کلیاتِ ابراہیم یوسف

(جلد اوّل)

(ڈرامے)

مرتب

محمد نعمان خان

کلیاتِ ابراہیم یوسف

(جلد دوم)

(ڈرامے)

مرتب

محمد نعمان خان

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	2015
تعداد	:	550
قیمت	:	1343/- روپے (مکمل سیٹ)
سلسلۂ مطبوعات	:	1836

Kulliyat-e-Irbaheem Yousuf Vol. 2
(Dramey)
Compiled by: Mohd. Nauman Khan

ISBN: 978-93-5160-072-5

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49639000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066
فون نمبر: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی-110 006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho (Top) کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان کا اجتماعی شعور صدیوں کو محیط ہے۔ اظہار کے سانچوں پر قابو پاتے میں صدیاں لگی ہیں۔ اظہار کے لسانی سانچے پر عبور پانا معجزے سے کم نہیں۔ زبان حقیقت سے مجاز تک کا نہایت با معنی سفر ہے۔ مجاز کے توسط سے اشارے حقیقت کی ترسیل ہیں۔ معروضے سے معروضے کی منزل مشاہدے سے تجربے کی منزل ہے جو پیچیدگی سے آسانی کی طرف لے جاتی ہے۔ تفکر سے اظہار اور اظہار سے تحریر کے مراحل میں رد و قبول کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جذبے، احساسات اور اشیا کی شناخت کے لیے لفظیات کا انتخاب اور ان کی قبولیت کے لیے زمانہ درکار ہوتا ہے۔ زبان عمرانی، معاشرتی اور تہذیبی مظہر ہے۔ ایک دن میں زبان بنی ہے نہ قواعد۔ نطق سے اظہار تک کا سفر صدیوں پر مشتمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں پیچیدگی اور تنوع پایا جاتا ہے۔ زبان نامیاتی حقیقت ہے۔ اسی لیے نئے نئے سیاق میں ظاہر ہوتی ہے۔ ہر لفظ معنوی امکانات میں ایک سے زائد سیاق رکھتا ہے۔ ہر لفظ اپنے ساتھ مختلف تصورات لے کر ظاہر ہوتا ہے لیکن اس کی سادہ اور پیچیدہ دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ ہر لفظ اپنی تخلیق کے بعد جب کچھ زمانی عرصہ گزار لیتا ہے تو اس کے معنوی حدود متعین ہو جاتے ہیں اور اس کی سند لغت فراہم کرتا ہے۔ اردو نے اپنا

ادبی سفر شروع کیا تو تحریر بھی اسے محفوظ کرتی گئی اور آج اردو کتابوں کے عظیم ذخیرے پر ہم فخر کرتے ہیں۔

اردو میں مختلف علوم و فنون کی کتابوں کو منتقل کرنا اور معیاری تحریروں کو نئی روشنائی عطا کرکے اردو حلقوں تک پہنچانا ہماری اہم ذمہ داری ہے۔ کونسل نے متنوع موضوعات پر کتابیں شائع کی ہیں۔ کلیات ابراہیم یوسف کی اشاعت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب کلیات ابراہیم یوسف کے ڈراموں کی کلی ادبی شخصیت اور ادبی کارناموں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک قیمتی تحفہ ہوگی۔ خوشی ہے کہ کونسل نے ایک اہم ذخیرے کو محفوظ کرلیا ہے۔ امید ہے کونسل کی دیگر مطبوعات کی طرح اس کتاب کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

(ڈائرکٹر)

فہرست

○ مقدمہ۔ محمد نعمان خان — viii

الجھاوے

1. اچھی اچھی راتیں — 3
2. بادلوں کا سایہ — 67
3. الجھاوے — 133

پرچھائیوں کا پیچھا

1. طلاق — 169
2. پرچھائیوں کا پیچھا — 215
3. راوی چین لکھتا ہے — 245
4. سیپ حتی — 277

رسائل میں شائع ڈرامے

1. گورکن — 329
2. مریم وزلیخا — 375
3. ایک پاگل — 433
4. جیتے آخریں — 455
5. رنگ میں بھنگ — 469
6. زمرد کا گلوبند — 485
7. طوفان — 503
8. ننھا مجاہد — 519
9. سواگت — 529
10. مانڈو کا پھول — 543
11. چپقلش — 573
12. ڈراما ایک روح کا — 585
13. اور یہ انسان — 597
14. اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ — 611
15. شاخ نازک — 631
16. سہاگ رات — 649
17. قبرستان — 661
18. بنتِ عم — 673
19. وہ کون تھا؟ — 687
20. پردے اٹھتے ہیں — 699
21. ننھی صالحہ — 713
22. کراس کا تحفہ — 721
23. ٹکٹ — 731

مقدمہ

اردو کے معروف ڈراما نگار اور ادیب ابراہیم یوسف کا اصل نام محمد ابراہیم خاں، اور والد کا نام محمد یوسف خاں تھا۔ وہ 15 مئی 1925 کو بھوپال کے ایک معزز پٹھان خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابراہیم یوسف کا آبائی پیشہ سپہ گری تھا۔ ان کے آبا و اجداد سترھویں صدی عیسوی میں افغانستان سے ہندوستان آئے اور بھوپال میں سکونت پذیر ہوکر ریاستی فوج میں ملازم ہو گئے۔ ابراہیم یوسف کی ابتدائی تعلیم حسبِ معمول گھر پر ہی ہوئی۔ انھوں نے ثانوی تعلیم الیگزینڈرا اسکول بھوپال میں مکمل کی۔ 1945 میں کرسچن کالج، اندور سے بی اے پاس کیا پھر وکرم یونیورسٹی اجین سے سیاسیات اور اردو ادب میں ایم اے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ ایڈ کی اسناد حاصل کیں۔ حصولِ تعلیم کے بعد مدھیہ پردیش کے محکمۂ جنگلات کے اکاؤنٹس کے دفتر میں ملازمت اختیار کی لیکن ادبی مزاج کا حامل ہونے کے سبب اس ملازمت کو خیرباد کہہ کر بہ حیثیت استاد، محکمۂ اسکولی تعلیمات، حکومت مدھیہ پردیش سے وابستہ ہوگئے اور پرنسپل کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ مختصر علالت کے بعد 30 اکتوبر 1999 میں بھوپال میں ان کا انتقال ہوا اور یہیں تدفین عمل میں آئی۔

ابراہیم یوسف کو مطالعے کا شوق بچپن سے تھا۔ بھوپال کے ادبی ماحول نے ان کے

ادبی ذوق کو جلا بخشی۔ طبیعت نثر نگاری خصوصاً فکشن کی جانب مائل تھی اس لیے زمانہ طالب علمی ہی میں کالج کی سماجی زندگی سے متعلق ایک افسانہ "تماشہ" (مطبوعہ حمیدیہ کالج میگزین) سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ ابتدا میں ابراہیم بھوپالی بی اے کے نام سے لکھتے اور چھپتے تھے پھر ابراہیم یوسف کے نام سے لکھنے لگے اور یہی قلمی نام ان کی ادبی شناخت بن گیا۔ نوجوانی ہی میں وہ ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے اس لیے ابتدا ہی سے ان کی تحریروں میں ترقی پسند نظریات کا عکس دکھائی دیتا ہے۔

ابراہیم یوسف کی افسانہ نگاری کا ابھی آغاز ہی تھا کہ بھوپال کے مشہور شاعر اور کلامِ غالب کے معروف شارح سہا مجددی کے مشورے پر 1943 میں انھوں نے ڈراما "بہشت ارضی" تحریر کیا۔ سہا مجددی کی حوصلہ افزائی اور اپنی طبیعت کی مناسبت کے سبب انھیں ڈراما نگاری ایسی راس آئی کہ وہ ہمیشہ کے لیے اسی کے ہو رہے اور تمام عمر ڈراما نگاری میں صرف کر دی۔ مختلف موضوعات پر انھوں نے 250 سے زیادہ ڈرامے تحریر کیے جن میں تقریباً 25 ڈرامے پورے وقت یعنی Full length کے ہیں اور بقیہ تمام یک بابی ہیں۔ ابراہیم یوسف کے تحریر کردہ کئی ڈرامے ہندو پاک کے موقر ادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ حسب ذیل سات مجموعے کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں:

1. سوکھے درخت — مکتبۂ افکار، بھوپال — 1952
2. طربیہ ڈرامے — نسیم بک ڈپو، لکھنؤ — 1974
3. دھوئیں کے آنچل — نسیم بک ڈپو، لکھنؤ — 1976
4. پانچ نئے ڈرامے — نئی آواز، نئی دہلی — 1978
5. اداس موڑ — نئی آواز، نئی دہلی — 1983
6. الجھاوے — نئی آواز، نئی دہلی — 1990
7. پرچھائیوں کا پیچھا — مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال — 1990

اردو ڈرامے کی روایت قدیم اور وقیع ہے لیکن ایسے ڈراما نگار بہت کم ہیں جنھیں خالصتاً ڈراما نگار کہا جا سکے۔

ابراہیم یوسف بنیادی طور پر ڈراما نگار ہیں لیکن انھوں نے ڈراموں کے علاوہ ایک ناول ' آبلے اور منزلیں' (1952) اور کئی تحقیقی، تنقیدی، تاثراتی مضامین، تبصرے، پیش لفظ بھی تحریر کیے ہیں۔ رومانیہ کے معروف ڈراما نگار 'یان لیوکا کرجیل' کا ڈراما 'Lost Letter' کا اردو ترجمہ 'گم شدہ خط' کے نام سے 1978 میں شائع کیا۔ سید ابوالفضل الفیاض کا تحریر کردہ اردو کا قدیم تاریخی ڈراما 'صولت عالمگیری' مرتب کیا اور اس پر ایک مبسوط مقدمہ تحریر کرکے 1976 میں شائع کیا۔

ابراہیم یوسف کا مطالعہ وسیع تھا۔ ڈرامے کے فن اصول، تکنیک، ارتقا اور موضوعات و مسائل پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ وہ محض ڈراما نگار ہی نہ تھے۔ ڈرامے کے سچے عاشق، محقق، مبصر، مترجم اور نقاد بھی تھے۔ ڈراما نگاری کے فن کے اصول، تکنیک، اقسام اور ارتقا سے متعلق انھوں نے نہ صرف کئی مضامین تحریر کیے بلکہ درج ذیل کتابیں بھی تصنیف و تالیف کیں:

1. اندر سبھا اور اندر سبھائیں، مطبوعہ نسیم بک ڈپو، لکھنؤ 1980
2. اردو کے اہم ڈراما نگار (متقدمین) مالوہ پبلشنگ ہاؤس، بھوپال، 1981
3. اردو کے اہم ڈراما نگار (متوسطین) مالوہ پبلشنگ ہاؤس، بھوپال، 1984
4. اردو کے اہم ڈراما نگار (آغا حشر)، مالوہ پبلشنگ ہاؤس، بھوپال، 1982
5. ہندی ڈرامے کا ارتقا، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال، 1985
6. اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی 1994

ابراہیم یوسف کے کئی ڈرامے ہندی اور دیگر زبانوں میں ترجمہ کیے گئے اور مختلف شہروں میں اسٹیج بھی کیے گئے۔ ان کے بعض ڈرامے مدھیہ پردیش ایس سی ای آر ٹی، این سی ای آر ٹی (نئی دہلی) اور مختلف ریاستی سرکاروں کے محکمۂ اعلیٰ تعلیمات کی نصابی کتابوں میں شامل ہیں۔ ابراہیم یوسف کی شخصیت، ڈراما نگاری اور طویل ادبی خدمات سے متعلق بمبئی یونیورسٹی، حیدرآباد یونیورسٹی اور اندور یونیورسٹی نے ریسرچ اسکالرس کو پی ایچ ڈی کی اسناد تفویض کیں۔ بیشتر ناقدین و محققین نے ان پر مضامین تحریر کیے ہیں۔ کئی اخبارات اور رسائل نے خصوصی گوشے شائع کیے اور مختلف نجی اور سرکاری اداروں نے ان کے اعزاز میں خصوصی

جلسے/ سیمینار منعقد کر کے ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔

ابراہیم یوسف کی طویل اور مسلسل ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ مدھیہ پردیش نے انھیں 'اقبال سمان' غالب انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) نے 'غالب ایوارڈ' اور مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے کل ہند 'میر تقی میر اعزاز' سے اعزاز یاب کیا اور کئی ریاستی اردو اکادمیوں نے ان کی کتابوں پر نقد انعامات بھی دیے۔

ڈراما ایک قدیم صنف ادب ہے۔ عالمی ادب کے کئی آفاقی شاہ کار ڈرامے کی صورت میں ہی پیش کیے گئے ہیں۔ یونان اور ہندوستان ڈرامے کے اہم، قدیم مرکز رہے ہیں۔ یونان میں اگر ارسطو نے اپنی تصنیف بوطیقا (Poetics) میں یونانی ڈرامے کے اجزا اور اصول مرتب کر کے پہلی بار پیش کیے تو بھرت منی نے ہندوستانی ناٹک کے اصول وفن پر پہلی کتاب 'ناٹیہ شاستر' تصنیف کی۔ ہندوستانی ناٹک کا جنم مذہبی ماحول میں ہوا، وہ دیوی دیوتاؤں کی آغوش میں پروان چڑھا لیکن جوں جوں حالات تبدیل ہوتے گئے زندگی اور سماج کے مختلف النوع مسائل و معاملات ہندوستانی ڈرامے کا موضوع بننے لگے۔ موجودہ اردو ڈراما 'رام لیلا'، 'کرشن لیلا'، 'یاترا'، 'رہس'، 'نوٹنکی'، 'سوانگ' اور اندرسبھاؤں سے ہوتا ہوا 'فارس'، 'براسک'، 'نکڑ ناٹک'، 'کل وقتی' (full length) 'یک بابی' اور ریڈیو ڈراما، ٹی وی ڈراما کی صوت میں تدریجی ارتقا کے سفر کی جانب گامزن ہے۔

عصرِ حاضر میں ڈرامے کے آخرالذکر تینوں اقسام بے حد مقبول ہیں۔ اردو کے بیشتر ڈراما نگاروں نے انھیں اقسام میں اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔

یک بابی ڈراما کے تعلق سے ابراہیم یوسف کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اردو ڈرامے کے معروف محقق و نقاد ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی نے ان کے متعلق اپنی کتاب 'اردو یک بابی ڈراما' میں لکھا ہے:

> ''اردو یک بابی ڈرامے کے ضمن میں صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ ابراہیم یوسف پر جنات کا سایہ ہے۔''

ڈاکٹر ظ انصاری نے محمد خالد عابدی کے نام اپنے خط مورخہ 30 اگست، 1985ء میں لکھا تھا:

> "ابراہیم یوسف جس شخص کا نام ہے وہ بڑے جیوٹ کا آدمی ہے۔ جب بھوپال اور گرد و نواح میں اسٹیج کے فن کا پوچھنے والا کوئی نہیں تھا تب ابراہیم یوسف نے ڈرامے کو اوڑھنا بچھونا بنایا۔ ترکیبوں کے اس گھونسلے میں جس نے کبھی ایک سے ایک اہلِ علم اور اہلِ قلم جما تھا یا اپنایا تھا (نواب صدیق حسن خاں سے لے کر ابوسعید بزمی اور مہدی جعفر تک) وہاں اس دلیر شخص نے ڈرامے پر کام ہی نہیں کیا، ڈرامے لکھے بھی..... سن لیجیے کہ ابراہیم یوسف کو نہ صرف یہ کہ اردو کی پوری ڈرامائی کائنات کا علم ہے بلکہ وہ خود بھی ماہر ہے۔"

ابراہیم یوسف سے متعلق ظ انصاری کی مذکورہ بالا رائے جہاں حرف بہ حرف درست ہے وہیں معروف فکشن نگار کوثر چاندپوری مرحوم کی یہ رائے بھی 'ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات' کے مصداق بنی بر حقیقت ہے جو انھوں نے ابراہیم یوسف کے ڈراموں کے پہلے مجموعے 'سوکھے درخت' (1952) کے مطالعے کے بعد اپنے مقالے "ابراہیم یوسف" مطبوعہ ماہنامہ 'نیرنگ خیال' (پاکستان) میں تحریر کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

> "ترقی پسند ڈرامے کی سرگزشت اتنی طویل، حیرت انگیز اور حیات پرور نہیں جتنی افسانہ اور نظم کی ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی نیا ڈراما نگار درمیان میں آئے تو ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اس وقت میں ایسے ہی ایک فنکار کا خیر مقدم کر رہا ہوں جس کی شہرت کا آفتاب ابھی ابھی 'سوکھے درخت' کی چوٹی پر طلوع ہوا ہے۔ میرا اشارہ بھوپال کے ہونہار نوجوان آرٹسٹ ابراہیم یوسف کی طرف ہے... جب اس کی کتاب 'سوکھے درخت' کوہستانی آبشار کا سا حسن اور اس کی صداقت سے لبریز جیتی جاگتی موسیقی بکھیرتی پریس سے نکلی

اور میں نے اسے پڑھا تو محسوس ہوا کہ ان کا کلام مجھ سے کتنا بہت
قریب ہے۔ وہ اپنے فن میں گھل مل کر میرے احساس پر چھا گیا
ہے اور یہی فنکار کا حسن ہے یہی اس کا خلوص ہے۔ ان کا کلام ترقی
پسندی کے بارے میں کسی تنگ نظری یا محدود نظریے کا شکار نہیں۔ اس
سلسلے میں ان کا تصور بہت صاف، واضح اور صحت مند ہے۔ نعرے بازی
کا نام ترقی پسندی نہیں ہے۔ ترقی پسندی کی اخلاقی قدریں بہت
وسیع ہیں۔ ان کا کلام کے فن اور ان کا بیان بہت صاف اور سادہ ہوتا
ہے۔ شعری ترتیب نہایت حسین ہوتی ہے اور جذبے کا اظہار بھی بہت
عمدہ ہے۔ انہیں میں کہیں کہیں اسالیب کی تحریک بھی پائی جاتی ہے
لیکن کسی تحریک کی خاطر تخلیق اور فکر کے پہلو کا شکار نہیں ہوتے
تو ان کا سر برگ سماجیت میں الجھتا ہے۔ بلکہ شعر اے لوگوں کا میلان ہے
اور کمال طور پر شگفتگی اور ماحول سے ہم آہنگ بنانے کے لیے وہ
پیش پا ایک حقیقی کے ساتھ اپنے فن میں ترنم کے ساتھ ایک عمدہ
اور خوبصورت تخلیق کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے اور اس کی حقیقی
تخلیقات میں جا بجا آج کل کے نقوش ابھر آتے ہیں۔ وہ مختلف
واقعات بیان کرتا ہے کہ اس میں بھی حقیقت نظر آسکتا ہے لیکن
فلسفیت کے فکری قطعے سے ہمیشہ دور نہیں ہوتے پاتا۔
تہذیب کی سادگی، صداقت اور تیور ہے جو اس کے فن میں
جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ تہذیب ماحول کے ساتھ ساتھ یوں بدلتی
جاتی ہے جیسے شخصیت کے ساتھ حالات بدل جاتے ہیں۔
ان کا کلام بہت سادگی کی روح میں ڈھلا ہوا ہے اور یہ کہ
احساس کی شدت اور شائستگی سے مزین ہے اور اس کے شعر میں قوت
گویائی ہے۔ مگر یہ سب اس کا نام ہے ستاروں سے آگے خیال کا

> ہے جس نے ہیروشیما کو تباہ کر ڈالا تھا۔ وہ ساقی کے ہاں جیسا کہ
> جاتا ہے تو جس کا ان چلانا ہے اور مرکزوں کو بھی محفوظ رکھنے کی
> کوشش کرتا ہے۔ کسی موقعے پر بھی اس نے کوئی دعویٰ نہیں کیا لیکن
> کتنے احوال کی ایسی مکمل تصویر کھینچ دی ہے جس کو دیکھ
> کر قاری کے ذہن میں انقلاب اور انسانیت کا یقین پیدا ہو اٹھتا ہے۔"

یہ حقیقت ہے کہ شاعر یا ادیب واعظ اور ناصح نہیں ہوتا۔ عصری مسائل اور حالات سے آگاہی اور ان کے مضر اثرات سے انقلاب و انسانیت ہی اس کا مقصد ہوتا ہے۔ ابراہیم یوسف نے اپنی تخلیقات خصوصاً افسانوں کے ذریعے بھی اسی اخلاقی اور ادبی فریضہ انجام دیا ہے اس لیے محمود عراقی کی اس رائے کو تو یہ جیسے نہیں کیا جا سکتا ہے کہ:

> "آج ترقی پسند حلقوں کی طرف سے ان کتاب (سوکھے درخت) پر
> صرف ایک اعتراض کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ابراہیم یوسف
> نے ان افسانوں میں مسائل کا حل جیسا کہ حالات سے نکلنے کا
> کوئی راستہ نہیں بتایا حالانکہ ترقی پسندی کے ادب میں حقیقت پسندی
> کے علاوہ اس کی سمت اشارہ بھی لازمی شے کے طور پر آتی
> ہے۔" (ماخوذ: سوکھے درخت اور ابراہیم یوسف)

بلاشبہ ابراہیم یوسف محض ایک کامیاب افسانہ نگار ہی نہ تھے بلکہ شاعر کی حیثیت سے بھی جانے جاتے اور بحر بھی تھے۔ وہ ترقی پسند افسانہ نگاری کے مسائل اور ان سے متعلق تقریری کی سی باتوں سے متعلق تعصب اور جذباتی باتوں سے گریز کرتے تھے۔ وہ صرف باتیں ہی نہیں کرتے تھے بلکہ تحقیق اور حقائق کی روشنی میں بحث و استدلال کے ساتھ اپنی بات اس طرح پیش کرتے تھے کہ پڑھنے یا سننے والا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ابراہیم یوسف نے شاعری کی حالت میں کئی مقالات اور کتب لکھ کر شاعری سے متعلق پھیلائی گئی غلط فہمیوں اور غلط تعبیروں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

افسانے کے مقصد، فیشن اور اہمیت سے متعلق اٹھائے گئے بے بنیاد سوالات اور

افواہوں کا جواب دیتے ہوئے اپنے ڈراموں کے مجموعے 'دھوئیں کے آنچل' کے ابتدائی صفحات میں 'ایک عرض' کے عنوان سے انھوں نے لکھا ہے:

"اردو ڈراما عجیب عجیب افواہوں کا شکار ہے، یہ کہ اردو میں ڈراما ہے ہی نہیں، جو کچھ ہے بھی تو وہ معیاری نہیں۔ اردو ڈرامے پر اس طرح کی تنقید اور تبصرہ کرنے والے وہ حضرات ہیں جن کو ڈرامے سے کوئی دلچسپی نہیں، تو کیا ضرورت ہے کہ اس پر تحقیق و جستجو کی جائے۔ جن حضرات کو اردو ڈراما غیر معیاری نظر آتا ہے۔ وہ بدقسمتی سے رہتے ہندوستان میں ہیں، بولتے اردو ہیں مگر غور و فکر یورپین فضا میں کرتے ہیں۔ اگر کوئی چیز یورپین معیار پر پوری نہیں اترتی تو وہ ان کے نزدیک غیر معیاری ہو جاتی ہے۔ کچھ حضرات کو یہ شکایت ہے کہ ہمارا ڈراما یورپین ڈرامے کے مقابلے میں نوٹنکی معلوم ہوتا ہے گویا نوٹنکی کوئی گالی ہے۔ جس کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ حالانکہ نوٹنکی ہماری تہذیبی روایت ہے اور ہر تہذیبی روایت قابلِ احترام ہوتی ہے۔ اگر اردو ڈرامے پر نوٹنکی کے اثرات ہیں تو یہ قابلِ ستائش ہیں نہ کہ قابلِ لعنت۔ اگرچہ یہ نوٹنکی والی بات بھی ایک افواہ ہی ہے... ایک افواہ یہ بھی ہے کہ اردو کے ابتدائی ڈراما نگار کم پڑھے لکھے بلکہ جاہل لوگ تھے۔

ان کو یورپین ڈرامے کے بارے میں علم نہیں تھا۔ اردو کے پڑھے لکھے اور شہرت یافتہ ادیبوں نے جن کو یورپین ڈرامے کا بھی علم تھا، ڈرامے کو منہ کیوں نہیں لگایا؟ اسی لیے نا کہ ان کے نزدیک ڈرامے لکھنا غیر مہذب حرکت تھی اور غیر شریفانہ عمل تھا۔ جس 'صنف' کے بارے میں اس قدر تعصب پھیلا ہوا ہو، اس کے متعلق ہر افواہ پر لوگ خواہ مخواہ یقین کر لیتے ہیں...... سچ بات تو یہ ہے کہ ڈرامے کے

بارے میں ابتدا میں جو تعصب پیدا ہوگیا تھا وہ آج تک قائم ہے اور
جب تک یہ تعصب دور نہ ہوگا، اردو ڈراما ترقی نہیں کرے گا۔
کہا جاتا ہے کہ اردو کے پاس اسٹیج نہیں ہے اس لیے ڈرامے کی
طرف دھیان نہیں دیا جاتا۔ میں کہتا ہوں کہ اچھے ڈرامے لکھے
جائیں اسٹیج خود بہ خود مل جائے گا..
یہ چند مسائل ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ میری ناقدین
اور محققین سے یہی عرض ہے کہ وہ ڈرامے پر بھی سنجیدگی سے غور
فرمائیں... ڈراما اگر تحقیق کا موضوع ہو تو ایمان داری سے اس پر
کام کریں.... کسی تعصب اور ادبی سیاست کا شکار نہ ہوں۔ یہ
ڈرامے کی بڑی خدمت ہوگی۔"

ابراہیم یوسف نے تمام عمر جس طرح ڈراما نگاری کے مطالعے اور اس کی تخلیق، تحقیق، تنقید اور تجزیے میں صرف کردی۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ڈراما نگاری اور اس کے متعلقات پر انھیں جو عبور اور اختصاص حاصل تھا وہ بہت کم ڈراما نگاروں کے حصے میں آسکا ہے۔ وقت اور حالات کے تقاضوں کے ساتھ اردو ڈراما نگاری کے ضمن میں ہونے والی تبدیلیوں اور کیے جانے والے تجربات پر ان کی گہری نظر تھی۔ موجودہ اردو ڈراما نگاری سے متعلق ان کی حسب ذیل رائے نہ صرف مبنی برحقیقت ہے بلکہ اس سے ان کی ڈراما نگاری اور اس کے نصب العین کا اظہار بھی ہو جاتا ہے:

"آج ڈراما نہ دیوتاؤں کی حمد گا کر افزائشِ نسل اور زرخیزیِ فصل کے
لیے دعائیں مانگنے کے لیے ہے اور نہ کلیسا کا اسیر ہے کہ اُسے تبلیغ
کے لیے استعمال کیا جاتا ہو۔ آج ڈرامے کے محرکات، مذہبی اور
تفریحی نہ ہوکر وہ کشمکش ہے جس کے باعث انسان انتشار زندگی کا
شکار، اپنے ماحول سے گریزاں بلکہ اپنی ہی ذات سے بیزار نظر آتا
ہے اور اس قدر دل برداشتہ ہوگیا ہے کہ یہی ازم کو بطور پناہ گاہ کے

استعمال کرنے میں عافیت محسوس کرتا ہے...... معاشرے کی یہ جبریہ
مصنوعی تشکیل آج کا وہ المیہ ہے جس سے منضبط نظامِ حیات پارہ
پارہ ہوکر رہ گیا ہے اور جس نے مایوسی اور تلخی کو جنم دے کر جارحیت
کے لیے فضا ہموار کی ہے۔ روایتی تہذیب انحطاط کا شکار ہے لیکن
ابھرتی ہوئی نئی تہذیب کے سامنے کوئی ایسا نصب العین نہیں جس
کے لیے جدوجہد کرنے کی امنگ پیدا ہو.......... اس منتشر نظامِ حیات
نے افراد کے مستقبل کو تاریک کردیا ہے اور وہ صرف خوابوں کی
زندگی بسر کررہا ہے............... آج کا اردو ڈراما نگار سماجی
مسائل سے ہٹ کر اندر سبھا تخلیق نہیں کررہا ہے بلکہ سماج میں پیدا
ہونے والے مسائل پر اس کی نظر ہے اور وہ اپنی فکر کی گہرائی اور
شعور کی پختگی سے ان مسائل کو تشویش کی نظر سے دیکھ رہا ہے۔ اس
سے واضح طور پر یہ رجحان سامنے آتا ہے کہ اردو ڈرامے کی رو
جذباتیت سے عقلیت کی طرف بہنے لگی ہے.............................
اس زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کے بعد ہم محسوس کرتے ہیں کہ ڈرامے
کے بارے میں اردو ڈراما نگار کے نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا ہوئی ہے
اور اگر کلی طور پر نہیں تو جزوی طور پر وہ بریخت کے خیالات سے
متاثر ہوا ہے۔
ڈرامے کے اس بدلتے ہوئے رخ نے اردو ڈراما نگاروں کے سامنے
فن کا مسئلہ بھی پیدا کیا ہے۔ اس کو احساس ہے کہ ڈرامے کے بدلتے
ہوئے اس روپ کا ڈرامے کے ڈھائی سو سالہ پرانے قوانین ساتھ نہیں
دے سکتے، اس لیے وہ نئے تجربات کی ضرورت محسوس کررہا ہے—"
(اردو ڈرامے کے دس سال، مطبوعہ ماہنامہ، شاعر بمبئی، ص 31-30)

B
حقیقت یہ ہے کہ ڈراما نگاری، ابراہیم یوسف کے لیے نہ تو صلہ و ستائش کا وسیلہ تھی

اور نہ ہی تفننِ طبع یا حصول لطف و مسرت کا ذریعہ۔ وہ ایک ذہین، حساس فنکار تھے۔ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ وسیع تھا۔ سماج کے متوسط طبقے کی روزمرہ زندگی کے مسائل مثلاً بے روزگاری، فیشن پرستی، رشتوں کی نزاکت، قدروں کا زوال، حقوق کی پامالی، حق تلفی، سماجی بدعنوانی اور استحصال، انسانی بے بسی، بے چارگی، حرص و ہوس، فسادات کی تباہ کاری وغیرہ پر وہ نہ صرف گہری نگاہ رکھتے تھے بلکہ یہی موضوعات ان کے ڈراموں کا عنوان بن جاتے تھے۔

ابراہیم یوسف کے ڈراموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ادب برائے مقصد واصلاح کے قائل تھے۔ انسانی دردمندی اور انسانیت کی سربلندی ان کا شیوہ تھا، اسی لیے انھوں نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے ایک ایسی صنف ادب یعنی ڈراما نگاری کو اختیار کیا تھا جو کہ زندگی اور سماج سے سب سے زیادہ قریب تر ہے یا جس میں زندگی اور سماج کی حقیقتوں اور انسانی خیر وشر کو تحریری اور عملی طور پر موثر طریقے سے پیش کیے جانے کی زیادہ گنجائشیں موجود ہیں۔ ڈراموں کے ذریعے پیش کردہ اور بیان کردہ مسائل و معاملات پر قاری یا ناظر کی توجہ مبذول کرانا ہی ان کا اصل مقصد تھا۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے اس سے متعلق تمام تر امور پر انصاف کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ڈراما لکھتے وقت ان پر سرشاری اور استغراق کی جو کیفیت طاری رہتی تھی اس کے متعلق ان کے قریبی دوست اور افسانہ نگار انجم سلمانی نے لکھا ہے:

> ’’عام طور پر وہ ڈراما شروع کرنے میں زیادہ غور و فکر کا عادی نہیں ہے۔ اس کا دماغ اپنے فن میں اتنا منجھ گیا ہے کہ آپ ہی آپ پلاٹ کا تانا بانا بننے لگتا ہے۔ البتہ جیسے جیسے پلاٹ نقطۂ عروج کی طرف بڑھتا ہے اور مختلف متصادمات ڈرامے میں زندگی پیدا کرنے لگتے ہیں۔ وہ لمحات، گھنٹے یا دن جتنے عرصے میں بھی وہ نقطۂ عروج پر پہنچے ابراہیم یوسف کی بے چینی، اضطراب اور تفکر اس کے ہر انداز، ہر جنبش سے آشکارا ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم یوسف خود بھی اپنے ڈرامے کا ایک کردار

ہے۔ یہ تمام کیفیات اس پر اس وقت تک طاری رہتی ہیں جب تک
کہ اس کے ڈرامے کا نقطۂ عروج نہ گزر جائے—''
(ماخوذ: ابراہیم یوسف اور اس کی ڈراما نگاری از انجم سلمانی، مطبوعہ،
نذر سجاد، ص 271)

ایک سچے، اچھے اور کامیاب ڈراما نگار کی خوبی یہی ہے کہ وہ اپنے ڈرامے کے ماحول میں کھوکر اس کے کرداروں میں اس طرح گھل مل جاتا ہے کہ گویا وہ بھی اسی ماحول اور حالات کا حصہ ہو۔ ابراہیم یوسف کے ڈراموں کی ان خصوصیات کے سبب ان کے ڈراموں میں حقیقت نگاری، واقعیت، دردمندی، ڈرامائیت اور اثر و تاثیر کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ انسانی نفسیات، مسائل اور معاملات پر گہری نگاہ ہونے کے سبب وہ کرداروں کو ان کے اصل ماحول کے مطابق متعارف کراتے ہیں۔ ان کے کردار نہ تو شیطان ہیں اور نہ فرشتے بلکہ نیکی و بدی، خیر و شر کے حامل متوسط طبقے کے ایسے عام انسان ہیں جو حالات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے بہتر زندگی گزارنے یا زندگی کو گوارہ بنانے کی کوشش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ حالات کی ناسازگاری، استحصال اور غم نصیبی نے انھیں بے بس اور بے دست و پا ضرور کر دیا ہے لیکن وہ زندگی سے مایوس نہیں ہیں۔

ابراہیم یوسف نے زندگی اور سماج سے متعلق ہر اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے جو کہ ایک ذمے دار، حساس فنکار کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ ڈرامے میں گہرائی، سچائی اور اثر و تاثیر پیدا کرنے کے لیے انھوں نے کرداروں کی خارجی کیفیات کے بجائے داخلی کشمکش کو ابھارنے کی سعی کی ہے۔ وہ موضوع کی اہمیت کے ساتھ ساتھ قاری کی پسند کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں نہ تو سطحیت ملتی ہے نہ ہی خالص رومانیت، ان کے ڈراموں میں حقیقت پسندی اور ترقی پسندی کا جو امتزاج ملتا ہے اس کے سبب ان کے اسلوب میں کہیں کہیں ایسی نشتریت بھی پیدا ہوگئی ہے جو کبھی کبھی خالص نصیحت کا روپ اختیار کر کے ڈرامے کو خشک اور گراں بار بنا دیتی ہے۔ لیکن ان کے یہاں یہ پہلو صرف سنگین مسائل کے حامل ڈراموں میں ہی نمایاں ہے، ان کے بیشتر ڈرامے اس نوع کے عیب سے عاری ہیں۔

ابراہیم یوسف کے کئی ڈرامے خالص طنزیہ ہیں بعض مزاحیہ اور بعض تجسس اور چونکا دینے والی کیفیت اور پراسراریت کے حامل بھی ہیں۔

یوں تو ابراہیم یوسف کے بیشتر ڈرامے موضوع، تکنیک اور فن کی کسوٹی اور اسٹیج کے تقاضوں پر پورے اترتے ہیں لیکن ان کے جن ڈراموں کو ہر لحاظ سے، کامیاب، معیاری اور پراثر کہا جاسکتا ہے ان میں 'وقت کے کراہتے رنگ'، 'دھوئیں کے آنچل'، 'زبیدہ'، 'قدم قدم اداس موڑ'، 'خاموشیاں'، 'تصویر اور جھوٹ'، 'ڈاکٹر تمکین کی الجھن'، 'ٹوٹے ہوئے خوابوں کا درماں'، 'افشاں یا نور افشاں'، 'تین نسلیں ایک دور'، 'بادلوں کا سایہ'، 'اندھیری رات کا جگنو'، 'کمینہ کہیں کا'، 'صنم کدے'، 'گونگے کے خواب'، 'بڑھتے قدم'، 'جمہور کے ابلیس'، 'بیگم صاحبہ'، 'مرکز کی طرف'، 'سوانگت'، 'حیوان'، 'سہاگ راگ'، 'اس حمام میں'، 'اداس راہی، اداس راہیں'، 'سلگتی روحیں'، 'بنتِ غم'، 'خودکشی'، 'دم خم'، 'میرے خواب' اور تاریخی نوعیت کے ڈراموں میں 'سلطان ٹیپو'، 'مانڈو کا پھول'، 'روپ متی'، 'معمار' اور 'مغلوب غالب' کے نام بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

ابراہیم یوسف نے زور واثر پیدا کرنے کی خاطر، ڈراموں میں بعض کامیاب تجربات بھی کیے ہیں۔ مثلاً ان کے تین ڈرامے: 'اندھیری رات کا جگنو'، 'اداس راہی، اداس راہیں' اور 'بڑھتے قدم' میں یہ تجربہ کیا گیا ہے کہ یہ تینوں ڈرامے اپنے اپنے طور پر علاحدہ اکائی کی حیثیت رکھنے کے باوجود نفس موضوع کے اعتبار سے یہ تینوں مل کر ایک اکائی بن جاتے ہیں۔ ڈراما 'جو چپ رہے گی زبان خنجر' اپنی جگہ ایک اکائی ہے لیکن ڈراما 'وقت کے کراہتے رنگ' کے ساتھ مل کر بھی ایک ڈراما بن جاتا ہے۔ یہی معاملہ ڈراما 'کاغذ کی دھجی' اور 'وقت کے کراہتے رنگ' کا ہے کہ یہ دونوں ڈرامے علاحدہ ڈرامے بھی ہیں اور ایک ڈراما بھی! اسی طرح ان کے بعض ڈراموں کا اختتام انتہائی چونکانے والا بلکہ ایسا غیر یقینی ہوتا ہے کہ جس کی طرف قاری یا ناظر کا ذہن تیار نہیں ہوتا اور وہ بے اختیار چونک اٹھتا ہے۔ ابراہیم یوسف نے اپنے بعض ڈراموں میں فلسفیانہ موشگافی، تحلیل نفسی، تذبذب، شدید جذباتی اور نفسیاتی کشمکش، تجسس، سنسنی خیزی اور تحیر سے بھی کام لیا ہے۔ ان کے اس نوع کے جن ڈراموں

میں یہ تاثر آخر تک قائم رہتا ہے۔ ان میں 'پچھے سال بعد'، 'طمانچہ'، 'موت سے پہلے آدمی'، 'بادلوں کا سایہ'، 'خاموشیاں'، 'والد صاحب'، 'ایک پہیلی'، 'داغ اور دھبے'، 'افشاں یا نورافشاں'، 'بیگم صاحبہ'، 'چمگادڑیں' اور 'پرچھائیوں کا پیچھا' کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔

تخیل کی بلند پروازی کی مثال پیش کرنے اور ماورائی فضا قائم کرنے میں ان کے تحریر کردہ ڈرامے 'آسمانوں میں'، 'کردار کا کردار' اور 'سوا گت' کامیاب ڈرامے ہیں۔ تکنیکی حسن کاری، حسن تعمیر، ڈرامائیت اور پلاٹ کی بُنت کے اعتبار سے 'سوکھے درخت'، 'احرام'، 'نقلی خوشیاں، اصلی چہرے، وقت کے کراہتے رنگ'، 'دھوئیں کے آنچل'، 'شاہدہ'، 'تین نسلیں، ایک دور'، 'بادلوں کا سایہ'، 'تصویر اور جھوٹ'، 'اندھیری رات کا جگنو'، 'رنگ میں بھنگ'، '... اور یہ انسان'، 'ٹوٹے ہوئے خوابوں کا درماں'، 'بڑھتے قدم' وغیرہ ایسے اہم ڈرامے ہیں جنھیں کسی بھی زبان کے معیاری اور مثالی ڈراموں کے سامنے پیش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن 'جوان'، 'بزدل'، 'ہنسی ہنسی میں'، 'لاش کے گرد' اور 'یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں' ان کے ایسے ڈرامے ہیں جن میں موضوع کی سنگینی کے سبب کرداروں کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی نفسیاتی اور جذباتی کشمکش نے فن ڈراما کے فطری حسن کو خاصا مجروح کیا ہے اور یہ ڈرامے بعض فنی اسقام کا شکار ہوگئے ہیں۔

ڈراما 'دھوئیں کے آنچل' میں تعلیم یافتہ افراد کی معاشی پریشانیوں اور سماجی و تہذیبی قدروں کے ٹکراؤ کو خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ پانچ مناظر پر مشتمل اس یک بابی ڈرامے میں تمام ڈرامائی عناصر کو کامیابی کے ساتھ برتا گیا ہے لیکن اس کا انجام قدرے غیر متاثر کن اور غیر فطری اس لیے محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر قاسم کو محض اسقاط حمل کے ایک کیس کے سلسلے میں معتوب قرار دے کر ڈراما ختم کردیا جاتا ہے۔ یہ ڈراما 15 اپریل 1981 اور 16 ستمبر 1981 کو ٹیگور ہال، بھوپال میں کامیابی کے ساتھ اسٹیج کیا گیا تھا۔

ابراہیم یوسف نے سماجی، سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور نفسیاتی مسائل کے ساتھ بعض تاریخی نوعیت کے ڈرامے بھی تحریر کیے ہیں جن میں 'مغلوب غالب'، 'معمار'، 'سلطان ٹیپو' اور 'مانڈو کا پھول' ان کے ایسے کامیاب ڈرامے ہیں جن کے مطالعے سے متعلقہ موضوع،

اس کا تاریخی پس منظر، مخصوص ماحول و حالات اور اشخاص و افراد کے مزاج و مسائل، انداز فکر ونظر اور طرز زندگی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ڈراما 'معمار' میں جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، ایک مخصوص پیشے سے وابستہ افراد کی پیشہ ورانہ نفسیات اور معاشرتی زندگی کے مسائل کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس ڈرامے میں ڈراما نگار نے ترقی پسند نقطۂ نظر سے کام لے کر مزدور پیشہ افراد کے مسائل کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ اجداد کے کارناموں پر فخر محسوس کرنا، فطرت انسانی کا خاصہ ہے۔ ڈراما 'معمار' کا مزدور کردار کلو بھی اپنے اسلاف کے ان کارناموں پر نازاں ہے جنھوں نے تاج محل کی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ ڈرامے میں بھیگو معمار اور دھنا شرابی کے کردار بھی متاثر کن ہیں۔

'کمینہ کہیں کا' میں ڈراما نگار نے متوسط گھرانوں کی چاردیواری میں پیش آنے والے غیراخلاقی اور غیرمہذب حالات کو ڈرامائی کشمکش کے ساتھ اس طرح ظاہر کیا ہے کہ ڈراما پڑھنے یا دیکھنے والے اصلاح و عبرت حاصل کرسکیں۔ آمنہ، راحت اور راحت کی بیوی فاطمہ ڈرامے کے اہم کردار ہیں۔

ڈراما 'وقت کے کراہتے رنگ' موضوع، زبان، پیش کش اور ڈرامائی عناصر کے لحاظ سے معیاری ڈراما ہے جس میں معاشرتی اور خانگی حالات اور انسانی نفسیات کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ڈراما ماہنامہ 'شاعر' بمبئی کے سال نامے 1972 میں شائع ہوا تھا۔ 27 مارچ 1982 کو مدھیہ پردیش اردو اکادی نے اسے مع دوسرے ایکٹ 'کاغذ کی دھجی' کے ساتھ راجیو ورما کی زیرہدایت، ٹیگور ہال، بھوپال میں اسٹیج کیا۔

اس ڈرامے میں عاصم، خدیجہ بیگم (عاصم کی بیوی) عظمت خالا (نوکرانی) عالیہ (عاصم کی بیوہ بہو) شارق (عاصم کا بھتیجہ) سبھی نے کردار نگاری کے اچھے نمونے پیش کیے ہیں لیکن عالیہ کا کردار سب سے زیادہ بھرپور اور متاثر کن ہے۔ ڈرامے میں عصر حاضر کی قدروں کے زوال کو پیش کیا گیا ہے۔ اگرچہ موضوع نیا نہیں ہے لیکن کامیاب پیش کش، برجستہ مکالمے اور اچھی کردار نگاری نے اسے ایک اچھا ڈراما بنا دیا ہے۔ بقول فصیح احمد صدیقی:

"فکری زاویے سے ڈرامے کا رتبہ کافی بلند ہے۔ اس کے بنیادی

خیال کی رفعت سے انکار ممکن نہیں۔ فی زمانہ مادی عیش و آرام اور جلبِ زر کو جو اہمیت مل گئی ہے۔ اس سے ہر ذی ہوش فنکار متنفر ہے۔ دولت کا لالچ اُسی کے بل پر رشتوں کا بنا یا ٹوٹنا ایک ایسا سانحہ ہے جس پر جس قدر نفرین کی جائے کم ہے۔ ڈرامے میں اسی تلخ حقیقت پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔"

(اردو کا یک بابی ڈراما، سیریز3، ص 458-457)

غالب کے جشن صد سالہ کے موقعے پر اردو نثر و نظم میں متعدد تخلیقات منظرِ عام پر آئیں جن میں غالب کی شخصیت، عہد، ماحول اور ان کی نثری و شعری خدمات پر اظہار خیال کیا گیا۔ ابراہیم یوسف کا تحریر کردہ ڈراما: 'مغلوب غالب' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں مرزا غالب کے علاوہ ان کی اہلیہ امراؤ بیگم، نوکر کلو اور کلیانی ملازمہ وفادار، دو گورے، ایک ہندستانی سپاہی اور چند پڑوسیوں کے کرداروں کو 1857 کے انقلاب کے حالات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ ڈرامے میں انگریزوں کے ظلم و جبر، غالب کے بھائی مرزا یوسف کی شہادت اور غالب کے اضطراب کی عکاسی متاثر کن انداز میں کی گئی ہے۔

انگریزوں کے ظلم وستم اور 1857 کی دلی کا نقشہ ملاحظہ کیجیے:

مرزا غالب: (کلو کی طرف دیکھ کر) کیوں میاں کلو کیا خبر لائے، شہر کا کیا حال ہے۔

کلو: دھائیں، دھائیں گولیاں چل رہی ہیں، سرکار! کیا گناہ گار، کیا بے گناہ جو بھی سامنے آتا ہے گولی کا نشانہ بن جاتا ہے۔

مرزا غالب: ارے ہاں، میاں کلو— کچھ کلیان کا پتہ ہے۔

کلو: وہ تو صبح ہی سے لاپتہ ہے سرکار۔ خدا جانے زندہ بھی ہے یا کسی گورے کی گولی کا نشانہ بن گیا ہے۔

اس ڈرامے میں غالب کے مزاج کی فطری بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کو بھی دلچسپ اور فنکارانہ انداز میں ظاہر کیا گیا ہے۔ مرزا غالب کو جب دو گورے پکڑ کر کرنل برون کے سامنے لے جاتے ہیں اور وہ تھوڑی دیر بعد صحیح سلامت گھر واپس آجاتے ہیں تو اس وقت

کا منظر اس طرح بیان کیا گیا ہے:

("... تھوڑی دیر بعد مرزا غالب چہرے پر پریشانی مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے داخل ہوتے ہیں۔ مرزا کو دیکھ کر امراؤ بیگم کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور بے اختیار زبان سے نکلتا ہے)۔"

امراؤ بیگم: خدا تیرا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے (مرزا کی طرف دیکھ کر) آپ کو کوئی صدمہ تو نہیں پہنچا۔

(مرزا گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھ جاتے ہیں اور مسکراتے ہوئے)

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشہ نہ ہوا

بیگم واللہ آج تو مرے آدھے مسلمان ہونے نے میری جان بچالی۔

امراؤ بیگم: خدا را تمسخر کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیے۔ اس وقت تو یہ کلماتِ کفر زبان پر نہ لائیے۔

مرزا غالب: علیؓ کا بندہ ہوں، سچ بیگم! جھوٹ نہیں بولتا، اگر پورا مسلمان ہوتا تو آج احمد بخش خاں کی بھتیجی اور الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی بیوہ ہوگئی ہوتی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(امراؤ بیگم جانے کے لیے مڑتی ہیں) واللہ بیگم کہاں تشریف لے چلیں۔ امر واقعہ تو سنتی جایئے۔

امراؤ بیگم: میں پہلے شکرانے کا دوگانہ ادا کرلوں پھر حاضر ہوتی ہوں۔

مرزا غالب: دوگانہ بھی ادا کرلیجیے گا۔ اب سنیے۔ جب میں کرنل برون کے سامنے پیش ہوا تو اس نے میرے سر پر کلاہِ پپاخ، ایک برکا پاجامہ، سفید ململ کا انگرکھا اور اس پر یہ قبا دیکھ کر کہا: 'ول تم مسلمان ہے' میں نے کہا، 'آدھا، اس پر وہ حیران ہوا اور کہا آدھا کیسا؟ میں نے کہا شراب پیتا ہوں سور نہیں کھاتا۔ وہ مسکرایا اور باعزت رہائی کا حکم دے دیا۔ اب فرمایئے کیا پورے مسلمان کو یہ

سعادت نصیب ہوسکتی تھی؟‘‘

ڈرامے کے مکالمے دلچسپ اور موزوں ہیں اور فنی اعتبار سے بھی یہ ایک معیاری ڈراما ہے۔

ابراہیم یوسف کے ڈراموں کا پہلا مجموعہ ’سوکھے درخت‘ 1952 میں شائع ہوا جس میں چھ یک بابی ڈرامے ’لاش کے گرد‘، ’ایڈیٹ‘، ’خون کی بوندیں‘، ’رات کی کہانی‘، ’چگادڑیں‘ اور ’سوکھے درخت‘ شامل ہیں۔ ان ڈراموں میں متوسط طبقے سے متعلق زندگی کی الجھنوں، بدحالی، ظلم و استحصال اور خانگی مسائل کو طنزیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ڈراما ’لاش کے گرد‘ میں زبیدہ مرکزی کردار کی حیثیت سے، اپاہج بہن اور بیمار ماں کا بوجھ اٹھاتی ہے اور ماں کے مرجانے کے بعد اس کے کفن اور تدفین کے خرچے کے لیے خود ایک سرمایہ دار کی ہوس کا شکار ہوجاتی ہے۔ غریبی، بے بسی، اور انسانی بے چارگی اس ڈرامے کا بنیادی موضوع ہے جسے ڈراما نگار نے دل سوزی اور اثرانگیزی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ڈراما، ’ایڈیٹ‘ میں بھی سماج کی ایسی ہی تصویر پیش کی گئی ہے۔

’خون کی بوندیں‘ فسادات کے موضوع پر لکھا گیا پر اثر ڈراما ہے جس میں انسان کی شرپسند اور متعصب ذہنیت کو فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ڈراما ’چگادڑیں‘ میں ماڈرن سوسائٹی کی بے راہ رویوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ ’سوکھے درخت‘ کا پلاٹ سماج کی اس تلخ حقیقت پر مبنی ہے جس میں بے گناہ اور معصوم نوجوان لڑکیاں اپنی خوشیوں اور آرزوؤں کی قربانی دینے پر مجبور کردی جاتی ہیں۔

مذکورہ بالا ڈراموں کا اسلوب اور مکالمے برجستہ اور پراثر ہیں اور ان کے سبھی کرداروں نے زندگی کے حقیقی رنگ کو کامیابی کے ساتھ نباہا ہے۔

مسائل کی سنگینی اور پیچیدگی کے سبب ابراہیم یوسف کے جن ڈراموں کا اسلوب خالص طنزیہ ہوگیا ہے انھیں، انھوں نے ایک علاحدہ مجموعہ ’طنزیہ ڈرامے‘ (مطبوعہ نسیم بک ڈپو لکھنؤ) میں یکجا کرکے شائع کیا ہے۔ اس مجموعے میں درج ذیل بارہ ڈرامے ’حیوان‘، ’بزدل‘، ’شاہدہ‘، ’وہ ایک نرس تھی‘، ’گونگے کے خواب‘، ’جمہور کے ابلیس‘، ’بیگم صاحبہ‘،

'مقابلے اور فیصلے'، 'مرکز کی طرف'، 'چھ سال بعد'، 'دم ثم' اور 'ایک حمام میں' شامل ہیں۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے مذکورہ بالا تمام ڈراموں کا اسلوب خالص طنزیہ ہے۔ ڈراموں میں طنزیہ اسلوب کا استعمال، آسان کام نہیں ہے۔ ابراہیم یوسف نے ڈرامائیت کو برقرار رکھتے ہوئے طنزیہ اسلوب کو کامیابی کے ساتھ اس طرح برتا ہے کہ نہ تو ڈرامائیت مجروح ہوئی ہے اور نہ ہی طنز کی کاٹ میں کمی واقع ہوسکی ہے۔ بلکہ طنزیہ اسلوب ان ڈراموں کا ایک اضافی وصف بن گیا ہے۔ بطور نمونہ چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

ڈراما 'شاہدہ' میں جب نصیر کہتا ہے: ''یہ بہکی بہکی باتیں نہیں ہیں، میری عزت نفس کا سوال ہے۔'' تو شاہدہ طنزیہ انداز میں جواب دیتی ہے:

''شاہدہ: عزتِ نفس! کس قدر خوبصورت لفظ تراشے ہیں حضرتِ انسان نے خود کو دھوکا دینے کے لیے (طنزیہ) عزتِ نفس، خودداری، عظمتِ انسانی اور جانے کیا کیا — اور ان سب کے لیے میرے پاس ایک لفظ ہے — ظاہرداری۔''

ڈراما 'اس حمام میں' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ہماری بدعنوان سوسائٹی کا منظرنامہ جس طرح پیش کیا گیا ہے وہ قابلِ مذمت ونفرین بھی ہے اور باعثِ عبرت و تاسف بھی! اس ڈرامے میں رمیش اور سریش جہاں اپنی شیطانی حرکات سے پورے ماحول کو داغ دار بنا دیتے ہیں وہیں کشور اور رادھا کے کردار اپنی مجبوریوں اور حالات کا شکار ہونے کے باوجود، اپنے ضمیر پر لبیک کہتے نظر آتے ہیں۔

ابراہیم یوسف کے ڈراموں کا ایک مجموعہ 'پانچ، چھے ڈرامے' کے نام سے شائع ہوا ہے جس میں بظاہر چھ ڈرامے 'ٹوٹے ہوئے خوابوں کا درماں'، 'ڈاکٹر تمکین کی الجھن'، 'دہکتے انگارے، گرتی برف'، 'اندھیری رات کا جگنو'، 'اداس راہی اداس راہیں' اور 'ایک پہیلی' شامل ہیں لیکن ابراہیم یوسف نے اس مجموعے کا عنوان 'پانچ چھ ڈرامے' قائم کرکے قارئین کے لیے بھی ایک سوال کھڑا کردیا ہے۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے مذکورہ بالا مجموعے کے پیش لفظ میں اس طرح وضاحت کی ہے کہ:

''یہ ڈرامے اپنی نوعیت کے اعتبار سے تجرباتی ڈرامے ہیں۔ تجرباتی

اس لحاظ سے کہ ان میں وہ روایتی تصادم نہیں ہے جو ڈرامے کے لیے مخصوص اور لازمی قرار دیا جاتا ہے۔ ان ڈراموں میں افراد کے درمیان تصادم نہیں ہوتا بلکہ فرد اپنی ذات کے اندر خود سے جھگڑتا اور داخلی کشمکش میں مبتلا نظر آتا ہے۔۔ اور اسی داخلی کشمکش سے ڈراما اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ جاتا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ ڈرامے صرف کرداری ڈرامے ہیں۔''

ڈراموں کے اس مجموعے پر ڈاکٹر محمد حسن نے اپنے ادبی رسالہ 'عصری ادب' پریل تا اکتوبر 1980) میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

''ابراہیم یوسف اردو کے ان گنے چنے کامیاب ڈراما نگاروں میں ہیں جن کو ڈرامے بُننے کا فن آتا ہے۔ پلاٹ میں حیرت و استعجاب اور ڈرامائی کشمکش کے لیے نئے پہلو پیدا کرتے چلے جاتے ہیں اور سب کچھ ایسی ہنرمندی اور بے اختیار طور پر کرتے ہیں کہ آورد کا شبہ نہیں ہوتا۔ ان مختصر ڈراموں میں ابراہیم یوسف نے انسانی زندگی اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو کشمکش اور آویزش کے بنیادی نقاط پر اسیر کرلیا ہے اور انھیں چابکدستی اور فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اردو ڈرامے کے سنجیدہ طالب علم کے لیے ان کا مطالعہ دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔''

ابراہیم یوسف کے مجموعے 'اداس موڑ' (مطبوعہ نئی آواز نئی دہلی 1982) میں سات یک بابی ڈرامے 'پیرول پر رہائی'، 'افشاں یا نورافشاں'، 'موت سے پہلے آدمی'، 'تصویر اور جھوٹ'، 'تمانچہ'، 'خطوط کی واپسی' اور 'قدم قدم اداس موڑ' شامل ہیں۔ ان ڈراموں کے کرداروں کی نفسیات اور ان کے موضوعات سے متعلق ابراہیم یوسف لکھتے ہیں:

''چاند کے سنگ ریزے بٹورنے اور خلاؤں کا سینہ چیرنے پر فخر کرنے والا انسان اندر سے خود کتنا دکھی اور ٹوٹا پھوٹا ہے، یہی ان

ڈراموں کا موضوع ہے۔ خلاؤں کی تاریکیوں میں وہ اس طرح
کھوگیا کہ اپنے مسائل اور اپنے غموں کو بھول گیا ہے یا پھر ان کی
طرف توجہ دینے کی اسے فرصت نہیں۔ وہ اپنے دکھوں کو اپنے
کاندھوں پر اٹھائے پھرنے سے مطمئن ہے یا پھر انھیں قسام ازل کا
تحفہ سمجھ کر بطور مقدر قبول کر چکا ہے۔ان ڈراموں کا ہر کردار سوال
کرتا ہے''کیا آپ کے پاس ہمارے درد کا درماں ہے؟ اور کہتا ہے
کہ آپ ہمارا مقدر یا نفسیاتی کیفیت کہہ کر ہمیں مطمئن نہیں کر سکتے۔
یہ سب کچھ آپ کا دیا ہوا ہے۔آپ ہی کو اس کا علاج کرنا ہوگا۔کیا آپ
کے پاس ہمارے دکھوں کا علاج ہے؟ کیا یہ انسان کی زندگی کا سب سے
بڑا المیہ نہیں ہے کہ وہ اپنے دکھوں کے علاج سے گریز کرتا ہے؟''

افسانی مسائل و معاملات کے تئیں ابراہیم یوسف کی یہ فکرمندی ان کی انسان دوستی، دانش مندی، عصری آگہی کا نہ صرف بین ثبوت ہے بلکہ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ذمے دار، حساس اور باشعور ڈراما نگار تھے اور انھوں نے فن ڈراما کو انسانی زندگی اور سماج کے مختلف النوع مسائل کی ترجمانی کے لیے برتا تھا۔

ابراہیم یوسف کے ڈراموں کے مطالعے سے قاری ایک خاص نوع کی بصیرت وشعور سے ہم کنار ہوتا ہے۔ غالباً ڈراما نگار کا مقصد بھی یہی تھا۔

'پرچھائیوں کا پیچھا' ابراہیم یوسف کے ڈراموں کا ساتواں مجموعہ ہے جس میں چار ڈرامے: 'نالائق'، 'پرچھائیوں کا پیچھا'، 'راوی چین لکھتا ہے' اور 'روپ متی' شامل ہیں۔ ڈراما 'پرچھائیوں کا پیچھا' رویندر بھون بھوپال میں کامیابی سے اسٹیج کیا گیا تھا۔'روپ متی' تاریخی ڈراما ہے جو کہ 19 ویں صدی کی ڈرامائی تکنیک پر لکھا گیا ہے جس میں مانڈو کا رومانی ماحول، فطری حسن، جنگ کا تباہ کن ماحول، روپ متی اور باز بہادر کی مثالی محبت اور روپ متی کے ایثار کو تاریخی پس منظر میں موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ابراہیم یوسف ماہر، تجربہ کار ڈراما نگار تھے۔ وہ ڈرامے کی تکنیک سے پوری طرح

واقف تھے۔ اچھے معیاری اور کامیاب ڈرامے کی خصوصیات سے متعلق پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا تھا:

''ڈرامے کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک اس کا تمثیلی پہلو دوسرا ادبی... ڈرامے کی خوبی یہ ہونا چاہیے کہ وہ بغیر کسی دقت کے اور کم سے کم سرمایہ سے اسٹیج کیا جاسکے۔ ...ڈراما نگار کے خیال کو بحسن و خوبی پیش ہونا سب سے بڑی خوبی ہے... میرے نزدیک اچھے ڈرامے کے لیے نہ صرف اچھے موضوع کا انتخاب ضروری ہے بلکہ موضوع ایسا ہونا چاہیے جس میں شدید کشمکش اور تصادم کے زیادہ سے زیادہ مواقع ہوں۔ انسانی جذبات اور احساسات کا بھرپور احساس ہوسکے۔ ایکٹر کے لیے عمل اور حرکات کی زیادہ سے زیادہ گنجائش ہو اور ڈائرکٹر کے لیے ایسے مواقع ہوں کہ وہ فنکارانہ طور پر ڈراما نگار کے مافی الضمیر کو بخوبی سمجھنے اور پیش کرنے میں کوئی عملی دقت محسوس نہ کرے... ڈرامے میں غیرضروری کردار نہ ہونا چاہیے... طویل مکالمے ڈرامے کو تباہ کردیتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر کم سے کم اور مختصر سے مختصر مکالموں کا قائل ہوں.... ایک خاموش سین ایک مکالماتی سین کے مقابلے میں کہیں زیادہ متاثر کرتا ہے... مکالموں کی زبان عام فہم اور پراثر ہونا چاہیے۔''

(ماخوذ: ماہنامہ 'شاعر' بمبئی گوشۂ ابراہیم یوسف)

ابراہیم یوسف کے بیشتر ڈرامے مذکورہ بالا خصوصیات کے حامل ہیں۔ ان کے یک بابی ڈراموں میں زمان و مکان اور تاثر ہر لحاظ سے وحدت کے نمونے کو پیش کرنے کی کوشش ملتی ہے۔

ابراہیم یوسف نے عام طور پر سادہ، سلیس اور عام فہم زبان استعمال کی ہے لیکن محل وقوع کے اعتبار سے حسبِ ضرورت فلسفیانہ، عالمانہ اور شاعرانہ زبان کا استعمال بھی ان

کے یہاں ڈرامے کو ایک نئی آب و تاب عطا کرتا ہے۔ مثلاً: گناہ کے سلسلے میں مختلف کرداروں کی زبانی مختلف فلسفیانہ خیال کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں:

''پروفیسر: گناہ وہ ہے جو کیا نہ جاسکے۔ جو کیا جاسکے وہ گناہ نہیں... وہ ایک رنگین خواب بن جاتا ہے۔

ثروت: .... میں گناہ اس کو سمجھتا ہوں کہ ہم کسی کام کے کرنے اور نہ کرنے کی کشمکش میں مبتلا رہیں۔

شہزادی: میں گناہ اس بازی کو سمجھتی ہوں جس میں انسان داؤ لگائے، ہارے جیتے، جیتی ہوئی بازی گناہ نہیں ہوتی۔

نکہت: میں گناہ وہی سمجھتی ہوں جس کو چھپایا جائے۔'' (ڈراما 'بہشتِ ارضی')

ڈرامے کی زبان میں ڈرامائیت اشاریت اور دلچسپی کا ہونا ضروری ہے۔ ابراہیم یوسف کے یہاں یہ عناصر باہم دگر نظر آتے ہیں۔ ڈرامے کو موثر بنانے کے لیے انھوں نے سچویشن کے اعتبار سے کہیں کہیں شاعرانہ انداز بھی اختیار کیا ہے۔ مثلاً

''عشرت: سچ مچ! میں نے دیکھا جیسے دنیا ایک انگڑائی لے رہی ہے۔ ہر طرف شادابی ہے، حسن ہے، بہاریں ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے جیسے مالوہ کی رات اور بنارس کی صبح ایک سنگم پر آگئی ہے۔ نغموں کا ایک دریا ہے جس نے فضا کو مسحور کردیا ہے۔ ایک حسین جادو ہے جس کی آغوش میں ساری دنیا سمٹ آئی ہے جہاں سدابہار پھول کھلے ہیں جنھوں نے فضا کو معطر کردیا ہے۔ کلی کے چٹکنے پر قہقہے بلند ہوتے ہیں۔ پہاڑوں سے ایک ندی محبوبہ کی طرح اٹھلاتی چلی آرہی ہے جس کے سنگ ریزوں میں ہیروں کی تابانی ہے اور اسی کنارے پر میں کھڑا ہوں۔'' (ڈراما: 'میرے خواب')

تاریخی ڈراما 'مانڈو کا پھول' میں مصاحب خاں کی زبانی روپ متی کے حسن بے مثال اور کمال فن کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ باز بہادر، روپ متی پر نادیدہ عاشق ہوجاتا ہے۔

''مصاحب خاں: جہاں پناہ! یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے۔ یہ ایسی سچائی ہے جیسے ہم روز سورج کو

طلوع ہوتے دیکھتے ہیں۔ جب وہ ستار پر کوئی دھن چھیڑتی ہے تو ہرن کلیل کرنا بھول جاتے ہیں۔ پانی کی لہریں اس کو سر اٹھا اٹھا کر دیکھتی ہیں۔ طاؤس اپنا رقص بھول جاتا ہے۔ فضا ساکت ہوجاتی ہے۔ جہاں پناہ... اس کی انگلیاں مخروطی ہیں، آنکھیں نرگسی ہیں، زلفیں شبِ فرقت سے دراز ہیں، گردن صراحی دار ہے۔ اس کے دانت الماس کی طرح، پیشانی ہلال کو شرماتی ہے، ابرو دودھاری تلوار ہیں، عارضِ رنگیں سے گلاب شرماتا ہے۔ اگر وہ اپنا جوڑا کھول دے تو دنیا میں اندھیرا ہوجائے۔''

حالات کی نامساعدت اور مسائل کی سنگینی اور تلخی کے سبب ابراہیم یوسف کے ڈراموں میں اکثر جگہ طنز و نشتریت کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ انھوں نے خالص طنزیہ ڈرامے بھی لکھے ہیں اور ان کے غیر طنزیہ ڈراموں میں بھی یہ عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ جس کے سبب انھیں ایک کامیاب ڈراما نگار ہی نہیں اچھا طنز نگار بھی کہا جاسکتا ہے۔ اپنی بات کو موثر بنانے یا موضوع سے انصاف کرنے کی خاطر اکثر جگہ وہ طنز و نشتریت کا سہارا لیتے ہیں اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ ان کے طنز کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ وہ ایک مشاق جراح کی طرح سماج اور افراد کے رگ و پے میں طنز کے نشتر چبھو کر اپنے مقصد کے حصول کی تکمیل کرتے ہیں۔ ان کے طنز کا وار بڑا کاری ہوتا ہے۔ مثلاً ڈراما 'معمار' میں دھنا اپنے دل کا غم اس طرح ظاہر کرتا ہے:

''.....مردوں کے لیے تاج محل بنتے ہیں اور جندوں کو جھونپڑیاں نہیں ملتیں۔ تاج بی بی کا روجہ دیکھنے لوگ دوردیسوں سے آتے ہیں مگر گریبوں کی جھونپڑیوں میں کوئی جھانک کر نہیں دیکھتا۔ یہی دھرم ہے نا بھگوان کا... یہی نیائے ہے؟''

''وہ..... بہت مقدس! تم اس کو کوٹھے پر لے جاکر بٹھا دیتے ہو اور پھر..... اور پھر خود ہی گاہک بن کر پہنچ جاتے ہو—''

(ڈراما: کردار کا کردار)

''پاکیزہ: ..... ڈاکٹروں کو جب تک فیس ملتی رہتی ہے وہ ناامید نہیں
ہوتے۔'' (ڈراما: صنم کدے)

کیونکہ ابراہیم یوسف کے ڈراموں میں موضوعات و مسائل کا تنوع ملتا ہے۔ اس لیے ان کے کرداروں کے مزاج و ماحول میں یکسانیت پیدا نہیں ہوسکی ہے۔ انھوں نے ہر طبقہ، فرقے، عمر، پیشے اور ماحول سے متعلق کرداروں کی روزمرہ زندگی کے مسائل کو اپنے ڈراموں کا موضوع بنایا ہے اور سنجیدہ، المیہ، طربیہ، جذباتی، معاشرتی، اصلاحی، مقصدی اور نفسیاتی ہر طرح کے تاثر کو ظاہر کرنے کے لیے ڈرامے تحریر کیے ہیں۔ ان کے ڈراموں کے کردار حقیقت سے قریب نظر آتے ہیں۔ ابراہیم یوسف کی ڈراما نگاری سے متعلق ڈاکٹر سید حامد حسین کی یہ رائے درست ہے کہ:

> ''ابراہیم یوسف نے نہ کبھی بت شکنی کا دعویٰ کیا اور نہ کبھی انھیں نئے بت تراشنے کا زعم رہا۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے اردو کے ایک بابی ڈرامے کو عہد جدید کے رجحانات کو قبول کرنے کا اہل بنایا ہے۔ انھوں نے ایک ایکٹ کے تنگ پیمانے میں انسانی ذہن و دماغ کی کشمکش کو سمیٹ کر پیش کرنے کے کامیاب تجربے کیے ہیں... اور یہ واضح کردیا ہے کہ ڈراما اپنی دلچسپی کے لیے خارجی زیبائش، ظاہری کشمکش، سنسنی خیزی اور شعبدہ کاری کا مرہونِ منت نہیں۔ خود انسانی زندگی اپنے دامن میں جو مسائل سمیٹے ہوئے ہے وہی داستانِ حیات کو دلکش بنانے کے لیے کچھ کم نہیں ہے..... انھوں نے اپنے تین سو سے زیادہ ڈراموں کے ذریعے یہ واضح کردیا ہے کہ ہماری روزمرہ کی گرد و پیش کی زندگی میں ڈرامائی موضوعات کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اصل ضرورت فنی بصیرت کی ہے۔''
>
> (ابراہیم یوسف کی ڈراما نگاری ماہنامہ 'شاعر' بمبئی جلد46، شمارہ11، 1975)

جیسا کہ لکھا جاچکا ہے، ابراہیم یوسف نے ڈراما نگاری کے علاوہ ڈرامے کے آغاز و ارتقا،

فن، اصول اور تکنیک پر بھی مضامین اور کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان کی کتاب 'اندر سبھا اور اندر سبھائیں' (مطبوعہ نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، 1980) موضوع کی اہمیت اور جامعیت کے اعتبار سے ان کا اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ دو حصوں پر مشتمل اس تحقیقی کتاب کے پہلے حصے میں اندر سبھاؤں کے پس منظر، محرکات اور ان کی فنی اور تاریخی اہمیت، لوک ناٹک اور اندر سبھا امانت، ام التمثیلات اندر سبھا امانت، اندر سبھا امانت اور اندر سبھا مداری لال، زمانی تقدم کا مسئلہ، ماہ منیر معروف بہ اندر سبھا مداری لال اور دو قدیم اندر سبھائیں (الف) بزم سلیمان (ب) جشن پرستان کا تعارف اور تجزیہ نہایت تحقیقی ژرف نگاہی اور تنقیدی بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے جب کہ کتاب کے دوسرے حصے میں مذکورہ بالا چاروں اندر سبھاؤں کے متن کو زمانی ترتیب کے ساتھ اصل مسودے کی روشنی میں ترتیب دے کر، ضمیمہ نمبر 1 اور ضمیمہ نمبر2 میں مختلف تھیٹریکل کمپنیوں کے ذریعے کھیلی گئیں مختلف اندر سبھاؤں کی تفصیل پیش کی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ نہایت وقیع اور اہم کام ہے جس کے مطالعے سے ابراہیم یوسف کی تحقیقی دروں بینی، علمیت، ریاضت اور فنی صلاحیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ بقول ظ انصاری:

> ''اندر سبھا گزشتہ صدی کے وسط میں ہمارا اولین اوپیرا (Opera) ہے جو رہس کے بعد اودھ کی گنگا جمنی تہذیب کی ساری نفاست اور کثافت لیے ہوئے نمودار ہوا تھا۔ نوٹنکی کے عوامی اسٹیج کے بعد کی اور موجودہ ڈرامے سے پہلے کی یہ ایک درمیانی سیڑھی ہے جس سے تہذیبی منظر اور لسانی نقشے تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے..... ابراہیم یوسف نے اس موضوع پر بڑا قابلِ قدر کام کیا ہے۔''
>
> (ماخوذ: 'کتاب شناسی'، اگست 1981، ص 35)

حقیقت یہ ہے کہ 'اندر سبھا اور اندر سبھائیں' ایک علمی تصنیف ہی نہیں ہے بلکہ ڈرامے کی تنقید میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

ابراہیم یوسف کا مرتب کردہ 'صولت عالم گیری' اردو کا ایک قدیم، تاریخی ڈراما ہے جسے

مولوی سید ابوالفضل الفیاض نے 1292 ہجری مطابق 1871 میں لکھا تھا۔ لیکن دست و برد زمانہ کے ہاتھوں اس کا متن عام طور پر دستیاب نہیں تھا۔ ابراہیم یوسف نے اسے مرتب کر کے اور اس پر طویل مقدمہ تحریر کر کے ادارۂ ادب اردو، علوی بک ڈپو بمبئی سے 1976 میں کتابی صورت میں شائع کرا کے اردو ڈراما کے شائقین کے لیے بطور تحفہ پیش کیا ہے۔

اگر چہ یہ اردو کا پہلا ڈراما نہیں ہے لیکن اردو کے اس قدیم ڈرامے سے متعلق فصیح احمد صدیقی کی یہ رائے صحیح ہے کہ:

> ''صولت عالم گیری کو بھی اردو کا پہلا دستیاب شدہ ڈراما نہیں کہہ سکتے تاہم اس کی اہمیت اس لحاظ سے بہت بڑھ جاتی ہے کہ یہ ڈراما 1843 تا 1857 کے درمیانی عہد کی ایک درخشاں کڑی ہے... چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ 'رادھا کنھیا کا قصہ' کے بعد اردو ڈرامے کی ایک قابلِ توقیر اور سائنٹفک صورت صولت عالمگیری میں ہی نظر آتی ہے۔''
>
> (سخن ہائے گفتنی، مشمولہ: صولت عالمگیری، مرتبہ: ابراہیم یوسف)

ابراہیم یوسف صولت عالم گیری کو اردو کا پہلا یورپی طرز کا ڈراما تسلیم کرتے ہیں۔ انھوں نے 'صولت عالمگیری' میں شامل اپنے مقدمے میں اردو کا پہلا ڈراما اور ابتدائی دور کے اہم اردو ڈراما پر بحث کرتے ہوئے ڈراما اور ناٹک کو ایک ہی چیز ماننے پر اصرار کیا ہے۔ ڈراما 'صولت عالم گیری' سے متعلق ان کا خیال ہے:

> ''میں نے اپنے مضمون مطبوعہ 'شاعر' بمبئی مارچ 1974 میں 'صولت عالمگیری' کو قدیم ڈراما لکھا ہے اور اب بھی پہلا طبع زاد ڈراما کہنے کے مقابلے میں قدیم ڈراما کہنا ہی مناسب سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اگر اس کو پہلا طبع زاد ڈراما تسلیم نہ بھی کیا جائے تو اس سے اس کی اس خوبی پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ یہ خالص یورپی انداز کا لکھا ہوا پہلا اردو ڈراما ہے۔''

'ہندی ڈرامے کا ارتقا' (ویدک دور سے 1948 تک) (مطبوعہ مدھیہ پردیش اردو

اکادمی 1985:

ابراہیم یوسف کو محض یہی احساس نہیں تھا کہ اردو ڈرامانگاری پر خاطرخواہ کام نہیں ہوا ہے بلکہ انھیں اس بات کا بھی ملال تھا کہ اہل اردو سنسکرت، ہندی، بنگلہ اور ہندوستان کی دیگر علاقائی زبانوں کے ڈرامائی ادب سے اس لیے بے خبر یا ناواقف ہیں کہ اردو میں مذکورہ بالا زبانوں کے ادب خصوصاً ڈرامائی ادب پر کوئی تحقیقی یا تعارفی کام نہیں ہوسکا ہے۔ ابراہیم یوسف کا خیال تھا کہ اردو کے ڈرامائی ادب کی روایت اور صورت حال کو سمجھنے اور اس کے معیار و مزاج سے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ قدیم ہندوستانی زبانوں اور اردو کی معاصر زبانوں کے ڈرامائی ادب کو پرکھا اور سمجھا جائے۔ چنانچہ مذکورہ بالا کتاب اسی مقصد کے حصول کے لیے قلمبند کی گئی ہے۔ کتاب کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں ابتدائی صفحات میں 'عرضِ مصنف' کے عنوان سے ابراہیم یوسف نے لکھا ہے:

> ''اردو ڈرامے کی طرف توجہ نہ دینا تو اردو میں روایت بن گئی ہے لیکن اسی کے ساتھ دوسری زبانوں کے ڈرامائی ادب کی طرف بھی کم توجہ دی جاتی ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ بالکل توجہ نہیں دی جاتی تو کچھ غیر مناسب نہ ہوگا۔ مراٹھی، گجراتی، اور بنگالی زبانوں میں اچھا ڈرامائی ادب موجود ہے لیکن وہ حضرات جو صرف اردو سے واقف ہیں اور اردو ہی کے ذریعے دیگر زبانوں کے ادب سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کو دوسری زبانوں کے ڈرامائی ادب سے کوئی واقفیت نہیں ہوتی۔ سنسکرت میں دنیا کا بہترین ادب موجود ہے مگر اردو میں سنسکرت ڈرامے کی کوئی تاریخ موجود نہیں ہے۔ چند بکھرے ہوئے مضامین ہیں اور وہ بھی... رسائل کے اوراق میں دفن ہوکر رہ گئے ہیں۔ یہی حالت ہندی ڈرامے کے بارے میں ہے۔ شاید ہی اردو میں ہندی ڈرامے کے بارے میں کچھ لکھا گیا ہو اور اگر لکھا گیا ہے تو وہ کم از کم میری نظر سے نہیں گزرا۔ یہ حقیر سی کوشش

اسی سلسلے میں ہے کہ اردو داں حضرات سنسکرت اور ہندی ڈرامے
کے بارے میں معلومات حاصل کرسکیں۔"

مذکورہ بالا کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں 'ابتدائیہ' کے عنوان سے مختلف قدیم ملکوں اور زبانوں میں ڈرامے کے آغاز و ارتقا کے علل و اسباب پر تحقیقی استدلال کے ساتھ اظہار خیال کیا گیا ہے اور ناٹک کی ہندستانی روایات، ناٹیہ شاستر، روپک، اپ روپک اور ناٹک کے اجزائے ترکیبی پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں ہندستانی ناٹک کے عہد بہ عہد ارتقا مثلاً ناٹک کے ویدک دور، پراکرت ڈراما، سنسکرت ڈراما اور اہم ڈراما نگاروں پر تبصرہ کرتے ہوئے سنسکرت ناٹک کے زوال کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرا باب، لوک ناٹک، جاترا یاترا ناٹک اور وانگ سے متعلق ہے جب کہ چوتھے باب میں ہندی ناٹک اور اس کے مختلف ادوار اور اہم ناٹک کاروں کے ناٹکوں کا جائزہ پیش کرتے ہوئے ہندی رنگ منچ، ہندی رنگ منچ کے چند ناٹک کار اور ہندی میں ایکانکی ناٹک پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ اس طرح اس کتاب کے مطالعے سے سنسکرت اور ہندی ناٹک کی پوری تاریخ، اس کی فنی خصوصیات، موضوعات اور پیش کش کا بخوبی علم ہوجاتا ہے۔

ابراہیم یوسف نے یہ کام فرض کفایہ کے بطور انجام دے کر اردو والوں کے لیے تحقیق وتنقید وتفہیم کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ کتاب کے آخر میں کتابیات کے علاوہ ڈرامے کی مصطلحات اور ڈراما نگاروں کے ناموں کا اشاریہ بھی شامل اشاعت ہے۔ اس اعتبار سے اپنی نوعیت کا یہ ایک ایسا اہم، وقیع اور منفرد تحقیقی کام ہے جس کے لیے آنے والی نسلیں استفادہ کرکے ڈرامائی ادب میں خاطر خواہ اضافہ کرتی رہیں گی۔

'گم شدہ خط' دراصل رومانیہ کے معروف حقیقت نگار ڈراما نویس یان لیوکا کرجیل (Ion Luca Caragiale) کا ڈراما 'A Lost Letter' (1884) کا اردو ترجمہ ہے جسے ابراہیم یوسف نے اردو میں منتقل کیا اور جولائی 1978 میں نسیم بک ڈپو، لکھنؤ نے اسے شائع کیا۔ اردو میں ترجمہ شدہ اس ڈرامے کے آغاز میں ابراہیم یوسف نے تعارف کے عنوان سے نہ صرف اصل ڈراما نگار کی شخصیت اور ادبی خدمات کا تعارف کرایا ہے بلکہ مذکورہ بالا

ڈرامے کے موضوع، فن، تکنیک، اسلوب پر بھی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

"کرہجیل کی تخلیقات رومانین ادب میں کلاسک ہی نہیں بلکہ قوم کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اس کی تصانیف کے نمایاں خد و خال اس کی حقیقت نگاری، اس کا اندازبیان اور اس دور کی صحیح اور کامیاب ترجمانی ہے۔ اس کی تحریروں میں اس زمانے کے سماج، مختلف سماجی طبقوں ان کے احساسات و جذبات ان کا اندازفکر اور ان کی دلچسپیاں نمایاں طور پر ظاہر ہوتی ہیں... اپنی غیرمعمولی ذہانت اور انداز بیان سے کرہجیل نے نہ صرف سوسائٹی کا نقشہ ہی کھینچا بلکہ اس دور کی ناانصافیوں اور ظلم وستم کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ یہ عظیم فنکار ایک طرف تو اعلیٰ طبقے کی بدعنوانیوں اور ظلم وستم پر بھرپور وار کرتا ہے اور دوسری طرف عوام سے والہانہ محبت کرتا ہے جن کو وہ حقیقی آقا اور تخلیق کا منبع قرار دیتا ہے۔ ان کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتا ہے۔ یہ عظیم مصنف کسی ایک زمانے کا نہیں بلکہ ہر زمانے کا فنکار ہے۔ اس کی تصانیف لافانی ہیں... کرہجیل کی تخلیقات میں فن کا ترقی پسندانہ نظریہ ملتا ہے، حقیقت نگاری ہے، جمہوری نظریات ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ بڑے فنکار کے لیے حقیقت نگاری سب سے اہم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک حقیقت پسند فنکار کو مسلسل اپنے زمانے کی برائیوں سے لڑتے رہنا چاہیے۔"

اردو میں ترجمہ شدہ 'گمشدہ خط' کے سلسلے میں ابراہیم یوسف نے لکھا ہے:

"اصل ڈرامے میں کوئی تحریف یا اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ترجمے میں کوئی الجھاؤ یا پیچیدگی پیدا نہ ہو۔ عام فہم اور سلیس ہو۔"

بلاشبہ ابراہیم یوسف نے ایک عالمی شہرت یافتہ اہم ڈرامانگار اور اس کے شاہ کار ڈرامے سے جس طرح اہلِ اردو کو متعارف کرایا ہے، اس کے لیے وہ تعریف و تحسین کے مستحق ہیں۔

'اردو کے اہم ڈراما نگار (متقدمین، متوسطین) اور (آغا حشر)': مذکورہ بالا عنوان سے ابراہیم یوسف نے تین کتابیں لکھیں جنھیں علی الترتیب 1981، 1984 اور 1982 میں مالوہ پبلشنگ ہاؤس، بھوپال نے شائع کیا۔ اول الذکر کتاب یعنی اردو کے اہم ڈراما نگار (متقدمین) میں اردو کے چھ اہم قدیم ڈراما نگار: نسروان جی مہروان جی آرام، محمود میاں رونق، محمد الف خاں حباب، حافظ محمد عبداللہ، کریم الدین مراد اور حسینی میاں ظریف کے نام شامل ہیں۔ اس کتاب کے دوسرے حصے یعنی متوسطین میں اردو کے تین اہم ڈراما نگار ونایک پرشاد (طالب) سید مہدی حسن احسن لکھنوی اور پنڈت نرائن پرشاد بے تاب اور تیسرے حصے میں آغا حشر کے حالات زندگی اور ان کی ڈراما نگاری پر نہ صرف اظہار خیال کیا ہے بلکہ ڈرامے کے پیش رو محققین و ناقدین کی غلطیوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔

مذکورہ بالا تینوں کتابوں میں شامل مواد ایسا اہم تحقیقی کام ہے جسے ابراہیم یوسف نے ڈرامے کے فن ارتقا اور اردو ڈراموں کے عمیق مطالعے کے بعد انجام دیا ہے۔ اس کے مطالعے سے ڈرامے سے متعلق ابراہیم یوسف کی غیر معمولی معلومات اور تحقیقی، تنقیدی نیز تجزیاتی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا کتابی سیریز کے پہلے جز یعنی 'متقدمین' کے ابتدائی صفحات میں ابراہیم یوسف نے بعنوان 'ابتدائی ڈراموں کے بارے میں' 28 صفحات پر مشتمل جو تحریر شامل کی ہے اس نے اس وجہ سے اردو کے قدیم ڈراموں سے متعلق ایک دستاویزی حیثیت اختیار کر لی ہے کہ اس میں ابراہیم یوسف نے اردو ڈراما کے مختلف مسائل سے متعلق بہت ہی غلط فہمیوں اور مفروضات کا جواب براہین اور دلائل کے ساتھ دیا ہے۔

ابراہیم یوسف اگرچہ جہانگیر جی پسعن جی کھمباتا کے اس دعوے سے متفق ہیں کہ 'بمبئی اور پورے ہندوستان میں اردو ناٹکوں کو پارسیوں ہی نے پھیلایا تھا، لیکن کھمباتا کے اس خیال کو صحیح نہیں سمجھتے ہیں کہ ''اردو ناٹک کا پہلا مصنف بھی پارسی تھا۔''

اس ضمن میں ابراہیم یوسف کا خیال ہے کہ:

''مسٹر کھمباتا کا یہ دعویٰ کہ اردو ناٹکوں کو پورے ہندوستان میں

پارسیوں نے پھیلایا حقیقت پر مبنی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ ان کی
خدمات تجارتی نقطۂ نظر سے میکانکی اور کرتبی اسٹیج کے لیے زیادہ تھیں
اور اصل ڈرامے کے لیے کم۔" کھباتا کے ثانی الذکر دعوے کو وہ
پورے طور پر اس لیے تسلیم نہیں کرتے ہیں کہ بقول ان کے: "اردو
کے پارسی ڈراما نگاروں اور ان کے ابتدائی ڈراموں کی تاریخ تاریکی
میں ہے اور جو کچھ ہے وہ الجھن پیدا کرنے کے لیے کافی ہے۔"

اسی طرح ڈراما 'رستم و سہراب' اور 'خورشید' سے متعلق تراجم نیز تحقیقی تنقیدی کاموں سے پیدا ہونے والی غلط فہمیوں سے بھی ابراہیم یوسف نے پردہ اٹھایا ہے اور حقائق کی روشنی میں اپنے دلائل پیش کیے ہیں۔ ابراہیم یوسف نے اردو کے ابتدائی ڈراموں میں استعمال ہونے والی زبان سے متعلق پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی تحقیقی اور لسانیاتی استدلال کے ساتھ کیا ہے۔

اردو کے ابتدائی ڈراما نگاروں کے حالات زندگی سے متعلق ڈرامے کے محققین اور ناقدین میں خاصا اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ ابراہیم یوسف نے اس مشکل اور پیچیدہ کام کو حل کرنے یا پیدا شدہ اختلافات کو حقائق سے ہم کنار کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

اردو ڈراما نگاری کی تاریخ کے ادوار سے متعلق بھی خلط مبحث عام ہے۔ ابراہیم یوسف نے منطقی اور تحقیقی طریقۂ کار سے کام لے کر اس مسئلے کو بھی بڑی حد تک سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ اردو ڈرامے کے ادوار اور ان کی بدلتی صورت حال سے متعلق ان کا خیال ہے کہ:

"اردو ڈرامے کا اولین دور اندرسبھائی اثرات کا دور ہے جو کم و بیش
انیسویں صدی کی آخری دہائی تک قائم رہتا ہے۔"

اردو ڈرامے کے دوسرے دور سے متعلق انھوں نے لکھا ہے:

"طالب بنارسی نے جو پودا لگایا تھا اس نے انیسویں صدی کی آخری
دہائی سے پھل دینا شروع کردیا۔ یہ اردو ڈرامے میں ایک نیا موڑ تھا۔
اس موڑ کے ساتھ ہی ایک نیا دور شروع ہوا جس کو ہم اردو ڈرامے کا

> دورِ دوم کہہ سکتے ہیں اور جو اس وقت تک قائم رہا جب تک 1930-32 تک اسٹیج نے فلم کے سامنے ہتھیار نہ ڈال دیے... 1930-32 کے بعد جب اردو ڈرامے کا رشتہ تجارتی تھیٹر سے ٹوٹنے لگا تو اردو ڈراما کالجوں اور اسکولوں کے اسٹیج پر پناہ لینے پر مجبور ہوگیا... کالجوں اور اسکولوں میں یک بابی یا مختصر ڈراموں کی مانگ بڑھی، اس لیے پورے وقت کے ڈراموں کی طرف سے ڈراما نگاروں کی توجہ ہٹ کر یک بابی ڈرامے پر مرکوز ہوگئی۔ اس لیے اس دور کو ہم اردو میں ایک اور رجحان ٹیلی ڈراموں کا پیدا ہوا جس میں ڈرامے خالص ادبی نقطۂ نظر سے پڑھنے کے لیے لکھے گئے اس طرح آہستہ آہستہ اردو ڈرامے کا رشتہ اسٹیج سے ٹوٹ گیا۔ لیکن آزادی کے بعد پھر ڈرامے کی اہمیت بڑھنا شروع ہوئی۔ دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو ڈراما بھی بیرونی ممالک میں چلنے والی تحریکات سے متاثر ہوا اور اردو ڈراما نگاروں نے بھی نئے نئے تجربات کرنا شروع کیے۔"

اردو ڈرامے کے آغاز و ارتقا نیز بدلتی صورتِ حال کے علل و اسباب سے متعلق ابراہیم یوسف نے بہت صحیح تجزیہ پیش کر کے دلائل کے ساتھ اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے انھیں بڑی حد تک قابلِ قبول اور قرینِ قیاس کہا جاسکتا ہے۔

ابراہیم یوسف نے اپنے اس مقدمے میں اردو تجارتی تھیٹر سے وابستہ ڈراما نگاروں کی طویل فہرست میں انتخاب سے کام لے کر، دورِ اوّل کے صرف چھ ڈراما نگاروں (جن کے نام ابتدا میں تحریر کردیے گئے ہیں) کا انتخاب کر کے ان سے متعلق تمام ضروری اور اہم معلومات کو زیرِ نظر کتاب میں پیش کر کے ایک اہم کام انجام دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مذکورہ بالا چھ ڈراما نگاروں کو ہم دورِ اوّل یا اندرسبھائی دور کے ڈرامانویس کہہ سکتے ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصے یعنی (متوسطین) کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے:

''دورِ دوم کی فہرست اور بھی طویل تھی، اس میں چار ڈراما نگاروں
یعنی طالب، احسن، بے تاب اور آغا حشر کا انتخاب کیا گیا۔''

مذکورہ بالا چاروں ڈراما نگاروں کی صحیح تاریخ پیدائش کا علم نہ ہونے کے سبب تقدیم و تاخیر کا مسئلہ پیدا ہوا تو ابراہیم یوسف نے اس مسئلہ کا حل اس طرح نکالا کہ ''جس کا مطبوعہ ڈراما پہلے کا ہے وہ پہلے اور جس کا بعد کا ہے وہ بعد میں اسی ترتیب سے یہاں جگہ دی گئی ہے۔''

دورِ متوسطین کے ڈراموں اور ڈراما نگاروں کے متعلق ابراہیم یوسف نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے:

''اردو ڈرامے کا یہ دورِ متوسطین کا دور ہے جسے بالعموم پارسی تھیٹر کا نام دیا جاتا ہے، جو اردو ڈرامے کا اہم ترین دور ہے۔ پارسیوں نے اردو تھیٹر کو تجارتی بنیادوں پر شروع کیا تھا... ظاہر ہے کہ جب ان کے اس شوق نے تجارتی صورت اختیار کی تو فن کے مقابلے میں حصولِ زر ان کے پیشِ نظر تھا اس لیے اچھے اسکرپٹ کے مقابلے میں انھوں نے ڈرامے میں ان ذرائع کا استعمال کیا جس سے وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے تفریحی جذبات کی تسکین کر سکیں... اس طرح اس دور میں اسکرپٹ ثانوی چیز ہو کر رہ گیا تھا اور ڈراما نگار جن کی حیثیت ملازم کی ہوتی تھی، وہی کچھ لکھنے پر مجبور تھے جس سے مالک کو زیادہ سے زیادہ نفع حاصل ہو سکے۔''

دورِ متوسطین کی صورت حال اور خصوصیات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ابراہیم یوسف نے یہ صحیح لکھا ہے کہ:

''اس دور کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اب اردو ڈراما اندرسبھائی دور سے نکل آیا، اگرچہ اس سے خالص اردو ڈرامے کی موت ہوگئی اور اردو ڈراما اپنا کوئی علاحدہ وجود قائم نہ کر سکا مگر یہ بات ضرور ہوئی کہ اردو ڈرامے میں سماجی مسائل کو جگہ مل گئی.... اردو ڈرامے میں یہ

تبدیلی گزرے ہوئے دور سے ایک خاموش بغاوت تھی جس کے اچھے اثرات آنے والے دور پر پڑے۔ خاص طور پر جب یک بابی ڈراموں کا دور آیا تو یک بابی ڈرامے مسائلی ڈرامے بن کر سامنے آئے جنھوں نے اردو ڈرامے کو ایک وقار بخشا اور سماجی، سیاسی، معاشی، معاشرتی ہر قسم کے مسائل اردو ڈرامے میں پیش کیے جانے لگے۔ نفسیاتی الجھنیں بھی ڈرامے کا موضوع بن گئیں۔ کرداری ڈراموں پر زور دیا جانے لگا اور متوسطین نے جو ایک دھندلی سی راہ دکھلائی تھی آنے والی نسل نے اسے روشن کر دیا۔"

دور متوسطین کے اہم ڈراما نگاروں میں آغا حشر کا نام بھی شامل ہے۔ کیونکہ وہ اس دور کے سب سے اہم اور مقبول ڈراما نگار ہیں اور ان پر سب سے زیادہ لکھا گیا ہے اس لیے ابراہیم یوسف نے ان سے متعلق ایک علاحدہ جلد کا اہتمام کیا۔ 'اردو کے اہم ڈراما نگار' سیریز کی آخری کتاب پورے طور پر آغا حشر سے متعلق ہے جس میں آغا حشر کی شخصیت اور ڈراما نگاری سے متعلق سبھی اہم اور ضروری معلومات پیش کردی گئی ہیں۔ اس جلد کے آخر میں تین ضمیمے بھی شامل ہیں۔ ضمیمہ نمبر 1 میں آغا حشر سے متعلق آغا جمیل کاشمیری کا خط، ضمیمہ نمبر 2 میں آغا حشر کے چند مشہور گانے اور ضمیمہ نمبر 3 میں وہ اپیل شامل ہے جو 'یومِ حشر' منانے کے لیے جاری کی گئی تھی اور جس میں کئی اہم شخصیات کے دستخط تھے۔ یہ ضمیمے اس لیے شامل کیے گئے تاکہ ان کے مطالعے کے بعد آغا حشر کی اہمیت اور مقام و مرتبے کا اندازہ لگایا جاسکے۔

ابراہیم یوسف کی کتاب 'اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ چار ابواب پر مشتمل ہے جس میں اردو ڈرامے کے اہم ناقدین، مبصرین و محققین کی خدمات کے ساتھ ساتھ آزادی سے پہلے اور بعد کے اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی وجہ تسمیہ کے متعلق ابراہیم یوسف نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے:

"اس کتاب کو ترتیب دینے کا مقصد یہ ہے کہ اردو ڈرامے کی تنقید

کے محرکات اور رجحانات ایک جگہ جمع کر دیے جائیں جو ابتدا سے تا
حال کارفرما رہے ہیں۔ چونکہ ہر صنف ادب وقت کے تقاضوں کے
مطابق ہیئت اور موضوعات میں تبدیلیاں قبول کرتی ہے۔ اسی کے
ساتھ تنقید بھی اپنے راستے بدلتی ہے۔ اردو ڈرامے کی تنقید بھی اس
اصول سے مستثنٰی نہیں ہے اس نے بھی گرم و سرد حالات دیکھے ہیں
اور آج بھی ایک بہتر افق کی تلاش میں ہے۔"

اس کتاب میں اردو ڈراما نگاری، اس کے فن اور بدلتے ہوئے اصول نقد پر ایسا سیر حاصل مواد پیش کیا گیا ہے کہ اس کے مطالعے سے نہ صرف پوری تصویر سامنے آجاتی ہے بلکہ ڈراما نگاری سے متعلق ابراہیم یوسف کے وسیع تر مطالعے اور وقیع تر آرا کا بھی علم ہوتا ہے۔

ڈراما نگاری کا فن، اصول، تکنیک اور اردو ڈرامے کی ابتدا و ارتقا اور بدلتی ہوئی صورت حال سے متعلق ابراہیم یوسف کے ذریعے لکھی جانے والی تمام تحقیقی تنقیدی کتابیں، تراجم، ترتیب اور مضامین وغیرہ کے مطالعے سے جہاں فن ڈراما نگاری اور اردو میں ڈراما نگاری سے متعلق کئی اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں، کئی غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں، کئی سوالات کے جوابات مل جاتے ہیں، کئی ٹوٹی ہوئی کڑیاں جڑ جاتی ہیں، ڈرامے میں کیے گئے مختلف تکنیکی اور فنی تجربوں کا علم ہوتا ہے۔ ڈراموں کے صحیح متن کی گتھیاں سلجھتی ہیں، اصلی اور نقلی طبع زاد اور ترجمہ شدہ، اہم و غیر اہم ڈراموں اور ڈراما نگاروں کا پتہ چلتا ہے وہیں ڈرامے کے قدآور ماہرین، محققین اور ناقدین کے ذریعے صادر کیے ہوئے غلط فیصلے، حاصل شدہ غلط نتائج اور پیدا کردہ غلط فہمیوں اور افواہوں پر سے بھی پردے اٹھتے ہیں اور اصل حقیقت سامنے آکر صحیح نتائج اخذ کرنے اور صحیح رائے قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ ڈراما نگاری سے متعلق ابراہیم یوسف نے اپنے فیصلوں یا نتائج میں کسی قسم کی ادعائیت سے کام نہیں لیا ہے۔ جو بات کہی ہے حقائق یا اصل متن کی روشنی میں کہی ہے اور جن امور تک ان کی رسائی نہیں ہو سکی ہے ان سے عدم دستیابی یا لاعلمی کا اظہار کر کے نہ صرف معذرت کر لی ہے بلکہ انھیں آنے والی نسل کے محققین و ناقدین پر چھوڑ دیا ہے۔ تاکہ وہ ان

سلسلوں کو آگے بڑھائیں اور اردو ڈرامے کی بقا اور اس کے ارتقا کے لیے معیاری تحقیقی تنقیدی کام انجام دے سکیں۔

بلاشبہ ابراہیم یوسف ڈراما کے سچے عاشق تھے۔ ڈراما نگاری اور اس سے متعلق ان کے تمام ادبی کام اس صنف ادب سے ان کے فطری لگاؤ، عمیق مطالعے، وسیع تر مشاہدے اور ان کی غیر معمولی تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی صلاحیتوں کا مظہر ہیں۔

اردو میں ایسے ڈراما نگار بہت کم ہیں جنھوں نے ڈرامے کی تخلیق کے ساتھ ساتھ اس کی تحقیق، تنقید، تالیف اور ترجمہ پر بھی اتنا وقیع اور معیاری کام انجام دیا ہو جتنا کہ ابراہیم یوسف نے انجام دیا ہے۔ انھوں نے اپنی تمام عمر ڈراما نگاری کی خدمت میں صرف کر دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تعداد و معیار دونوں اعتبار سے ایک اچھے اور کامیاب ڈراما نگار ہی نہیں تھے بلکہ ڈرامے کے بہت اچھے محقق، نقاد، مبصر، مترجم اور مولف بھی تھے۔

ابراہیم یوسف کے ڈراموں کے سات مجموعے اور فن ڈراما نگاری سے متعلق چھ تحقیقی، تنقیدی کتابیں، ترجمہ شدہ ایک ڈراما، ترتیب شدہ ایک قدیم ڈراما اور ہند و پاک کے موقر ادبی جرائد میں شائع ان کے ڈرامے اور مضامین اب بآسانی دستیاب نہیں ہیں۔ ابراہیم یوسف اردو ڈراما نگاری کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں اس لیے ان کی شخصیت اور مجموعی ادبی خدمات کے پیش نظر اور ان پر یا اردو ڈراما نگاری پر تحقیقی کام انجام دینے والے اسکالرس کے لیے ان کے کلیات کی اشاعت وقت کی اہم ضرورت تھی، جس کی اشاعت کی تکمیل، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے اس کے خصوصی اشاعتی پروجیکٹ کے تحت عمل میں آرہی ہے۔

'کلیات ابراہیم یوسف' چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں ابراہیم یوسف کے ڈراموں کے پانچ مجموعے 'سوکھے درخت'، 'طنزیہ ڈرامے'، 'دھوئیں کے آنچل'، 'پانچ چھے ڈرامے'، 'اداس موڑ' اور دوسری جلد میں 'الجھاوے'، 'پرچھائیوں کا پیچھا' اور رسائل میں شائع ڈرامے شامل اشاعت ہیں۔ تیسری جلد ابراہیم یوسف کی تالیف 'اندر سبھا اور اندر سبھائیں'، ترجمہ شدہ ڈراما 'گم شدہ خط' مرتب کردہ ڈراما 'صولت عالم گیری' اور رسائل میں شائع

مضامین پر مشتمل ہے جبکہ چوتھی اور آخری جلد میں ابراہیم یوسف کی تحقیقی تنقیدی کتب اردو کے اہم ڈراما نگار (متقدمین، متوسطین اور آغا حشر) 'اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ'، 'ہندی ڈرامے کا ارتقا' اور ناول 'آبلے اور منزلیں' کو شامل کیا گیا ہے۔

'کلیات ابراہیم یوسف' کی اشاعت پر میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (نئی دہلی) کے ارباب حل و عقد، خصوصاً پروفیسر وسیم بریلوی وائس چیئرمین (این سی پی یو ایل) اور اس کے فعال ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، میرے کرم فرما اور پروجیکٹ کمیٹی کے سربراہ پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب اور کمیٹی کے جملہ اراکین کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میرے عزیز دوست پروفیسر خالد محمود اور کرم فرما پروفیسر عتیق اللہ صاحب جس طرح میرے نجی اور ادبی کاموں میں میری پرخلوص معاونت فرماتے رہے ہیں اس کے لیے شکریے کا لفظ میرے جذبات کی مساعدت نہیں کرتا۔ بہرحال اپنے خوشگوار اخلاقی فرض کی ادائگی کے لیے میں ان حضرات کا شکرگزار ہوں۔

ابراہیم یوسف (مرحوم) کے اس کلیات سے متعلق تمام تر مواد کی فراہمی میں ان کے ورثا خصوصاً ان کے بیٹے محمد علی خاں عرف تاج میاں نے میری بھرپور معاونت کی ہے۔ میں ان کا بھی شکرگزار ہوں۔

امید کہ یہ کلیات اردو ڈراما نگاری، ابراہیم یوسف کی شخصیت اور ادبی خدمات پر تحقیقی تنقیدی کام کرنے والے ریسرچ اسکالرس اور محققین کے لیے معاون ثابت ہوگا اور ادبی حلقوں میں اس کی خاطرخواہ پذیرائی ہوگی۔

محمد نعمان خاں

الجھاوے

اپنی اپنی راہیں

افرادِ تمثیل

-دادا جان (1) رقیب (دادا جان کا بڑا لڑکا) (2) عمر (چھوٹا لڑکا) (3) فریدہ (لڑکی) (4) صغرا (رقیب کی بیوی) (5) جلال (رقیب کا لڑکا) (6) شبنم (فریدہ کی سہیلی) (7) زینب (صغرا کی عزیز)

پہلا سین

منظر

(ایک متوسط مگر کھاتے پیتے گھرانے کا کمرہ۔ سامنے دیوار سے لگا ایک تخت بچھا ہے جس پر صاف ستھرا فرش ہے۔ تخت کے نیچے ایک مرادآبادی اگالدان ہے۔ تخت سے تھوڑا ہٹ کر اسی دیوار سے لگی ایک میز ہے اور ایک کرسی اس طرح رکھی ہے کہ اگر کوئی اس پر بیٹھ کر لکھتا پڑھتا ہے تو اس کی پیٹھ کمرے کی طرف ہوتی ہے۔ ایک صوفہ سیٹ ہے جس کے سامنے ایک میز رکھی ہے جس پر اخبار پڑے ہیں۔ پورے کمرے میں دری کا فرش ہے۔ دیواروں پر آیاتِ قرآنی آویزاں ہیں۔ اس وقت صغرا اور زینب تخت پر بیٹھی ہیں ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت دیر سے بیٹھی باتیں کررہی ہیں۔ سامنے پاندان رکھا ہے۔ تخت سے لگی ہوئی ایک کھڑکی ہے جس میں سے ایک کاریڈور نظر آرہا ہے۔ زینب کھڑکی میں سے باہر دیکھتے ہوئے۔)

فاروق : اے ہے صغرا یہ جلال میاں کہاں الوپ ہوگئے۔

صغرا : (مسکرا کر) آتا ہی ہوگا چچی۔ لیجیے آپ پان تو لیجیے۔

زینب : اے کیا خاک پان لوں۔ (پان اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے) سچ مان صغرا تجھے دیکھ کر جی جلتا ہے۔ اللہ پاک نے محبت کرنے والا گھر والا دیا۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) مگر تیرے نصیبوں میں چین نہیں۔

صغرا : (ہنس کر) ایسا کون سا دکھ ہے مجھے۔

زینب اب میرے دیدے پھوٹے ہوئے تو ہیں نہیں کہ بھائی نہ دے۔ دن رات چھوکری بنی چکری کی طرح گھومتی رہتی ہے۔

صغرا : (مسکرا کر) زینب چچی۔ اب میں ہی گھر کا کاج نہ دیکھوں گی تو اور کون دیکھنے آئے گا۔

زینب : اور یہ فریدہ بی بی کہاں کی لاٹ صاحبی ہیں کہ اٹھ کر پانی پینے میں پانو کی مہندی چھوٹتی ہے۔

صغرا : کالج جاتی ہیں پڑھتی لکھتی ہیں پھر تھک ہار کر پڑ رہتی ہیں۔ میں خود ان سے کام کاج کا نہیں کہتی۔

زینب : صغرا۔ میں منہ دیکھتی نہیں کہتی خدا کو منہ دکھانا ہے۔ وہ تو سمجھتی ہیں کہ لونڈی مل گئی ہے کیوں ہاتھ پانو ہلاؤں (ذرا آگے کھسک کر تھوڑی نیچی آواز میں) اب تو کہہ جب تو شبی کے وقت تو دو جان سے تھی اور تیرا ان گنا مہینا چل رہا تھا اس وقت بھی انھیں بھائی نہیں دیا کہ تیرا ہاتھ ہی بٹا لیا کرتیں۔

صغرا : (تھوڑا شرما کر (اب کنواری لڑکیاں اس دکھ کو کیا سمجھیں۔ زینب چچی۔

زینب : اے بی بی ہوش کی دوا کرو۔ آج کل کی یہ کنواری چھوکریاں بیاہیوں کے کان

کترتی ہیں۔ ہمارا تو چونڈا سفید ہوگیا پر وہ باتیں نہیں جانتے جو یہ جانتی ہیں ان سے تو توبہ بھلی۔ بس قیامت آئی سمجھو۔

(جلال کھڑکی میں جھانک کر)

جلال : چچی اماں تانگہ آگیا ہے۔

زینب : اچھا بیٹا جیتا رہ خدا تجھے خوش رکھے (برقع اٹھا کر) تیری بھلائی کو کہتی ہوں تیرے آگے بھی اولاد ہے کب تک دیور اور نند پر گھر لٹاتی رہے گی۔ (کھڑے ہوکر) میری باتوں کا برا نہ ماننا تجھے دیکھ کر جی جلتا ہے تو دو بول زبان پر آجاتے ہیں۔

(برقع پہنتی ہیں کہ جلال کمرے میں آتا ہے)

صغرا : (کھڑے ہوکر ہنستے ہوئے) فریدہ بی بی تین مہینے کی تھیں تب سے پالا ہے چچی نے اولاد کی طرح ہیں۔

زینب : آفریں ہے بی بی تم پر۔ گھر پھونک تماشا دیکھ رہی ہو (صغرا صرف مسکراتی ہے) اب کسی دن میرے گھر آنا۔

صغرا : فرصت کہاں ملتی ہے زینب چچی۔ (ہنس کر) ہم تو اب باجے گاجے ہی سے آئیں گے (زینب مسکرا کر صغرا کو دیکھتی ہیں اور کمرے سے چلی جاتی ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے صغرا بھی جاتی ہے۔ جلال میز کے پاس کرسی پر اس طرح بیٹھتا ہے کہ پانو ایک ہتھے پر ہوتے ہیں اور ٹیک دوسرے ہتھے سے لگاتا ہے۔ کتابوں میں سے ایک کتاب نکال کر پڑھنے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد باہر سے صغرا کی آواز۔ ''جلال۔'' جلال گھبرا کر وہ کتاب چھپا دیتا ہے اور دوسری کتاب اٹھا کر پڑھنے لگتا ہے کہ صغرا کمرے میں آکر)۔

صغرا : تم نے بہت پریشان کر رکھا ہے جلال۔ جگ پھوڑ ڈالا۔ سارے کا سارا سیٹ برباد ہوگیا۔

جلال : میں شبی کے لیے بسکٹ کا ڈبا اتار رہا تھا کہ۔

صغرا : تم شمی کے بڑے ہمدرد ہو۔ بس تمھارا تو دن رات منہ چلتا رہتا ہے۔
(دادا جان کمرے میں آتے ہوئے)

دادا جان : کیا بات ہے دُلہن۔

صغرا : (دوپٹہ سر پر برابر کرتے ہوئے) دیکھیے نا ابا جی۔ ہزار بار منع کیا کہ ادھر اُدھر ہاتھ ڈالتا نہ پھرا کر مگر اسے شرم نہیں آتی۔ بسکٹ کا ڈبا اتارنے میں کانچ کا جگ پھوڑ ڈالا۔

دادا جان : اتنی سی بات میں ناراض ہونے کی کون سی بات ہے۔ کھانے پینے کی چیز کھانے پینے کے لیے ہوتی ہے۔

صغرا : اس کے پیٹ میں جانے کہاں کا شیطان بیٹھا ہے کوئی چیز چھوڑتا ہی نہیں۔

دادا جان : بسکٹ کوئی ایسی چیز تو نہیں کہ پھر نہ آسکیں۔ ان کے لیے بچوں کو کوسنا اچھا نہیں ہوتا۔

صغرا : بسکٹ کھانا تھا تو کھالیتا مگر جگ توڑ ڈالا۔ اب وہ سنیں گے تو بڑبڑائیں گے۔ فریدہ بی کے لیے کلکتے سے لائے تھے۔
(کمرے سے چلی جاتی ہے۔ دادا جان کرسی پر بیٹھ کر)

دادا جان : جلال اب تم بہت شریر ہوتے جارہے ہو۔

جلال : میں تو شمی کے لیے بسکٹ نکال رہا تھا کہ جگ میں دھکا لگا اور وہ گر پڑا۔ مجھے جان بوجھ کر پھوڑنے کی کیا ضرورت تھی۔

دادا جان : کام ذرا احتیاط سے کرنا چاہیے۔ اب دیکھو نا بلاوجہ کا نقصان ہوا (جلال خاموش رہتا ہے۔ دادا جان کچھ دیر خاموش رہ کر) عمر کہاں ہے۔

جلال : اپنے کمرے میں ہوں گے۔ ابھی باہر سے آئے ہیں۔

دادا جان : جاؤ۔ اسے بلا کر تو لاؤ۔

(جلال کمرے سے چلا جاتا ہے۔ دادا جان جیب سے چشمہ نکال کر لگاتے ہیں۔ میز پر سے اخبار اٹھا کر اس کے ورق الٹتے ہیں کہ عمر اور جلال کمرے

میں آتے ہیں عمر دادا جان کو دیکھ کر)

عمر : ابا جی۔ آپ نے یاد فرمایا تھا۔

(جلال پھر اسی طرح کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ دادا جان اخبار میز پر رکھ کر)

دادا جان : ارے بھئی دن بھر کہاں رہے نظر ہی نہیں آئے۔

عمر : سلمیٰ کے گھر رہا ابا جی۔ اس کے بچے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

دادا جان : (سوچتے ہوئے) رشید میاں کل ہی تو مجھے ملے تھے۔ انھوں نے بیماری کا ذکر نہیں کیا۔

عمر : خیال نہیں رہا ہوگا۔ سلمیٰ خود روتے روتے بیمار نظر آنے لگی ہے۔ آپ کو یاد کر رہی تھی۔

دادا جان : مجھ سے تو اب چلا پھرا جاتا نہیں۔ دو قدم چلنے میں سانس پھولنے لگتی ہے۔

عمر : آپ ٹیکسی یا تانگہ سے کیوں نہیں چلے جاتے۔

دادا جان : کمال کرتے ہو ایک پرانا فوجی تانگہ پر لد کر جائے۔ گویا وہ آدمی نہیں ہوا دوسروں کے کاندھوں پر لدی ہوئی لاش ہوگیا۔
(خفیف سے مسکراہٹ کے بعد) میں نے تو سلمیٰ سے کہا تھا کہ وہ دو چار دن کے لیے یہاں آجائے مگر وہ راضی نہیں ہوئی۔ یہاں بچے کی اچھی دیکھ بھال ہوجاتی۔

دادا جان : اپنے بیمار بچے کو لے کر یہاں کیسے آن پڑے۔ سوچتی ہوگی کل اسے طعنے نہ سننا پڑیں۔

عمر : یہاں طعنے دینے والا کون ہے؟ میں طعنے دینے سے رہا۔ بھائی جان طعنے دینے سے رہے۔ رہیں بھابی جان تو خدا کی قسم انھوں نے کبھی یہ محسوس ہونے نہیں دیا کہ ہماری ماں نہیں ہے۔

دادا جان : عمران پینسٹھ سالوں میں میں نے دنیا ہی بدلتی نہیں دیکھی انسان بھی بدلتے دیکھے ہیں (ٹھنڈی سانس بھر کر) اس دور میں انسان کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔

(فریدہ کوریڈور سے گزرتی ہے عمر کھڑکی سے اسے دیکھ کر)

عمر : ارے فریدہ اِدھر آنا۔ (تھوڑی دیر بعد فریدہ کمرے میں آتی ہے) وہ تمھاری سہیلی ہے نا شبنم۔

فریدہ : جی ہاں۔

عمر : آج اس کا بھائی ملا تھا کہہ رہا تھا وہ کچھ بیمار ہے۔

فریدہ : جی ہاں۔ وہ تو کئی دنوں سے بیمار ہے۔

عمر : کیا بیمار ہے۔ یہاں بھی کئی دن سے نہیں آئی۔

فریدہ : زکام بگڑ گیا ہے۔ روز اسے دیکھنے جانے کا سوچتی ہوں مگر فرصت ہی نہیں مل رہی ہے۔

عمر : وہ تمھارے بارے میں ذرا سا سن لیتی ہے تو دوڑی چلی آتی ہے اور تمھیں فرصت نہیں مل رہی ہے۔ اس کے بھائی کی گھبراہٹ سے تو معلوم ہوتا تھا کہ کچھ زیادہ ہی گڑبڑ ہے۔

فریدہ : کل کالج جاؤں گی تو اس سے ملتی جاؤں گی۔ (دادا جان کی طرف دیکھ کر) ابا جی آپ پینشن لے آئے۔

دادا جان : نہیں بیٹی ابھی تو نہیں لایا۔ شروع تاریخوں میں بھیڑ بھاڑ زیادہ ہوتی ہے دو تین دن کے بعد جاؤں گا۔

فریدہ : مجھے کالج کی فیس دینا ہے اور کچھ کتابیں بھی خریدنی ہیں۔

دادا جان : رقیب سے کیوں نہیں کہتی وہ انتظام کر تو دیتا ہے۔

فریدہ : مجھے تو بار بار ان سے کہتے شرم آتی ہے آخر کب تک ان کو پریشان کیا جائے۔

دادا جان : اچھا کل جا کر لے آؤں گا۔

(صغرا کمرے میں آتی ہے اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی ہے)

صغرا : کیا لائیں گے ابا جی۔

دادا جان : پینشن۔ فریدہ کو کچھ کتابوں کی ضرورت ہے۔

صغرا : (فریدہ کی طرف دیکھ کر) فریدہ بی بی تم بھی کمال کرتی ہو۔ کیا ابا جی کی پنشن کے علاوہ تمھاری کتابیں نہیں آتیں بلا وجہ ابا جی کو پریشان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آخر تمھاری سب ضرورتیں کسی نہ کسی طرح پوری ہوتی ہی ہیں۔

فریدہ : ابا جی کی پنشن سے ہی آجائیں تو کہاں کی برائی ہے۔ آپ کو بعد میں تکلیف ہوتی ہے۔

صغرا : اب یوں تو زندگی میں سب چلتا ہے۔ تم اپنا دل چھوٹا نہ کیا کرو۔ (عمر کی طرف دیکھ کر) عمر میاں کل فریدہ بی کو کتابیں لا دینا۔ روپے مجھ سے لے لینا (فریدہ سے) ابا جی کو اس عمر میں پریشان کرنا اچھا نہیں ہے۔

دادا جان : دلہن۔ ابھی تک رقیب نہیں آیا۔

صغرا : (نظریں جھکا کر) انھیں کوئی کام تھا کہہ گئے تھے دیر میں آئیں گے۔

دادا جان : (جیب میں سے گھڑی نکال کر دیکھتے ہوئے) نماز کا وقت ہوگیا۔ (فریدہ کی طرف دیکھ کر) فریدہ۔ ذرا وضو کے لیے پانی رکھ دو اور جائے نماز بچھا دو۔ میں نماز پڑھ لوں۔

فریدہ : بہت اچھا ابا جی۔

(فریدہ کمرے سے چلی جاتی ہے۔ دادا جان کھڑے ہوتے ہیں)

صغرا : ابا جی۔ چائے تو پی لیجیے۔

دادا جان : اب نماز کے بعد پیوں گا۔

(کمرے سے چلے جاتے ہیں۔ صغرا تخت پر بیٹھ جاتی ہے۔ عمر اس کے پاس نیچے فرش پر بیٹھ کر صغرا کے ہاتھ سے پیالی لے کر ایک گھونٹ پی کر جلال سے جو ایک رسالہ بے حد انہماک سے پڑھ رہا ہے)۔

عمر : مولانا آپ کیا کر رہے ہیں۔

جلال : (عمر کی طرف دیکھ کر) چچا جان میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ انڈیا یہ سیریز جیت لے گا۔

عمر : وہ تو جیت لے گا۔ لیکن آپ یہ کل میچ کھیلنے کیوں نہیں گئے۔

جلال : میں نے کھیلنا چھوڑ دیا ہے۔

عمر : جی۔ آپ نے یہ تیاگ کیوں فرمایا ہے۔

جلال : اوّل تو مجھے کپتان نہیں بنایا گیا اور کل میرے ساتھ پھر بے انصافی کی گئی۔

عمر : کیا بے انصافی کی گئی آپ کے ساتھ۔

جلال : دو سال سے این سی سی میں میرا پرفارمینس سب سے اچھا رہا ہے مگر کل جب پہاڑ پر چڑھنے کی ٹریننگ کا سلیکشن ہوا تو مجھے چھوڑ کر اگروال صاحب کے لڑکے کو چن لیا گیا۔

عمر : کون اگروال صاحب۔

جلال : اسکول کے مینیجنگ کمیٹی کے چیئر مین ہیں۔

عمر : اس طرح پیچھے ہٹ جانے سے آپ کے مسائل حل ہو جائیں گے۔

جلال : اور گئے سال مجھے پریکٹیکل میں جان بوجھ کر کم نمبر دیے گئے کہ کہیں میں کلاس میں اوّل نہ آجاؤں۔ میں تو اب اس اسکول میں ہی پڑھنا نہیں چاہتا۔

عمر : (ہنس کر) پھر تو آپ کے لیے دوسرا نیا اسکول کھلوانا پڑے گا اور وہاں بھی آپ کے ساتھ بے انصافی ہونے لگی تو پھر کیا ہوگا۔ بھابی جان یہ انتہائی خود سر ہوتا جا رہا ہے۔ آج ہی اس کے گیمس ٹیچر نے مجھ سے شکایت کی ہے۔

صغرا : مجھ سے کیا کہتے ہو دو جھانپڑ رسید کرو ٹھیک ہو جائے گا۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) کل فریدہ بی کے لیے کتابیں ضرور لا دینا۔

عمر : کالج کی لائبریری سے کیوں نہیں لاتی اسے بلا وجہ روپیا برباد کرنے میں مزہ آتا ہے۔

صغرا : کہاں کی دولت لٹی جا رہی ہے پچیس پچاس ہی کی تو بات ہوگی۔

عمر : پچاس پچاس بھی بڑی محنت سے کمائے جاتے ہیں بھابی جان۔

صغرا : زندگی میں پیسے کا آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہے۔ کتنے دن کی مہمان ہے کل

شادی ہوگئی تو سمجھو پرائی ہوگئی۔ پھر ہم سے لینے نہیں آئے گی۔ اب سلمیٰ بی کو
ہی دیکھو بیچاری مہینوں میں دو چار دن کے لیے آتی ہیں اور غیروں کی طرح
رہ کر چلی جاتی ہیں۔

عمر : ارے ہاں بھابی جان آپ کو معلوم ہے اس کے بچے کی طبیعت خراب ہے۔

صغرا : تمھارے بھائی جان نے بتلایا تھا۔ کل جاؤں گی آج تو فرصت ہی نہیں ملی
(عمر صغرا کی ٹوکری میں سے چھالیا کا ایک دانہ اٹھا کر منہ میں ڈالتا ہے پھر
جلال کی طرف دیکھ کر)

عمر : آپ کون سی کتاب ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

جلال : (گھبرا کر) وہ تو میں نے یوں ہی۔

عمر : (جھک کر کتاب کا نام دیکھتے ہوئے) تم سے کتنی مرتبہ کہا کہ یہ واہیات مار
دھاڑ کے جاسوسی ناول نہ پڑھا کرو۔

جلال : چچا جان وہ تو یں۔

عمر : وہ تو کیا۔ وقت ایسی کتابیں پڑھنے میں گزار دو گے اور پھر کہو گے امتحان میں
میرے ساتھ بے انصافی کی گئی۔
(رقیب کمرے میں آتے ہیں اور عمر کو دیکھ کر)

رقیب : اچھا ہوا کہ تم مل گئے۔ سلمیٰ کے یہاں چلے جاؤ اس کے بچے کی طبیعت ٹھیک
نہیں ہے۔

عمر : میں صبح سے اس کے پاس تھا ابھی آیا ہوں۔

رقیب : ہاں اس نے بتلایا تھا۔ رشید میاں آج آنے کا کہہ کر گئے تھے مگر ابھی تک پتا
نہیں سلمیٰ اکیلی پریشان ہو رہی ہے۔

صغرا : اگر کوئی خاص بات ہو تو میں چلی جاؤں۔ بیچاری کو ڈھارس بندھ جائے گی۔

رقیب : کل سویرے ضرور چلی جانا (شیروانی اتار کر صوفے کی پشت پر ڈالتے ہیں
اور عمر کی طرف دیکھ کر) اور جب تک رشید میاں نہ آجائیں تم وہیں رہنا۔

عمر : بہت اچھا۔

(عمر دروازے کی طرف جاتا ہے)

رقیب : اور فریدہ سے کہتے جانا کہ مجھے ایک پیالی چائے دے جائے۔

عمر : بہت اچھا۔

(عمر کمرے سے چلا جاتا ہے۔ صفرا تخت سے اتر کر)

صفرا : میں بنالاتی ہوں ابھی کالج سے آئی ہیں۔ تھکی ہوئی ہوں گی۔

رقیب : تمھارے بیجا لاڈ سے اسے چائے بنانا بھی نہیں آئے گی۔

صفرا : (مسکرا کر) جب سر پر پڑے گی تو سب سیکھ جائیں گی۔

رقیب : تو پھر ابھی سے اس کے سر پر پڑنے دو (مسکرا کر) تم بیٹھو دیکھیں تو میم صاحب کیسی چائے بناتی ہیں۔

صفرا : (مسکرا کر تخت پر بیٹھتے ہوئے) ابا جی سے کہہ رہی تھی پنشن لے آئیں اسے کچھ کتابوں کی ضرورت ہے۔ میں نے عمر میاں سے کہہ دیا ہے کہ وہ اسے کتابیں لا دیں۔

رقیب : (ہنس کر) اسے ابا جی کی پنشن کی بڑی فکر رہتی ہے۔

صفرا : اب میں سوچتی ہوں کہ ابا جی کی دو چار مہینے کی پنشن اکٹھی آجاتی ہے تو اس رقم سے کوئی چیز لے کر ڈال لیتی ہوں اسی کے کام آئیں گی اور ہمیں وقت پر پریشانی نہ ہوگی۔ (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) آج بیگم رفیع آئی تھیں۔

رقیب : اچھا خیریت سے تو ہیں۔

صفرا : بیچاری پریشان ہیں۔ اپنے جھمکے بیچنا چاہتی ہیں۔ کہہ رہی تھیں جنگ سے پہلے چار ہزار میں خریدے تھے۔ جوہری نے تو بہت کم دام لگائے۔

رقیب : بیچاری جانے کس چکر میں پھنس گئی ہے۔

صفرا : چکر کیا ہے سب ان کے دیور کے کرتوت ہیں۔ ساری جائداد پر قبضہ کرلیا ہے۔

رقیب : شاید انھوں نے اپنی ملازمہ کو بھی نکال دیا ہے۔

صفرا : وہ تو جانے کب کا نکال دیا۔ کہہ رہی تھیں کچھ گڑبڑ کرنے لگی تھی۔

رقیب : وہ تو دس بارہ سال سے ان کے یہاں تھی۔ اب یہ شکایت کیوں پیدا ہوگئی۔ (ٹھنڈی سانس بھرکر) شریف آدمی بھی اپنا بھرم رکھنے کے لیے کیا کیا بہانے تراشتا ہے۔

صفرا : میں سوچتی ہوں کہ وہ جھمکے ہم خرید لیں۔

رقیب : مگر پیسہ...

صفرا : ابا جی کی چار مہینے کی پینشن آجائے گی اور کچھ روپے کی ضرورت پڑے گی تو اللہ کچھ انتظام کردے گا۔ فریدہ بی کے کام آجائیں گے۔ آج کل ایسی چیز مشکل سے ملتی ہے۔

رقیب : ارے بھائی یہ فریدہ ابھی تک چائے نہیں لائی۔

صفرا : بناتے بنائیں گی۔ (مسکراکر) آپ تو ہتھیلی پر سرسوں جمانے لگے۔ (چند سیکنڈ رُک کر) کل تو فہمیدہ آپا کے یہاں زینب چچی کے ساتھ رانی بھی آئی تھی۔

رقیب : اچھا۔ (مسکراکر) اس نے تم سے تو پردہ کیا ہوگا۔

صفرا : ہاں چھپی چھپی سی رہی۔ (مسکراکر) میں نے ایک دو مرتبہ بلایا بھی مگر وہ آئی نہیں۔

رقیب : زینب چچی نے کچھ نہیں کہا۔

صفرا : زینب چچی تو آج یہاں بھی آئی تھیں۔ وہ بیچاری کیا کہیں گی لڑکی والی جو ٹھہریں۔ لیکن فہمیدہ آپا کہہ رہی تھیں کہ اب انھیں رانی کی شادی کی جلدی ہے۔

رقیب : تم نے عمر سے بات کی۔

صفرا : جب بھی میں شادی کی بات نکالتی ہوں وہ ٹال جاتے ہیں۔ شاید سوچتے ہیں پہلے کہیں نوکری تو لگ جائے۔

رقیب : مگر یہ تو معلوم کرو کہ اسے یہ شادی پسند ہے یا نہیں۔

صفرا : انھوں نے یہ مسئلہ تو ہم پر چھوڑ دیا ہے۔ (رقیب خاموش رہتے ہیں۔ صفرا

جلال کی طرف دیکھ کر) اور ایک خوش خبری سنیے۔ (رقیب صغرا کی طرف دیکھتے ہیں) آپ کے سپوت نے وہ جگ توڑ ڈالا جو آپ کلکتہ سے لائے تھے۔

رقیب : کیسے توڑ ڈالا۔

صغرا : بہن سے بہت محبت ہے اس کے لیے الماری میں سے بسکٹ نکال رہے تھے۔

رقیب : (جلال کی طرف دیکھ کر) جلال۔ تمھاری بدتمیزیاں بہت بڑھتی جارہی ہیں۔

جلال : کوئی میں نے جان بوجھ کر پھوڑا ہے۔ دھوکے سے دھکا لگ گیا۔ امی تو بلاوجہ مجھ سے ناراض رہتی ہیں۔

را : میں تیری دشمن ہوں نا، کہ تجھ سے ناراض رہتی ہوں۔

(فریدہ چائے لے کر آتی ہے۔ رقیب فریدہ کو دیکھ کر)

رقیب : بنالائیں (فریدہ کے ہاتھ سے پیالی لے کر مسکراتے ہوئے) ہم تو سمجھتے تھے آج انتظار ہی ہاتھ رہے گا۔ (چائے کا گھونٹ لے کر برا سا منہ بنا کر) تم نے مجھے ڈائیبٹیز کا مریض کب سے سمجھ لیا ہے۔

فریدہ : کیا میں شکر ڈالنا بھول گئی۔

رقیب : (ہنس کر) اچھا ہوا کہ تم چائے ڈالنا نہیں بھولیں۔

فریدہ : میں شکر لاتی ہوں۔

دادا جان : (واپس جاتی ہے کہ دادا جان اسی دروازے سے آتے ہیں اور فریدہ کو جاتے ہوئے دیکھ کر)۔ کہاں جارہی ہو بیٹی۔

فریدہ : بھائی جان کے لیے شکر لے آؤں۔ آپ کے لیے چائے لاؤں ابا جی۔

دادا جان : اگر ہو تو ایک پیالہ لیتی آنا۔

(فریدہ کمرے سے چلی جاتی ہے۔ رقیب کھڑا ہوکر سلام کرتا ہے۔ صغرا بھی سر پر دوپٹہ برابر کرکے تخت سے اتر آتی ہے)

دادا جان : بیٹھو۔ بیٹھو۔ رقیب آج تم بہت دیر سے آئے۔

(دادا جان ایک کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ رقیب دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے)

رقیب : دفتر سے اٹھ کر سلمیٰ کے یہاں چلا گیا۔

دادا جان : اب اس کے بچے کی طبیعت کیسی ہے؟

رقیب : کوئی تشویش کی بات نہیں۔ بخار کچھ زیادہ ہے۔ سلمیٰ بہت پریشان تھی میں نے عمر میاں کو اس کے پاس بھیج دیا ہے۔

دادا جان : اچھا کیا۔ اس کا ایک بچہ پہلے ہی ضائع ہو چکا ہے۔ ڈری ہوئی عورتوں کو وہم ویسے ہی زیادہ ہو جاتا ہے۔ (صغرا کو دیکھ کر) ارے دلہن بیٹھو۔ ابھی شبی نہیں آئی؟

صغرا : (تخت پر بیٹھتے ہوئے) آج اس کے اسکول کے بچے سرکس دیکھنے گئے ہیں کچھ دیر سے آئے گی۔

دادا جان : (ہنس کر) اور آتے ہی کہانی کی فرمائش کرے گی۔

جلال : اور آپ پریوں کی کہانی شروع کر دیں گے۔ یہ کہانیاں بہت بور کرتی ہیں۔ ان میں آخر ہوتا ہی کیا ہے؟

دادا جان : تمھیں بور کرتی ہیں تو کیوں سنتے ہو۔ اپنے مار دھاڑ کے جاسوسی ناول پڑھتے رہا کرو۔

جلال : اور ابا جی سب ایک جیسی کہانیاں ہوتی ہیں بس ایک پری ہوتی ہے اس کے پر بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔ وہ چاندنی راتوں میں سیر کو نکلتی ہے تو رات رانی اس کے لیے خوشبوئیں بکھیر دیتی ہے پھر اک شہزادہ آتا ہے جو بہت خوبصورت ہوتا ہے۔

دادا جان : (کسی قدر بیزاری سے) بس خاموش رہو تم کیا جانو کہ حسن کیا ہوتا ہے۔ چاند کا حسن اس کی چاندنی میں ہے۔ پھول کا حسن اس کی خوشبو میں ہے، بچے کا حسن اس کی مسکراہٹ میں ہے۔ کیا ان واہیات مار دھاڑ اور جنگ کے ہولناک قصوں سے تم کو وہ مسرت حاصل ہو سکتی ہے۔ جو چاند کی چاندنی، پھولوں کی خوشبو اور بچے کی مسکراہٹ سے حاصل ہوتی ہے۔

جلال : پھر بھی ابا جی اگر آپ اپنی جنگ کے قصے لکھ دیں تو مزہ آجائے اور کتاب

خوب بکے۔

دادا جان : اور میں آنے والی نسلوں کے لیے ایک ایسا دفتر چھوڑ جاؤں جو انسانوں کے ذہنوں کو خوف اور دہشت میں مبتلا رکھے۔ اگر میں نے ایسا کیا تو میں مرنے کے بعد بھی خود کو معاف نہیں کر سکتا۔

رقیب : (مسکرا کر) ابا جی۔ جب آپ کو جنگ سے اس قدر نفرت ہے تو آپ جنگ لڑنے ہی کیوں گئے تھے۔

(دادا جان پہلے تو رقیب کا چہرہ غور سے دیکھتے ہیں۔ پھر خلا میں گھورنے لگتے ہیں فریدہ چائے کی پیالی اور شکر لے کر آتی ہے۔ شکر رقیب کو دے کر پیالی دادا جان کی طرف بڑھاتی ہے مگر وہ اس کی طرف دھیان نہ دے کر خلا میں گھورتے رہتے ہیں پھر کچھ دیر بعد)

دادا جان : شاید اس لیے کہ مجھے تمھاری پرورش کرنا تھی۔ تمھیں تعلیم دلوانا تھی یا پھر شاید اس لیے کہ میں بے وقوف تھا۔ (ماحول ایک دم سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر مکمل خاموشی رہتی ہے۔ پھر دادا جان ٹھنڈی سانس بھر کر) میں نے دوسروں کے گھر اس لیے اجاڑے کہ اپنا گھر آباد کرسکوں۔ اسے روشن تر کرسکوں (ٹھنڈی سانس بھر کر) میں نے ایسے ہولناک مناظر دیکھے ہیں کہ ان کے تصور سے بھی روح لرز اٹھتی ہے۔ میں نے زخموں سے چور انسانوں کو پانی نہیں دیا بلکہ انھیں روندتا ہوا یوں آگے بڑھ گیا جیسے وہ کیڑے مکوڑوں سے بدتر ہوں۔ میں انسانیت کا مجرم ہوں رقیب۔ خود غرض مجرم۔ (کچھ دیر اس طرح خاموش رہتے ہیں جیسے اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہوں) رقیب۔ بڑھاپا انسان کو بزرگی، وقار اور عظمت ہی نہیں جوانی کی کچھ خوشگوار یادیں بھی دیتا ہے جو اس کے بڑھاپے کا سہارا بن کر اس کی آخری زندگی کو مسرتوں اور خوشیوں سے روشن رکھتی ہیں (کرسی کی پشت سے ٹک کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور ٹھنڈی سانس بھر کر)(مگر میری جوانی میدانِ جنگ میں

تڑپتی لاشوں کی یاد سے عبارت ہے۔ میرا بڑھاپا ایک مسلسل عذاب ہے۔
صلیب پر چڑھا ہوا مسیح جو دوسروں کے گناہوں کا کفارہ ادا کررہا ہے۔
(سب خاموشی سے دادا جان کو دیکھتے رہتے ہیں)۔

(پردہ)

دوسرا سین

منظر : (وہی کمرہ تقریباً ایک ہفتہ بعد عمر ایک آرام کرسی پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا ہے۔ اس کے پاس ہی فرش پر جلال بیٹھا ہوا ہے جو البم میں ڈاک ٹکٹ چپکا رہا ہے۔ ایک ٹکٹ کو بہت غور سے دیکھتا ہے پھر عمر کی طرف دیکھ کر):

جلال : چچا جان (عمر کتاب پر سے نظریں ہٹا کر جلال کو دیکھتا ہے) مجھے فلائنگ کلب کا ممبر بنوا دیجیے۔

عمر : جی کیا فرمایا آپ نے۔

جلال : میں فلائنگ کلب کا ممبر ہونا چاہتا ہوں۔ ابو سے سفارش کردیجیے۔

عمر : (کتاب سامنے میز پر رکھ کر) آپ کی عمر کیا ہے۔

جلال : پندرہ سال۔

عمر : آپ کو فلائنگ کلب کا ممبر کون بنا لے گا۔ ابھی آپ نے دسویں جماعت بھی پاس نہیں کی ہے۔ بس دن رات یہی خرافات سوچا کرو پڑھنا لکھنا کچھ نہیں۔

جلال : اور بہت سے بھی تو ممبر ہیں۔

عمر : اور وہ سب آپ کی طرح دسویں جماعت میں پڑھتے ہیں۔
(رقیب کمرے میں آتے ہوئے)

رقیب : کیا بات ہے عمر۔

عمر : (مسکرا کر) مسٹر جلال متعلم درجہ دس، عمر پندرہ سال فلائنگ کلب کے ممبر بنا چاہتے ہیں۔

رقیب : (ہنس کر) بہت خوب۔ اب ایک نئی سنک دماغ میں پیدا ہوئی۔

عمر : آپ نے مسٹر جلال متعلم درجہ دس کی اس ماہ کی رپورٹ دیکھی ہے۔ ہوم ورک کے کالم میں اِرریگولر لکھا ہے۔

رقیب : شرارت کرنے سے فرصت ملے تو اسکول کا کام ہو۔ دماغ کیا ہے شرارتیں پیدا کرنے کی فیکٹری ہے (کرسی پر بیٹھ کر) عمر۔ یہ تم نے یو۔ ڈی۔ سی کے لیے کیوں اپلائی کر دیا۔

عمر : (نظریں جھکا کر) آخر کہاں تک مارا مارا پھرتا رہوں۔

رقیب : تمھیں کوئی تکلیف ہے جو تم نوکری کے لیے اس قدر بے چین ہو۔

عمر : تکلیف تو کوئی نہیں مگر...

رقیب : (بات کاٹ کر) اگر کوئی تکلیف ہو تو کہو۔ (عمر خاموش رہتا ہے) تمھارا اکاڈیمک کیریر کس قدر شاندار رہا ہے کیا تمھاری صلاحیتیں یو۔ڈی۔ سی بن جانے کے لیے ہیں۔

عمر : مجبوری میں آدمی کو سب کچھ پسند کر لینا پڑتا ہے۔

رقیب : تمھیں کوئی مجبوری نہیں ہے۔ ڈاکٹر ہدیٰ کو ایک ریسرچ اسسٹنٹ کی ضرورت ہے۔ میں نے تمھارے لیے ان سے بات کر لی ہے تم بھی ان سے جا کر مل لو۔ تمھیں تجربہ ہو جائے گا۔ پھر خود ریسرچ کر سکتے ہو۔

عمر : (سوچتے ہوئے) آج کل پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی خاصی پنکچر ہو گئی ہے۔ کچھ پروفیشنل الٹی سیدھی کتابیں لکھتے ہیں اور کچھ شوقین انھیں خرید کر اچھی نوکریاں حاصل کر لیتے ہیں۔

رقیب : تم بڑی حد تک ٹھیک کہہ رہے ہو ایسا ہی ہو رہا ہے۔ مگر اپنی صلاحیتوں کا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ محنت مستقبل کو روشن کر دیتی ہے (کھڑے ہو کر) یو۔ ڈی۔ سی کی نوکری ہرگز قبول نہ کرنا مجھے دکھ ہوگا۔ (جلال کی طرف دیکھ کر) جلال تم سلمیٰ کے گھر چلے جاؤ اور اپنی ماں کو لے آؤ۔ سلمیٰ سے کہنا میں نے

اسے بھی بلایا ہے۔

جلال : بہت اچھا۔

(رقیب دروازے کی طرف جاتے ہیں پھر کچھ سوچ کر رکتے ہیں عمر کی طرف دیکھ کر)

رقیب : عمر۔تم اسد علی کو جانتے ہو؟

عمر : کون اسد علی؟

رقیب : تمھاری بھاوج کے خالہ زاد بھائی۔

عمر : اچھا وہ۔ جی ہاں۔ کیا بات ہے۔

رقیب : تمھاری بھاوج کا فریدہ کے لیے ان کا خیال ہے۔ ذرا ان کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کرو۔

عمر : بہت اچھا۔ وہ شاید کسی کنسٹرکشن کمپنی میں انجینئر ہیں۔

رقیب : ہاں سنا ہے ہونہار ہیں اور ترقی کے چانسز ہیں۔ تمھاری بھاوج کہہ رہی تھیں کہ کمپنی اعلیٰ تعلیم کے لیے انھیں فارن بھیج رہی ہے۔

عمر : اگر ایسے چانسز ہیں تو اور بھی اچھا ہے۔

رقیب : ابا جی فریدہ کی شادی کے لیے بے چین ہیں وہ چاہتے ہیں کہ اپنی زندگی ہی میں اس بار سے سبکدوش ہو جائیں۔

عمر : (مسکرا کر) ابا جی کو ہم لوگوں پر بھروسا نہیں ہے۔

رقیب : عمر زیادہ ہو جانے پر انسان بہت کچھ وہمی اور شکی ہو جاتا ہے۔ شاید زندگی کے طویل سفر میں اس کے تلخ تجربات اس کے ذہن کو دھکا دیتے ہیں (جلال کی طرف دیکھ کر) جلال تم ابھی تک گئے نہیں۔ (جلال ٹکٹوں کا البم میز پر رکھتا ہے اور خاموشی سے کمرے سے چلا جاتا ہے رقیب مسکرا کر) اس لونڈے کے بھی کچھ اسکرو لوز ہے۔

عمر : کل تو لیا دیا ہی آڑے آگیا۔ رقیب سوالیہ نظروں سے عمر کو دیکھتا ہے) کل

اسکول میں کشتیوں کی دوڑ کا مقابلہ ہو رہا تھا کہ جانے کیسے حضرت کی کشتی الٹ گئی وہ تو خیریت ہوئی کہ پیچھے ایک حفاظتی کشتی آ رہی تھی۔ اس نے بچا لیا ورنہ حضرت دو چار غوطے تو کھا ہی چکے تھے۔

رقیب : خدا ہی خیر کرے حضرت بڑے مہم پسند واقع ہوئے ہیں (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ سلمیٰ آئے تو اس کا خیال رکھنا۔

عمر : بہت اچھا۔

(رقیب کمرے سے چلے جاتے ہیں۔ عمر پھر کتاب پڑھنے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد دادا جان تھکے تھکے قدموں سے کمرے میں آتے ہیں اور نڈھال سے صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں چہرے کا پسینہ پوچھتے ہیں اور میز پر سے اخبار اٹھا کر ہوا کرتے ہیں کچھ دیر بعد اس طرح جیسے خود سے کہہ رہے ہوں)

دادا جان : جب انسان کے ہاتھ پاؤں جواب دے دیں تو اس کو زندہ رہنے کا حق نہیں۔ سود میں ملی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔

عمر : ابا جی آپ سے کتنے مرتبہ کہا کہ تانگہ یا ٹیکسی میں جایا کیجیے مگر آپ کو جانے کیا ضد ہے۔

دادا جان : سوال ضد کا نہیں وضع داری کا ہے ایک فوجی تانگہ یا ٹیکسی پر چڑھ کر جائے یہ اس کی توہین ہے (عمر خاموش رہتے ہیں) تم کیا کر رہے ہو۔

عمر : کتاب دیکھ رہا تھا۔

دادا جان : تو اپنا کام کرو (عمر آہستہ سے مسکرا کر خاموش رہتا ہے) دادا جان کھوئی نظروں سے خلا میں دیکھتے ہوئے) طویل زندگی بھی انسان کو کیا کیا غم دیتی ہے۔

عمر : ابا جی آپ کی عمر پینسٹھ سال کی ہے یہ تو کوئی طویل عمر نہیں ہوئی۔ لوگ پہلے تو سو سو سال جیتے تھے۔

دادا جان : اور پہلے کی دنیا ایسا دہکتا ہوا انگارہ نہیں تھی جہاں بیماریاں، غم اور برائیاں اس قدر عام ہوں۔ جیسے آج ہیں۔ وہ لوگ جینے کی تمنا کرتے تھے اور ہم موت کو

تلاش کرتے ہیں۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) سوچو۔ چار سال میں سلمیٰ کے یہاں دو بچے پیدا ہوئے اور دونوں جاتے رہے۔ موت اور بیماری کس قدر ارزاں ہے غم کس قدر سستے ملتے ہیں اس دنیا میں۔

عمر : (ٹھنڈی سانس بھر کر) ابا جی اس میں قسمت کو بڑا دخل ہوتا ہے جو بچے خدا کو پسند ہوتے ہیں وہ ہم سے چھین لیے جاتے ہیں۔

دادا جان : انسان اپنی شکست پر ایسی ہی حسین منطق تراش لیتا ہے۔ چاند پر کمندیں ڈال کر اترا رہا ہے اور بیماری موت کا پیغام بن کر پہلو میں کھڑی مسکراتی رہتی ہے۔

عمر : مگر ابا جی۔ بیماری اور موت تو ہر زندگی کا مقدر ہے۔ وہ۔

دادا جان : تو پھر بیماریوں ہی سے پنجہ کیوں نہیں لڑاتا۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) چاند کو جیت کر تم کو وہ مسرت نہیں ملے گی جو ایک صحت مند بچے کی مسکراہٹ سے ملتی ہے۔ کیا چاند کو اپنے آغوش میں لے کر تم ایک ماں کی وہ گود بھر سکو گے جو سونی ہو چکی ہے۔

عمر : انسان کا عزم یہی ہے ابا جی کہ بیماری اور موت کے خوف سے نہ تو اس نے تاج محل بنانے سے منہ موڑا ہے اور نہ چاند پر کمندیں ڈالنے سے ہچکچایا ہے۔

دادا جان : یہ حقائق سے انسان کا فرار ہے۔ بیماری سے ہار کر وہ تاج محل تعمیر کرتا ہے۔ اجنتا بناتا ہے۔ چاند پر کمندیں پھینکتا ہے صرف یہ جتلانے کے لیے وہ کس قدر طاقت ور ہے یہ بھول جانے کے لیے کہ بیماری اور موت سے وہ ہار چکا ہے۔

عمر : آپ شاید دنیا کی اس عظیم ترقی سے مطمئن نہیں ہیں جہاں انسان نے خلاؤں کا دل چیر کر اپنے عزم کی بلندی، اپنے حوصلے کی پختگی اور اپنے ارادوں کا لوہا منوایا ہے۔

دادا جان : (طنزیہ مسکرا کر) اور وہ خلاؤں کی تاریکیوں میں اس طرح کھو گیا ہے کہ اسے یہ دکھائی نہیں دیتا کہ وہ خود مرکز کائنات ہے کہ بیماری، بے روزگاری اور غریبی اس کی سب سے بڑی شکستیں ہیں۔ عمر۔ خاموش ہو کر) سوچنے لگتے

ہیں۔ عمر سوالیہ نظروں سے انھیں دیکھنے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد، میں دنیا کی اس ترقی کے خلاف نہیں ہوں مگر مجھے انسان کی مسرتیں انسان کے اس غرور سے زیادہ عزیز ہیں کہ اس نے چاند پر قدم رکھ لیا ہے یا اس نے ایسے مہلک ہتھیار بنا لیے ہیں جس سے وہ دنیا کو تباہ کردینے کی دھمکی دے سکتا ہے۔

(کچھ دیر خاموش رہ کر) تمھاری نوکری کا کچھ ہوا۔

عمر : ایک جگہ ملنے کی امید ہے مگر بھائی جان اس کے خلاف ہیں۔

دادا جان : کیوں خلاف ہیں؟

عمر : وہ کسی معمولی نوکری سے مطمئن نہیں۔

دادا جان : تمھارا کیا خیال ہے۔

عمر : میں تو اب معمولی سے معمولی نوکری پر قناعت کرنے کو تیار ہوں۔ مگر بھائی جان کی محبت اور خلوص کو ٹھیس پہنچانے کی ہمت نہیں ہوتی۔

دادا جان : یہ تمھاری سعادت مندی ہے۔ (کچھ دیر رک کر) فریدہ کی شادی میرے جیتے جی ہوجاتی تو اچھا تھا۔

عمر : آپ اس قدر فکرمند کیوں ہیں۔ ابھی تو وہ پڑھ رہی ہے۔

دادا جان : فکرمند کیوں نہ ہوں گا جہاں سوا سال کا صحت مند بچہ صرف چند راتوں میں ختم ہوسکتا ہے وہاں پینسٹھ سال کے بوڑھے کا کیا ٹھکانہ (سوچتے ہوئے کھڑے ہوکر) ابھی فریدہ کالج سے نہیں آئی؟

عمر : ابھی تو نہیں آئی ہوگی۔

دادا جان : اچھا۔ (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) میں ذرا لیٹ کر کمر سیدھی کرلوں ابھی عصر کی نماز میں تو دیر ہے۔

عمر : جی ہاں۔ پندرہ بیس منٹ ہیں۔

(دادا جان کمرے سے چلے جاتے ہیں۔ عمر میز پر رکھی ہوئی کتاب اٹھا کر پڑھتا ہے مگر اس کے اندازے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں اس کا

دل نہیں لگ رہا ہے۔ پھر کتاب میز پر رکھ دیتا ہے کچھ دیر سوچتا رہتا ہے پھر اٹھ کر جلال کی میز کے پاس جاتا ہے کتابیں اِدھر اُدھر کر کے ایک رسالہ اٹھا کر کرسی کی طرف آتا ہے کہ فریدہ اور شبنم کمرے میں آتی ہیں۔ عمر کو کمرے میں دیکھ کر شبنم کچھ رکتی ہے پھر کمرے میں آتی ہے۔ فریدہ شبنم سے)

فریدہ : بیٹھو (صوفے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ شبنم شرمائے ہوئے انداز میں بیٹھ جاتی ہے۔ فریدہ عمر کی طرف دیکھ کر) ابھی بھابی جان نہیں آئیں۔

عمر : ابھی تو نہیں آئیں۔ جلال انھیں لانے کے لیے گیا ہوا ہے۔

فریدہ : ابا جی آگئے۔

عمر : ہاں ابھی آئے ہیں۔ اپنے کمرے میں آرام کر رہے ہیں۔

فریدہ : (شبنم کی طرف دیکھ کر) شبنم تم بھائی صاحب سے گپیں ہانکو میں تمھارے لیے چائے لاتی ہوں۔

شبنم : (گھبرائے ہوئے انداز میں) اس وقت چائے کی کیا ضرورت ہے۔

فریدہ : (مسکرا کر) پھر کس وقت ضرورت ہوتی۔ (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) میں ابھی آتی ہوں (پھر مڑ کر ہنستے ہوئے) ہمارے بھائی صاحب بے حد شرمیلے بلکہ دبو ہیں۔ تمھاری طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے۔

عمر : ایک پیالی چائے ابا جی کو بھی دیتی آنا۔

فریدہ : بہت اچھا۔

(فریدہ کمرے سے چلی جاتی ہے۔ شبنم اور عمر کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں پریشان ہیں اور بے چین سے ہیں۔ کچھ دیر اُکتا دینے والی خاموشی رہتی ہے۔ کچھ دیر بعد)

عمر : بہت دنوں میں تشریف لائیں آپ۔

(شبنم نظریں اٹھا کر عمر کو دیکھتی ہے جو اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ شبنم گھبرا کر نظریں نیچی کر کے)

شبنم : میں بیمار ہوگئی تھی۔

عمر : کیا بیماری تھی۔

شبنم : زکام بگڑ گیا تھا۔ کافی پریشانی رہی۔

عمر : زکام عجیب بیماری ہے۔ ہزاروں بیماریوں کی جڑ (شبنم خاموش رہتی ہے عمر کچھ دیر خاموش رہ کر) بی، ایس، سی کے بعد کیا ارادہ ہے۔

شبنم : کچھ نہیں میڈیکل میں داخلہ نہ مل سکا۔ مجبوری میں بی ایس سی کرنا پڑ رہا ہے۔

عمر : بی ایس سی کے بعد کوشش کیجیے گا۔

شبنم : اب تو بہت مشکل ہے۔ (کچھ دیر رُک کر) آپ کا اب کیا ارادہ ہے۔

عمر : پروفیسر ہدیٰ کو ایک ریسرچ اسسٹنٹ کی ضرورت ہے بھائی جان کا خیال ہے کہ ان کے ساتھ کام کروں۔

(دونوں اس طرح خاموش ہوجاتے ہیں جیسے اب ان کے پاس بات کرنے کو کوئی موضوع نہ ہو۔ کچھ دیر بعد فریدہ چائے لے کر آتی ہے اور دونوں کو خاموش دیکھ کر)

فریدہ : کیا آپ دونوں نے مون برت رکھا ہے؟

عمر : ابا جی کو چائے دے آئیں؟

فریدہ : وہ تو شاید سو گئے ہیں۔

عمر : تم نے جگا لیا ہوتا۔

فریدہ : میں نے سوچا کچھ دیر آرام کر لینے دوں۔

عمر : اور اگر عصر کی نماز قضا ہوگئی تو سارا گھر سر پر اٹھا لیں گے۔ وہ پہلے ہی سلمٰی کے بچے کی موت سے بے حد متاثر ہیں۔ اچھا لاؤ ایک پیالی چائے دو میں انھیں جگا لوں گا۔

فریدہ : (چائے بناتے ہوئے) پہلے آپ پی لیجیے پھر چلے جایئے گا وہ بھی تھوڑی دیر آرام کر لیں گے۔

عمر : پہلے انھیں پلا آؤں پھر آ کر پی لوں گا۔

(فریدہ کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لے کر چلا جاتا ہے۔ فریدہ دوسری پیالی شبنم کی طرف بڑھاتی ہے۔ شبنم پیالی لے کر مسکراتے ہوئے)

شبنم : تمھارے بھائی صاحب سے پہلی مرتبہ بات کرنے کا اتفاق ہوا وہ تو بڑے شرمیلے ہیں۔

فریدہ : شرمیلے نہیں دبو۔ بھابی جان کے سامنے تو ایسے بن جاتے ہیں جیسے بھیگی بلی۔

شبنم : (مسکرا کر) تم سعادت مندی کو دبو پن کہتی ہو۔ (چائے کا گھونٹ لے کر) اب تو وہ ڈاکٹر ہدیٰ کے اسسٹنٹ کے بطور کام کریں گے۔

فریدہ : یہ کس چنڈوخانے کی ہے۔

شبنم : وہ خود ہی کہہ رہے تھے بڑے بھائی جان نے انھیں مشورہ دیا ہے۔

فریدہ : بڑے بھائی جان نے!

شبنم : ہاں کہہ تو یہی رہے تھے۔

فریدہ : (سوچتے ہوئے) پھر تو یہ بھابی جان کے دماغ کی پیداوار ہوگی۔ پانچ سالہ منصوبہ بناتی ہیں ہماری بھابی جان۔

شبنم : اگر انھوں نے ایسا منصوبہ بنایا ہے تو کون سی برائی ہے اس میں۔

فریدہ : برائی۔ تاکہ وہ دو تین سال ڈاکٹر ہدیٰ کے ساتھ جھک مارتے رہیں اس کے بعد انھیں ڈاکٹریٹ کرنے کا مشورہ دے دیں گی کہ وہ نوکری نہ کریں اور ان کے رحم و کرم پر زندگی گزارتے رہیں اور اس پھنپھر رانی سے شادی کرلیں تاکہ جائداد پر ان کا قبضہ رہے۔

شبنم : (غور سے فریدہ کا چہرہ دیکھتے ہوئے) کون پھنپھر رانی؟

فریدہ : ہماری بھابی کی کسی چچی کی صاحب زادی ہیں۔ (ڈرامائی انداز سے جس میں نفرت کا انداز نمایاں ہے) رانی بٹیا۔ میٹرک پاس۔ تھرڈ ڈویژن۔ شکل و صورت واجبی دماغ ساتویں آسمان پر۔ (سوچتے ہوئے) بعض وقت یہ کم

پڑھی لکھی عورتیں بھی اچھے خاصے پڑھے لکھوں کے کان کترتی ہیں۔ کل بیگم رفیع کے جھمکے دس ہزار میں خرید لیے۔ مجھ سے پوچھ رہی تھیں تمھیں پسند ہیں جیسے میرے ہی لیے خریدے ہوں۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) کہو ہمارے بھائی صاحب پسند آئے۔

شبنم : (شبنم کسی قدر شرما کر) بہت بدتمیز ہو یہ کون سا مذاق ہے۔

فریدہ : اس میں مذاق کی کیا بات ہے۔ کم ازکم اس چڑی مار سے تو اچھے ہی ہوں گے۔ جو کالج میں تمھارے گرد منڈلاتا رہتا ہے۔

شبنم : لاحول ولاقوۃ۔ تم بھی کس سے اپنے بھائی صاحب کا مقابلہ کررہی ہو۔

فریدہ : (ہنس کر) تو گویا بھائی صاحب پسند آگئے۔ (شرارت سے مسکراتے ہوئے شبنم کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر) سچ مان شبنم۔ بھائی صاحب بڑے سعادت مند شوہر ثابت ہوں گے۔

شبنم : (بات ٹالنے کے انداز سے) بھابی جان نہیں آئیں میں تو انھیں سلمٰی بہن کے بچے کا پُرسا دینے آئی تھی۔

فریدہ : اور یہاں بھائی صاحب گلے پڑے جارہے ہیں۔ (اسی وقت عمر کمرے میں آتا ہے فریدہ اسے دیکھ کر) ابا جی جاگ گئے۔

عمر : وہ سوئے ہی کب تھے، نماز پڑھ رہے ہیں۔

فریدہ : مگر جب میں گئی تھی وہ لیٹے ہوئے تھے۔

عمر : اور اگر واپسی میں دیکھ لیتیں تو وہ نماز پڑھتے نظر آجاتے۔ (کرسی پر بیٹھ کر) اچھا لائیے ایک پیالی مجھے بھی دیجیے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔

فریدہ : (چائے پیالی میں نکالتے ہوئے) یہ شبنم ابھی آپ کی بہت تعریف کررہی تھی اور یہ جس کی تعریف کردے وہ سچ مچ تعریف کے قابل ہوتا ہے۔

عمر : شکریہ اس کا پہلی معتنت کا مگر چائے ذرا جلدی دے دیجیے۔

فریدہ : (چائے کی پیالی عمر کو دیتے ہوئے) یہ ڈاکٹر ہدیٰ کے ساتھ کام کرنے کا

پروگرام کب بنا لیا۔

عمر : (پیالی لیتے ہوئے) آج اور ابھی۔ (مسکرا کر) محترمہ فریدہ خاتون کو کوئی اعتراض ہے۔

فریدہ : ہرگز نہیں۔ (مسکرا کر جس میں خفیف سا طنز ہے) پھر خود پی ایچ ڈی کر ڈالیے گا۔ اس کے بعد ڈی لٹ۔ ڈی لٹ تو فارن کی کسی یونیورسٹی سے ٹھیک رہے گی۔

عمر : آپ کا مشورہ تو نیک ہے۔ یہ کچھ غیر ممکن نہیں۔ جب تک بھابی جان ہیں مصارف وغیرہ کی کوئی فکر نہیں۔ (کھڑے ہوکر) اچھا اب میں جاکر ذرا ڈاکٹر ہدئی سے مل لوں۔ (دروازے کی طرف بڑھتا ہے کہ اسی وقت صغرا کمرے میں آتی ہیں۔ وہ بہت تھکی ہوئی اور نڈھال معلوم ہوتی ہیں۔ آنکھیں سرخ ہورہی ہیں جیسے عرصہ تک روتی رہی ہیں۔ عمر واپس ان کے پاس آکر) بھائی جان سلمٰی نہیں آئی۔

صغرا : (ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے) کیا آتی بیچاری تین دن سے پرسا دینے والوں کا تو تانتا بندھا ہوا ہے۔

عمر : مگر بھائی جان نے تو جلال سے کہا تھا اسے بھی ساتھ لے آنا۔

صغرا : میں نے تو بہت کہا رشید میاں نے بھی زور دیا مگر وہ راضی نہیں ہوئی۔ کہنے لگی دو چار دن بعد آؤں گی اگر آجاتی تو دل بہل جاتا (شبنم کی طرف دیکھ کر) شبنم بی بی تم کب آئیں۔

شبنم : ابھی آئی ہوں آپ ہی کا انتظار کررہی تھی۔ کیا بیماری تھی بچے کو۔

صغرا : بس معمولی بخار آیا تھا۔ پھر دست ہوئے (ٹھنڈی سانس بھر کر) چار پانچ دن میں چٹ پٹ ہوگیا۔ کیا تندرست بچہ تھا ہاتھی کا پٹھا۔

شبنم : ابھی بھی آرہی تھیں۔ فریدہ نے بتلایا کہ آپ گھر پر نہیں ہیں اب وہ کل آئیں گی۔

صغرا : سلمٰی بی بد حال تھیں انھیں چھوڑ کر کیسے چلی آتی مجھ سے تو اُن کا دکھ نہیں دیکھا جارہا تھا۔

شبنم : ایک صدمہ ہو تو انسان برداشت کر لے ان بیچاری پر تو پیہم صدمے پڑے ہیں۔ (فریدہ سے) فریدہ۔ تمھیں فرصت ہو تو ذرا چلو میں بھی سلمٰی باجی کو پرسں دے آؤں۔

صغرا : ہاں فریدہ بی چلی جاؤ۔ میں کہہ آئی تھی کہ تمھیں ابھی بھیج دوں گی۔ وہ باولی سی ہو رہی ہیں ان کا اکیلا رہنا ٹھیک نہیں کل صبح میں پھر آ جاؤں گی۔

فریدہ : بہت اچھا۔ میں چلی جاتی ہوں۔ آؤ شبنم چلیں۔

صغرا : ذرا جلال سے کہتی جانا مجھے ایک گلاس پانی دے جائے (فریدہ اور شبنم دروازے کی طرف بڑھتی ہیں عمر بھی ان کے پیچھے پیچھے جاتا ہے) عمر میاں تم کہاں چلے۔

عمر : ایک کام سے جا رہا ہوں بھابی جان۔

صغرا : اگر اُدھر ہی کہیں جا رہے ہو تو ان دونوں کو سلمٰی کے گھر چھوڑتے جانا۔

عمر : بہت اچھا۔

(تینوں دروازے کی طرف بڑھتے ہیں کہ زینب چچی ہانپتی کانپتی کمرے میں آتی ہیں۔ تینوں کو جاتے ہوئے دیکھ کر)

زینب : اے ہے فریدہ بی ایسی بھی کیا بے مروتی کہ دو انگلیوں کا سلام بھی بھاری پڑتا ہے۔

فریدہ : السلام علیکم زینب چچی۔

زینب : موا کیا زمانہ ہے کہ بزرگوں کی بزرگی کو گھُن لگ گیا اور بی بی یہ مردوں کی طرح سلام کرنا کب سے سیکھ لیا ہے (عمر کو مشکوک نظروں سے دیکھ کر) اور میاں تم کہاں چلے۔

فریدہ : یہ ہمارے ساتھ سلمٰی باجی کے گھر جا رہے ہیں۔

(تینوں چلے جاتے ہیں۔ صغرا کھڑی ہو کر)

صغرا : آیئے زینب چچی۔

زینب : اے کیا خاک آؤں۔ ان لچھنوں کو دیکھ کر جی جلتا ہے۔ غیر مردوں سے ہی

ہی ہی ہاہا کرتے پھرنا ہمیں تو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اب بی بی تم برا مانو یا بھلا میں تو خدا لگتی کہتی ہوں۔

صغرا : آپ بیٹھیے تو، وہ تو میں نے ہی عمر میاں سے کہا تھا کہ ان دونوں کو سلمیٰ بی کے گھر چھوڑتے جائیں وہ اُدھر ہی جا رہے تھے۔

زینب : اور یہ بی بی شبنم بھی ساتھ میں گھ گئیں۔ نہ شرم نہ حیا۔ بی بی مانو یا نہ مانو آج کل آنکھوں کا پانی مر گیا ہے۔

صغرا : آپ بیٹھیے تو۔ عمر میاں سمجھ دار ہیں ایسے ویسے نہیں اور پھر فریدہ بی بھی تو ساتھ میں ہیں۔

زینب : (تخت پر بیٹھتے ہوئے) مرد کو پھنستے دیر نہیں لگتی صغرا۔ ایسی چھمک چھلوئیں چٹکیوں میں مرد کو ایسا ویسا بنا دیتی ہیں۔

(جلال پانی کا گلاس لیے آتا ہے اور زینب کو دیکھ کر)

جلال : چچی اماں۔ السلام علیکم۔

زینب : خوش رہو بیٹا جگ جگ جیو۔ (صغرا پانی پی کر گلاس واپس کرتی ہے)

بیٹا : ایک گلاس مجھے بھی پلا دے حلق سوکھ رہا ہے۔

جلال : بہت اچھا۔

صغرا : اور بیٹا پاندان بھی اُٹھاتا لاتا۔

جلال : بہت اچھا۔

(چلا جاتا ہے)

زینب : شبی نظر نہیں آ رہی کہاں ہے؟

صغرا : سلمیٰ بی نے روک لیا۔ میں نے بھی سوچا کہ ان کا بھی دل بہلے گا اس لیے چھوڑ آئی۔

زینب : بی بی تم کتنی ہی للو پتو کرو نند نند ہی رہے گی۔

(صغرا کے چہرے پر ناگواری کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ بات ٹالنے کے انداز میں)۔

صغرا : میں نے سلمٰی بی کے یہاں آپ کا بہت انتظار کیا مگر ـــــ

زینب : (بات کاٹ کر) بی بی کیا آتی گھر کے جھمیلے کہاں چھوڑتے ہیں کہ کہیں آؤں جاؤں۔ سلمٰی نے تو میرا نہیں پوچھا۔

صغرا : ہوش ہی کس کے ٹھکانے تھے زینب چچی کو دیکھتا کون آیا کون گیا۔ (جلال پانی کا گلاس اور پاندان لے کر آتا ہے۔ زینب گلاس لے کر)

زینب : جیتا رہ بیٹا۔

ا : (پاندان لے کر اپنے سامنے رکھتے ہوئے) ابا جی کیا کر رہے ہیں۔

جلال : بڑبڑا رہے ہیں۔ انھیں چائے ابھی تک نہیں ملی۔

صغرا : فریدہ بی نے نہیں پلائی۔

جلال : وہ نماز پڑھ رہے تھے رکھے رکھے ٹھنڈی ہوگئی۔ امی اگر آپ کہیں تو میں بنا لاؤں (ہنس کر) ایسی چٹ پٹی بارہ مسالے کی بناؤں گا کہ چچی اماں بھی زندگی بھر یاد رکھیں گی۔

صغرا : (ہنس کر) بس اپنی چائے رہنے دے۔ چل میں بناتی ہوں (کھڑی ہو کر) چلیے زینب چچی وہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔

زینب : نہیں بی بی۔ اب میں چلوں۔ رانی اکیلی ہے۔

صغرا : چلی جایئے گا۔ چائے تو پی لیجیے۔ جلال پاندان اٹھا لا۔

(پردہ)

تیسرا اسین

منظر : وہی کمرہ۔ عمر ایک آرام کرسی پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا ہے۔ فریدہ تخت پر پانو لٹکائے بے مقصد سی بیٹھی ہے۔ کبھی کبھی عمر کو دیکھ لیتی ہے اور پھر پانو ہلانے لگتی ہے۔ پھر جیسے کوئی بات یاد آجانے پر۔

فریدہ : بھائی صاحب (عمر اخبار پر نظریں جمائے رہتا ہے) سنیے تو۔ (عمر فریدہ کی

طرف دیکھتا ہے) شبنم بہت اچھی لڑکی ہے۔

عمر : (پھر اخبار پر نظریں جما کر) پھر میں کیا کروں بہت سی لڑکیاں اچھی ہوتی ہیں۔

فریدہ : مگر وہ تو بہت اچھی ہے۔

عمر : کچھ لڑکیاں بہت ہی اچھی سے اچھی ہوں گی۔

فریدہ : تو گویا آپ کو شبنم پسند نہیں حالانکہ وہ آپ کو بہت پسند کرتی ہے۔

عمر : (چہرے کے سامنے سے اخبار ہٹا کر شرارت سے) اگر ایسی بات ہے تو مجھے بھی اسے پسند کرنے کی کوشش کرنی پڑے گی۔

فریدہ : (عمر کی شرارت کو محسوس کر کے حقارت سے) آپ کو تو وہی کلپھڑی بھتنی پسند ہے۔

عمر : (غور سے فریدہ کو دیکھ کر) کون کلپھڑی بھتنی۔

فریدہ : محترمہ رانی۔ دی پھنیچر۔

عمر : (سنجیدہ ہوکر) میں نے آج تک رانی کو نہیں دیکھا کہ وہ بھتنی ہے، کلپھڑی ہے یا پھنیچر۔ اس لیے آپ کی طرح اس کی شان میں قصیدہ نہیں پڑھ سکتا۔

فریدہ : اور جس دن آپ ان کو ملاحظہ فرمالیں گے اسی دن بھابی جان کی عقل پر فاتحہ پڑھیں گے جو اُن بیگم صاحب سے آپ کی شادی کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔

عمر : ابھی شادی ہی کون مسخرہ کررہا ہے کہ قصیدہ یا فاتحہ پڑھنے کا سوال پیدا ہو۔

فریدہ : گویا بھابی اپنی اسکیم میں کامیاب ہوتی جارہی ہیں۔

عمر : کیسی اسکیم۔

فریدہ : یہی کہ ابھی آپ شادی نہ کریں اور اگر کریں تو ان کے خاندان میں کہ ساری جائداد اُن کے قبضہ میں رہے۔

عمر : یہ جائداد وائداد کے چکر، میں نہیں سمجھتا۔ جو جس کا حق ہے اُسے ملے گا۔

فریدہ : مگر وہ انتہائی چالاکی سے سب کچھ اپنے قبضے میں کرتی جارہی ہیں۔

عمر : کیسے قبضہ میں کرتی جارہی ہیں۔

فریدہ : یہ قبضہ میں کرنا نہیں ہے کہ ابا جی کی پینشن تک ہڑپ کرلیتی ہیں۔ اس دن

میں نے ابا جی سے پینشن لانے کو کہا تو جھٹ کتابیں منگا دیں کہ پینشن کی رقم کہیں میرے ہاتھ نہ پڑ جائے۔

عمر : پھر اس سے کیا فرق پڑ گیا۔

فریدہ : کیوں نہیں پڑ گیا۔ پینشن کے روپے سے فوراً بیگم رفیع کے جھمکے خرید لیے اب مٹکے مٹکے پھریں گی۔

(عمر غور سے فریدہ کو دیکھتا ہے اس کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے فریدہ کی باتیں ناگوار گزر رہی ہیں۔ اس طرح خاموش رہتا ہے جیسے اب اس مسئلہ پر گفتگو کرنا نہیں چاہتا کہ اسی وقت صغرا کمرے میں آتی ہیں۔ ان کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے فریدہ اور عمر کی گفتگو سن لی ہے۔ کچھ دیر کھڑی رہتی ہیں جیسے ستا رہی ہوں۔ پھر کرسی پر بیٹھ جاتی ہیں کچھ دیر بے مقصد سامنے دیکھتی رہتی ہیں پھر عمر کی طرف دیکھ کر)

صغرا : عمر میاں اسپتال کب جاؤ گے۔

عمر : بس جا ہی رہا ہوں بھابی جان۔

صغرا : اس لونڈے نے زندگی عذاب بنا دی ہے آج تو اسپتال سے چھٹی مل جائے گی۔

عمر : جی ہاں۔ مگر پلاسٹر کھلنے میں آٹھ دس دن لگ جائیں گے۔

صغرا : امتحان نزدیک آگیا ہے (ٹھنڈی سانس بھر کر) اللہ ہی مالک ہے۔

عمر : (مسکرا کر) آپ فکر نہ کریں وہ اچھے نمبروں سے پاس ہوگا۔ اس کی شرارت اور ذہانت دونوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

صغرا : عمر میاں۔ اس کا ہاتھ تو ٹھیک ہو جائے گا نا۔

عمر : (ہنس کر) بالکل ٹھیک ہو جائے گا بھابی جان آپ بلاوجہ پریشان ہو رہی ہیں۔

صغرا : ایسی باتوں سے مجھے ہول سا ہوتا ہے بھیا۔

عمر : ہول اٹھنے کی کوئی بات نہیں ہے بھابی جان (ہنس کر) مگر حضرت کو بھی کیا کیا نئی نئی شرارتیں سوجھتی ہیں (کھڑے ہو کر) اچھا میں اسپتال جا رہا ہوں۔

صغرا : اچھا۔ ذرا جلدی آجانا۔ (عمر مسکرا کر دروازے کی طرف بڑھتا ہے کہ اسی وقت شبنم کمرے میں آتی ہے۔ عمر کو دیکھ کر تھوڑی دیر رکتی ہے۔ عمر نظریں جھکائے اس کے پاس سے گزر جاتا ہے۔صغرا شبنم کو دیکھ کر) آؤ شبنم بی بی اچھی تو ہو۔

شبنم : آپ کی دعائیں ہیں۔

صغرا : بہت دن میں آئیں۔ اب طبیعت کیسی ہے۔

شبنم : معمولی سا بخار تھا۔ اب بالکل ٹھیک ہوں۔

صغرا : ادھر تم کئی دن سے نہیں آئیں۔ پھر فریدہ بی نے بتلایا کہ بیمار ہو، تو فکر ہوگئی۔ (کرسی کی طرف اشارہ کرکے) کھڑی کیوں ہو بیٹھو نا۔

شبنم : (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) جلال میاں ابھی اسپتال ہی میں ہیں؟

صغرا : آج چھٹی مل جائے گی۔ عمر میاں اسپتال ہی گئے ہیں۔ شبنم بی بی! میں تو اس لونڈے کی شرارتوں سے عاجز آچکی ہوں۔ نت نئی شرارتیں سوجھتی ہیں۔

شبنم : (مسکرا کر) ذہین بچے ہمیشہ شریر ہوتے ہیں آپ فکر نہ کریں سدھر جائیں گے۔

صغرا : (ٹھنڈی سانس بھر کر) اللہ مالک ہے۔ (کھڑی ہوکر) تم بیٹھو میں چائے لاتی ہوں۔

شبنم : بھابی جان اس وقت چائے کی کیا ضرورت ہے۔

صغرا : ارے واہ بی بی کیوں نہیں۔ کیا تم روز روز آتی ہو۔
(کمرے سے چلی جاتی ہیں۔ فریدہ شبنم کو دیکھ کر طنزیہ)

فریدہ : اور جو روز روز آئے یہ اس سے چائے کا بھی نہیں پوچھیں گی۔ (شبنم خاموش رہتی ہے) اور سناؤ امتحان کی تیاری کیسی چل رہی ہے۔

شبنم : امتحان کی تیاری تو چل رہی ہے۔ مگر تم کس مرض میں مبتلا ہو۔ کئی دن سے غائب ہو۔

فریدہ : امتحان تو ہمارا بھی سر پر ہے۔ اور پھر۔

شبنم : (لقمہ دے کر) اپنی شادی کی تیاریاں بھی کرنا پڑ رہی ہیں۔

فریدہ : کیا مطلب!

شبنم : اچھا۔ بڑی بھولی ہو میری بنو۔ (ہنس کر) ہاتھ اچھا مار رہی ہو۔ ابھی تو خیر انجینئر ہیں مگر کمپنی انھیں ٹریننگ کے لیے فارن بھیج رہی ہے۔ واپسی پر پراسپیکٹ اچھے ہیں۔

فریدہ : میں آپ کا مطلب بالکل نہیں سمجھی۔ (ہنس کر) شاید حضور کی تشریف کسی چنڈو خانے سے آرہی ہے۔

شبنم : (مسکرا کر) بھئی آتو میں سیدھی گھر سے رہی ہوں اور وہاں سب روزے نماز اور شرع شریف کے پابند لوگ ہیں۔ چنڈو خانے کی نہیں اڑاتے۔

فریدہ : (سنجیدہ ہو کر) بخدا مجھے کوئی علم نہیں۔

شبنم : (شرارت آمیز لہجے میں) مگر کہیں انکار نہ کر دینا۔ تمھارے ہوتے وہ انجینئرنگ کی اعلا تعلیم کے لیے فارن جائیں تم بھی ان کے ساتھ نتھی ہو جانا لگے ہاتھوں تمھیں بھی ڈاکٹری کی اعلا تعلیم مل جائے گی۔

فریدہ : لیکن یہ کیا مقدمہ ہے مجھے تو اس کا کوئی پتا نہیں۔

شبنم : (غور سے فریدہ کو دیکھ کر) سچ کہہ رہی ہو۔

فریدہ : تو کیا جھوٹ بول رہی ہوں۔

شبنم : تمھاری بھابی جان کے کوئی خالہ زاد بھائی ہیں اسد علی۔

فریدہ : ہاں۔ وہ تو اکثر بھابی جان کے پاس آتے رہتے ہیں۔

شبنم : (مسکرا کر) پھر کیا خیال ہے ان کے متعلق۔ (فریدہ خاموش رہتی ہے شبنم ہنس کر) ابھی سے شرما گئیں۔ (فریدہ اب بھی خاموش رہتی ہے چہرہ سنجیدہ ہو جاتا ہے) ویسے شکل وصورت سے تو وہ پھٹیچر یا چڑی مار نہ ہوں گے۔

فریدہ : چھوڑ اس بکواس کو۔ یہ بتاؤ کہ—

شبنم : (بات کاٹ کر) دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے مگر زبان سے بکواس

کہہ رہی ہیں۔ (شرارت کے لہجے میں) چھٹے مہینے میں تم بھی کوئی ٹٹ پنجیالیڈی ڈاکٹر ہوہی جاؤ گی اور انھیں بھی کم از کم اتنے دن تو فارن جانے میں لگ ہی جائیں گی۔ (ہنس کر)ہنی مون کسی جہاز کے عرشہ پر منا لینا۔

فریدہ : (سنجیدہ ہوکر) لیکن یہ سب کچھ تمھیں کیسے معلوم ہوا۔

شبنم : (ہنس کر) تمھیں اس سے مطلب۔ مگر راوی جو کچھ کہتا ہے سچ کہتا ہے اور سچ کے علاوہ کچھ نہیں کہتا اور اس کے بعد چین ہی چین لکھتا ہے۔

فریدہ : (بات ٹالنے کے انداز میں) ارے ہاں تمھارے بھائی جان کی نوکری کا کیا ہوا۔

شبنم : کیا مطلب؟

شبنم : مطلب یہ کہ تحریری امتحان میں میرٹ لسٹ میں تھرڈ پوزیشن انٹرویو میں فیل۔

فریدہ : چلو اچھا ہوا۔ انٹرویو میں پاس ہونے والے سفارشی لوگ ہوتے ہیں۔ بالکل نمبر ایک کے پھسڈی۔

(صفرا چائے لے کر آتی ہے۔ شبنم اسے دیکھ کر)

شبنم : میرے آجانے سے آپ کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔

صفرا : واہ شبنم بی بی۔ اس میں تکلیف کی کون سی بات ہے۔

شبنم : اب آپ کو اس وقت چولھا پھونکنا پڑا۔ یہ تکلیف نہیں ہے۔

صفرا : (مسکرا کر چائے کی کشتی میز پر رکھ کر) تو میں کہاں کی دبلی ہوگئی— اچھا اب تم دونوں چائے پیو۔ میں ابا جی کے لیے وضو کا پانی گرم کردوں۔

شبنم : آپ بھی تو چائے پی لیجیے۔

صفرا : ابا جی وضو کے لیے بیٹھے ہیں۔

(صفرا دروازے کی طرف جاتی ہے۔ شبنم اسے جاتا ہوا دیکھ کر)

شبنم : بھابی جان۔ امی آپ کو بہت یاد کرتی ہیں کسی دن تشریف لائیے۔

صفرا : (مڑ کر شبنم کو دیکھ کر) ان سے ملنے کو تو میرا بھی جی بہت چاہتا ہے— لیکن تم دیکھتی تو ہو گھر کے بکھیڑوں سے کہاں فرصت ملتی ہے۔ کسی دن انھیں یہیں

لے آؤ۔ (باہر سے آواز۔ دُلہن) ابا جی آواز دے رہے ہیں اچھا میں کسی دن آؤں گی۔

(تیزی سے کمرے سے چلی جاتی ہیں)

شبنم : (فریدہ سے) بے چاری دن بھر کام میں جٹی رہتی ہیں (فریدہ خاموش رہتی ہے) تم بھی ذرا ان کا ہاتھ بٹا لیا کرو نا۔

فریدہ : (ہنس کر) تم نے تو ابھی سے ان کی خوشامد شروع کر دی۔ ابھی تو بھائی صاحب نے تمھیں پسند کرنے کی کوشش کی ہے۔

شبنم بدتمیز۔ مجھے تیرے یہاں آنا چھوڑنا پڑے گا۔

فریدہ : پھر بیچارے بھائی صاحب بہت اداس رہنے لگیں گے (چائے کی پیالی شبنم کو دیتے ہوئے) آج کل وہ چڑی مار نظر نہیں آ رہا۔ (ہنس کر) شاید تم نے اسے ناامید کر دیا۔

(اسی وقت عمر اور جلال کمرے میں آتے ہیں۔ جلال کے ہاتھ پر پلاسٹر چڑھا ہوا ہے۔ صحت گری ہوئی ہے مگر چہرے پر مسکراہٹ ہے (شبنم جلال کو دیکھ کر)

شبنم : جلال میاں یہ تو تا کیسے پال لیا۔

جلال : (صوفے پر بیٹھ کر) ارے کچھ نہیں شبنم آپا چلڈرن پارک میں بچے پھسلن پٹی پر پھسل رہے تھے میں نے کہا میں سائیکل پر بیٹھ کر اتر سکتا ہوں۔ بس سائیکل گر پڑی۔

شبنم (ہنس کر) اور یہ تو تا انعام میں مل گیا۔ اب تو تکلیف نہیں ہے۔

جلال : اب تو ٹھیک ہے۔ ذرا پلاسٹر کھل جائے ایک مرتبہ تو سائیکل اتار کر ہی رہوں گا۔

عمر : اور ہاتھ کے ساتھ ٹانگ بھی برابر کر لوں گا۔ کیوں مسٹر جلال؟

جلال : وہ تو چچا جان خیال دوسری طرف بٹ گیا تھا ورنہ۔

عمر : ہاتھ کے ساتھ ٹانگ بھی برابر کر لیتا۔ (شبنم اور فریدہ ہنستی ہیں عمر سنجیدہ ہو کر) اب آپ نے یہ حماقت کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔

(جلال خاموش رہتا ہے۔ شبنم کھڑی ہو کر)

شبنم : اچھا اب چلتی ہوں۔ (فریدہ سے) امی تمھیں یاد کر رہی تھیں۔

فریدہ : کل ضرور آؤں گی۔ امی سے آداب کہہ دینا۔

(فریدہ اور شبنم دروازے کی طرف بڑھتی ہیں کہ صغرا کمرے میں آتی ہیں اور شبنم کو جاتا ہوا دیکھ کر)

صغرا : کیوں شبنم بی بی جا رہی ہو۔

شبنم : جی ہاں۔ کالج سے اِدھر ہی چلی آئی تھی۔ امی فکرمند ہوں گی۔ پھر آؤں گی۔

صغرا : خدا حافظ۔ تم دو دن نہیں آتیں تو یاد ہونے لگتی ہو۔

شبنم : اب جلدی آنے کی کوشش کروں گی۔ آداب۔

صغرا : جیتی رہو۔ اپنی امی سے میرا اسلام کہنا۔

شبنم : بہت اچھا۔

(شبنم اور فریدہ چلی جاتی ہیں۔ صغرا جلال کے پاس بیٹھ کر پلاسٹر چڑھے ہاتھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے)

صغرا : اب تو تیرے ہاتھ میں تکلیف نہیں ہے۔

جلال : نہیں امی بالکل نہیں۔ آپ مجھے اسپتال میں صرف ایک بار دیکھنے آئیں مجھے بہت یاد ہوتی تھیں۔

صغرا : میں تجھ سے بہت ناراض ہوں۔ (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) تو نے مجھے بہت پریشان کر رکھا ہے۔ (جلال کچھ دیر صغرا کا چہرہ دیکھتا رہتا ہے پھر اس کی گود میں سر رکھ کر ہچکیوں سے رونے لگتا ہے۔ صغرا اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے آنسو پونچھ کر) اب کیوں روتا ہے چل مت رو۔

جلال : (روتے ہوئے) کیا آپ اسی لیے نہیں آئیں کہ میں خراب لڑکا ہوں۔

صغرا : دیکھ بیٹا۔ تو شرارت کرتا ہے تو سب پریشان ہو جاتے ہیں اور تجھے بھی دکھ اٹھانے پڑتے ہیں۔ (جلال برابر روتا رہتا ہے) چل اب رونا بند کر حلوا

کھائے گا۔ میں نے تیرے لیے حلوا پکا کر رکھا ہے۔ چل اٹھ منہ ہاتھ دھو لے میں تیرے لیے حلوا لاتی ہوں۔

جلال : مگر امی میں نے شرارت کہاں کی تھی۔ میں نے تو سائیکل۔

عمر : (مسکرا کر بات کاٹتے ہوئے) چلو تم نے شرارت نہیں کی تھی۔ (پیالی میں چائے نکال کر اسے دیتے ہوئے) لو چائے پیو۔ بھابی جان آپ اس کے لیے حلوا لے آیئے۔

(صغرا کمرے سے چلی جاتی ہے۔ جلال چائے کا گھونٹ لے کر)

جلال : چچا جان شیبی کہاں ہے۔

عمر : سلمٰی کے یہاں گئی ہے شام کو آجائے گی۔

(جلال چائے پینے لگتا ہے کہ دادا جان کمرے میں آتے ہیں اور جلال کو دیکھ کر)

دادا جان : کیوں بیٹا آ گئے (جلال اسی طرح نظریں جھکائے بیٹھا رہتا ہے۔ جیسے بہت شرمندہ ہو۔ دادا جان اس کے پاس بیٹھ کر) بس ذرا سی تکلیف میں ہمت ہار دی اور کہتے ہو ہوائی جہاز اڑاؤں گا۔

عمر : ابا جی آپ نے چائے پی۔

دادا جان : لاؤ ایک پیالہ مجھے بھی دے دو۔ (پھر جلال کی طرف دیکھ کر) کھیل کود میں تو ایسی چوٹیں لگ ہی جاتی ہیں۔ میں جب جوانی میں فٹ بال کھیلتا تھا تو ایسی جانے کتنی چوٹیں آجاتی تھیں۔

جلال : (حیرت سے) ابا جی۔ آپ فٹ بال کھیلتے تھے۔

دادا جان : کیوں نہیں۔ (ذرا سینہ پھلا کر اکڑتے ہوئے) میں تو اپنی رجمنٹ کا سب سے اچھا کھلاڑی مانا جاتا تھا۔ (جلال ایسی نظروں سے انھیں دیکھتا ہے جیسے ان کی باتوں پر یقین نہ آرہا ہو) جنگ کے زمانے میں ہم جنگی قیدیوں سے میچ کھیلا کرتے تھے۔

جلال : جنگی قیدیوں سے!

دادا جان : ہاں ہم نے جنگ میں بہت سے قیدی بنا لیے تھے۔ وہ سب بیچارے بہت اداس رہتے تھے۔ ان کو خوش رکھنے کو ہم ان سے فٹ بال میچ کھیلتے تاش اور دوسرے کھیل کھیلتے۔ ان کو اپنے یہاں کے گانے سکھاتے ان سے ان کے یہاں کے گانے سیکھتے۔

جلال : مگر وہ تو آپ کے دشمن تھے ابا جی۔

دادا جان : ہاں بیٹا۔ (کچھ دیر خلا میں گھورتے ہوئے) مگر ان کی اور ہماری حالت ایک جیسی تھی۔ ان کو اپنے بیوی بچے یاد آتے تھے تو ہم کو بھی اپنے بیوی بچے یاد آتے تھے۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہم دونوں کو پتا ہی نہ تھا کہ ہم کیوں لڑ رہے ہیں۔ بس ہم کو حکم ملتا کہ گولیاں چلاؤ اور ہم گولیاں چلانے لگتے۔

عمر : ابا جی جب یہ موضوع آپ کے لیے اس قدر تکلیف دہ ہے تو آپ اسے یاد ہی کیوں کرتے ہیں۔

دادا جان : (کچھ دیر عمر کو خالی خالی نظروں سے دیکھتے رہتے ہیں پھر ٹھنڈی سانس بھر کر) بڑھاپے میں جوانی کی باتیں یاد آتی ہیں اور یہی میری جوانی کی یادیں ہیں۔ (کچھ دیر خلا میں دیکھتے رہتے ہیں پھر اس انداز سے جیسے خود سے کہہ رہے ہوں) جب ہم کسی مورچہ پر قبضہ کرتے تو ایسے خوش ہوتے جیسے ہم نے کوئی فٹ بال میچ جیت لیا ہو۔ جب ہم اپنے ہتھیار لے کر جنگی قیدیوں کے سامنے سے گزرتے تھے۔ عمر۔ میں ان کی ان مایوس نگاہوں کو کبھی نہیں بھول سکتا جو ہمارے ہتھیار دیکھ کر ان کے چہروں پر پیدا ہوتی تھی۔ (آنکھیں بند کر کے صوفے کی پشت سے ٹک جاتے ہیں۔ چائے کی پیالی ابھی تک ان کے ہاتھ میں ہے۔ عمر کچھ دیر بعد)

عمر : ابا جی آپ کی چائے۔

دادا جان : اوہ ہاں۔ (آنکھیں کھول کر ایک گھونٹ لے کر) ٹھنڈی ہوگئی۔

(پیالی سامنے میز پر رکھتے ہیں کہ صغرا ایک پلیٹ میں حلوا لے کر آتی ہے۔

دل ہولوں پر ہے۔ راتوں کی نیند حرام ہوگئی ہے۔ ٹھیک تو ہو جائے گا نا۔

فریدہ : معمولی فریکچر ہے پتا بھی نہیں چلے گا۔

زینب : اور یہ صغرا کس دیس گئی ہوئی ہیں۔

فریدہ : ابا جی کے لیے چائے بنا رہی ہیں۔

زینب : اے بی بی تم ذرا ہاتھ بٹا لیا کرو۔ دن بھر چھلاوا پائی کی طرح گھومتی رہتی ہے۔ میں تو جب پندرہ برس کی تھی اللہ بخشے امی کو، سب کچھ مجھ پر چھوڑ کر مصلّی پکڑ لیا تھا۔

فریدہ : جب بھابی جان سب کچھ اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہیں تو میں کیوں دخل دوں۔ وہ جانیں ان کا کام جانے۔

زینب : اے فریدہ بی ایسی بھی کیا بیزاری۔ اے لو کم بختی ماری بھول ہی گئی ابھی راستہ میں مجھے وہ چھمک چھلو دکھی تھی۔

فریدہ : کون چھمک چھلو؟

زینب : ارے وہی کیا نام ہے کم بختا مارا دماغ بھی کیا ہے۔ نام ہی یاد نہیں رہتا ارے وہی تمھاری سہیلی۔

فریدہ : شبنم۔

زینب : اے ہاں بی بی وہی۔ بھلا یہ بھی کوئی نام ہوا۔ سچ مانو بی بی ایسے نام تو ہمارے زمانے میں گانے والیوں کے ہوتے تھے۔ (فریدہ کے چہرے پر ناگواری کے آثار پیدا ہوتے ہیں) اب تم بھلا مانو یا برا اس سے تمھارا میل جول مجھے پھوٹی آنکھ نہیں بھاتا۔

فریدہ : (ناگواری سے) کیا برائی ہے اس میں۔

زینب : اے لو برائی پوچھتی ہو۔ اس کی ماں کے پرنانا نے کوئی کم ذات عورت گھر میں ڈال لی تھی۔

فریدہ : تو اس میں شبنم کا کیا قصور ہے۔

زینب : اے لو کچھ ہوا ہی نہیں۔ سو پشتوں تک ہڈی اور خون بولتا ہے۔

فریدہ : (بیزاری سے) آپ کے زمانے میں بولتا ہوگا۔ ہمارے زمانے میں اس نے بولنا چھوڑ دیا ہے۔

زینب : اے فریدہ بی ہوش کی دوا کرو ہمارے بزرگ ہڈی اور خون پہلے پرکھتے تھے پھر پاس بٹھلاتے تھے۔

(اسی وقت دادا جان کمرے میں آتے ہوئے)

دادا جان : فریدہ۔

فریدہ : (تیزی سے کھڑے ہوکر) ابا جی اِدھر زینب چچی بیٹھی ہیں۔

دادا جان : (دوسری طرف منہ کرکے) اچھا میرا سلام عرض کرو۔

زینب : (دوپٹے سے آڑ کرتے ہوئے) اے ہے کرنیل صاحب کچھ تو غیرت کرو۔ اونٹ کی طرح منہ اٹھائے دھسے چلے آرہے ہو۔

دادا جان : (ہنس کر) پہلے سلام کا جواب تو دیجیے پھر لڑ بھی لیجیے گا۔

زینب : اے نوج میں کیوں لڑنے لگی۔

دادا جان : (ہنس کر) تو پھر دعائیں ہی دے دیجیے۔

زینب : ہاں پالنے میں پڑے للنا ہونا کہ کالا ٹیکہ لگا کر نظر اتاری جائے اور بلائیں لی جائیں۔

دادا جان : اچھا تو دعائیں اور سلام کا جواب ادھار رہا پھر کبھی وصول کرلوں گا۔ فریدہ دلہن سے کہنا میں سلمٰی کے یہاں جارہا ہوں۔

فریدہ : بہت اچھا۔

(اسی وقت صغرا کمرے میں آتی ہے۔ دادا جان اسے دیکھ کر)

دادا جان : دلہن میں سلمٰی کے یہاں جارہا ہوں۔

صغرا : آپ کھانے کے وقت تک تو آجائیں گے۔

دادا جان : اگر نہ آسکوں تو کھانے پر میرا انتظار نہ کرنا۔

(چلے جاتے ہیں۔ صغرا زینب کے پاس آکر)

صغرا : زینب چچی آداب۔

زینب : جیتی رہو۔ آؤ بیٹھو۔ جلال میاں کا سنا تو چلی آئی اب تو ماشاء اللہ ٹھیک ہے۔

صغرا : اب پلاسٹر کھلنے پر پتا چلے گا۔

(جلال کمرے میں آکر)

جلال : امی میں ابا جی کے ساتھ جارہا ہوں شپی کو ساتھ لیتا آؤں گا۔

صغرا : اچھا۔ پر راستے میں شرارت نہ کرنا۔ سڑک کے کنارے کنارے جانا۔

جلال : بہت اچھا۔

(جلال کمرے سے چلا جاتا ہے)

زینب : سنا ہے عمر میاں نے کوئی اور پڑھائی شروع کردی ہے۔

صغرا : (تخت پر بیٹھ کر پاندان اپنی طرف کھینچتے ہوئے) ابھی تو نہیں کی مگر سوچ ضرور رہے ہیں۔

زینب : توبہ ہے بی بی۔ آج کل موئی نئی نئی پڑھائیاں نکل آئی ہیں۔ موا انسان ساری زندگی پڑھتا رہے پھر بھی پیٹ نہ بھرے۔ کتنے سال کی ہوتی ہے یہ پڑھائی۔

صغرا : عمر میاں تین چار کا بتلا رہے تھے۔

زینب : ایسی پڑھائی سے توبہ بھلی۔ جس پڑھائی میں بچے بوڑھے ہوجاتے ہیں۔ (صغرا پان دیتی ہے۔ زینب پان منہ میں رکھ کر) اب رانی تو اور پڑھنے کے لیے بہت پھڑ پھڑائی مگر بی بی لڑکی دلھن بنے اور بالوں سے چاندی جھلکے وہ بھی کوئی دلھن ہوئی۔ میں نے تو نہیں پڑھنے دیا۔ (اگالدان اٹھا کر اس میں تھوک کر تھوڑی دیر خاموش رہ کر) اب تم لوگوں کا کیا خیال ہے۔

صغرا : عمر میاں تو پہلے ہی کنیاں کاٹ رہے تھے۔ اب تو اور پڑھائی کی دھن سوار ہوگئی ہے۔

زینب : (ناگواری کے لہجے میں) وہ تو میں پہلے ہی جان گئی تھی کہ اب اس گھر کے رنگ ڈھنگ اچھے نہیں رہے۔

صغرا : کیا رنگ ڈھنگ اچھے نہیں رہے۔

زینب : پرائی لڑکیوں سے ٹھٹھے بازی اور ہی ہی ہاہا کرنا کوئی اچھے لچھن ہیں۔

صغرا : آپ کو تو جانے کیا شک ہوگیا ہے۔ میں نے عمر میاں کو اولاد کی طرح پالا ہے۔ میں انھیں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔

زینب : اپنے مال میں کیڑے کسے نظر آتے ہیں میں تو پہلے ہی جان گئی تھی کہ عمر میاں اب تمھارے بس میں نہیں رہے۔

صغرا : جلال میرے قابو سے باہر ہوسکتا ہے مگر عمر میاں نہیں۔

زینب : میں تو فہمیدہ کے کہنے پر چپ تھی اچھے اچھے پیغام آئے اور لوٹا دیے۔ بی بی ایسی دغا کرنی تھی تو پہلے ہی کہہ دیا ہوتا۔ میں تمھارے ہاتھ جوڑنے نہیں آئی تھی۔ تمھیں میرے گھر کے سوسو چکر لگا کر جوتیاں گھستی رہتی تھیں۔

صغرا : انکار کس کو ہے مگر—

زینب : (بات کاٹ کر) اب میں قبر میں پانو لٹکائے بیٹھی ہوں جانے کب بلاوا آجائے۔ سوچتی تھی کہ میری زندگی میں رانی کے ہاتھ پیلے ہوجاتے تو چین سے مرتی۔ (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) اس سفید چونڈے کی خوب عزت بڑھائی بی بی۔

صغرا : مگر زینب چچی۔

زینب : (بات کاٹ کر) بس بی بی اب رہنے دو۔ میری بچی کو تو اچھا برا گھر مل ہی جائے گا۔ مگر تمھاری اصلیت معلوم ہوگئی۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) میں نے تو سوچا تھا گھر کی لڑکی گھر میں رہے گی۔ (غصہ سے کھڑی ہوکر برقع اٹھا کر) اب تمھیں کوئی شہزادی مل جائے اسی سے کرلینا۔

فریدہ : مگر چچی آپ بیٹھیے تو۔

زینب : تھو ہے اس گھر پر جو اب میں قدم بھی رکھوں۔

(تیزی سے کمرے سے چلی جاتی ہیں۔ صغرا اپنے آنسو پونچھتی ہے۔ فریدہ کچھ دیر خاموش رہ کر)

فریدہ : بھابی جان آپ نے بلاوجہ زینب چچی کو ناراض کر دیا۔

صغرا : میں اپنے خاندان میں شادی ہی کرنا نہیں چاہتی ایک مرتبہ گالیاں سن لیں ہمیشہ کے لیے قصہ تمام ہو گیا۔

(فریدہ صغرا کا چہرہ غور سے دیکھنے لگتی ہے)

(پردہ)

چوتھا سین

منظر : وہی کمرہ۔ پندرہ دن بعد۔ کمرے میں فریدہ اکیلی ہے اور ٹہل رہی ہے۔ چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی ہے کہ شبنم کمرے میں آتی ہے اور فریدہ کو اس عالم میں دیکھ کر مسکراتے ہوئے۔

شبنم : ارے فریدہ۔ تم تو ابھی سے مسٹر اسد کی یاد میں کچھ دیوانی سی رہنے لگیں (فریدہ شبنم کو دیکھتی ہے۔ مگر خاموش رہتی ہے۔ شبنم اس کی سنجیدگی کو محسوس کر کے) کیا بات ہے اس قدر خاموش اور اداس کیوں ہو۔

فریدہ : بیٹھو۔ کب آئیں۔

شبنم : بس چلی ہی آ رہی ہوں۔ سنا تھا ابا جی کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔

فریدہ : ہاں کچھ دن سے انھیں بخار آ رہا ہے۔ تم بیٹھو نا۔

شبنم : (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) خیریت تو ہے۔ تم اس قدر پریشان کیوں ہو۔ (فریدہ میز پر سے ایک پاس بک اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتی ہے۔ شبنم پاس بک دیکھتے ہوئے) یہ کیا ہے۔

فریدہ : بینک کی پاس بک۔ بھابی جان نے مجھے دی ہے۔

شبنم : پھر۔

فریدہ : (پاس بک پھر میز پر رکھتے ہوئے) اس میں کئی ہزار روپے میرے نام پر جمع ہیں۔ ہر مہینے پندرہ سال سے برابر جمع ہو رہے ہیں۔ (سوچتے ہوئے) اس

مرتبہ ابا جی کی پینشن بھی انھوں نے مجھے دے دی تھی (کچھ دیر خاموش رہ کر) سمجھ میں نہیں آتا کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا۔

شبنم : وہ شاید کسی بات پر ناراض ہوگئی ہیں۔

فریدہ : مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کس بات پر ناراض ہوئی ہیں۔ پہلے تو وہ ہمیشہ خوش رہتی تھیں مگر اب کچھ دن سے خاموش خاموش اور اداس ہیں۔

شبنم : ممکن ہے انھیں عمر صاحب کی منگنی ٹوٹ جانے کا غم ہو۔

فریدہ : مگر یہ منگنی بھی تو انھوں نے ہی توڑی ہے۔

شبنم : عمر صاحب نے تو کوئی بات نہیں کہہ دی۔

فریدہ : بھائی صاحب تو قسمیں کھاتے ہیں کہ انھوں نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی اور پھر بھائی صاحب کا مزاج ایسا ہے کہ اگر بھابی جان ان سے رانی سے نہیں مہترانی سے شادی کرنے کو کہیں تو بھی وہ اعتراض نہیں کریں گے۔

(فریدہ خاموش ہو کر ٹہلنے لگتی ہے۔ شبنم کچھ دیر بعد)

شبنم : اور مسٹر اسد کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے۔

فریدہ : اس سلسلے میں وہ بالکل خاموش ہیں۔ اور ان کی خاموشی کا مطلب ہمیشہ انکار ہوتا ہے۔

شبنم : (سوچتے ہوئے) تمھارا کیا خیال ہے میں بھابی جان سے بات کروں۔

فریدہ : بیکار ہے۔ وہ بھائی جان اور بھائی صاحب کو ہی اس سلسلے میں ٹال رہی ہیں۔

شبنم : بہرحال تمھیں کوئی اعتراض نہیں۔ (فریدہ خاموش رہتی ہے) ابا حضور تو مسٹر اسد کی بہت تعریف کر رہے تھے۔

فریدہ : مگر بھابی جان۔ (کچھ دیر رک کر) ان کی مرضی کے خلاف اس گھر میں پتا نہیں ہل سکتا۔

شبنم : میں ان سے بات کر کے دیکھوں گی شاید ان کی ناراضگی کا سبب معلوم ہو جائے۔

فریدہ : (سوچتے ہوئے اوّل تو وہ خاموش رہیں گی اور اگر تم نے زیادہ زور دیا تو رو

دیں گی۔ کل ہی بھائی صاحب نے ان سے اس سلسلے میں بات کی کچھ دیر تو خاموش بیٹھی رہیں پھر ایک دم رو پڑیں۔ بیچارے بھائی صاحب ایسے گھبرائے کے کمرے سے ہی اٹھ کر چلے آئے۔

(شبنم خاموش ہوجاتی ہے۔ فریدہ ایک کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگتی ہے کہ عمر کمرے میں آتا ہے شبنم کو دیکھ کر کچھ رکتا ہے پھر فریدہ سے)

عمر : فریدہ تم ذرا جاکر ابا جی کا ٹمپریچر لے لو اس وقت بخار کچھ زیادہ معلوم ہورہا ہے۔

فریدہ : بہت اچھا۔

(دروازے کی طرف جاتی ہے۔ شبنم کھڑے ہوکر)

شبنم : ٹھہرو فریدہ میں بھی چل رہی ہوں۔ ابا جی کی مزاج پرسی کرلوں گی۔ (دونوں کمرے سے چلی جاتی ہیں۔ عمر کچھ دیر سوچتے ہوئے کمرے میں ٹہلتا رہتا ہے پھر ایک صوفے پر بیٹھ کر پاس پڑا ہوا رسالہ اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگتا ہے کہ رقیب کمرے میں آکر۔

رقیب : ابا جی کا بخار کچھ کم ہوا؟

عمر : (کھڑے ہوکر اس وقت تو بخار کچھ زیادہ معلوم ہورہا ہے۔ ویسے کوئی خاص بات نہیں ہے۔

رقیب : (فکرمندی سے) مجھے تو بیماری کچھ بڑھتی ہوئی معلوم ہورہی ہے۔

عمر : جی نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے ہے کہ بخار اُتر جائے تو پھر کوئی مرض نہیں ہے۔

رقیب : بخار کیسے اُتر جائے۔ دوا سے وہ پرہیز کرتے ہیں۔ (مسکرا کر) اس بیماری میں تو وہ بالکل بچے ہوگئے ہیں۔ معمولی معمولی باتوں پر ضد کرتے ہیں۔ اور چڑچڑے اس قدر ہوگئے ہیں کہ بچوں تک کو جھڑک دیتے ہیں۔ (ایک کرسی پر بیٹھ کر) سلمٰی آئی یا نہیں۔

عمر : صبح ہی آگئی تھی۔ انھیں کے پاس ہے۔

رقیب : (کچھ دیر خاموش رہ کر سوچتے ہوئے) اس بیماری میں بھی انھیں فریدہ کی شادی کی فکر ہے۔ اگر اسد سے اس کی بات طے ہوجاتی تو ان کو اطمینان ہوجاتا۔

عمر : (رقیب کا چہرہ دیکھ کر) یہ تو ٹھیک ہے بھائی جان مگر جب تک فریدہ کی رائے نہ لے لی جائے اس سلسلے میں قدم اٹھانا مناسب نہیں۔

رقیب : (کچھ دیر عمر کا چہرہ غور سے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر آہستہ سے) کیوں۔ اسد میں کیا برائی ہے جو اس کو اعتراض ہوگا۔

عمر: ممکن ہے کوئی اعتراض ہو۔

رقیب : اسد اچھی جگہ ملازم ہے، صحت مند ہے، خوبصورت ہے نیک اور اب تو اس کا فارن جانا بھی طے ہوگیا ہے اور کیا چاہیے۔ کیا فریدہ کے لیے کوئی لڑکا آسمان سے اترے گا۔

عمر : یہ تو ٹھیک ہے مگر فریدہ کا خیال معلوم ہونا چاہیے۔ پڑھی لکھی لڑکی ہے۔

رقیب : بھئی تم لوگوں کی منطق میری سمجھ میں نہیں آتی (کچھ دیر خاموش رہ کر) تمھاری بھاوج اس مسئلہ پر بات کرنا نہیں چاہتیں اور اگر کرتی بھی ہیں تو اس طرح جیسے انھیں کوئی دلچسپی نہ ہو۔

عمر : بھابی جان اس سلسلے میں عقلمندی کا ثبوت دے رہی ہیں۔

رقیب : اور میں تو گویا بے وقوف ہوں۔

عمر : میرا یہ مطلب نہیں ہے بلکہ۔

رقیب : پھر اور کیا مطلب ہے۔ تم فریدہ کا خیال معلوم کرنے کا کہتے ہو۔ اب اس کا خیال کون معلوم کرے میں، تم اور ابا جی تو اس سے اس سلسلے میں بات کرنے سے رہے۔ رہیں تمھاری بھاوج تو انھوں نے صاف انکار کردیا ہے کہ وہ اس سلسلے میں فریدہ سے کوئی بات نہیں کریں گی۔

عمر : سلمٰی تو ہے۔

رقیب : اور سلمیٰ ایک نمبر کی بے وقوف ہے۔ فریدہ جیسی چاہیں گی اس کو پٹی پڑھا دے گی اور وہ ہاں ہاں کرتی رہے گی۔

عمر : آپ یہ چاہتے ہیں کہ کوئی فریدہ کو پٹی پڑھانے والا ہو۔

رقیب : نہیں میں یہ نہیں چاہتا مگر کوئی ایسا تو ہو جو اسے اونچ نیچ سمجھا سکے۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) تمھاری بھاوج کا بدلا ہوا رخ سمجھ میں نہیں آتا۔

عمر : اس گھر میں کوئی بات ایسی ضرور ہوئی ہے جس سے ان کو صدمہ پہنچا ہے۔

رقیب : (عمر کا چہرہ غور سے دیکھ کر) اور وہ بات تم جانتے ہو۔

عمر : کہہ نہیں سکتا ممکن ہے میرا خیال درست ہو۔

رقیب : اور تمھارا خیال کیا ہے۔

عمر : ایک دن فریدہ نے کہا تھا کہ بھابی جان ہم سب کی شادیاں اپنے ہی خاندان میں کرنا چاہتی ہیں کہ جائداد پر ان کا قبضہ رہے اور یہ بات شاید انھوں نے سن لی تھی۔

رقیب : (کچھ دیر خاموش رہ کر سوچتے ہوئے) اور شاید اسی لیے انھوں نے زینب چچی کو بھی جواب دے دیا۔

عمر : ممکن ہے یہی بات ہو۔

(رقیب کسی گہری سوچ میں پڑجاتے ہیں اور خاموش رہتے ہیں۔ کچھ دیر بعد صغرا کمرے میں آکر)

صغرا : عمر میاں، ابا جی کو دوا کا وقت ہوگیا ہے۔ مجھ سے تو وہ دوا پیتے نہیں۔ بچوں کی طرح ضد کرتے ہیں۔ اور مجھے بھی ان سے زیادہ بات کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس وقت تو وہ سلمیٰ بی سے بھی انکار کررہے ہیں۔

عمر : بہت اچھا۔ میں جاتا ہوں۔

صغرا : کچھ انگور بھی کھالیں تو اچھا ہے۔ سرہانے میز پر رکھے ہیں۔

عمر : بہت اچھا۔

صغرا : بازار جاؤ تو گلوکوز لے آنا۔ختم ہو گیا ہے۔

عمر : میں ابھی ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا تو لیتا آؤں گا۔

(عمر کمرے سے چلا جاتا ہے۔صغرا ایک تخت پر بیٹھ کر)

صغرا : بیچارے ابا جی بہت کمزور ہو گئے ہیں۔

رقیب : دوا سے پرہیز کرتے ہیں۔ پھلوں سے چڑتے ہیں۔ بالکل بچے بن گئے ہیں اور سمجھاؤ تو سمجھتے نہیں۔

صغرا : ڈاکٹر نے کھٹی بادی چیزوں سے پرہیز بتلایا ہے اور وہ ایسی ہی چیزوں کے لیے ضد کرتے ہیں اور چڑ چڑے اس قدر ہو گئے ہیں کہ (ہنس کر) آج تو زندگی میں پہلی مرتبہ انھوں نے مجھے بھی جھڑک دیا۔

رقیب : (کچھ دیر خاموش رہ کر) انھیں فریدہ کی شادی کی بڑی فکر ہے (صغرا خاموش رہتی ہے۔رقیب صغرا کا چہرہ غور سے دیکھ کر) تم نے فہمیدہ آپا سے اس سلسلے میں بات کی۔

صغرا : کس سلسلے میں؟

رقیب : اسد اور فریدہ کے سلسلے میں۔بھئی لڑکا تو مجھے بہت پسند ہے۔

صغرا : نہیں۔میں نے کوئی بات نہیں کی۔

رقیب : کیوں۔اس سے اچھا لڑکا۔

صغرا : (بات کاٹ کر) میں شادی بیاہ کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتی۔اچھا۔کیا اللہ نے برا کیا بندوں نے اور پھر فہمیدہ آپا مجھ سے ویسے ہی ناراض ہیں۔

رقیب : کیوں ایسی کیا بات ہو گئی۔

صغرا : زینب چچی نے ان سے کچھ الٹی سیدھی باتیں کردی ہیں۔فہمیدہ آپا مجھ سے بگڑ رہی تھیں۔

رقیب : مگر تم نے بلا وجہ زینب چچی سے انکار کردیا۔

صغرا : انھیں رانی کی شادی کی جلدی تھی اور عمر میاں کا ابھی شادی کرنے کا ارادہ

نہیں ہے۔

رقیب : (کچھ دیر خاموش رہ کر) صغرا سچ بتاؤ بات کیا ہے۔ تم ان دونوں کی شادی سے اس قدر غیر متعلق کیوں ہوگئی ہو۔

صغرا : نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔

رقیب : ضرور کوئی ایسی بات ہوئی ہے جس سے تمھارے دل کو صدمہ پہنچا ہے۔

صغرا : ایسی کیا بات ہوسکتی ہے۔

رقیب : ہوگی کوئی بات جسے تم چھپا رہی ہو۔

صغرا : میں کوئی بات کیوں چھپانے لگی۔ میں نے آج تک ان لوگوں کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کیا۔ اب ان کے معاملہ میں کیوں دخل دوں۔

رقیب : کیا وہ دونوں ان شادیوں کے خلاف ہیں؟ (صغرا خاموش رہتی ہے) اگر وہ دونوں تیار ہوں تو تمھیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔

صغرا : اب بات پھیل گئی ہے کہ عمر میاں کی منگنی ٹوٹ گئی۔ اب زینب چچی تیار نہ ہوں گی رہا فریدہ بی کا معاملہ تو اس میں دخل نہ دوں گی۔

رقیب : (غور سے صغرا کا چہرہ دیکھ کر) صغرا۔ فریدہ کی کسی بات سے ضرور تمھارے دل کو صدمہ پہنچا ہے۔ کیا تم انھیں معاف نہیں کرسکتیں۔

صغرا : جس کو تین مہینے کی عمر میں گود میں لے کر پالا ہے اس کے قصور بھی مجھے بہت پیارے ہیں۔

(آنسو آجاتے ہیں اور دوسری طرف منہ کرکے پونچھتی ہے کہ اسی وقت شبنم کمرے میں آکر)

شبنم : بھائی جان۔ ابا جی دوا نہیں پی رہے ہیں۔ فریدہ آپ کو بلا رہی ہے۔

رقیب : اچھا۔

(سوچتے ہوئے کمرے سے چلے جاتے ہیں۔ صغرا مڑ کر شبنم سے)

صغرا : آؤ شبنم بی۔ اچھی تو ہو۔

شبنم : دعا ہے آپ کی۔۔ امی آپ کو یاد کرتی رہتی ہیں۔

صغرا : اب بی بی تم خود تو دیکھ رہی ہو۔ ابا جی کی بیماری نے تو ہوش گم کر رکھے ہیں۔

شبنم : اس وقت بھی کافی تیز بخار ہے۔

صغرا : کئی دن سے یہی حالت ہے۔ بس صبح کے وقت کچھ کم ہوجاتا ہے۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) ابا جی کے بیمار ہوجانے سے گھر کیسا سونا سونا سا لگنے لگا ہے۔ اور بچے تو ایسے اِدھر اُدھر پھرتے رہتے ہیں۔ جیسے۔۔ جیسے۔۔

(صغرا خاموش ہوجاتی ہے مگر آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگتے ہیں۔ شبنم متاثر ہوکر)

شبنم : بھابی جان گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ (فریدہ کہہ رہی تھی بخار اُتر جانے کے بعد وہ بھلے چنگے ہوجائیں گے۔

صغرا : بی بی خدا تمھاری زبان مبارک کرے۔ سچ پوچھو تو میری تو راتوں کی نیند حرام ہوگئی ہے۔

(کچھ دیر دونوں خاموش رہتی ہیں پھر شبنم آہستہ سے)

شبنم : بھابی جان آپ نے مسٹر اسد کے بارے میں سوچا۔ ابا حضور تو ان کی بہت تعریف کرتے ہیں۔

صغرا : (غور سے شبنم کا چہرہ دیکھ کر) بی بی اب تم گھر کی حالت تو دیکھ رہی ہو۔ دل تو ہولوں پر ہے ایسے میں کہیں شادی بیاہ کی سوجھتی ہے۔

شبنم : فریدہ کی باتوں سے تو پتا چلتا ہے کہ اسے اس شادی سے انکار نہیں۔

صغرا : وہ آپ مختار ہیں۔ میں کون ہوتی ہوں دخل دینے والی۔

شبنم : آپ بزرگ ہیں یہ آپ کی ذمے داری ہے۔

صغرا : بی بی اس دور میں بزرگ رہے ہی کہاں ہیں۔ جو ان کی ذمے داری ہو۔ خودسری میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتے ہیں۔

شبنم : ہم کتنے ہی خودسر ہوں مگر بزرگ ہمیں بھول تھوڑی ہی جائیں گے۔

صغرا : چھوڑو شبنم بی بی۔ ارے ہاں سنا ہے تمھارے بھائی جان کی کہیں باہر نوکری

لگ گئی۔ کیا ارادہ ہے جائیں گے۔

شبنم : ابا حضور اس کے حق میں نہیں ہیں کہ اتنی دور جایا جائے۔

صغرا : اب بی بی یہ تو نوکری ہے۔ دور نزدیک کیا۔

(اسی وقت جلال کمرے میں آتا ہے اور کتابیں میز پر تقریباً پھینکتے ہوئے)

جلال : امی مجھے جلدی سے چائے دے دیجیے مجھے میچ کھیلنے جانا ہے۔

صغرا : ابا جی صبح سے تیرے لیے بے چین ہیں اور تجھے میچ کی پڑی ہے۔

جلال : آج کا میچ بہت زوردار ہے امی۔ بس سات بجے واپس آجاؤں گا۔ (خوشامدانہ لہجے میں) ذرا جلدی سے چائے دے دیجیے میری امی۔

صغرا : پہلے ابا جی سے مل کر منہ ہاتھ دھو لے میں چائے بناتی ہوں۔ (شبنم کی طرف دیکھ کر) شبنم بی بی تم بیٹھنا۔ میں ابھی چائے لے کر آئی۔

(صغرا کمرے سے چلی جاتی ہے۔ شبنم جلال کی طرف دیکھ کر)

شبنم : جلال میاں کون سا میچ ہے۔

جلال : ہاکی کا شبنم آپا۔ گورنمنٹ اسکول سے۔ اس سال تو جیتنا ہی ہے۔

شبنم : (مسکرا کر) سچ مچ۔

جلال : تین سال سے ہم ہار رہے ہیں اگر اب کی بار ہار گئے تو میں کھیلنا چھوڑ دوں گا۔

شبنم : (ہنس کر) یہ بات ہے۔

جلال : بالکل وہ تو ریفری بے ایمانی کرجاتے ہیں۔ گئے سال اگر پرنسپل صاحب میچ میں نہ آگئے ہوتے تو ریفری کی ایسی کی تیسی ہوجاتی۔

شبنم : (ہنس کر) تم لوگ ریفری کی ایسی کی تیسی کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہوگے اور وہ لوگ جیتنے کی فکر میں۔

جلال : نہیں شبنم آپا وہ تو۔۔۔

فریدہ : (کمرے میں داخل ہوتے ہوئے) جلال تمھیں ابا جی بلا رہے ہیں۔

جلال : بہت اچھا۔ (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) امی نے چائے بنائی۔

فریدہ : بنا رہی ہیں۔ پہلے تم ابا جی کے پاس جاؤ وہ صبح سے تمھیں یاد کر رہے ہیں۔
(جلال کمرے سے چلا جاتا ہے۔ فریدہ شبنم کے پاس بیٹھ جاتی ہے مگر خاموش رہتی ہے۔ شبنم کچھ خاموش رہ کر)

شبنم : میں نے بھابی جان سے بات کی تھی مگر وہ ٹال گئیں۔

فریدہ : وہ تو میں جانتی تھی۔ تم نے بلا وجہ اس سلسلے میں بات کی۔

شبنم : میری کون سی ذات کم ہوگئی۔ (سوچتے ہوئے) میں ابا حضور سے کہوں گی کہ وہ تمھارے بھائی جان سے بات کریں۔

فریدہ : سب بیکار ہے۔ اس گھر میں بھابی جان کی مرضی کے خلاف پتا نہیں ہل سکتا اور میں جانتی ہوں کہ وہ اس مسئلہ کو ٹال رہی ہیں۔

شبنم : اگر بھابی جان مان جاتیں تو بہت اچھا ہوتا۔

فریدہ : (ٹھنڈی سانس بھر کر) کیا کیا جائے ایسی ضد کرتے تو میں نے انھیں کبھی نہیں دیکھا۔

شبنم : میں نے تو ان سے صاف کہہ دیا کہ تمھیں اس رشتہ پر کوئی اعتراض نہیں۔

فریدہ : مگر میری اس گھر میں چلتی کہاں ہے۔
(دونوں خاموش ہو جاتی ہیں۔ کچھ دیر بعد صغرا چائے لے کر آتی ہے)

صغرا : جلال کہاں چلا گیا۔

فریدہ : ابا جی کے پاس وہ اسے بہت دیر سے یاد کر رہے تھے۔

صغرا : اچھا تم دونوں چائے پیو۔ میں سلمٰی بی بی کو بھی چائے پلا دوں۔ صبح سے بیچاری بھوکی بیٹھی ہیں ابا جی کو ایک منٹ کے لیے نہیں چھوڑا۔ (صغرا چائے میز پر رکھ کر چلی جاتی ہیں دونوں خاموشی سے چائے پینے لگتی ہیں کچھ دیر بعد عمر کمرے میں آ کر)

عمر : فریدہ ڈاکٹر صاحب نے دوا بدل دی ہے۔ یہ گولیاں اور مکچر ہے۔ مکچر تین تین گھنٹے کے بعد اور گولیاں دو دو گھنٹے کے بعد دینا ہے۔ اگر بارہ بجے رات

تک بخار کم نہ ہو تو یہ انجکشن لگانا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ ٹمپریچر ہر حالت میں گرنا چاہیے۔

فریدہ : بخار کا ایک حالت پر رہنا اچھا نہیں ہے۔ میں جاگتی رہوں گی اگر ضرورت پڑی تو انجکشن لگا دوں گی۔

عمر : تمھارا امتحان قریب ہے تم تیاری کرو۔ میں جاگ لوں گا۔ اب بھابی جان کو بھی آرام کی ضرورت ہے۔ بیچاری کئی راتوں سے جاگ رہی ہیں۔ انجکشن لگانے کی ضرورت ہوئی تو میں تم کو بلا لوں گا۔

(فریدہ ایک پیالی چائے عمر کو دیتی ہے۔ عمر دوائیں میز پر رکھ کر چائے پینے لگتا ہے)

فریدہ : بھائی جان نے چھٹی کی درخواست دی تھی اس کو کیا ہوا۔

عمر : کہہ رہے تھے ابھی منظور نہیں ہوئی۔

(تینوں خاموشی سے چائے پینے لگتے ہیں۔ شبنم پیالی میز پر رکھ کر کھڑے ہو کر)

شبنم : اچھا فریدہ اب میں چلتی ہوں کل آؤں گی۔

فریدہ : بھئی شبنم برا نہ ماننا۔ میں آج کل ذرا پریشان ہوں۔

شبنم : برا ماننے کی کیا بات ہے۔ کیا مجھے نظر نہیں آ رہا۔ (فریدہ اسے دروازے تک چھوڑنے جاتی ہے) خدا حافظ۔

فریدہ : خدا حافظ۔ (شبنم کمرے سے چلی جاتی ہے۔ فریدہ واپس آتی ہے کہ اس کی نظر میز پر رکھی ہوئی پاس بک پر پڑتی ہے اسے اٹھا کر) بھائی صاحب۔

عمر : کیا ہے (فریدہ اسے پاس بک بتلاتی ہے) یہ کیا ہے۔

فریدہ : پاس بک۔

عمر : کیسی پاک بک۔

فریدہ : بینک کی پاس بک۔ بھابی جان نے مجھے دی ہے۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) اس میں بہت سارو پیا میرے نام پر جمع ہے۔

عمر : کہاں کی برائی ہے۔ تمھارا حق تم کو مل گیا۔

فریدہ : مگر بھائی صاحب...

عمر : (بات کاٹ کر) فریدہ۔ کبھی تم نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ ان کا دل کتنا بڑا ہے اور وہ تم سے کتنی محبت کرتی ہیں۔

فریدہ : مگر بھائی صاحب میں نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے...

عمر : کبھی کبھی انسان کا ایک غیر ذمے دارانہ لفظ دوسرے کو بہت صدمہ پہنچا دیتا ہے اور اس معاملہ میں تم ہمیشہ غیر ذمے دار رہی ہو۔

فریدہ : اگر میری کسی بات سے ان کو صدمہ پہنچا ہو تو۔

عمر : (بات کاٹ کر) ٹوٹا ہوا دل جڑا نہیں کرتا۔ جب تم تین مہینے کی تھیں اس وقت سے وہ تم کو اولاد کی طرح پال رہی ہیں۔ انھوں نے تمھارے پیچھے رات کو رات اور دن کو دن نہیں سمجھا۔

فریدہ : مگر بھائی صاحب...

عمر : (پھر بات کاٹ کر) جب ہماری ماں کا انتقال ہوا وہ صرف دو مہینے کی دلہن تھیں۔ تمھاری پرورش کی خاطر انھوں نے کبھی ایسی خواہش نہیں کی جو اتنی نئی دلہنیں کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ پانچ سال تک بچہ پیدا کرنے کا بھی خیال نہیں کیا۔

فریدہ : مگر میں نے تو کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے ان کے دل کو صدمہ پہنچے۔

عمر : تو وہ جھمکوں والی بات اور جائداد پر قبضہ رکھنے والی باتیں ایسی تھیں جن سے انھیں خوشی ہوئی ہوگی۔ (فریدہ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) اور تمھیں معلوم ہے کہ وہ جھمکے بھی انھوں نے تمھارے لیے خریدے ہیں۔ شاید تمھیں یہ بھی پتا نہیں کہ ابا جی کی پینشن کا ایک پیسہ بھی انھوں نے گھر یا اپنے بچوں پر صرف نہیں کیا تمھارے جہیز کی تیاری کرتی تھیں۔

فریدہ : بھائی صاحب...

(عمر کے سینہ سے لگ کر ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ عمر اس کی پیٹھ تھپ تھپاتے ہوئے روندھے گلے سے)

عمر : انسان کو ہر بات سوچ سمجھ کر کہنا چاہیے۔ وہ تو بہت بڑے دل کی عورت ہیں فریدہ۔ بہت بڑے دل کی عورت۔

(پردہ)

پانچواں سین

منظر : وہی کمرہ۔ تقریباً پندرہ دن بعد۔ رات کے تقریباً نو بجے ہیں عجیب سا سناٹا چھایا ہوا ہے۔ جلال اپنے مخصوص اسٹائل سے کرسی پر بیٹھا خالی خالی نظروں سے کتاب دیکھ رہا ہے۔ رقیب، عمر، صغرا اور فریدہ سب خاموش کبھی کبھی ایک دوسرے کو ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ کچھ دیر بعد رقیب عمر کی طرف کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھ کر۔

رقیب : عمر!

عمر : (رقیب کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے) جی۔

رقیب : (خلا میں دیکھتے ہوئے) باپ کے مرنے پر انسان کیسا عجیب محسوس کرتا ہے۔ جیسے اس کی عمر یکا یک کئی سال بڑھ گئی ہو وہ ایک دم بوڑھا ہوگیا ہو۔ (عمر خاموش رہتا ہے۔ رقیب ٹھنڈی سانس بھر کر) باپ کی موجودگی سے انسان کس قدر خوداعتماد بنا رہتا ہے مگر اس کے مرتے ہی انسان محسوس کرتا ہے کہ اس پر ذمے داریوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے (فریدہ ایک دم ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ رقیب اس کی طرف دیکھ کر) تم کیوں روتی ہو فریدہ۔ تم کیوں روتی ہو۔

فریدہ : (رقیب کے سینہ سے لگ کر) بھائی جان— ابا جی۔

رقیب : (محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے پھر اپنے آنسو پونچھ کر) تم کیوں رو رہی ہو تمھارا باپ کہاں مرا ہے۔ رونا تو مجھے چاہیے باپ تو ہمیشہ بڑے بھائی

کا مرنا ہے۔ تمھارے ماں باپ تو زندہ ہیں۔ بے ماں باپ کا تو میں ہوا ہوں۔
(فریدہ کچھ دیر روتی رہتی ہے۔ پھر خاموش ہو کر خلا میں دیکھنے لگتی ہے۔ جلال
کتاب میز پر رکھ کر)

جلال : ابا جی جنگ کے کیسے مزیدار قصے سنایا کرتے تھے۔

عمر : (ٹھنڈی سانس بھر کر) کس قدر وضع داری تھی۔ سواری پر اس لیے نہیں چڑھتے تھے کہ یہ پرانے فوجیوں کی توہین ہے۔ اس بڑھاپے میں بھی پیدل چلتے رہے ان کے ساتھ ایک نسل ایک دور ایک وضع داری ختم ہو گئی۔

صغرا : ہائے ہائے ابا جی کی باتیں (ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر) اب اس دنیا میں مجھے دلہن کہنے والا کوئی نہیں رہا۔ کس قدر پیار تھا ان کے اس لفظ دلہن میں۔ (پھر کچھ دیر خاموش رہ کر اپنے آنسو پونچھ کر) میرے کانوں کو جانے کیا ہو گیا ہے۔ ہمیشہ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ابا جی کہہ رہے ہوں دلہن وضو کے لیے پانی تو دے دو۔

رقیب : (فریدہ کو دیکھ کر) فریدہ۔ جاؤ بیٹی اب تم جا کر آرام کرو۔

فریدہ : مجھے نیند نہیں آتی بھائی جان۔

رقیب : تمھارا امتحان قریب ہے جاگنے سے صحت پر بڑا اثر پڑے گا۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) جو ہونا تھا سو ہو گیا ماں باپ کس کے زندہ رہے ہیں۔

فریدہ : جانے اب مجھے نیند کیوں نہیں آتی۔

رقیب : کوشش کرو انسان کو صحت کا پورا خیال رکھنا چاہیے۔ جاؤ عمر، تم بھی آرام کرو۔
(عمر خاموشی سے کھڑے ہو کر فریدہ سے)

عمر : آؤ فریدہ چلو۔ آج سردی کچھ زیادہ ہے یا مجھے ہی معلوم ہو رہی ہے (فریدہ کی طرف دیکھ کر) آؤ فریدہ چلو۔

(فریدہ تھکے تھکے قدموں سے کمرے سے چلی جاتی ہے۔ عمر اس کے پیچھے پیچھے جاتا ہے کمرے میں پھر پہلا سا سناٹا چھا جاتا ہے۔ رقیب تھوڑی دیر بعد

جلال کو دیکھ کر)

رقیب : جاؤ جلال تم بھی سو جاؤ۔ رات زیادہ ہوگئی ہے۔

جلال : ابھی تو دس بھی نہیں بجے۔ (تھوڑی دیر خاموش رہ کر) ابا جی نے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوگیا تو وہ اسکوٹر دلا دیں گے۔

رقیب : تم فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوجاؤ ابا جی کا وعدہ پورا کیا جائے گا۔ جاؤ اب جا کر سو جاؤ۔

(جلال کچھ دیر تو کرسی پر بیٹھا رہتا ہے پھر اٹھ کر تخت پر لیٹ جاتا ہے۔ صغرا کچھ دیر خاموش رہ کر سوچتے ہوئے)

صغرا : ابا جی کچھ دن سے ایسی باتیں کرنے لگے تھے جیسے ان کو اپنی موت کا یقین ہوگیا ہو۔ (آنسو پونچھ کر) کہا کرتے تھے زندگی کا کیا بھروسا کب بلاوا آجائے۔

رقیب : اس بیماری میں بھی انھیں فریدہ کی شادی کی فکر لگی رہی۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) مگر انسان اپنی کچھ خواہشیں اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ (صغرا خاموش رہتی ہے۔ رقیب کچھ دیر خاموش رہ کر) زینب چچی پرسا دینے نہیں آئیں۔

صغرا : ابھی تک تو نہیں آئیں مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ نہ آئیں۔

رقیب : تم نے بلا وجہ ان کو ناراض کردیا۔ فہمیدہ آپا کہہ رہی تھیں کہ رشتہ ٹوٹ جانے سے زینب چچی بہت دکھی ہیں۔

صغرا : دکھی ہونے کی بات ہی ہے۔ بیچاری رانڈ بیوہ۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے، اللہ بندی ایک بچی ہے اس کو دیکھ کر جیتی ہیں۔

رقیب : ابا جی کو بھی اس رشتے کے ٹوٹ جانے کا بڑا دکھ ہوا تھا۔ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میں خود دلہن سے بات کروں گا۔

صغرا : مگر۔

رقیب : (بات کاٹ کر) اگر یہ رشتہ دوبارہ ہوجائے تو شاید ان کی روح کو تسکین پہنچے۔ (صغرا خاموش رہتی ہے رقیب کچھ دیر ان کا چہرہ دیکھتے رہتے ہیں۔

کچھ دیر بعد) میں نے کل فہمیدہ آپا سے اس سلسلے میں بات کی تھی مگر وہ مجھ پر بگڑ پڑیں۔

صغرا : یہ رشتہ انھوں نے ہی طے کرایا تھا۔ زینب چچی نے ان سے بھی کچھ الٹی سیدھی باتیں کہہ دیں جن سے ان کے دل کو صدمہ پہنچا اب فہمیدہ آپا مجھ سے بھی کچھ کھچی کھچی سی رہنے لگی ہیں (کچھ دیر خاموش رہ کر بالکل ایسے انداز میں جیسے وہ اس مسئلے پر گفتگو کرنا نہ چاہتی ہو) ابا جی کے انتقال کے بعد گھر کیسا سونا سونا سا لگنے لگا ہے۔ ان کے کمرے کے پاس سے گزرتی ہوں تو رونا آتا ہے۔ ایک دو مرتبہ ان کے کمرے میں گئی تو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ مصلے پر بیٹھے نماز پڑھ رہے ہوں۔

رقیب : (غور سے صغرا کو دیکھتا ہے پھر ٹھنڈی سانس بھر کر) بزرگوں کی موجودگی گھر کے لیے خیر و برکت کا باعث ہوتی ہے۔

صغرا : جب آپ گھر پر نہیں ہوتے تو یہ گھر کھانے کو دوڑتا ہے۔

رقیب : ابا جی کی موجودگی میں تمھیں تنہائی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

صغرا : ابا جی اکثر گھر پر نہیں رہتے تھے مگر ایسی تنہائی اور ویرانی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ آپ نے خیال کیا شہی اب کیسی ضدیں کرنے لگی ہے۔

رقیب : بچی ہے حقیقت کا تو اسے علم نہیں مگر ایک فطری احساس ضرور ہے جس نے اسے ضدی بنا دیا ہے۔ (اسی وقت پھر عمر آہستہ آہستہ کمرے میں آتا ہے رقیب اسے دیکھ کر) ارے عمر تم سوئے نہیں۔

عمر : (تخت پر جلال کے پاس بیٹھتے ہوئے) ابھی مجھے نیند نہیں آرہی۔

رقیب : فریدہ سوگئی؟

عمر : جی ہاں بستر پر تو لیٹ گئی ہے۔ اب تو بات بات میں بچوں کی طرح رونے لگی ہے جانے کون سے جذبات اور احساسات ہیں جو آنسو بن کر بہہ نکلتے ہیں (جلال ایک دم اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے اور گھبرائی نظروں سے چاروں طرف

دیکھتا ہے، کیا بات ہے جلال)۔

جلال : ابا جی۔ (سب حیرت سے اسے دیکھتے ہیں) چچا جان۔ ابھی ابا جان آئے تھے وہ فوجی وردی پہنے تھے ان کے پریوں کی طرح بڑے بڑے چمکیلے پر تھے وہ چھت پر اترے اور جب میں ان کے پاس گیا تو وہ پھر آسمانوں میں اڑ گئے۔

عمر : (اس کی پیٹھ تھپ تھپاتے ہوئے) ڈرو نہیں جلال۔ تم نے خواب دیکھا ہے۔ لیٹ جاؤ۔

(اسے پھر لٹا دیتا ہے)

رقیب : عمر۔ تم جلال کو اپنے کمرے میں سلا لینا۔

عمر : بہت اچھا۔

رقیب : (اٹھ کر جاتے ہوئے) جاؤ جا کر سونے کی کوشش کرو۔

(رقیب کمرے سے چلا جاتا ہے۔ عمر تخت سے اتر کر فرش پر صغرا کے پاس بیٹھ جاتا ہے کچھ دیر خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ پھر لیٹ کر صغرا کے گھٹنے پر سر رکھ کر)

عمر : بھابی جان، جب میں چھوٹا سا تھا تو گھنٹوں یونہی آپ کے پاس لیٹا رہتا تھا۔

صغرا : (محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) اب کہاں کے بڑے ہو گئے ہو میرے لیے تو اتنے ہی بڑے ہو۔

عمر : نہیں اب آپ مجھے بڑا سمجھنے لگی ہیں آپ سوچتی ہیں کہ میں سوچنے لگا ہوں اس لیے بڑا ہو گیا ہوں۔

صغرا : عورت جسے سینہ سے لگا کر پالتی ہے اسے بوڑھا ہو جانے پر بھی بچہ ہی سمجھتی رہتی ہے۔ میرے لیے تو تم اور جلال برابر ہو۔

عمر : پھر آپ مجھ سے ناراض کیوں ہیں۔

صغرا : تم سے ناراض (محبت سے اس کے بال برابر کرتے ہوئے) یہ تم نے کیسے سمجھ لیا۔

عمر : (تھوڑی دیر خاموش رہ کر) میری وجہ سے فہمیدہ آپا آپ سے ناراض ہوگئیں۔ زینب چچی نے آپ کو برا بھلا کہا۔ کیا آپ نے سمجھا تھا کہ میں آپ کی مرضی کے خلاف ایک قدم بھی اٹھاؤں گا۔

صغرا : عمر میاں! میں نے سنا تم شبنم کو پسند کرنے لگے ہو اور فریدہ بی بھی شاید یہی چاہتی تھیں۔ اس لیے...

(صغرا خاموش ہوجاتی ہے۔ عمر اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے)

عمر : آپ کے ہوتے ہوئے میرے یا فریدہ کا کچھ چاہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں تو اسی کو چاہوں گا جسے آپ پسند کریں گی۔ وہ رانی ہو شبنم یا کوئی اور۔

صغرا : مگر فریدہ بی کی پسند بھی تو ضروری ہے۔ میں کب تک جیوں گی۔ نباہنا تو فریدہ بی کو ہی ہے۔

عمر : مگر اپنی غیر ذمے داری پر وہ خود شرمندہ ہے آپ نے محسوس نہیں کیا۔

صغرا : چھوٹی بہنوں کو اپنے بھائی کے بیاہ کی بڑی چاہ ہوتی ہے اور اگر بھاوج ان کی پسند کی آجائے تو پھر ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہتا۔

عمر : اور ماں کو کیا کم چاہ ہوتی ہے۔ بہنیں تو جذباتی بن کر سوچتی ہیں مگر ماں کو تو اونچ نیچ سب کچھ سوچنا پڑتا ہے۔

صغرا : اور میں نے ماں بن کر ہی سوچا تھا۔ رانی گھریلو سی لڑکی ہے۔ زیادہ پڑھی لکھی نہ سہی مگر سگھڑ ہے نیک ہے اپنی ماں کی اکیلی ہے جو کچھ اس گھر میں ہے سب اسی کا ہے (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) اب زینب چچی ایسی گئی گزری بھی نہیں ہیں کہ اس گھر کی جائداد پر ان کی نظر ہو۔

عمر : فریدہ تو بے وقوف ہے آپ نے اس کی بات کا اس قدر اثر قبول کرلیا۔ آپ نے اسے بھی شمّی کی طرح پالا ہے کیا آپ شمّی اور جلال کی حماقتوں کو معاف نہیں کرتیں۔

صغرا : خدا گواہ ہے عمر میاں فریدہ بی کی طرف سے میرے دل میں کوئی برائی نہیں ہے۔

عمر : (اپنے آنسو پونچھتے ہوئے) بھابی جان آپ فرشتہ ہیں فرشتہ۔

صغرا : (محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) میں یہ سوچ کر فریدہ بی کی شادی کے بارے میں چپ ہوگئی کہ اپنی زندگی کے بارے میں انھیں بھی تو سوچنے کا حق ہے۔

عمر : اس نے تو کبھی بھی اسد میاں سے شادی کرنے سے انکار نہیں کیا اور شاید...
(پاس کے کمرے سے زوردار چیخ۔ "بھابی جان۔" عمر ایک دم گھبرا کر کھڑے ہوکر) شاید فریدہ سوتے میں ڈر گئی۔ (باہر کسی کے دوڑنے کی آواز۔ عمر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھتا ہے کہ فریدہ پریشان حال کمرے میں آتی ہے وہ ہانپ رہی ہے۔ کیا بات ہے فریدہ۔
(فریدہ کوئی جواب نہیں دیتی۔ پھٹی پھٹی نظروں سے صغرا کو دیکھتی ہے۔ صغرا گھبرا کر کھڑی ہوجاتی ہے اور فریدہ کی طرف بڑھتے ہوئے)

صغرا : کیا بات ہے فریدہ بی۔

فریدہ : بھابی جان۔
(صغرا سے لپٹ جاتی ہے۔ صغرا اسے اپنے سینہ سے لگا کر)

صغرا : کیا بات ہے فریدہ بی۔ کوئی ڈراونا خواب دیکھا ہے۔ (فریدہ ہچکیوں سے رونے لگتی ہے) شاید سوتے میں ڈر گئی ہیں۔ ایک گلاس پانی لانا عمر میاں (عمر کمرے سے چلا جاتا ہے۔ صغرا فریدہ کو تخت پہ بٹھلاتے ہوئے) فریدہ بی بیٹھو۔ (خود بھی اس کے پاس بیٹھ جاتی ہیں) فریدہ بی۔
(فریدہ صغرا کی گود میں سر رکھ کر ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ رقیب کمرے میں آکر)

رقیب : کیابات ہے۔

صغرا : شاید سوتے میں ڈر گئی ہیں (عمر گلاس میں پانی لے کر آتا ہے۔ صغرا گلاس لے کر) لو فریدہ بی ایک دو گھونٹ پانی پی لو۔

(فریدہ برابر ہچکیوں سے روتی رہتی ہے)

رقیب : کیا بات ہے فریدہ۔

فریدہ : (ہچکیوں کے درمیان) میں بہت خراب ہوں بھابی جان بہت خراب۔

صغرا : کس نے کہہ دیا تم سے۔ لو ایک دو گھونٹ پانی پی لو۔

فریدہ : (نظریں اٹھا کر صغرا کو دیکھتی ہے) نہیں بھابی جان۔ میں بہت خراب ہوں میں نے آپ کو بہت دکھ پہنچایا ہے۔ رانی بہت اچھی ہے بھابی جان میں بری ہوں۔

صغرا : نہیں۔ تم سے اچھا تو مجھے کوئی دکھائی نہیں دیتا اور عمر میاں کی شادی تو وہیں ہوگی۔ جہاں تم چاہوگی۔ وہ شبنم ہو یا رانی۔

فریدہ : بھابی جان۔

(پھر صغرا کی گود میں سر رکھ کر رونے لگتی ہے۔ صغرا اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے)

صغرا : اگر تم کہو گی تو میں زینب چچی کے پاس جھولی پھیلا کر چلی جاؤں گی کہ وہ رانی کو مجھے دے دیں۔ چلو اٹھو روتے نہیں ہیں۔

(پردہ)

ثاقب : امی۔ آپ جانے کیوں نصرت سے ناراض ہیں (مڑ کر بیگم کو دیکھ کر) یقین کیجیے وہ انتہائی شریف اور نیک انسان ہے۔

بیگم : (ثاقب کے چہرے پر نظریں جما کر) ایک نمبر کا لفنگا ہے بس باتیں ہی میٹھی میٹھی کرتا ہے۔

ثاقب : وہ میرے بچپن کا دوست ہے (آئینہ میں اپنا چہرہ مختلف زاویوں سے دیکھتے ہوئے) کبھی آپ نے کوئی بات ایسی دیکھی جس سے معلوم ہو کہ وہ لفنگا اور بدمعاش ہے۔

بیگم : بچپن اور جوانی میں بہت فرق ہوتا ہے (ٹوکری میں سے چھالیا کی ایک ڈلی چنتے ہوئے) مجھے تیرا اس سے ملنا جلنا ایک آنکھ نہیں بھاتا۔

ثاقب : (مڑ کر بیگم کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر) آپ تو میری ایسی نگرانی کرتی ہیں جیسے میں بالکل بچہ ہوں۔

بیگم : (پھر نظریں اٹھا کر ثاقب کو دیکھ کر) تو اپنے آپ کو بوڑھا کب سے سمجھنے لگا ہے۔ کل ہی دوا نہ پلاتی تو یوں ہی پڑا رہتا۔

ثاقب : (ہنس کر) امی۔ کم از کم اتنا بڑا تو ضرور ہو گیا ہوں کہ اپنا بھلا برا سوچ سکوں۔

بیگم : تجھے اپنا برا بھلا سوچنے کا کیا حق ہے (خود اعتمادی کے لہجے میں) جب تک میں زندہ ہوں اپنا یہ حق تجھے نہیں دے سکتی۔

ثاقب : (مسکرا کر) اچھا امی جیسی تمھاری مرضی (آہستہ آہستہ صوفے کے پاس جاتے ہوئے) مگر یہ تو بتایئے یہ حق مجھے کبھی ملے گا بھی یا نہیں۔

بیگم : میری زندگی میں تو نہیں (آنکھوں میں آنسو بھر کر) جب میں مر جاؤں پھر جو تیرا جی چاہے کرتا رہنا۔

(ثاقب صوفے کی پشت پر پڑا ہوا کوٹ اٹھا کر جھٹکتا ہے اور مڑ کر بیگم کو دیکھتا ہے جو دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھ رہی ہے۔ واپس بیگم کے پاس آتا ہے کوٹ تخت پر رکھتا ہے اور بیگم کے گلے میں باہیں ڈال کر)

ثاقب : امی۔ تم اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر میری ساری ہمت پست کر دیتی ہو۔

بیگم : چل ہٹ دور ہو۔ میں نے تجھے اسی لیے پالا پوسا ہے کہ ایک دن تو خودسر ہو جائے۔

ثاقب : (مسکراتا ہے ٹوکری میں سے دوچار دانے سپاری کے اٹھا کر منہ میں ڈال کر) مگر آپ نے مجھے ڈاکٹر بنایا ہے اگر میں یوں گھر میں بند رہوں گا تو میرے پیشے کا کیا ہوگا۔

بیگم : تیرے دل میں ہمدردی ہے، خدمت کا جذبہ ہے ماں کی دعائیں ہیں تو ضرور کامیاب ہوگا۔

ثاقب : (قہقہہ مار کر) اور اس طرح پردے میں رہ کر۔ امی آپ مجھے ہر شخص سے ملنے جلنے سے منع کرتی ہیں حتی کہ مریضوں کو بھی لفنگا اور بدمعاش کہہ دیتی ہیں۔ بھلا اس طرح میں اپنے پیشے میں کیسے کامیاب ہوسکتا ہوں۔

(بیگم خاموش رہتی ہیں۔ ثاقب کھڑے ہوکر کوٹ پہنتا ہے۔ ایک مرتبہ پھر آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر اپنا جائزہ لیتا ہے۔ پھر دوسرے کمرے کی طرف بڑھتا ہے۔ بیگم نظریں اٹھا کر اسے دیکھ کر)

بیگم : اب کہاں جانے کی تیاری ہو رہی ہے۔

ثاقب : (مڑ کر بیگم کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے) ایک ضروری کام ہے امی۔ (ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ ثاقب فون کے پاس جاکر ریسیور اٹھا کر) ہلو۔ جی ہاں۔ میں ہی بول رہا ہوں... جی ہاں آرہا ہوں۔ بس روانہ ہونے والا ہوں (ریسور رکھ کر بیگم سے) امی میں جلدی ہی آجاؤں گا۔

بیگم : مگر تو جا کہاں رہا ہے۔

ثاقب : (ہنس کر) ایک ڈاکٹر اپنے مریض کے علاوہ اور کہاں جاسکتا ہے۔

بیگم : مگر معلوم تو ہو وہ مریض ہے کون۔

ثاقب : (مسکرا کر) مریض کوئی بھی ہو ڈاکٹر کا فرض اس کا درد دور کرنا ہے۔

بیگم : جب تک تو یہ نہیں بتلائے گا مریض کون ہے میں تجھے نہیں جانے دوں گی۔

ثاقب : امی۔ میں ہر ایک مریض کا حسب نسب تو پوچھتا نہیں کہ اس کی رپورٹ تمھارے روزنامچے میں درج کرادوں۔

بیگم : (تخت سے اتر کر جوتیاں پہنتے ہوئے) اگر تو نہیں بتلائے گا تو میں بھی نہیں جانے دوں گی۔ جانے کیسے لوگ ہوں بھلے یا برے (ثاقب کے پاس آکر) کہاں جارہا ہے پہلے بتا پھر جانے دوں گی۔

ثاقب : (اکتا کر صوفے پر بیٹھ کر) امی آپ مجھے زندگی میں کچھ نہیں کرنے دیں گی۔ آخر اس شہر میں ہزاروں ڈاکٹر ہیں، جوان ہیں، کیا ان کی مائیں ان کی یوں ہی نگرانی کرتی ہیں۔

بیگم : کرتی ہوں یا نہیں۔ مجھے ان سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ میں تو یوں ہی تیری نگرانی کرتی رہوں گی۔

ثاقب : (دیوار میں لگی ہوئی کلاک کی طرف دیکھ کر) میں نے کبھی آپ کی مرضی کے خلاف کوئی کام کیا ہے مگر آپ میری ایسی نگرانی کرتی ہیں جیسے میں آپ کی حکومت کا باغی ہوں کہ اگر نگرانی نہیں کی گئی تو آپ کی حکومت کا تختہ الٹ دوں گا۔

بیگم : تو خود کو باغی نہ کہہ یہ لفظ بہت منحوس ہے کہیں سچ مچ تو باغی نہ ہو جائے۔

ثاقب : (کھڑے ہو کر بیگم کے گلے میں باہیں ڈال کر) اچھا امی۔ میں آنے کے بعد بتلا دوں گا۔

بیگم : چل ہٹ دور ہو۔ جانے سے پہلے کیوں نہیں بتلاتا۔

ثاقب : (الگ ہٹ کر مسکرا کر) اب میں مریض کا حسب نسب معلوم کر کے آؤں گا تو آپ کو رپورٹ درج کراؤں گا — تو جاؤں امی؟

بیگم : نہیں۔ جب تک تو نہیں بتلائے گا۔ میں جانے نہیں دوں گی۔ (ثاقب کے چہرے پر ناگواری کے آثار پیدا ہوتے ہیں اور وہ خاموش رہتا ہے) اب بولتا

کیوں نہیں۔

ثاقب : (جھنجھلا کر ٹائی کی گرہ کھولتے ہوئے) میں شائستہ سے ملنے جارہا تھا۔

بیگم : وہ تو میں پہلے سے جانتی تھی۔ یہ شائستہ کون ہے۔ لاکھ بار منع کیا ہے کہ ایسی ویسی عورتوں سے نہ ملا کر مگر میری تو سنتا ہی نہیں۔

ثاقب : (سنگھار میز کی طرف جاتے ہوئے) امی۔ آپ تو سب کی شان میں ایک دم قصیدے شروع کر دیتی ہیں۔

(غصہ سے ٹائی سنگھار میز پر پھینکتا ہے اور دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ بیگم کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہے۔ پھر مڑ کر دیوار پر لگی ہوئی تصویر کو دیکھنے لگتی ہے۔ آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں کہ ثاقب پھر کمرے میں آتا ہے۔ اس نے کوٹ اُتار دیا ہے۔ ٹیلی فون کے پاس جاکر رسیور اٹھاتا ہے۔ (بیگم اسے دیکھ کر)

بیگم : اب کسے فون کیا جارہا ہے۔

ثاقب : (اسے کوئی جواب نہیں دیتا) ہلو— میں ڈاکٹر ثاقب بول رہا ہوں۔ بھئی میں اس وقت نہیں آسکتا۔ ایک ضروری کیس آگیا ہے۔ اسپتال جانا بہت ضروری ہے۔ (رسیور رکھ دیتا ہے۔ بیگم اسے دیکھ کر)

بیگم : اب جھوٹ بولنا بھی سیکھ لیا ہے۔ صاف کیوں نہیں کہتا کہ ماں نے نہیں آنے دیا۔ بروں کی صحبت میں اور کیا سیکھے گا (ثاقب خاموش رہتا ہے بیگم اسے دیکھتی رہتی ہیں پھر غصہ سے) اب بولتا کیوں نہیں؟

ثاقب : کیا بولوں۔ آپ نے کہہ دیا نہ جا میں نہیں جارہا۔ (کسی قدر اکتاہٹ کے لہجہ میں) بچپن سے یہی سنتا آرہا ہوں کہ یہ برا ہے وہ برا ہے، یہ لفنگا ہے، وہ لچا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اچھا کون ہے۔

بیگم : میں تیرا برا چاہتی ہوں یہی کہنا چاہتا ہے نا۔

ثاقب : یہ تو نہیں کہتا مگر پیروں میں بیڑیاں ڈالے رکھنا چاہتی ہو۔ جانے تمھیں

انسانوں کی صورت سے کیوں نفرت ہے۔

بیگم : تو پھر جا۔ مجھے تجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔ اگر قسمت میں یوں ہی دکھ بھوگنا ہے تو بھوگ لوں گی۔

ثاقب : شائستہ کے ماں باپ کیا کہیں گے کہ انھوں نے مجھے کھانے پر مدعو کیا اور میں نے وعدہ کرکے اسے پورا نہیں کیا۔ کس قدر اخلاق سے گری ہوئی بات ہے۔

بیگم : اور ماں کا حکم نہ ماننا تیرے نزدیک بڑا اخلاق ہے۔

ثاقب : یہ بات نہیں ہے مگر۔

بیگم : اب زیادہ نہ بول اگر جانا ہے تو چلا جا۔ پر یاد رکھ بروں کا سایہ بھی اچھوں کو برا بنا دیتا ہے (ثاقب خاموش رہتا ہے) اب جاتا کیوں نہیں۔

ثاقب : نہیں اب میں نہیں جاؤں گا۔

(تیز تیز قدموں سے دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ بیگم خاموش کھڑی دروازے کو دیکھتی رہتی ہے)

(پردہ)

دوسرا سین

(وہی کمرہ۔ دوسرے دن صبح ثاقب فون کر رہا ہے۔ شائستہ اس کے پاس کھڑی ہے)

ثاقب : ہاں۔ میں تھوڑی دیر سے آؤں گا۔

(رسیور رکھتا ہے اور شائستہ کی طرف دیکھتا ہے۔ شائستہ اس طرح بولتی ہے جیسے اپنی پہلی کہی ہوئی بات کو جاری رکھنا چاہتی ہو)

شائستہ : کتنے ہی لوگ آئے تھے۔ سب ہی نے آپ کا پوچھا، کیا جواب دیتی۔ کتنی شرمندگی ہوئی دل ہی جانتا ہے۔

ثاقب : شرمندگی کی کیا بات تھی (مسکرا کر) کہہ دیا ہوتا ضروری کام میں الجھ گئے ہیں۔

شائستہ : مجھے آپ کی طرح جھوٹ بولنا نہیں آتا۔

ثاقب : ارے تم بیٹھو نا۔ اس میں جھوٹ بولنے کی کون سی بات تھی۔

شائستہ : اس لیے کہ آپ اسپتال میں نہیں تھے میں خود اسپتال جاکر دیکھ آئی تھی—

ثاقب : (حیرت سے) تم اسپتال گئی تھیں۔

شائستہ : جی ہاں۔ تاکہ جھوٹ اور سچ ظاہر ہوجائے۔ سسٹر گریز کے پاس اپنی حاضری بھی درج کرا آئی تھی (ثاقب خاموش رہتا ہے) امی اور پاپا کو بھی آپ کا نہ آنا بہت ناگوار گزرا۔

ثاقب : خیر ان کو تو میں منالوں گا (مسکراکر) مگر تمھارا منایا جانا ذرا مشکل ہے۔

شائستہ : آپ کو میری پروا ہی کب ہے۔ اگر پروا ہوتی تو چلے نہ آتے۔

ثاقب : بات دراصل یہ ہے کہ—

شائستہ : (بات کاٹ کر) اب زیادہ دم دلاسے دینے کی ضرورت نہیں اگر نہیں آسکتے تھے تو کہہ دیتے دعوت کسی اور دن کے لیے ملتوی کردی جاتی۔

ثاقب : مگر عین وقت پر—

شائستہ : اہم کیس آگیا تھا۔ ضروری کام نکل آیا تھا۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر ٹھنڈی سانس بھر کر) جانے میں اس قدر بدقسمت کیوں ہوں کہ جب بھی آپ آنے کا وعدہ کرتے ہیں کوئی اہم کام نکل آتا ہے کوئی کیس آجاتا ہے۔

ثاقب : (شکست خوردہ لہجے میں) ہاں شائستہ یہ ہوتا رہا ہے اور کہہ نہیں سکتا کب تک ہوتا رہے گا۔

شائستہ : یوں کہیے کہ آپ مجھ سے ملنا نہیں چاہتے۔

ثاقب : یہ بات نہیں ہے شائستہ۔

شائستہ : تو پھر اور کیا بات ہے (ثاقب خاموش رہتا ہے) کہیے نا کون سی بات ہے آخر آپ کہتے کیوں نہیں۔ کوئی راز ہے جو مجھ پر ظاہر نہیں کرسکتے۔

ثاقب : ہاں یونہی سمجھ لو (سوچتے ہوئے) ویسے ایسا کوئی راز بھی نہیں ہے جو تم پر ظاہر

نہ کیا جاسکے۔

شائستہ : (طنزیہ) راز بہرحال راز ہے کسی پر کیسے ظاہر کیا جاسکتا ہے۔

(دوسرے کمرے سے بیگم آتے ہوئے)

بیگم : وہ راز میں بتلائے دیتی ہوں (شائستہ اور ثاقب مڑ کر بیگم کو دیکھتے ہیں بیگم دونوں کے پاس آتے ہوئے) وہ راز میں ہوں۔

شائستہ : آپ!

(شائستہ ثاقب کی طرف دیکھتی ہے۔ ثاقب کچھ کہنا چاہتا ہے مگر بیگم اسے بولنے کا موقع نہ دے کر)

بیگم : ہاں میں۔ میں اس کو نہیں آنے دیتی۔

شائستہ : آپ نہیں آنے دیتیں!

بیگم : ہاں۔ یہ تم سے چوری چھپے ملنا چاہتا ہے اور مجھ سے جھوٹ بولتا ہے۔ اس لیے میں اسے روک لیتی ہوں۔

شائستہ : لیکن۔۔

بیگم : (بات کاٹ کر) جب تک مجھے یقین نہ ہوجائے کہ یہ کسی غلط جگہ نہیں جارہا ہے میں اسے نہیں جانے دیتی۔

شائستہ : ہمارا گھر غلط جگہ ہے۔

بیگم : بی بی۔ تم سے میری نہ جان نہ پہچان میں ابھی کیسے کہہ سکتی ہوں۔

ثاقب : امی یہ شائستہ ہیں (شائستہ اب بہت ادب سے سلام کرتی ہیں، شائستہ سے) یہ میری امی ہیں (مسکرا کر) مجھے ایک منٹ نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں۔

بیگم : تو کھڑا کیوں ہے بیٹھتا کیوں نہیں۔ (شائستہ سے) تم بھی بیٹھو (ثاقب سے) میں صبح سے دیکھ رہی ہوں تو ایک منٹ کے لیے نہیں بیٹھا۔

ثاقب : امی جب کام ہوتا ہے تو چلنا پھرنا ہی پڑتا ہے (شائستہ سے) ارے شائستہ بیٹھو نا۔

شائستہ : (بیگم سے) آپ بھی تو تشریف رکھیے۔
(ثاقب اور بیگم ایک صوفے پر اور شائستہ ان کے سامنے بیٹھ جاتی ہے۔ بیگم (کچھ سوچ کر کھڑے ہوکر)

بیگم : میں ابھی آتی ہوں (دروازے کی طرف جاتی ہیں پھر مڑ کر ثاقب سے) دیکھ کہیں چلا نہ جانا سمجھا۔

ثاقب : (مسکرا کر) امی۔ آپ کے بغیر حکم کے تو میں جنت میں بھی نہیں جاؤں گا۔
(بیگم دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ ثاقب شائستہ سے) میری ماں بھی عجیب ہیں۔ ایک منٹ نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں۔

شائستہ : (مسکرا کر) سمجھ دار ہیں آج کل کے نوجوانوں پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔

ثاقب : (طنزیہ) جی ہاں۔ میں ایک قیدی ہوں۔ زندگی اجیرن ہوگئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ زندگی کب تک رہے گی۔

شائستہ : (ایسے لہجے میں جس میں طنز کی جھلک ہے) جب تک آپ کی امی قید رکھیں۔

ثاقب : (مسکرا کر) مگر میرے تو زلفوں کی زنجیریں پڑی ہیں انھیں کیسے توڑ سکتا ہو۔

شائستہ : (طنزیہ) معلوم ہوتا ہے فرصت زیادہ ہے کہ شاعری کرنے لگے۔ چھوڑیے ان چونچلوں کو۔

ثاقب : کہاں رکھی ہے فرصت (مسکرا کر) کسی کا خیال ایک منٹ کی بھی فرصت نہیں دیتا۔ (بیگم چائے کی کشتی ہاتھ میں لیے داخل ہوتی ہے۔ شائستہ اسے دیکھ کر)

شائستہ : ارے آپ نے یہ تکلیف کیوں کی۔
(شائستہ آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے کشتی لینا چاہتی ہے۔ مگر بیگم اسے کشتی نہیں دیتی۔ میز پر کشتی رکھ کر)

بیگم : اب بی بی تم پہلی بار آئی ہو۔ یہ نہ سمجھو کہ میں بداخلاق ہوں۔ (چائے پیالیوں میں نکالتے ہوئے) بس ذرا اپنے بچے کے معاملے میں سخت ہوں (شائستہ کو پیالی دیتے ہوئے) اور سچ پوچھو تو مجھے اس کا کسی سے ملنا جلنا اور

کہیں آنا جانا بالکل پسند نہیں۔

شائستہ : مگر امی۔

بیگم : (بات کاٹ کر) بھئی معاف کرنا۔ میں ذرا پرانے خیالات کی ہوں۔ آج کل کی لڑکیوں کے لچھن مجھے بالکل پسند نہیں۔

شائستہ : (نظریں اٹھا کر بیگم کو دیکھتی ہے پھر چائے کا گھونٹ لے کر) آپ چائے تو بہت اچھی بناتی ہیں۔

بیگم : ہمارے زمانے میں مائیں گھریلو کاموں ہی کی تعلیم دیتی تھیں۔ پر آج کل کی لڑکیاں تو اڑن چھو ہیں۔ کپڑے درزی سے سلوائیں گی تو کھانا ہوٹل سے آئے گا (ثاقب کی طرف دیکھ کر) بیٹھ کر چائے پی۔ کھڑا کیوں ہے۔

ثاقب : (مسکرا کر) امی۔ تمھارے زمانے میں ہوٹل اور درزی کی آسانیاں نہ ہوں گی۔

بیگم : تھیں کیوں نہیں۔ اللہ بخشے ابا جان کو۔ دو دن گھر میں بھوکے پڑے رہے مگر ہوٹل جا کر کھانا نہیں کھایا۔ شریف لوگ ہوٹل میں قدم رکھتے شرماتے تھے۔ (ثاقب مسکراتا ہے) مسکرا کیا رہا ہے۔ سچ کہہ رہی ہوں۔ ہمیشہ اماں کے ہاتھ کا سلا ہوا انگرکھا پہنا۔ کبھی درزی سے نہیں سلوایا۔ خدا بخشے وہ بھی ایسا سیتی تھیں کہ درزی دانتوں میں انگلیاں دبا لیتے تھے۔ مگر آج کل کی لڑکیاں خدا بچائے ایک بٹن ٹھیک سے نہیں ٹانک سکتیں۔ کھانا پکانا تو دور رہا۔

شائستہ : میری امی بھی ان ہی خیالات کی ہیں۔ ان سے ملیے آپ بہت خوش ہوں گی۔

بیگم : ارے بی بی گھر کے بکھیڑوں ہی سے کہاں فرصت ملتی ہے کہ کہیں آؤں جاؤں۔ اور خدا نے بیٹا بھی دیا تو ایسا کہ خدا بچائے۔ اگر ذرا نظر چوک جائے تو سارا گھر الٹ کے رکھ دے گا۔ بیمار پڑ جائے تو دوا سے جی چرائے گا۔ لاکھ خوشامد کرتی ہوں تب کہیں جا کر ایک گھونٹ حلق سے اتارتا ہے۔

ثاقب : (ہنس کر) امی۔ آپ کو تو میں دن رات بیمار نظر آتا ہوں۔ ہمیشہ دوا پیتے رہنا بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔

بیگم : بس رہنے دے۔ تیری ڈاکٹری کی موٹی موٹی کتابوں میں وہ سب کچھ نہیں لکھا جو ہم بوڑھوں کے تجربے میں ہے۔

(ثاقب مسکرا کر خاموش رہتا ہے۔ شائستہ کھڑی ہوکر)

شائستہ : اب مجھے اجازت دیجیے۔

بیگم : اچھا چل دیں۔ (کھڑی ہوکر) پر بی بی یوں بغیر خبر کیے نہ آیا کرو۔ میزبان کو شرمندگی ہوتی ہے۔

شائستہ : یہ لیجیے آپ نے اس قدر مزیدار چائے پلائی اور کیا میزبانی ہوگی (ہنس کر) اور پھر اپنے گھر کون اطلاع دے کر آتا ہے۔

(بیگم برا سا منہ بناتی ہے مگر خاموش رہتی ہے۔ شائستہ دروازے سے باہر جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ثاقب بھی جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد پھر واپس آتا ہے۔ بیگم اسے دیکھ کر)

بیگم : گئی؟

ثاقب : جی ہاں۔

بیگم : بڑی دیدہ دراز لڑکی ہے (ثاقب حیرت سے اس کا چہرہ دیکھتا ہے) اسے اپنا گھر کہتے شرم نہیں آئی۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان جب ہی تو کہتی ہوں آج کل کی لڑکیوں کے دیدوں کا پانی مرگیا۔ آخر وہ ہے کس کی لڑکی۔

ثاقب : اس کے باپ ایک ریٹائرڈ ایس پی ہیں۔ بڑے بھلے لوگ ہیں۔ گورنمنٹ میں بھی ان کی بڑی عزت ہے۔

بیگم : گورنمنٹ کی بات چھوڑ جو بھی اس کی خیرخواہی کرتا ہے وہ اسی کی عزت کرنے لگتی ہے۔ نام کیا ہے اُن کا۔

ثاقب : عزیزالحسن۔ انگریز گورنمنٹ نے انھیں خاں صاحب کا خطاب دیا تھا۔

بیگم : (ایک دم چونک کر) خاں صاحب عزیزالحسن۔

ثاقب : جی ہاں۔ (بیگم کا چہرہ دیکھ کر) ان کا نام سن کر آپ چونک کیوں پڑیں۔

بیگم : (کھوئے ہوئے انداز میں) کچھ نہیں۔ (سوچتے ہوئے) یہ نام سنا ہوا ہے (بات ٹالنے کے انداز میں) تو ابھی تک اسپتال نہیں گیا۔

ثاقب : بس جا رہا ہوں (بیگم کا چہرہ دیکھ کر) آپ اس قدر پریشان کیوں ہوگئیں؟

بیگم : کوئی بات نہیں۔ جا تو اب نوکری پر جا اور دیکھ سیدھا گھر آ جانا۔

ثاقب : (مسکرا کر) ای میں سیدھا گھر ہی تو آتا ہوں مگر آپ بار بار فون کر کے پریشان کر دیتی ہیں۔ مجھے سکون سے کام نہیں کرنے دیتیں۔

بیگم : اپنے بیٹے کی خیریت معلوم کرنا کوئی گناہ ہے؟ آخر ایک ماں کو یہ حق تو ہے کہ وہ معلوم کرے کہ اس کا بیٹا خیریت سے تو ہے۔ آج کل زمانہ خراب ہے۔ (ثاقب مسکراتا ہوا دوسرے کمرے کی طرف جاتا ہے) دیکھ وقت پر لوٹ آنا۔ دیر ہونے پر مجھے ہول ہونے لگتا ہے۔

ثاقب : اچھا ای۔

(دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ بیگم صوفے پر بیٹھ جاتی ہے اور خلا میں گھورنے لگتی ہے۔ چہرے پر پریشانی کے آثار ہیں)

(پردہ)

تیسرا سین

(وہی کمرہ— ثاقب صوفے پر بیٹھا ایک کتاب دیکھ رہا ہے کہ نصرت کمرے میں آتا ہے اور ثاقب کے ہاتھ سے کتاب لے کر اس کا نام دیکھ کر)

نصرت : کیوں بھائی صاحب یہ شاعری کا چکر کب سے چلنے لگا۔

ثاقب : آؤ بیٹھو۔ کدھر سے چلے آ رہے ہو۔

نصرت : (میز پر کتاب رکھ کر بیٹھتے ہوئے) عزیزالحسن صاحب کے گھر سے۔ تمھاری شکایت کر رہے تھے۔ تم نے ان کے یہاں آنا جانا کیوں چھوڑ دیا ہے۔

ثاقب : فرصت کس مسخرے کو ہے کہ وقت برباد کرتا پھرے!

نصرت : (حیرت سے) وقت برباد کرتا پھرے!

ثاقب : جی ہاں۔ (کھڑا ہوتا ہے اور سنگھار میز کی طرف جاتے ہوئے) میں نے شائستہ سے نہ ملنے کا عہد کرلیا ہے۔

نصرت : مجھے دماغی امراض کا مطالعہ خاص طور پر تمھارے لیے کرنا ہوگا کہ معلوم کیا جائے کہ تمھارے کون سے اسکرو لوز ہیں (اٹھ کر ثاقب کے پاس جاکر) ڈاکٹر رحم دل ہوتا ہے۔

ثاقب : (مڑ کر نصرت کو دیکھ کر) میں نے سخت دلی کا کون سا مظاہرہ کیا ہے۔

نصرت : تمھیں معلوم ہے شائستہ کی کیا حالت ہے۔

ثاقب : (بات ٹالنے کے انداز میں) ٹریجک پارٹ کرنے کی ریہرسل کررہی ہوں گی۔

نصرت : (تخت پر بیٹھ کر) بات مذاق میں نہ اُڑاؤ (سگریٹ جلا کر اس کا لمبا سا کش لے کر) خود اپنے کو دیکھو۔ کیا حالت بنا رکھی ہے۔

ثاقب : اچھا خاصا ہوں۔ (اس طرح مسکرا کر جس میں طنز نمایاں ہے) صرف امی کو شک ہے کہ میں بیمار ہوں۔ (اور ماؤں کا کیا انھیں تو ہمیشہ اپنی اولاد بیمار اور کمزور نظر آتی ہے۔

نصرت : مگر اس وقت ان کی نظریں دھوکا نہیں کھارہی ہیں۔ اگر تم پریشان نہیں ہو تو اپنے پیشے سے بے پروائی کیوں برت رہے ہو۔

ثاقب : پیشے سے بے پروائی۔ (پردہ ہٹا کر دوسرے کمرے میں جھانک کر) آج تم طے کرکے آئے ہو کہ اخلاقیات کے تمام جراثیم مجھ پر عائد کردو گے۔

نصرت : (غصے سے جس میں محبت کا پہلو نمایاں ہے) مجرم کو معاف کردینا دیانت داری نہیں ہے۔ تم آج کل مریضوں سے جس طرح پیش آرہے ہو وہ دیانت داری ہے؟

ثاقب : (غصہ اور نفرت سے) وہ جھوٹے اور مکار ہوتے ہیں۔ اپنی اولاد سے غیر ضروری محبت کرتے ہیں۔

نصرت : تمھاری غفلت سے کل ایک جان گئی ہوتی تمھارے نامہ اعمال میں۔

ثاقب : (بات کاٹ کر) ڈاکٹروں کے ہاتھوں جانے کتنی جانیں جاتی ہیں۔ خدا انھیں معاف کر دیتا ہے۔

نصرت : (کھڑے ہو کر) خدا صرف انجانی غلطی کو معاف کرتا ہے۔ بے پروائی کو نہیں (کچھ دیر رُک کر) آخر تم نے شائستہ سے ملنا جلنا کیوں چھوڑ دیا ہے۔

ثاقب : میرے اپنے ذاتی حالات ہیں۔ میری اپنی مصلحتیں ہیں۔

نصرت : (ثاقب کے پاس جاتے ہوئے) نہ تمھارے ذاتی حالات ہیں اور نہ ذاتی مصلحتیں (سگریٹ کا کش لے کر) تم صرف اپنے آپ سے جنگ کر رہے ہو اور اپنے آپ سے جنگ کرنا بہت خطرناک ہوتا ہے۔

ثاقب : (اُکتائے ہوئے لہجے میں) میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم یہ غیر ضروری اور غیر دلچسپ موضوع کیوں لے بیٹھے۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

نصرت : تمھیں کوئی دلچسپی نہ ہو مگر مجھے ہے (چند سیکنڈ رک کر) میں تمھیں اس وقت تک معاف نہیں کر سکتا جب تک تمھارے اس نامعقول رویہ میں تبدیلی پیدا نہ ہو جائے۔

(ثاقب خاموش رہتا ہے مگر چہرے پر پریشانی اور الجھن کے تاثرات گہرے ہو جاتے ہیں۔ کچھ دیر خاموش رہ کر آہستہ سے)

ثاقب : نصرت! میری کچھ مجبوریاں ہیں، کمزوریاں ہیں جو مجھے بہت عزیز ہیں۔ میں ان کو نہیں چھوڑ سکتا (اسی وقت بیگم کمرے میں آتی ہیں اور نصرت کو سگریٹ پیتا دیکھ کر)

بیگم : اچھا یہ دھواں اڑایا جا رہا ہے (نصرت گھبرا کر سگریٹ پھینک دیتا ہے (بیگم ثاقب سے) کیوں تو بھی سگریٹ پی رہا تھا۔

ثاقب : امی میں نے کبھی سگریٹ پیا ہے جو اب پیوں گا۔ آپ کو تو ہر بات میں شک رہتا ہے۔

بیگم : شک کیوں نہ ہوگا تو ہمیشہ جھوٹ بولتا ہے۔ بتا تیری جیبیں ان میں ضرور سگریٹ ہوگا۔

ثاقب : (دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر مسکراتے ہوئے) لیجیے جامہ تلاشی لے لیجیے۔ آپ کو تو میں جھوٹا اور مکار نظر آتا ہوں۔

(بیگم آگے بڑھ کر جیبیں ٹٹولتی ہے پھر ثاقب کی طرف انگلی اٹھا کر)

بیگم : یاد رکھنا اگر کبھی سگریٹ کو ہاتھ لگایا تو زندگی بھر بات نہیں کروں گی۔

ثاقب : (جھنجھلا کر) امی! آپ کی حکومت اس قدر سخت گیر ہے کہ کبھی کبھی تو اس سے بغاوت کرنے کو جی چاہتا ہے۔

بیگم : یاد رکھ اگر تو نے ماں کا دل دکھایا تو زندگی بھر خوش نہیں رہے گا۔ (نصرت کا پھینکا ہوا سگریٹ کا ٹکڑا باہر پھینکتی ہے)

نصرت : (مسکرا کر) امی آپ اس کی شادی کر دیجیے۔ سب بل نکل جائے گا۔

بیگم : بھلا کوئی اسے اپنی لڑکی دے گا اور کوئی خدا کا بندہ دے بھی دے تو بچاری دو دن میں اُکتا جائے گی۔ میرا ہی ناک میں دم کر رکھا ہے۔

نصرت : امی۔ اس کی شادی ہو جانے کے بعد کم از کم آپ کو اس کی دیکھ بھال سے تو فرصت مل جائے گی۔

بیگم : کوئی ماں کی طرح دیکھ بھال کرے گا۔ بیوی سونخرے کرے گی اور میاں کے منہ پر مکھیاں بھنکنے لگیں گی۔ صبح سے کہہ رہی ہوں۔ داڑھی بنا لے پر کس کی سنتا ہے۔

نصرت : اور امی اب تو اسے اسپتال میں کوارٹر مل گیا ہے۔ دن رات وہیں رہے گا۔ کوئی وہاں اس کی دیکھ بھال کرنے والا تو ہو۔

بیگم : (گھبرا کر) اسپتال میں کوارٹر مل گیا ہے۔ وہیں رہے گا۔

نصرت : جی ہاں۔

بیگم : (ثاقب کی طرف دیکھ کر) کیوں رے۔ تو نے مجھ سے کہا تک نہیں۔

ثاقب : کل ہی تو ملا ہے۔ امی۔ آپ کو سمجھانے کے لیے فرصت کی ضرورت تھی۔

بیگم : ہاں ماں سے بات کرنے کو تیرے پاس فرصت کہاں ہے۔

ثاقب : مگر امی۔

بیگم : (بات کاٹ کر) اب تو وہاں جا کر اکیلا رہے گا۔ نہیں، میں تجھے نہیں جانے دوں گی۔

ثاقب : نوکری ہے ماں۔ حکم تو ماننا پڑے گا۔

بیگم : مجھے ایسی نوکری نہیں کرانا جس میں بیٹا ماں سے جدا ہو جائے۔

ثاقب : آپ بھی وہیں چل کر رہنا۔ آپ کو کون روکتا ہے۔

بیگم : اور بزرگوں کے اس مکان کو چھوڑ دوں جس میں دلہن بن کر آئی تھی۔ جس میں تو اور تیرا باپ پیدا ہوا تھا اور جس میں میری بہو دلہن بن کر آئے گی۔

نصرت : (ہنس کر) ماں۔ تم سے کوئی یہ مکان چھین تو نہیں رہا۔

بیگم : اور چھیننا کیا ہوتا ہے۔ کیا یہ اپنے گھر پر رہ کر نوکری نہیں کرسکتا۔

نصرت : مگر امی۔

بیگم : (بات کاٹ کر) بس چپکے رہو۔ مجھے تم لوگوں کی ایسی باتیں ایک آنکھ نہیں بھاتیں (چند سکنڈ رک کر) دیکھو بشیر بھی کس قدر بے پروا ہے۔ ابھی تک چائے نہیں لایا۔

نصرت : ایسی جلدی کیا ہے امی آجائے گی۔

بیگم : خاک آجائے گی۔ کوئی آج کل کے نوکر نوکر ہیں۔ وہ تو مالکوں پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔

ثاقب : آپ بیٹھیے۔ میں جا کر دیکھتا ہوں۔

(ثاقب دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ نصرت کچھ دیر خاموش رہ کر)

نصرت : امی۔ شائستہ بیمار ہے آپ بھی جا کر ذرا دیکھ آیئے۔

بیگم : وہ میری کیا لگتی جو دوڑی چلی جاؤں اسے دیکھنے۔

نصرت : کوئی نہ بھی لگتی ہو مگر عیادت کرنے سے بیمار کو تسکین ہوتی ہے۔

بیگم : وہ لڑکی مجھے ایک نظر نہیں بھائی۔ کیسی دیدہ دلیری سے کہہ رہی تھی یہ تو میرا ہی گھر ہے۔

نصرت : (مسکرا کر) اگر وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں تو آپ کو کیا اعتراض ہے۔

(ثاقب کمرے میں آتا ہے)

بیگم : (غصہ سے) وہ پسند کرنے والا کون ہوتا ہے۔ بہو میری پسند کی آئے گی۔

نصرت : آپ شائستہ ہی کو پسند کر لیجیے۔ آپ کو ایک اچھی سی بہو مل جائے گی۔

بیگم : میں کہہ چکی ہوں وہ مجھے ایک نظر نہیں بھائی۔ پھر نہ جانے تم لوگ کیوں میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہو۔ (ثاقب کی طرف دیکھ کر جس کے چہرے پر ناگواری کے آثار ہیں) چائے کے لیے کہا۔

ثاقب : بشیر گھر پر ہے ہی کہاں جس سے کہا جائے۔

بیگم : (بیگم اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر) میں بھی سٹھیا گئی ہوں۔ خود ہی تو اسے بازار بھیج کر آئی تھیں۔

(کمرے سے چلی جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد ثاقب ٹھنڈی سانس بھر کر)

ثاقب : جانے ماں کو اس سے کون سی عداوت پیدا ہوگئی ہے۔ اس کا نام سنتے ہی یوں ناک بھوں چڑھاتی ہیں جیسے وہ مرض متعدی ہو۔

نصرت : وہ پرانے خیالات کی ہیں۔ تم فکر نہ کرو (ثاقب کے قریب آتے ہوئے) ایک نہ ایک دن میں انھیں ضرور منا لوں گا۔

ثاقب : (سوچتے ہوئے) بات کچھ اور ہے نصرت۔ کوئی راز ہے جو امی چھپا رہی ہیں اس دن عزیز الحسن صاحب کا نام سن کر وہ چونک پڑی تھیں اور جب ہی سے ان کے رویہ میں تختی آگئی ہے۔ مجھے برابر قسمیں دیتی رہتی ہیں کہ میں شائستہ سے نہ ملا کروں۔

نصرت : (سوچتے ہوئے) مگر سوال یہ ہے کہ۔

ثاقب : (بات کاٹ کر) راز کیا ہے یہ تو وہی جانتی ہیں۔ جب تک یہ راز نہ کھلے گا سب کچھ معما بنا رہے گا۔

(بیگم چائے لے کر آتی ہیں اور دونوں کو ایک ایک پیالی دیتی ہیں۔ دونوں کھڑے کھڑے ہی چائے پینے لگتے ہیں۔ دونوں کو کڑی نظروں سے دیکھ کر)

بیگم : اب چائے بھی بیٹھ کر نہیں پی جاتی (دونوں خاموش رہ کر چائے پیتے رہتے ہیں۔ بیگم سوچتے ہوئے) ثاقب۔ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ تو اسپتال کے کوارٹر میں نہ جائے۔

ثاقب : (جھنجھلا کر) امی۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں نوکری چھوڑ دوں اور دن رات آپ کے سامنے بیٹھا رہا کروں۔

بیگم : (غصہ سے) پھر تو نے الٹ کر جواب دیا۔ جتنا بڑا ہوتا جارہا ہے اتنا ہی بدتمیز بھی۔

ثاقب : امی آپ بھی تو ایسی باتیں کرتی ہیں۔ مجھے حکم ملا ہے وہاں رہوں، تو رہنا پڑے گا۔ (بیگم خاموش رہتی ہے۔ نصرت چائے کی پیالی میز پر رکھ کر)

نصرت : امی۔ اب اجازت ہے۔

بیگم : اچھا اب جائے گا۔ کیا تو بھی اسپتال میں جا کر رہے گا۔

نصرت : نہیں امی۔ میری ایسی قسمت کہاں کہ مجھے یہ ڈیوٹی ملتی۔ اچھا امی۔ آداب۔ (بیگم صرف سر ہلا کر جواب دیتی ہے۔ نصرت کے کمرے سے جانے کے بعد)

بیگم : میں نے کتنی مرتبہ منع کیا کہ تو اس لڑکے سے نہ ملا کر مجھے بالکل پسند نہیں۔

ثاقب : آپ کو تو کوئی بھی پسند نہیں۔ جانے میں کس دن ناپسند ہو جاؤں۔

بیگم : پھر تو نے الٹی سیدھی باتیں کیں۔

ثاقب : تو پھر ایک فہرست بنا کر دیجیے کہ کون کون اچھے ہیں۔ بس انھیں سے ملا کروں گا (بیگم غصہ سے نظر اٹھا کر دیکھتی ہے کہ گھنٹی بجتی ہے۔ بیگم خاموش رہتی ہے۔ ثاقب کمرے سے باہر چلا جاتا ہے۔ بیگم چائے کی پیالیاں کشتی میں رکھتی ہے کہ ثاقب دروازے میں آکر) امی خاں صاحب تشریف لائے

ہیں۔ (بیگم ایک دم کشتی میز پر رکھتی ہے۔ کمرے میں آویزاں بڑی تصویر کو دیکھتی ہے اور تیزی سے اس کے پاس جاکر اسے الٹ دیتی ہے۔ ثاقب خاموش کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہتا ہے۔ بیگم مڑ کر ثاقب کو دیکھتی ہے) اندر بلا لوں۔

بیگم : (آہستہ سے) بلا لو۔ باہر کیوں کھڑا کر رکھا ہے۔

ثاقب : (مڑ کر باہر کی طرف دیکھ کر) تشریف لائیے۔

(عزیزالحسن اندر آتے ہیں اور ہاتھ اٹھا کر بیگم کو سلام کرتے ہیں)

بیگم : تشریف رکھیے۔

(عزیزالحسن صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں کہ ان کی نظر الٹی ہوئی تصویر پر پڑتی ہے۔ چند سیکنڈ اسے دیکھ کر ثاقب سے مخاطب ہوکر)

عزیزالحسن : بھئی تم کئی دن سے ہمارے یہاں نہیں آئے۔ کیا ناراضگی ہے۔

ثاقب : ناراضگی۔ ناراضگی کیا ہوگی۔ بس سمجھ لیجیے کہ مصروفیت زیادہ رہی ان دنوں۔

عزیزالحسن : اس دن دعوت میں بھی نہیں آئے۔ تمھارا بڑا انتظار رہا۔

ثاقب : مجھے خود شرمندگی ہے۔

عزیزالحسن : باہر سے کچھ مہمان آئے تھے وہ بالخصوص تم سے ملنا چاہتے تھے۔ شکار کا بھی پروگرام تھا۔ تمھارے نہ آنے سے سب بدمزہ ہوگیا (ثاقب خاموش رہتا ہے) کئی دن سے شائستہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کل تمھیں فون کیا تم نے خود نہ آکر ڈاکٹر نصرت کو بھیج دیا۔

ثاقب : میں اس وقت بے حد مصروف تھا۔ میں نے سوچا شاید مجھے دیر ہوجائے اس لیے۔

عزیزالحسن : خیر اب آکر دیکھ لینا۔ (سوچتے ہوئے) ڈاکٹر تو سب ہی اچھے ہوتے ہیں۔ مگر مریض کے عقیدے کو علاج میں بڑا دخل ہوتا ہے۔

ثاقب : مگر خاں صاحب نصرت بھی بہت اچھا ڈاکٹر ہے۔

عزیزالحسن : اس میں کوئی شک نہیں مگر ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا نے شفا تمھارے ہاتھ میں دی ہے۔

ثاقب : شکریہ (مسکرا کر) اس دور میں آپ عقیدہ کی بات کہہ کر میرا حوصلہ بڑھا رہے ہیں۔

عزیزالحسن : بھئی ہم تو پرانے خیالات کے ہیں اور عقائد ہی پر زندگی گزارنے کے عادی ہیں (مسکرا کر) تھوڑی سی جو زندگی بچی ہے۔ وہ بھی یوں ہی عقائد کے سہارے گزر جائے گی۔ (ثاقب خاموش رہتا ہے۔ عزیزالحسن بیگم کی طرف دیکھ کر) آپ کسی دن ہمارے یہاں تشریف لائیے نا۔

بیگم : (نظریں جھکا کر) بیس سال سے تو میں نے ایک منٹ کے لیے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا۔ اب آخری وقت میں کیا اپنی قسم توڑوں۔

عزیزالحسن : اگر آپ نے کوئی ایسی قسم کھا رکھی ہے تو میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔ (ثاقب کی طرف دیکھ کر) ثاقب میاں کسی وقت فرصت نکال کر شائستہ کو آکر دیکھ لو۔

ثاقب : ڈاکٹر نصرت مجھ سے برابر مشورہ کرتے رہتے ہیں۔

عزیزالحسن : بھئی ایک ہی لڑکی ہے۔ اس کی تکلیف برداشت نہیں ہوتی (کھڑے ہوکر بیگم سے) اب اجازت دیجیے۔ (ثاقب سے) اگر فرصت ملے تو آکر شائستہ کو دیکھ لینا۔

بیگم : ذرا ٹھہریے تو — بشیر — (بلند آواز سے) بشیر — (عزیزالحسن سے) آپ تشریف تو رکھیے۔ چائے پی کر جائیے گا۔

عزیزالحسن : آپ تکلیف نہ کیجیے۔ میں چائے کا عادی نہیں ہوں۔

(عزیزالحسن کمرے سے چلے جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ ثاقب بھی جاتا ہے۔ بیگم کے چہرے پر پریشانی کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ دیر بعد ثاقب پھر کمرے میں آتا ہے۔ کچھ دیر بیگم کے چہرے کو دیکھتا رہتا ہے۔ پھر آگے بڑھتے ہوئے)

ثاقب : امی۔ آپ نے یہ تصویر کیوں الٹ دی تھی۔

(بیگم کوئی جواب نہیں دیتی۔ آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں)

(پردہ)

دوسرا ایکٹ

پہلا سین

منظر

(ڈاکٹر ثاقب کے اسپتال کے کوارٹر کا کمرہ۔ پلنگ پر بستر بے ترتیب حالت میں ہے۔ میز پر شیو کا سامان بے ترتیب پڑا ہے۔ کپڑوں کا کرسی پر ڈھیر سا ہے۔ پلنگ کے نیچے جوتے بکھرے ہوئے ہیں۔ غرض کہ کسی قسم کی کوئی ترتیب نہیں ہے۔ عزیز الحسن کچھ پریشان سے کمرے میں ٹہل رہے ہیں کہ نصرت کمرے میں آتا ہے۔ عزیز الحسن اسے دیکھ کر)۔

عزیزالحسن : ثاقب کہاں ہے۔ میں کب سے اس کا انتظار کر رہا ہوں۔

نصرت : وہ اس وقت راؤنڈ پر ہے۔ خیریت تو ہے۔

عزیزالحسن : شائستہ کی طبیعت اور خراب ہوگئی۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ بھی چل کر معائنہ کر لیتا۔

نصرت : میں نے جو دوا دی تھی۔ وہ پلائی۔ آپ تشریف تو رکھیے۔

عزیزالحسن : (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) ہاں پلا دی تھی مگر نیند نہیں آئی۔ رات بھر بے چین رہی۔

نصرت : میرا خیال ہے انھیں کوئی بیماری نہیں ہے۔ صرف ذہنی الجھن ہے۔ ذہنی الجھن ہی سے ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

عزیزالحسن : اس دن ڈاکٹر ثاقب کے دعوت میں نہ آنے سے اسے سخت تکلیف ہوئی ہے وہ محسوس کرتی ہے کہ اس کی توہین کی گئی ہے۔ وہ اپنی سہیلیوں کی نظر میں بے عزت ہوگئی ہے۔

نصرت : آپ کو انھیں سمجھانا چاہیے کہ یہ ایک معمولی واقعہ ہے۔

عزیزالحسن : (سوچتے ہوئے) آج کے انسان نے عجیب عجیب کامپلیکسیز کو اپنی زندگی بنا لیا ہے اور وہ ان کے دائروں سے باہر نکلنا نہیں چاہتا۔ خیر چھوڑو اس ذکر کو وہ کس وقت تک راؤنڈ سے واپس آجاتا ہے۔

نصرت : بے حد جھکی ہے کوئی ٹھکانہ نہیں (عزیزالحسن کھڑے ہوتے ہیں) آپ تشریف تو رکھیے۔

عزیزالحسن : میرا ٹھہرنا بیکار ہے۔ میری موجودگی میں شاید وہ نہ آئے۔

نصرت : (نصرت چند سکنڈ رک کر) آپ ثاقب کے والد سے واقف ہیں؟

عزیزالحسن : نہیں اور نہ میں نے جاننے کی کوشش کی (نصرت کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے) کیا بات ہے۔

نصرت : آپ جس روز اس کے گھر گئے تھے وہاں آپ نے کوئی تصویر الٹی لٹکی دیکھی تھی۔

عزیزالحسن : ہاں۔ مجھے حیرت تھی کہ تصویر آویزاں کرنے کا یہ کون سا ڈھنگ ہے۔

نصرت : وہ ثاقب کے والد کی تصویر تھی جو اس کی والدہ نے آپ کا نام سن کر الٹ دی تھی۔

عزیزالحسن : لیکن انھوں نے ایسا کیوں کیا تھا۔

نصرت : خود ثاقب کو حیرت ہے۔ اور اس کی ماں کچھ نہیں بتلاتیں۔

عزیزالحسن : (سوچتے ہوئے) میں اس تصویر کو دیکھوں تو شاید پہچان سکوں۔

نصرت : اب وہ تصویر اس کی ماں نے غائب کردی ہے۔ خود ثاقب کو پتا نہیں کہ وہ کہاں ہے۔

عزیزالحسن : اس کی ماں نے کہا تھا کہ وہ بیس سال سے گھر سے نہیں نکلی۔

نصرت : اور یہ صحیح ہے۔ میں بچپن سے دیکھ رہا ہوں کہ وہ ایک منٹ کو بھی گھر سے باہر نہیں جاتیں۔

عزیزالحسن : (سوچتے ہوئے) ممکن ہے ان کی ذات سے کوئی ناخوشگوار واقعہ وابستہ ہو جس سے وہ خوف زدہ ہوں کہ اس کی تشہیر نہ ہوجائے۔ ان کے گھر کس قسم

کے لوگ آتے ہیں۔

نصرت : پہلے تو ان کے کچھ عزیز آیا کرتے تھے۔ سب مہذب اور شریف ہوتے تھے مگر اب تو برسوں سے انھوں نے بھی آنا جانا چھوڑ دیا ہے۔

(عزیزالحسن خاموش رہ کر سوچتے ہیں کہ سسٹر گلریز کمرے میں آ کر)

گلریز : ڈاکٹر! اب میں تمھارے دوست کے ساتھ کام نہیں کر سکتی۔

نصرت : (گلریز کو دیکھ کر) کیا ہوا سسٹر۔

گلریز : ہوا یہ کہ وہ اب بالکل پاگل ہو گئے ہیں۔ مریضوں کو جھڑک دیتے ہیں۔

نصرت : وہ آج کل پریشان ہے۔ آپ ذرا اس کا خیال رکھیے۔

گلریز : کیا خاک خیال رکھوں۔ وہ مجھ سے بھی سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔ ابھی ایک بچے کی ماں کو جھڑک دیا۔ وہ بچاری التجائیں کرتی رہ گئی۔ مجھے بہت غصہ آیا اور میں یہاں چلی آئی۔

نصرت : آپ تو اس کا خیال رکھتی ہیں۔ کچھ دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔

گلریز : کیا خاک ٹھیک ہو جائیں گے۔ ایک اچھا ڈاکٹر تباہ ہو رہا ہے۔ وہ شادی کیوں نہیں کر لیتے۔

نصرت : (مسکرا کر) ابھی اس کا شادی کا ارادہ نہیں ہے۔

گلریز : اگر اس نے شادی نہیں کی تو وہ یوں ہی دوسروں کی زندگیوں سے کھیلتا رہے گا۔

نصرت : مگر سسٹر۔۔۔

گلریز : (بات کاٹ کر) بس اب اس کی بات نہ کرو۔ ہمیں اس پر بہت غصہ ہے۔ (غصہ میں تیز تیز قدموں سے چلی جاتی ہے۔ نصرت عزیزالحسن کی طرف دیکھ کر جو اپنے ہی خیالات میں کھوئے ہوئے ہیں)۔

نصرت : بڑی نیک اور ہوشیار نرس ہے۔ سب کا خیال رکھتی ہے۔

عزیزالحسن : (نصرت کی بات پر دھیان نہ دے کر) ثاقب کے والد کا نام کیا تھا۔

نصرت : نجم الدین۔ انھیں مرے ہوئے بیس سال ہو چکے ہیں۔ (عزیزالحسن کے

قریب جاتے ہوئے) آپ اس نام کے کسی شخص سے واقف ہیں۔

عزیزالحسن : (ایک ہی نام کے جانے کتنے لوگ ہوتے ہیں اور انھیں مرے ہوئے تو بیس سال ہو چکے ہیں۔

نصرت : خود ثاقب کو اپنے باپ کے متعلق کچھ زیادہ معلوم نہیں۔ اس کی ماں بھی ان کے بارے میں کچھ نہیں بتلاتی (عزیزالحسن خاموش رہتے ہیں) ثاقب کی ماں ایک معما ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے شک ہوتا ہے کہ وہ اس کی اصل ماں ہے بھی کہ نہیں۔

عزیزالحسن : یہ بھی ہوسکتا ہے (سوچتے ہوئے) اس نے وہ تصویر مجھ سے کیوں چھپائی تھی۔

نصرت : خود ثاقب کو بھی اس پر حیرت ہے۔

عزیزالحسن : ہوسکتا ہے کہ اس سے کوئی ایسا راز وابستہ ہو جس سے میں واقف ہوں۔ کیا وہ تصویر میں ایک بار نہیں دیکھ سکتا۔

نصرت : وہ تصویر ثاقب کی ماں نے چھپا دی ہے۔ اب اس کا حاصل کرنا مشکل ہے۔

عزیزالحسن : اسے حاصل کرنے کی کوشش کرو۔۔۔ (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) میں جب تک یہاں ہوں ثاقب نہیں آئے گا۔

نصرت : کیا آپ شائستہ بیگم کو یہاں نہیں لاسکتے۔

عزیزالحسن : نہیں۔ نہ میں اسے مناسب سمجھتا ہوں اور نہ وہ خود یہاں آئے گی۔

نصرت : میں شام کو آکر انھیں دیکھ لوں گا۔

(عزیزالحسن کمرے سے چلے جاتے ہیں۔)

(پردہ)

دوسرا سین

(اسپتال کے کوارٹر کا وہی کمرہ۔ ثاقب آنکھیں بند کیے کرسی پر بیٹھا ہے۔ مسٹر گلریز میز کے پاس کھڑی چائے بنا رہی ہے۔ پھر پیالی لے کر ثاقب کے

پاس آتے ہوئے)۔

گلریز : ڈاکٹر۔ اب تم شادی کرلو۔ میں تمھاری وجہ سے بہت پریشان ہوجاتی ہوں۔

ثاقب : (آنکھیں کھول کر مسکراتے ہوئے) نہیں سسٹر ابھی شادی کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔

گلریز : (پیالی اس کے ہاتھ میں دے کر) آپ نے کوئی لڑکی پسند کی۔

ثاقب : نہیں سسٹر۔ ابھی پسند کی کوئی لڑکی نہیں ملی۔

گلریز : (کھڑکی کے پاس جاکر پردہ برابر کرتے ہوئے) آپ مجھ سے چھپا کیوں رہے ہیں (مڑ کر ثاقب کو دیکھ کر) ڈاکٹر نصرت نے کہا تھا کہ آپ جس لڑکی کو پسند کرتے ہیں وہ آپ کی مدر کو پسند نہیں۔

ثاقب : اس نے تم سے مذاق کیا ہوگا۔ (بات ٹالنے کے انداز میں) بیڈ نمبر 15 کے مریض کو انجکشن لگا دیا تھا۔

گلریز : میں اپنی ڈیوٹی کو خوب سمجھتی ہوں ڈاکٹر۔ تم بات کیوں ٹال رہے ہو۔

ثاقب : میں بات نہیں ٹال رہا ہوں سسٹر۔ (مسکرا کر) میں جب شادی کروں گا تو تم کو ضرور مدعو کروں گا۔

گلریز : (پلنگ پر بستر برابر کرتے ہوئے) اگر آپ نہیں بھی بلائیں گے تو میں خود بلا بلائے آجاؤں گی۔ (کچھ دیر رک کر) میں آپ کی مدر سے بات کروں گی۔ وہ آپ کو آپ کی پسند کی لڑکی سے شادی کرنے دیں۔

ثاقب : نہیں سسٹر تم ان سے کوئی بات نہ کرنا۔

گلریز : کیوں نہ کرنا — آپ سچ بتلایئے شادی کرنا چاہتے ہیں یا نہیں۔

ثاقب : نہیں۔

گلریز : جھوٹ نہ بولیے (ثاقب کے پاس آکر) میں کل ڈاکٹر نصرت کے ساتھ خاں صاحب کے گھر گئی تھی۔ شائستہ بیگم کی حالت دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ آپ جاکر انھیں ضرور دیکھ لیں۔

ثاقب : (پیالی میز پر رکھ کر) نہیں سسٹر میں نہیں جاؤں گا۔
گلریز : کیوں نہیں جاؤ گے اور اگر نہیں جاؤ گے تو یہاں مریضوں کی جانیں لیتے رہو گے۔ آپ اتنے اچھے ڈاکٹر ہیں مگر آج کل سب الٹا سیدھا کر رہے ہیں۔ آپ بدنام ہوجائیں گے۔
ثاقب : (کھڑے ہوکر پریشانی کے لہجے میں) پھر میں کیا کروں میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔
گلریز : آپ شائستہ بیگم سے شادی کر لیجیے۔
ثاقب : (بے حد مایوسی کے لہجے میں) سسٹر میں اس سے شادی نہیں کرسکتا۔ اس سے نہیں مل سکتا۔ مجبوری ہے۔ خدا کے لیے تم اس سلسلے میں کچھ نہ بولو۔
گلریز : مگر ڈاکٹر نصرت کہتے ہیں کہ آپ کی مدر اس سے نہیں ملنے دیتیں کیا یہ سچ ہے۔
ثاقب : (مجرمانہ لہجے میں) ہاں سسٹر یہ سچ ہے۔
گلریز : اوہ گاڈ۔ آپ کی مدر اس قدر ناسمجھ کیوں ہیں (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) کبھی کبھی سب کی مدر اتنی ناسمجھ کیوں ہوجاتی ہیں (آنسو پونچھ کر) ہمارے فادر مرے تو ہماری مدر نے دوسری شادی کی۔ پھر ہمارے نئے فادر نے ہمیں بہت دکھ دیے۔
ثاقب : (گلریز کے آنسوؤں سے متاثر ہوکر) سسٹر اب آپ کی ماں کہاں ہیں۔
گلریز : وہ ہمیں پادری کے حوالے کر کے کہیں چلی گئیں اور پادری نے ہی ہماری پرورش کی (پھر آنسو پونچھ کر) ڈاکٹر میں آپ کی کیا مدد کرسکتی ہوں۔
ثاقب : شکریہ سسٹر۔
گلریز : میں شائستہ بیگم کے گھر جا کر ان سے ملوں گی۔ ان کو سمجھاؤں گی۔ کوئی تدبیر کروں گی کہ آپ سے شادی کرلیں (نصرت کمرے میں آتا ہے۔ گلریز اسے دیکھ کر) ڈاکٹر! یہ تمھارے دوست پاگل کیوں ہوگئے ہیں۔ اپنی پسند کی لڑکی سے شادی نہیں کریں گے تو کس سے کریں گے۔

نصرت : سسٹر۔ یہ اپنی ماں کی پسند کی لڑکی سے شادی کرے گا۔

گلریز : اوہ گاڈ۔ یہ برباد ہوجائیں گے (کچھ دیر خاموش رہتی ہے پھر ثاقب کی طرف دیکھ کر) ڈاکٹر تم اپنے آپ کو سنبھالو۔ میں تمھاری مدد کروں گی۔

(ثاقب خاموش رہتا ہے۔گلریز خاموشی سے چلی جاتی ہے۔نصرت سگریٹ جلا کر اس سے دوچار کش لے کر)

نصرت : میں خاں صاحب کے گھر سے آرہا ہوں۔

ثاقب : (میز کے پاس جاتے ہوئے) اچھا۔

نصرت : شائستہ کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

ثاقب : (چائے پیالی میں نکالتے ہوئے) اچھا۔

نصرت : خاں صاحب بہت پریشان ہیں۔

ثاقب : (چائے کی پیالی ہاتھ میں لے کر نصرت کے پاس آتے ہوئے) اچھا۔

نصرت : (کسی قدر غصہ سے) کیا اچھا اچھا لگا رکھا ہے۔کیا تمھارے دل میں احساس مروّت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔

ثاقب : (پیالی نصرت کو دیتے ہوئے طنزیہ) احساس مروّت خوبصورت ترکیب ہے۔

نصرت : (غصہ سے سگریٹ زمین پر پھینک کر) تم انسان نہیں حیوان ہو۔تم اس سے شادی نہیں کرنا چاہتے نہ کرو۔تم اس سے ملنا نہیں چاہتے نہ ملو لیکن یہ کون سی انسانیت ہے کہ تم بحیثیت ڈاکٹر اس کے معالج ہونا بھی پسند نہیں کرتے۔ یہ پیشہ کے ساتھ بددیانتی ہے۔

ثاقب : (زمین پر پڑی ہوئی سگریٹ پانو سے مسلتے ہوئے) شہر میں ڈاکٹروں کی کمی نہیں ہے۔ مجھ پر ہی کیا منحصر ہے۔

نصرت : بالکل منحصر ہے۔ بالکل نامعقول ہو۔

ثاقب : (طنزیہ ہنس کر) تم بھی گالیاں دینے پر اُتر آئے۔

نصرت : دل دکھتا ہے تو زبان بھی چلنے لگتی ہے۔تم میرے دوست ہو ورنہ——

ثاقب : (لقمہ دے کر) مجھے گولی مار دیتے (زہریلی مسکراہٹ سے) زہر دے دیتے
ٹھنڈی سانس بھر کر) کاش دوست تم یہ احسان مجھ پر کر سکتے۔

نصرت : (چائے کی پیالی میز پر رکھ کر سمجھانے کے لہجے میں) تم اپنی ماں کے فرماں
بردار ہو۔ بہت اچھی بات ہے۔ تمھاری ماں نے شائستہ کو پسند نہیں کیا اور تم
نے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن وہ بیمار ہے۔ تمھیں اس کا
معائنہ تو کرنا چاہیے (ثاقب خاموش رہتا ہے۔ نصرت کچھ دیر خاموش رہ کر)
تم نے وہ تصویر حاصل کی۔

ثاقب : نہیں۔ امی نے جانے کہاں چھپا رکھی ہے۔

نصرت : سارا راز اسی تصویر میں ہے۔ جب تک وہ تصویر نہیں ملے گی تمھاری امی یوں
ہی معمائی رہیں گی۔

ثاقب : (کرسی پر بیٹھ کر) جانے کہاں چھپا دی ہے۔ میں نے کئی مرتبہ پوچھا۔ مگر وہ
کچھ بتلاتی ہی نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ وہ تصویر میرے لیے اور
الجھن بن گئی ہے۔

نصرت : آج بہت دیر تک خاں صاحب سے گفتگو ہوئی۔ وہ خود حیران ہیں کہ تصویر
ان سے کیوں چھپائی گئی۔ تم نے اپنی امی سے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔

ثاقب : کیوں نہیں مگر وہ کچھ بتلاتی نہیں رونے لگتی ہے۔

نصرت : عزیز الحسن صاحب کا خیال ہے کہ اس سے کوئی کہانی وابستہ ہے جس سے وہ
واقف ہیں۔ تمھیں یقین ہے کہ تمھارے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔

ثاقب : ہاں مجھے یقین ہے۔

(اسی وقت سسٹر گلریز تیز تیز قدموں سے کمرے میں آ کر)

گلریز : ڈاکٹر بیڈ نمبر 15 کے مریض کی حالت بہت خراب ہوگئی ہے۔ تم اسے فوراً
اٹینڈ کرو۔

(ثاقب بہت تیزی سے اُٹھ کر کمرے سے چلا جاتا ہے نصرت گلریز کو دیکھ کر)

نصرت : سسٹر اس وقت تو آپ ڈیوٹی پر نہیں ہیں۔

گلریز : میں ادھر سے گزر رہی تھی۔ ڈیوٹی پر جو نرس تھی وہ پریشان تھی۔ مریض کی سیریس کنڈیشن دیکھ کر میں خبر کرنے چلی آئی (ہمدردی کے لہجے میں) بالکل ینگ ہے گاڈ بلیس ہم۔

(واپس جانے کے لیے مڑتی ہے۔ (نصرت سگریٹ کا کش لے کر)

نصرت : سسٹر (گلریز مڑ کر دیکھتی ہے۔ نصرت مسکرا کر) اب آپ بھی شادی کرلو۔

گلریز : (مصنوعی غصہ سے) ڈاکٹر آپ ہم سے بدمعاشی کی باتیں نہ کیا کرو۔

نصرت : تو کیا شادی نہیں کروگی۔

گلریز : ہاں ابھی میں اس چکر میں پڑنا نہیں چاہتی۔

نصرت : (مسکرا کر) جب آپ بوڑھی ہوجاؤگی پھر کون اس چکر میں پڑے گا۔

گلریز : نہ پڑے۔ میں مریضوں کی خدمت کرتی رہوں گی (مسکرا کر) مگر آپ کو میری شادی کی کیا فکر ہے۔

نصرت : میں آپ کی شادی پر ایک شاندار پارٹی کھانا چاہتا ہوں۔

گلریز : تو آپ پارٹی کھانے کے لے میری شادی کرانا چاہتے ہیں۔

نصرت : ہاں سسٹر۔

گلریز : ڈاکٹر آپ بہت شریر ہیں۔ اچھا جب ڈاکٹر ثاقب شادی کریں گے تو ہم ایک شاندار پارٹی دیں گے (مسکرا کر) آپ کو ضرور بلاؤں گی۔

نصرت : شکریہ سسٹر۔ اچھا سسٹر آپ نے شادی کے لیے کسی کو پسند کیا ہے۔

گلریز : ڈاکٹر تم ہماری پرائیویٹ لائف کیوں معلوم کرنا چاہتے ہو۔

نصرت : (مسکرا کر) سسٹر میں آپ کے لور سے ملنا اور اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔

گلریز : ہمارا لور الو کا پٹھا تھا ایک دم اُلو کا پٹھا وہ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔

نصرت : سوری سسٹر وہ آپ کو یاد تو آتا ہوگا۔

گلریز : کہہ دیا وہ الو کا پٹھا تھا۔ سب مرد اُلو کے پٹھے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر ثاقب کی

طرح۔کیسی اچھی لڑکی ہے۔کیسی اچھی فیملی ہے اور ڈاکٹر ثاقب اسے چھوڑ رہا ہے۔

نصرت : مگر ثاقب کی امی شائستہ کو پسند نہیں کرتیں۔

گلریز : کیوں پسند نہیں کرتیں۔ شادی ڈاکٹر کریں گے یا ان کی امی۔ ڈاکٹر ثاقب جنٹلمین اُلو کا پٹھا ہے۔ میں نے سوچ رکھا ہے کہ —

(اسی وقت ثاقب تھکے تھکے قدموں سے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ گلریز خاموش ہوکر اسے دیکھنے لگتی ہے۔ نصرت بھی خاموش رہتا ہے۔ ثاقب ایک کرسی پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ کچھ دیر بعد)

ثاقب : ہی از نو مور۔

گلریز : (سینہ پر کراس بناتے ہوئے) اوہ گاڈ۔ وہ تو بہت ینگ تھا۔

(آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ کمرے کا ماحول ایک دم اُداس ہو جاتا ہے)

(پردہ)

تیسرا سین

(وہی کمرہ۔ ڈاکٹر نصرت کھڑکی کے پاس کھڑا سگریٹ پی رہا ہے۔ عزیزالحسن ایک کرسی پر خاموش بیٹھے کچھ سوچ رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد نصرت کو دیکھ کر)

عزیزالحسن : ڈاکٹر۔ یہ سسٹر گلریز کس قسم کی عورت ہے۔

نصرت : (پردہ ہٹا کر سگریٹ باہر پھینکتے ہوئے) بہت نیک ہے۔ اس جیسی نرس پورے اسپتال میں نہیں ہے۔

عزیزالحسن : کل یہ شائستہ سے ملنے آئی تھی۔ بہت دیر تک اس سے باتیں کرتی رہی۔

نصرت : وہ ثاقب کا بہت خیال رکھتی ہے۔ کہہ رہی تھی کہ شائستہ بیگم کو منا کر یہاں لاؤں گی۔

عزیزالحسن : (کھڑے ہوکر) کچھ زیادہ چالاک عورت تو نہیں ہے۔

نصرت : (مسکرا کر) نہیں وہ ایسی عورت نہیں ہے۔ مخلص اور نیک ہے۔

(عزیزالحسن صاحب پان چباتے ہوئے باہر جاتے ہیں۔ کچھ دیر بعد کمرے میں آکر)

عزیزالحسن : اس تصویر کا کوئی پتا چلا۔

نصرت : نہیں۔ ثاقب تو ناامید ہو چکا ہے۔

(عزیزالحسن خاموشی سے کچھ سوچتے ہیں اور پھر نصرت کے پاس آکر)

عزیزالحسن : یہ بات تو بالکل طے ہے کہ ثاقب کی والدہ کوئی بڑا راز چھپا رہی ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس کا تعلق ثاقب کی ذات سے کیا ہے۔

نصرت : (سگریٹ جلا کر) میں بچپن سے اس کے ساتھ رہا ہوں اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ انتہائی نیک اور شریف ہے۔ اس کی ذات سے کسی برائی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

عزیزالحسن : (سوچتے ہوئے) اس کی پیدائش یہیں کی ہے یا یہ خاندان کہیں باہر سے آکر سیٹل ہوا ہے۔

نصرت : میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے انھیں اسی مکان میں آباد دیکھا ہے۔ یہ ان کا آبائی مکان ہے۔

(عزیزالحسن کمرے میں ٹہلنے لگتے ہیں۔ چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی گہری سوچ میں گم ہیں کہ ثاقب کمرے میں آتا ہے اور عزیزالحسن صاحب کو دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہے۔ عزیزالحسن نظریں اٹھا کر اسے دیکھ کر)۔

عزیزالحسن : آؤ آؤ ڈاکٹر۔ میں تمھارا ہی انتظار کر رہا تھا۔

ثاقب : ایک دو اہم کیس اٹینڈ کر رہا تھا۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) اب شائستہ بیگم کی طبیعت کیسی ہے۔

عزیزالحسن : قدرے بہتر ہے۔ ڈاکٹر نصرت پوری توجہ دے رہے ہیں۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) ابھی تک اس تصویر کا پتا نہیں چلا؟

ثاقب : (غور سے عزیزالحسن کا چہرہ دیکھ کر) جی نہیں۔

عزیزالحسن : ڈاکٹر۔ تمھاری والدہ تم سے کوئی راز چھپا رہی ہیں اس لیے خود معما بنی ہوئی ہیں اور تم پریشان ہو رہے ہو۔ اس راز کا فاش ہونا بے حد ضروری ہے۔

(کچھ دیر خاموش رہتا ہے پھر مڑ کر عزیزالحسن کو دیکھ کر) لیکن امی کچھ بھی بتلانے کو تیار نہیں ہیں (مایوسی کے لہجے میں ٹھنڈی سانس بھر کر) سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔

عزیزالحسن : پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہمت سے کام لو (چند سکنڈ رک کر) وہ تصویر کسی طرح حاصل کرلو۔

ثاقب : ماں نے کہاں چھپا دی ہے۔ کچھ پتا نہیں چل رہا اور پھر وہ دن رات گھر کی چوکیداری کرتی رہتی ہیں۔

عزیزالحسن : (کچھ دیر خاموش رہ کر افسوس کے لہجے میں) بعض وقت غیر معمولی محبت بھی مصیبت کا سبب بن جاتی ہے (ثاقب کی طرف دیکھ کر) تمھارا باپ چور نہیں تھا۔ ڈاکو نہیں تھا، قاتل نہیں تھا پھر اس کو کیوں معما بنایا جارہا ہے۔

ثاقب : خاں صاحب۔

عزیزالحسن : اور اگر وہ یہ سب کچھ تھا تو اپنے اعمال اپنے ساتھ لے گیا۔ تم ان کی سزا کیوں بھگتو۔

ثاقب : (شکست خوردہ لہجے میں) باپ کے اعمال کی سزا اولاد کو بھگتنا ہی پڑتی ہے۔ اس دنیا میں ایسا ہوتا رہا ہے۔

عزیزالحسن : یہ سب فضول بکواس ہے (ثاقب خاموش رہتا ہے۔ عزیز الحسن کچھ دیر ثاقب کو دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر دروازے کی طرف جاتے ہوئے) اس سلسلے میں اگر کبھی میری مدد کی ضرورت پڑے تو بلا تکلف چلے آنا۔

(عزیزالحسن صاحب کمرے سے چلے جاتے ہیں۔ ثاقب کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے نصرت کچھ دیر خاموش رہ کر)

نصرت : کل مسز گلریز شائستہ سے ملنے گئی تھی (ثاقب کوئی جواب نہیں دیتا) وہاں

سے بہت ناامید ہوکر واپس آئی ہے۔

ثاقب : (رک کر نصرت کا چہرہ دیکھ کر) کیسی ناامید۔

نصرت : شائستہ نے تم سے ملنے سے انکار کردیا۔

ثاقب : یہ بھی اچھا ہوا۔ (طنزیہ مسکرا کر) ایک جھنجھٹ دور ہوئی (بے حد طنزیہ لہجے میں) کیا معلوم میرا باپ چور ڈاکو، یا قاتل رہا ہو۔

نصرت : اس کا تمھاری ذات سے کیا تعلق ہے۔

ثاقب: ایک چور ڈاکو اور قاتل کی اولاد چور، ڈاکو، یا قاتل ہی ہوسکتی ہے۔

نصرت : بہکی بہکی باتیں نہ کرو۔ جا کر شائستہ سے مل لو۔ میں امی کو کسی نہ کسی طرح منا لوں گا۔

ثاقب : میں ہرگز اس سے نہیں ملوں گا۔

نصرت : لیکن تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو۔

ثاقب : (ایک دم مشتعل ہوکر) یہ جھوٹ ہے فریب ہے۔ مجھے کسی سے محبت نہیں ہے۔ تم کیوں بار بار اس مسئلے کو چھیڑتے رہتے ہو۔

نصرت : ثاقب! نادان نہ بنو۔ اگر تمھارا یہی رویہ رہا تو ایک دن اسے ٹی بی ہوجائے گی۔

ثاقب : پھر میں کیا کروں۔ جو کچھ جس کی قسمت میں ہوتا ہے وہ ہوکر رہتا ہے۔

نصرت : غلط ہے۔ ہم اپنی بے وقوفیوں کو اپنی قسمت کا نام دیتے ہیں لیکن اپنی غلطیوں کو محسوس نہیں کرتے۔

ثاقب : (جھنجھلا کر) یہ تم ناصح مشفق کب سے بن گئے۔ میں ایسی نصیحتیں سنتے سنتے عاجز آ گیا ہوں۔

نصرت : (غصہ سے) اور تمھیں اس وقت تک سننا پڑیں گی جب تک تم اپنا رویہ تبدیل نہیں کردیتے۔

ثاقب : اور میں ہرگز اپنا رویہ تبدیل کرنے کو تیار نہیں۔

نصرت : (غصہ سے) تو پھر مجھے اپنا رویہ تبدیل کرنا پڑے گا اور کہنا پڑے گا کہ تم

خودغرض ہو بزدل ہو۔ تم میں نہ ہمت ہے اور نہ جرأت (ذرا اور اونچی آواز سے) تم بے حس ہو، بے پروا اور بے مروت ہو۔

ثاقب : (اپنی پوری آواز سے چیخ کر) نصرت! بس خاموش رہو ورنہ—

(گلریز کمرے میں آتے ہوئے)

گلریز : اوہ بابا۔ تم لوگ اس قدر چیخ کر کیوں بول رہے ہو۔

نصرت : (آہستہ سے ٹھنڈی سانس بھر کر) کچھ نہیں سسٹر۔ مردوں کو انجکشن لگانا فضول ہے۔

گلریز : کیا ڈاکٹر ثاقب نے پھر کوئی کیس بگاڑ دیا۔

نصرت : نہیں سسٹر۔ وہ اپنا کیس بگاڑ رہا ہے (ثاقب کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھر کر) ثاقب۔ تمھارا ایک دوست تھا۔ آج وہ مر گیا۔

(ثاقب کوئی جواب نہیں دیتا۔ نصرت تھکے تھکے قدموں سے کمرے سے چلا جاتا ہے۔ گلریز خاموش کھڑی رہتی ہے۔ کچھ دیر کمرے پر خاموشی طاری رہتی ہے۔ پھر گلریز ثاقب کو دیکھ کر آہستہ سے)

گلریز : ڈاکٹر۔ آخر تمھیں ہو کیا گیا ہے۔

ثاقب : (چیخ کر) پاگل ہو گیا ہوں۔ باولا ہو گیا ہوں۔

گلریز : ڈاکٹر۔ تم بری زبان منہ سے کیوں نکالتے ہو۔ (ثاقب کے پاس آکر) ہم سب تمھارا بھلا چاہتے ہیں۔

ثاقب : (ٹھنڈی سانس بھر کر) جو میرا بھلا چاہتے ہیں وہ ایک دن مجھے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ شائستہ چلی گئی۔ خاں صاحب چلے گئے اور اب نصرت چلا گیا۔ (طنزیہ مسکرا کر) اور ایک دن سسٹر تم بھی چلی جاؤ گی۔

گلریز : نہیں ڈاکٹر۔ میں بے وفا نہیں ہوں۔ تم جیسے شریف انسان کو چھوڑ کر جانے کا میں سوچ بھی نہیں سکتی۔

ثاقب : سب ہی یہی کہتے ہیں مگر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں (ٹھنڈی سانس بھر کر) شائستہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتی۔ عزیزالحسن مجھے چور ڈاکو اور قاتل کی اولاد

سمجھتے ہیں۔ نصرت مجھے بے حس، بددیانت اور بے مروّت سمجھتا ہے (کرسی پر بیٹھ کر کچھ دیر خلا میں گھورتے ہوئے) سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں (ٹھنڈی سانس بھر کر) میں جب مروں گا تو کوئی دو قطرہ آنسو بھی بہانے والا نہ ہوگا۔

گلریز : ڈاکٹر آپ اتنے ینگ ہوکر مرنے کی بات سوچتے ہیں۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) آپ ایسی بات نہ سوچیں ڈاکٹر۔ مجھے دکھ ہوتا ہے۔

ثاقب : (حیرت سے گلریز کا چہرہ دیکھ کر) سسٹر آپ کی آنکھوں میں آنسو۔

گلریز : کیوں ڈاکٹر۔ کیا ہم انسان نہیں۔ کیا ہم کسی کے دکھ سے دکھی نہیں ہوسکتے۔ ہم تمھارا دکھ بانٹ لینا چاہتے ہیں۔

ثاقب : (کچھ دیر گلریز کو دیکھتا رہتا ہے۔ کھڑا ہوتا ہے۔ گلریز کے پاس جاکر اس کے گالوں پر بہتے ہوئے آنسو پونچھ کر) آج میں نے دنیا کے سب سے قیمتی آنسو دیکھے ہیں سسٹر۔ آج تم نے میرے لیے دنیا کا سب سے قیمتی خزانہ لٹا دیا۔ کاش میں اس کا بدلا دے سکتا۔

گلریز : میں بدلہ نہیں چاہتی ڈاکٹر۔ میں خود کتنی دکھی ہوں تم نہیں جانتے۔ (خاموش ہوجاتی ہے۔ آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس جاتی ہے۔ کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہے پھر مڑ کر ثاقب سے) ہماری کہانی بڑی دکھ بھری ہے۔ میں اسکول میں پڑھتی تھی کہ میرے فادر مرگئے۔ میری ماں مجھے گرجا میں چھوڑ کر دوسری شادی کر کے کہیں چلی گئی۔ گرجا میں رہ کر میں نے نرسنگ میں ڈپلوما لیا۔ پھر جم سے ہماری شادی ہوئی وہ مکار اور خودغرض نکلا وہ مجھ سے پیسے لیتا۔ شراب پیتا اور جوا کھیلتا اور پھر ایک دن غائب ہوگیا۔ میں جانتی ہوں ڈاکٹر کہ دکھی انسان کتنا نروس ہوتا ہے۔

ثاقب : سچ مچ سسٹر تمھاری کہانی بہت دکھ بھری ہے۔

گلریز : میں نے دکھوں کو جھیلنے کا حوصلہ پیدا کرلیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر تم اتنے شریف ہو

کہ تمھارے دکھی ہونے سے مجھے سارا ماحول غمگین سا محسوس ہوتا ہے۔

ثاقب : تم کس قدر اچھی ہو سسٹر۔ ماں سے بھی اچھی۔ شائستہ سے بھی اچھی۔

گلریز : شائستہ ایک دم بور ہے۔ میں نے اس کو سمجھایا۔ خوشامد کی مگر اس نے میری بات نہیں مانی۔ مجھے بہت ڈس اپائنٹ کیا۔ میں اس سے ناراض ہوگئی۔

ثاقب : اسے گولی مارو سسٹر۔

گلریز : میں اسے ایسا سبق سکھاؤں گی کہ وہ تمام زندگی یاد رکھے گی۔ (ثاقب خاموش رہتا ہے) میں نے اسے سمجھایا کہ وہ تمھیں معاف کردے۔ مگر اس نے سنا ہی نہیں بلکہ میری انسلٹ تک کی۔ مجھے بہت دکھ ہوا۔ تم ایسی مغرور لڑکی کو کیوں چاہتے ہو۔

ثاقب : چاہتا تھا مگر اب نہیں۔ میں اس کا ذکر بھی سننا نہیں چاہتا۔

گلریز : مگر آپ دکھی نہ رہا کریں۔ آپ کے دکھی ہونے سے میں دکھی ہوجاتی ہوں۔ مریض دکھی ہوجاتے ہیں۔ اب تو آپ دکھی نہیں رہیں گی۔

ثاقب : نہیں۔ آپ نے میرے لیے جو قیمتی آنسو بہائے ہیں اب انھیں نہیں بہنے دوں گا۔

(پردہ)

تیسرا ایکٹ

پہلا سین

منظر

(پہلے ایکٹ کا ڈاکٹر ثاقب کے مکان کا کمرہ۔ ثاقب ایک صوفے پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہے۔ بیگم تخت پر بیٹھی چھالیا کاٹ رہی ہیں۔ بیگم کبھی کبھی نظریں اٹھا کر ثاقب کو دیکھ لیتی ہیں۔ کچھ دیر بعد)۔

بیگم : نصرت کئی دن سے نہیں آیا۔ کیا بات ہے۔

ثاقب: (اسی طرح اخبار پر نظریں جمائے ہوئے) وہ مجھ سے ناراض ہوگیا ہے اور مجھ

سے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے۔

بیگم : (چھالیا کی ٹوکری سامنے سے ہٹاتے ہوئے) ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے۔

ثاقب : ہاں۔ آپ یہی چاہتی تھیں اور وہ ہوگیا۔

بیگم : کل اس کی ماں آئی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ کوئی نرس تجھ سے بہت بے تکلف ہوگئی ہے۔

ثاقب : (اخبار ایک طرف ڈال کر) ہاں۔ اس لیے کہ اس نے میرے دکھوں پر آنسو بہائے ہیں۔ قیمتی آنسو۔

بیگم : (تخت سے اترتے ہوئے) مگر میں اس آوارگی کو پسند نہیں کرتی۔

ثاقب : آپ کو تو یہی پسند نہیں کہ میں زندہ رہوں۔

بیگم : (غصہ سے) کیا بکتا ہے (ثاقب کے قریب آتے ہوئے) میں نے اپنے خون کے قطرے قطرے سے تیری زندگی کو اسی دن کے لیے سینچا تھا کہ ایک دن تو اس طرح میری محبت پر شک کرے۔

ثاقب : (کھڑے ہوکر) مگر آپ کی وہ کون سی محبت ہے جس نے مجھے مردوں سے بدتر بنا دیا ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ میرا کوئی دوست نہیں۔ میں کسی سے پیار نہیں کرسکتا۔ میں کسی کو چاہ نہیں سکتا۔ (سنگھار میز کی طرف جاتا ہے۔ پھر ایک دم مڑکر) لوگ مجھے بداخلاق اور بددیانت سمجھتے ہیں۔ میرے مریض میری صورت سے گھبراتے ہیں۔ (ہر لفظ پر زور دیتے ہوئے) میں ایک ناکام ڈاکٹر ہوں۔ ناکام انسان ہوں۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آنے لگی ہے۔

بیگم : آج زبان بہت تیز چلنے لگی ہے۔

ثاقب : میری زندگی میں جو گھٹن ہے اگر اس کا علاج زبان چلنے سے ہوجائے تو سودا کچھ مہنگا نہیں ہوگا۔

بیگم : میں نے تیرے لیے کیا نہیں کیا۔ زمانے کے گرم و سرد سے تجھے بچانے کے لیے اپنا سب کچھ تجھ پر قربان کردیا۔ کیا اس لیے کہ ایک دن مجھے تیرے طعنے

سنا پڑیں گے۔

ثاقب : میں بچپن ہی میں مرجاتا تو اچھا تھا۔ (مڑ کر سنگھار میز کے آئینہ میں اپنی شکل دیکھتے ہوئے) آج لوگ میرے باپ کی اس طرح تو تلاش نہ کرتے جیسے کسی چور یا ڈاکو کی تلاش کی جاتی ہے (مڑ کر بیگم کو دیکھ کر) میں لوگوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوں۔ لوگ مجھ پر اس طرح نظریں ڈالتے ہیں جیسے میں سماج کا وہ ناسور ہوں جس سے پورا سماج گندہ ہو رہا ہے (بیگم کے پاس آکر) آخر آپ بتلاتی کیوں نہیں کہ میرا باپ کون تھا۔

بیگم : (غصہ سے) میں ہزار بار کہہ چکی ہوں کہ وہ ایک شریف خاندان کا فرد تھا تیری اس سے تسکین نہیں ہوتی۔

ثاقب : میری تسلی سے سماج کی تسکین نہیں ہوجاتی (ٹھنڈی سانس بھر کر) وہ ضرور کوئی بہت بڑا پاپی تھا۔

بیگم : (غصہ سے چیخ کر) خاموش رہ۔ تجھے اپنے باپ کے متعلق ایسی باتیں کرتے شرم نہیں آتی۔

ثاقب : سماج کی طعن آمیز نگاہوں نے مجھے اس قدر بے شرم بنا دیا ہے کہ اب میں شرم کو محض بکواس سمجھتا ہوں۔ اگر میرا باپ سماج کا یک باعزت انسان تھا تو آپ نے اسے چھپا کیوں رکھا ہے۔

بیگم : تیرے باپ کو مرے ہوئے بیس سال ہو چکے ہیں۔ اور—

ثاقب : (لقمہ دے کر) وہ بیس سال سے معما بنا ہوا ہے۔ آپ معما بنی ہوئی ہیں۔ ٹھنڈی سانس بھر کر) یہ معمے میری جان لے کر رہیں گے۔

بیگم : تو کہیں پاگل تو نہیں ہوگیا ہے۔

ثاقب : یوں ہی سمجھ لو۔ مگر آج میں نے طے کرلیا ہے کہ اپنے باپ کے متعلق سب کچھ معلوم کرکے رہوں گا۔

بیگم : (غصہ سے) میں تجھے سب کچھ بتلا چکی ہوں۔

ثاقب : آپ نے کچھ نہیں بتلایا۔ (جوش سے) میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کون تھا۔ کیسا تھا۔ کیا تھا۔ اگر آج آپ نے نہیں بتلایا تو ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا اور آپ میری پھر صورت بھی نہ دیکھ سکیں گی۔

بیگم : (آنکھوں میں آنسو بھر کر) ہاں میں نے تجھے اسی لیے پالا پوسا ہے کہ ایک دن تو مجھے چھوڑ کر چلا جائے۔

ثاقب : (طنزیہ لہجے میں) نہیں آپ نے اس لیے پالا پوسا تھا کہ ایک دن میں گھٹ گھٹ کر مرجاؤں (چند سکنڈ رک کر) آخر آپ نے میرے باپ کو میرے لیے راز کیوں بنا رکھا ہے۔

بیگم : میں نے کوئی راز نہیں بنا رکھا ہے۔ تجھے سب کچھ بتلا چکی ہوں۔

ثاقب : وہ کس کی تصویر ہے جو آپ نے چھپا دی ہے۔

بیگم : وہ تیرے باپ کی تصویر تھی۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ ہٹا دی۔

ثاقب : بیس سال تک اس کی ضرورت تھی۔ اب کیوں نہیں رہی۔

بیگم : اب تو مجھ سے بحث نہ کرو۔

ثاقب : (غصہ سے) بحث کیوں نہ کروں۔ آپ نے مجھے ہمیشہ دبایا میں دبتا چلا گیا۔ تم نے میری محبت چھین لی۔ میں خاموش ہو گیا۔ تم نے میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ میں نے اس کو بھی برداشت کرلیا۔ (بیگم کے پاس آکر) آج میں دنیا کی نظروں میں گر گیا ہوں۔ میں اسے برداشت نہیں کرسکتا۔ (اونچی آواز سے) جب میرا باپ چور نہیں تھا، ڈاکو نہیں تھا قاتل نہیں تھا پھر اسے اس طرح راز بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ (بیگم خاموش رہتی ہے اور آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) میں نے آپ کے ان آنسوؤں کی بہت قدر کی ہے۔ مگر آج فیصلہ کرلیا ہے کہ یا تو یہ راز معلوم کر کے رہوں گا یا پھر اس گھر سے ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا۔

بیگم : اگر تو نے یہ فیصلہ کرلیا ہے تو چلا جا (آنسو پونچھتے ہوئے) جہاں بیس سال

دکھوں اور غموں میں گزارے ہیں وہاں جو باقی بچے ہیں وہ بھی گزار لوں گی۔

ثاقب : مگر اپنی ضد نہیں چھوڑو گی۔

(اسی وقت گلریز کمرے میں آتی ہے اور ثاقب کو دیکھ کر)

گلریز : ہلو ڈاکٹر۔ میں آپ کا انتظار کرتے کرتے اُکتا گئی۔ آپ بھول گئے کہ آج اتوار ہے اور ہم کو پکنک پر جانا تھا۔ آپ کو فرصت ہے۔

ثاقب : (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہاں سسٹر اب فرصت ہی فرصت ہے۔

گلریز : (بیگم کی طرف دیکھ کر) یہ آپ کی مدر ہیں نا۔

ثاقب : ہاں یہ میری امی ہیں۔

گلریز : آپ اپنی ممی سے ہمارا انٹروڈکشن نہیں کرائیں گے؟

ثاقب : ضرور کراؤں گا۔ (بیگم کی طرف دیکھ کر) امی۔ یہ سسٹر گلریز ہیں۔ مجھ پر بہت مہربان ہیں۔ میرے دکھوں سے دکھی رہتی ہیں۔

بیگم : (گلریز کو سر سے پیر تک دیکھ کر) یہی وہ نرس ہے جس کے بارے میں نصرت کی ماں نے کہا تھا۔

ثاقب : ہاں وہی ہیں۔

گلریز : ڈاکٹر نصرت کی ماں بہت اچھی ہیں۔ میری بہت عزت کرتی ہیں۔ ڈاکٹر نصرت کی بہن ہماری دوست بن گئی ہے۔ مجھے اپنی برتھ ڈے پر انوائٹ کیا تھا۔

بیگم : (نفرت آمیز لہجے میں) مگر اس گھر میں کوئی لڑکی نہیں ہے جو تمھاری دوست بن سکے۔

گلریز : ڈاکٹر ثاقب میرے دوست ہیں۔ میں ان سے ملنے آئی تھی۔

بیگم : تمھیں شرم نہیں آتی جو مردوں سے ملتی جلتی پھرتی ہو۔

گلریز : مرد ہمیں کھا تو نہیں جائیں گے اور پھر ڈاکٹر ثاقب جیسا بھلا آدمی آج تک نہیں دیکھا۔

بیگم : مگر تم خدا کے لیے اس کا پیچھا چھوڑ دو۔

گلریز : آپ کیا کہتی ہیں میں ان کے ساتھ کام کرتی ہوں۔ ان کا ساتھ۔

بیگم : (بات کاٹ کر) تم کسی اور ڈاکٹر کے ساتھ کام کرو۔ نصرت کے ساتھ کام کرو۔

گلریز : میں اور ڈاکٹر ثاقب سرجیکل میں کام کرتے ہیں اور وہ میڈیکل میں۔ میں ان کے ساتھ کیسے کام کرسکتی ہوں۔ ہوشیار اور ہمدرد ڈاکٹر کے ساتھ کام کرنے میں خوشی ہوتی ہے اور پھر ڈاکٹر ثاقب مجھے فرینڈ کی طرح ٹریٹ کرتا ہے۔ میں انہیں بہت پسند کرتی ہوں (ثاقب کی طرف دیکھ کر) کیوں ڈاکٹر آپ بھی مجھے پسند کرتے ہیں یا نہیں۔

ثاقب : میں تم کو بہت پسند کرتا ہوں سسٹر۔

گلریز : (مسکرا کر) شائستہ سے بھی زیادہ۔

ثاقب : ہاں (ٹھنڈی سانس بھر کر) اس سے بھی زیادہ۔

گلریز : وہ ایک دم بور لڑکی ہے۔ اونچا دماغ اور مغرور۔ میں نے اس کی بیماری میں کتنی خدمت کی۔ مگر اس نے کبھی سیدھے منہ بات نہیں کی۔ ہمارا احسان تک نہ مانا۔

ثاقب : ایسا ہی ہوتا ہے سسٹر۔ زمانے نے انسان کو بہت خودغرض بنا دیا ہے۔

گلریز : زمانہ بہت مکار ہے ڈاکٹر۔ جس سے ہم پیار کرتے ہیں وہ ہمیں دھوکا دیتا ہے۔ آپ مجھے دھوکا تو نہیں دو گے۔

ثاقب : نہیں سسٹر کبھی نہیں۔ تم نے میرے دکھوں پر جو آنسو بہائے تھے وہ کس قدر سچے اور قیمتی تھے اب میں ان کو نہیں بہنے دوں گا۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) میں زندگی بھر خود غرضی اور مکاری کے آنسو دیکھتا رہا ہوں۔ (بیگم مسرت سے ثاقب کو دیکھتی ہے اور اپنے آنسو پونچھتی ہے)

گلریز : کیا پکنک پر چلنے کا ارادہ نہیں ہے۔

ثاقب : کیوں نہیں۔ ضرور چلیں گے۔

بیگم : نہیں۔ تو نہیں جائے گا۔

ثاقب : کیوں نہیں جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا۔ آپ نے جو بیڑیاں میرے پیروں میں

ڈال رکھی تھیں اب میں نے انھیں توڑ ڈالا ہے۔

بیگم : تو اپنی ماں کی بات نہیں مانے گا۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) یاد رکھ زندگی بھر پچھتائے گا۔

ثاقب : (بے مروّتی کے انداز میں) اگر زندگی میں پچھتانا لکھا ہے تو پچھتا بھی لوں گا۔ آج تک زندگی میں کون سے سکھ دیکھے ہیں جو آئندہ کی امید رکھوں (گلریز کی طرف دیکھ کر) آؤ سسٹر چلو۔

بیگم : (دیکھ میں کہتی ہوں نہ جا۔ (شکست خوردہ لہجے میں) اپنی ماں کی بددعا نہ لے۔

ثاقب : کوئی ایسی بددعا دینا امی کہ زندگی ایک ہی دن میں ختم ہو جائے اور یہ مستقل پھانسی کا پھندہ گلے سے نکل جائے۔

گلریز : (بیگم کی طرف دیکھ کر) آپ کیسی ماں ہیں کہ اپنے بچے کے لیے بددعا کی بات کرتی ہیں (ثاقب کی طرف دیکھ کر) ڈاکٹر تمھیں ایسی منحوس بات اپنے لیے نہیں نکالنا چاہیے۔

بیگم : (غصہ سے) تو چپ رہ منحوس۔

ثاقب : (بلند آواز سے) امی۔

گلریز : یہ مجھ سے لڑتی ہیں۔ میں نے تو ان کا برا نہیں چاہا۔ (ثاقب کا ہاتھ پکڑ کر) آیئے ڈاکٹر چلیں۔ اب میں اس گھر میں کبھی نہیں آؤں گی۔ آپ کی مدر ہم سے لڑتی ہیں۔

ثاقب : بکواس کرتی ہیں۔ آؤ۔ چلو۔

(گلریز کے ساتھ دروازے کی طرف جاتا ہے۔ بیگم بلند آواز سے)

دیکھ ثاقب نہ جا۔ (ثاقب دروازے کی طرف جاتا ہے۔ بیگم بلند آواز سے)

بیگم : ثاقب کوئی جواب نہیں دیتا۔ بیگم چیخ کر) ثاقب (ثاقب کمرے سے نکل جاتا ہے۔ بیگم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے اور ایک صوفے پر گر جاتی ہے۔

(پردہ)

دوسرا سین

منظر : ڈاکٹر ثاقب کے مکان کا وہی کمرہ۔ بیگم تخت پر بیٹھی ہیں ان کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پریشان اور بیمار ہیں۔ نصرت کمرے میں آتا ہے۔ بیگم اسے دیکھ کر۔

بیگم : نصرت بیٹا۔ میں صبح سے تجھے کتنی بار فون کر چکی ہوں مگر۔

نصرت : میں اسپتال میں نہیں تھا امی۔ ابھی آپ کا فون ملا۔

بیگم : کچھ ثاقب کا بھی پتا ہے بیٹا (آنکھوں میں آنسو بھر کر) وہ آٹھ دن سے نہیں آیا۔نصرت: وہ نوکری پر بھی نہیں آرہا ہے۔کوارٹر میں پڑا رہتا ہے۔

بیگم : اسے سمجھا بیٹا۔ (آنسو پونچھ کر) نہیں تو میں اپنی جان دے دوں گی۔

نصرت : اس نے مجھ سے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے امی۔ اب مجھ سے بات تک نہیں کرتا۔

بیگم : میں نے دو تین بار بشیر کو بھیجا مگر اس نے اس سے بات تک نہیں کی۔ ڈانٹ کر بھگا دیا۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) جانے اس کم بخت نرس نے اس پر کون سا جادو کر دیا ہے۔

نصرت : وہ دن رات اسی کے ساتھ رہتا ہے۔ اسپتال میں ان کے متعلق بڑے غلط چرچے ہورہے ہیں (کچھ سوچتے ہوئے) آپ اسپتال میں اس سے جا کر ملیے۔

بیگم : میں نے بیس سال سے اس گھر سے قدم نہیں نکالا۔ اب کیسے نکل پڑوں۔

نصرت : آپ بھی کہاں کے وہموں میں مبتلا ہیں (کچھ سوچ کر) اچھا۔ میں خاں صاحب کو بلاتا ہوں۔ شاید وہ کوئی راہ نکال سکیں۔

بیگم : مگر نصرت بیٹا۔ ان کا یہاں آنا۔

نصرت : بات کٹ کر) بس امی۔ اب ہمیں کوئی راستہ تلاش کرنے دیجیے (فون اٹھا کر نمبر ڈائل کر کے) ہلو۔ ڈاکٹر نصرت۔ شائستہ بیگم—— آپ کا مزاج کیسا ہے۔ خدا کا شکر ہے۔ خاں صاحب سے عرض کر دیجیے۔ اچھا اچھا۔ فون انھیں

دیجیے۔ ہلو— آداب عرض ہے۔ میں ثاقب کے گھر سے بول رہا ہوں۔ آپ سے ایک ضروری کام ہے۔ کیا آپ تھوڑی دیر کے لیے تکلیف فرما سکتے ہیں— بہت اچھا۔ شکریہ۔ میں انتظار کر رہا ہوں (ریسور رکھ کر بیگم کے پاس آکر) خاں صاحب آرہے ہیں۔

بیگم : (سوچتے ہوئے) جانے کیوں مجھے ان سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔

نصرت : (مشکوک نظروں سے بیگم کو دیکھ کر) کیوں؟ خاں صاحب بے حد ہمدرد انسان ہیں۔

م : میں کہہ نہیں سکتی کہ مجھے ان سے کیوں ڈر معلوم ہوتا ہے۔

نصرت : (مسکرا کر) وکیل کو تو سب کچھ بتلا دینا چاہیے کہ وہ اچھی پیروی کر سکے۔

بیگم : میں کیا بتلادوں جب کہ بتلانے کو کچھ ہے ہی نہیں۔

نصرت : مگر آپ کچھ چھپا کر حالات کو بگاڑ ضرور رہی ہیں جب تک صحیح حالات کا علم نہ ہو بگاڑ کا سدھار ممکن نہیں۔

بیگم : مگر میں کن حالات پر روشنی ڈالوں۔

نصرت : اس تصویر کے راز پر جو آپ نے چھپا دی ہے۔

بیگم : وہ ثاقب کے باپ کی تصویر تھی۔ بار بار اس پر نظر پڑتی تھی تو زخم ہرے ہوجاتے تھے اس لیے ہٹا دی۔

نصرت : لیکن آپ نے وہ تصویر خاں صاحب سے کیوں چھپائی۔

بیگم : عزیز الحسن صاحب سے؟

نصرت : جی ہاں۔ ثاقب کہتا ہے کہ جب خاں صاحب آئے تھے تو آپ نے اس تصویر کو الٹ دیا تھا۔ (بیگم خاموش رہتی ہیں۔ نصرت خاموش رہ کر) وہ یہی جاننا چاہتا ہے جو آپ بتلانا نہیں چاہتیں۔

بیگم : اگر وہ یہ معلوم بھی کرے گا تو اسے کیا ملے گا۔ اسے میری باتوں پر اعتبار نہیں۔

نصرت : اس نے جس طرح آپ کی فرماں برداری کی ہے ویسی کوئی دوسرا نوجوان

نہیں کرسکتا۔ اگر کوئی راز ہے تو اسے بتلا دینے میں کیا حرج ہے۔

بیگم : اگر وہ اسے راز سمجھتا ہے تو اسے میری خاطر راز ہی رہنے دے (نصرت خاموش رہتا ہے پھر جیب میں سے سگریٹ نکالتا ہے مگر بیگم کی طرف دیکھ کر اسے جیب میں رکھ لیتا ہے) پی لو بیٹا پی لو۔ تم تو عادی ہو۔

نصرت : (دوبارہ سگریٹ نہیں نکالتا۔ بیگم کا چہرہ دیکھتے ہوئے) اگر آپ برا نہ مانیں تو کچھ عرض کروں (بیگم سوالیہ نظروں سے نصرت کو دیکھتی ہے) ثاقب کو یہ شک ہوگیا ہے کہ آپ اس کی اصل ماں نہیں ہیں۔

وبیگم : (حیرت زدہ نظروں سے نصرت کو دیکھنے لگتی ہے۔ آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) اب میں اس کی ماں بھی نہیں رہی (پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے کچھ دیر بعد خود پر قابو پاکر) کیا میں نے اسے اسی دن کے لیے پالا پوسا تھا کہ ایک دن وہ مجھے اپنی ماں کہنے سے بھی انکار کردے۔

(دروازے پر دستک۔ نصرت باہر جاتا ہے۔ پھر دروازے میں آکر)

نصرت : امی خاں صاحب آئے ہیں۔

بیگم : (جلدی سے آنسو پونچھ کر) اندر بلا لو (دوپٹہ سر پر برابر کرتی ہے اور تخت سے اتر آتی ہیں (عزیز الحسن کمرے میں آتے ہیں اور بیگم کو سلام کرتے ہیں۔ بیگم سلام کا جواب دے کر صوفے کی طرف اشارہ کرکے) تشریف رکھیے۔

عزیزالحسن : (بیگم کا چہرہ دیکھ کر) آپ کچھ بیمار ہیں۔

بیگم : جی نہیں بھلی چنگی ہوں۔

عزیزالحسن : مگر آپ کے چہرے سے تو معلوم ہورہا ہے کہ آپ عرصہ کی بیمار ہیں۔

نصرت : ثاقب ایک ہفتہ سے گھر نہیں آیا اس لیے پریشان ہیں۔

عزیزالحسن : (نصرت کی طرف دیکھ کر) سنا ہے وہ گلریز کے چکر میں پھنس گیا ہے۔

نصرت : اجی ہاں۔ اب وہ دن رات اسی کے ساتھ رہتی ہے۔

عزیزالحسن : مگر تم نے تو مجھ سے کہا تھا کہ وہ خراب عورت نہیں ہے۔

نصرت : بظاہر وہ بہت نیک عورت ہے۔ یہ کیا معلوم تھا کہ اس کے پیٹ میں اتنی بڑی داڑھی ہے (بیگم دروازے کی طرف جاتی ہے) آپ کہاں جارہی ہیں۔

بیگم : ابھی آتی ہوں۔

عزیزالحسن : آپ اس وقت کوئی تکلیف نہ کیجیے گا۔ (بیگم کوئی جواب نہیں دیتی اور دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے) ان کی حالت تو بہت خراب ہوگئی ہے۔

نصرت : بہت پریشان ہیں۔ نوکر نے بتلایا تین دن سے کچھ کھایا پیا نہیں۔

عزیزالحسن : (سوچتے ہوئے) لیکن ڈاکٹر ثاقب کو کیا ہوگیا۔ اس کی شرافت اور فرماں برداری کی تو لوگ مثالیں دیا کرتے تھے۔

نصرت : جس دن سے آپ نے اس کے باپ کے بارے میں کہا کہ اگر وہ کوئی چور ڈاکو یا قاتل نہیں تھا تو پھر اسے راز کیوں بنایا جارہا ہے۔ بس اسی دن سے وہ ڈسٹرب ہے۔

عزیزالحسن : (سوچتے ہوئے کمرے میں ٹہلنے لگتے ہیں، پھر نصرت کے پاس رک کر) مسٹر نجم الدین کسی مبہم تصویر سے خوف زدہ ہیں۔ ان کا بیس سال سے گھر سے نہ نکلنا، تصویر کو چھپا دینا۔ نجم الدین کے بارے میں کچھ نہ بتلانا اور ڈاکٹر ثاقب کی اس قدر سخت اور کڑی نگرانی کرنا۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ چھپا رہی ہیں۔

نصرت : اگر ایسا ہے تو—

عزیزالحسن : ایسا ضرور ہے (سوچتے ہوئے) اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ سب کچھ ثاقب کی محبت میں کیا جارہا ہے۔

نصرت : ثاقب کی محبت میں!

عزیزالحسن : ہاں۔ انھیں شاید خوف ہے کہ کسی ناخوشگوار واقعہ کا اثر اس کی زندگی پر نہ پڑے۔ (بیگم چائے لے کر آتی ہیں۔ عزیزالحسن انھیں دیکھ کر) ارے آپ نے یہ تکلیف کیوں کی۔

بیگم : (کشتی میز پر رکھتے ہوئے) اس میں تکلیف کی کون سی بات ہے۔

عزیزالحسن : آپ ویسے ہی پریشان ہیں۔

بیگم : زندگی اور پریشانیوں کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔

عزیزالحسن : (کچھ دیر خاموش رہ کر) بعض پریشانیاں انسان کی خودساختہ ہوتی ہیں اگر وہ چاہے تو—

بیگم : (بات کاٹ کر) بعض پریشانیاں انسان کو جان سے عزیز ہوتی ہیں— (بیگم دونوں کو چائے دیتی ہے۔عزیزالحسن پیالی لیتے ہوئے)

عزیزالحسن : لیکن مجبوریوں سے ایسی محبت بھی کیا کہ جس کا اثر زندگیوں کے بننے اور بگڑنے پر پڑے۔

بیگم : انسان کی کوشش ہمیشہ زندگی سنوارنے کی ہوتی ہے۔

عزیزالحسن : اس میں انسان غلطی بھی کرسکتا ہے۔

بیگم : لیکن دوسرے کی غلطی بھی تو زندگی بگاڑ سکتی ہے۔

عزیزالحسن : لیکن انسان اسے محسوس کر کے سدھار بھی لیتا ہے۔

بیگم : بعض غلطیاں ایسی ہوتی ہیں جنھیں سدھارا نہیں جاسکتا۔

عزیزالحسن : (چائے کا گھونٹ لے کر) کوئی غلطی ایسی نہیں جو سدھاری نہ جاسکے (بیگم کا چہرہ غور سے دیکھ کر) ثاقب جیسا آپ کا بچہ ہے ویسا ہی میرا سمجھ لیجیے۔ جتنا آپ کو عزیز ہے اتنا ہی مجھ کو۔ وہ ایک ہونہار نوجوان اور ایک اچھا ڈاکٹر ہے۔اس کو بگڑتا ہوا دیکھ کر مجھے بھی اتنا ہی دکھ ہے جتنا آپ کو (پھر بیگم کو غور سے دیکھتے ہوئے) کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ جو کچھ چھپا رہی ہیں صرف مجھے بتلادیں۔ ممکن ہے میں سدھار کی کوئی تدبیر کرسکوں۔ (بیگم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔عزیزالحسن اور نصرت خاموشی سے انھیں دیکھتے رہتے ہیں۔ کچھ دیر بعد خود پر قابو پا کر)

بیگم : کوئی راز نہیں ہے خاں صاحب کوئی راز نہیں ہے۔ خدا کے لیے مجھ سے کچھ

نہ پوچھیے۔ مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔

عزیز الحسن : مجھے وہ تصویر ہی بتلا دیجیے جو آپ نے چھپا دی ہے۔

بیگم : وہ تصویر میں نے ضائع کر دی ہے۔

عزیزالحسن : (پیالی میز پر رکھ کر) یہ ممکن نہیں ہے۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) آپ نے طے کرلیا ہے کہ ثاقب کی زندگی تباہ کر دیں۔ وہ تمام زندگی سوچتا رہے کہ اس کا باپ کون تھا، کیا تھا، کیسا تھا، اس نے ایسا کون سا گناہ کیا تھا کہ اس کی ماں نے اس کے باپ کے بارے میں کچھ نہیں بتلایا۔ (بیگم ایک صوفے پر نڈھال ہوکر بیٹھ جاتی ہے۔عزیزالحسن اس کے پاس جاکر) وہ ایک اچھا بلکہ بہت اچھا ڈاکٹر ہے مگر آج کل وہ اس قدر بداخلاق ہوگیا ہے کہ مریض اس سے دور بھاگنے لگے ہیں۔ وہ ایک شریف نوجوان تھا مگر آج لوگ اس پر انگلیاں اٹھانے لگتے ہیں کہ وہ ایک معمولی نرس کے چکر میں پھنس گیا ہے (بیگم چہرے پر ہاتھ رکھ کر رونے لگتی ہے) مسز نجم الدین آنسو مسائل کا حل نہیں ہوتے۔ آپ چاہتی ہیں کہ وہ ایک باعزت زندگی گزارے مگر آپ ایسے حالات پیدا کر رہی ہیں کہ وہ کیچڑ اور دلدل میں دھنستا چلا جارہا ہے۔ اس کی تباہی کی ذمے دار آپ ہیں تنہا آپ۔ مسٹر نجم الدین کیا کرتے تھے۔

بیگم : (غیرارادی طور پر) بینک میں منیجر تھے۔

عزیزالحسن : بینک میں منیجر (سوچنے لگتے ہیں۔ بیگم اپنی غلطی کا احساس کر کے اور زور زور سے رونے لگتی ہیں۔ کچھ دیر بعد) کس بینک میں (بیگم کوئی جواب نہیں دیتیں۔ روتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔(عزیزالحسن سوچتے ہوئے) بیس سال پہلے بینک میں منیجر۔ (نصرت کی طرف دیکھ کر) آؤ ڈاکٹر چلیں۔ (دروازے کی طرف بڑھتے ہیں)

(پردہ)

تیسرا سین

منظر : (بیگم آنکھیں بند کیے ایک صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی ہیں کہ کچھ دیر بعد نصرت کمرے میں آتا ہے۔ بیگم آنکھیں کھول کر اسے دیکھ کر)۔

بیگم : کیوں بیٹا ثاقب نہیں آیا۔

نصرت : (ٹھنڈی سانس لے کر) ہاں امی۔نہیں آیا۔

بیگم : (آنکھوں میں آنسو بھر کے) اسے اپنی ماں بھی یاد نہیں آتی۔

نصرت : وہ بیمار ہے امی۔

بیگم : بیمار۔

نصرت : جی ہاں دن رات کوارٹر میں پڑا رہتا ہے۔ نہ اسے اپنی پروا ہے نہ نوکری کی اور نہ مریضوں کی۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر بیگم کے پاس آتے ہوئے) امی! آپ چل کر اسے دیکھ لیجیے نا۔

بیگم : میں اس گھر کو نہیں چھوڑ سکتی۔

نصرت : اور میں نے طے کرلیا ہے کہ آپ کو لے کر جاؤں گا۔ میں نے اسے دوا پلانے کی کوشش کی مگر اس نے پینے سے انکار کردیا۔ آپ سے انکار نہیں کرے گا۔

بیگم : میری کہاں سن لے گا (ٹھنڈی سانس بھر کر کھڑے ہوتے ہوئے) ایسا ہی سننے والا ہوتا تو گھر چھوڑ کر کیوں جاتا۔

نصرت : لیکن آپ کو وہاں چلنے میں کیا اعتراض ہے۔

بیگم : اس گھر سے باہر قدم نہ رکھنے کی میں نے قسم کھائی ہے (نصرت کو دیکھ کر) اپنی یہ قسم کیسے توڑ دوں۔

نصرت : (صوفے کے پیچھے سے بیگم کے قریب آتے ہوئے) آپ نے ایسے ہی فضول خیالات کے باعث یہ حالات پیدا کرلیے ہیں جو اب قابو سے باہر

ہوتے جا رہے ہیں (بیگم کے پاس پہنچ کر کچھ اس انداز سے جیسے خود سے کہہ رہا ہو) ایک مسئلہ ابھی سلجھا نہیں ہے کہ گلریز کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔

بیگم : وہ ابھی تک اس کے ساتھ ہے۔

نصرت : (طنزیہ مسکرا کر) آپ سمجھتی ہیں کہ وہ اس قدر آسانی سے اسے چھوڑ دے گی (بیگم اس طرح تخت پر بیٹھ جاتی ہیں جیسے سب کچھ ہار چکی ہوں) آپ نے شائستہ جیسی لڑکی کو نظر انداز کر دیا۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) اور اب آپ گلریز کو قبول کرنے کو تیار ہیں۔

بیگم : میں کیوں قبول کرنے لگی۔ کیا میں نے اس سے کہا ہے کہ وہ گلریز کے چکر میں پھنس جائے۔

نصرت : آپ نے نہیں کہا مگر حالات ضرور ایسے پیدا کر دیے۔ امی! اگر وہ اس کے چکر میں پھنسا رہا تو اس کا سارا کیریئر تباہ ہو کر رہ جائے گا۔

بیگم : (خوشامدانہ لہجے میں)۔ نصرت بیٹا خدا کے لیے کسی طرح اس کم بخت نرس کو اس کے راستے سے ہٹانے کی کوشش کر۔

نصرت : (ٹھنڈی سانس بھر کر) وہ میری بات سنتا بھی ہو۔ اسے تو جیسے میری صورت سے نفرت ہو گئی ہے۔ کل ہی وہ مجھے برا بھلا کہنے تک سے نہیں چوکا۔

بیگم : وہ تیرے بچپن کا دوست ہے اس کی بات کا برا نہ ماننا بیٹا۔

نصرت : یہی سوچ کر خاموش ہو جاتا ہوں۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد سوچتے ہوئے) آپ کو اس گھر سے اب نکلنا ہی ہوگا۔ آپ —— (کال بیل بجتی ہے۔ نصرت خاموش ہو کر دروازے کے پاس جا کر پردہ ہٹا کر باہر دیکھتا ہے۔ پھر مڑ کر بیگم کو دیکھ کر) خاں صاحب تشریف لائے ہیں۔

بیگم : اندر بلا لو نا۔

(سر پر دوپٹہ برابر کرتی ہے۔ نصرت باہر دیکھ کر)

نصرت : (پردہ ہٹا کر) تشریف لائیے۔ (عزیز الحسن کمرے میں آتے ہیں۔ نصرت صوفے

کی طرف اشارہ کرکے) تشریف رکھیے۔ اب شائستہ بیگم کا مزاج کیسا ہے۔

عزیزالحسن : اب تو کسی قدر بہتر ہے۔

نصرت : کل میں نے آپ کے گھر پر حاضری دی تھی آپ سے ملاقات نہ ہوسکی۔

عزیزالحسن : ہم لوگ ایک تقریب میں چلے گئے تھے۔ نوکر نے تمھارے بارے میں کہا تھا اور میں نے تمھیں فون کیا تھا۔ تم گھر پر نہیں تھے۔

نصرت : کوئی ضرور کام تھا۔

عزیزالحسن : نہیں ایسا کوئی ضروری کام نہیں تھا۔ ابھی بھی تمھیں فون کیا تھا معلوم ہوا کہ تم یہاں ہو تو یہاں چلا آیا (کچھ دیر خاموش رہ کر سوچتے ہوئے) میں ثاقب سے ملنا چاہتا ہوں۔ تم اس سے ملے۔

نصرت : جی ہاں۔ مگر اسے جانے کیا ہوگیا ہے (بیگم کی طرف اشارہ کرکے) اسی کے پاس آیا تھا کہ انھیں ساتھ لے کر جاؤں۔ شاید اس پر اثر ہو مگر اسی جانے کے لیے تیار نہیں۔

عزیزالحسن : (بیگم کی طرف دیکھ کر) آپ کو جانے میں کیا اعتراض ہے۔

بیگم : بیس سال پہلے جو قسم کھائی تھی—

عزیزالحسن : (بات کاٹ کر) وہ قسم نہیں تھی آپ کا وہم تھا۔ جب انسان روپے پیسے کا حساب کتاب رکھتا ہے تو اس سے بھول چوک بھی ہوتی ہے۔

بیگم : لیکن یہ بھول چوک نہیں تھی۔

عزیزالحسن : پھر اور کیا بات تھی۔

بیگم : انھوں نے غبن کیا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ انھوں نے روپیا جوئے میں اُڑا دیا تھا وہ گرفتار کیے گئے تھے۔

(عزیزالحسن مسکراتے ہیں۔ بیگم ایک دم گھبرا جاتی ہیں۔ انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوجاتا ہے۔ عزیزالحسن خاموش ہوکر اس طرح سوچنے لگتے ہیں جیسے کسی پرانے واقعے کو یاد کرنے کی کوشش کررہے ہوں۔ پھر ایک دم چونک کر

جیسے انھیں پورا واقعہ یاد آ گیا ہو)

عزیزالحسن : اچھا تو یہ وہ نجم الدین تھے (ہنستے ہیں) مسز نجم الدین یقین کیجیے آپ کے شوہر بے قصور تھے۔ غبن تو بینک کے کیشیر نے کیا تھا۔ میں ہی اس کیس کا انکوائری آفیسر تھا۔

بیگم : (تخت سے اتر کر) مگر وہ جیل گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

عزیزالحسن : (ہنس کر) نہ وہ جیل گئے تھے اور نہ ان کا جیل میں انتقال ہوا تھا۔ انھیں پوچھ تاچھ کے لیے تھانے بلایا گیا تھا کہ ان پر ہارٹ اٹیک ہوا۔ اسپتال پہنچائے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا تھا۔

بیگم : مگر لوگ تو کہتے تھے کہ —

عزیزالحسن : لوگوں کے کہنے سے کیا ہوتا ہے (ہنس کر) مسز نجم الدین اگر ذرا سا بھی یہ شبہ ہوتا کہ مسٹر نجم الدین کا اس غبن میں ذرا سا بھی ہاتھ ہے تو ہم پولیس والے آپ کی زندگی بھی اجیرن کر دیتے۔ آپ نے اس معمولی واقعے کا اتنا اثر لیا کہ اپنی زندگی ہی تباہ کر لی۔

بیگم : آپ اسے معمولی واقعہ کہتے ہیں۔

عزیزالحسن : بہت معمولی۔ میں نے تو قاتلوں کو یوں سینہ تان کر پھرتے دیکھا ہے جیسے قتل کر دینا کوئی جرم ہی نہ ہو۔

بیگم : مگر میں تو ہمیشہ یہ محسوس کرتی رہی کہ میں دنیا کی نظروں میں گر گئی ہوں۔

عزیزالحسن : آپ نے سماج میں آنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ایک بے بنیاد خوف سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ زندگی ہی تباہ کر لی۔ آپ تشریف رکھیے۔ بہت کمزور ہیں۔ (بیگم تخت پر بیٹھ کر خلا میں دیکھنے لگتی ہیں کہ گلریز کمرے میں آتی ہے۔ عزیزالحسن اور بیگم کے چہرے پر ناگواری کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ گلریز عزیزالحسن کو دیکھ کر)

گلریز : اوہ خاں صاحب آپ یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ (بیگم کے پاس جا کر)۔

ڈاکٹر ثاقب بیمار ہیں آپ دیکھنے تک نہیں آئیں۔

بیگم : (طنزیہ) جب تم دیکھ بھال کر رہی ہو تو میری کیا ضرورت ہے۔

گلریز : جب آپ نہیں آئیں گی تو مجھے دیکھ بھال کرنا ہی پڑے گا۔ وہ دن رات آپ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔

بیگم : جب میں اسے یاد آتی ہوں تو خود کیوں نہیں چلا آیا۔

گلریز : وہ آپ سے ناراض ہیں کہتے ہیں اب اس گھر میں کبھی نہیں آؤں گا۔

بیگم : (غصہ سے) اگر وہ مجھ سے ناراض ہے تو رہا کرے۔ اگر بیٹے کو ماں کی پروا نہیں تو ماں بیٹے کی کیوں پروا کرے۔

گلریز : اولاد تو ایسی ادائیں دکھلاتی ہی رہتی ہے مگر مائیں اسے بھول نہیں جاتیں۔ وہ آپ کو یاد کرتے ہیں۔ میں ان سے کہہ کر آئی ہوں کہ آپ کو ساتھ لے کر آؤں گی۔

بیگم : میں ہرگز نہیں جاؤں گی۔

گلریز : (عزیزالحسن کی طرف دیکھ کر) خاں صاحب انھیں سمجھایئے نا! یہ مانتی کیوں نہیں ہیں (نصرت سے) ڈاکٹر اور تم نے بھی کل سے ان کی خبر نہیں لی۔

نصرت : میں ابھی آؤں گا سسٹر۔

گلریز : وہ ہماری بات سنتے ہی نہیں ہم انھیں سمجھاتے ہیں تو وہ اُلٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں۔

نصرت : آپ چلیے سسٹر۔ میں ابھی آتا ہوں۔

گلریز : آپ جلدی آنا۔ ان کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ رات رات بھر جاگتی رہتی ہوں۔

نصرت : اچھا سسٹر۔ میں ابھی آتا ہوں۔

گلریز : میں چلتی ہوں۔ لیکن آپ جلدی آجانا۔

نصرت : اچھا سسٹر۔ گلریز چلی جاتی ہے۔ نصرت بیگم کی طرف دیکھ کر) امی آپ کا چلنا

اب بہت ضروری ہے۔

بیگم : نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔

عزیزالحسن : آپ بلاوجہ کی ضد کررہی ہیں۔ مجبوری میں سب کو اپنی قسم توڑنا پڑتی ہے (بیگم سوچنے لگتی ہیں۔ عزیزالحسن کچھ دیر خاموش رہ کر) آپ اور شام تک غور فرما لیجیے مگر میں سمجھتا ہوں آپ کو ایسے فضول تصورات چھوڑ دینا چاہئیں (نصرت کی طرف دیکھ کر) آیئے ڈاکٹر ہم چلیں۔ اگر اسے اس نرس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تو حالات اور بگڑ جائیں گے۔

(دونوں دروازے کی طرف جاتے ہیں۔ نصرت دروازے کے پاس پہنچ کر)

نصرت : امی۔ آپ تیار رہیے گا شام کو میں آپ کو لینے آؤں گا۔

(دونوں کمرے سے چلے جاتے ہیں۔ بیگم خاموش بیٹھی رہتی ہیں)

(پردہ)

چوتھا ایکٹ

پہلا سین

منظر

(اسپتال کا کوارٹر۔ ثاقب پلنگ پر کمبل اوڑھے بیٹھا ہے۔ گلریز ایک کرسی پر بیٹھی چائے بنارہی ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ پھر نظریں اٹھا کر ثاقب کو دیکھ کر)۔

گلریز : ڈاکٹر۔ میں آپ کی مدر کے پاس گئی تھی (ثاقب خاموش رہتا ہے) وہاں ڈاکٹر نصرت اور خاں صاحب بھی تھے (ثاقب اب بھی خاموش رہتا ہے) میں نے آپ کی مدر کو سمجھایا مگر وہ یہاں آنے پر راضی نہیں ہوئیں۔

ثاقب : وہ بہت ضدی ہیں۔ تمھیں ان کے پاس نہیں جانا چاہیے تھا۔

گلریز : (پیالی ہاتھ میں لے کر ثاقب کے پاس جاتے ہوئے) کیوں نہیں جانا چاہیے تھا۔ آپ انھیں کتنا یاد کرتے ہیں وہ آئیں گی تو آپ کو آرام ملے گا۔

ثاقب : (چائے کی پیالی لے کر) مجھے کون سی تکلیف ہے۔ تم میرا اس قدر خیال رکھتی ہو کہ میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔

گلریز : ماں پھر ماں ہوتی ہے۔ آپ کی طبیعت کو وہ بہتر سمجھتی ہیں۔ (سوچتے ہوئے) ڈاکٹر۔ آپ کچھ دن کے لیے اپنے گھر چلے جایئے۔

ثاقب : (غور سے گلریز کو دیکھ کر) تم بھی مجھے پسند نہیں کرتیں اور چھوڑ کر چلی جانا چاہتی ہو۔

گلریز : اوہ ڈاکٹر۔ آپ ہمیشہ الٹا ہی کیوں سوچتے ہیں۔

ثاقب : (اکتائے ہوئے لہجے میں) میں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ مجھے اپنے گھر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے مگر تم ہمیشہ میرے گھر کی بات کرتی رہتی ہو۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) وہ تو میں جانتا ہوں کہ ایک دن تم بھی مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی میں اس دنیا میں تنہا رہنے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔

گلریز : میں آپ کی بھلائی کے لیے کہتی ہوں۔ آج میں نے آپ کی مدر کی حالت دیکھی وہ برسوں کی مریض معلوم ہوتی ہیں آپ گھر جائیں گے تو انھیں خوشی ہوگی۔ آپ بھی سکھی ہو جائیں گے۔

ثاقب : (ذرا اونچی آواز سے) میں دکھی رہ کر مر جانا چاہتا ہوں مگر گھر جانا نہیں چاہتا۔ (غصہ سے) اگر تم بھی مجھے چھوڑ کر چلی جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ مجھے کسی کے چلے جانے سے اب دکھ نہیں ہوتا۔

گلریز : میں تمھیں چھوڑ کر چلے جانے کے لیے تمھارے پاس نہیں آئی ہوں۔ میں آپ کو سکھی دیکھنا چاہتی ہوں اور اس کے لیے اپنی جان بھی دے سکتی ہوں۔

ثاقب : (پیالی گلریز کی طرف بڑھاتے ہوئے) زندگی میں ایسے بہت سے دھوکے کھائے ہیں۔ تم بھی دھوکا دے لو تاکہ تباہی میں کوئی کسر باقی نہ رہے۔

گلریز : (ثاقب کے ہاتھ سے پیالی لے کر) آپ عجیب آدمی ہیں ڈاکٹر۔ آخر آپ تباہ کیوں ہونا چاہتے ہیں۔ (پیالی میز پر رکھ کر) کوئی بھی خود سے تباہ ہونا

نہیں چاہتا۔

ثاقب : (کمبل جسم سے الگ کرتے ہوئے) مگر میں ہونا چاہتا ہوں۔ اس لیے کہ میں دنیا کی نظروں سے گر گیا ہوں۔

گلریز : بس۔ (ہنس کر) زہوں کے کیرکٹر کو لوگوں نے کبھی اچھا نہیں سمجھا لیکن ہم نے تو کبھی ہتھیار نہیں ڈالے۔

ثاقب : یہ ہمت کی بات ہے اور سب میں یہ ہمت نہیں ہوتی۔

(عزیزالحسن کمرے میں آتے ہوئے)

عزیزالحسن : ہمت سب میں ہوتی ہے مگر حالات کا مقابلہ صرف بہادر کرتے ہیں۔

ثاقب : (عزیزالحسن کو غور سے دیکھ کر) اور جس کے حالات بگڑ گئے ہوں۔ (پلنگ سے اترنا چاہتا ہے)

عزیزالحسن : بیٹھے رہو۔ تم کمزور ہو (ثاقب کے پلنگ کے پاس آتے ہوئے) حالات بگڑ جاتے ہیں تو انھیں سدھارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ ان کے سامنے ہتھیار تو نہیں ڈالے جاتے (کچھ دیر خاموش رہ کر) کبھی کسی کی غلط فہمی کی سزا کسی اور کو بھگتنا پڑتی ہے۔ تم اپنی ماں کی غلط فہمی کی سزا بھگت رہے ہو۔

ثاقب : (مشکوک نظروں سے عزیزالحسن کو دیکھ کر) کیسی غلط فہمی۔

عزیزالحسن : انھوں نے سب حالات مجھے بتلا دیے ہیں اور وہ ایک غلط فہمی کا شکار ہو کر مبہم خوف میں مبتلا ہیں۔ تمھیں معلوم ہے کہ تمھارے والد ایک بینک کے منیجر تھے؟

ثاقب : نہیں۔ اور نہ اب میں ان کے بارے میں کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

عزیزالحسن : مگر میں اتنا ضرور بتلاؤں گا کہ تمھاری ماں تمھارے بے گناہ باپ کو گنہگار سمجھتی رہیں۔ انھوں نے وہ تصویر مجھ سے اس لیے چھپائی کہ میں انھیں پہچان نہ لوں۔ تمھاری خاطر وہ خود کو بیس سال سے چھپائے ہوئے ہیں۔ (گلریز

چائے کی کیتلی اٹھا کر دروازے کی طرف جاتی ہے)

ثاقب : کہاں جارہی ہو۔

گلریز : خاں صاحب کے لیے چائے لانے۔

(کمرے سے چلی جاتی ہے۔ ثاقب پلنگ سے اُتر کر عزیزالحسن سے)

ثاقب : کتنی ہی خوبصورت کہانی کیوں نہ گھڑی جائے مگر اب میں گھر نہیں جاؤں گا۔

عزیزالحسن : تم گھر جاؤ یا نہ جاؤ مگر اپنی اس ماں کو دکھ نہ دو جس نے تمھاری خاطر اتنی بڑی قربانی دی ہے۔ (ثاقب کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ کمزوری کی وجہ سے اسے کھڑے ہونے میں تکلیف ہورہی ہے) بیٹھ جاؤ۔ تم کمزور ہو۔ (ثاقب ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) تم اس نرس کے چکر میں پڑ کر اپنا سارا کیریئر برباد کررہے ہو۔

ثاقب : خاں صاحب! جب انسان ناامید ہوجاتا ہے تو جو بھی اس سے ہمدردی کرتا ہے وہ اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ گلریز نے میری ایسی خدمت کی ہے جس کا جواب نہیں ہے۔

عزیزالحسن : ایسی ہزاروں عورتیں تم سے ہمدردی کے پردے میں خودغرضی چھپا کرلیں گی۔

ثاقب : وہ خودغرض نہیں ہے میں نے اسے پرکھ لیا ہے۔

عزیزالحسن : اور ایک دن تمھیں پچھتانا پڑے گا۔

ثاقب : اگر زندگی میں پچھتانا ہی ہے تو پچھتا بھی لوں گا۔ کم ازکم زندگی میں ایک تجربہ تو ہوجائے گا۔

عزیزالحسن : (کسی قدر ناگواری سے) تم زندگی میں پہلے آدمی ملے ہو جو اپنے مستقبل سے جان بوجھ کر کھیل رہا ہے۔ ڈاکٹر ثاقب تم سمجھدار انسان ہو۔ اگر اپنے لیے نہیں تو کم ازکم اپنی ماں کی خاطر ایسا جوا نہ کھیلو جس میں سوائے ہار کے کچھ نہیں ہے۔

ثاقب : اس ماں کی خاطر جس نے آج تک مجھے تاریکی میں رکھا۔

عزیزالحسن : صرف تمھارے مستقبل کی خاطر (چند سکنڈ رک کر ٹھنڈی سانس بھر کر) جوانی میں انسان بیچ سمندر میں کود کر سمجھتا ہے کہ وہ اسے تیر کر پار کرلے گا اس کو اپنے دوستوں اور ہمدردوں کی آواز سنائی دے گی۔ ڈاکٹر ثاقب! ڈوبنے کے بعد غلطی سدھاری نہیں جاسکتی۔ (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) اگر فرصت ملے تو میری باتوں پر غور کرلینا۔ خدا حافظ۔

(گلریز چائے لے کر آتی ہے اور عزیزالحسن کو جاتا ہوا دیکھ کر)

گلریز : خاں صاحب میں آپ کے لیے چائے لائی ہوں۔

عزیزالحسن : شکریہ۔ میں ایک ضروری کام سے جارہا ہوں۔

(عزیزالحسن کمرے سے چلے جاتے ہیں۔گلریز کشتی میز پر رکھ کر)

گلریز : یہ خاں صاحب بھی کتنے ان کریش ہیں میں تو ان کے لیے چائے لائی اور انھوں نے لفٹ تک نہ دی۔ میں اتنی خراب تو نہیں ہوں کہ وہ مجھ سے بات تک نہ کریں۔

ثاقب : تم ان کی پروا نہ کرو گلریز۔

گلریز : (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) میں نے جانے کون سا گناہ کیا ہے کہ لوگ مجھ سے ایسا ہی بیہو کرتے ہیں۔ اوہ گاڈ یہ کیسے لوگ ہیں۔

ثاقب : مارو گولی ان لوگوں کو۔

گلریز : (آنسو پونچھ کر) ڈاکٹر آپ کو چائے دوں۔

(پردہ)

دوسرا اسین

منظر : (اسپتال کا کوارٹر، ثاقب کمبل اوڑھے پلنگ پر بیٹھا ہے۔ اس کے سامنے دوسری کرسی پر نصرت بیٹھا ہے۔ نصرت کے چہرے پر جھنجھلاہٹ کے آثار ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں دیر سے کسی مسئلہ پر گفتگو کر رہے ہیں)۔

نصرت : (ثاقب کا چہرہ دیکھ کر) ثاقب میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ تم اس قدر حماقت کی باتیں کرو گے۔

ثاقب : (طنزیہ مسکرا کر) تم زندگی میں جانے کتنی بار مجھے احمق کہہ چکے ہو ایک بار اور کہہ لینے میں برا نہیں مانوں گا۔

نصرت : تم برا مانو یا نہ مانو مگر انسان کو اپنے فیصلے پر اس قدر یقین نہیں کر لینا چاہیے جیسا کہ تم نے کرلیا ہے۔

ثاقب : میرے بار بار فیصلے بدلنے سے میری ماں نے مجھے اس حالت پر پہنچا دیا ہے۔ اب ایک بار میں اپنے فیصلے پر اٹل ہو کر دیکھنا چاہتا ہوں۔

نصرت : (کھڑے ہو کر) غلط فیصلے پر اٹل ہو جانا کوئی دانشمندی نہیں ہے (میز کے پاس جا کر ماچس اٹھاتا ہے اور مڑ کر ثاقب کو دیکھ کر) تم نے امی کی حالت نہیں دیکھی کہ وہ کیا ہو گئی ہیں۔ تم نے شائستہ کو نہیں دیکھا کہ وہ کیسی زندگی گزار رہی ہے۔

ثاقب : (کمبل اپنے چاروں طرف لپیٹے ہوئے) تم ان دونوں کی وکالت کر رہے ہو جنھوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ میں کیسی زندگی گزار رہا ہوں (کچھ دیر خاموش رہ کر) ان دونوں سے زیادہ محبت اور خلوص تو گلریز نے دیا ہے۔

نصرت : (سگریٹ جلاتا ہے اور آہستہ آہستہ ثاقب کے پاس آتے ہوئے) یہ کچھ گلریز پر منحصر نہیں ہے۔ اس اسپتال کی ہر نرس تم کو یہی خلوص اور محبت دینے کو تیار ملے گی۔

ثاقب : مگر میں گلریز کو ان میں سے نہیں سمجھتا۔

نصرت : میں خوب سمجھتا ہوں۔ میں نے انھیں قریب سے دیکھا ہے۔

ثاقب : (طنزیہ مسکرا کر) تو پھر تمھاری نظروں ہی میں کھوٹ ہوگا۔

نصرت : حقیقتوں کو منطق سے جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ صرف تجربے اور امتحان ہی سے جھٹلایا جاسکتا ہے (گلریز چائے لے کر کمرے میں آتی ہے نصرت اسے دیکھ کر) ہلو سسٹر۔

گلریز : (چائے کی کشتی میز پر رکھ کر) ہلو ڈاکٹر۔ (مسکرا کر) آج تو بڑے سویرے سویرے آگئے۔

نصرت : میں آپ کو ایک خوش خبری سنانے آیا ہوں۔

گلریز : خوش خبری (نصرت کو دیکھ کر) جلدی سناؤ ڈاکٹر۔ میں نے تو جانے کب سے خوش خبری نہیں سنی۔

نصرت : (مسکرا کر) تو اب سن لو۔ ڈاکٹر ثاقب کی شائستہ سے شادی ہونے والی ہے۔

گلریز : (گھبرا کر) اوہ بابا۔ اور ڈاکٹر ثاقب یہ بات ہم سے چھپاتے رہے۔

ب : یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ سراسر جھوٹ۔

نصرت : ڈاکٹر ثاقب! تم کب تک چھپاتے رہتے۔ ایک نہ ایک دن تو مسز گلریز سے کہنا ہی پڑتا۔ تمھاری یہ مشکل میں نے آسان کردی۔

ثاقب : (غصہ سے) نصرت۔ میں اس قسم کا مذاق پسند نہیں کرتا۔

نصرت : یہ مذاق نہیں ہے ڈاکٹر ثاقب۔ حقیقت ہے۔

گلریز : (ثاقب سے) آپ کو مجھے دھوکا نہیں دینا چاہیے تھا۔ میں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا۔

ثاقب : (اسی طرح غصہ سے) یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ دھوکا دے رہا ہے۔

گلریز : آخر سب ہی ہمیں دھوکا کیوں دیتے ہیں۔ ہماری مدر نے ہمیں دھوکا دیا اور دوسری شادی کرکے غائب ہوگئی۔ ہمارے گھر والے نے ہمیں دھوکا دیا۔ ایسا غائب ہوا کہ آج تک غائب ہے (ثاقب سے) آپ کو میں نے بھلا آدمی جانا تھا مگر آپ نے بھی دھوکا دیا۔

ثاقب : یہ جھوٹ بول رہا ہے اس میں کوئی سچائی نہیں ہے۔

نصرت : (اطمینان سے سگریٹ کا کش لے کر گلریز سے) ابھی ثاقب کی امی آئیں گی اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ کون جھوٹا اور مکار ہے۔

ثاقب : (غصہ سے) اگر وہ اس مقصد سے آئیں گی تو میں ان سے بات بھی نہیں کروں گا۔

نصرت : (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) بڑی سعادت مندی کا ثبوت دو گے۔
(جواب کا انتظار کیے بنا کمرے سے چلا جاتا ہے۔گلریز ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ ثاقب کچھ دیر خاموش رہ کر)

ثاقب : نصرت جھوٹ بول رہا تھا۔ (گلریز کوئی جواب نہیں دیتی اور کیتلی سے پیالی میں چائے نکالنے لگتی ہے) گلریز تمھیں میری بات پر یقین کیوں نہیں۔

گلریز : اب آپ کو یقین دلانے کی ضرورت نہیں۔

ثاقب : اور تم نے نصرت کی بات پر یقین کرلیا جو سراسر جھوٹ بولا ہے۔

گلریز : (چائے کی پیالی ثاقب کی طرف بڑھاتے ہوئے) جانے کون جھوٹ بول رہا ہے اور کون سچ۔
(ثاقب غصہ سے پیالی پر ہاتھ مارتا ہے جو گر کر ٹوٹ جاتی ہے۔گلریز گھبرا کر کھڑی ہوجاتی ہے)

ثاقب : (اونچی آواز سے) جاؤ تم بھی مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ۔ میں جھوٹا مکار اور دھوکے باز ہوں۔
(اسی وقت بیگم کمرے میں آتی ہیں۔ ان کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیمار ہیں اور کمزور ہوگئی ہیں۔ ثاقب انھیں دیکھ کر غیراختیاری طور پر کھڑا ہوجاتا ہے۔بیگم تھکی تھکی سی ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہیں اور ثاقب کا چہرہ دیکھ کر)

بیگم : تونے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ بیٹھ جا تو کمزور ہے۔ (ثاقب کھڑا رہتا ہے بیگم کی نظر ٹوٹی ہوئی پیالی پر پڑتی ہے) برتن پھینکنے کی تیری عادت ابھی تک نہیں گئی۔ (ثاقب اب بھی خاموش رہتا ہے) کیا تو کچھ نہیں بولے گا۔ میں تیری خاطر بیس سال پرانی قسم توڑ کر آئی ہوں— تو گونگا ہوگیا ہے۔

گلریز : کیا ڈاکٹر کی شادی شائستہ بیگم سے ہونے والی ہے۔

بیگم : ہاں۔ میں نے اور خاں صاحب نے یہ شادی طے کردی ہے۔

ثاقب : مگر میں اب شائستہ سے شادی نہیں کروں گا۔

بیگم : کیوں نہیں کرے گا۔
ثاقب : میری مرضی۔
بیگم : تو نے اپنی مرضی چلانا ابھی تک نہیں چھوڑا۔
ثاقب : آپ نے میری مرضی چلنے ہی کب دی ہے۔ مگر اب ضرور میری مرضی چلے گی اور وہ یہ ہے کہ میں شائستہ نہیں کسی اور سے شادی کروں گا۔
بیگم : اور وہ کون ہے۔
ثاقب : وہ کوئی بھی ہو، شائستہ نہیں ہے۔
بیگم : مجھے معلوم ہے کہ وہ کون ہے (گلریز کی طرف دیکھ کر) مگر ایسی عورتوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔
ثاقب : ہو یا نہ ہو مگر وہ ان شائستاؤں سے بہتر ہیں جو اپنے غرور میں کسی کو کچھ نہیں سمجھتیں۔
بیگم : تو تو میری نہیں سنے گا۔ ماں کا دل دکھانا اچھا نہیں ہوتا۔
ثاقب : میں زندگی بھر نصیحتیں سنتے سنتے اکتا گیا۔ خدا کے لیے یہ دفتر بند کیجیے۔
بیگم : یوں کہہ کہ تو اپنی ماں سے اکتا گیا ہے۔ ماں کے پاس نصیحتوں اور دعاؤں کے علاوہ ہوتا ہی کیا ہے (کھڑی ہوجاتی ہیں۔ آنکھوں میں آنسو ہیں) مجھے نہیں معلوم تھا کہ بیس سال بعد میں دوسری چوکھٹ پر قدم رکھوں گی اور بے عزت ہوجاؤں گی۔
ثاقب : (جیسے متاثر ہوکر) مگر ای بے عزت ــــ
بیگم : (بات کاٹ کر) اور بے عزتی کیا ہوتی ہے کہ بیٹا ماں کی نصیحتوں سے اکتا گیا ہے اسے ماں کی دعاؤں کی بھی ضرورت نہیں۔
ثاقب : ای۔ اگر میری زندگی کی ضرورت ہے تو لے لو مگر شادی کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔
بیگم : کیا تو اب یہ چاہتا ہے کہ میں جھولی پھیلا کر اس سے بھیک مانگوں کہ میرا بیٹا مجھے دے دے۔

گلریز : آپ کیسی باتیں کرتی ہیں میں نے کہاں آپ کا بیٹا چھین لیا ہے۔

بیگم : اور چھیننا کیا ہوتا ہے۔ میں بیمار ہوں۔ یہ ایک دن بھی مجھے دیکھنے نہیں آیا۔ میں شائستہ سے اس کی شادی کرنا چاہتی ہوں اور یہ انکار کررہا ہے۔

گلریز : بیمار تو یہ خود بھی ہیں آپ نے کون سی خبر لے لی اور جب یہ شائستہ بیگم سے شادی کرنا چاہتے تھے تو آپ نے انکار کردیا۔ اب ان سے شادی کرالینے کے لیے اس قدر بے چین کیوں ہوگئیں۔

بیگم : تب حالات اور تھے۔ اب حالات اور ہیں۔

گلریز : یوں کہیے کہ وہ اب ہم کو پسند کرنے لگے ہیں اور ہم آپ کو پسند نہیں۔ اس لیے کہ ہم گھٹیا ہیں۔

بیگم : یہ بات نہیں بلکہ —

گلریز : (بات کاٹ کر) اور کیا بات ہے آپ بڑے لوگ ہیں تو سب کو گھٹیا کیوں سمجھتے ہیں۔ آخر آپ بڑے لوگ اس قدر خودغرض کیوں ہوتے ہیں۔ (طنزیہ) ہم گھٹیا لوگ آپ کی کتنی ہی خدمت کریں مگر آپ اس کی پروانہیں کرتے۔ اگر میں ان کی اتنی دیکھ بھال نہ کرتی تو یہ اپنی جان دے دیتے۔

بیگم : میں تمھارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔

گلریز : مگر مجھے ڈاکٹر کو بھولنا پڑے گا۔

بیگم : یہ ہماری عزت کا سوال ہے۔

گلریز : اور ہماری تو کوئی عزت ہی نہیں۔ عزت کی ٹھیکیداری آپ ہی کے حصہ میں آئی ہے۔

بیگم : (کسی قدر غصہ سے) اور تم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ تم تمام زندگی اس کے ساتھ نباہ کرسکو گی۔

گلریز : کیوں کیا ہم عورت نہیں ہیں۔ ماں، بہن اور بیوی بننے کی ذمے داری کیا خدا نے صرف تمھیں کو سونپی ہے۔

بیگم : یہ تو ٹھیک ہے مگر—

گلریز : (بات کاٹ کر) میں نے شائستہ بیگم کی خوشامد کی کہ وہ ڈاکٹر ثاقب سے ملے تو اس نے مجھ سے مس بی ہیو کیا۔ ہم نے آپ کی خوشامد کی کہ ڈاکٹر بیمار ہے آپ چل کر دیکھ لیجیے مگر آپ نے ہماری بات نہیں مانی۔ میں نے رات دن ایک کر کے ان کی خدمت کی تو اب آپ اپنا حق جتانے آگئیں (میز پر سے چائے کے برتن اٹھاتے ہوئے) اگر اب بھی ڈاکٹر ثاقب آپ کے ساتھ چلے جائیں گے تو میں ان کو روکوں گی نہیں۔ (بیگم خاموش رہتی ہے) اگر آپ کو میرے ہاتھ کی چائے پینے میں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں آپ کے لیے چائے لاؤں۔

بیگم : نہیں میں اس وقت چائے نہیں پیوں گی (گلریز خاموشی سے چائے کے برتن لے کر کمرے سے چلی جاتی ہے۔ بیگم کچھ دیر خاموش رہ کر ثاقب سے) دیکھا ذرا سی خدمت کیا کر لی کہ احسان جتانے لگی۔

ثاقب : جب کوئی خدمت اور محنت کرتا ہے تو ایسی باتوں سے اسے دکھ ہوتا ہی ہے۔

بیگم : کیا میں نے پالنے پوسنے میں محنت نہیں کی، کیا میں نے تیرے لیے دکھ نہیں جھیلے۔

ثاقب : وہ آپ کا فرض تھا لیکن اس کا خدمت کرنا احسان ہے۔

بیگم : (آنکھوں میں آنسو بھر کر) اب وہ تیری سب کچھ ہوگئی اور میں کچھ نہ رہی۔

ثاقب : امی۔ (بیگم سے لپٹ جاتا ہے۔ آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ بیگم ہچکیوں سے رونے لگتی ہیں۔ کچھ دیر بعد بیگم کو کرسی پر بٹھلا کر) امی میری چمڑی کی اپنی جوتیاں بنوالو۔ مگر گلریز کے سامنے مجھے ذلیل نہ کرو۔

بیگم : (ٹھنڈی سانس بھر کر) تو اب تو اس نرس کو نہیں چھوڑ سکتا۔ کیا تو شائستہ کو بھول سکے گا جس کے لیے تو نے اپنی یہ حالت بنالی ہے۔ بول کیا تو شائستہ کو نہیں چاہتا۔ (ثاقب اب بھی خاموش رہتا ہے) بولتا کیوں نہیں۔ کیا شائستہ کو بھلا سکے گا۔

(ثاقب آہستہ آہستہ پلنگ کے پاس جاتا ہے اور اس پر گردن جھکا کر بیٹھ جاتا ہے اور سوچنے لگتا ہے۔ پھر گردن اٹھا کر بیگم کو دیکھ کر)

ثاقب : میں کوشش کروں گا کہ شائستہ کو بھول جاؤں۔

بیگم : اور تو اسے نہیں بھول سکتا (کھڑے ہوکر ثاقب کے پاس جاکر) اگر تو چاہتا ہے کہ میں اس نرس کے سامنے جھولی پھیلا کر بھیک مانگوں۔ تو وہ بھی مانگ لوں گی۔ مجھے شرم نہیں آئے گی۔ اگر تو اپنی ماں کو اتنی بڑی سزا دینا چاہتا ہے تو دے دے (ٹھنڈی سانس بھر کر) تیری ماں تیرے لیے یہ بھی برداشت کرلے گی۔

ثاقب : (نظریں اٹھا کر بیگم کو دیکھ کر) مگر امی۔

بیگم : (بات کاٹ کر) میں نے تیرے لیے بہت دکھ جھیلے ہیں بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں اب بھی میں تیرے لیے سب کچھ کرسکتی ہوں (ثاقب خاموش رہتا ہے) اچھا سچ بتا کیا تو اس نرس سے محبت کرنے لگا ہے۔

ثاقب : (سوچتے ہوئے) میں کچھ کہہ نہیں سکتا مگر اس کے مجھ پر جو احسان ہیں انھیں بھول بھی نہیں سکتا۔ اس کا دل نہیں توڑ سکتا۔

(نصرت اور عزیزالحسن کمرے میں آتے ہیں۔ نصرت آگے بڑھتے ہوئے کسی قدر غصہ کے لہجے میں)

نصرت : اور تم اپنی ماں کا دل توڑ سکتے ہو۔ شائستہ کا دل توڑ سکتے ہو۔

ثاقب : (کھڑے ہوکر) مگر شائستہ نے میرے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا۔

نصرت : (اسی لہجے میں) اور تم نے اس کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا۔ کبھی اس پر بھی سوچا ہے۔ تم نے زندگی بھر اپنے بارے میں سوچا ہے اور اب بھی اپنے ہی بارے میں سوچنا چاہتے ہو۔

ثاقب : یہ صرف تمھارا خیال ہے۔

نصرت : اور وہ غلط نہیں ہے۔ جس خول میں تم بند ہو اس سے باہر نکل کر دیکھو کہ تم کیا سوچتے ہو اور کیا کرتے ہو (بیگم کی طرف دیکھ کر) آیئے امی چلیے۔ (بیگم

رکتی ہے۔ نصرت اس کا بازو پکڑ کر) چلیے۔ آپ یہاں بے عزت ہونے کے لیے نہیں آئی ہیں۔

(تینوں دروازے کی طرف بڑھتے ہیں کہ گلریز دروازے میں آتی ہے اس کے ہاتھ میں کشتی ہے جس میں کچھ مٹھائی، پھل اور چائے کا سامان ہے اور اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ ہے۔ آگے بڑھتے ہوئے)

گلریز : ارے آپ لوگ کہاں چل دیے۔ میں تو آپ کے لیے مٹھائی لائی تھی۔

عزیزالحسن : (غصہ سے) کیا مطلب۔

گلریز : (کشتی میز پر رکھتے ہوئے) مٹھائی کا مطلب مٹھائی ہوتا ہے (مسکرا کر) ہم خوشی کے وقت ایک دوسرے کا منہ میٹھا کرتے ہیں۔ آیئے آیئے۔ بیٹھیے میں نے اسی دن کے لیے تھوڑا تھوڑا بچا کر رکھا تھا۔ بڑی گاڑھی کمائی کا ہے یہ سب کچھ۔

نصرت : (برہمی سے) مسٹر آخر یہ سب کیا تماشا مچا رکھا ہے۔

گلریز : (مسکرا کر) خدمت کا ایک طریقہ۔

ثاقب : (غصہ سے) گلریز۔ بند کرو یہ مذاق۔

گلریز : (ثاقب کو دیکھ کر لہجہ بدل کر) ڈاکٹر ثاقب۔ سب ہم کو مسز گلریز کہتے ہیں۔ آپ بھی مسز گلریز کہیے (سب حیرت سے گلریز کو دیکھتے ہیں) ڈاکٹر ثاقب آپ شریف ہی نہیں نادان بھی ہیں۔ میں نے آپ سے کتنی بار کہا کہ میں شادی شدہ ہوں۔ میرا شوہر ہے مگر کہیں چلا گیا ہے (کرسی پر بیٹھ کر خلا میں دیکھتے ہوئے) وہ کبھی تو آئے گا (ٹھنڈی سانس بھر کر) وہ کتنا ہی برا سہی مگر میں اس کا انتظار کرتی رہوں گی۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر ٹھنڈی سانس بھر کر) شاید اس انتظار میں میرے بال سفید ہو جائیں گے۔

(سب حیرت سے گلریز کو دیکھنے لگتے ہیں جو خلا میں گھور رہی ہے)۔

(پردہ)

الجھاوے

افرادِ تمثیل

(1) رحمٰن (چالیس سالہ مرد) (2) روبینہ (رحمٰن کی بیوی) (3) سلمٰی (اندھی عورت)
(4) انوری (نوکرانی) (5) شاہ بابا (بوڑھا نوکر) (6) بیگم اشرف (بوڑھی عورت)

پہلا سین

منظر

(رحمٰن کے مکان کا کمرہ۔ ساز و سامان سے کھاتا پیتا گھرانہ معلوم ہوتا ہے۔ ہر چیز سلیقہ سے سجی ہوئی ہے۔ رحمٰن ایک صوفے پر بیٹھا ہے اس کے ہاتھ میں اخبار ہے مگر وہ سامنے والی دیوار کو گھور رہا ہے۔ کچھ دیر ٹھنڈی سانس بھر کر کھڑا ہوتا ہے۔ میز پر سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دباتا ہے اور کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ پھر رک کر سگریٹ جلاتا ہے کہ شاہ بابا کمرے میں آتا ہے۔ سفید داڑھی ہے پیشانی پر سجدوں کا نشان ہے۔ لباس معمولی اور صاف ستھرا ہے۔ دروازے پر رک کر کچھ دیر رحمٰن کو دیکھتا ہے۔ پھر دو تین قدم آگے بڑھ کر)۔

شاہ بابا : رحمٰن میاں۔ (رحمٰن تھکے تھکے انداز سے مڑ کر شاہ بابا کو دیکھتا ہے) فیکٹری نہیں جاؤ گے۔ (رحمٰن خاموش رہتا ہے) دس بجنے کو آئے آپ نے ناشتہ تک نہیں کیا۔ (رحمٰن کے پاس آکر) طبیعت تو ٹھیک ہے۔

رحمٰن : (سگریٹ ایش ٹرے میں ڈال کر) سب ٹھیک ہے شاہ بابا۔ (کچھ دیر رُک کر) روبینہ کہاں ہے۔

شاہ بابا : وہ تو صبح ہی کہیں چلی گئی ہیں۔

رحمٰن : کہاں گئی ہے۔ کچھ کہہ کر نہیں گئی۔

شاہ بابا : مجھ سے اتنا ہی کہا تھا باہر جاری ہوں اگر دیر ہوجائے تو آپ کو ناشتہ کرادوں۔ ناشتہ تیار ہے میز پر لگا دوں۔

رحمٰن : نہیں شاہ بابا۔ ایک پیالی چائے یہیں لادو۔

(شاہ بابا کمرے سے چلا جاتا ہے۔ رحمٰن کچھ دیر وہیں کھڑا رہتا ہے پھر کھڑکی کے پاس جاکر اس میں سے باہر دیکھنے لگتا ہے کہ شاہ بابا چائے لے کر آتا ہے اور رحمٰن کے پاس جاکر)

شاہ بابا : رحمٰن میاں۔

رحمٰن : (مڑ کر شاہ بابا کو دیکھ کر) ارے اتنی جلدی لے آئے۔

شاہ بابا : چائے تو کب کی تیار تھی۔

رحمٰن : (پیالی کشتی سے اٹھا کر) روبینہ پہلے تو کبھی اتنے سویرے باہر نہیں گئی۔

شاہ بابا : جی ہاں۔ جب تک آپ کو ناشتہ نہیں کرادیتیں کوئی دوسرا کام نہیں کرتیں۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) کچھ آپ سے...

رحمٰن : نہیں شاہ بابا۔ ہم میں کبھی کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔

شاہ بابا : تو پھر کسی کام سے چلی گئی ہوں گی۔

رحمٰن : کہہ کر تو جانا چاہیے۔ بلا وجہ کی الجھن پیدا ہوجاتی ہے۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) شاہ بابا۔ آپ کو سلمیٰ تو یاد ہوگی۔

شاہ بابا : ہاں خوب کیا ہوا انھیں۔

رحمٰن : وہ اندھی ہوگئی ہے۔

شاہ بابا : (حیرت سے) اندھی!

رحمٰن : ہاں اور اب اپاہج آشرم میں ہے۔

شاہ بابا : اپاہج آشرم میں؟

رحمٰن : ہاں۔ شاہ بابا۔ (شاہ بابا خاموش رہتا ہے) روبینہ آئے تو مجھ سے کہہ دیجیے گا۔

شاہ بابا : بہت اچھا۔

(شاہ بابا کمرے سے چلا جاتا ہے۔ رحمٰن پیالی میز پر رکھ کر صوفے پر بیٹھ کر اخبار اٹھاتا ہے کہ باہر برآمدے میں روبینہ کی آواز)

روبینہ : انوری۔ ارے انوری۔ ذرا ادھر آنا۔

(رحمٰن دروازے کی طرف دیکھتا ہے کہ روبینہ ایک اندھی عورت کا ہاتھ پکڑے کمرے میں آتی ہے۔ رحمٰن اسے دیکھ کر ایک دم کھڑے ہوکر۔ ''روبینہ'' روبینہ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرکے عورت کو کرسی پر بٹھلاتے ہوئے۔

روبینہ : سلمٰی بہن۔ آپ بیٹھیے۔

سلمٰی : (بے چین سی ہوکر) یہ کس کی آواز تھی۔

روبینہ : میرے شوہر کی۔ (سلمٰی خاموش ہوکر سوچنے لگتی ہے۔ روبینہ دروازے کے پاس جاکر) انوری۔ ارے انوری۔ (اسی وقت انوری کمرے میں آتی ہے) کیا کررہی تھی۔ (انوری خاموش رہتی ہے۔ روبینہ صوفے پر سے ایک پیکٹ اٹھاکر انوری کو دے کر) اس میں ساڑی ہے (سلمٰی کی طرف اشارہ کرکے) سلمٰی بہن کو نہلا کر پہنادے (انوری حیرت سے سلمٰی کو دیکھتی ہے۔ روبینہ سلمٰی کے پاس جاکر) آپ نہا کر کپڑے بدل لیجیے۔ پھر ناشتہ کریں گے (روبینہ سلمٰی کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کرتی ہے اس کا ہاتھ انوری کو پکڑا کر) اور شاہ بابا سے

ناشتہ کے لیے کہہ دینا۔

انور : بہت اچھا۔

(انوری سلمیٰ کو لے کر کمرے سے چلی جاتی ہے۔ روبینہ رحمٰن کو دیکھ کر)

روبینہ : آپ نے ناشتہ کرلیا۔ (رحمٰن خاموش رہتا ہے) فیکٹری جانے کا ارادہ نہیں ہے۔ (رحمٰن خاموش رہتا ہے اور روبینہ کا چہرہ دیکھتا رہتا ہے کچھ دیر خاموش رہ کر)

رحمٰن : روبینہ۔ سنا تھا کہ عورتیں اپنے شوہروں کا مذاق اڑانے کے لیے نئے نئے لطیفے گھڑتی رہتی ہیں۔ مگر ایسا عملی مذاق بھی کرتی ہیں یہ معلوم نہیں تھا۔

روبینہ : مذاق!

رحمٰن : سلمیٰ کو اپاہج آشرم سے لانے کا کیا مقصد ہے۔

روبینہ : اسے وہاں دیکھ کر آپ دکھی جو رہنے لگے تھے۔

رحمٰن : مجھے خوش رکھنے کا یہ طریقہ نکالا ہے۔

روبینہ : آپ کی بے وفائی نے ہی اسے اس حال پر پہنچایا ہے۔

رحمٰن : (تلخ لہجے میں) اور تم مجھ سے وفا کرکے مجھے اس حالت میں پہنچا دینا چاہتی ہو۔

روبینہ : مجھے غلط نہ سمجھو رحمٰن۔

رحمٰن : تاکہ ایک دن تم مجھے غلط سمجھنے لگو۔

روبینہ : (ایسے لہجے میں جس میں خفیف سا طنز ہے) تم مجھے دل سے چاہتے ہو اسی نے میرے اندر خود اعتمادی پیدا کردی ہے۔

رحمٰن : (طنز کو محسوس کرکے) بہت زیادہ خود اعتمادی کبھی کبھی...

(خاموش ہو جاتا ہے سگریٹ کا کش لے کر اسے ایش ٹرے میں ڈالتا ہے)

روبینہ : (کچھ دیر خاموش رہ کر) میں آپ سے ایک ہی بات کہتی ہوں (رحمٰن سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے) اس پر یہ ظاہر نہ ہونے دینا کہ آپ وہی رحمٰن ہیں جس کی وہ ستائی ہوئی ہے۔

رحمٰن : میں نے اسے نہیں ستایا ہے بلکہ اس کی کچھ—— خیر چھوڑو۔ بہرحال تم نے ہم دونوں پر ظلم کیا ہے۔

روبینہ : مگر رحمٰن۔

رحمٰن : (بات کاٹ کر) چھوڑو اس بحث کو اس سے کچھ نتیجہ نکلنے والا نہیں (روبینہ خاموش ہو جاتی ہے، پھر دروازے کے پاس جا کر)

روبینہ : شاہ بابا۔ شاہ بابا۔

(دور سے شاہ بابا کی آواز "آیا بیٹا" روبینہ آ کر صوفے پر بیٹھتی ہے کہ شاہ بابا کمرے میں آ کر)

شاہ بابا : کیا بات ہے بیٹا۔

روبینہ : میرے کمرے کے پاس جو کمرہ ہے اسے ٹھیک کر دو اس میں کوئی رہے گا (رحمٰن مڑ کر روبینہ کو دیکھتا ہے مگر خاموش رہتا ہے) ناشتہ یہیں دے جایئے۔

شاہ بابا : بہت اچھا۔ ابھی رحمٰن میاں نے بھی ناشتہ نہیں کیا ہے۔

روبینہ : اچھا۔ (رحمٰن سے) آپ نے ابھی تک ناشتہ کیوں نہیں کیا۔ (رحمٰن خاموش رہتا ہے) شاہ بابا آپ ناشتہ یہیں لے آیئے۔

شاہ بابا : اچھا بیٹا۔

(شاہ بابا کمرے سے چلا جاتا ہے۔ روبینہ رحمٰن کی طرف بڑھتی ہے کہ سلمٰی اور انوری کمرے میں آتی ہیں۔ سلمٰی نے نئی ساڑی پہن لی ہے اب وہ زیادہ خوبصورت نظر آ رہی ہے۔ روبینہ اسے دیکھ کر)

روبینہ : آیئے۔ (رحمٰن مڑ کر سلمٰی کو دیکھتا ہے روبینہ سلمٰی کو صوفے پر بٹھلا کر انوری سے) شاہ بابا سے جا کر کہو کہ ناشتہ لے آئیں (انوری خاموشی سے کمرے سے چلی جاتی ہے روبینہ اپنے پرس میں سے گاگلز نکال کر سلمٰی کی آنکھوں پہ لگاتے ہوئے۔

روبینہ : یہ گاگلز لگا لیجیے۔

سلمٰی : (پھیکی مسکراہٹ سے) ان سے میری آنکھوں میں روشنی تو نہیں آجائے گی۔

روبینہ : مگر آپ اور خوبصورت نظر آنے لگیں گی۔ (رحمٰن سے) کیوں ہے نا (رحمٰن کے چہرے پر غم کے آثار پیدا ہوتے ہیں مگر وہ خاموش رہتا ہے سلمٰی اپنے کپڑے ٹٹول کر)

سلمٰی : یہ ساڑی تو بڑی قیمتی معلوم ہوتی ہے۔

روبینہ : زیادہ قیمتی تو نہیں۔ (ہنس کر) مگر آپ پر جچ رہی ہے۔

سلمٰی : (ساڑی ٹٹولتے ہوئے) اس کا رنگ کیسا ہے۔

روبینہ : کاہی۔

سلمٰی : کاہی۔

(گھبرا کر صوفے سے اٹھتی ہے مگر ٹھنڈی سانس بھر کر پھر بیٹھ جاتی ہے)

روبینہ : کیوں یہ رنگ آپ کو پسند نہیں۔ (سلمٰی خاموش رہتی ہے۔ روبینہ رحمٰن کی طرف دیکھ کر) یہ رنگ آپ کو بھی تو پسند ہے۔

(رحمٰن کے چہرے پر غم کے آثار اور گہرے ہو جاتے ہیں مگر خاموش رہتا ہے)

سلمٰی : (مسکرا کر) آپ کے صاحب تو بہت کم بولتے ہیں۔

روبینہ : جی نہیں۔ (ہنس کر) آپ سے کچھ شرما رہے ہیں۔

سلمٰی : (ہنس کر) شرما رہے ہیں۔ مگر میں تو انھیں دیکھ بھی نہیں سکتی۔

روبینہ : وہ تو آپ کو دیکھ رہے ہیں۔ (انوری ناشتہ لے کر آتی ہے) ادھر لے آ (انوری ناشتہ اس کے سامنے میز پر لگا دیتی ہے) جا تو جا کر شاہ بابا کا ہاتھ بٹا لے وہ سلمٰی بہن کے لیے کمرہ ٹھیک کر رہے ہیں۔ (انوری کمرے سے چلی جاتی ہے۔ روبینہ ہنس کر رحمٰن سے) اب شرمانا ختم کیجیے اور آ کر ناشتہ کر لیجیے۔ (رحمٰن آ کر ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ روبینہ ایک پلیٹ اس کی طرف سرکاتے ہوئے) آج فیکٹری جانے کا ارادہ نہیں ہے۔

رحمٰن : ہاں۔ آج طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

(سلمیٰ رحمٰن کی آواز کی طرف اس طرح کان لگاتی ہے جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ روبینہ ایک پلیٹ اس کے سامنے رکھ کر) اس میں سلائس ہیں۔ (دوسری پر اس کا ہاتھ رکھ کر) یہ انڈے ہیں۔ (پھر رحمٰن کی طرف دیکھ کر) آپ تو دو تین دن سے فیکٹری نہیں گئے۔

رحمٰن : اس سے بزنس چوپٹ نہیں ہوجائے گا۔ اگر آپ کا حکم ہے تو ابھی چلا جاتا ہوں۔

روبینہ : (ہنس کر) اس قدر سعادت مندی کی بھی ضرورت نہیں ہے کچھ دن اور آرام کر لیجیے۔

رحمٰن : (پیالی میز پر رکھ کر) بہرحال کام ضروری ہے۔ (کھڑے ہوکر) میں فیکٹری جا رہا ہوں۔

روبینہ : (ہنس کر) آپ تو سچ مچ برا مان گئے۔ (رحمٰن کوئی جواب نہیں دیتا اور کمرے سے چلا جاتا ہے) چالیس سال کی عمر میں بھی نخرے کرنے سے باز نہیں آئے (سلمیٰ کی طرف دیکھ کر) ارے آپ نے تو کچھ لیا ہی نہیں۔ (سلمیٰ خاموش رہتی ہے) آپ کیا سوچنے لگیں۔

سلمیٰ : (گھبرا کر) جی کچھ نہیں۔ (ٹٹول کر میز سے پیالی اٹھانا چاہتی ہے۔ روبینہ پیالی اٹھا کر اسے دیتی ہے۔ سلمیٰ پیالی لے کر) آپ کے صاحب کی آواز جانی پہچانی معلوم ہوتی ہے۔ نام کیا ہے۔

روبینہ : اکثر آوازوں میں دھوکا ہوجاتا ہے۔ ارے کچھ اور لیجیے نا۔

سلمیٰ : بس شکریہ۔

روبینہ : آپ نے انڈا تو لیا ہی نہیں۔ (سلمیٰ گردن ہلا کر انکار کرتی ہے۔ روبینہ دروازے کے پاس جا کر) شاہ بابا۔ شاہ بابا۔

سلمیٰ : (آہستہ سے) شاہ بابا۔

(شاہ بابا کمرے میں آتا ہے اس کے ہاتھ میں ایک جھولا ہے۔ اس کی نظر سلمیٰ پر پڑتی ہے اور چہرے پر حیرت کے آثار پیدا ہوتے ہیں روبینہ اسے

دیکھ کر)

روبینہ : بازار جارہے ہو بابا۔

(شاہ بابا کی نظریں اب بھی سلمٰی پر ہیں اور حیرت کم نہیں ہوئی ہے کہ انوری کمرے میں آکر)

انوری : کمرہ تیار ہوگیا ہے۔

روبینہ : (سلمٰی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر) آپ تھوڑی دیر آرام کرلیجیے (انوری سے) سلمٰی بہن کو ان کے کمرے میں لے جا۔ (سلمٰی کھڑی ہو جاتی ہے۔ انوری اس کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف لے جاتی ہے) یہ تیری ذمے داری ہے کہ انھیں کوئی تکلیف نہ ہو۔

(انوری اور سلمٰی کمرے سے چلی جاتی ہیں۔ روبینہ شاہ بابا کو دیکھ کر)

روبینہ : آپ بازار جارہے ہیں شاہ بابا۔

شاہ بابا : ہاں بیٹا۔ مگر یہ سلمٰی بی بی۔

روبینہ : (بات کاٹ کر) آپ کے وہ صاحب بہادر بلا کھائے پیے بیماری کی حالت میں فیکٹری چلے گئے ہیں۔

شاہ بابا : اچھا۔ مگر یہ سلمٰی بی بی۔

روبینہ : انھیں میں لائی ہوں۔

شاہ بابا : آپ لائی ہیں! کیا آپ کو معلوم ہے کہ —

روبینہ : ہاں بابا مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ میں ان دونوں کے بیچ میں آگئی۔

شاہ بابا : نہیں بیٹا۔ تم ان کے بیچ میں نہیں آئیں۔ رحمٰن میاں نے خود ان سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔

روبینہ : رحمٰن میاں نے ملنا چھوڑ دیا تھا!

شاہ بابا : جی ہاں۔ (روبینہ سوالیہ نظروں سے شاہ بابا کو دیکھتی ہے۔ شاہ بابا کچھ دیر خاموش رہ کر) میں بازار جارہا ہوں۔ رحمٰن میاں کو فیکٹری میں دیکھ لوں گا اگر

طبیعت ٹھیک نہ ہوئی تو...

روبینہ : (بات کاٹ کر) مگر شاہ بابا انھوں نے سلمٰی سے ملنا کیوں چھوڑ دیا تھا۔

شاہ بابا : رحمٰن میاں نے مجھے صرف اتنا بتلایا تھا کہ سلمٰی بی بی پیسے کو بہت اہمیت دیتی ہیں۔

روبینہ : یہ تو کوئی خاص بات نہ ہوئی۔

شاہ بابا : جی ہاں۔ شاید سلمٰی بی بی کے گھر کی حالت اچھی نہیں تھی۔

روبینہ : (سوچتے ہوئے) کیا اس زمانے میں رحمٰن کی مالی حالت۔

شاہ بابا : (بات کاٹ کر) ارے نہیں بیٹا۔ مکانات تھے دکانیں تھیں۔ اچھا کاروبار تھا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ (روبینہ خاموش رہتی ہے) بیٹا میں بازار سے واپسی پر رحمٰن میاں کو فیکٹری میں دیکھتا آؤں گا۔

(جانے کے لیے مڑتا ہے۔ روبینہ سوچتے ہوئے)

روبینہ : شاہ بابا۔ (شاہ بابا مڑ کر دیکھتا ہے) سلمٰی کو یہ پتا نہ چلے کہ وہ کہاں رہ رہی ہے۔

شاہ بابا : اچھا بیٹا۔

(دروازے کی طرف مڑتا ہے)

(پردہ)

دوسرا سین

منظر

(وہی کمرہ پندرہ دن بعد۔ سلمٰی کھڑکی کے پاس کرسی پر بیٹھی ہے۔ کھڑکی میں سے دھوپ آرہی ہے۔ رحمٰن پاس ہی کھڑا سگریٹ پی رہا ہے (سلمٰی کچھ دیر خاموش رہ کر)

سلمٰی : آپ کہاں ہیں۔

رحمٰن : میں تمھارے پاس ہوں سلمٰی۔

سلمٰی : عجیب اتفاق ہے آپ کا نام اور آواز جانی پہچانی معلوم ہوتی ہے۔

رحمٰن : (اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر) جی ہاں اتفاق ہی ہے۔

سلمیٰ : اور جب آپ میرے پاس ہوتے ہیں تو آپ بھی جانے پہچانے معلوم ہوتے ہیں۔

(رحمٰن خاموش رہتا ہے اسی وقت روبینہ کمرے میں آتی ہے۔ اسے دیکھ کر رحمٰن کاندھے پر سے ہاتھ ہٹا لیتا ہے۔ روبینہ تھوڑی دیر دروازے پر رکتی ہے پھر آگے بڑھتے ہوئے)

روبینہ : ارے سلمیٰ بہن آپ یہاں ہیں۔

سلمیٰ : (چہرہ روبینہ کی طرف کرتے ہوئے) وہاں اکیلے میں جی گھبراتا ہے اور دھوپ بھی نہیں آتی۔

روبینہ : باغیچہ میں کرسی رکھوا لیا کیجیے (اونچی آواز سے) انوری۔ ارے انوری (رحمٰن کے پاس جاکر) امی کی طبیعت کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔

رحمٰن : کل میں نے برابر فون سے کانٹکٹ کرنے کی کوشش کی مگر نہ ہوسکا۔ ابھی فیکٹری جاؤں گا تو پھر کوشش کروں گا۔

روبینہ : ان کی بیماری تشویش ناک تھی۔ کسی کو وہاں سے اطلاع تو دینا چاہیے تھا میرا دل ہولوں پر ہے (انوری آتی ہے اسے دیکھ کر) انوری سلمیٰ بہن کو باغیچہ میں لے جاؤ میں وہیں آرہی ہوں۔

(انوری سلمیٰ کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے لے جاتی ہے۔ رحمٰن کچھ دیر خاموش رہ کر)

رحمٰن : روبینہ! شاید سلمیٰ مجھے پہچان گئی ہے۔

روبینہ : کہاں کی برائی ہے پہچان لینے دیجیے۔

رحمٰن : (بیزاری سے) اس طرح تم اسے سزا دینا چاہتی ہو یا مجھے۔

روبینہ : سزا؟

رحمٰن : ہاں سزا۔ ذرا سوچو اگر اس کو یقین ہوگیا کہ میں وہی رحمٰن ہوں تو اس کی حالت کیا ہوگی۔

روبینہ : (ہنس کر) اس سے شادی کر لیجیے گا۔ مجھے اندھی سوکن سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔

رحمٰن : (بگڑ کر) روبینہ۔ میں ایسا مذاق پسند نہیں کرتا۔

روبینہ : میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ آخر ایک معمولی بات پر آپ نے اسے کیوں چھوڑ دیا۔ ہر جوان لڑکی مستقبل کے اچھے خواب دیکھتی ہے۔

رحمٰن : وہ کوئی معمولی بات نہیں تھی اس کے پورے کردار کی نمائندگی کرتی تھی۔

روبینہ : شادی کے پہلے لڑکی کیسے ہی حسین خواب کیوں نہ دیکھے مگر شادی کے بعد وہ گھٹیا سے گھٹیا مرد کو برداشت کرتی ہیں کیوں کہ وہ بیچاریاں بیویاں بن جاتی ہیں۔

رحمٰن : اور آپ بھی مجھے گھٹیا سمجھ کر برداشت کر رہی ہیں۔

روبینہ : ایسی بات تو نہیں ہے لیکن مجھے یہ حق ضرور ہے کہ میں پوچھوں کہ فیکٹری کی لیڈی کلرک ہر تین چار مہینے میں کیوں بدل دی جاتی ہیں۔

رحمٰن : اس لیے کہ وہ فیکٹری کے لیے فائدہ مند نہیں ہوتیں۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) روبینہ تم مجھ پر کبھی بھروسہ نہیں کرسکتیں۔

روبینہ : اگر بھروسہ نہیں ہوتا تو یہ آٹھ نو سال کیسے گزرتے۔

رحمٰن : میرے تو صلیب پر گزرے ہیں۔

روبینہ : (رحمٰن کی بات پر دھیان نہ دے کر) میں نے تو آپ کے ان بچوں پر بھی اعتراض نہیں کیا جو آپ نے یتیم خانے میں داخل کردیے۔

رحمٰن : (ذرا بلند آواز سے) روبینہ۔

روبینہ : کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں۔

رحمٰن : (ٹھنڈی سانس بھر کر)۔ روبینہ سچ بات تو یہ کہ تمھیں شوہر کی نہیں اپنی فیکٹری کے لیے ایک منیجر کی ضرورت تھی اور وہ بدقسمت مرد میں تھا جس پر تمھاری نظر انتخاب پڑی۔

روبینہ : (طنزیہ) ارے شوہر صاحب۔ ایسی بھی بداعتقادی کیا۔ بخدا مجھے ایک نیک اور صالح شوہر کی ضرورت تھی منیجر کی نہیں۔

رحمٰن : (بیزاری سے) عورت سے سمجھ داری کی بات کرنا اپنی عقل کا دیوالیہ نکالنا ہے۔

روبینہ : (ہنس کر) میں نے کب کہا کہ اپنی عقل کا دیوالیہ نکالیے۔

رحمٰن : سلمٰی کو یہاں لاکر تم نے میرے تھوڑے بہت سکون کو بھی غارت کرنے کی کوشش کی ہے اور۔

روبینہ : (بات کاٹ کر) رحمٰن۔ (طنزیہ) سلمٰی ابھی بھی انوری سے خوبصورت اور صحت مند ہے۔

رحمٰن : (بیزاری سے) روبینہ اگر تم مجھے یونہی پل پل مارتی رہنا چاہتی ہو تو بہتر ہے کہ (فون کی گھنٹی بجتی ہے رحمٰن خاموش ہوکر ریسور اٹھا کر) ہلو۔ ذرا اونچی آواز سے) ہلو۔ہاں میں رحمٰن بول رہا ہوں (کچھ دیر خاموشی سے سنتا رہتا ہے پھر ریسور رکھ کر کچھ دیر خاموشی سے روبینہ کو دیکھتا رہتا ہے۔ پھر روبینہ کے پاس آکر) تمھارے لیے ایک بری خبر ہے (روبینہ کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہوتی ہے) تمھیں پہلی فلائٹ سے دلی جانا ہے۔

روبینہ : تو امی۔ (آواز رندھ جاتی ہے اور آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) مگر...

رحمٰن : (روبینہ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر) حوصلہ رکھو روبینہ حوصلہ۔ خدا کی مرضی سے لڑا نہیں جاسکتا۔ (روبینہ کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور بار بار آنسو پونچھتی ہے رحمٰن فون اٹھا کر نمبر ڈائل کر کے) بصیر صاحب۔ پہلی فلائٹ سے ایک سیٹ دلی کے لیے بک کرادیجیے۔ روبینہ کو فوراً دلی جانا ہے۔ٹھیک ہے آپ پرسنلی جاکر انتظام کردیجیے (ریسور رکھ کر کھڑکی کے پاس جاکر بلند آواز سے) انوری۔ او انوری— یہاں آؤ۔ (پھر روبینہ کے پاس آکر) کل صبح کی فلائٹ سے میں بھی دلی پہنچ جاؤں گا۔ فیکٹری کے ایک دو ضروری کام آج ہی نمٹانا ہیں۔ (روبینہ نظریں اٹھا کر رحمان کو دیکھتی ہے) اگر تم کہو تو میں ساتھ چلا چلوں۔

روبینہ : (کھڑی ہوجاتی ہے) جب ایک ہی سیٹ بک کرائی ہے تو میں ہی چلی جاؤں گی۔ (رحمٰن کچھ کہنا چاہتا ہے کہ انوری اور سلمٰی کمرے میں آتے ہیں رحمٰن ان دونوں کو دیکھ کر)

رحمٰن : انوری روبینہ کو ابھی دلی جانا ہے تم ان کا سامان تیار کردو۔

انوری : (حیرت سے) ابھی—

رحمٰن : ہاں ابھی۔ ان کے یہاں ایک حادثہ ہوگیا ہے۔

سلمٰی : کیسا حادثہ؟

رحمٰن : ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا ہے۔

سلمٰی : والدہ کا انتقال۔

(ہاتھ آگے بڑھا کر تیزی سے آگے بڑھتی ہے کہ ایک کرسی سے ٹکراجاتی ہے۔ رحمٰن اسے سہارا دے کر ایک کرسی پر بٹھلا کر)

رحمٰن : آپ بیٹھ جایئے۔

سلمٰی : (ٹھنڈی سانس بھر کر) جانے بدقسمتی میرے آگے کیوں چلتی ہے۔ مجھے جہاں پناہ ملتی ہے حادثے وہاں کا راستہ دیکھ لیتے ہیں۔

رحمٰن : لیکن۔

سلمٰی : (بات کاٹ کر) اب دیکھیے نا جس روز میں اپاہج آشرم میں داخل کی گئی اسی دن وہاں آگ لگ گئی اور ایک بوڑھی عورت جل کر مرگئی۔ یہاں آئی تو... آخر خدا میرے لیے اتنا ظالم کیوں ہوگیا ہے۔

(سب خاموش رہتے ہیں۔ کچھ دیر بعد رحمٰن انوری سے)

رحمٰن : جاؤ اور ان کا ضروری سامان تیار کردو۔

(انوری جانے کے لیے مڑتی ہے۔ روبینہ اسے جاتے ہوئے دیکھ کر)

روبینہ : انوری سلمٰی بہن کو ان کے کمرے میں پہنچادو۔ تھوڑی دیر آرام کرلیں گی۔ اور سن لے میری غیرموجودگی میں انھیں کوئی تکلیف نہ ہو۔

(انوری سلمٰی کا ہاتھ پکڑ کر لے جاتی ہے۔ رحمٰن روبینہ کے پاس آکر)

رحمٰن : آپ کب تک واپس آجائیں گی۔

روبینہ : اب یہ تو وہاں کے حالات پر ہے۔

رحمٰن : جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اب اور کیا حالات ہوں گے۔

روبینہ : کیوں۔ وہاں کی جائداد۔

رحمٰن : اب ہمیں کسی جائداد کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے بہت ہے۔

روبینہ : آپ کو ضرورت نہ ہو مجھے تو ہے میرے پاس کیا رکھا ہے۔

رحمٰن : یہ فیکٹری کسی کو دان میں دینے کا ارادہ ہے۔

روبینہ : جب میں کوئی چیز کسی کو سونپ دیتی ہوں تو پھر اسے اپنی نہیں سمجھتی۔

رحمٰن : تو گویا فیکٹری آپ مجھے خیرات میں دے چکی ہیں۔

روبینہ : خیرات کا لفظ تو بہت گھٹیا ہے۔ آپ تحفے کا لفظ استعمال نہیں کر سکے تھے (اسی وقت شاہ بابا کمرے میں آتا ہے اس کے آنکھوں میں آنسو ہیں۔ روبینہ کی طرف دیکھ کر)

شاہ بابا : بیٹا۔

(روبینہ مڑ کر شاہ بابا کو دیکھتی ہے کچھ دیر اپنی جگہ پر کھڑی رہتی ہے۔ پھر دوڑ کر شاہ بابا سے لپٹ کر اس طرح ہچکیوں سے رونے لگتی ہے جیسے اس کے صبر کا بند ٹوٹ گیا ہو شاہ بابا اس کی پیٹھ تھپ تھپا کر)

شاہ بابا : صبر کرو بیٹا صبر۔ خدا کی مرضی میں کسے دخل ہے۔

روبینہ : (شاہ بابا سے الگ ہو کر) مگر شاہ بابا۔

شاہ بابا : جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب چارہ ہی کیا رہ گیا ہے۔

روبینہ : (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہاں شاہ بابا۔ اب صبر ہی تو کرنا ہے۔

شاہ بابا : (روبینہ کو ایک کرسی پر بٹھلا کر) انسان اس دنیا سے چلا جاتا ہے اور اپنی یادیں چھوڑ جاتا ہے۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) ایسی نیک بیویاں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر رحمٰن سے) رحمٰن میاں آپ کے دلی جانے کی تیاری کر دوں۔

رحمٰن : میں کل جاؤں گا شاہ بابا۔ کچھ ضروری کام ہیں۔ آپ روبینہ کے ساتھ

ایرپورٹ چلے جانا۔

(کمرے سے چلا جاتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد)

شاہ بابا : انھیں بھی آپ ہی کے ساتھ جانا چاہیے۔

روبینہ : (طنزیہ) شاہ بابا۔ ضروری کاموں سے اہم عزیز و اقارب تو ہونہیں سکتے (کھڑی ہوکر) میں جانے کی تیاری کرلوں۔ آپ گھر کا خیال رکھنا۔

(کمرے سے چلی جاتی ہے۔ شاہ بابا خاموش کھڑا رہتا ہے)

(پردہ)

تیسرا سین

(وہی کمرہ ایک ماہ بعد۔ رحمان صوفے پر بیٹھا سگریٹ پی رہا ہے اور خیالات میں کھویا ہوا ہے اس کے سامنے میز پر چائے کی پیالی رکھی ہے۔ شاہ بابا فرش پر پڑا اخبار اٹھا کر میز پر رکھتا ہے۔ پھر پہلے رحمٰن کو اور پھر چائے کی پیالی کو دیکھ کر)

شاہ بابا : رحمٰن میاں چائے ٹھنڈی ہوگئی دوسری لے آؤں۔ (رحمٰن نظریں اٹھا کر شاہ بابا کو دیکھتا ہے پھر پیالی اٹھا کر چائے کا گھونٹ لیتا ہے۔ شاہ بابا کچھ دیر خاموش رہ کر) کل بٹیا کا فون آیا؟

رحمٰن : ہاں شاہ بابا۔

شاہ بابا : کب تک واپس آرہی ہیں۔

رحمٰن : مجھے نہیں بتلایا۔ (طنزیہ) ابھی وہاں ضروری کام نمٹا رہی ہیں۔

شاہ بابا : ایک مہینا ہوگیا اب تو یہ گھر کاٹنے کو دوڑنے لگا۔

رحمٰن : رات میں سلمٰی کو بخار تو نہیں آیا۔

شاہ بابا : نہیں۔ مگر ان چھے سات دنوں میں وہ بہت کمزور ہوگئی ہیں (کچھ دیر خاموش رہ کر) ان کی دیکھ بھال میں آپ خود بیمار نظر آنے لگے ہیں۔ (رحمٰن خاموش

رہتا ہے) اگر آپ دو چار دن کے لیے دلی چلے جاتے تو اچھا تھا۔ (وہاں شاید بٹیا کو آپ کی ضرورت ہو۔

رحمٰن : (تلخ لہجے میں) انھیں کب میری ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

شاہ بابا : میرا مطلب یہ ہے کہ بعض معاملات میں آپ انھیں مشورہ دے سکتے ہیں۔

رحمٰن : (شکست خوردہ لہجے میں) انھوں نے کب میرے مشوروں پر عمل کیا ہے (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) میں نے انھیں مشورہ دیا تھا کہ اب کسی جائداد کے چکر میں نہ پڑو ہمارے پاس جو کچھ ہے بہت ہے۔ انھوں نے کب میرا مشورہ مانا۔

شاہ بابا : اگر وہ اپنا حق حاصل کرنا چاہتی ہیں تو کون سی برائی ہے۔

رحمٰن : برائی تو کوئی نہیں۔ (تلخ لہجے میں) مگر وہ ایسی عورت ہے جسے دوسروں کو دکھ پہنچانے میں مزا آتا ہے اور یہ بھی دکھ پہنچانے کا ایک طریقہ ہے (شاہ بابا خاموش رہتا ہے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر) آپ آج اور سلمٰی کو ڈاکٹر روما سے چیک کرالینا۔

شاہ بابا : کل ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا اب وہ ٹھیک ہیں کسی دوا کی ضرورت نہیں۔

انوری : (کمرے میں آکر) شاہ بابا۔ کیا بازار جانے کا ارادہ نہیں ہے۔ پھر کھانے میں دیر ہوجائے گی۔ (رحمٰن کی طرف دیکھ کر خفیف سے طنز سے) آج تو آپ فیکٹری جائیں گے۔

رحمٰن : (غصہ سے) ہاں اب سلمٰی ٹھیک ہے گھر پر رہنا ضروری نہیں۔

انوری : شاہ بابا۔ پھر تو آپ جلدی بازار چلے جایئے۔ سامان کا پرچہ کچن میں میز پر رکھا ہے (شاہ بابا جانے کے لیے مڑتا ہے) اور ذرا جلدی آجانا وہیں بازار میں بیٹھ نہ رہنا۔ (شاہ بابا۔ مڑ کر اس طرح انوری کو دیکھتا جیسے اسے انوری کا یہ تحکمانہ لہجہ پسند نہ آیا ہو۔ رحمٰن بھی اسے محسوس کرلیتا ہے۔ (شاہ بابا رحمٰن سے)

شاہ بابا : رحمٰن میاں اگر آپ اجازت دیں تو میں دو چار دن کے لیے دلی چلا جاؤں۔ بٹیا بہت یاد آنے لگی ہے۔

رحمٰن : دو چار دن میں شاید روبینہ خود ہی آجائے گی اگر نہ آئے تو چلے جانا (شاہ بابا

ایک مرتبہ پھر انوری کو دیکھتا ہے اور کمرے سے چلا جاتا ہے رحمٰن انوری کو دیکھ کر) شاہ بابا پر حکم چلانے کا اختیار تمھیں کس نے دے دیا ہے۔ دیکھو انوری اپنی کھال سے باہر نکلنے کی کوشش مت کرو۔

انوری : ہم جیسے بے حیاؤں کی بھی کوئی کھال ہوتی ہے جس سے باہر نکلنے کی وہ کوشش کریں۔ مجھے یتیم خانے بچے کو دیکھنے جانے کی جلدی ہے۔آٹھ دن سے سلمٰی بیگم کی خدمت سے فرصت ہی نہیں ملی۔

رحمٰن : روبینہ کو آجانے دو پھر چلی جانا ابھی سلمٰی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

انوری : آٹھ دن پہلے جب اسے دیکھنے گئی تھی اس کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔

رحمٰن : اور تم نے مجھے بتلایا بھی نہیں۔

انوری : بتلانے سے کیا فائدہ ہوتا۔ بے باپ کا سہی مگر ابھی ماں تو موجود ہے۔

رحمٰن : (غصہ سے) انوری۔

انوری : کیا جھوٹ کہہ رہی ہوں۔اگر باپ ہوتا تو یتیم خانے میں کیوں پرورش ہوتی۔ (جانے کے لیے مڑتی ہے)

رحمٰن : سنو۔ (انوری اپنی جگہ پر رک جاتی ہے مگر مڑ کر نہیں دیکھتی) سلمٰی کو یہاں پہنچا جاؤ مگر احتیاط سے ابھی وہ کمزور ہے۔

(انوری چلی جاتی ہے۔ رحمٰن سگریٹ جلاتا ہے اور پھر صوفے پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد سلمٰی کمرے میں آتی ہے۔ انوری دروازے ہی پر رک جاتی ہے۔ رحمٰن کھڑے ہو کر سلمٰی کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھلاتا ہے۔ انوری نفرت سے دونوں کو دیکھتی ہے اور دروازہ بند کر کے چلی جاتی ہے۔)

رحمٰن : اب طبیعت کیسی ہے۔

سلمٰی : اب تو بالکل ٹھیک ہے (رحمٰن کی طرف منہ کر کے) آپ کو میری وجہ سے بڑی تکلیف اٹھانا پڑی۔

رحمٰن : تکلیف! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ یہ تو میرا فرض تھا۔

سلمٰی : شاہ بابا کہہ رہے تھے آپ کی طبیعت بھی خراب ہوگئی ہے۔

رحمٰن : شاہ بابا کو شک ہوا ہوگا میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں۔

سلمٰی : انوری بھی کہہ رہی تھی۔

رحمٰن : بکواس کرتی ہے۔

(اسی وقت انوری دروازہ کھول کر)

انوری : آپ کھانا کھا کر جائیں گے یا لنچ ٹائم میں آئیں گے۔

(انوری کے چہرے پر شریر مسکراہٹ ہے)

رحمٰن : لنچ ٹائم میں آؤں گا۔

(انوری دروازہ بند کر کے چلی جاتی ہے)

سلمٰی : روبینہ کب تک آئیں گی۔

رحمٰن : خدا بہتر جانتا ہے یا پھر روبینہ۔

سلمٰی : آپ دلی نہیں گئے انھیں دکھ ہوا ہوگا۔

رحمٰن : اب میری مصروفیت کا تو آپ کو علم ہے۔

سلمٰی : دو چار دن تو نکالے جاسکتے تھے۔ آٹھ دن تو آپ میرے پلنگ کی پٹی سے لگے بیٹھے رہے۔ مجھے کس قدر شرمندگی ہوئی۔

(انوری پھر دروازے میں آکر)

انوری : آج سویٹ ڈش میں کیا بناؤں۔

رحمٰن : (غور سے انوری کو دیکھ کر) کیا تم ہر روز مجھ سے پوچھ کر بناتی ہو۔

انوری : (طنزیہ) مالک سے پوچھ لینا اچھا ہوتا ہے۔

رحمٰن : جو تمھارا جی چاہے بنالو۔

انوری : سلمٰی بیگم سے پوچھ لیجیے (طنزیہ دروازہ بند کر کے چلی جاتی ہے۔ (رحمٰن غصہ سے) جب سے روبینہ گئی ہے اس کا دماغ بھی خراب ہوگیا ہے۔ لاکھ مرتبہ کہا کہ اسے دفان کرو مگر انھیں جانے اس سے کیا محبت ہے۔

سلمیٰ : وہ نیک دل خاتون ہیں سوچتی ہوں گی کہاں در بدر ٹھوکریں کھاتی پھرے گی۔

رحمٰن : ان کی نیک دلی دوسروں کے لیے تکلیف دہ ہوجاتی ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) روبینہ نے آپ کی زندگی کے المیہ کے بارے میں بتلایا سن کر بہت دکھ ہوا۔

سلمیٰ : (ٹھنڈی سانس بھر کر) اس کے بارے میں میں بہت کچھ بھول چکی ہوں جو کچھ یاد ہے وہ بھی بھول جاؤں گی مگر ایک بات کبھی نہیں بھول سکوں گی کہ رحمٰن نے مجھے غلط سمجھا۔

رحمٰن : ممکن ہے اسے غلط فہمی ہوئی ہو۔

سلمیٰ : ہوسکتا ہے مگر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اس کی غلط فہمی کی سزا میں بھگتوں۔ وہ ایک خودغرض اور کم فہم انسان تھا۔

رحمٰن : خودغرض!

سلمیٰ : (جذباتی انداز میں غصہ سے کھڑی ہوکر) ہاں خودغرض۔ اسے کوئی مال دار عورت مل گئی ہوگی اور وہ اس کے ساتھ عیش کررہا ہوگا اور میں... (خاموش ہوجاتی ہے غصہ سے چہرہ سرخ ہوجاتا ہے رحمٰن شرمندگی اور بے بسی سے اس کا چہرہ دیکھتا ہے پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھلاتے ہوئے)

رحمٰن : آپ بیٹھ جایئے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے ایک غلط موضوع چھیڑ کر آپ کو دکھ دیا۔

سلمیٰ : (بیٹھتے ہوئے) یہ موضوع تو چوبیس گھنٹے میرے دماغ میں چڑھا رہتا ہے۔ اور اس وقت تک چڑھا رہے گا جب تک میں مر نہ جاؤں یا ایک بار مجھے رحمٰن مل نہ جائے کہ میں اس سے کہہ سکوں کہ وہ کس قدر خودغرض اور کمینہ ہے۔ (رحمٰن بیچارگی سے سلمیٰ کو دیکھتا ہے۔ سلمیٰ کچھ دیر خاموش رہ کر) معاف کیجیے گا میں کچھ زیادہ جذباتی ہوگئی تھی۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) مگر کیا کروں دل میں جو لاوا کھدک رہا ہے وہ ذرا سی ٹھیس سے اُبل پڑتا ہے۔

رحمٰن : آپ صبر کیجیے ممکن ہے خدا اُسے کوئی بڑی سزا دے رہا ہو۔

سلمٰی : (جذباتی انداز میں) انسان کے آپسی مسائل کا فیصلہ کرنا صرف انسان کا حق ہے۔ انسان کو حق ہے کہ وہ اپنے گنہگار کو خود سزا دے۔ کیا خدا اسے یہ سزا دے گا کہ میری طرح اندھا کردے۔ نہیں مجھے یہ امید نہیں۔

رحمٰن : واقعی آپ کے ساتھ ظلم ہوا ہے (اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر) صبر کیجیے خدا ایک دن...

انوری : (دروازے میں آکر) آپ کا فون ہے۔

رحمٰن : (سلمٰی کا ہاتھ چھوڑ کر) کس کا فون ہے۔

انوری : دلی سے ہے۔ (رحمٰن کھڑا ہوتا ہے) اس سے پہلے بصیر صاحب نے بھی فون کیا تھا۔ (طنزیہ مسکراہٹ سے) میں نے کہہ دیا تھا کہ آپ مصروف ہیں۔

رحمٰن : (طنز کو محسوس کر کے غصہ سے) کیوں کہہ دیا تھا ممکن ہے انھیں کوئی ضروری کام ہو۔

انوری : آپ ہی تو کہتے ہیں وہ الٹے سیدھے فون کر کے پریشان کرتے ہیں... فون یہیں لے آؤں۔

رحمٰن : نہیں۔ میں وہیں اٹینڈ کرلوں گا۔ سلمٰی بیگم کو ان کے کمرے میں پہنچا دو۔
(رحمٰن کمرے سے چلا جاتا ہے۔ انوری سلمٰی سے)

انوری : آیئے۔ (طنزیہ) نہیں تو رحمٰن میاں آکر پھر ہمدردی جتلانے لگیں گے۔

سلمٰی : (کھڑی ہوکر) کیا مطلب۔

انوری : وہ کسی کو دکھ میں نہیں دیکھ سکتے۔

سلمٰی : روبینہ نے کچھ بتلایا کب آرہی ہیں۔

انوری : میں گھر کی نوکرانی ہوں مجھے کیوں بتلانے لگیں۔ مگر اب انھیں آجانا چاہیے۔ گھر کی حالت بگڑتی جارہی ہے۔

سلمٰی : ایسا کیا ہوگیا۔

انوری : ہوگا کیا۔ اب حکم ہوا ہے کہ شمسہ شام کو آئے گی اچھا انتظام رکھو۔

سلمیٰ : شمسہ کون ہے۔

انوری : رحمان میاں کی نئی سکریٹری ہے۔

سلمیٰ : لیڈی سکریٹری۔

انوری : جی ہاں۔ وہ ہر تیسرے چوتھے مہینے اپنی سکریٹری بدل دیتے ہیں بیچاری مالکن کیا کریں خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی ہیں۔

سلمیٰ : وہ اچھا کام نہیں کرتی ہوں گی۔

انوری : ارے نہیں۔ بس شوق ہے۔ کبھی کبھی تو میاں بیوی اس پر الجھ بھی پڑتے ہیں مگر رحمٰن میاں بھی دُھن کے پکے ہیں۔ اپنی حرکت سے باز نہیں آتے۔ خدا بچائے رحمٰن میاں جیسے مردوں سے... آیئے آپ کو کمرے میں پہنچا دوں اور شمسہ بیگم کے لیے انتظام کروں۔

(سلمیٰ کا ہاتھ پکڑتی ہے)

(پردہ)

چوتھا سین

منظر

(وہی کمرہ۔ آٹھ دس دن بعد۔ رحمٰن کمرے میں ٹہل رہا ہے۔ چہرے سے بیزاری ظاہر ہورہی ہے۔ روبینہ اطمینان سے صوفے پر بیٹھی ایک رسالہ کی ورق گردانی کررہی ہے۔ رحمٰن روبینہ کے پاس آکر رکتا ہے مگر روبینہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتی۔ رحمٰن کچھ دیر اسے دیکھتا رہتا ہے پھر اس کی بے توجہی سے اُکتا کر)۔

رحمٰن : روبینہ۔

روبینہ : ہمنہ۔

رحمٰن : (اکتائے ہوئے لہجے میں) یہ مطالعہ بند کیجیے۔

روبینہ : (رسالہ سامنے میز پر رکھ کر کھڑی ہوجاتی ہے اور رحمٰن کو گھور کر) فرمایئے۔

رحمٰن : یہ سراسر جھوٹ ہے کہ شمسہ یہاں آئی تھی۔

روبینہ : چلیے نہیں آئی ہوگی۔ بس اب تو آپ کو اطمینان ہو گیا۔

رحمٰن : اطمینان مجھے نہیں تمھیں ہونا چاہیے۔

روبینہ : چلیے مجھے بھی ہو گیا۔ (رحمٰن کے چہرے کو غور سے دیکھ کر) ارے آپ کی کنپٹیوں پر بال سفید کب سے ہو گئے جب میں دلی گئی تھی تب تو نہیں تھے۔ ایک مہینے میں...

رحمٰن : (بات کاٹ کر) روبینہ۔

روبینہ : (مسکرا کر) اب آپ خضاب لگالیا کیجیے۔ کچھ دن بعد وگ تو استعمال کرنا ہی پڑے گا۔

رحمٰن : (جھنجھلا کر) روبینہ۔ فی الحال میں تم سے اپنے آنے والے بڑھاپے پر بات کرنا نہیں چاہتا۔

روبینہ : (ہنس کر) وہ تو کوئی مرد بھی نہیں کرتا۔ بیچارہ مرد بڑھاپے سے بہت ڈرتا ہے— ہاں تو کہیے آپ کیا بات کرنا چاہتے تھے۔

رحمٰن : شمسہ کے بارے میں۔

روبینہ : میں مان تو چکی ہوں کہ وہ یہاں نہیں آئی تھی (طنزیہ) کوئی سمجھ دار مرد اپنی لیڈی سکریٹری کو گھر نہیں لاتا۔

رحمٰن : انوری نے سراسر جھوٹ بولا ہے۔

روبینہ : انوری نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔

رحمٰن : تو پھر شاہ بابا نے۔

روبینہ : شاہ بابا ایسے بے وقوف نہیں ہیں کہ میاں بیوی میں جھگڑا کراتے پھریں (موضوع بدلنے کے انداز میں) سلمٰی کیا بیمار ہو گئی تھیں۔

رحمٰن : بخار تھا۔ (میز کے پاس جاتے ہوئے) تم نے اسے یہاں لا کر— (میز پر سے سگریٹ کی ڈبیا اٹھا کر) اسے شک ہو گیا کہ...

روبینہ : ہو جانے دیجیے اور یقین بھی ہو جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔

رحمٰن : تمھارے نزدیک تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

(انوری کمرے میں آکر)

انوری : بیگم صاحبہ کوئی بیگم اشرف آئی ہیں اپنے آپ کو شمسہ بیگم کی والدہ بتلا رہی ہیں۔ انھیں یہاں بلا لاؤں آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔

روبینہ : میں وہیں جا کر مل لیتی ہوں۔

(روبینہ کمرے سے چلی جاتی ہے۔ انوری بھی جانے کے لیے مڑتی ہے)

رحمٰن : انوری۔ شمسہ کی والدہ کیوں آئی ہیں۔

انوری : مجھے کیا معلوم۔

رحمٰن : اور یہ تم نے کیا اڑا رکھی ہے کہ شمسہ یہاں آئی تھی۔

انوری : میں کیوں اڑانے لگی۔ اس گھر میں سلمائیں آئیں یا شمسائیں میری بلا سے۔

(انوری پھر جانے کے لیے مڑتی ہے)

رحمٰن : (غصہ سے) انوری۔ (انوری رک جاتی ہے مگر مڑ کر نہیں دیکھتی) یہ کیا بدتمیزی ہے۔ میں تم سے بات کر رہا ہوں۔

انوری : اور ابھی تھوڑی دیر میں آپ غصہ کریں گے کہ کھانا وقت پر تیار نہیں ہوا۔

رحمٰن : (غصہ سے) میں کہہ چکا ہوں کہ اپنی کھال میں رہا کرو مگر سمجھ میں نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے روٹیاں لگ گئی ہیں۔

انوری : (مڑ کر رحمٰن کو دیکھ کر) محنت کی کمائی کو روٹیاں لگنا نہیں کہتے۔

رحمٰن : (غصہ سے بے قابو ہو کر) اگر نکال باہر کیا تو در در کی ٹھوکریں کھاتی پھروگی۔

انوری : اگر رزق دنیاوی خداؤں کے ہاتھ میں ہوتا تو وہ کسی کو زندہ ہی نہ رہنے دیتے۔

رحمٰن : (بلند آواز سے) انوری۔

انوری : میرا بچہ یتیم خانے میں سسک سسک کر مر گیا اور مجھے یہ موقع نہیں دیا گیا کہ میں اس کی آخری ہچکی کو اپنے سینہ میں چھپا لیتی۔ میں یہاں تیمارداریاں کرتی رہی۔

رحمٰن : کیا مجھے اس کا دکھ نہ ہوا ہوگا۔

انوری : آپ نے تو اسے یتیم خانے میں داخل کر کے اپنا فرض ادا کردیا تھا۔ ایک باپ کی اس سے بڑھ کر اور خوش قسمتی کیا ہوسکتی ہے کہ اس کی اولاد یتیم خانے میں پرورش پائے۔

رحمٰن : (پریشان ہوکر) اوہ انوری۔

انوری : اور یہ بھی سن لیجیے کہ۔

(روبینہ کمرے میں آتی ہے۔ اسے دیکھ کر انوری خاموش ہوجاتی ہے۔ روبینہ دونوں کو مشکوک نظروں سے دیکھ کر)

روبینہ : کیا بات ہے۔

رحمٰن : کوئی بات نہیں۔ (انوری سے) میں کھانا کھا کر جاؤں گا اور ذرا جلدی جانا ہے۔

روبینہ : مسز اشرف آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ یہیں بلا لوں (رحمٰن خاموش رہتا ہے۔ روبینہ انوری سے) انوری شمسہ کی والدہ کو یہاں پہنچا دو۔ (انوری کمرے سے چلی جاتی ہے) آپ انوری پر کس بات پر بگڑ رہے تھے۔

رحمٰن : آپ نے اس کا دماغ خراب کردیا ہے۔ ہزار بار کہا کہ اسے نکال باہر کرو مگر آپ کو اس سے جانے کیوں محبت ہے۔

روبینہ : کیا آپ پسند کریں گے کہ وہ یتیم خانے والے بچے کا سارے شہر میں ڈھنڈورا پیٹتی پھرے۔ تھوڑی بہت پڑھی لکھی ہے اپنی بات ہر طرح سے کہہ سکتی ہے۔

رحمٰن : (بیزاری سے) یتیم خانے کا بچہ یتیم خانے کا بچہ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ—

انوری : (دروازہ کھول کر) آیئے۔

(ایک عورت جس کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہے۔ برقع پہنے ہے مگر نقاب اٹھا ہوا ہے اندر آتی ہے۔ انوری دروازہ بند کردیتی ہے)

روبینہ : (ذرا اونچی آواز سے) انوری۔

انوری : (پھر دروازہ کھول کر) جی۔

روبینہ : چائے دے جاؤ۔

انوری : بہت اچھا۔

(دروازہ بند کردیتی ہے۔ رحمٰن سوالیہ نظروں سے انھیں دیکھتا ہے)

روبینہ : یہ آپ کی نئی سکریٹری شمسہ کی والدہ ہیں۔ بیگم اشرف۔

رحمٰن : تشریف رکھیے۔ فرمایئے کیسے تکلف کی۔

روبینہ : (بیگم اشرف کا ہاتھ پکڑ کر بٹھلاتے ہوئے) تشریف تو رکھیے۔

بیگم اشرف : (کسی قدر پس و پیش کے انداز میں) مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا تھا (رحمٰن کے چہرے پر پریشانی کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ جسے روبینہ محسوس کرلیتی ہے اور اس طرح مسکراتی ہے جیسے رحمٰن کی پریشانی سے لطف اندوز ہورہی ہو۔ بیگم اشرف نظریں جھکا کر) شمسہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

رحمٰن : شمسہ کے بارے میں (کچھ دیر خاموش رہتا ہے جیسے سوال کی نوعیت پر غور کررہا ہو۔ بیگم اشرف نظریں اٹھا کر رحمٰن کا چہرہ دیکھتی ہیں۔ رحمٰن گھبرا کر) جی اچھی لڑکی ہے بہت اچھی۔ میرا مطلب محنتی بہت محنتی۔

روبینہ : (مسکرا کر) تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے اچھی لڑکی ہے تو اچھی لڑکی ہے۔

بیگم اشرف : اس کی تربیت بڑے مذہبی انداز سے ہوئی ہے ہمارا گھرانہ بڑا مذہبی گھرانہ ہے۔

رحمٰن : بڑی خوشی کی بات ہے (روبینہ کی طرف اشارہ کرکے) یہ بھی بڑی مذہبی ہیں۔ (ہنس کر) ابھی کچھ دن تک تو پردہ کرتی تھیں۔

بیگم اشرف : اچھا (رحمٰن کی طرف دیکھ کر) میں تو اس کی نوکری ہی کے خلاف تھی مگر اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالنا پڑے۔

روبینہ : نوکری کرنا کوئی بری بات نہیں ہے مگر کم از کم نوجوان لڑکیوں کو فیکٹری میں نوکری نہیں کرنا چاہیے۔ (بیگم اشرف سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی ہیں) فیکٹری کا ماحول عام دفتروں کے ماحول سے مختلف ہوتا ہے۔

بیگم اشرف : اب کیا کیا جائے بی بی کچھ مجبوریاں بھی ہوتی ہیں۔ (رحمٰن سے) آپ کے

آفس میں کوئی نجم الدین ہے۔ کیسا لڑکا ہے۔

رحمٰن : (سوچتے ہوئے) نجم الدین۔ (پھر جیسے یاد آجانے پر) جی ہاں اکاؤنٹ سیکشن میں کام کرتا ہے۔ میرے پاس تو کبھی اس کی کوئی شکایت نہیں آئی۔

بیگم اشرف : کل اس کی ماں ہمارے یہاں آئی تھیں۔

روبینہ : اچھا پھر کیا خیال ہے آپ کا۔

بیگم اشرف : اب بی بی چھان بین تو کرنا ہی پڑتی ہے۔ آگے لڑکی کی قسمت۔

- : (رحمٰن کی طرف دیکھتی ہے جو سگریٹ جلا رہا ہے۔ پھر بیگم اشرف سے) لڑکیوں کو جلدی نمٹا دینا چاہیے۔ آج کل بدنامی ان کے آگے آگے چلتی ہے۔

بیگم اشرف : جی ہاں بی بی بڑا خراب زمانہ آگیا ہے (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہمارا زمانہ ہی اچھا تھا لڑکیاں پردے میں رہ کر ماں باپ کی نظروں کے سامنے تو رہتی تھیں مگر اس کم بختی ماری مہنگائی نے تو شرافت تک کی جڑیں ہلا کر رکھ دیں (انوری چائے لے کر آتی ہے) آپ نے یہ تکلیف کیوں کی۔

روبینہ : اس میں تکلیف کی کیا بات ہے (انوری سے) جا سلمٰی بہن کو لے آ وہ بھی چائے پی لیں گی۔

رحمٰن : اور کھانا میز پر لگا دینا۔ مجھے ابھی فیکٹری جانا ہے۔

(انوری کمرے سے چلی جاتی ہے۔ روبینہ ایک پیالی بیگم اشرف کو دے کر دوسری رحمٰن کی طرف بڑھاتی ہے)

رحمٰن : نہیں، ابھی میں کھانا کھاؤں گا۔

(روبینہ اور بیگم اشرف خاموشی سے چائے کے گھونٹ لینے لگتی ہیں کہ انوری سلمٰی کو لے کر آتی ہے اور اسے کمرے میں چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ بیگم اشرف کچھ دیر سلمٰی کو دیکھتی رہتی ہیں پھر آہستہ سے)

بیگم اشرف : سلمٰی۔ (سلمٰی اپنا چہرہ بیگم اشرف کی طرف کرتی ہے۔ بیگم اشرف پیالی میز پر رکھ کر کھڑی ہوکر) سلمٰی تو یہاں۔

سلمیٰ : میں آپ کو پہچانی نہیں آواز ضرور جانی پہچانی ہے۔

بیگم اشرف : ارے میں تیری مغلانی بی ہوں۔ تجھے 'قرآن' پڑھایا کرتی تھی۔

سلمیٰ : مغلانی بی۔

(دونوں ہاتھ ان کی طرف یوں بڑھاتی ہے۔ جیسے ان سے لپٹ جانا چاہتی ہو۔ بیگم اشرف آگے بڑھ کر اسے سینہ سے لگا لیتی ہیں۔ سلمیٰ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔ بیگم اشرف کی آنکھوں میں بھی آنسو آجاتے ہیں۔ کچھ دیر بعد بیگم اشرف اسے کرسی پر بٹھلا کر)

بیگم اشرف : بیٹی تیری یہ حالت۔

سلمیٰ : سب قسمت کے کھیل ہیں مغلانی بی۔ اگر روبینہ بہن مجھے سہارا نہ دیتیں تو اپاہج آشرم میں پڑی سڑ رہی ہوتی۔

بیگم اشرف : اور تیرا وہ منگیتر۔

سلمیٰ : (جذباتی انداز میں) اس کا نام نہ لو مغلانی بی اس کا نام لینے سے آپ کی زبان ناپاک ہوجائے گی۔ وہ گندگی کا کیڑا کسی گندی نالی میں سڑ رہا ہوگا۔ اگر وہ مجھے ایک بار مل جائے تو میں اس کی دونوں آنکھیں پھوڑ کر کہوں کہ آؤ ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر بھیک مانگیں۔

(روبینہ رحمٰن کی طرف دیکھتی ہے جس کے چہرے پر کرب کے آثار ہیں اسی وقت انوری کمرے میں آکر)

انوری : کھانا لگا دیا ہے۔

رحمٰن : اچھا۔ (بیگم اشرف کی طرف دیکھ کر) مجھے اجازت ہے آج فیکٹری جلدی جانا ہے۔

(جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے سے چلا جاتا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے انوری بھی جاتی ہے۔

بیگم اشرف : بیچاری بے ماں باپ کی بچی نے بڑے دکھ جھیلے ہیں۔ اللہ نام بس ایک چچا

تھا۔ گھر میں آگ لگی وہ بھی جل کر اللہ کو پیارا ہوگیا۔ پھر اس کا پتا نہ چلا۔ آج نظر آئی۔

سلمٰی : میں بھی جل گئی تھی مغلانی بی۔ اسپتال میں میری آنکھیں جاتی رہیں اور جب انھیں معلوم ہوا کہ میرا کوئی نہیں ہے تو انھوں نے مجھے اپاہج آشرم میں بھیج دیا۔ (کچھ دیر رک کر) شمسہ تو اب بڑی ہوگئی ہوگی۔ اس کی شادی کردی؟

بیگم اشرف : ابھی نہیں۔ اس نے رحمٰن میاں کی فیکٹری میں نوکری کرلی ہے (سلمٰی سوچنے لگتی ہے۔ بیگم اشرف کھڑے ہوکر) اب مجھے اجازت دیجیے۔

روبینہ : ایسی جلدی کیا ہے چلی جایئے گا۔

بیگم اشرف : پھر آؤں گی۔ آپ ذرا نجم الدین کے بارے میں معلومات کیجیے گا۔ ثواب کا کام سمجھ کر۔

روبینہ : آپ مطمئن رہیے۔ میں آج ہی بصیر صاحب کو بلاؤں گی شاہ بابا سے بھی کہوں گی۔ (بیگم اشرف دروازے کی طرف جاتی ہیں۔ روبینہ ان کے ساتھ دروازے تک جاتی ہے۔ بیگم اشرف کمرے سے چلی جاتی ہیں۔ روبینہ واپس سلمٰی کے پاس آکر) بڑی نیک بی بی معلوم ہوتی ہیں۔

سلمٰی : بہت نیک۔ ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں۔ ہم سب لڑکیوں کو گھیر گھیر کر قرآن پڑھاتی تھیں مگر کبھی ایک پیسہ کی روادار نہیں ہوئیں۔

روبینہ : ایسی عورتیں اس زمانے میں غنیمت ہیں آنے والی نسل ان کی صورت دیکھنے کو ترسے گی۔ (فون کے پاس جاکر نمبر ڈائل کرکے) ہلو... شمسہ... ہاں میں تمھیں جانتی ہوں۔ فون بصیر صاحب کو دو... بصیر صاحب وعلیکم السلام۔ رحمٰن فیکٹری پہنچے... ابھی نہیں۔ اچھا... آپ فیکٹری سے اٹھنے کے بعد مجھ سے مل لیجیے گا... نہیں نہیں ابھی نہیں۔

(فون رکھ دیتی ہے)

(پردہ)

پانچواں سین

منظر

(وہی کمرہ پندرہ دن بعد۔ رحمٰن ایک کرسی پر بیٹھا کوئی کتاب دیکھ رہا ہے۔ لیکن اس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر اس کی نظر کتاب پر ہے مگر خیالات کہیں اور ہیں۔ روبینہ اطمینان سے بیٹھی اخبار دیکھ رہی ہے۔ کچھ دیر بعد رحمان کتاب میز پر پھینک کر کھڑا ہوجاتا ہے۔ روبینہ مڑ کر رحمٰن کو دیکھ کر)۔

روبینہ : یادحشت۔ خیریت تو ہے۔

رحمٰن : (اس طرح جیسے خود سے کہہ رہا ہو) میں اس کو برداشت نہیں کرسکتا بھلا یہ بھی زندگی ہے (تیزی سے روبینہ کے پاس جاکر) روبینہ۔ سلمیٰ کو پھر اپاہج آشرم بھیج دو۔

روبینہ : کیوں۔ اب بیچاری سے کیا قصور ہوگیا۔

رحمٰن : قصور وار میں سہی، مجرم میں سہی اور جو الزام ہوں وہ سب مجھ کو منظور۔ مگر اب اس کی موجودگی مجھے پاگل کردے گی۔

روبینہ : (ہنس کر) میں کہہ چکی ہوں کہ اگر آپ اس سے شادی کرلیں گے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

رحمٰن : (اونچی آواز سے) روبینہ۔ (روبینہ اخبار صوفے پر ڈال کر کھڑی ہوتی ہے۔ رحمٰن آواز ذرا نیچے کرکے) کیا تم چاہتی ہو کہ میں برابر اس کے طعنوں بددعاؤں اور ذلیل الفاظ کو برداشت کرتا رہوں جو وہ میرے بارے میں کہتی رہتی ہے۔

روبینہ : اور آپ سمجھتے ہیں کہ اپاہج آشرم میں جاکر وہ آپ کو دعائیں دینے لگے گی۔

رحمٰن : کم ازکم میں سن تو نہ سکوں گا اور اگر تم اسے یہاں رکھنے پر بضد ہو تو میں خود کو اس پر ظاہر کردوں گا۔

روبینہ : (تحکمانہ لہجے میں) آپ ایسا نہیں کریں گے۔

رحمٰن : (غصہ سے) مجھے یہ لہجہ پسند نہیں۔ اور سن لو کہ اب میں خود کو ضرور ظاہر کروں

گا۔ مجھے اس کی کتنی ہی بڑی قیمت کیوں نہ ادا کرنا پڑے۔

روبینہ : (کسی قدر برہم انداز میں) اگر آپ نے یہ فیصلہ کرلیا ہے تو ضرور ظاہر کردیجیے لیکن پھر آپ کو یہ بھی ظاہر کرنا ہوگا کہ گھر کی مامائیں فیکٹری کی گندی مزدور عورتیں، حالات سے مجبور فیکٹری کی لیڈی کلرک سب آپ کے دلال ہیں۔

رحمٰن : (بلند آواز میں غصہ سے) روبینہ۔

روبینہ : چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر آپ یہ سب اسے نہیں بتلائیں گے تو میں بتلا دوں گی۔

(تیز تیز قدموں سے دروازے کی طرف جاتی ہے کہ انوری کمرے میں آکر)

انوری : بیگم صاحبہ۔ شمسہ بی کی والدہ آئی ہیں۔

روبینہ : کیوں (انوری خاموش رہتی ہے۔ روبینہ واپس کمرے کے درمیان آتے ہوئے (انھیں یہیں لے آؤ)۔

(انوری چلی جاتی ہے۔ روبینہ صوفے پر پڑا ہوا اخبار میز پر رکھتی ہے۔ رحمٰن سگریٹ جلا کر دروازے کی طرف جاتا ہے)۔

روبینہ : آپ کہاں چل دیے۔

رحمٰن : وہ آپ سے ملنے آئی ہیں میں یہاں رہ کر کیا کروں گا اور پھر مجھے ایک ضروری کام سے بھی جانا ہے۔

روبینہ : ممکن ہے انھیں آپ ہی سے کوئی کام ہو ضروری کام تھوڑی دیر بعد بھی کیا جاسکتا ہے۔

رحمٰن : مجھے معلوم ہے وہ کیوں آئی ہیں۔ اگر یوں ہے تو یونہی سہی۔ آنے دو انھیں۔

روبینہ : کوئی خاص بات ہے۔

رحمٰن : جو بات بھی ہوگی ابھی سامنے آجائے گی۔

(صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ کے کش لینے لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس نے کوئی فیصلہ کرلیا ہو اور اس پر عمل کرنے کو تیار ہو۔ روبینہ اس کے چہرے کو دیکھتی ہے۔

روبینہ : اگر کوئی ایسی بات ہو جس سے۔

رحمٰن : (بیزاری سے بات کاٹ کر) اب جو بھی بات ہوگی سامنے آجائے گی (طنزیہ لہجے میں) آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

(دونوں خاموش ہوجاتے ہیں مگر روبینہ رحمٰن کے بدلے ہوئے انداز سے سہمی ہوئی معلوم ہوتی ہے مگر کوشش کر کے اپنے چہرے کے تغیرات کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہے کہ بیگم اشرف کمرے میں آتی ہے روبینہ انھیں دیکھ کر)

روبینہ : آیئے (مسکرا کر) بہت دن میں تکلیف فرمائی۔ میں ہر روز آپ کو یاد کرتی رہی۔

بیگم اشرف : شکریہ آپ کی محبت کا۔ (رحمٰن کی طرف دیکھ کر) آپ کی طبیعت اب کیسی ہے۔

رحمٰن : میری طبیعت! میں تو ٹھیک ہوں۔

بیگم اشرف : شمسہ نے بتلایا تھا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ (رحمٰن خاموش رہتا ہے) اگر آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات پوچھوں۔

رحمٰن : (چہرے پر ناگواری کے اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ سگریٹ ایش ٹرے میں ڈال کر کھڑے ہوتے ہوئے) آپ یہی دریافت فرمائیں گی کہ میں نے نجم الدین کو نوکری سے کیوں نکال دیا۔

روبینہ : (حیرت سے) نوکری سے نکال دیا۔

رحمٰن : جی ہاں نکال دیا اور وجہ... (چند سکنڈ رک کر) آپ کو میری بات پر تو یقین آئے گا نہیں۔ بصیر صاحب سے پوچھ لیجیے گا۔

بیگم اشرف : (تذبذب کے لہجے میں) مگر وہ تو اپنے آپ کو بے قصور...

رحمٰن : (بات کاٹ کر) بیگم اشرف عدالت میں قاتل بھی چیخ چیخ کر اپنے آپ کو بے قصور ہی کہتے ہیں۔

(اسی وقت سلمٰی کمرے میں آتی ہے۔ روبینہ اسے دیکھ کر)

روبینہ : ارے سلمٰی بہن۔ (ہاتھ پکڑ کر ایک کرسی پر بٹھلاتے ہوئے) بیٹھیے۔

سلمٰی : انوری نے بتلایا کہ مغلانی بی آئی ہیں۔

بیگم اشرف : (سلمیٰ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر) اچھی تو ہو سلمیٰ۔

سلمیٰ : (بیگم اشرف کی طرف منہ کر کے) دعا ہے آپ کی۔ شمسہ کو نہیں لائیں۔

بیگم اشرف : ہاں۔ اسے گھر پر کچھ کام تھے۔ نوکری چھوڑنے کا کہہ رہی تھی۔

روبینہ : نوکری چھوڑنے کا کیوں۔

بیگم اشرف : اسے فیکٹری کا ماحول پسند نہیں آیا اور سچ پوچھو بی بی تو مجھے بھی اس کے اس فیصلے سے خوشی ہے۔ سلمیٰ تم کسی دن ہمارے یہاں آؤنا۔

روبینہ : لیکن آپ تشریف تو رکھیے۔

بیگم اشرف : بس بی بی اب چلوں گی۔

روبینہ : لیکن چائے تو۔

بیگم اشرف : چائے پینے پھر کبھی حاضر ہو جاؤں گی۔ سلمیٰ بیٹی تو پھر کب ہمارے یہاں آرہی ہو۔

سلمیٰ : کسی دن ضرور آؤں گی مغلانی بی۔

بیگم اشرف : دیکھو آنا ضرور۔ شمسہ بھی تم سے ملنا چاہتی ہے۔

(بیگم اشرف کمرے سے چلی جاتی ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے پھر روبینہ رحمٰن سے)

روبینہ : کیا شمسہ نے استعفا دے دیا ہے۔

رحمٰن : ابھی نہیں۔ لیکن جس وقت دے گی اسی وقت منظور کر لیا جائے گا۔

روبینہ : (طنزیہ) ابھی تو اسے پورے تین مہینے بھی نہیں ہوئے نوکری کرتے۔

رحمٰن : اور اتنے ہی دنوں میں انھوں نے گل کھلانا شروع کر دیے۔

روبینہ : کیسے گل؟

رحمٰن : روبینہ۔ فیکٹری، فیکٹری ہے عشق و محبت کی درس گاہ نہیں۔

روبینہ : عشق و محبت کی درس گاہ!

رحمٰن : جی ہاں جب بھی معلوم کیا یہی معلوم ہوا کہ شمسہ بیگم اور نجم الدین صاحب

اپنی سیٹ سے غائب ہیں اور کینٹین میں بیٹھے محبت کی پینگیں بڑھا رہے ہیں۔

روبینہ : (مسکرا کر جس میں طنز شامل ہے) اور آپ کو یہ پسند نہیں۔ یہ حق تو آپ نے اپنے لیے محفوظ کر رکھا ہے۔

رحمٰن : روبینہ۔

روبینہ : (اس کے غصہ کی پروا نہ کرتے ہوئے) اور آپ نے اپنے اس حق پر ڈاکہ پڑتے دیکھ کر بیچارے نجم الدین کو صدقہ کا بکرا بنا دیا۔

رحمٰن : (غصہ سے) میں نے صدقہ کا بکرا نہیں بنایا اس کے اعمال کا نتیجہ ہے پچیس ہزار کا بینک ڈرافٹ اس کی تحویل سے غائب ہے۔ آٹھ دن سے اس کا پتا نہیں۔

روبینہ : (طنزیہ) آپ نے اپنی سیف میں دیکھ لیا ہوتا۔ کہیں وہاں منتقل نہ ہو گیا ہو۔

رحمٰن : گویا میں چور اور سازشی ہوں کہ پانچ سال کے پرانے ملازم کو سازش کر کے نکال دیا۔ روبینہ تمھاری شکی طبیعت نے میری زندگی کو جہنم بنا دیا ہے۔ تم پل پل اور لمحہ لمحہ میرے وجود کی بے حرمتی کرتی رہتی ہو اور میں برداشت کرتا رہتا ہوں۔

روبینہ : رحمٰن۔

رحمٰن : تم امربیل ہو کہ ہمارے خون کا آخری قطرہ بھی چوس لینا چاہتی ہو۔ تم مجھے دکھ دے کر خوش ہوتی ہو اور مجھ سے محبت، ہمدردی اور خلوص کا ناٹک رچاتی ہو۔

روبینہ : شاید اس وقت تم اپنے حواس میں نہیں ہو رحمٰن۔ میں اس وقت تم سے کسی مسئلہ پر گفتگو کرنا نہیں چاہتی۔

رحمٰن : اور میں آج تم سے ہر مسئلہ پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ انوری کا بچہ یتیم خانے میں مر گیا اور میں دل مسوس کر رہ گیا کہ میں اس کا باپ تھا اور یہ تجویز تمھاری ہی تھی کہ اسے یتیم خانے میں داخل کر دیا جائے۔ تم سلمیٰ کو یہاں لے آئیں کہ...

روبینہ : (بات کاٹ کر) رحمٰن خدا کے لیے۔

رحمٰن : خدا کو درمیان میں نہ لاؤ۔ تم سلمیٰ کو اس لیے لائیں کہ میں گھٹ گھٹ کر زندگی گزارتا رہوں۔ (تیزی سے سلمیٰ کے پاس جا کر سلمیٰ میں وہی رحمٰن ہوں

جس کی تمھیں تلاش ہے۔

سلمٰی : (ایک دم کھڑے ہوکر) آپ۔

رحمٰن : ہاں میں۔ مجھے گالیاں دو بددعائیں دو، میرا منہ نوچ لو میرے کپڑے پھاڑ دو بلکہ میری تکا بوٹی کردو کہ میں اسی لائق ہوں۔

(اس طرح خاموش ہوجاتا ہے جیسے تھک گیا ہو۔ پھر آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس جاتا ہے۔ روبینہ سہمی سہمی سی اس کے پاس جاتی ہے۔ سلمٰی ٹٹولتے ہوئے کمرے سے چلی جاتی ہے۔ روبینہ کچھ دیر خاموش رہ کر)

روبینہ : رحمان۔ (رحمٰن مڑ کر نہیں دیکھتا) رحمٰن۔ بخدا...

رحمٰن : (مڑ کر روبینہ کو دیکھ کر) روبینہ۔ تم میرے ہی اعمال کی چوکیداری کرتی رہیں لیکن کبھی اپنے اعمال پر غور نہیں کیا کہ تم خود کیا کرتی ہو۔ اور تم خود کیا ہو کیسی ہو۔ مجھے کبھی تم نے ذہنی سکون نہیں بخشا اور نہ جسمانی لذت۔ میں نے لاکھ بار کہا کہ تم آپریشن کرالو کہ ہم بھی جسمانی لذت حاصل کرسکیں مگر تم ڈیڈ اسٹون بنی رہیں۔ کب تک میں ڈیڈ اسٹون سے سر پھوڑتا رہتا۔

(باہر سے شور و غل کی آواز۔ رحمٰن کھڑکی میں سے باہر دیکھتا ہے کہ شاہ بابا گھبرایا ہوا کمرے میں آکر)

شاہ بابا : رحمٰن میاں۔ رحمٰن میاں۔ سلمٰی بی بی برآمدے میں سڑک پر گر پڑیں شاید وہ۔

روبینہ : نیچے گر پڑیں۔

(تیزی سے دروازے کی طرف جانا چاہتی ہے رحمٰن اس کا ہاتھ پکڑ کر۔

رحمٰن : اب زیادہ ہمدردی جتلانے کی ضرورت نہیں۔ یہ حادثہ نہیں خودکشی ہے اور اس کی ذمے دار آپ ہیں۔

(روبینہ کرسی پر بیٹھ کر خلا میں دیکھنے لگتی ہے)

(پردہ)

پرچھائیوں کا پیچھا

نالائق

افرادِ تمثیل

(1) منیر (باپ) (2) وقار (منیر کا بڑا لڑکا) (3) فاروق (منیر کا چھوٹا لڑکا) (4) فرزانہ (منیر کی لڑکی) (5) نوری (منیر کی گود لی ہوئی لڑکی) (6) برجیس (ایک نوجوان لڑکی) (7) پسو (ملازم)

پہلا سین

منظر

(فرزانہ کرسی پر بیٹھی ایک موٹی سی کتاب پڑھ رہی ہے۔ آنکھوں پر موٹے فریم کا چشمہ ہے، بال بکھرے ہوئے ہیں لباس کی طرف سے بے پرواہ معلوم ہوتی ہے۔ کچھ دیر بعد فاروق کمرے میں آکر)

فاروق : باجی (فرزانہ برابر کتاب پڑھتی رہتی ہے) باجی۔ (بلند آواز سے) باجی۔ باجی (فرزانہ فاروق کی طرف متوجہ نہیں ہوتی۔ فاروق اکتا کر) باجی، خدا کرے تمہارے مونچھیں اُگ آئیں۔

فرزانہ : (اسی طرح کتاب پر نظریں جمائے جمائے) منے میاں کیا بیہودگی ہے۔

فاروق : (فرزانہ کے پاس صوفے پر بیٹھ کر اس کے ہاتھ سے کتابیں لے کر میز پر رکھ کر) ہم تو آپ کو اپنا خواب سنانے آئے ہیں اور آپ کو کتابوں سے فرصت نہیں (ڈرامائی انداز میں) میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک خوبصورت باغ ہے جس میں طرح طرح کے ہزاروں پھول کھلے ہیں۔ درختوں پر خوبصورت پرندے بیٹھے چہچہا رہے ہیں۔ باغ میں ایک جھولا پڑا ہے جو ہیروں اور موتیوں سے جگمگا رہا ہے۔ اس پر آپ سنہرا تاج پہنے بیٹھی کتاب پڑھ رہی ہیں اور سبز پری آپ کو جھولا جھلا رہی ہے۔

فرزانہ : (سنجیدگی سے) بھئی منے میاں قسم لے لو۔ تمھیں قرض دینے کے لیے میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔

فاروق : ہائے ہائے باجی آپ نے میرے سارے خواب کا ستیاناس کر دیا۔

فرزانہ : کنفیوشس نے کہا ہے کہ اگر کوئی خوشامد کی باتیں کرے تو—

فاروق : (بات کاٹ کر) اگر کنفیوشس نے کچھ کہا تو میں ساری دیوار چین اکھاڑ کر پھینک دوں گا۔ (کھڑے ہو کر) جب دیکھو کنفیوشس نے کہا ہے، ارسطو نے کہا ہے، افلاطون نے کہا ہے، بھنگا چنگا نے کہا ہے۔ انھیں کہنے کے علاوہ کچھ کرنے کو نہیں تھا۔ دن بھر بس بیٹھے بیٹھے کچھ نہ کچھ کہا کرتے تھے۔

فرزانہ : (مسکرا کر) ان بھنگا چنگا کی تعریف؟

فاروق : ارے آپ نہیں جانتیں۔ افریقہ کے ایک قبیلہ کے بڑے پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔

فرزانہ : ان پہنچے ہوئے بزرگ نے کیا فرمایا ہے۔

فاروق : یہ نہ کچھ فرماتے تھے نہ کچھ کہتے تھے۔ بیچارے کالے تھے اس لیے عرض کیا کرتے تھے۔

فرزانہ : عرض کرتے تھے؟ اچھا انھوں نے کیا عرض کیا ہے؟

فارق : عرض کیا ہے کہ آپ جیسی باجی نہ ہو تو زندگی بیکار ہے۔ ارے ہاں اچھا یاد

آیا، آپ انھیں جانتی ہیں (فرزانہ نظریں اٹھا کر فاروق کو دیکھتی ہے) ارے وہ نواب۔ نواب۔ اچھا بھلا سا نام ہے، ویسے نواب بھنڈی کے نام سے مشہور ہیں۔

فرزانہ : نواب بھنڈی۔

فاروق : اپنے ابا جی کے ساتھ لنگوٹی میں پھاگ کھیلا کرتے تھے۔

فرزانہ : تم غلط محاورہ بول گئے۔ شاید کہنا چاہتے ہو کہ لنگوٹیا یار تھے۔

فاروق : جی ہاں۔ جی ہاں۔ لنگوٹیا یار۔

فرزانہ : میں کسی نواب بھنڈی کو نہیں جانتی۔

فاروق : نام تو کچھ اور ہے مگر نواب بھنڈی کے نام سے مشہور ہیں۔

فرزانہ : پھر تو مسخروں کے نواب ہوں گے۔

فاروق : جی نہیں پکے نواب بلکہ اصل نواب اور حرکتیں بھی نوابوں جیسی۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے جانے کیا جی میں سمائی کہ حکم دیا کہ ہماری جاگیر میں صرف بھنڈی کی کاشت ہوگی۔

فرزانہ : اچھا۔ صرف بھنڈی کی کاشت۔

فاروق : جی ہاں۔ پھر لوگوں نے بھنڈی پر وہ تجربات کیے کہ دنیا حیرت زدہ رہ گئی۔ ایک صاحب نے گنے کے برابر بھنڈی پیدا کی تو ایک صاحب نے کدو کی شکل کی کدو سے بڑی۔ اور ایک صاحب نے تو کمال کر دیا۔ ایسی بھنڈی پیدا کی کہ اس پر رین بو کے سات رنگ صاف نظر آتے تھے۔

فرزانہ : (سنجیدگی سے) اچھا۔ اب بہت بکواس ہو چکی تشریف لے جایئے۔

فاروق : ہائے ہائے کلیجے پر آرے چلا دیے باجی آرے۔ اصل بات سنی نہیں اور جانے کا حکم دے دیا۔ (فرزانہ میز پر سے کتاب اٹھاتی ہے۔ فاروق اس کے ہاتھ سے کتاب لے کر) باجی۔ اگر اس قدر کتابیں پڑھنے کے بجائے آپ آٹا گوندھنے اور مسالہ پیسنے کے نئے نئے اسٹائل ایجاد کرتیں تو عورتوں کو

بہت فائدہ پہنچتا۔

فرزانہ : (اکتائے ہوئے لہجے میں) اچھا بھئی اپنی بات جلدی کہو اور چلتے بنو۔

فاروق : نواب بھنڈی کچھ دن کے لیے باہر جا رہے ہیں۔

فرزانہ : جانے دو تمھیں کیا فکر ہے۔

فاروق : پوری بات تو سنیے۔ ان کی ایک لڑکی ہے اور گھر میں کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں۔

فرزانہ : تو پھر ہم کیا کریں۔

فاروق : ہمدردی باجی ہمدردی۔ میں نے ان سے کہا کہ کچھ دن کے لیے ہمارے یہاں بھیج دیجیے تو کہنے لگے۔ میں تمھارے باپ سے ناراض ہوں۔

فرزانہ : ناراض! کیوں؟

فاروق : بس نواب جو ٹھہرے۔ کہنے لگے تمہارے باپ نے بھنڈی کے مقابلے میں ٹنڈے کی تعریف کی تھی۔ بس میں ناراض ہوگیا۔ جب میں نے آپ کی تعریف کی کہ ہماری باجی ایسی ویسی نہیں، افلاطون کی خالا ہیں تب کہیں ہمارے ساتھ بھیجنے پر راضی ہوئے۔

فرزانہ : اچھا تو میں افلاطون کی خالا ہوں۔

فاروق : جی ہاں۔ باجی آپ تو جانتی ہیں میں ایک نمبر کا گدھا ہوں۔

فرزانہ : یہ بات تمھیں بہت دن بعد معلوم ہوئی۔

فاروق : باجی۔ بلکہ گدھوں کا بھی گدھا— میں اسے اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔

فرزانہ : (چونک کر) ساتھ لے آئے ہو۔ کسے ساتھ لے آئے ہو۔

فاروق : نواب بھنڈی کی لڑکی کو۔ میں ابھی اسے آپ کے حضور میں پیش کرتا ہوں۔ (دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ فرزانہ میز پر سے کتاب اٹھاتی ہے کہ نوری تیز تیز کمرے میں آکر)

نوری : باجی۔ کیا اب اس گھر میں سبزی کی دوکان لگے گی۔

فرزانہ : (نوری کو دیکھ کر) کیا مطلب۔

نوری : یہ غفور کی لڑکی یہاں کیوں آئی ہے۔

فرزانہ : کون غفور

نوری : سبزی فروشوں کا چودھری

فرزانہ : مگر منے میاں تو کہہ رہے تھے کہ وہ نواب بھنڈی کی لڑکی ہے۔

نوری : (طنزیہ) نواب بھنڈی۔ نواب ٹنڈا، نواب کدو، نواب چقندر سب ہی کچھ ہے۔ آپ کے کمرے میں اس شان سے بیٹھی ہے جیسے اس کا ہی کمرہ ہو۔

(فرزانہ کتاب میز پر رکھتی ہے۔ چشمہ اتار کر دوپٹے کے پلو سے صاف کرتے ہوئے)

فرزانہ : تو اسے پہچانتی بھی ہے یا نہیں۔ کہیں

نوری : باجی۔ میں اسے خوب پہچانتی ہوں۔ جب میں کالج میں تھی تو یہ بھی تھی۔

فرزانہ : (فکر مندی کے انداز میں کمرے میں ٹہلتی ہے پھر نوری کی طرف دیکھ کر) ابھی تو خاموش رہنا۔ دیکھیں تو کیا بات ہے۔

نوری : بات کیا ہوگی۔ صورت شکل کی اچھی ہے۔ بس منے میاں کو پھانس لیا ہوگا۔

(فاروق اور برجیس کمرے میں آتے ہیں۔ برجیس بے حد مہذب انداز میں فرزانہ کو سلام کرتی ہے۔ فرزانہ گردن ہلا کر جواب دیتی ہے اور برابر اس کو دیکھتی رہتی ہے جیسے اس کے حسن سے متاثر ہوگئی ہو۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ پھر فاروق یہ خاموشی توڑتے ہوئے برجیس سے)

فاروق : یہ ہماری باجی ہیں۔ پیدا ہوتے ہی باجی ہوگئی تھیں اور آج تک باجی ہیں۔ اور ہم پیدا ہوتے ہی منے ہوگئے تھے۔ سچ مچ اپنے منے ہونے پر اب تو ہمیں شرم آنے لگی ہے۔ یہ نوری تک ہمیں منے ہونے پر چڑاتی ہے۔

نوری : میں آپ کو کب چڑاتی ہوں۔

فاروق : اچھا اس دن نہیں کہہ رہی تھی کہ شادی کے بعد جو پہلا لڑکا پیدا ہوگا اس کا نام مُنّے رکھوں گی۔

فرزانہ : منے میاں کیا بدتمیزی ہے۔ (برجیس کی طرف دیکھ کر) نواب صاحب کب تک واپس آجائیں گے۔ مس بھنڈی

برجیس: (حیرت سے) کون نواب صاحب۔ اور یہ مس بھنڈی۔

فرزانہ : مُنّے میاں نے بتلایا تھا کہ آپ نواب بھنڈی کی صاحبزادی ہیں اور نواب صاحب کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔

برجیس : میں کسی نواب بھنڈی کو نہیں جانتی اور نہ میں مس بھنڈی ہوں۔ میرا نام برجیس ہے (فاروق سے) آپ میرا مذاق اڑوانے کے لیے یہاں لائے ہیں۔

فاروق : (گھبرا کر) ارے نہیں۔ وہ بات یہ ہے کہ — یہ ہے کہ ہماری باجی کو بھنڈیوں سے بڑی دلچسپی ہے۔ گڑ کی میٹھی بھنڈیاں تو ایسے مزے کی پکاتی ہیں کہ وہ بس انگلیاں چاٹا کرو۔

برجیس : کمال ہے۔ میٹھی بھنڈیوں کے بارے میں پہلی بار سنا ہے اور وہ بھی گڑ کی۔

فاروق : بالکل، بالکل۔ (میز پر سے کتاب اٹھا کر برجیس کو دکھلاتے ہوئے۔ یہ دیکھو۔ بھنڈیوں پر ایسی موٹی موٹی کتابیں پڑھتی ہیں۔

برجیس : (کتاب فاروق کے ہاتھ سے لے کر اسے دیکھتے ہوئے) اچھا تو افلاطون نے اپنی ری پبلک میں بھنڈیاں پکانے کی ترکیب لکھی ہے اور وہ بھی گڑ کی میٹھی بھنڈیاں۔

فاروق : جی ہاں۔ پلیٹو نے سب پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے بھلا بھنڈیوں کو کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ بس تم ایک مرتبہ باجی کے ہاتھ کی بھنڈیاں کھا کر دیکھنا۔ انگلیاں نہ چاٹنے لگو تو میرا نام۔ ہماری باجی کوئی معمولی باجی نہیں ہیں (دوسرے کمرے سے آواز— ”فرزانہ— ارے فرزانہ“ فاروق گھبرا کر) ارے مر گئے۔ جایئے ناباجی‘ ابا جی آپ کو بلا رہے ہیں۔ کہیں وہ یہاں نہ آجائیں۔

فرزانہ : آجانے دو۔ وہ برجیس سے ملاقات کرلیں گے۔

فاروق : ارے نہیں باجی۔ پلیز (فرزانہ اپنی جگہ پر کھڑی رہتی ہے) آپ میری ایسی

تیسی کرا کے رہیں گی۔ (برجیس کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے) آؤ میرے ساتھ آؤ۔

(تقریبا گھسیٹتا ہوا دوسرے کمرے میں لے جاتا ہے کہ منیر صاحب کمرے میں آ کر)

منیر : فرزانہ (فرزانہ اور نوری کے چہروں کو دیکھ کر) کیا بات ہے، تم دونوں گھبرائی ہوئی کیوں ہو۔

فرزانہ : جی نہیں ابا جی۔ وہ ذرا۔

منیر : اچھا اچھا— کل تم کچھ نئی کتابیں خرید کر لائی تھیں۔ کون کون سی کتابیں ہیں۔

فرزانہ : آپ تشریف رکھیے میں لاتی ہوں۔

منیر : میں وہیں بیٹھ کر دیکھ لوں گا۔ یہاں سب کا آنا جانا لگا رہتا ہے (دروازے کی طرف جاتے ہیں۔ فرزانہ اور نوری کے چہروں پر گھبراہٹ پیدا ہوتی ہے کہ فاروق اس طرح ہاتھ جھٹکتا ہوا آتا ہے جیسے دھول جھاڑ رہا ہو منیر اسے دیکھ کر) وہاں کیا کر رہے تھے۔

فاروق : (گھبرائے ہوئے انداز میں) جی کچھ نہیں۔

منیر : تم اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔

فاروق : جی۔ گھبرایا ہوا۔ جی ہاں۔ جی نہیں۔ وہ بھنڈی

منیر : بھنڈی۔ کیا بک رہے ہو۔

فاروق : جی ہاں بھنڈی۔ بالکل بھنڈی

نوری : (ہنستے ہوئے آگے بڑھ کر) ابا جی۔ یہ کہہ رہے ہیں کہ میں گڑ کی میٹھی بھنڈیاں پکا سکتا ہوں۔

منیر : تو فرزانہ کے کمرے میں تم میٹھی بھنڈیاں پکا رہے تھے۔

فارو : جی نہیں۔ میں کتاب ڈھونڈ رہا تھا۔ پکانے کی ترکیب والی۔

منیر : واہیات۔ ہم نے آج تک میٹھی بھنڈیوں کے بارے میں نہیں سنا۔

فارق : بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک سب میٹھی بھنڈیوں کا ناشتہ کرتے تھے۔
آپ نے ضرور کتابوں میں پڑھا ہوگا۔

منیر : ہم نے نہیں پڑھا۔ تم ہمیں بے وقوف سمجھتے ہو۔۔۔ فرزانہ

فرزانہ : جی ابا جی

منیر : جب تک یہ میٹھی بھنڈیاں نہ پکا لے اس وقت اس کا جیب خرچ بند۔
(دروازے کی طرف بڑھتے ہیں)

فاروق : مگر ابا جی۔

منیر : کچھ نہیں میٹھی بھنڈیاں پکاؤ
(کمرے میں چلے جاتے ہیں)

فاروق : مرگئے۔ (آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر) جل تو جلال تو۔ آئی بلا کو ٹال تو
(سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے کہ منیر تیزی سے واپس آتے ہیں)

منیر : وہاں عورت ہے کوئی غیر عورت

فاروق : (تیزی سے کھڑے ہوکر) عورت۔ غیر عورت۔ اس کی یہ ہمت کہ باجی کے کمرے میں جائے۔۔۔ مگر نہیں ابا جی وہاں کوئی عورت نہیں ہے۔ میں ابھی کمرے میں سے آرہا ہوں۔

منیر : تو ہم جھوٹ بول رہے ہیں یا ہماری آنکھیں ہمیں دھوکا دے رہی ہیں۔

فاروق : روح۔ ابا جی روح

منیر : روح۔ کیسی روح

فاروق : روحیں اپنے بارے میں پڑھنے کے لیے اکثر لائبریریوں میں آتی رہتی ہیں۔
جیسے کلوپطرہ کی روح، لیڈی میکبتھ کی روح، ماتا ہری کی روح۔

منیر : تم ہم کو پاگل سمجھتے ہو یا تمہارے کچھ اسکرو لوز ہیں۔

فاروق : میرے ہی اسکرو لوز ہیں۔

فرزانہ : ابا جی۔ برجیس ہے۔ اسے کچھ کتابوں کی ضرورت ہے۔ انھیں تلاش کر رہی ہے۔

فاروق : لیکن میں نے تو نہ کسی برجیس کو دیکھا نہ کسی بلقیس کو۔

فرزانہ : اس لیے کہ تم ایک نمبر کے ابلیس ہو۔ تمہیں دیکھ کر وہ برآمدے میں چلی گئی ہوگی۔ (منیر صاحب سے) ابا جی آپ اپنے کمرے میں چلیے میں کتابیں لے کر آتی ہوں۔

منیر : اچھا۔ (اپنے کمرے کی طرف جاتے ہیں۔ فاروق اطمینان کا سانس لیتا ہے۔ منیر صاحب پھر مڑ کر) فرزانہ۔ آج اس سے میٹھی بھنڈیاں پکوانا۔
(دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں)

فاروق : مر گئے۔ (اپنے پر غصہ کرتے ہوئے) بھنڈی۔ ہائے ہائے میں نے ٹنڈا یا چقندر کیوں نہ کہہ دیا۔
(فرزانہ مسکرا کر فاروق کو دیکھتی ہے۔ نوری قہقہہ مار کر ہنستی ہے۔ فرزانہ مسکراتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ نوری شرارت آمیز مسکراہٹ . ے)

نوری : منے میاں آج وہ نواب صاحب نہیں آئے۔

فاروق : کون نواب صاحب

نوری : نواب پسو

فاروق : کیوں تشریف نہیں لائے۔

نوری : میں کیا جانوں۔ آپ ذرا بازار جا کر سبزی لے آیئے۔

فاروق : میں سبزی لے آؤں۔ تیرا دماغ تو نہیں چل گیا ہے۔

نوری : کیوں دماغ کیوں چلنے لگا۔ (ہنس کر) بھنڈی نہیں لاؤ گے؟ آخر گڑ کی میٹھی پکانا ہے نا آپ کو۔

فاروق : دیکھ نوری کی بچی سچ کہتا ہوں تیرا دماغ ٹھیک کر دوں گا۔

نوری : مہنگی نہ خرید لانا۔ مس بھنڈی سے بھاؤ پوچھتے جانا انھیں صحیح بھاؤ معلوم ہوں گے۔
(فاروق ایک دم سنجیدہ ہو کر نوری کو دیکھنے لگتا ہے۔ نوری شرارت سے مسکراتی رہتی ہے۔ کچھ دیر خاموش رہتی ہے۔ پھر آہستہ سے)

فاروق : نوری—

نوری : میں اسے پہچانتی ہوں۔ کالج میں مجھ سے تین کلاس آگے تھی (فاروق کے چہرے پر پریشانی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ نوری مسکرا کر) اسی زمانے میں کسی لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔

فاروق : بھاگ گئی تھی۔ بلا وجہ کی اڑا رہی ہے۔

نوری : کالج میں تو یہی مشہور ہوا تھا

فاروق : سب بکواس ہے۔

(اسی وقت فرزانہ کمرے میں آتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں کچھ کتابیں ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے برجیس آتی ہے۔ فرزانہ نوری کو دیکھ کر)

فرزانہ : نوری، آج کھانا پکانے کا ارادہ نہیں ہے۔

نوری : آج نواب پسو نہیں آئے ہیں۔ منے میاں کہہ رہے ہیں سبزی میں لے آؤں گا۔

فرزانہ : منے میاں لائیں گے (مسکرا کر) اللہ کی شان ہے۔

نوری : کہہ رہے ہیں اپنی پسند کی بھنڈیاں لاؤں گا۔ اسپیشل قسم کی۔ جو گڑ کی میٹھی پکائی جاتی ہیں۔

فاروق : دیکھ نوری کی بچی۔ میں سچ کہتا ہوں کہ—

نوری : (ہنس کر) جیب خرچ۔ منے میاں جیب خرچ۔

(ہنستی ہوئی جاتی ہے اسی کے ساتھ فرزانہ بھی دوسرے کمرے میں جاتی ہے)۔

برجیس : یہ کون محترمہ ہیں

فاروق : (اکھڑے ہوئے انداز میں) ہماری نانی اماں

برجیس : جی— نانی اماں

فاروق : جی ہاں ۔ ہمارے ابا جی کے ایک اردلی تھے مشہور خاں صاحب۔ ان کی صاحب زادی ہیں۔ جب یہ ایک سال کی تھیں تو ان کی والدہ اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ مشہور خاں صاحب کو اتنی غیرت آئی کہ تین مہینے بعد وہ بھی ان سے

جا ملے۔ اب حالت یہ ہے کہ جو کپڑے باجی کے بنتے ہیں وہی ان کے بنتے ہیں۔ جو زیور باجی کے لیے خریدا جاتا ہے وہی ان کے لیے خریدا جاتا ہے۔ جو جیب خرچ باجی کو ملتا ہے وہی ان کو بھی ملتا ہے۔

برجیس : اچھا—

فاروق : جی ہاں۔ کھانے کی میز پر یہ ابا جی کے پاس بیٹھتی ہیں اور ان کے بعد ہمارا نمبر آتا ہے۔ کالج میں پڑھتی تھیں وہ تو بیمار ہوگئیں تو پڑھنا چھوٹ گیا ورنہ ہمیں شیکسپیئر پڑھایا کرتیں۔

برجیس : (کچھ دیر خاموش رہ کر سوچتے ہوئے) مجھے کب تک یوں پردے میں رہنا پڑے گا۔

فاروق : صرف چند دن۔ ذرا ابا جی کو پٹانا پڑے گا۔

برجیس : مگر آپ تو کہہ رہے تھے ہمارے ابا جی فرشتہ ہیں فرشتہ۔

فاروق : بالکل ہیں۔ مگر غصہ میں موت کا فرشتہ بن جاتے ہیں۔ بس وہ وقت بہت نازک ہوتا ہے۔

(نوری پھر دروازے کے پاس آتی ہے اس کے ہاتھ میں ایک جھولا ہے۔ دروازے کے پاس سے جھولا ہلاتے ہوئے)

نوری : منے میاں بھنڈیاں لے آئیے۔

فاروق : (مڑ کر اسے دیکھ کر۔ اس کی طرف بڑھتے ہوئے) ٹھہر تو جا میں بتلاتا ہوں

(نوری قہقہہ مار کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے)

(پردہ)

دوسرا سین

منظر

(صبح کا وقت۔ وہی کمرہ۔ وقار کھادی کا لباس پہنے بیٹھا ہے اس کے سامنے میز

پر شیو کرنے کا سامان رکھا ہے۔ وقار عجیب عجیب شکلیں بنا کر مختلف زاویوں سے اپنی شکل دیکھ رہا ہے کہ نوری کمرے میں آ کر۔)

نوری : بڑے میاں۔ ناشتہ پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔

وقار : (مڑ کر نوری کو دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے اسے قریب بلاتا ہے نوری اس کے پاس آتی ہے۔ وقار اسے سر سے پیر تک دیکھ کر) میری عمر کیا ہے (نوری جانے کے لیے مڑتی ہے) کہاں چلی۔

نوری : باجی سے آپ کی عمر پوچھ آؤں۔

وقار : میں تجھ سے آٹھ سال بڑا ہوں۔ تیری عمر کیا ہے۔

نوری : اٹھارہ سال

وقار : اس حساب سے میری عمر کیا ہوئی۔

نوری : اس حساب سے تو چھبیس سال ہوئی۔

وقار : اور بڑے میاں کم سے کم ساٹھ سال کے بوڑھے کو کہتے ہیں۔ کیا تجھے میں ساٹھ سال کا نظر آتا ہوں۔ دیکھ اب بڑے میاں کہا تو اچھا نہ ہوگا۔ اپنی اوقات میں رہا کر۔ (نوری اس طرح وقار کا چہرہ دیکھتی ہے جیسے بہت دکھی ہوگئی ہو) میرے لیے ایک پیالی چائے یہیں لا دے۔ میں ناشتہ نہیں کروں گا۔ (نوری خاموشی سے جانے کے لیے مڑتی ہے (اور دیکھ فاروق سے کہنا مجھے اس سے ایک ضروری کام ہے۔ ابھی مجھ سے مل لے۔

نوری : وہ ناشتہ کی میز پر نہیں ہیں۔

وقار : کیوں۔ نواب صاحب ابھی سو کر نہیں اٹھے۔

نوری : وہ ناشتہ اپنے کمرے میں کرتے ہیں۔

وقار : خیر۔ تم جاؤ میں اس سے مل لوں گا۔

نوری : ٹھہریے میں انھیں بلائے دیتی ہوں

(نوری فاروق کے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ وقار پھر اپنا منہ مختلف زاویوں

سے دیکھنے لگتا ہے کہ آگے آگے فاروق اور اس کے پیچھے نوری آتی ہے۔
فاروق کے ہاتھ میں اخبار ہے۔ نوری خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلی
جاتی ہے۔ وقار فاروق کو دیکھ کر)

وقار : کیا کر رہے تھے۔
فاروق : اخبار دیکھ رہا تھا۔ اس میں آپ کی تقریر چھپی ہے۔
وقار : (بے پروائی سے) چھپی ہوگی۔ کل اخبار کا رپورٹر خاص طور پر میری تقریر کور
کرنے آیا تھا۔
فاروق : ارے وہی رپورٹر تو نہیں تھا جسے پرسوں آپ نے چائے پر بلایا تھا۔
وقار : (اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے) کل تمہارے کمرے میں کون عورت تھی۔
فاروق : نیلم پری
وقار : کیا بیہودگی ہے۔
فاروق : اس گھر میں یا تو باجی ہیں یا نوری تیسری نیلم پری ہی ہوسکتی ہے۔
وقار : میں نے صرف ایک جھلک دیکھی تھی پہچان نہ سکا۔ (کچھ دیر رک کر) تم آج
مشتاق صاحب کے پاس چلے جانا۔
فاروق : کون مشتاق صاحب
وقار : وہ تمہارا دوست ہے نا اشتیاق۔ اس کے والد۔
فاروق : لعنت ہے بڑے بھیا۔ میں ان کے پاس ہرگز نہ جاؤں گا۔
وقار : کیوں کیا بات ہے؟
فاروق : بھلا وہ بھی کوئی آدمی ہیں۔ ایک دن دیکھا تو سات آٹھ کلو کا کدو کاندھے پر
رکھے چلے آرہے ہیں۔ کدو کھانے والے مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔
وقار : میرا ارادہ کارپوریشن کا الیکشن لڑنے کا ہے وہ محلے کے اثر دار آدمی ہیں
(فاروق بڑے غور اور سنجیدگی سے وقار کو دیکھتا ہے کچھ دیر خاموش رہ کر)
فاروق : بڑے بھیا۔ اپنی امی بڑی نیک خاتون تھیں۔ کبھی گھر سے بے پردہ نہیں نکلتیں

اور بیچاری باجی۔ انھیں کتابوں کے علاوہ دنیا سے کوئی واسطہ نہیں۔ کیوں ان دونوں کی عزتوں کے پیچھے پڑے ہو۔ اگر کچھ فالتو پیسہ جمع ہوگیا ہے تو مجھے دے دو کسی اچھے کاروبار میں لگا دوں گا۔

وقار : میں نے آپ کو رائے دینے کے لیے نہیں بلایا ہے۔

(اسی وقت نوری آتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی ہے۔ وقار اسے دیکھ کر خاموش ہوجاتا ہے۔ نوری اسے چائے کی پیالی دیتی ہے۔ وقار چائے کا گھونٹ لے کر برا سا منہ بنا کر)

وقار : یہ چائے ہے۔

(فاروق پنجوں کے بل اونچے اٹھ کر پیالی میں جھانک کر ہنستے ہوئے)

فاروق دیکھنے میں تو چائے ہی نظر آرہی ہے۔

وقار : (غصہ سے) اور مزے میں حکیم کی کوئی دوا۔ لاکھ مرتبہ کہا کہ شکر کم اور پتی زیادہ ہونا چاہیے مگر اس کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔

(غصہ سے پیالی میز پر رکھ دیتا ہے۔ فاروق ناگواری سے پیالی اٹھا کر نوری کو دے کر)

فاروق : جا باجی سے کہنا ایک پیالی وہ بنا دیں۔

(نوری پیالی لے کر چلی جاتی ہے۔ وقار فاروق سے)

وقار : تم لوگوں نے اس کا دماغ خراب کر رکھا ہے۔

فاروق : اگر چائے ناپسند تھی تو اور منگا لیتے۔ اس طرح بگڑ کر اسے دکھی کرنے سے کیا فائدہ۔

وقار : تمھی لوگ اسے سر پر بٹھاؤ (کھڑے ہوکر) میں کم ظرف لوگوں کو منہ لگانا پسند نہیں کرتا۔

(فاروق اور سنجیدہ ہوکر کچھ دیر وقار کا چہرہ دیکھتا رہتا ہے پھر)

فاروق : بڑے بھیا۔ اگر اس کا باپ ہمارے یہاں اردلی تھا تو وہ کم ظرف ہوگئی۔ آپ امیری غریبی اور کسی کے پیشے سے اس کا ظرف ناپتے ہیں۔ اگر کل یہ

ثابت ہو جائے کہ ہمارے دادا جان تانگہ چلاتے تھے تو ہمارا ظرف کیا ہوگا۔

وقار : (غصہ سے) منے میاں

فاروق : وہ اسی گھر میں پلی بڑھی ہے۔ یہیں اس نے اسی ماحول میں پرورش پائی اور تعلیم حاصل کی ہے اور ابا جی اسے۔

وقار : (غصہ سے بات کاٹ کر) اگر وہ تمھیں اتنی ہی پیاری ہے تو اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتے۔

فاروق : (غصہ سے بلند آواز سے) بڑے بھیا۔ میں نے اس میں اور باجی میں کوئی فرق نہیں سمجھا ہے۔ ایسی واہیات بات کہنے سے پہلے آپ کو سوچنا چاہیے۔

(اسی وقت فرزانہ چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے داخل ہو کر)

فرزانہ : کیا بات ہے۔ یہ چیخ پکار کیوں ہو رہی ہے۔

فاروق : (تیز تیز اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے) بڑے بھیا کچھ زیادہ عقلمندی کی باتیں کرنے لگے ہیں۔

(فاروق اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ وقار کے چہرے پر ابھی تک غصہ ہے۔ فرزانہ پیالی وقار کی طرف بڑھاتے ہوئے)۔

فرزانہ : تم نے نوری سے کیا کہہ دیا وہ اپنے کمرے میں بیٹھی رو رہی ہے۔ (وقار خاموش رہتا ہے) لو چائے پی لو۔

وقار : رہنے دیجیے اب مجھے ضرورت نہیں ہے۔ (کمرے میں ٹہلتا ہے پھر اس طرح جیسے خود سے کہہ رہا ہو) کدو کھاتے ہیں۔

فرزانہ : (حیرت سے وقار کو دیکھ کر) کدو کھاتے ہیں۔ کون کدو کھاتے ہیں۔

وقار : مشتاق صاحب۔ میں نے منے میاں سے کہا ذرا مشتاق صاحب سے مل لینا تو فرمانے لگے۔ واہیات آدمی ہیں کدو کھاتے ہیں۔

: (دروازے کی طرف جاتا ہے۔ فرزانہ اسے جاتا ہوا دیکھ کر)

فرزانہ : ارے بھئی چائے تو پیتے جاؤ۔

وقار : نہیں باجی مجھے ایک ضروری کام ہے۔

فرزانہ : (اونچی آواز سے) منے میاں۔ منے میاں (شیو کا سامان اٹھا کر دوسری میز پر لے جا کر رکھتی ہے کہ فاروق کمرے میں آتا ہے اس کے چہرے پر ابھی تک غصہ کے آثار ہیں۔ آ کر خاموش کھڑا ہو جاتا ہے۔ فرزانہ مڑ کر اسے دیکھ کر)
کیا بات ہے یہ وقار اس قدر غصہ میں کیوں تھا۔

فاروق : وہ کچھ زیادہ ہی عقلمندی کی باتیں کرنے لگے ہیں۔ اب ان کی شادی ہو جانا چاہیے۔

فرزانہ : (ہنس کر) تو پھر کیا وہ عقلمندی کی باتیں نہیں کریں گے۔

فاروق : اپنی بیوی کی برائی اور دوسروں کی بیویوں کی تعریف کرنے سے ہی فرصت نہیں ملے گی کہ ادھر ادھر کی سوچیں۔

فرزانہ : خیر اسے عقلمند بنانے کا یہ نسخہ تو بعد میں آزمایا جائے گا۔ لیکن اس وقت کیا ہوا۔

فاروق : (بیزاری سے) کچھ نہیں باجی۔ چائے میں شکر ذرا زیادہ ہو گئی تو نوری کی اوقات نکالنے لگے۔ اور اخبار میں ان کی تقریر آپ نے پڑھی۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اونچ نیچ اور غریبی امیری مٹانے کے لیے خدا نے خاص طور پر اس دنیا میں بھیجا ہے۔ اور گھر میں یہ حالت ہے (فرزانہ سوچنے لگتی ہے) اب کارپوریشن کا الیکشن لڑیں گے۔

فرزانہ : (حیرت سے) کارپوریشن کا الیکشن لڑیں گے۔

فاروق : جی ہاں۔ ابا جی اور ہماری آپ کی عزتیں انھیں اچھی نہیں لگتیں۔ انھیں جھنڈے پر چڑھا کر سکون ملے گا۔

(فرزانہ خاموش ہو کر سوچنے لگتی ہے کہ برجیس کمرے کے دروازے سے چوروں کی طرح جھانکتی ہے۔ فرزانہ اسے دیکھ کر)

فرزانہ : ارے برجیس یہ چوروں کی طرح کیوں جھانک رہی ہو۔ آؤ۔

برجیس : (کمرے میں آتے ہوئے) وہ میں نے سوچا کہ کہیں—

فرزانہ : بیٹھو— (برجیس کرسی پر بیٹھ جاتی ہے) ناشتہ کیا۔

برجیس : جی ہاں کرلیا۔
فرزانہ : تمھیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔
برجیس : آپ کی اتنی اچھی لائبریری ہوتے ہوئے کیا تکلیف ہوسکتی ہے۔
(دوسرے کمرے سے منیر کی آواز)
منیر کی آواز: فرزانہ
فاروق : مارے گئے۔ (اس طرح کھڑا ہوتا ہے جیسے برجیس کو چھپانے کی کوشش کررہا ہو) جائیے باجی۔ جلدی جائیے۔
فرزانہ : آئی ابا جی
: (دوسرے کمرے کی طرف جاتی ہے کہ منیر صاحب کمرے میں آتے ہیں۔ فاروق اِدھر اُدھر ہل کر برجیس کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ منیر اسے دیکھ کر)
منیر : کیا کوئی ورزش کررہے ہو۔
فاروق : جی نہیں— وہ— وہ—
منیر : وہ— وہ کیا
فاروق : وہ ادھر۔ ادھر۔ اسی طرح مٹکتے ہوئے) پردہ ہے ابا جی پردہ۔
منیر : (دوسری طرف منہ پھیر کر) تو پھر یوں کیوں نہیں کہتے۔
فاروق : ابا جی۔ یہ سلام عرض کررہی ہیں۔
منیر : ہماری دعا کہو۔ (اپنے کمرے میں جاتے ہوئے) بھئی اپنے مہمان کو ناشتہ کرایا۔
فرزانہ : جی ہاں۔ ابا جی کرایا
منیر : (رک کر) فرزانہ— آج نقوی اور ان کی بیگم شام کو کھانے پر آئیں گی۔
فرزانہ : بہت اچھا۔ انتظام ہوجائے گا۔
(منیر اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ فاروق رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے)
فاروق : جان بچی لاکھوں پائے
(برجیس کی نظر اخبار پر پڑتی ہے۔ فرزانہ کی طرف دیکھ کر)

برجیس : آپ نے بڑے بھیا کی تقریر پڑھی؟ بڑی اچھی تقریر کی ہے

فاروق : توبہ کرو اور اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو

برجیس : (حیرت سے) کیوں

فاروق : اگر دو چار اسی طرح اور تقریریں پسند آگئیں تو کھادی کے کپڑے پہننے لگو گی (برجیس ہنستی ہے۔ فرزانہ مسکراتی ہے) نوری کہاں ہے

فرزانہ : رو رہی ہے۔ (مسکرا کر) چائے میں شکر زیادہ ہوگئی تھی۔

فاروق : ارے میں اس سے ابھی کم شکر کی چائے بنوا کر لاتا ہوں۔ اس میں رونے کی کون سی بات ہے۔

(تیزی سے دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ برجیس کچھ دیر خاموش رہ کر)

برجیس : باجی — یہ نوری

فرزانہ : اس کا نام نور جہاں ہے۔ ہم لوگ محبت سے اسے نوری کہتے ہیں۔ ماں جائی نہ سہی مگر ہم ہی میں سے ایک سمجھو۔

برجیس : یہ فاروق سے بہت بے تکلف ہیں۔

فرزانہ : کیوں نہ ہوگی بچپن سے ساتھ کھیلے کودے ہیں (برجیس خاموش ہوکر سوچنے لگتی ہے مگر فرزانہ اس کی خاموشی پر دھیان نہ دے کر) تمہاری فاروق سے کہاں ملاقات ہوگئی تھی (برجیس خاموش رہتی ہے۔ فرزانہ اسے دیکھ کر) کیا سوچنے لگیں۔

برجیس : (چونک کر) جی نہیں کچھ نہیں۔

فرزانہ : میں نے پوچھا تھا تمہاری فاروق سے کہاں ملاقات ہوئی تھی۔

برجیس : کالج میں

(دوسرے کمرے سے نوری کی آواز — باجی۔ باجی۔ فرزانہ مڑ کر اس کمرے کی طرف دیکھتی ہے کہ فاروق نوری کی چوٹی پکڑے ہوئے کمرے میں لاتا ہے نوری چوٹی چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے)

نوری : باجی۔ میری چوٹی۔

فرزانہ : (کسی قدر بگڑ کر) منے میاں۔کیا بدتمیزی مچا رکھی ہے۔

فاروق : دیکھیے نا۔ میں نے کہا کم شکر کی چائے بنا دے تو کہنے لگی میں بھنڈیوں کا آب جوش نکال رہی ہوں۔فرصت نہیں ہے۔

فرزانہ : چھوڑو اس کی چوٹی۔

فاروق : (نوری کی چوٹی چھوڑ کر) ہم سے میٹھی بھنڈیا پکی نہیں یہ آب جوش نکالنے لگی۔ جا، کم شکر کی چائے بنا کر لا۔ زیادہ شکر نہیں۔ فیر پرائز شاپ والے ویسے) ہمارے کوٹے کی شکر دوسروں کو دے دیتے ہیں۔

نوری : میں بھی بھنڈیوں کے آب جوش کی چائے بناؤں گی۔

فاروق : دیکھ نوری۔

(نوری کی طرف بڑھتا ہے نوری ہنستی ہوئی دوسرے کمرے میں بھاگ جاتی ہے)

فرزانہ : منے میاں۔تمہارا بچپن نہیں جائے گا۔

فاروق : اب دیکھیے نا۔ بھنڈیوں کا آب جوش۔ (اسی وقت ایک موٹا تازہ شخص کمرے میں آتا ہے۔ فاروق اسے دیکھ کر) آیئے نواب پسو۔ تین دن کے بعد درشن ہورہے ہیں حضور کے۔

پسو : منے میاں۔ بیمار تھا کمزوری ہوگئی تھی۔

فاروق : (غور سے اسے دیکھ کر) اگر کمزوری کے بعد آپ کی یہ حالت ہے تو پھر گویا ہم تو مرچکے ہیں۔کیا بیماری تھی حضور نواب صاحب۔

پسو : لولکی میں درد تھا۔

فاروق : خدا خیر۔اب آپ کس پر عاشق ہوگئے ہیں۔ایک مرتبہ اور آپ کی لولکی میں درد ہوا تھا تو آپ امیرن پر عاشق ہوگئے تھے جو اللہ کے فضل سے پہلے ہی پانچ بچوں کی ماں تھی۔

پسو : امیرن کا نام نہ لیجیے۔ بے وفا تھی۔ اپنے گھر والے کے ساتھ بھاگ گئی اور

بچے میرے پاس چھوڑ گئی۔

برجیس : (مسکرا کر) اس کا گھر والا پہلے سے موجود تھا۔

پسو : بالکل تھا۔ کیوں نہیں ہوگا۔ کوئی دم کٹی لنڈورتھی۔

فرزانہ : جاؤ اپنا کام کرو۔ فضول بکواس لگا رکھی ہے۔

(پسو دوسرے دروازے کی طرف جاتا ہے۔ پھر ایک دم مڑ کر)

پسو : منے میاں۔ میں ابھی بڑے بھیا کی تقریر سن کر آرہا ہوں۔

فاروق : اچھا۔

پسو: جی ہاں۔ خوب ہاتھ ہلا ہلا کر زور دار تقریر کر رہے تھے کہ ایک ٹماٹر منہ پر آکر لگا۔ بچاخ

فاروق : ابے جاجا۔ ان کے ہونے والے سالے نے مذاق کیا ہوگا۔

: (پسو دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے)

برجیس : (ہنس کر) آپ لوگوں نے انھیں کس چڑیا گھر سے پکڑا ہے۔

فاروق : (برجیس کی بات پر دھیان نہ دے کر ٹھنڈی سانس بھر کر) تو الیکشن لڑکے نے میڈل ملنا شروع ہوگئے۔

(پردہ)

تیسرا سین

منظر

(دس دن بعد وہی کمرہ۔ وقار ہاتھ ہلا کر کسی کو رخصت کر رہا ہے۔ پھر بلند آواز سے۔

وقار : پوسٹر آج ہی چھپ جانا چاہیے اور ہاں بشیر کو میرے پاس بھیج دینا۔

(باہر سے آواز۔ ''بہت اچھا۔'' وقار مڑ کر کمرے میں آجاتا ہے اور غور وفکر کے عالم میں ٹہلنے لگتا ہے کہ پسو مگ میں چائے لیے ہوئے کمرے میں آکر)

پسو : چائے۔

وقار : (مڑ کر اسے دیکھ کر) میرے لیے پھر مگ میں چائے لایا۔

پسو : جی ہاں۔ کم شکر پتی زیادہ۔ نوری نے بنائی ہے۔

وقار : میں مگ کی بات کر رہا ہوں۔ لاکھ مرتبہ کہا کہ میرے لیے چائے پیالی طشتری میں لایا کر۔ (چائے کا مگ لیتے ہوئے بیزاری سے) یہ نوری ہمیشہ مجھے چڑانے میں لگی رہتی ہے۔

پسو : بڑے بھیا۔ کل چوک میں میں نے بھی آپ کی تقریر سنی تھی۔

وقار : (چائے کا گھونٹ لے کر) اچھا۔

پسو : آپ خوب ہاتھ ہلا ہلا کر چلا رہے تھے کہ پچاخ

وقار : پچاخ— پچاخ کیا

پسو : وہ ٹماٹر۔ آپ کے منہ پر لگا تھا۔ ٹماٹر پھینکنے والا میرے ہی پاس کھڑا تھا۔ میں نے کہا کیا کرتے ہو تو کہنے لگا ہم خوش ہوتے ہیں تو ہیجڑوں کی طرح تالیاں نہیں بجاتے ٹماٹر بجاتے ہیں پھر تو وہ تالیاں پیٹیں کہ مزا آ گیا۔ میں نے بھی خوب تالیاں بجائیں۔

وقار : اچھا تو ٹماٹر پھینکنے پر آپ نے بھی تالیاں بجائی تھیں۔

پسو : جی ہاں بجائی تھیں اور زور زور سے بجائی تھیں۔ ایک بار تالیاں بجانے سے کوئی ہیجڑا تھوڑا ہو جاتا ہے۔

(وقار غور سے اس کا چہرہ دیکھتا ہے۔ پھر چائے کے دو گھونٹ لے کر)

وقار : جا ذرا باجی کو تو بلا لا۔

(پسو مڑ کر دروازے کی طرف جاتا ہے کہ منیر صاحب کمرے میں آتے ہیں۔ ایک نظر پسو پر ڈالتے ہیں پسو باجی کے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ وقار منیر صاحب کو دیکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ منیر وقار کے پاس آ کر چند سیکنڈ اسے غور سے دیکھتے ہیں پھر بڑے روکھے لہجے میں)

منیر : سنا ہے تم کارپوریشن کا الیکشن لڑ رہے ہو۔

وقار : (نظریں جھکا کر) جی ہاں ارادہ تو ہے۔

منیر : کیوں۔

وقار : محلے والے مجبور کر رہے ہیں کہ میں ان کی خدمت کروں۔

منیر : تو خدمت کا جذبہ ہے۔ میئر بننے کا چانس ہے۔

وقار : جی ہاں ہے تو

منیر : تو پھر یہ خدمت کا جذبہ نہیں اقتدار کی ہوس ہے۔

وقار : لیکن ابا جی۔

منیر : (بات کاٹ کر) میں اس لفنگے پن کو پسند نہیں کرتا۔ (وقار کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ منیر کچھ دیر رک کر) میں تمھیں الیکشن لڑنے سے نہیں روکتا مگر ایک بات یاد رکھنا۔ (وقار سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے) اگر الیکشن ہار گئے تو اس گھر کے دروازے اپنے لیے بند سمجھنا۔

(منیر فرزانہ کے کمرے کی طرف جاتے ہیں۔ وقار ان کے پیچھے آتے ہوئے)

وقار : ابا جی (منیر مڑ کر اسے دیکھتے ہیں۔ وقار نظریں [illegible] کر) مجھے کچھ روپے کی ضرورت ہوگی۔

منیر : (کچھ دیر غور سے اس کا چہرہ دیکھ کر) رنڈی بازی کرتے ہو (وقار حیرت سے ان کا چہرہ دیکھتا ہے مگر خاموش رہتا ہے) میں پوچھ رہا ہوں۔ رنڈی بازی کرتے ہو۔ (وقار اب بھی خاموش رہتا ہے) اگر تم رنڈی بازی کے لیے روپیہ مانگتے تو میں دے دیتا مگر اس لفنگے پن پر اپنا روپیہ برباد کرنا نہیں چاہتا۔

(فرزانہ کے کمرے کی طرف بڑھتے ہیں کہ فرزانہ اپنے کمرے سے نکلتی ہے اس کے ہاتھ میں ایک کتاب ہے منیر صاحب کو دیکھ کر)

فرزانہ : ابا جی (کتاب انھیں دے کر) دوسری کتاب نہیں مل رہی ہے اسے ابھی ڈھونڈ کر لاتی ہوں۔

منیر : اچھا۔ اطمینان سے ڈھونڈ لو ایسی کوئی جلدی نہیں ہے۔
(اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ وقار پریشانی اور غصہ سے کمرے میں ٹہل رہا ہے۔ فرزانہ اسے دیکھ کر)

فرزانہ : کیا بات ہے۔

وقار : (غصہ سے) ابا جی رنڈی بازی کے لیے روپیہ دے سکتے ہیں الیکشن لڑنے کے لیے نہیں (فرزانہ خاموش رہتی ہے) اور اگر میں الیکشن ہار گیا تو اس گھر کے دروازے مجھ پر بند ہوجائیں گے۔ گویا میں چوری کررہا ہوں ڈاکہ ڈال رہا ہوں کہ اگر پکڑا گیا تو ان کی بے عزتی ہوجائے گی۔
(نوری کمرے میں آتی ہے اس کے ہاتھ میں دو چار اخبار ہیں انھیں میز پر رکھتی ہے)

فرزانہ : مگر وقار سوال یہ ہے کہ—

وقار : (بات کاٹ کر) سوال صرف یہ ہے کہ بلا روپے کے الیکشن کیسے لڑا جائے گا۔ ننھا خاں کو چپ کرنے کے لیے روپے کی ضرورت ہے۔
(نوری کمرے سے چلی جاتی ہے)

فرزانہ : ننھا خاں! مگر وہ تو—

وقار : جو انھیں پیسہ دے گا وہ اس کا کام کریں گے۔ ان کے ساتھ ورکرس کی ایک پوری فوج ہے۔

فرزانہ : مگر وقار—

وقار : پانچ ہزار روپے مانگ رہے ہیں (فرزانہ کرسی پر بیٹھ کر اخبار اٹھا لیتی ہے) باجی اگر انھیں دس ہزار دے دیا جائے تو وہ میرا ورک بھی کریں گے۔

فرزانہ : مگر دس ہزار تو بہت ہوتے ہیں۔

وقار : اب یہ تو الیکشن ہے باجی جتنا گڑ ڈالو اتنا ہی میٹھا ہوتا ہے۔ خلیق مرزا انھیں آٹھ ہزار کا آفر دے چکے ہیں۔ (کچھ دیر رک کر) باجی آپ مجھے دس ہزار

دے دیجیے میں الیکشن کے بعد واپس کردوں گا۔

فرزانہ : بھئی قسم لے لو۔ میرے پاس روپیہ نہیں ہے۔ اس کا یہ طریقہ تو بلیک میلنگ ہے۔

وقار : بالکل ہے۔ مگر مجبوری ہے۔ (کچھ دیر رک کر) کہیں سے انتظام کردیجیے۔ بخدا میں واپس کردوں گا۔ آپ ابا جی سے سفارش کردیجیے۔

فرزانہ : وہ انکار کرچکے ہیں اب ایک کوڑی نہ دیں گے۔ ان سے کہنا فضول ہے۔

نوری : (کمرے میں آتے ہوئے) باجی آپ کو ابا جی یاد کررہے ہیں۔

(فرزانہ کھڑی ہوکر دروازے کی طرف جاتی ہے)

وقار : باجی اگر موقع ملے تو ابا جی سے سفارش کردیجیے گا۔ (فرزانہ کمرے سے چلی جاتی ہے۔ نوری میز پر رکھا ہوا مگ اٹھاتی ہے۔ وقار اسے دیکھ کر) میں نے تجھ سے کتنی مرتبہ کہا کہ میرے لیے مگ میں چائے نہ بھیجا کر۔ (نوری کوئی جواب نہیں دیتی۔ ہاتھ میں دبا ہوا چیک میز پر رکھ کر دروازے کی طرف جاتی ہے۔ وقار چیک اٹھا کر دیکھ کر) نوری— (نوری برابر دروازے کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔ وقار تیزی سے اس کا راستہ روک کر) تیرے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آیا۔

(اسی وقت فاروق کمرے میں آتا ہے)

نوری : میں نے جیب خرچ سے بچا بچا کر جمع کیا ہے۔

فاروق : اور بڑے بھیا کچھ روپیہ چائے اور شکر کم ڈال کر بھی بچایا ہوگا۔

(نوری اور وقار مڑ کر فاروق کو دیکھتے ہیں جو شرارت سے مسکرا رہا ہے۔ وقار چند سیکنڈ اسے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر کمرے سے چلا جاتا ہے— فاروق نوری کے پاس آکر) اپنا روپیہ ڈوبا ہوا سمجھو۔

نوری : مگر وہ باجی سے کہہ رہے تھے الیکشن کے بعد واپس کردیں گے۔

فاروق : (ہنس کر) اگر الیکشن لڑنے والے سچ بولنے لگیں تو دنیا جنت بن جائے۔

نوری : (مسکرا کر) اب زندگی میں تھوڑا بہت رسک تو لینا ہی پڑتا ہے۔ مجھے امید

ہے کہ

فاروق : کیاامید ہے۔ یہی کہ روپیہ لوٹا دیں گے (نوری اثبات میں سر ہلاتی ہے) ہاں اگر الیکشن جیت گئے تو سمجھ لے کہ ان کے ساتھ تیرے بھی پو بارہ ہیں۔ دوگنا بھی مل سکتا ہے ورنہ اس روپے پر فاتحہ پڑھ لے۔

نوری : اب جو کچھ بھی ہو۔

(مڑ کر دروازے کی طرف جاتی ہے۔ فاروق چند سیکنڈ رک کر)

فاروق : نوری۔ (نوری مڑ کر فارق کو دیکھتی ہے۔ فاروق کچھ دیر اس کے چہرے پر نظریں جمائے رہتا ہے پھر اس کے پاس جاکر) یہ الیکشن لڑنے والے کسی کی محبت کا اتنا ہی احترام کرتے ہیں جتنا الیکشن میں کیے گئے وعدوں کا۔

(نوری ایک نظر فاروق کو دیکھتی ہے اور خاموشی سے کمرے سے چلی جاتی ہے۔ فاروق کچھ سوچتے ہوئے کمرہ میں ٹہلتا ہے کہ وقار بہت غصہ میں کمرے میں آتا ہے اس کے ہاتھ میں اخبار ہے۔ اخبار فاروق کی طرف بڑھا کر)

وقار : فاروق یہ کیا ہے۔

فاروق : (اخبار پر ایک نظر ڈال کر) میرے لیے سلور میڈل۔ باجی یا ابا جی کے لیے گولڈ میڈل تیار ہورہا ہوگا۔

وقار : جانتے ہو اس کا میرے الیکشن پر کیا اثر پڑے گا۔

فاروق : یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اس کا آپ کے الیکشن سے کوئی تعلق نہیں۔

وقار : لیکن یہ خبر مجھے بدنام کرنے کے لیے چھاپی گئی ہے۔ کون ہے وہ لڑکی اور کہاں ہے۔ تمھیں شرم نہیں آتی ایک سبزی فروش کی لڑکی کے لیے دیوانے ہوئے جارہے ہو۔

فاروق : بڑے بھیا۔ سبزی فروشی ضمیر فروشی سے بڑا جرم نہیں ہے۔ اس الیکشن میں آپ کتنی مرتبہ ضمیر فروشی کریں گے اس کی گنتی کرنا مشکل ہے۔

وقار : (چیخ کر) منے میاں۔

فاروق : میرے ضمیر نے سبزی فروش کی لڑکی سے محبت کرنے پر کبھی ملامت نہیں کی اور

وقار : (بات کاٹ کر) اس پوسٹر کو دیکھتے ہی اس کی ساری برادری، میرے خلاف ہو جائے گی۔

فاروق : ننھا خاں کی طرح انھیں بھی رشوت دی جاسکتی ہے (طنزیہ) ابھی نوری کے پاس اور روپیہ ہے۔

(فاروق اپنے کمرے کی طرف جاتا ہے)

وقار : فاروق۔ (فاروق مڑ کر بھی نہیں دیکھتا اور اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ وقار کبھی کمرے میں ٹہلتا ہے۔ اخبار اٹھا کر دیکھتا ہے پھر غصہ سے زمین پر پھینک کر بلند آواز سے) پسو۔ اے پسو (ذرا رک کر) ابے کیا مر گیا (پسو کمرے میں آتا ہے) کیا کر رہا تھا۔

پسو : غیبت کر رہا تھا — بڑا مزہ آتا ہے غیبت کرنے میں

وقار : بڑا نیک کام کر رہا تھا۔ (اس طرح جیسے غصہ پر قابو پا چکا ہو) تو غفور کی لڑکی کو جانتا ہے۔

پسو : کون غفور

وقار : سبزی فروشوں کا چودھری

پسو : ارے وہ۔ میں اسی کی تو برائی کر رہا تھا۔ وہ تو کئی دن سے نوری کے کمرے میں ٹھہری ہوئی ہے۔

وقار : (چونک کر) نوری کے کمرے میں۔

پسو : جی ہاں۔ (ہاتھوں سے بتلاتے ہوئے) دن بھر اتنی موٹی موٹی کتابیں پڑھتی ہے اور خوبصورت ایسی ہے بڑے بھیا کہ جیسے — کہ جیسے۔ بس سمجھ لیجیے کہ جیسے نیلم پری۔

وقار : تو یہ اس کی پیٹھ پیچھے برائی ہوئی کہ تعریف (کچھ دیر خاموش رہ کر) نوری تیرے موٹاپے پہ ہنستی ہے۔

پسو : ہنستی ہے۔ ہنسنے دو۔

وقار : کہہ رہی تھی کہ اتنا موٹا ہوتے ہوئے اس میں غیرت نام کو نہیں۔

پسو : کیوں نہیں۔

وقار : ابا جی کو معلوم ہے کہ وہ نوری کے کمرے میں ٹھہری ہوئی ہے۔

پسو : ابا جی کو کیوں معلوم ہونے لگا۔ وہ اس کے کمرے میں جاتے ہی نہیں ہیں۔

وقار : ابا جی ایک دن تیرا سارا مٹاپا جھڑا دیں گے۔

پسو : کیوں جھڑا دیں گے۔ مجھے اپنے موٹاپے سے بہت محبت ہے۔

وقار : اس لیے جھڑا دیں گے کہ تو نے انھیں خبر کیوں نہیں کی وہ نوری کے کمرے میں ٹھہری ہوئی ہے باجی کو تو معلوم ہوگا۔

پسو : ہاں دونوں خوب موٹی موٹی کتابیں پڑھتی ہیں اور پھر خوب باتیں کرتی ہیں۔

وقار : (سوچتے ہوئے) اچھا تو ایسا کر۔ (کچھ دیر رک کر سوچتے ہوئے) خیر۔ ذرا نوری کو تو بُلا لا۔ (پسو چلا جاتا ہے۔ وقار سگریٹ جلا کر اس کے کش لیتا ہے اور سوچتے ہوئے کمرے میں آتا ہے۔ کچھ دیر بعد نوری کمرے میں آتی ہے۔ وقار کچھ دیر اسے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر جیب میں سے چیک نکال کر نوری کو واپس کرتے ہوئے (یہ نوری۔ اب اس کی مجھے ضرورت نہیں۔)

نوری : (حیرت سے وقار کو دیکھ کر) کیوں۔

وقار : اب میں الیکشن لڑنا نہیں چاہتا۔ (نوری برابر اس کا چہرہ دیکھتی رہتی ہے— وقار اخبار اٹھا کر اسے دیتے ہوئے) اسے پڑھو۔ (نوری پوسٹر پڑھتی ہے) کیا اس کے بعد میں الیکشن جیت جاؤں گا۔ گھر میں یہ ناٹک کھیلا جارہا ہے اور تو نے مجھے خبر تک نہ دی۔

نوری : ایسا کوئی ناٹک نہیں کھیلا جارہا ہے جو قابلِ اعتراض ہو۔

وقار : تو کیا اس کی پوجا کی جارہی ہے۔ جانتی ہے اس پوسٹر کو دیکھتے ہی اس کی ساری برادری میرے خلاف ہوجائے گی اور اس وارڈ میں ان کی اچھی خاصی

تعداد ہے (پھر چیک نوری کی طرف بڑھا کر) لو اب مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

نوری : اسے اپنے ہی پاس رکھیے۔ ابھی کچھ روپیہ اور میرے پاس ہے اگر ضرورت پڑے تو لے لیجیے گا اور ابھی تو الیکشن کے دن ہیں۔ اس وقت تک کوئی تدبیر نکل آئے گی۔

وقار : کیا خاک تدبیر نکل آئے گی۔ سارے خاندان کی ناک کٹوا دی اس منحوس نے۔

نوری : مگر آپ تو ذات پات اونچ نیچ کو نہیں مانتے۔ وہ اس دن کی آپ کی تقریر۔

وقار : (غصہ سے) سب بکواس تھی۔

(غصہ میں تیز تیز قدموں سے اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ نوری حیرت زدہ اسے جاتا ہوا دیکھتی رہتی ہے)

(پردہ)

چوتھا سین

منظر

(وہی کمرہ۔ دوسرے دن۔ وقار ایک کرسی پر بیٹھا ہے اس کے سامنے میز پر کچھ اخبار رکھے ہیں۔ پاس ہی فاروق کھڑا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک اخبار ہے جسے وہ پڑھ رہا ہے۔ کچھ دیر بعد وقار فاروق کو دیکھ کر)

وقار : تم مشتاق صاحب کے پاس گئے تھے۔

فاروق : جی نہیں۔ میں کہہ چکا ہوں کہ مجھے پالٹکس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

وقار : (طنزیہ) کیوں ہونے لگی۔ مجنوں، فرہاد، رانجھا کو پالٹکس سے کہاں دلچسپی تھی۔

فاروق : انھیں ہو یا نہ ہو۔ مجھے قطعی نہیں ہے۔

وقار : (طنزیہ) تو پھر آپ اپنے ہونے والے سسر سے بھی کیا ملے ہوں گے۔

فاروق : (وقار کا چہرہ غور سے دیکھ کر) کون ہونے والا سسر۔

وقار : جناب غفور خاں صاحب۔ سبزی فروش۔

(فاروق کچھ دیر وقار کو دیکھتا رہتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ تھمے ہوئے لہجے میں)

فاروق : بڑے بھیا۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی جو عزت کرتا ہوں وہ کرنا چھوڑ دوں۔

(اسی وقت پسو کمرے میں آ کر)

پسو : بڑے بھیا۔ دادا ننھا خاں آئے ہیں۔

(وقار ایک نظر فاروق پر ڈالتا ہے اور کمرے سے چلا جاتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد فاروق پسو کو دیکھ کر)

فاروق : نواب پسو۔ یہ ننھا خاں کیوں آئے ہیں۔

پسو : بڑے بھیا سے روپیہ لینے آئے ہوں گے۔ جب آتے ہیں بھر بھر مٹھی لے جاتے ہیں۔

(فاروق کچھ دیر خاموش رہ کر پسو سے)

فاروق : نوری سے جا کر کہہ دے کہ ایک پیالی چائے دے جائے۔

پسو : میں اس سے بات نہیں کرتا۔

فاروق : آپ اس سے بات کیوں نہیں کرتے۔

پسو : مجھے موٹا کہتی ہے اور کہتی ہے میری عقل بھی میری طرح موٹی ہے۔ بس میں نے اس سے بات کرنا چھوڑ دیا ہے۔ آپ ہی کہیے میری عقل موٹی ہے؟

فاروق : ارے کہاں۔ بہت دبلی ہے۔ جا کر اشارہ کر دے کہ میں بلا رہا ہوں۔ منہ سے کچھ نہ بولنا۔

(پسو چلا جاتا ہے۔ فاروق سگریٹ جلا کر کش لیتا ہے کہ نوری کمرے میں آ کر)

نوری : فرمایئے۔ کیا حکم ہے۔

فاروق : کیا کر رہی تھی۔

نوری : (مسکرا کر) بھنڈیوں کا حلوہ پکا رہی تھی۔

فاروق : دیکھو نوری بی بی ہم سے میٹھی بھنڈیاں پکی نہیں اور تم حلوہ پکانے لگیں۔

نوری : آپ دیکھنا تو منے میاں پہلے بھنڈیوں کا حلوہ پکاؤں گی اور پھر بھنڈیوں کے رس گلے۔

فاروق : واہ۔ واہ۔ منہ میں پانی بھر آیا۔ اچھا اس وقت تو ایسا کیجیے کہ ایک پیالی چائے پلا دیجیے (نوری جانے کے لیے مڑتی ہے) اور سنیے۔ (نوری مڑ کر دیکھتی ہے) دودھ اور شکر زیادہ پتی کم۔ مگر بھنڈیوں کا آب جوش نہ ملا دینا۔ (نوری ہنستی ہے اسی وقت برجیس کمرے میں آتی ہے۔ فاروق اسے دیکھ کر) ان کے لیے کڑک۔ (نوری چلی جاتی ہے) فاروق غور سے برجیس کا جائزہ لے کر) جانِ عالم کیا ارادہ ہے۔

برجیس : (بگڑ کر) یہ کیا لفنگا پن ہے۔

فاروق : اچھا تو مادام۔ یہ ٹھاٹ باٹ کس سلسلے میں ہیں۔

برجیس : میں ذرا اپنے میکے جا رہی ہوں۔

فاروق : خدا خیر کرے۔ کیا رات کوئی خواب دیکھا تھا۔

برجیس : میں اپنی برادری میں جا کر بڑے بھیا کا ورک کروں گی۔

فاروق : مر گئے۔ (تقریباً دوڑتے ہوئے فرزانہ کے کمرے کے پاس جا کر گھبرائے ہوئے لہجے میں بلند آواز سے) باجی— باجی ذرا جلدی آنا— ارے باجی کیا کر رہی ہو ذرا جلدی تو آؤ۔

(فرزانہ گھبرائی ہوئی آتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں کتاب ہے جس کے درمیان میں انگلی رکھے ہوئے ہے۔ فاروق کو دیکھ کر)

فرزانہ : کیا بات ہے منے میاں۔ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں؟

فاروق : پالِٹکس باجی پالِٹکس۔

فرزانہ : (حیرت سے) پالِٹکس۔ کیسی پالِٹکس۔

فاروق : (برجیس کی طرف اشارہ کر کے) یہ پالِٹکس میں حصہ لینے جا رہی ہیں۔

فرزانہ : (اطمینان کا سانس لے کر کمرے کے درمیان میں آتے ہوئے) بھئی تم نے

تو ڈرا دیا۔ میں سمجھی جانے مکان میں آگ لگ گئی ہے یا سانپ نکل آیا ہے
جو ایسی چیخ پکار کر رہے ہو۔

فاروق : ارے باجی آدم خور شیر نکل آتا۔ بھوت میرے چاروں طرف ناچنے لگتے۔ زلزلے آتے طوفان آتے تب بھی میں نہیں ڈرتا۔ مگر پالیٹکس سچ مچ باجی میرے سارے بدن میں کپکپی ہے۔ شاید بخار آگیا ہے (ہاتھ فرزانہ کی طرف بڑھا کر) ذرا نبض دیکھنا باجی۔

فرزانہ : (فاروق کی باتوں پر دھیان نہ دے کر۔ برجیس کے پاس جاکر) کیا بات ہے برجیس۔

برجیس : (ہنس کر) کوئی بات نہیں باجی۔ میں کچھ دن کے لیے میکے جارہی ہوں۔ اپنی برادری کو سمجھاؤں گی کہیں اس کا اُلٹا اثر بڑے بھیا کے الیکشن پر نہ پڑے۔

فرزانہ : مگر تمھارا وہاں جانا۔

برجیس : باجی میں بالغ ہوں آزاد ہوں پڑھی لکھی ہوں۔ کوئی مجھے وہاں قید تو کر نہیں لے گا۔ (ہنس کر) اور کوئی چوری چھپے گھر سے بھاگ کر بھی نہیں آئی ہوں کہ پولیس پیچھے ہو۔

(اسی وقت نوری چائے لے کر آتی ہے ایک پیالی فاروق کو اور ایک برجیس کو دے کر واپس جاتے ہوئے)

نوری : باجی میں آپ کے لیے بھی لاتی ہوں۔

فرزانہ : نہیں بھئی۔ میں اس وقت چائے نہیں پیوں گی۔

فاروق : (پیالی میں چائے دیکھ کر) نوری بی بی آج بھی دودھ پی گئی یا بھنڈیوں کے حلوے میں ڈال دیا۔

فرزانہ : بھنڈیوں کا حلوہ۔

فاروق : جی ہاں نوری صاحبہ بھنڈیوں کا حلوہ پکا رہی ہیں اور فرما رہی تھیں کل بھنڈیوں کے رس گلّے بناؤں گی۔ (نوری کی طرف دیکھ کر) نوری بی بی میں نے آپ

سے کتنی مرتبہ عرض کیا ہے کہ میری چائے میں دودھ شکر زیادہ اور پتی کم ہونا چاہیے۔

نوری : (فاروق کی بات پر دھیان نہ دے کر) باجی۔ آج دودھ والا صرف ڈیڑھ لیٹر دودھ دے گیا ہے اور کہہ گیا ہے آدھا لیٹر پانی ملا لینا۔

فرزانہ : کیا مطلب۔

نوری : مطلب منے میاں سے پوچھیے

فاروق : میں کیا جانوں

نوری : کیوں آپ نے اس سے نہیں کہا تھا کہ تو شدھ پانی نہیں ملاتا ہم سے کہہ دیا کر کتنا ملانا ہے ہم خود ملا لیا کریں گے۔

برجیس : (ہنس کر) تو یہ دودھ والا ان کا بھی استاد نکلا۔

نوری : میں نے صبح ان سے پوچھا کون سا پانی ملاؤں تو کہنے لگے کارپوریشن کے نلوں میں شدھ پانی نہیں آتا۔ بارش ہونے دے ہم دودھ میں ملانے کے لیے شدھ پانی جمع کرلیں گے۔

برجیس : اور اب باقی دودھ میں بھی اس نے پانی ملایا تو کیا کرو گے۔

فاروق : پھر اس سے شدھ دودھ دینے کی درخواست کریں گے اور خود زیادہ پانی ملا سکیں گے۔

برجیس : (ہنس کر) اور ایک دن وہ آئے گا کہ دودھ کے دام دے کر شدھ پانی پیا کریں گے۔

(فرزانہ اور نوری ہنستی ہیں۔ نوری میز پر سے پیالی اٹھاتی ہے۔ فاروق پانی کی پیالی اسے دے کر)

فاروق : یہ لے اور بھاگ یہاں سے (نوری پیالی لے کر جاتی ہے) اور سن (نوری مڑ کر دیکھتی ہے) ابا جی سے کہہ دینا کل تو بھنڈیوں کا حلوہ پکا رہی ہے۔

نوری : ان سے کیوں کہہ دوں۔

فاروق : تاکہ تیرا جیب خرچ بند ہو جائے بہت فضول خرچ ہو گئی ہے۔ باجی۔ اس نے

اپنی جمع پونجی کے دس ہزار روپے بڑے بھیا کو الیکشن لڑنے کو دے ڈالے۔

(فرزانہ نوری کی طرف دیکھتی ہے۔ نوری نظریں جھکا کر)

نوری : انھیں ضرورت تھی دے دیا۔ وہ واپس کر دیں گے۔

(فرزانہ خاموش رہتی ہے۔ نوری کمرے میں چلی جاتی ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ پھر فرزانہ فاروق کو دیکھ کر)

برجیس : آپ بڑے بھیا کے الیکشن لڑنے کے اس قدر خلاف کیوں ہیں۔

فاروق : اس لیے کہ وہ الیکشن ہار جائیں گے۔ روپیہ برباد ہوگا اور بدنامی ہاتھ آئے گی۔

برجیس : آپ نے پہلے ہی سے سمجھ لیا کہ وہ الیکشن ہار جائیں گے۔

فاروق : ہاں۔ اس لیے کہ ننھا خاں پیسے ان سے لے رہا ہے اور کام خلیق مرزا کا کر رہا ہے۔

فرزانہ : خلیق مرزا کا۔

فاروق : جی۔ خلیق مرزا اور ننھا خاں مل کر جوا خانہ چلاتے ہیں۔ وہ اِن کے لیے کام کیوں کرنے لگا۔

فرزانہ : تمھیں کیسے معلوم کہ وہ جوا خانہ چلاتے ہیں۔

فاروق : میں اسی شہر میں رہتا ہوں باجی

فرزانہ : یہ بات وقار کو معلوم ہے۔

فاروق : معلوم کیوں نہ ہوگی سارا شہر جانتا ہے (برجیس کی طرف دیکھ کر) جایئے آپ بھی اپنی سی کر دیکھیے۔ حسرت نہ رہ جائے دل میں۔ مگر آپ کی برادری والے اتنے بے وقوف تو نہ ہوں گے کہ آپ کے کہنے پر غنڈوں سے دشمنی مول لے کر اپنی دکانیں لٹوا دیں۔

برجیس : (جوش کے انداز میں) اور اتنے بزدل بھی نہیں ہیں کہ غنڈوں سے ڈر جائیں۔ وہ اپنی حفاظت کرنا جانتے ہیں (فرزانہ سے) باجی۔ میں تین چار دن میں واپس آجاؤں گی۔

(جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے سے چلی جاتی . کمرے میں پھر خاموشی

طاری ہو جاتی ہے۔ فرزانہ کرسی پر بیٹھ کر کتاب پڑھنے لگتی ہے۔ فاروق ایک اخبار اٹھا کر دیکھنے لگتا ہے کہ وقار کمرے میں آتا ہے۔ وہ کچھ فکرمند نظر آتا ہے۔ کمرے میں ٹہلتا ہے۔ فرزانہ کچھ دیر اسے دیکھنے کے بعد)

فرزانہ : وقار۔ کیا تمھیں ننھا خاں پر بھروسہ ہے۔

وقار : کیوں نہ ہوگا۔

فرزانہ : سنا ہے وہ اور خلیق مرزا جوا خانہ ــــ

وقار : (بات کاٹ کر) چلاتے ہوں گے۔ مگر الیکشن میں میرا ورک کر رہے ہیں الیکشن لڑانا بھی ان کا ایک بزنس ہے۔ آخر غنڈوں کا بھی کوئی کیریکٹر ہوتا ہے۔

فاروق : ہوتا تھا مگر اب نہیں۔ پہلے غنڈے محلے کے شرفا کی عزت کرتے تھے۔ ان کی بے عزتی کو اپنی بے عزتی سمجھتے تھے مگر اب ــــ

وقار : مگر اب کیا۔

فاروق : ننھا خاں کا کیریکٹر یہ اخباری خبر ہے جس سے انھوں نے ہمارے خاندان کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی ہے (نفرت سے) ضمیر فروش۔

وقار : (بگڑ کر) تم کیا ہمیشہ ضمیر فروشی کی بات کرتے رہتے ہو۔ کیا بڑے بڑے سرکاری افسر، بڑے بڑے سیاست داں اور فنکار تمھارے نزدیک سب ضمیر فروش ہیں، تم مصلحت پسندی کو ضمیر فروشی کہتے ہو۔

فاروق : جی ہاں۔ مصلحت پسندی نہ صرف ضمیر فروشی ہے بلکہ بزدلی کی وہ بدترین شکل ہے جو انسان کی خودداری میں گھن لگا دیتی ہے۔ مصلحت پسندی خود کو بیچ دینے کا عزت دار نام ہے۔ ان بزدل مصلحت پسندوں نے ہمیشہ سقراط کو زہر کا پیالہ دیا ہے۔

وقار : (غصہ سے واپس جاتے ہوئے) تم سے تو بات کرنا اپنی بے عزتی کرنا ہے۔ (کمرے سے چلا جاتا ہے۔ فرزانہ کچھ دیر خاموش رہ کر)

فرزانہ : منے میاں۔ تم وقار کے الیکشن سے دلچسپی لینا نہیں چاہتے نہ لو مگر۔ اس کے

سامنے ناامیدی کی باتیں کرنے سے کیا حاصل۔

فاروق : مجھے امید و ناامیدی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ خود فضول باتیں کر کے مشتعل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ابھی کہہ رہے تھے کہ تم اپنے سسر غفور سے ملے تھے۔

فرزانہ : مگر پھر بھی —

فاروق : پھر بھی کیا۔ ننھا خاں نے چند غنڈوں کو اس کام پر لگا دیا ہے کہ وہ گھر گھر جا کر لوگوں کو دھمکاتے ہیں کہ اگر انھوں نے وقار صاحب کو ووٹ نہیں دیا تو ان کی خیر نہیں۔ اس سے سارا ماحول بڑے بھیا کے خلاف ہو گیا ہے۔

(فرزانہ سوچنے لگتی ہے کہ پسو گھبرایا ہوا آتا ہے اور گھبرائے ہوئے لہجے میں)

پسو : مر گئے باجی — مر گئے۔

فرزانہ : (حیرت سے) کون مر گئے۔

پسو : (خوف سے کانپتے ہوئے) ہم سب باجی۔ ہم سب۔ منے میاں بھاگو۔

فاروق : ابے ہوا کیا۔ کیوں دم نکلا جا رہا ہے۔

پسو : بڑے حضور بہت غصہ میں ہیں وہ ہم سب کو مار ڈالیں گے۔

فاروق : کیوں مار ڈالیں گے۔

پسو : پتہ نہیں۔ وہ کہہ رہے تھے تم سب کو گولی مار دوں گا۔ منے میاں میں ابھی مرنا نہیں چاہتا — امیرن کے پانچ بچے — باجی مجھے بچاؤ امیرن کے پانچ بچے۔ وہ نوری کو دو گولیاں ماریں گے۔ وہ بے چاری تو ابھی کنواری ہے۔

فاروق : (جھنجھلا کر) ابے کچھ بتلائے گا بھی یا نہیں۔ گولی لگنے سے پہلے ہی مرا جا رہا ہے۔

پسو : وہ میں نے — یعنی بڑے بھیا نے — مگر نوری کے دو گولیاں ماریں گے۔ خیر اسے ماریں میرا اس سے جھگڑا ہے۔ مگر نہیں بے چاری ابھی کنواری ہے — اور باجی — وہ امیرن کے پانچ بچے۔

فرزانہ : کہاں ہیں ابا جی

پسو : اپنے کمرے میں ہیں— مگر وہ—

فرزانہ : (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) اچھا میں جاکر دیکھتی ہوں کیا بات ہے۔

پسو : (فرزانہ کا راستہ روک کر) نہیں باجی نہیں۔ وہ آپ کو گولی مار دیں گے بہت غصہ میں ہیں۔

فرزانہ : چل ہٹ راستے سے دیکھوں کیا بات ہے۔

پسو : نہیں باجی نہیں۔ آپ بہت اچھی۔ وہ غصہ میں—

فرزانہ : (ہاتھ سے اسے ایک طرف کرکے) چل ہٹ—

(آگے بڑھتی ہے کہ منیر صاحب کمرے میں آتے ہیں ان کے چہرے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ غصہ کو ضبط کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ کچھ دیر خاموشی سے ماحول کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ کمرے میں سناٹا چھایا رہتا ہے۔ منیر صاحب ایک ایک کو غور سے دیکھ کر)

منیر : نوری کہاں ہے۔ (سب خاموش رہتے ہیں۔ ذرا بلند آواز سے) میں پوچھ رہا ہوں، نوری کہاں ہے۔ (سب اب بھی خاموش رہتے ہیں) کیا تم سب گونگے ہوگئے ہو (سب خاموش رہتے ہیں۔ پسو کی طرف دیکھ کر) تو بول نوری کہاں ہے۔

پسو : باورچی خانہ میں

منیر : جا— اور اسے بلا کر لا

(پسو چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے پھر فرزانہ)

فرزانہ : بات کیا ہے ابا جی

منیر : ابھی معلوم ہوجائے گا۔ (فاروق سے) وقار کہاں ہے۔

فاروق : ابھی یہیں تھے۔ وہ شاید الیکشن کے کام

(نوری اور پسو آتے ہیں دونوں سہمے ہوئے ہیں۔ فاروق خاموش ہوجاتا ہے۔ منیر پہلے تو نوری کو غور سے دیکھتے ہیں۔ پھر)

منیر : تم کہاں تھیں

نوری : باورچی خانے میں

منیر : (پھر اُسے غور سے دیکھتے ہوئے) تیرے کمرے میں کون لڑکی ٹھہری ہوئی ہے۔

نوری : (گھبرا کر) لڑکی— اباب جی وہ— وہ

منیر : میں پوچھ رہا ہوں کون لڑکی ہے۔

فرزانہ : کون لڑکی ہو سکتی ہے ابا جی۔

منیر : میں یہی پوچھ رہا ہوں۔

فرزانہ : کوئی بھی لڑکی نہیں ہے ابا جی

منیر : (غصہ سے) جھوٹ مت بولو۔

فرزانہ : آپ جا کر دیکھ لیجیے۔

منیر : وہ تو میں دیکھوں گا ہی۔ مگر میں نوری سے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ بول کون لڑکی ہے۔ (نوری خاموش رہتی ہے) تو نہیں بولے گی۔ اچھا۔ دروازے کی طرف جاتے ہوئے) میں خود جا کر دیکھتا ہوں۔

(دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ نوری رونے لگتی ہے)

فرزانہ : کیوں رو رہی ہے۔

نوری : (فرزانہ سے لپٹ کر روتے ہوئے) باجی— وہ— وہ—

فرزانہ : (محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر مسکراتے ہوئے) پگلی تیرے کمرے میں کوئی نہیں ہے۔

پسو : ہے باجی ہے۔ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھی۔

فرزانہ : تو نوری کے کمرے میں کیوں گیا تھا کیا ابا جی نے وہاں جانے کو منع نہیں کر رکھا ہے۔

پسو : مگر باجی— میں تو—

فاروق : اچھا تو یہ آپ کی حرکت ہے

پسو : جی نہیں — جی نہیں — وہ تو —

(منیر پھر کمرے میں آتے ہیں۔ پسو خاموش ہوجاتا ہے۔ منیر غصہ سے پسو کو دیکھ کر)

منیر : کہاں ہے لڑکی

پسو : (ڈر سے کانپتے ہوئے) پتہ نہیں — شاید چھلاوہ —

منیر : خاموش۔ چھلاوہ کیا ہوتا ہے

: لڑکی۔ کبھی یہاں کبھی وہاں

سیر : بدتمیز۔ (نوری کو دیکھتے ہیں جو سہمی ہوئی فرزانہ کے پاس کھڑی ہے۔ آہستہ آہستہ نوری کے پاس آتے ہیں۔ چند سیکنڈ اسے دیکھتے رہتے ہیں۔ اب آنکھوں میں غصہ کی جگہ محبت ہے۔ اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو پونچھ کر) نوری۔ میں نے تجھ پر شک کرکے تجھے دکھ دیا۔ مجھے معاف کردے بیٹی۔ (نوری نظریں اٹھا کر انھیں دیکھتی ہے اور پھر ان سے لپٹ کر رونے لگتی ہے۔ محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر) نہ رو بیٹی نہ رو۔ آ میرے ساتھ میرے کمرے میں چل (پسو کی طرف دیکھ کر) میں تجھے ابھی سمجھتا ہوں۔

پسو : (گھبرا کر) ابا جی — میں — میں —

(منیر کوئی دھیان نہیں دیتے۔ نوری کو سہارا دیتے ہوئے اسے اپنے کمرے میں لے جاتے ہیں۔ کچھ دیر بعد فاروق پسو کو دیکھ کر)

فاروق : یہ حرکت کیا تھی۔

پسو : میری نہیں ہے منے میاں میری نہیں۔ بڑے بھیا کی۔ انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ

فاروق : دیکھا باجی۔ ان نیتا جی کا کردار

(فرزانہ خاموش رہتی ہے)

(پردہ)

پانچواں سین

منظر:

(وہی کمرہ فاروق ایک کرسی پر بیٹھا بے دلی سے ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہا ہے۔ دوسری کرسی پر فرزانہ آنکھیں بند کیے بیٹھی ہے اس کی گود میں ایک کھلی ہوئی کتاب رکھی ہے۔ باہر سے آوازیں آتی ہیں۔ ''خلیق مرزا زندہ باد۔'' فاروق ٹھنڈی سانس بھر کر کھڑے ہوتے ہوئے)

فاروق : تو فیصلہ ہو گیا۔

(فرزانہ غمگین نگاہوں سے فاروق کو دیکھتی ہے۔ اسی وقت نوری چائے لے کر آتی ہے۔ اس کا چہرہ ستا ہوا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ رو دینے کو تیار ایک پیالی فرزانہ کو دیتی ہے۔ دوسری فاروق کو۔ ایک پیالی خود لے کر ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے)

نوری : (اس انداز سے جیسے وہ اس خاموشی کو توڑنا چاہتی ہو فاروق کی طرف دیکھ کر) آج تو چائے ٹھیک بنی ہے۔

فاروق : (کچھ دیر خاموش رہ کر) برجیس کہاں ہے۔

نوری : باجی کے کمرے میں بیٹھی پڑھ رہی ہیں۔ میں چائے وہیں دے آئی ہوں۔

(نوری بھی ایک کرسی پر بیٹھ کر چائے پینے لگتی ہے۔ ماحول پر ایک غمگین سناٹا چھا جاتا ہے۔ فاروق کچھ دیر بعد جیسے اس ماحول سے اکتا کر)

فاروق : نوری۔ (نوری مڑ کر اسے دیکھتی ہے) تو نے بھنڈیوں کے رس گلے ابھی تک نہیں بنائے (نوری خاموش رہتی ہے) بھنڈی بڑا دیہاتی نام ہے (نوری اب بھی خاموش رہتی ہے۔ فاروق نوری کے پاس آ کر) انگریزی نام بڑا شاعرانہ ہے۔ لیڈیز فنگر۔ (نوری اب بھی خاموش رہتی ہے) کیا بات ہے تو اس قدر خاموش کیوں ہے۔ (نوری اب گردن جھکائے چائے پیتی رہتی

ہے) اپنا روپیہ ڈوب جانے کا غم ہے۔

نوری : (نظریں اٹھا کر فاروق کو دیکھ کر) جی نہیں۔

فاروق : تو پھر اس قدر خاموش کیوں ہے۔ بڑے بھیا کے ہارنے کا غم ہے۔

فرزانہ : اب ہار جیت تو لگی رہتی ہے۔ تو نے کتنا روپیہ دیا تھا وقار کو۔

نوری : میں نے کہا نہیں مجھے روپے کی پرواہ نہیں۔

فاروق : دس ہزار تو ایک مرتبہ دیے تھے پسو کہہ رہا تھا پانچ ہزار اور دیے تھے۔ چوری چھپے اور دیے ہوں تو معلوم نہیں۔

فرزانہ : پندرہ ہزار ہی کیا کم ہوتے ہیں۔

نوری : (بیزاری) میں نے کہہ دیا مجھے روپے کی پرواہ نہیں ہے۔

(تیزی سے اٹھ کر کمرے سے چلی جاتی ہے۔ فرزانہ اور فاروق اسے خاموشی سے جاتے ہوئے دیکھتے رہتے ہیں۔ کچھ دیر بعد فاروق ٹھنڈی سانس بھر کر)

فاروق : بیوقوف لڑکی۔

فرزانہ : (سوالیہ نظروں سے فاروق کو دیکھ کر) کیا بات ہے منے میاں۔

فاروق : کچھ نہیں باجی۔ پتھر سے سر ٹکرانے سے اپنا ہی سر پھوٹتا ہے۔ (فرزانہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہتی ہے۔ فاروق پھر ٹھنڈی سانس بھر کر) ان الیکشن لڑنے والوں کے سینہ میں دھڑکتا ہوا دل نہیں صرف گوشت کا لوتھڑا ہوتا ہے۔

فرزانہ : کیا سچ مچ منے میاں نوری وقار سے——

(خاموش ہو جاتی ہے۔ کھڑی ہو کر غور و فکر کے عالم میں ٹہلتی ہے۔ کچھ دیر بعد وقار کمرے میں آتا ہے اور دونوں کو خاموش دیکھ کر)

وقار : کیا بات ہے باجی۔ آپ دونوں خاموش کیوں ہیں (فرزانہ وقار کو دیکھتی ہے مگر خاموش رہتی ہے۔ وقار فاروق کو دیکھ کر) اور تم بھی خاموش ہو۔ (مسکرا کر) ارے بھئی ہار جیت تو لگی رہتی ہے۔

فاروق : جی ہاں جب دو مقابلہ کرتے ہیں تو ایک ہارتا ہی ہے مگر——

وقار : مگر — مگر کیا۔

فاروق : مگر یہ کہ کچھ لوگوں کی ہارنے کے بعد بھی عزت کم نہیں ہوتی۔

وقار : (طنزیہ) تمھارے نزدیک ہارنے کے بعد میں بے عزت ہوگیا ہوں (ٹھنڈی سانس بھر کر) اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔

فاروق : کیا کہنا چاہتے ہیں آپ۔

وقار : شاید تم وہ خبر بھول گئے جو اخبار میں چھپی تھی۔

فاروق : (طنزیہ مسکرا کر) گویا آپ کی ہار کا سبب وہ خبر ہے (چند سیکنڈ رک کر) بڑے بھیا کبھی آپ نے سوچا ہے کہ آپ نے کون سا کردار پبلک کے سامنے پیش کیا ہے۔

وقار : (مذاق اڑانے کے انداز میں) میں نے تو نہیں سوچا آپ بتلا دیجیے۔

فرزانہ : بھئی اس بحث کو ختم کرو۔

وقار : نہیں باجی کہنے دیجیے۔ (طنزیہ) فرمایئے۔فرمایئے۔

فاروق : (کچھ دیر وقار کا چہرہ دیکھتا رہتا ہے۔ پھر، اگر آپ سننا ہی چاہتے ہیں تو سنیے۔ جب جاگیرداروں کا دور دورہ تھا تو آپ ان کے قصیدے پڑھتے رہے۔ جب ان کا دور دورہ ختم ہوا تو آپ یکا یک کمیونسٹ بن گئے اور ابھی کچھ دن پہلے آپ نے ایک فرقہ پسند جماعت کی ادبی شاخ کی صدارت فرمائی۔آپ ہیں کیا۔

وقار : (ہنس کر) منے میاں سیاست میں یہ داؤں پیچ تو کرنا پڑتے ہیں۔

فاروق : بڑے بھیا۔ میں کوئی سیاست داں نہیں ہوں مگر میں صرف جلسوں کی صدارت کرنے کو زندگی کی معراج نہیں سمجھتا۔ میں سیاسی داؤں پیچ بھی نہیں سمجھتا لیکن اتنا ضرور محسوس کرتا ہوں کہ آپ کا کوئی سیاسی کردار نہیں ہے۔ میں اس بات سے دکھی ہوں کہ عوام میں آپ کی کوئی امیج نہیں ہے۔

(وقار خاموشی سے فاروق کو دیکھتا رہتا ہے کہ پسو کمرے میں آکر ایک کتاب

فرزانہ کو دے کر)

پسو : باجی۔ ابا جی نے یہ کتاب نہیں دوسری کتاب منگائی ہے۔

فرزانہ : دوسری کتاب۔ کون سی

پسو: میں نے پہلی ہی کتاب نہیں پڑھی دوسری کیا جانوں۔

فاروق : (ٹھنڈی سانس بھر کے) اچھا کیا پسو نے پہلی کتاب بھی نہیں پڑھی۔ اگر تو پڑھ لیتا تو الیکشن لڑنے والا ہوتا، کوئی بڑا فنکار ہوتا کوئی بڑا افسر ہوتا پھر تو مصلحت پسند ہوتا اور اپنے ہی بارے میں سوچتا۔ نہ امیرن کے بارے میں سوچتا اور نہ اس کے پانچ بچوں کے بارے میں۔

(وقار اور فرزانہ فاروق کی طرف دیکھتے ہیں جو بہت دکھی نظر آ رہا ہے۔ وقار اس طرح فاروق کی طرف بڑھتا ہے جیسے بہت متاثر ہو گیا ہو مگر پھر سوچ کر رک کر پسو کی طرف دیکھ کر)

وقار : نوری کہاں ہے۔

پسو : باورچی خانہ میں۔ بڑے بھیا۔ آپ کی ہار کو سن کر وہ خوب روئی۔ کھانا تک نہیں کھایا۔ صبح سے خاموش بیٹھی ہے۔

(وقار سوچتا ہے اور باورچی خانے میں چلا جاتا ہے۔

فرزانہ : (سوچتے ہوئے) جانے ابا جی نے کون سی کتاب منگائی ہے)

(پسو کی لائی ہوئی کتاب لے کر اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے فاروق کرسی پر بیٹھ کر جیسے اپنے غم کو بھلانے کی کوشش کر رہا ہو)

فاروق : کیوں نواب پسو۔ اب تو لوکی میں درد نہیں ہوتا۔

پسو : کبھی کبھی ہوتا ہے۔

فاروق : شادی کر لے پھر نہیں ہوگا۔

پسو : اور اگر وہ بھی پانچ بچے چھوڑ کر بھاگ گئی پھر۔

(فرزانہ پھر کمرے میں آتی ہے اور پسو سے)

فرزانہ : ارے بے وقوف پوچھ تو آیا ہوتا کون سی کتاب چاہیے۔
(ابا جی کے کمرے میں چلی جاتی ہے)

پسو : منے میاں۔ بڑے بھیا کی ہار پر کیوں روئے، نہ آپ روئے نہ باجی۔

فاروق : اس کی لوکی میں بھی درد ہوتا ہے۔

پسو : یہ تو چھوت کی بیماری معلوم ہوتی ہے ایک سے دوسرے کو لگتی ہے۔

فاروق : اس کا علاج معلوم ہے (پسو بے وقوفی سے سر ہلاتا ہے) شادی۔

پسو : شادی!

فاروق : ہاں۔ بیوی کان کھینچ کھینچ کر لوکی درد کو سر کی طرف بھگا دیتی ہے۔

پسو : (سوچتے ہوئے) اچھا ہی ہوا کہ امیرن اپنے گھر والے کے ساتھ بھاگ گئی۔ نہیں تو میرے بھی سر میں درد ہونے لگتا اور کیوں منے میاں نوری کا گھر والا بھی اس کے کان—

فاروق : (بات کاٹ کر) ابے نہیں۔ کان تو صرف عورتیں کھینچتی ہیں۔

(اسی وقت منیر صاحب اور فرزانہ کمرے میں آتے ہیں۔ فاروق انھیں دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ منیر صاحب کے چہرے پر اس وقت وہ سختی نہیں جو اکثر رہا کرتی ہے۔ کچھ دیر فاروق کو دیکھتے رہتے ہیں جو اب کھڑا ہو گیا ہے۔)

منیر : فاروق۔ (فاروق نظریں اٹھا کر منیر کو دیکھتا ہے) ابھی فرزانہ نے بتلایا کہ تمھیں وقار کے ہارنے کا بہت غم ہے (فاروق نظریں جھکا لیتا ہے) اپنی ہار کو ہنستے ہوئے برداشت کرنا چاہیے۔

فاروق : مگر ابا جی—

منیر : دیکھو وقار کے چہرے پر تو شکن بھی نہیں ہے۔

فاروق : مگر میں کیا کروں ابا جی۔ میں الیکشن لڑنے والوں کی طرح سخت دل نہیں ہوں۔

منیر : نرم دل ہونا شرافت اور انسانیت ہے اور ہار کو قبول کرنا بہادری۔ ہارنے کو جیتنے کا ایک زینہ سمجھنا چاہیے۔

(فرزانہ کے کمرے کی طرف بڑھتے ہیں۔ فاروق گھبرا کر)

فاروق : ابا جی— (منیر مڑ کر دیکھتے ہیں) وہ— وہ—

فرزانہ : ابا جی وہ کتاب میرے کمرے میں نہیں ہے آپ ہی کے کمرے میں ہوگی۔

منیر : کیا بات کرتی ہو۔ میں نے اپنے کمرے کی ایک ایک کتاب اٹھا کر دیکھ لی ہے۔

فرزانہ : اپنے کمرے کے دروازے کے پاس جا کر) آپ بیٹھیے میں پھر تلاش کیے لیتی ہوں۔

منیر : میں ہی دیکھ لوں گا۔ تم لوگوں کا آج دماغ ٹھیک نہیں ہے۔

(فرزانہ کے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ فاروق گھبرا کر)

فاروق : باجی— وہ— اب کیا ہوگا۔

(بے چینی سے کمرے میں ٹہلتا ہے۔ فرزانہ کے چہرے سے بھی پریشانی ظاہر ہوتی ہے کہ منیر پھر کمرے میں آتے ہیں۔ ان کے چہرے سے اب غصہ ظاہر ہو رہا ہے۔ پہلے فاروق کو پھر فرزانہ کو دیکھ کر)

منیر : وقار کہاں ہے۔ (فرزانہ خاموش رہتی ہے۔ فاروق کی طرف دیکھ کر) میں پوچھ رہا ہوں وقار کہاں ہے۔

(فاروق خاموش رہتا ہے۔ منیر صاحب پسو کو دیکھتے ہیں۔ پسو گھبرا کر)

پسو : باورچی خانہ میں۔ نوری کے پاس۔

منیر : نوری کے پاس کیوں ہے۔ جا بلا کر لا۔

(پسو چلا جاتا ہے۔ منیر صاحب کبھی فرزانہ کو اور کبھی فاروق کو دیکھتے ہیں— دونوں سر جھکائے کھڑے ہیں کہ وقار کمرے میں آتا ہے اس کے پیچھے پسو اور نوری بھی آتے ہیں۔ پہلے تو منیر صاحب وقار کو سر سے پیر تک غصہ سے دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر دو قدم اس کی طرف بڑھا کر)

منیر : تمھارے کمرے میں کون لڑکی ہے۔

وقار : (گھبرا کر) میرے کمرے میں لڑکی

منیر : ہاں تمھارے کمرے میں۔ سچ کہو کون ہے وہ لڑکی

فاروق : ابا جی— وہ—

منیر : تم خاموش رہو۔ میں وقار سے پوچھ رہا ہوں۔

وقار : میرے کمرے میں کون لڑکی ہوسکتی ہے۔

منیر : تو پھر وہ نیلم پری ہے جو یا تو آسمان سے اُتری ہے یا زمین سے نکل آئی ہے۔ وہ برآمدے میں کھڑی تھی مجھے دیکھ کر تمھارے کمرے میں چلی گئی۔ (تیز تیز قدموں سے وقار کے کمرے کے پاس جاتے ہیں اور اندر جھانک کر) اے لڑکی ادھر آ۔ (کچھ دیر دروازے پر رکتے ہیں۔ برجیس کمرے سے باہر آتی ہے۔ منیر اس کی طرف اشارہ کرکے وقار سے) کون ہے یہ لڑکی۔

وقار : (گھبرا کر) جی— جی

منیر : کیا جی جی لگا رکھا ہے۔ بتلاؤ۔ کون ہے یہ

وقار : میں نہیں پہچانتا

منیر : تم نہیں پہچانتے۔ تمہارا کمرہ لڑکیوں کو جنم دیتا ہے۔ (برجیس کی طرف دیکھ کر) بول لڑکی تو کون ہے۔

برجیس : میں برجیس ہوں۔

فرزانہ : یہ وہی برجیس ہے جس کے مضامین کی آپ بہت تعریف کیا کرتے ہیں۔

منیر : (سر سے پیر تک برجیس کو دیکھ کر حیرت سے) اگر یہ وہی برجیس ہے تو ہمیں حیرت ہے۔ اس کم عمری میں اس قدر پختہ خیالات۔

برجیس : اور میں غفور سبزی فروش کی لڑکی ہوں۔

منیر : اس سے تمھاری قابلیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

برجیس : اور اس گھر کی بہو بھی۔

منیر : (حیرت سے) اس گھر کی بہو۔

برجیس : جی ہاں

منیر : (باری باری سے وقار اور فاروق کو دیکھ کر) تم دونوں میں سے کس کی نالائقی

ہے۔ (دونوں خاموش رہتے ہیں۔ برجیس فاروق کے پاس جاکر کھڑی ہو جاتی ہے۔ منیر فاروق کو دیکھ کر) تمھاری نالائقی ہے۔ جی چاہتا ہے تمھیں گولی ماردوں (فاروق سر جھکائے خاموش کھڑا رہتا ہے۔ منیر ایک کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں اور فاروق کو غور سے دیکھتے رہتے ہیں) تم نے مجھے بہت دکھ پہنچایا ہے فاروق۔

فاروق : مگر ابا جی۔۔۔

منیر : (بات کاٹ کر) مجھے اپنی اولاد پر فخر تھا کہ وہ مجھ پر بھروسہ کرتی ہے۔ تم نے مجھ پر بھروسہ نہ کرکے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ تم نے میرے باپ ہونے کی توہین کی ہے۔

فاروق : مگر ابا جی۔۔۔

منیر : خاموش نالائق۔۔۔ اگر تم مجھے سب کچھ بتلا دیتے تو میں تم پر فخر کرتا۔ (برجیس کی طرف دیکھ کر) لڑکی اپنا سر چھپا (برجیس گھبرا کر اس طرح سر پر دوپٹہ برابر کرتی ہے کہ وہ گھونگھٹ کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ منیر صاحب کے چہرہ پر مسکراہٹ ہے)

(پردہ)

پرچھائیوں کا پیچھا

افرادِ تمثیل

(1) فانوس (2) ترنم (فانوس کی بیوی) (3) خورشید (فانوس کا دوست) (4) اجمل (فانوس کا شناسا)

پہلا سین

منظر

ترنم: (ایک کمرہ جس میں بائیں جانب تخت بچھا ہے جس پر صاف ستھرا فرش اور گاؤ تکیہ رکھا ہے۔ تخت کے پاس ایک الماری ہے جس میں کتابیں ہیں اور جس کے اوپر کچھ بے حد قدیم مورتیاں رکھی ہیں۔ الماری کے سامنے ایک آرام کرسی ہے جس کے دائیں جانب ایک چھوٹی گول میز رکھی ہے جس پر ایک ٹائم پیس ہے۔ بائیں جانب ایک آفس ٹیبل ہے جو خالی ہے اور جو مختلف اوقات میں مختلف کاموں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ میز کے پاس دو تین کرسیاں بے ترتیب پڑی ہیں۔ کمرے میں دائیں بائیں دروازے ہیں

جن پر پردے پڑے ہیں۔ ترنم صرف چیٹی کوٹ اور بلاؤز پہنے ہوئے مورتیوں کے پاس کھڑی انھیں غور سے دیکھ رہی ہے۔ کچھ دیر بعد غصے اور نفرت آمیز لہجے میں۔)

ترنم : تم نے میری زندگی اجیرن کردی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تمھارے ٹکڑے ٹکڑے کردوں (کال بیل کی آواز) لو وہ تمھارے عاشق آ گئے۔ اب تم سے گھنٹوں باتیں کریں گے۔ (کال بیل کی آواز۔ اسی طرح مورتیوں کو دیکھتے ہوئے) ارے تو یہ گھنٹی کا جلترنگ کیوں بجا رہے ہو۔ آ کیوں نہیں جاتے۔ کیا میں تم سے پردہ کرتی ہوں۔ (دروازے کی طرف دیکھتی ہے ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ عمر تیس سال کے قریب ہے۔ صحت مند، خوب صورت اور دلکش شخصیت کا مالک ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو مبہوت کھڑے دیکھتے رہتے ہیں پھر ایک دم ترنم کو احساس ہوتا ہے کہ وہ صرف بلاؤز اور چیٹی کوٹ پہنے ہے۔ "ارے" کہہ کر تقریباً بھاگتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ خورشید حیرت زدہ کمرے میں کھڑا رہ جاتا ہے اور کمرے کا جائزہ لینے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد ترنم ساڑی پہن کر کمرے میں آتی ہے۔ خورشید اسے دیکھ کر)

خورشید : معاف کیجیے گا۔ آپ کی اجازت سے کمرے میں آیا تھا۔ کیا یہاں مسٹر فانوس احمد رہتے ہیں۔

ترنم : جی ہاں۔ مگر وہ اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔

خورشید : کیا وہ دلی کے رہنے والے ہیں؟

ترنم : جی ہاں ہم دلی کے رہنے والے ہیں۔

خورشید : (سوچتے ہوئے) تو پھر ضرور وہی ہے (آہستہ سے) جالینوس

ترنم : جالینوس نہیں۔ فانوس

خورشید : جی ہاں فانوس۔ اسکول میں ہم دونوں ہم جماعت تھے (ہنس کر) اور میں

اسے جالینوس کہا کرتا تھا۔

ترنم : (مسکرا کر) آپ ٹھیک ہی کہا کرتے تھے۔ (خورشید کو عجیب بیباک نظروں سے دیکھتی ہے۔ خورشید چند سیکنڈ اس سے نظریں ملائے رہتا ہے پھر گھبرا کر نظریں نیچی کر لیتا ہے۔ ترنم کو بھی اپنی بیباکی کا احساس ہوتا ہے اور گھبرا کر) ارے آپ کھڑے کیوں ہیں۔ تشریف رکھیے۔ فانوس آتے ہی ہوں گے— آپ یہاں—

خورشید : میں یہاں کے تاریخی کھنڈرات دیکھنے آیا ہوں۔ دروازے پر نیم پلیٹ دیکھی تو اندر چلا آیا۔ معلوم ہوا ہے یہاں بے حد قدیم مورتیاں دریافت ہوئی ہیں؟

ترنم : لعنت ہے۔

خورشید : جی

ترنم : تم سب مرد واہیات ہوتے ہو بلکہ واہیات سے بھی بدتر۔ (کسی قدر مایوسی کے لہجے میں) میں تو سمجھتی تھی کہ کچھ معقول ہوگے مگر وہی مورتیوں کے پجاری۔ لعنت ہے۔ بیٹھو فانوس آتے ہوں گے۔

(دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ خورشید ہوسناک نظروں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ جلاتا ہے کہ باہر سے فانوس کی آواز)

فانوس : خاتون گربہ پرست۔ خاتون گربہ پرست۔ (فانوس کمرے میں آتا ہے۔ ایک اُچٹتی سی نظر خورشید پر ڈالتا ہے۔ خورشید کھڑا ہوجاتا ہے مگر فانوس اسے نظرانداز کرتے ہوئے دوسرے دروازے کے پاس جاکر) اجی بلیوں سے ہی عشق ہوتا رہے گا یا یہاں آنے کی بھی تکلیف گوارا کی جائے گی۔ (کمرے میں ٹہلتے ہوئے) بلیاں۔ لاحول ولا قوۃ۔ اور پھر ایک نہ دو بلکہ سترہ۔ اور رحیم خدا اگر تو بلیاں پیدا نہ کرتا تو کیا تیری دنیا میں کوئی کمی رہ جاتی (پھر بلند آواز سے) اجی خاتون گربہ پرست۔

ترنم : (کمرے میں آکر) کیوں چیخ پکار مچا رکھی ہے۔ صنم نے بچے دیے ہیں۔ میں ان کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔

فانوس : اور بچے! او خدا میری دنیا اور عاقبت کیوں برباد کر رہا ہے۔ (ترنم کے پاس جاکر) ان بلیوں کی نس بندی کراؤ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔

ترنم : (خوشی کا اظہار کرتے ہوئے) سات ہیں۔ (مایوسی کے لہجے میں) کم بخت چار بلے ہیں۔ تم انھیں کھنڈرات میں پھینک آنا۔ بلّے مجھے ایک نظر نہیں بھاتے۔

فانوس : یعنی کہ میں— لاحول ولا قوۃ

(برا سا منہ بنا کر ترنم کی طرف پیٹھ کر لیتا ہے)

ترنم : تم ایسا منہ بنا کر کیوں کھڑے ہو گئے۔ کیا میں نے تم سے بچہ جننے کو کہہ دیا ہے۔

فانوس : اگر تم بچہ جننے کو کہتیں تو اس پر بھی غور کرتا۔ مگر بلّی کے بچے۔ لعنت ہے۔ بخدا اگر مجھے ذرا بھی شک ہو گیا کہ جنت میں بلیاں ہیں تو جنت میں جانے سے انکار کر دوں گا۔ چاہے اللہ میاں سے جھگڑا کیوں نہ ہو جائے۔

خورشید : (مسکرا کر آگے بڑھ کر) کیا یہ بلیاں پولیٹیکل لیڈروں کے بھاشن نہیں سنتیں۔

فانوس : (بگڑ کر) آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔

خورشید : توبہ توبہ۔ میں آپ کا مذاق کیوں اڑانے لگا۔ وہ تو ایک مرتبہ ہمارے کتوں نے سن لیا تھا تو ان کی دمیں سیدھی ہو گئی تھیں۔

فانوس : بخدا

خورشید : تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں (کسی قدر بگڑ کر) مجھے جھوٹا کہہ کر آپ میری توہین کر رہے ہیں۔

فانوس : جی کیا مطلب۔ (خورشید کو غور سے دیکھ کر) لیکن آپ کی تعریف۔

خورشید : یعنی کہ میں۔ (ماحول کو اور دلچسپ بنانے کے انداز میں) میرا نام خواہشمند ہے۔

فانوس : بہت خوب۔ (سوچتے ہوئے) خواہشمند۔ کس کے خواہشمند۔

خورشید : (ایک اچٹتی سی نظر ترنم پر ڈالتا ہے۔ پھر سنجیدگی سے) مند ہمارے خاندان کا امتیازی نشان ہے۔ افراسیاب نے میرے مورثِ اعلیٰ کو حاجت مند کا خطاب دیا تھا۔

فانوس : بہت خوب

خورشید : جی ہاں۔ میرا نام خواہشمند ہے۔ میرے والد کا نام احسان مند تھا۔ ان کے والد کا نام غرض مند تھا۔ ان کے والد کا نیازمند۔ ان کے والد کا...

فانوس : (بات کاٹ کر) بس بس۔ آپ کے خاندان میں کوئی دانشمند، عقل مند، خردمند، ظفر مند پیدا نہیں ہوا۔

خورشید : ایسے واہیات نام ہمارے خاندان میں نہیں رکھے جاتے (بے حد نفرت کے لہجے میں) ہنہ۔ دانشمند، عقلمند۔ (ایک دم جارحانہ انداز میں) تمھارا نام کس گدھے نے فانوس رکھ دیا ہے جبکہ تمھارا نام جالینوس ہے۔

فانوس : اے مسٹر۔ اے مسٹر۔ تم میری چھت کے نیچے ہی میرا نام بدلے دے رہے ہو۔ (پھر آہستہ سے جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو) جالینوس۔

خورشید : ہاں جالینوس (کچھ دیر بعد ہنس کر) تو تم مجھے ابھی تک نہیں پہچانے۔ (فانوس اسے غور سے دیکھتا ہے) ارے میں خورشید ہوں خورشید۔ ہم تم اسکول میں ساتھ ساتھ پڑھا کرتے تھے۔

فانوس : (بالکل ایسے انداز میں جیسے اب بھی نہ پہچانا ہو مگر دل رکھنے کو کہہ رہا ہو) اچھا وہ خورشید۔ اب یاد آیا۔ معاف کرنا میں پہچانا نہیں تھا۔ (ترنم کی طرف دیکھ کر) یہ خورشید ہے۔ اور یہ ترنم۔ خاتون گربہ پرست۔

خورشید : ترنم۔ بہت خوبصورت اور پیارا نام ہے۔

ترنم : مسٹر خورشید۔ زیادہ بے تکلفی نہیں ورنہ ایک روز کہو گے کہ تم مجھے خوابوں میں نظر آتی ہو۔

خورشید : (حیرت سے ترنم کو دیکھتا ہے پھر مسکرا کر) آپ تو نیندیں اڑانے کے لیے

پیدا ہوئی ہیں خوابوں میں کیسے آسکتی ہیں۔

فانوس : (قہقہہ مار کر) بہت خوب (ترنم کی طرف دیکھ کر) اب بولو کیا بولتی ہو (ترنم برا سا منہ بناتی ہے۔ فانوس خورشید کی طرف دیکھ کر) میں ان کا منہ بولا شوہر ہوں۔

خورشید : منہ بولا شوہر

فانوس : جی ہاں۔ خدا غریق رحمت کرے والد صاحب کو۔ بڑے زندہ دل انسان تھے۔ ایک دن مجھے گھیر گھار کر انھیں میرے حوالے کیا اور فرمایا۔ یہ تمھاری بیوی ہے۔ دس بارہ سال ہوگئے کہ مجھے اپنا شوہر کہہ رہی ہیں۔

خورشید : (ترنم کی طرف دیکھ کر) اچھا

ترنم: (برا سامنہ بنا کر) لعنت ہے

فانوس : (خورشید سے) (برسبیل تذکرہ آج کل تمھارا مشغلہ کیا ہے۔)

خورشید : میرا مشغلہ! (سوچتے ہوئے) میں گھوسٹالا جسٹ ہوں۔ ماہر بھوتیات۔

فانوس : ماہر بھوتیات۔ واللہ۔ بہت خوب

خورشید : جی ہاں سنا تھا کہ یہاں کچھ قدیم کھنڈرات دریافت ہوئے ہیں۔ بالعموم بھوت ایسے ہی قدیم کھنڈرات میں رہتے ہیں۔ اس لیے یہاں چلا آیا کہ شاید کوئی کام کی بات معلوم ہوسکے۔

ترنم : (طنزیہ) ان کھنڈرات میں بھوت نہیں چڑیلیں رہتی ہیں جنھوں نے ان کی بیوی کو قید کر رکھا ہے اور جس کی تلاش دس بارہ سال سے جاری ہے۔

فانوس : اور کیا یہ غلط ہے؟ مسٹر خورشید خواب کی بات کبھی غلط ہوسکتی ہے۔

خورشید : (بے حد سنجیدگی سے) ہرگز نہیں۔ خواب تو الہام کی دوسری شکل ہے۔

فانوس : (ترنم سے) سنا تم نے (خورشید کی طرف دیکھ کر) مجھے صاف طور پر نظر آیا کہ میری بیوی مورتی میں تبدیل ہوگئی ہے۔

خورشید : ہوسکتا ہے ہوسکتا ہے۔ طلسم ہوش ربا میں بھی ایسے واقعات نظر سے گزرے ہیں۔

فانوس : (ترنم سے) اب فرمایئے۔ بھلا طلسم ہوش ربا کی بات غلط ہوسکتی ہے۔ مگر تم ضرور اپنی بات پر اڑی رہوگی۔

ترنم : (خورشید کی طرف دیکھ کر طنزیہ) تو اے ماہر بھوتیات تم ہی وہ مورتی تلاش کردو جو ان کی بیوی ہے۔

فانوس : ہاں۔ اب اس نیک مرد سے الجھ پڑو۔ (خورشید کی طرف دیکھ کر) برسبیلِ تذکرہ تمھارا قیام کہاں ہے۔

خورشید : ایک ہوٹل میں۔

فانوس : اگر چند دن قیام کرنے کا ارادہ ہو تو پھر یہ گھر حاضر ہے۔

خورشید : مگر آپ لوگوں کو —

فانوس : دیکھو یہ خانۂ بے تکلف ہے پس و پیش کی ضرورت نہیں۔ کچھ تمھارے علم سے ہی فائدہ اٹھا لوں گا (خورشید ترنم کی طرف دیکھتا ہے جو دلکش انداز میں مسکرا رہی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس پیش کش سے متفق ہے) تو پھر آجاؤ۔ (دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے) میں ذرا نہا کر لباس بدل لوں۔ (ترنم کی طرف دیکھ کر) پانی غسل خانہ میں ہے یا نہیں۔

ترنم : ہوگا کیوں نہیں۔ اور پھر تم اپنے کپڑے گندے کرلائے۔

فانوس : (خورشید سے) بس تو سامان اٹھالاؤ۔ کھانا ساتھ کھائیں گے۔

(فانوس دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ خورشید اور ترنم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں۔ کچھ دیر بعد)

خورشید : یہ مورتی اور بیوی کا کیا قصہ ہے۔

ترنم : کچھ نہیں صرف جھک ہے۔ بارہ سال پہلے ہماری شادی ہوئی تھی۔ مجھ سے ایسی محبت کرتے تھے جیسے میں دیوی ہوں۔ ایک سال تو ٹھیک ٹھاک گزرا۔ ایک دن سوکر اٹھے تو کھوئے کھوئے سے تھے کہنے لگے میری بیوی مورتی بن گئی ہے۔ بس اسی سورتی کی تلاش میں سارا ملک چھانا جارہا ہے۔

خورشید : نفسیاتی کیس ہے۔

ترنم : اور کوئی ابنارملٹی نہیں۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر شکست خوردہ لہجے میں) بس میں اس ویرانے میں دس سال سے شوہر سے محروم ہوں۔

خورشید : آپ کا مطلب ہے کہ۔۔۔

ترنم : اب مطلب کیا بتلاؤں۔ آخر عورت کو شوہر کی بھی ضرورت ہوتی ہے، صرف کپڑا اور روٹی دینے والے مرد کی نہیں۔ خیر یہ ایک دکھ بھری داستان ہے۔ چھوڑیے۔ ہاں تو آپ آرہے ہیں۔

خورشید : مادام ترنم۔ (سوچتے ہوئے) اب تو یہ میرے لیے ایک مسئلہ بن گیا۔

ترنم : کیوں۔ آجایئے نا۔ بخدا ان دس سالوں میں سوائے دکانداروں کے اور کسی مرد سے گفتگو نہیں کی ہے۔ کیا میں ہمدردی کی مستحق نہیں ہوں۔

(فانوس کمرے میں آتا ہے اور خورشید کو دیکھ کر)

فانوس : ارے تم ابھی یہیں براجمان ہو سامان لینے نہیں گئے۔

خورشید : مگر۔۔۔

فانوس : (بات کاٹ کر) نہیں۔ میں کوئی دلیل نہیں سنوں گا۔ جلدی سے سامان لے آؤ۔ میں ذرا بھوک کا کچا ہوں۔ ذرا بھی دیر ہوجائے تو اپنی بوٹیاں نوچنے کو جی چاہتا ہے (ترنم کی طرف دیکھ کر) تم بھی اس کے ساتھ چلی جاؤ، ایک نمبر کا لفنگا ہے کہیں دھوکہ نہ دے جائے۔

خورشید : نہیں نہیں۔ انھیں تکلیف دینے کی ضرورت نہیں میں خود سامان لے آؤں گا۔

ترنم : پہلے کھالیا جائے۔ پھر سامان لے آئیں گے۔

فانوس : ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔

خورشید : مگر میرا ہوٹل جانا ضروری ہے۔ ابھی میں نہایا بھی نہیں ہوں اور پھر مجھے کپڑے بھی بدلنا ہے۔

فانوس : یہیں نہا لو اور انھیں کپڑوں کو کھانا کھلا لو۔ نئے کپڑوں کی ضرورت نہیں۔

(خورشید بیچارگی سے ترنم کی طرف دیکھتا ہے ترنم مسکرا کر)

ترنم : آیئے میں آپ کو غسل خانہ بتلا دوں۔

خورشد : لیکن۔

ترنم : اب آ بھی جایئے ایسا تکلف بھی کیا۔

(خورشید بادل نخواستہ ترنم کے ساتھ کمرے سے چلا جاتا ہے۔ فانوس کچھ دیر خاموش کھڑا رہتا ہے۔ جیب سے سگریٹ نکال کر جلاتا ہے اور پھر ایک مورتی کے پاس جاکر)

فانوس : دیکھا تم نے۔ دس بارہ سال سے ایک بیوی بنی سر پر سوار ہیں اب ایک ہم جماعت بن کر نازل ہو گئے۔ (سگریٹ کا کش لے کر) بخدا کبھی تو بولو۔ کب تک پتھر بنی رہو گی۔

ترنم : (کمرے میں آتے ہوئے) بس شروع ہو گئے۔ اب مہمان کے سامنے بھی یہی حرکتیں کرنا۔ اس کا بھی جی خوش ہو جائے گا۔ (فانوس خاموش رہتا ہے) تم اس شخص کو پہچانتے ہو؟

فانوس : ہرگز نہیں

ترنم : اور پھر بھی تم نے اسے اپنا ہم جماعت قبول کر لیا۔

فانوس : اب وہ کہہ رہا ہے تو ضرور ہوگا اور پھر یہ کہ وہ گھوسٹالا جسٹ ہے ماہر بھوتیات اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ اس نے طلسم ہوشربا پڑھی ہے۔

ترنم : (طنزیہ) بڑا کمال کیا ہے۔ کل اگر وہ کہے کہ میں امیر حمزہ صاحب قرآں ہوں تو تم خواجہ عیار بن کر اس کے پیچھے لگ جانا۔

فانوس : (بیزاری سے) دیکھو ترنم میں تم سے اس قدر بیزار ہو گیا ہوں کہ اگر وہ تم کو اغوا کر کے لے جائے تو مجھے خوشی ہوگی۔

ترنم : (غصہ سے فانوس کا گریبان پکڑ کر) اگر تم نے ایسی واہیات بات کہی تو میں تمھارا خون پی لوں گی۔ (کال بیل کی آواز۔ ترنم اس کا گریبان چھوڑ کر)

اب وہ اس گھر میں نہیں رہے گا۔ (پھر کال بیل کی آواز) اب جاؤ نا دیکھو کون ہے۔ (فانوس دروازے کی طرف جاتا ہے۔ ترنم دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ فانوس دروازے میں جھانک کر)

فانوس : اچھا آپ ہیں تشریف لایئے۔ (ایک شخص جو صورت سے وحشت زدہ سا معلوم ہوتا ہے کمرے میں آتا ہے) فرمایئے کیا حکم ہے۔

اجمل : کھدائی میں تین نئی مورتیاں نکلی ہیں۔

فانوس : تو لاکر میرے سر پر مار دو۔ میں کیا کروں۔

اجمل : ان کے عہد کا تعین نہیں ہو رہا ہے اگر آپ ملاحظہ فرما لیتے تو شاید کوئی کام کی بات معلوم ہوسکتی۔

فانوس : اور تمھارے اس میڈک کا کیا خیال ہے۔

اجمل : جی میڈک! یعنی آپ کا مطلب ہے...

فانوس : جسے تم پروفیسر کہتے ہو۔

اجمل : لیکن وہ...

فانوس : ایک نمبر کا جاہل ہے۔ آج تک میں نے اسے کسی مورتی کی روح میں جھانکتے نہیں دیکھا۔ صرف خد و خال میں الجھا رہتا ہے۔

اجمل : لیکن وہ پتھر کی قدامت جاننے کے بھی تو ماہر ہیں۔

فانوس : میرے سامنے اس جاہل کی تعریف نہ کرو۔ (خورشید کمرے میں آتا ہے۔ فانوس اسے دیکھ کر) نہا لیے؟ (اجمل سے) یہ مسٹر خورشید ہیں، گھوسٹالا جسٹ۔ ماہر بھوتیات۔ یہ کھنڈرات کے بھوتوں کے بارے میں تحقیقات کریں گے۔

اجمل : (قہقہہ مار کر) ماہر بھوتیات! بالکل نیا سبجیکٹ ہے۔ (طنزیہ) مگر ان کھنڈرات میں بھوت نہیں ہیں۔ میں نے تاریک راتوں میں گھوم پھر کر ان کھنڈرات کا چپہ چپہ دیکھا ہے۔

(بلی کی آواز)

خورشید : (اجمل کو سر سے پیر تک دیکھ کر) پھر تو مجھے آپ کے وجود پر شک ہے۔
(اجمل نفرت سے خورشید کو دیکھتا ہے) مسٹر فانوس آپ نے سنا ہوگا کہ زلزلہ آنے سے پہلے کتے بھونکنے لگتے ہیں۔

اجمل : بھوتیات سے متعلق یہ آپ کی نئی تحقیق ہے۔

خورشید : یہ مانا ہوا سچ ہے۔ میری تحقیق یہ ہے کہ بھوت کی آواز سن کر بلیاں بولنے لگتی ہیں۔

اجمل : مسٹر خورشید میں آپ سے بے تکلف نہیں ہوں۔ ہاں تو مسٹر فانوس آپ کب تشریف لا رہے ہیں۔

(ترنم کمرے میں آکر)

ترنم : کھانا تیار ہے۔

فانوس : (ترنم کی بات پر دھیان نہ دے کر) مسٹر اجمل۔ نئی مورتیوں کی دریافت اور ان کی قدامت کا ذکر کر کے آپ نے میری دلچسپی بڑھا دی۔ (خورشید کی طرف دیکھ کر) اگر تم کو کوئی اعتراض نہ ہو تو ـــــ

ترنم : مسٹر خورشید کو اعتراض ہو یا نہ ہو۔ مجھے اعتراض ہے۔ پہلے کھانا کھالو پھر جھک مارتے پھرنا۔

فانوس : اگر صرف تمھیں اعتراض ہے تو میں ضرور جاؤں گا۔ آیئے مسٹر اجمل پہلے مورتیاں دیکھ لیں اور مسٹر خورشید آپ کھانا کھالینا۔ میرا انتظار نہ کرنا۔
(اجمل کے ساتھ کمرے سے چلا جاتا ہے۔ ترنم آنکھوں میں آنسو بھر کر)

ترنم : اس شخص نے کبھی میرے جذبات کا احترام نہیں کیا۔

خورشید : اور آپ دس بارہ سال سے اسے برداشت کررہی ہیں۔

ترنم : کوئی بھی عورت اسے برداشت کرے گی وہ اتنا ہی معصوم ہے بالکل بچوں کی طرح ضدی۔ اگر میں اس کی دیکھ بھال نہ کروں تو یہ انسانوں کی طرح رہ بھی نہیں سکتا۔

خورشید : اور یہ کون بزرگ تھے جنھیں فانوس اجمل کہہ رہا تھا۔

ترنم : اس کی صورت سوال ہے کیا آپ نے اندازہ نہیں لگایا۔ انتہائی واہیات انسان ہے خوفناک اور تاریک راتوں میں بھی کھنڈرات میں گھومتا رہتا ہے— آیئے کھانا کھا لیجیے۔

خورشید : تھوڑا انتظار کرلیجیے۔ ممکن ہے فانوس جلد لوٹ آئے۔

ترنم : اب وہ جلد نہیں آئے گا— آیئے۔

(پردہ)

دوسرا اسین

منظر

(وہی کمرہ۔ کچھ دن بعد۔ کمرے میں ترنم تنہا ہے اور مختلف کام کرتی پھر رہی۔

ترنم : (Loved thinking) محبت! کس سے؟ فانوس سے؟ جو محبت کے معنی بھی نہیں جانتا۔ کیا میں اس سے تمام زندگی یونہی محبت کرتی رہوں گی اور ایک دن ہڈیوں کا پنجر بن جاؤں گی۔ اس سے زیادہ مضحکہ خیز خیال اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ لعنت ہے۔ کیا میں فانوس کی بیوی ہوتے ہوئے اس سے بیوفائی کرسکتی ہوں۔ ترنم۔ کیا خورشید کا مردانہ حسن تیرے جذبات کو مشتعل کررہا ہے۔ اگر تیرے جسم کی پیاس اسی قدر تیز ہے تو پھر خورشید اور اجمل میں فرق کیوں کرتی ہے۔ (میز کے پاس جا کر میز پر رکھی پیالیوں وغیرہ کو کپڑے سے صاف کرنے لگتی ہے۔ خورشید کمرے میں آتا ہے اور خاموشی سے کرسی پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگتا ہے۔ ترنم کچھ دیر بعد بلند آواز سے) پاگل پن— بالکل پاگل پن۔

خورشید : (اخبار چہرے سے ہٹا کر) کس کا پاگل پن۔

ترنم : (اپنی ہی رو میں) میرا— (پھر ایک دم مڑ کر خورشید کی طرف دیکھ کر) تم— (خورشید اخبار ایک جانب ڈال کر کھڑا ہوتا ہے۔ ترنم اسے سر سے پیر تک

دیکھ کر) تم— (جذباتی انداز میں) میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔

خورشید : اور میں نے کب تم سے محبت کا دعویٰ کیا ہے۔

ترنم : تو پھر یہاں کیوں آئے ہو۔ جاؤ اور ان مورتیوں میں کھو جاؤ جن کے جسم کو تم چھو سکتے ہو میرے جسم کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔

خورشید : تمھیں اپنے جسم کی خوبصورتی پر بڑا ناز ہے۔

ترنم : ہاں ناز ہے۔تم اور اجمل دونوں— مگر خیر۔

خورشید : تو ناز کرتی رہو۔ مجھے اس وقت صرف ایک پیالی چائے کی ضرورت ہے۔

ترنم : چائے۔ جھوٹ۔ تمھیں اس وقت چائے کی ضرورت نہیں ہے۔ (خورشید برابر ترنم کو تاکے جاتا ہے۔ ترنم پھر اپنے کام میں مشغول ہوکر) فانوس کہاں ہے۔

خورشید : کہاں ہوسکتا ہے۔ کھنڈرات میں اپنی بیوی کی تلاش کر رہا ہے۔

ترنم : (مڑ کر خورشید کو دیکھ کر) اور تم صرف ایک پیالی چائے کے لیے چھ فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے آگئے۔ (پھر اپنے کام میں مشغول ہوکر) صاف کیوں نہیں کہتے کہ (ترنم خاموش ہوجاتی ہے۔ خورشید کچھ دیر اسے دیکھتا رہتا ہے پھر آگے بڑھ کر ترنم کے قریب ہوتے ہوئے)۔

خورشید : تم نے جملہ پورا نہیں کیا۔ (ترنم خاموش رہتی ہے) تمھیں دیکھنے کے لیے چھ ہزار فرلانگ کا فاصلہ بھی طے کیا جاسکتا ہے۔

ترنم : اور یہی تمھاری زندگی کی سب سے بڑی بھول ہوگی۔ (مڑ کر خورشید کو دیکھ کر) خیر یہ برتن صاف کرو میں تمھارے لیے چائے لاتی ہوں۔

(ایپرن کھول کر کرسی پر ڈالتی ہے اور دوسرے کمرے میں چلی جاتی۔ خورشید کچھ دیر کھڑا رہتا ہے پھر برا سا منہ بنا کر ایپرن پہن کر پلیٹیں صاف کرنے لگتا ہے کہ کال بیل کی آواز۔ خورشید اپنے کام میں مشغول رہتے ہوئے)

خورشید : آجاؤ۔ (اجمل کمرے میں آتا اور خورشید کو اس طرح کام کرتے ہوئے دیکھ کر دروازے پر ہی رک جاتا ہے) تم تو بہت مصروف تھے کیسے چلے آئے۔

(ہنس کر) مجھ پر بھروسہ نہیں۔

اجمل : (کچھ آگے بڑھ کر مذاق اڑانے کے انداز میں) بخدا ماہر بھوتیات اس رنگ میں تو اس وقت بچ رہے ہو۔

خورشید : (مڑ کر اجمل کو دیکھ کر) تمھیں پسند آیا۔ (بگڑ کر) اجمل صاحب میں

اجمل : (بات کاٹ کر) تو ناراض کیوں ہوتے ہو۔ نہ میں تمھارے پاس آیا ہوں اور نہ تمھاری ٹوہ لینے۔ میں تو مادام ترنم کے پاس آیا ہوں۔

خورشید : مادام ترنم کے پاس! لیکن وہ تو یہاں کی مورتیوں پر اتھارٹی نہیں ہیں۔

اجمل : کیوں آیا ہوں۔ (ہنستا ہے) شادی کا پیغام لے کر (خورشید مشکوک نظروں سے اسے دیکھتا ہے) گھبرایئے نہیں۔ میری بلی مرگئی ہے اور بلا ایک مہینے سے بے چین ہے۔

خورشید : پھر تو مجھے حاضرات بٹھانا پڑے گی۔ اس کمرے میں ضرور کوئی اثر ہے کہ اندر آتے ہی لوگ واہی تباہی بکنے لگتے ہیں۔

اجمل : شادی کی بات کرنا واہی تباہی بکنا ہے۔ (طنزیہ) ممکن ہے آپ شادی کے قابل نہ ہوں۔

(اسی وقت ترنم کمرے میں آتی ہے اور اجمل کو دیکھ کر)

ترنم : کیوں آئے ہو۔ جانتے ہو کہ مجھے تمھاری صورت سے نفرت ہے۔

اجمل : اور میں نے کب تمھاری صورت سے محبت کی ہے۔

ترنم : جانتے ہو کہ اس وقت فانوس گھر پر نہیں ہوتے اور میں کسی سے تنہائی میں نہیں ملتی۔

اجمل : (خورشید کی طرف اشارہ کرکے) اور ماہر بھوتیات سے بھی نہیں (ہنستا ہے) میں تو شادی کا پیغام لے کر آیا ہوں۔

ترنم : شادی کا پیغام! کس سے، (طنزیہ) مجھ سے؟

اجمل : جی نہیں بلکہ آپ کی بلیوں میں سے کسی ایک سے۔

ترنم : بلی سے!

اجمل : جی ہاں۔ میرا بلا ایک مہینہ ہوا رنڈوا ہو گیا ہے۔ اسے بلی کی شدید ضرورت ہے۔

ترنم : میرے پاس صرف بیس بلیاں ہیں اور میں ان کو خود سے جدا نہیں کر سکتی۔

اجمل : تو پھر بلے کو گھر داماد رکھ لیجیے۔ سچ مچ وہ بلی کے لیے بہت بے چین ہے۔ اس کا مردانہ حسن دیکھ کر آپ کی بلیوں کا جی پھڑک اٹھے گا۔ بلیوں کو لبھانے کے اسے سیکڑوں گر آتے ہیں۔

ترنم : میری بلیوں پر ڈورے ڈالنے والے بلے مجھے ایک نظر نہیں بھاتے — تم چائے پیو گے۔

اجمل : آج سورج مغرب سے نکل رہا ہے۔ (ہنس کر) لڑکی والے لڑکے والوں کی یونہی خوشامد کرتے ہیں۔

ترنم : بیٹھو۔ بدتمیز۔ میں تمھارے لیے چائے لاتی ہوں۔

(دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ خورشید ایپرن کھول کر کرسی پر ڈالتا ہے۔ اجمل خورشید کو دیکھ کر)

اجمل : بخدا مادام ترنم بھی کسی خونخوار بلی سے کم نہیں۔

خورشید : تعجب ہے کہ آج تک انھوں نے آپ کو نوچا نہیں۔

اجمل : کیا وہ آپ کو نوچ چکی ہیں (خورشید برا سا منہ بناتا ہے) ہاں تو مسٹر گھوشالا جسٹ کھنڈرات میں کسی بھوت سے ملاقات ہوئی۔

خورشید : ملاقات تو نہیں ہوئی۔ دیکھا ضرور۔ ایک پچھلے پائی کے ساتھ (اجمل مشکوک نظروں سے خورشید کو دیکھتا ہے) اور حیرت ہوئی۔

اجمل : حیرت! کیا کوئی غیر معمولی بات تھی۔

خورشید : جی ہاں۔ پچھلی پائیاں بالعموم دن کے بارہ بجے نکلتی ہیں مگر وہ رات کے بارہ اور ایک کے درمیان نکل پڑی تھی۔ بھوت تو خیر رات ہی میں گھومتے ہیں۔

(فانوس کمرے میں آتا ہے اور اجمل کو دیکھ کر)

فانوس : ارے مسٹر اجمل آپ یہاں ہیں اور وہاں آپ کا میڈک بے حد پریشان ہے۔

اجمل : کیوں۔ خیر تو ہے۔

فانوس: کھدائی کرنے والے مزدوروں نے کام کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

اجمل : کیوں انکار کر دیا ہے۔

خورشید : (طنزیہ) انھوں نے پچھلے پائی کے ساتھ بھوت دیکھ لیا ہوگا۔ بیچارے خوف زدہ ہوگئے ہوں گے۔

فانوس : جاؤ۔ جاؤ۔ کہیں مزدور میڈک کا ڈیسکشن نہ کردیں۔

اجمل : مادام ترنم نے چائے پر مدعو کرلیا ہے۔ اس چائے پر سیکڑوں میڈک قربان کیے جاسکتے ہیں۔

فانوس : (ہنس کر) واہ۔ بہت خوب۔ آپ تو کسی عاشق نامراد کی طرح صرف ایک پیالی چائے سے مطمئن ہوگئے۔

اجمل : عاشق تو نہیں۔ نامراد ضرور ہوں۔

(ترنم کمرے میں آکر)

ترنم : خورشید صاحب! بلیاں سب دودھ پی گئیں۔ چائے اس وقت نہ مل سکے گی۔

فانوس : (قہقہہ مار کر) مسٹر اجمل آپ کی نامرادی برقرار رہی۔

اجمل : اپنا مقدر ہی ایسا ہے (ترنم کی طرف دیکھ کر) ہاں تو مادام ترنم بلے کو آپ قبول کرتی ہیں۔

ترنم : جی نہیں بلوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

اجمل : تو پھر افزائش نسل

ترنم : جب ان کو ضرورت ہوگی وہ اپنا جوڑا خود تلاش کرلیں گی۔

اجمل : لیکن ان میں یہ صلاحیت نہیں ہے۔

ترنم : جب بے چین ہوں گی تو یہ صلاحیت بھی پیدا ہوجائے گی۔

فانوس : (اکتائے ہوئے لہجے میں) اس بحث کو ختم کرو اور میڈک کی جا کر خبر لو۔

خورشید : ذرا ہوشیار رہنا۔ کہیں مزدور آپ کو کھنڈروں والا بھوت نہ سمجھ لیں۔ (اجمل نفرت سے خورشید کو دیکھتا ہے اور کمرے سے چلا جاتا ہے۔ ترنم بھی دوسرے کمرے میں جاتی ہے۔ خورشید کچھ دیر خاموش رہ کر) ممکن ہے اس کے بارے میں ہم کوئی بری خبر سنیں۔

فانوس : میڈک کے بارے میں؟

خورشید : نہیں اجمل کے بارے میں۔ راتوں میں مزدوروں کی جھونپڑیوں کے آس پاس منڈلانا اور کھنڈرات میں گھومنا بے مقصد نہیں ہوسکتا۔ (ترنم چائے لے کر آتی ہے) آپ تو کہہ رہی تھیں کہ دودھ بلیاں پی گئیں۔

ترنم : میری بلیاں اس قدر بدتمیز نہیں ہیں۔ (نفرت سے) مجھے تو اس اجمل منحوس کو چڑانے میں مزہ آتا ہے۔ اس کی نگاہوں میں جو ہوسناکی ہوتی ہے اس سے مجھے چڑ ہے۔

فانوس : اگر وہ تمھیں پسند کرتا ہے تو برا کیوں مانتی ہو۔

ترنم : تو کیا میں اس کی خوشامد کرنے گئی تھی کہ وہ مجھے پسند کرے۔ وہ صورت سے ہی لفنگا نہیں دل کا بھی لفنگا ہے۔

فانوس : ہوا کرے تمھارا کیا بگاڑ لے گا۔

ترنم : مورتیوں کی صحبت نے تو تمھیں پتھر بنا دیا ہے۔ تم جیسے بے غیرت اور بے حس مرد بگاڑ کے معنی بھی نہیں سمجھ سکتے۔ جانتے ہو وہ کیا چاہتا ہے (چند سیکنڈ رک کر نفرت سے) نام تمھارا ہو اور اولاد وہ پیدا کرے۔

فانوس : (قہقہہ مار کر) بخدا بڑا دلچسپ خیال ہے بلکہ فلسفہ ہے۔ (خورشید کی طرف دیکھ کر) خورشید تم چائے پیو۔ نو دریافت مورتیوں میں میں نے کچھ دلچسپ پہلو مارک کیے ہیں۔ رفرنس بکس دیکھنا ہے۔

(دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ ترنم غصہ سے کمرے میں ٹہلتی ہے۔ خورشید خاموش رہتا ہے۔ ترنم خورشید کو دیکھ کر)

ترنم : اب تم چائے پیو گے یا نہیں۔

خورشید : میں سوچ رہا ہوں کہ یہ فانوس کس قسم کا مرد ہے۔

ترنم : بے حد معصوم اور عظیم انسان

خورشید : اور آپ اس سے بھی عظیم تر ہیں۔۔۔ لیکن۔۔۔

(خاموش ہوکر ترنم کو دیکھنے لگتا ہے۔ ترنم کچھ دیر خاموش رہ کر)

ترنم : اب چائے بھی پیو گے یا نہیں۔ مجھے گھورنے سے کچھ نہیں ملے گا۔

خورشید : میں سوچ رہا ہوں کہ اجمل قصوروار نہیں۔ شاید آپ کو مرد کی توبہ شکنی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

ترنم : (غور سے خورشید کو دیکھتی ہے۔ کچھ دیر بعد) اگر میں فانوس کی بیوی نہ ہوتی تو تمھیں پسند کرتی۔ (پھر خورشید کو پرشوق نظروں سے دیکھتی ہے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر) جی چاہتا ہے کہ ایک مرتبہ تو تمھارے لیے فانوس سے بیوفائی کروں۔ خورشید کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر میز کے پاس جاکر ایک پیالی میں چائے لے کر وہیں کھڑے کھڑے خاموشی سے پینے لگتا ہے۔ ترنم بے حد سنجیدہ شکل بنائے غور وفکر کے عالم میں ایک کرسی پر بیٹھ کر خلا میں گھورنے لگتی ہے کچھ دیر مکمل خاموشی رہتی ہے۔ پھر مڑ کر خورشید کو دیکھتی ہے جو خود کسی خیال میں کھویا ہوا ہے۔ ترنم کھڑی ہوکر آہستہ آہستہ خورشید کے پاس جاکر) خورشید صاحب! میں فانوس سے بے پناہ محبت کرتی ہوں۔

خورشید : (پیالی میز پر رکھ کر کچھ دیر خاموش رہتا ہے پھر ترنم کے چہرے پر نظریں گاڑ کر) اور پھر بھی آپ اس سے بے وفائی کے بارے میں سوچتی ہیں۔

ترنم : (سوچتے ہوئے) شاید میری شخصیت دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ ایک پر فانوس کا مکمل قبضہ ہے اور دوسری جیسے پیاسی پیاسی سی تم سے کچھ حاصل کرنا چاہتی ہے۔ تمھارے پیچھے دوڑ رہی ہے (ایک دم جذباتی ہوکر) خدا کے لیے

خورشید تم واپس چلے جاؤ ورنہ میں ریزہ ریزہ ہوکر بکھر جاؤں گی۔

خورشید : خاتون ترنم۔ (اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) میں یہاں رہنے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ چلا جاؤں گا تم سے زیادہ پیاسا۔ تم سے زیادہ ریزہ ریزہ۔

ترنم : مسٹر خورشید۔ میں فانوس کو دکھی کرنا نہیں چاہتی۔ (آہستہ آہستہ جاکر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور خلا میں گھورتی ہے) میں پتھر کی مورتی بن جانا چاہتی ہوں۔ شاید اسی روپ میں وہ مجھے دوبارہ اپنی بیوی کے روپ میں قبول کرلے (خورشید آہستہ آہستہ دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ ترنم کو اس کے جانے کی خبر نہیں ہوتی۔ وہ برابر اپنی دھن میں بولے جاتی ہے) دس سال سے میں جس آگ کو دباتی رہی ہوں تم نے آکر اسے بھڑکا دیا ہے۔ یہ آگ اس قدر بھڑک اٹھی ہے کہ کسی دن بھی میرے دامن میں لگ سکتی ہے۔ (مڑ کر خورشید کو دیکھ کر) ارے تم چلے گئے۔ بخدا خورشید میں اسے پسند نہیں کروں گی کہ تم چلے جاؤ— اور اگر سچ مچ چلے گئے تو— تو— میں— مگر نہیں۔ (اٹھ کر دروازے کی طرف جاتے ہوئے) خورشید میں تمھیں نہیں جانے دوں گی۔

(پردہ)

تیسرا سین

منظر

(وہی کمرہ۔ رات کا وقت۔ فانوس آرام کرسی پر بیٹھا ایک کتاب دیکھ رہا ہے۔ پاس ہی میز پر ٹیبل لیمپ اور اس کے پاس ٹائم پیس رکھی ہے۔ فانوس کتاب میں منہمک ہے کہ سڑک پر سپاہی کی آواز— 'جاگتے رہو' فانوس آواز پر کان لگاتا ہے۔ پھر آواز 'جاگتے رہو—' فانوس گھڑی اٹھا کر وقت دیکھتا ہے۔ کچھ دیر بعد کرسی سے ٹیک لگاتا ہے آنکھیں بند کرتا ہے۔ کچھ دیر بعد

کتاب ہاتھ سے گر جاتی ہے مگر وہ کتاب نہیں اٹھاتا۔ کچھ دیر بعد ترنم چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے آتی ہے۔ اس نے شب خوابی کا لباس پہن رکھا ہے۔ فانوس کو سویا ہوا دیکھ کر پیالی میز پر رک کر مسکراتی ہے۔ تخت پر رکھا ہوا کمبل اٹھا کر فانوس کے پاؤں پر ڈالتی ہے۔ چند سیکنڈ کھڑی مسکرا کر اسے دیکھتی رہتی ہے۔ پھر جا کر تخت پر بیٹھ جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد تخت پر لیٹ جاتی ہے کہ خورشید کمرے میں آتا ہے اور تخت کے پاس کھڑا ہو کر ترنم کو دیکھتا رہتا ہے۔ اسی وقت سپاہی کی آواز 'جاگتے رہو' خورشید گھبرا کر پیچھے ہٹتا ہے۔ اسی وقت ٹائم پیس کا الارم بجتا ہے۔ ترنم ہڑبڑا کر اٹھ جاتی ہے اور حیرت سے خورشید کو دیکھتی ہے جس کی نظروں میں ہوسناکی ہے۔ فانوس انگڑائی لیتا ہے۔ کاہلوں کی طرح گھڑی اٹھا کر دیکھتا ہے)

فانوس : دو بج گئے۔ (گھڑی میز پر رکھ کر زمین پر پڑی ہوئی کتاب اٹھاتا ہے۔ کہ اس کی نظر خورشید پر پڑتی ہے اور حیرت سے) ارے خورشید تم ابھی تک سوئے نہیں۔

خورشید : نیند نہیں آئی۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔

فانوس : رات کے دو بجے (ہنس کر) بھئی بھوتوں کا قصہ نہ لے بیٹھنا۔

خورشید : میں صبح واپس جانا چاہتا ہوں۔

فانوس : یہ خیال تمھیں رات کے دو بجے آیا۔ (ہنس کر) بھوتوں پر تمھاری تحقیقات مکمل ہوگئی۔

خورشید : اب تو انسان ہی مجھے بھوت نظر آنے لگے ہیں۔ خیر میں صبح...

فانوس : کم ازکم میں ان بھوتوں سے خوف زدہ نہیں ہوسکتا جو انسانی شکل میں نظر آتے ہوں۔

خورشید : بہر حال میں صبح چلا جاؤں گا ممکن ہے تم سے ملاقات نہ ہوسکے۔

ترنم : (خورشید کے پاس آکر) ابھی تم نہیں جاسکتے۔ تمھارے اندر جو بھوت پیدا

ہوگیا ہے وہ...

خورشید : (بات کاٹ کر) بھوت تمھارے اندر بھی پیدا ہو چکا ہے۔ یہ دونوں بھوت بخدا۔

فانوس : (بات کاٹ کر) تو پھر تم دونوں بھوتوں پر تحقیقات کرو۔ خورشید اگر تم چلے گئے تو میں خاتون گر بہ پرست سے ہمیشہ خوف زدہ رہوں گا۔ بھوتوں کو سمجھنے کا مجھے سلیقہ نہیں ہے۔

خورشید : بیوقوف۔ تمھیں تو انسانوں کے سمجھنے کا بھی سلیقہ نہیں ہے۔ (فانوس کے قریب جاکر) جانتے ہو تمھاری بیوی سے—

(باہر سے پھر سیاہ کی آواز) ''جاگتے رہو''

فانوس : اماں جاگ رہے ہیں۔ کیوں دماغ چاٹ رہے ہو۔

ترنم : تم دس سال سے سو رہے ہو اور اپنے کو جاگتا ہوا سمجھتے ہو۔

فانوس : (ترنم کی بات پر دھیان نہ دے کر خورشید سے) تم میری بیوی کی بات کررہے تھے۔ کس بیوی کی؟ ترنم کی؟ یہی تو ٹریجڈی ہے کہ دس سال سے یہ برابر میری بیوی ہونے کا ناٹک کھیل رہی ہیں۔

خورشید : یہ تمھاری بیوی نہیں ہے۔

فانوس : کیا میرا خواب جھوٹا ہو سکتا ہے۔

خورشید : اور جب یہ خواب ٹوٹے گا تو تم سب کچھ کھو چکے ہوگے۔ بہرحال میں صبح چلا جاؤں گا۔ (تیز تیز قدموں سے کمرے سے چلا جاتا ہے۔ ترنم کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہے پھر تخت پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے)

فانوس : اب تمھیں کیا ہوگیا۔ خورشید کے جانے کا غم ہے تو اسے روک لو۔

ترنم : (ہچکیوں کے درمیان) تم دس سال سے میری توہین کررہے ہو میں کب تک برداشت کرتی رہوں گی۔

فانوس : میں تمھاری بیس بلیوں کو برداشت کررہا ہوں یہ توہین کرنا ہے۔

ترنم : (غصے سے کھڑی ہوکر) فضول باتیں نہ کرو۔ مجھے بھی تمھاری مورتیوں سے

اتنی ہی نفرت ہے جتنی تمھیں میری بلیوں سے۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) کیا تمھیں یقین ہے کہ میں تمھاری بیوی نہیں ہوں۔ اگر بیوی نہیں ہوں تو پھر کون ہوں۔

فانوس : اس پر میں نے کبھی غور نہیں کیا۔

ترنم : اس پر میں نے کبھی غور نہیں کیا۔ اگر میں تمھیں چھوڑ کر چلی جاؤں۔ تو تمھیں دکھ نہیں ہوگا۔

فانوس : کہہ نہیں سکتا۔ ممکن ہے دکھ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے دکھ نہ بھی ہو۔

ترنم : اور میں تمھیں یاد بھی نہیں آؤں گی۔

فانوس : ابھی کیسے کہا جاسکتا ہے یہ تو جانے کے بعد ہی معلوم ہوگا۔

ترنم : (غصہ سے) تو پھر میں بھی کل خورشید کے ساتھ جا رہی ہوں۔ مجھے طلاق نامہ لکھ دو کہ مجھ پر تمھارا کوئی حق نہیں ہے۔

فانوس : میں نے تم پر کون سا حق جتلایا ہے اور طلاق تو بیوی کو دی جاتی ہے۔ تم میری بیوی کب ہو۔

(ترنم خاموش ہوجاتی ہے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر اس طرح جیسے کوئی فیصلہ کرلیا ہو۔ بلند آواز سے)

ترنم : خورشید (اور بلند آواز سے) مسٹر خورشید۔

فانوس : کیوں چیخ رہی ہو۔ ان سے جو بات کرنا ہے اس کے کمرے میں جا کر کرو۔

ترنم : نہیں مجھے جیسے کہنا ہے تمھارے سامنے کہوں گی (پھر بلند آواز سے) مسٹر خورشید (پھر جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی ہو) میرے پکارنے پر یہ مرد بے حس اور بہرے کیوں ہوجاتے ہیں (پھر بلند آواز سے) مسٹر خورشید! (خورشید کمرے میں آتا ہے۔ ترنم اسے دیکھ کر) میں بھی کل تمھارے ساتھ چل رہی ہوں۔

خورشید : (حیرت سے) میرے ساتھ!

ترنم : ہاں تمھارے ساتھ۔ مجھے تم پسند آ گئے ہو۔ تمھارا مردانہ حسن مجھے متاثر کرتا ہے۔ تمھیں دیکھ کر میرے وہ جذبات بھڑک اٹھتے ہیں جنھیں میں دس سال سے تھپکیاں دے دے کر سلاتی رہی ہوں۔ (خورشید خاموش رہتا ہے) تم خاموش کیوں ہو۔ کیا تم مجھے للچائی نظروں سے نہیں دیکھتے رہے ہو۔

خورشید : ابھی آپ جا کر آرام کیجیے۔ ہم صبح اس پر گفتگو کریں گے۔

ترنم : نہیں ہم اس پر ابھی گفتگو کریں گے۔

خورشید : مگر خاتون ترنم—

ترنم : (بات کاٹ کر) بس کچھ نہیں جواب ہاں یا نا میں دو

خورشید : اس وقت تو آرام کیجیے۔ صبح تو ہونے دیجیے۔

ترنم : (نفرت سے) تو شاید تم بھی فانوس جیسے مرد ہو۔

(غصہ سے تیز تیز قدموں سے کمرے سے چلی جاتی ہے۔ خورشید اور فانوس کچھ دیر خاموش رہتے ہیں۔ کچھ دیر بعد فانوس آہستہ سے)

فانوس : خورشید! آخر اس عورت کو کیا ہو گیا ہے۔

خورشید : پاگل ہو گئی ہے اور میں بھی پاگل ہو گیا ہوں۔

فانوس : خدا رحم کرے۔

خورشید : تم دعاؤں پر زندہ رہو۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) فانوس! ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں۔ (پھر کچھ رک کر سوچتے ہوئے) ایک دوسرے کو دیکھ کر ہمارے غلط جذبات ابھرتے ہیں۔

فانوس : غلط جذبات! ارے واہ۔ جذبات جذبات ہوتے ہیں غلط اور صحیح کیا۔

خورشید : (چڑ جانے کے انداز میں) فانوس کیا تم اتنے ہی معصوم ہو یا پاگل ہو گئے ہو۔ (فانوس کے پاس جا کر) اگر وہ میرے ساتھ چلی گئی تو تمھیں دکھ نہیں ہوگا؟— فانوس کیا تم پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہو کہ وہ تمھاری بیوی نہیں ہے— (فانوس خاموش رہتا ہے۔ خورشید اس کی خاموشی سے اُکتا کر)

تو پھر میں اسے صبح اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ (فانوس اب بھی خاموش رہتا ہے) بولو— بولتے کیوں نہیں۔ (فانوس خاموش رہتا ہے) خورشید کچھ دیر خاموش رہ کر شکست خوردہ لہجے میں) تو پھر میں اسے اپنے ساتھ لے جارہا ہوں (دروازے کے پاس جاکر) خاتون ترنم۔ (ترنم کمرے میں آتی ہے) آپ کل صبح میرے ساتھ چل رہی ہیں۔

ترنم : کیا فانوس مجھے طلاق دینے پر تیار ہوگیا۔ (خورشید اور فانوس دونوں خاموش رہتے ہیں۔ ترنم دونوں کو مشکوک نظروں سے دیکھ کر) تم دونوں پاگل ہوگئے ہو یا مجھے پاگل کردینا چاہتے ہو (اب بھی دونوں خاموش رہتے ہیں۔ (ترنم فانوس کے پاس جاکر) کیا میں بے جان پتھر کی مورتی ہوں جس کے کوئی جذبات نہیں (ایک دم مڑ کر خورشید سے) اور تم— تم میں مردانہ وجاہت ہے۔ تم خوبصورت اور پرکشش ہو۔ تم کسی بھی عورت کو بہکا کر اس کے جسم کو نوچ سکتے ہو مگر تم دونوں بزدل ہو (دونوں خاموش رہتے ہیں) میرے خدا کیا میں پاگل ہوجاؤں گی (تخت پر بیٹھ کر ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ کچھ دیر روتی رہتی ہے۔ پھر ہچکیوں پر قابو پاکر عجیب وحشیانہ انداز سے فانوس کو دیکھتی ہے پھر ایک دم کھڑی ہوکر فانوس کا گریبان پکڑ کر ہلاتے ہوئے) بول بزدل مرد کیا میں تیری بیوی نہیں ہوں (زور زور سے ہلاتی ہے)(بول بولتا کیوں نہیں (فانوس خاموش رہتا ہے اس کا گریبان پکڑ کر) اور تو— تو اس سے بھی زیادہ بزدل ہے۔ اس سے پہلے کہ تو مجھے نوچے میں تجھے نوچ لوں گی۔ (خورشید کا گریبان چھوڑ کر) تم دونوں سے اچھا تو اجمل ہے کہ اس میں جرأت ہے (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) میں تم دونوں پر لعنت بھیجتی ہوں۔ (باہر سے آواز۔ ''جاگتے رہو۔''

(پردہ)

چوتھا سین

منظر

(وہی کمرہ۔ دوسرے دن صبح۔ فانوس اور خورشید اس طرح خاموش بیٹھے ہیں۔ جیسے اُکتائے ہوئے ہوں اور ان کے پاس گفتگو کا کوئی موضوع بھی نہ ہو۔ کچھ دیر بعد فانوس بجھی بجھی سی آواز میں)

فانوس : خورشید۔ میں رات بھر سویا نہیں۔

خورشید : (اکتائے لہجے میں) اچھا کیا۔

(پھر دونوں خاموش ہوجاتے ہیں۔ اکتا دینے والی خاموشی اور سناٹا۔ کچھ دیر بعد)

فانوس : مزدوروں نے اجمل کو کیوں مار ڈالا۔ (خورشید خاموش رہتا ہے) یہ بلیاں اتنے سارے بچے کیوں دیتی ہیں۔

خورشید : وہ کوک شاستر بالتصویر پڑھتی ہیں۔

فانوس : (سوچتے ہوئے) ہوسکتا ہے یہی بات ہو۔ (پھر خاموشی اور سناٹا۔ فانوس کچھ دیر بعد جیسے آپ اپنے آپ سے کہہ رہا ہو) کیا کبھی مجھے وہ مورتی مل سکے گی جس کی مجھے تلاش ہے۔

(خورشید فانوس کی طرف دیکھتا ہے مگر خاموش رہتا ہے۔ پھر دونوں اپنے اپنے خیالات میں کھوجاتے ہیں۔ کچھ دیر بعد ترنم چائے کی ٹرے لیے ہوئی آتی ہے— دونوں پر ایک اچٹتی نظر ڈالتی ہے اور میز پر ٹرے رکھ کر پیالیوں میں چائے ڈالنے لگتی ہے۔ اس کی پیٹھ اِن دونوں کی طرف ہے۔ خورشید اسے دیکھتا رہتا ہے۔ مگر فانوس اپنے خیالات میں کھویا رہتا ہے۔ ترنم اپنے کام میں مشغول رہتے ہوئے)

ترنم : تم دونوں اس قدر خاموش کیوں ہو۔ کیا سوچ رہے ہو۔

خورشید : (کھڑا ہوکر تھکے تھکے قدموں سے ترنم کے پاس جاتے ہوئے) میں اپنے مقبرے کے ڈیزائن کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ تاج محل کی طرح ہو یا اہراموں کی طرح۔

ترنم : (مڑکر چائے کی پیالی خورشید کو دیتے ہوئے) اہراموں کی طرح تاکہ بھوتوں پر تحقیق کرسکو۔ (فانوس سے) اور تم کیا سوچ رہے ہو۔

فانوس : میں سوچ رہا ہوں کہ اگر بلیاں بچوں کے بجائے انڈے دیا کرتیں تو ان کی آبادی پر کنٹرول کیا جاسکتا تھا۔

ترنم : (ایک پیالی فانوس کی طرف لاتے ہوئے) اور میں سوچ رہی ہوں کہ اگر مرد کے دُم ہوتی تو اچھا تھا۔ (پیالی فانوس کو دے کر) اور اس کی عقل بجائے کھوپڑی کے دُم میں ہوا کرتی کہ شادی کے وقت لڑکی والے دُم ٹٹول کر عقل کا اندازہ لگا لیتے۔ (خورشید سے) تم تو صبح صبح جانے والے تھے۔

خورشید : میں تمھیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔

ترنم : مجھے! اور اگر میں تم سے کہوں کہ مجھے تم سے نفرت ہے۔ پھر

خورشید : مجھے تمھاری محبت اور نفرت سے دلچسپی نہیں۔ مجھے تمھاری اور صرف تمھاری ضرورت ہے۔

ترنم : اور اگر میں تمھیں نہ ملوں پھر۔

خورشید : تو پھر میں سمجھوں گا کہ میرا وجود ایک وہم ہے ایک خیال ہے۔ وہ خوبصورت بانسری ہے جس میں کوئی لے نہیں کوئی نغمہ نہیں۔

(ترنم کسی خیال میں کھوجاتی ہے اور کمرے میں ٹہلنے لگی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ میز کے پاس جاکر پیالی بھرتی ہے اور وہیں خاموش کھڑی رہتی ہے۔ لیکن چائے کا گھونٹ نہیں لیتی۔ خالی خالی نظروں سے فانوس کو دیکھتی رہتی ہے پھر ٹھنڈی سانس بھرکر)

ترنم : اور میں بھی وہ بانسری ہوں جو فانوس کے ہونٹوں کے لیے ترستی رہی ہے۔

دس سال خدا کی پناہ۔ میری نے اور نغمہ کو کیسی کیسی اذیتیں برداشت کرنا پڑی ہیں۔ میری شخصیت کس کس طرح پارہ پارہ ہوئی ہے۔ میرے جسم نے کس کس طرح بغاوت کی ہے۔ میں نے کس طرح تنہائی کے کڑوے گھونٹ پیے ہیں۔ یہ المیہ ہے ایک ٹریجڈی ہے۔

خورشید : لیکن خاتون ترنم— میں—

ترنم : (بات کاٹ کر) نہیں خورشید۔ آج مجھے بول لینے دو۔ آج ساری دنیا خاموش رہے۔ فانوس ایک وہم کے پیچھے دوڑ رہا ہے اور میں اس کی پرچھائیں کا پیچھا کر رہی ہوں— ہاں— فانوس میرے لیے ایک پرچھائیں ہے۔

خورشید : اور تم کب تک پرچھائیں کا پیچھا کرتی رہوگی۔

ترنم : یہی فیصلہ مجھے آج کرنا ہے۔ (پیالی میز پر رکھ کر فانوس کے پاس جاکر) فانوس کیا میں وہ مورتی نہیں ہوں جس کی تمھیں تلاش ہے (فانوس کھڑا ہوتا ہے اور غور وفکر کے عالم میں کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ ترنم کچھ دیر خاموش رہ کر) کیا دس سال سے میرے جذبات کچلے نہیں جاتے رہے ہیں اور کیا میں پتھر کی مورتی کی طرح بے حس نہیں بنی رہی ہوں۔ آخر وہ کون سی مورتی ہے جس کی تمھیں تلاش ہے۔

فانوس : میرا خواب...

ترنم : (غصہ سے) خواب، خواب، خواب— جس طرح تم واہیات ہو اسی طرح تمھارا خواب بھی واہیات ہے۔ (تیز تیز قدموں سے مورتی کے پاس جاتی ہے اور ایک مورتی اٹھا کر زور سے زمین پر دے مارتی ہے۔ مورتی ٹوٹ جاتی ہے) لو میں نے تمھاری مورتی توڑ ڈالی۔ اب تم اس کے لیے آنسو بہاتے رہنا۔ (مڑ کر خورشید کو دیکھ کر) اور تم— تم کمینے جذبات کے غلام اور قابلِ نفرت ہو۔ مگر میں تمھارے ساتھ چلوں گی۔ مجھے تمھاری ضرورت ہے۔

فانوس : (ٹوٹی ہوئی مورتی دیکھ کر) ترنم۔تم نے مورتی توڑ ڈالی۔ وہ — وہ

خورشید : یہ مورتی خاتون ترنم نے نہیں خود تم نے توڑی ہے۔

فانوس : میں نے!

خورشید : ہاں تم نے۔ آج اس نے پتھر بننے سے انکار کردیا ہے۔ اس نے مورتی نہیں توڑی۔ خود اپنے آپ کو توڑ پھوڑ ڈالا ہے۔ (ترنم کی طرف دیکھ کر) آؤ خاتون ترنم میرے ساتھ چلو۔ میں تمھاری مورتی کی طرح نہیں ایک ذی روح کی طرح پوجا کروں گا۔ فانوس تو تمھیں مورتی بنا چکا ہے۔

ترنم : نہ مجھے دیوی بننا ہے اور نہ کسی پجاری کی ضرورت ہے۔

خورشید : لیکن تمھیں ایک مرد کی بے شک ضرورت ہے۔

ترنم : ہاں۔ لیکن وہ مرد کون ہو۔ تم یا فانوس۔

خورشید : ابھی تم میرے حق میں فیصلہ کر چکی ہو۔

ترنم : میں دس سال سے ایسے فیصلہ کرتی اور پھر انھیں رد کرتی رہی ہوں۔

خورشید : (غصہ سے) تو پھر۔ تم ایک بڑا فراڈ ہو۔

ترنم : اور تم وہ واہیات مرد ہو جو مجھ سے میرا فیصلہ کرنے کا حق چھین لینا چاہتا ہو۔

خورشید : تم فیصلہ کرتی رہنا۔ میں جا رہا ہوں۔ واہیات بزدل عورت

(غصہ میں تیزی سے کمرے سے چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ ترنم کرسی پر بیٹھ کر خلا میں گھورنے لگتی ہے اور پھر ایک دم ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ پہلے تو فانوس اسے خاموشی سے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر ترنم کے پاس جا کر)

فانوس : تمھیں اس کے جانے کا اتنا دکھ ہے تو اسے روک لو۔ میں نے تو اس سے جانے کو نہیں کہا ہے۔

ترنم : کیا تم ہی نے کہا ہے۔ تم ہی نے کہا ہے۔

فانوس : میں نے

ترنم : ہاں تم نے۔ تم ہم دونوں کے درمیان وہ خاموش دیوار ہو جو کچھ نہ بولتے ہوئے بھی سب کچھ بولتی رہتی ہے۔

فانوس : تو پھر اس دیوار کو ڈھا ڈالو ترنم۔ میں نے منع تو نہیں کیا۔

ترنم : میں کئی مرتبہ کوشش کر چکی ہوں مگر جانے اس کی بنیادیں کتنی مضبوط ہیں کہ ہمیشہ میرے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ (فانوس کے پاس جا کر جذباتی انداز میں اس کا گریبان پکڑ کر) مان لو فانوس کہ میں ہی وہ مورتی ہوں جس کی تمھیں تلاش ہے (فانوس خاموش رہتا ہے) اگر میں خورشید کے ساتھ چلی گئی تو تم اس مورتی کو کبھی نہ پاسکو گے۔ میں اس محبت کے لیے ترس رہی ہوں جو شادی کے پہلے سال میں تم نے مجھے دی۔ تم خواب میں مجھے ہی دیکھتے رہے اور خواب ہی میں تم نے مجھے مورتی بنا کر میری تلاش شروع کر دی۔ فانوس! اگر کوئی درخت پھل نہیں دے سکتا تو سایہ ضرور دیتا ہے (خورشید کمرہ میں آتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں سوٹ کیس ہے۔ ترنم فانوس کا گریبان چھوڑ کر خورشید سے) تو تم جا رہے ہو۔

خورشید : (ترنم کو سر سے پیر تک دیکھ کر) میں پتھر کی مورتیوں کا پجاری نہیں ہوں۔

ترنم : (نفرت اور طنز سے) تو تم صرف عورت کے جسم کے پجاری ہو (خورشید پھر ترنم کو سر سے پیر تک دیکھتا ہے اور خاموشی سے دروازے کی طرف بڑھتا ہے) وہ جا رہا ہے فانوس۔ اسے روک لو۔

فانوس : خورشید

خورشید : (مڑ کر فانوس کی بات کاٹ کر ترنم سے) میرے ساتھ چل رہی ہو۔

ترنم : خورشید میں۔

(خورشید اس طرح رک کر کھڑا ہو جاتا ہے جیسے اس کی بات سننا چاہتا ہو۔ فانوس ٹوٹی مورتی اٹھا کر اس کی جگہ پر رکھتا ہے۔ ترنم خاموش ہو کر فانوس کو مورتی رکھتے ہوئے دیکھنے لگی ہے۔ خورشید کچھ دیر انتظار کرتا ہے پھر مڑ کر ترنم

کی طرف دیکھتا ہے جو فانوس کو دیکھ رہی ہے۔ خورشید آہستہ آہستہ کمرے سے چلا جاتا ہے۔ ترنم جب مڑکر دیکھتی ہے تو خورشید جا چکا ہوتا ہے)

ترنم : فانوس۔ خورشید چلا گیا۔

فانوس : (کچھ دیر خاموش رہ کر) تمہاری بلیوں کے لیے دودھ آگیا یا نہیں۔

(پردہ)

راوی چین لکھتا ہے

افرادِ تمثیل

(1) اسد (2) امینہ (اسد کی بیوی) (3) خوشبو (اسد کی لڑکی) (4) سہیل (اسد کا لڑکا) (5) عائشہ (امینہ کی بڑی بہن) (6) موی (عائشہ کی لڑکی) (7) عطیہ (اسد کی بھتیجی) (8) خالدہ (اسد کی بھاوج) (9) اکبر (ملازم)

منظر

(ایک کھاتے پیتے متوسط مسلم گھرانے کا کمرہ۔ نماز کی چوکی تخت جس پر سفید فرش گاؤ تکیہ، صوفہ سیٹ اور کچھ آرائشی سامان۔ کمرہ اپنے ذوق کے مطابق سجایا جاسکتا ہے۔ دو دروازے ایک گھر کے اندر اور ایک گھر کے باہر جانے کے لیے۔ جس وقت پردہ اٹھتا ہے امینہ تخت پر بیٹھی چھالیہ کاٹ رہی ہیں۔ عمر پچاس سال سے زیادہ ہے۔ پاس ہی خوشبو بیٹھی ہے۔ چہرے پر اکتاہٹ ہے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر اکتائے ہوئے لہجے میں)

خوشبو : اب آبھی جاؤ خالہ جان۔ ہم بہت بور ہو چکے۔

امینہ : (ہنس کر) ہاں خالہ جان پردے کے پیچھے بیٹھی ہیں نا کہ تمھارے کہنے میں

کی طرف دیکھتا ہے جو فانوس کو دیکھ رہی ہے۔ خورشید آہستہ آہستہ کمرے
سے چلا جاتا ہے۔ ترنم جب مڑ کر دیکھتی ہے تو خورشید جاچکا ہوتا ہے)

ترنم : فانوس۔ خورشید چلا گیا۔

فانوس : (کچھ دیر خاموش رہ کر) تمہاری بلیوں کے لیے دودھ آ گیا یا نہیں۔

(پردہ)

راوی چین لکھتا ہے

افرادِ تمثیل

(1) اسد (2) امینہ (اسد کی بیوی) (3) خوشبو (اسد کی لڑکی) (4) سہیل (اسد کا لڑکا) (5) عائشہ (امینہ کی بڑی بہن) (6) مومی (عائشہ کی لڑکی) (7) عطیہ (اسد کی بھتیجی) (8) خالدہ (اسد کی بھاوج) (9) اکبر (ملازم)

منظر

(ایک کھاتے پیتے متوسط مسلم گھرانے کا کمرہ۔ نماز کی چوکی تخت جس پر سفید فرش گاؤ تکیہ، صوفہ سیٹ اور کچھ آرائشی سامان۔ کمرہ اپنے ذوق کے مطابق سجایا جاسکتا ہے۔ دو دروازے ایک گھر کے اندر اور ایک گھر کے باہر جانے کے لیے۔ جس وقت پردہ اٹھتا ہے امینہ تخت پر بیٹھی چھالیہ کاٹ رہی ہیں۔ عمر پچاس سال سے زیادہ ہے۔ پاس ہی خوشبو بیٹھی ہے۔ چہرے پر اکتاہٹ ہے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر اکتائے ہوئے لہجے میں)

خوشبو : اب آ بھی جاؤ خالہ جان۔ ہم بہت بور ہو چکے۔

امینہ : (ہنس کر) ہاں خالہ جان پردے کے پیچھے بیٹھی ہیں تا کہ تمھارے کہنے میں

آجائیں گی۔

خوشبو : اب دیکھیے نا سوا نو بج رہے ہیں (کھڑی ہو کر) ناشتہ الگ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔

امینہ : یوں کہو خالہ کی اتنی فکر نہیں جتنی ناشتہ کی ہے (ہنستی ہیں پھر خوشبو کے کپڑوں کی طرف اشارہ کرکے) کپڑے ہی کچھ ڈھنگ کے پہن لیے ہوتے۔ خالہ دیکھیں گی تو کیا کہیں گی۔

خوشبو : اب ان کے سامنے کوئی فیشن پریڈ تو ہوگی نہیں کہ میں ماڈل گرل بن کر آؤں۔

امینہ : پھر بھی انسان کو کچھ تو۔ (ایک دم سردتی ٹوکری میں ڈال کر انگلی منہ میں رکھتے ہوئے) تمھاری بکواس سے میری انگلی کٹ گئی۔

خوشبو : امی آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے سردتی کی نالائقی میری نالائقی ہو۔

(اسی وقت اسد صاحب کمرے میں آتے ہیں۔ خوشبو انھیں دیکھ کر خاموش ہو جاتی ہے اور نظریں جھکا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اسد پہلے خوشبو اور پھر امینہ کو دیکھ کر)

اسد : کیا بات ہے؟

امینہ : بات کیا ہوگی۔ بکواس کے علاوہ کچھ آتا ہی نہیں۔ خالہ کے سامنے فینسی ڈریس شو کی ماڈل گرل بن کر جانا نہیں چاہتیں۔

(اسد مسکراتے ہیں۔ امینہ کچھ دیر خاموش رہ کر) آپ اسٹیشن نہیں گئے۔

اسد : کیا کرتا جا کر گاڑی تین گھنٹے لیٹ ہے۔

امینہ : گاڑی کو بھی آج ہی لیٹ ہونا تھا۔

اسد : (مسکرا کر) اب گاڑی کو کیا معلوم تھا کہ آپ کی بہن سفر کر رہی ہیں۔ لیٹ ہونے پر آپ فوجداری کا مقدمہ قائم کر دیں گی۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) ان کی ایک لڑکی بھی تو تھیں۔

امینہ : اے ہے آپ تو یوں پوچھ رہے ہیں جیسے باجی آپ کے لیے اجنبی ہوں۔ اللہ رکھے ایک لڑکی ہے۔

اسد : غیر ملک میں جا کر بس جانے سے رشتے ناتے بھی دور کے ہو جاتے ہیں۔

اجنبی ہی سمجھو۔

اینہ : آپ کے لیے تو آپ کی اولاد بھی اجنبی ہے۔ اسے ہی کہاں دیکھا اور سمجھا ہے آپ نے۔

(اسد کے چہرے پر بے چارگی ظاہر ہوتی ہے)

اسد : کیا عمر ہوگی اس کی؟

اینہ : ماشاء اللہ اپنی خوشبو سے دو سال بڑی ہے (فخریہ انداز میں) دیکھو گے تو دیکھتے ہی رہ جاؤ گے)

اسد : (ہنس کر) زیادہ سے زیادہ اپنی ماں کی ڈپلی کیٹ کاپی ہوں گی۔

اینہ : تو باجی کسی سے کم ہیں ہزاروں میں ایک ہیں۔

اسد : ہم تو بس آپ ہی کو لاکھوں میں ایک سمجھتے ہیں۔ (اینہ گھبرا کر خوشبو کی طرف دیکھتی ہیں جو ریک میں کوئی کتاب تلاش کر رہی ہے۔ اسد کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔ کچھ دیر رک کر) خوشبو! کون سی کتاب تلاش کر رہی ہو۔

خوشبو : الفاروق — بھائی جان کل سے تلاش کر رہے ہیں۔

اسد : وہ تو شریف صاحب لے گئے ہیں اور یہ سہیل صبح سے ہے کہاں؟

خوشبو : اپنے کمرے میں ہوں گے (ہنس کر) جب سے خالہ جان کے آنے کا سنا ہے ان کی عمر ایک ہزار سال ہوگئی ہے۔ مجھے اور اکبر کو حکم ہے کہ انھیں ایک ہزار سال کا نوجوان مانا جائے۔

اسد : ایک ہزار سال!

اینہ : اسے تو ایسی اونٹ پٹانگ باتیں کرنے میں مزہ آتا ہے۔ تم جا کر اکبر کو دیکھو بازار سے آیا یا نہیں۔ (خوشبو کمرے سے چلی جاتی ہے۔ اینہ کچھ دیر خاموش رہ کر) کل طاہر میاں کی دلہن آئی تھیں۔

اسد : (روکھے لہجے میں) کیوں؟

اینہ : وہی خوشبو اور نسیم کی بات

اسد : (بگڑ کر) آپ نے پھر وہی ذکر چھیڑا۔ مجھے اس سے چڑ ہوتی ہے۔

امینہ : آپ تو ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جاتے ہیں اگر یوں اتنی سی بات پر دھیان دیں تو پھر شادی بیاہ تو ہو چکا۔

اسد : آپ اسے اتنی سی بات کہتی ہیں

خوشبو : (کمرے میں آکر) ڈیڈی شریف انکل آئے ہیں۔

اسد : انھیں کمرے میں بٹھلایا۔

(خوشبو اثبات میں سر ہلاتی ہے۔ اسد دروازے کی طرف جاتے ہیں۔ امینہ انھیں جاتا ہوا دیکھ کر)

امینہ : اب آپ اسٹیشن تو جا چکے۔

اسد : جائیں۔ سر کے بل جائیں گے۔ آپ کی باجی آ رہی ہیں۔ ضرورت پڑی تو جہنم تک میں جائیں گے۔ اسٹیشن کی بات تو دوسری ہے۔

(کمرے سے چلے جاتے ہیں۔ خوشبو امینہ کے پاس آکر)

خوشبو : آج تو ڈیڈی بڑے موڈ میں نظر آرہے ہیں۔ اتنی باتیں کرتے تو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ (تخت پر امینہ کے پاس بیٹھ کر) امی! کیا موی باجی بہت خوبصورت ہیں؟

امینہ : اب تم خود ہی دیکھ لو گی اور ہاں سنو۔ باجی کے سامنے اپنی چونچ بند رکھنا زیادہ چپڑ چپڑ کرنے کی ضرورت نہیں وہ بہت سنجیدہ خاتون ہیں۔

خوشبو : اگر موی باجی ان کی ٹروکاپی ہوئیں تو بور کردیں گی۔

(سہیل کمرے میں آکر تھرڈ کلاس ہوٹل کے لڑکے کی طرح بلند آواز سے)

سہیل : دو کپ چائے — کڑک — آدھا پلیٹ بسکٹ۔

امینہ : (تخت سے اُترتے ہوئے بیزاری سے) بس آگئے سر پر مسلط ہونے۔ بلا چائے پیے ملاقات ہو ہی نہیں سکتی۔

(بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے چلی جاتی ہیں۔ ان کے جانے کے بعد خوشبو ٹھنڈی سانس بھر کر)

خوشبو : ہائے عطیہ باجی اب آپ کا کیا ہوگا۔

سہیل : کیوں عطیہ کو کیا ہوا۔

خوشبو : یہ پوچھیے کہ کیا نہیں ہوا۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) بے چاری عطیہ باجی کی قسمت

سہیل : ارے کچھ بتلائے گی بھی یا عطیہ کی قسمت کو ہی روتی رہے گی

خوشبو : خون ہوگیا بھائی جان— خون

سہیل : کس کا خون ہوگیا

خوشبو : عطیہ باجی کے دل کا اور میرے ارمانوں کا

سہیل : (خوشبو کے شرارتی موڈ کو سمجھ کر) یہ حادثات کیونکر ہوئے۔

خوشبو : ہوئے نہیں ہونے والے ہیں۔ خالہ جان کی صاحبزادی زبردست حادثہ بن کر آرہی ہیں۔ امی نے اعلان کردیا ہے کہ وہ ہزاروں میں ایک ہیں۔

سہیل : ہونے دو اس سے عطیہ کی صحت پر کیا اثر پڑے گا۔

خوشبو : خطرہ عطیہ باجی کی صحت کا نہیں آپ کی صحت کا ہے۔

سہیل : میں اپنی صحت کا پورا خیال رکھوں گا۔

خوشبو : کیا خاک خیال رکھیں گے۔ عطیہ باجی نے آپ کی صحت پہلے ہی خراب کر رکھی ہے۔

سہیل : اگر انھوں نے میری صحت پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی تو پھر تماشا دیکھنا۔

خوشبو : (ہنس کر) کہیں وہ آپ ہی کو تماشا نہ بنادیں۔

اکبر : (کمرہ میں آکر) سہیل میاں مہمان تشریف لے آئے ہیں۔

سہیل : ابے جا جا۔ بلا وجہ اڑا رہا ہے گاڑی تین گھنٹے لیٹ ہے۔

اکبر : مگر سہیل میاں—

سہیل : (بات کاٹ کر) ڈیڈی کے ملاقاتی ہوں گے۔ ان کے کمرے میں لے جا۔

اکبر : مگر وہ تو خواتین ہیں— آپ کی—

سہیل : اچھی طرح دیکھا بھی تھا کہ خواتین ہیں

اکبر : اب میں مردوں اور عورتوں کو بھی نہیں پہچانوں گا—

سہیل : تیرا کیا ہے پہچانے پہچانے نہ بھی پہچانے۔
اکبر : مگر میں آپ کی خالہ جان کو خوب پہچانتا ہوں——

(اسی وقت عائشہ اور موی کمرے میں آتی ہیں۔ پہلے تو سہیل اور خوشبو دونوں حیرت سے دونوں کو دیکھتے ہیں پھر ادب سے عائشہ کو سلام کرتے ہیں۔ سہیل موی کی طرف اشارہ کرکے)

سہیل : خالا جان ان محترمہ کو مجھے سلام کرنا چاہیے یا یہ مجھے سلام کریں گی۔
عائشہ : (ہنس کر) سلام اسی نالائق کو کرنا چاہیے۔

(موی ہاتھ اٹھا کر سلام کرتی ہے۔ سہیل بوڑھی عورتوں کے انداز میں)

سہیل : جُگ جُگ جیو۔ پھولو پھلو۔
عائشہ : (ہنستی ہیں، خوشبو سے) امینہ کہاں ہے۔
خوشبو : اندر ہیں بلاتی ہوں۔ (بلند آواز سے) امی خالہ جان آگئیں۔

(تیزی سے کمرہ سے چلی جاتی ہے۔ سہیل اکبر سے)

سہیل : کھڑا کھڑا کیا صورت دیکھ رہا ہے۔ جا کر سامان اُتار۔
(اکبر جاتا ہے) خالہ جان گاڑی تو تین گھنٹے لیٹ تھی۔
عائشہ : ہاں۔ مگر راستہ میں ڈیڑھ گھنٹہ میک اَپ کرلیا۔
سہیل : لاحول ولا قوۃ۔ آپ نے ایسی نالایق گاڑی میں سفر ہی کیوں کیا جو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی تھی پہلے لیٹ پھر میک اَپ۔
عائشہ : راستہ میں کچھ اسٹوڈینٹ کی گڑبڑ تھی۔
سہیل : ارے نہیں خالہ جان۔ (رازدارانہ انداز میں) سب ریلوے والوں کی حرکت ہوتی ہے۔ گاڑیاں آمنے سامنے سے ٹکرادیں گے اور کہیں گے اسٹوڈینٹ کی حرکت، شرارتی لوگوں کی حرکت تھی، دہشت پسند تھے۔ اور ہاں (ہاتھ سے اشارہ کرکے) آپ کی ایک اتنی بڑی صاحب زادی تھیں انھیں نہیں لائیں۔
عائشہ : (موی کی طرف اشارہ کرکے) یہ ہے تو تم پہچانے نہیں۔

سہیل : (موی کو غور سے دیکھ کر۔ پھر ہاتھ کے اشارہ سے) وہ تو اتنی سی تھیں۔

عائشہ : (مسکرا کر) جب تم اس سے ملے تھے تم بھی اتنے ہی بڑے تھے۔

سہیل : اتنے بڑے تھے! لعنت ہو ہم پر اگر ہم کبھی اتنے بڑے رہے ہوں۔ ایک ہزار سال سے ہم اتنے ہی بڑے ہیں۔ اگر خدا ہم کو اتنا چھوٹا پیدا کرتا تو ہم پیدا ہونے سے انکار کر دیتے۔

(عائشہ قہقہہ مار کر ہنستی ہیں۔ موی غور سے سہیل کو دیکھتی ہے کہ امینہ تیزی سے کمرے میں آتی ہیں۔ دونوں بہنیں گلے ملتی ہیں۔ امینہ موی سے)

امینہ : موی اچھی تو ہو۔ سفر میں تکلیف تو نہیں ہوئی۔

موی : (سلام کر کے) جی نہیں سفر اچھی طرح گزرا۔

امینہ : سہیل اور اس کے باپ تو اسٹیشن جانے کے لیے تیار تھے مگر گاڑی لیٹ تھی۔ گھر تلاش کرنے میں تو دقت نہیں ہوئی۔

عائشہ : نہیں۔ ٹیکسی والا تمہارے محلہ کا ہی رہنے والا تھا۔

سہیل : رحیمو ہوگا، وہی کم بخت سارے شہر کو ہمارے گھر کا پتہ بتلاتا پھرتا ہے۔

عائشہ : اسد میاں کہاں ہیں؟

امینہ : اپنے کمرہ میں سیاست پر گفتگو کر رہے ہیں۔ باجی جب سے پنشن ہوئی ہے میں تو عاجز آ گئی ہوں۔

عائشہ : (مسکرا کر) کیوں؟

امینہ : دن بھر دوستوں کا مجمع لگا رہتا ہے جانے کہاں سے اتنے دوست پھٹ پڑے ہیں۔

سہیل : امی دوستوں سے آپ کو اتنی شکایت نہیں جتنی ان کے لیے چائے بنانے سے ہے۔

امینہ : دن بھر چائے کے لیے چولھے سے سر پھوڑنا کون سی شرافت ہے۔

سہیل : اور اپنی شرافت کا ثبوت دینے کے لیے آپ خالہ جان سے چائے کا بھی نہیں پوچھ رہی ہیں۔

امینہ : میں خوشبو سے کہہ آئی ہوں وہ چائے لا رہی ہے۔

سہیل : میں ڈیڈی کو خالہ جان کے آنے کی اطلاع کردوں۔

امینہ : ہاں جاکر کہہ دو تاکہ سیاست سے جلدی فرصت مل جائے۔

(سہیل کمرہ سے چلا جاتا ہے۔ خوشبو چائے لے کر آتی ہے)

عائشہ : (خوشبو سے) بھئی ابھی تم اور موی چائے پیو۔ میں منہ ہاتھ دھوکر ذرا تازہ دم ہولوں (امینہ سے) غسل خانہ کدھر ہے۔

امینہ : آیئے۔

(دونوں دروازے کی طرف بڑھتی ہیں کہ دوسرے دروازے سے عطیہ کمرے میں آتے ہوئے)

عطیہ : آداب۔ بڑی امی

امینہ : (مڑ کر عطیہ کو دیکھ کر) خوش رہو۔

(عائشہ بھی مڑ کر دیکھتی ہے۔ عطیہ ادب سے سلام کرتی ہے)

عائشہ : خوش رہو (امینہ سے) طاہر میاں کی لڑکی ہے۔

امینہ : جی نہیں۔ مرغوب میاں کی

عائشہ : (عطیہ سے) ماں باپ تو خیریت سے ہیں۔

عطیہ : آپ کی دعا ہے۔

عائشہ : اچھا بیٹی تم چائے پیو میں ابھی آتی ہوں۔

(عائشہ اور امینہ چلی جاتی ہیں۔ خشبو عطیہ سے)

خوشبو : یہ موی باجی ہیں— (عطیہ اور موی ایک دوسرے کو سلام کرتی ہیں) پہلے ایک ایک پیالی چائے ہوجائے۔ خالہ جان فریش ہولیں پھر ناشتہ کریں گے۔

عطیہ : (کرسی پر بیٹھ کر پیالیوں میں چائے نکالتے ہوئے) آپ پہلی مرتبہ یہاں آئی ہیں۔

موی : آنے کا تو ہر سال ارادہ کرتے تھے مگر ہمیشہ کوئی نہ کوئی الجھن پیدا ہوجاتی تھی۔ پاسپورٹ اور ویزا کا چکر الگ تھا۔

(سہیل کمرہ میں آتا ہے۔ عطیہ ایک پیالی موی کو اور دوسری خوشبو کو دیتی

ہے۔سہیل آگے بڑھتے ہوئے)

سہیل : گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے ابرِ کرم بحرِ سخا کچھ تو ادھر بھی

(موی پہلے تو سہیل کو دیکھتی ہے جو سنجیدہ بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر خوشبو سے)

موی : کیا سہیل بھائی کو شعروں کی ایسی تیسی کرنے کا بھی شوق ہے۔

خوشبو : (تیزی سے کھڑی ہو کر اپنی پیالی اسے دے کر) آپ تشریف رکھیے۔

سہیل : (پیالی لے کر کرسی پر بیٹھ کر) میں نے کس طرح شعر کی ایسی تیسی کر دی۔

موی : جناب دوسرا مصرع اس طرح ہے "اے خانہ براندازِ چمن کچھ تو اِدھر بھی۔"

سہیل : لاحول ولا قوۃ۔ خانہ برانداز چمن (جارحانہ انداز میں) خانہ برانداز چمن کے معنی بھی معلوم ہیں (ہاتھ ہلا کر) خانہ برانداز چمن مزید لاحول ولا قوۃ (خوشبو جو سہیل کے پیچھے کھڑی ہے اپنے سر کے آس پاس اس طرح ہاتھ گھماتی ہے جیسے اشارہ کر رہی ہو کہ دماغ چلا ہوا ہے۔ سہیل مڑ کر خوشبو کو دیکھ کر) کیوں خوشبو ہم نے شعر صحیح پڑھا ہے۔ ہم ایک ہزار سال سے یہ شعر یوں ہی پڑھ رہے ہیں۔

خوشبو : جی ہاں۔ چھ سو سال سے میں بھی یہ شعر اسی طرح سُن رہی ہوں۔ آپ سے چار سو سال چھوٹی ہوں نا۔

سہیل : اور یہ محترمہ کہہ رہی ہیں ہم نے شعر غلط پڑھا ہے۔

خوشبو : یہ آج کل کے زمانہ کی ہیں۔ شعر یوں ہی پڑھا ہوگا۔

سہیل : اگر یوں پڑھا ہے تو پھر کوئی اعتراض نہیں۔

خوشبو : زمانہ کے ساتھ ساتھ شعر بھی بدل گئے ہیں۔ ایک ہزار سال ہو گئے نا۔

(سہیل بے وقوفوں کے انداز میں گردن ہلاتا ہے جیسے خوشبو کی بات کی تصدیق کر رہا ہو۔ موی کو غور سے دیکھتا ہے۔ پھر ایک دم کھڑے ہو کر موی سے)

سہیل : اب میں آپ کو پہچان گیا۔

موی : (گھبرا کر) جی۔

سہیل : آپ تسنیم ہیں۔ چھ سو سال پہلے میرے ساتھ کالج میں پڑھا کرتی تھیں۔

موی : چھ سو سال پہلے— مگر میں—

سہیل : (بات کاٹ کر) کیوں خوشبو تمھیں یاد ہے یہ اکثر میرے ساتھ آیا کرتی تھیں۔

خوشبو : مجھے کچھ زیادہ یاد نہیں۔ اس وقت میں صرف دو سو سال کی بچی تھی۔

اکبر : (کمرہ میں آکر) ناشتہ پر آپ سب کا انتظار ہو رہا ہے۔ بڑے صاحب بھی آگئے ہیں۔

سہیل : بڑے صاحب کیوں آگئے ہیں؟

اکبر : ناشتہ کرنے

سہیل : پھر جھوٹ بولا۔ ہم سب تو بور کرنے آتے ہیں۔

خوشبو : آیئے موی باجی۔ ڈیڈی آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ چلیے عطیہ باجی۔ (موی کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے چلی جاتی ہے۔ عطیہ سہیل سے)

عطیہ : یہ آپ نے کیا اونٹ پٹانگ باتیں شروع کر دیں۔

سہیل : گویا آپ سمجھتی ہیں کہ ہم ایک ہزار سال سے زندہ نہیں ہیں۔

عطیہ : اجی آپ تو لاکھوں سال سے زندہ ہیں مگر اس وقت اس واہیات مذاق کی کیا ضرورت تھی۔

سہیل : محترمہ عطیہ خاتون ہم اپنے کو جھوٹا سمجھنے والے اور اپنے معاملات میں دخل دینے والے کے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں ممکن ہے ہم آپ کو مرغی بلکہ کڑک مرغی بنا دیں بس چپ چاپ دیکھتی رہیے اور فی الحال چل کر ڈیڈی کے ذریعہ بور ہو لیجیے۔

(پردہ)

دوسرا سین

منظر

(وہی کمرہ۔ سہیل صوفے پر نیم دراز ہے۔ آنکھیں بند ہیں آہستہ آہستہ گنگنا رہا ہے۔ ”بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں۔ سلمٰی سے دل لگا کر— بستی

کی لڑکیوں میں— اسد کمرہ میں آتے ہیں۔ سہیل کو ان کے آنے کا علم نہیں ہوتا، برابر گنگناتا رہتا ہے۔ اسد کچھ دیر رک کر)۔

اسد : خدا کا شکر ہے بدنام تو ہوئے— (سہیل ایک دم گھبرا کر کھڑا ہوجاتا ہے۔ اسد کچھ دیر خاموش رہ کر) تم موی اور خوشبو کے ساتھ بازار نہیں گئے۔

سہیل : وہ مجھے ساتھ نہیں لے گئیں۔ کہنے لگیں میں انھیں بور کرتا ہوں۔

اسد : ضرور کرتے ہوگے اور مرغوب کے یہاں کہہ آئے کہ باجی ان کے یہاں آرہی ہیں۔

سہیل : بس جا ہی رہا تھا۔

(سہیل تیزی سے کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ اسد اسے جاتا دیکھ کر مسکراتے ہیں اور پھر گنگناتے ہیں۔ ''بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہورہا ہوں— بستی کی لڑکیوں میں— امینہ کمرے میں آکر— چند سیکنڈ رک کر)

امینہ : ان لڑکیوں کے نام بھی بتلا دو جن میں بدنام ہورہے ہو۔ بچے سنیں گے تو خوش ہوں گے— کیا سٹھیا گئے ہو کہ اپنی بدنامی کے قصے سنا رہے ہو۔

اسد : سٹھیانے کی کیا بات ہے۔ جوانی میں یہ نظم خود ہمیں پسند تھی (مسکرا کر) آپ کو یاد ہے۔ شادی سے پہلے جب آپ ہمارے یہاں مہمان آتی تھیں اور ہم گنگناتے تھے۔

پاک سہانی گھر کی فضائیں بوئے حنا سے مست ہوئیں
صحن میں بنت عم کی صدائیں اف ری جوانی ہائے زمانے

تو آپ کیسے چھپ چھپ کر سنا کرتی تھیں۔

امینہ : اے ہے خدا سے ڈرو۔ میں کب چھپ چھپ کر سنا کرتی تھی۔ آپ ہی میرے پیچھے پیچھے پھرا کرتے تھے۔

اسد : چلیے ہم ہی آپ کے پیچھے پیچھے پھرا کرتے تھے مگر اب سوچتے ہیں کہ ہم نے غلطی نہیں کی تھی۔ بخدا آپ کے ساتھ نے ہماری زندگی کو نور اور خوشبوؤں سے معطر کردیا۔ (صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں۔ کچھ دیر خاموش رہ کر افسردہ لہجے میں) مگر

جانے کیوں امینہ ہماری اولاد ہم سے اس قدر مانوس نہیں جتنا اولاد کو اپنے باپ سے ہونا چاہیے۔ (دکھ بھرے لہجے میں) ہم چاہتے ہیں کہ وہ اپنا دکھ درد ہم سے بیان کریں مگر ہمارے اور ان کے درمیان ایک پردہ ہے جسے وہ ہٹانا نہیں چاہتے۔

امینہ : (ہنس کر) اور یہ پردہ آپ اپنی بدنامی کے قصے سنا کر ہٹانا چاہتے ہیں۔ (ایک دم سنجیدہ ہوکر) آپ نے بچپن ہی سے انھیں یہ موقع نہیں دیا کہ وہ آپ سے بے تکلف ہوتے۔

اسد : شاید آپ سچ کہہ رہی ہیں۔ ہم ان سے دور دور رہے اور آج جب ہم ان سے قریب ہونا چاہتے ہیں تو وہ ہمیں اس طرح دیکھتے ہیں جیسے ہم اجنبی ہوں، غیر ہوں، ہمیں دیکھ کر جانے کیوں ان کے بے تکلف قہقہے دم توڑ دیتے ہیں۔ (اسد خاموش ہوجاتے ہیں چہرہ پر دُکھ کے آثار ہیں۔ عائشہ کمرہ میں آکر)

عائشہ : یہ موی اور خوشبو ابھی تک نہیں آئیں۔

امینہ : آجائیں گی۔ (ہنس کر) بچیاں تو ہیں نہیں کہ راستہ بھول جائیں۔

عائشہ : لڑکیوں کے یوں مارے مارے پھرنے سے بھئی مجھے ہول ہوتا ہے۔

اسد : ہول کی کیا بات ہے پڑھی لکھی اور سمجھدار ہیں۔

عائشہ : (مسکرا کر) ہماری ماں نے تو ہمیں کبھی دروازے سے جھانکنے تک نہیں دیا۔ اگر ذرا بھی شک ہوجاتا تھا تو وہ ڈانٹ پڑتی تھی کہ ہم گھنٹو آنچل میں منہ چھپا کر روتے رہتے تھے۔

اسد : اب آنچل رہا ہی کہاں ہے کہ اس میں منہ چھپایا جائے۔

عائشہ : یہی تو رونا ہے۔ (صوفے پر بیٹھ کر) خدا سے دعا کرتی ہوں کہ موی جلدی سے اپنے گھر کی ہوجائے تو سمجھوں گنگا نہائی۔ (امینہ کی طرف دیکھ کر) ماشاء اللہ خوشبو بھی اب سیانی ہوگئی ہے۔ اس کی بھی کچھ فکر کررہی ہو۔

امینہ : (عائشہ کے پاس بیٹھے ہوئے) اب باجی پیغام تو بہت ہیں۔ اب طاہر میاں کا لڑکا نسیم ہے۔ اس کی ماں بھی برابر چکر لگا رہی ہے مگر ان کی ناک پر مکھی نہیں

بیٹھ رہی ہے۔

اسد : تم نے پھر ان کا ذکر چھیڑا جانتی نہیں مجھے اس سے چڑ ہوتی ہے۔

عائشہ : اسد میاں جس گھر میں بیری ہوتی ہے پتھر تو آتے ہی ہیں۔ ان سے چڑا تو نہیں کرتے۔

اسد : میں دوسروں کے پھینکے ہوئے پہاڑ برداشت کرسکتا ہوں مگر ان کا پھینکا ہوا کنکر بھی نہیں۔ طاہر کی بیوی کی حرکت کا آپ کو علم ہے؟— نسیم کی پہلے تو اپنے بھائی کی لڑکی سے نسبت طے کرنے کی کوشش کی جب وہاں سے جواب مل گیا تب خوشبو یاد آئی۔

امینہ : اب باجی گھٹنا پہلے تو پیٹ ہی کی طرف جھکتا ہے میں تو خدا لگتی کہتی ہوں نسیم ہزاروں میں ایک ہے مگر ان کی تو وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ پٹھانوں کی ٹر۔

اسد : ہاں ہاں پٹھانوں کی ٹر ہی سمجھو مگر نسیم کا نام میرے سامنے نہ لینا اور طاہر کی بیوی سے صاف کہہ دینا کہ گھٹنا اُدھر ہی جھکتا رہے ہماری طرف نہ جھکے۔

امینہ : تمھیں دنیاداری کبھی نہیں آئے گی۔

اسد : (بیزاری سے) بس دنیاداری تم ہی کرتی رہو۔ میں تو نرا گنوار ہوں۔
(غصہ میں تیز تیز قدموں سے کمرے سے چلے جاتے ہیں)

امینہ : پینشن کیا ہوئی ہے کہ مزاج ہی بگڑ گیا ہے ذرا ذرا سی بات پر ایسے بے قابو ہوجاتے ہیں جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

عائشہ : ماحول کی تبدیلی کا اثر ہے۔ اللہ بخشے تمہارے بہنوئی کو پینشن کے بعد ایسی چپ لگی تھی جیسے بولنا ہی بھول گئے ہوں۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) مرغوب میاں کا ایک لڑکا بھی تو تھا۔

امینہ : اللہ رکھے ہے نا۔ باہر گیا ہوا ہے اور یہ عطیہ (ہنس کر) بڑی ہڑدنگی ہے، آجاتی ہے تو سارا گھر سر پر اٹھا لیتی ہے (رازدارانہ لہجہ میں) کالج کے ڈراموں میں حصہ لے چکی ہے۔

عائشہ : بس قیامت آئی سمجھو کہ لڑکیوں کے ایسے چھن ہو گئے ہیں۔ بھئی میں نے تو موی کو ایسی آزادی کبھی نہ دی۔ (سہیل کمرہ میں آتا ہے امینہ اسے دیکھ کر)

امینہ : مرغوب میاں کے یہاں نہیں گئے۔

سہیل : وہیں سے تو آرہا ہوں۔ ابھی سب کو بلایا ہے رات کا کھانا وہیں کھانا ہے۔

امینہ : تم نے کیا کیا؟

سہیل : میں کیا کہتا۔ مرغوب چچا کے سر پر دوچار مرغوں کا خون سوار ہو گیا ہے میں روکنے والا کون ہوتا ہوں۔ جلدی تیار ہو لیجیے عطیہ آپ کو لے جانے کے لیے آرہی ہے۔

امینہ : ساتھ لے آئے ہوتے اب اکیلی آئے گی۔

سہیل : میم صاحب آرائش جمال میں مصروف تھیں کب تک انتظار کرتا۔

عائشہ : بھئی سہیل میاں تم نے کہا ہوتا کہ تکلف کی کیا ضرورت ہے۔

سہیل : خالہ جان۔ مرغوں سے میرا کوئی یارانہ تو ہے نہیں کہ ان کے قتلِ عام پر دکھی ہو جاتا۔ (عائشہ ہنستی ہے۔ امینہ کھڑے ہو کر)

امینہ : آیئے باجی تیار ہو لیں۔ وہیں چل کر مرغوب میاں کی دلہن سے گپ شپ کریں گے۔

(دونوں کمرے سے چلی جاتی ہیں۔ سہیل بلند آواز سے)

سہیل : اکبر میاں— اکبر میاں

اکبر : حاضر ہوا۔ (اکبر کمرہ میں آکر) فرمایئے۔ کیا حکم ہے۔

سہیل : ہم نے کبھی آپ کو حکم دیا ہے۔ عرض ہے کہ ایک پیکٹ سگریٹ لا دیجیے مگر خیال رہے، ڈیڈی کو علم نہ ہو (اکبر جانے کے لیے مڑتا ہے کہ باہر سے خوشبو کے قہقہے کی آواز) ذرا سنیے تو اس قدر فرمانبرداری کی ضرورت نہیں ہے۔ (اکبر مڑ کر دیکھتا ہے کہ خوشبو اور موی کمرے میں آتی ہیں) میرے کمرے میں تکیہ کے نیچے پرس رکھا ہے اس میں سے پیسے لے لیجیے گا۔

اکبر : (اپنے دونوں کان پکڑ کر) سہیل میاں گردن کاٹ دیجیے مگر میں آپ کے

کمرے میں نہیں جاؤں گا۔

سہیل : آپ کیوں تشریف نہیں لے جائیں گے۔

اکبر : مجھے آپ کے کمرے میں ڈر معلوم ہوتا ہے۔

سہیل : ڈرپورک کہیں کا۔ اچھا میرے ساتھ۔

(سہیل اور اکبر کمرے سے چلے جاتے ہیں۔ موی سوالیہ نظروں سے خوشبو کو دیکھتی ہے)۔

خوشبو : اکبر کبھی بھائی جان کے کمرے میں نہیں جاتا، کہتا ہے اس میں اثرات ہیں اس کا گلا دبا دیں گے۔

موی : اثرات۔ کیسے اثرات۔

خوشبو : کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قرآن کی تلاوت کررہا ہے۔ کمرہ خوشبوؤں سے مہک جاتا ہے لیکن آج تک کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

موی : اور یہ ہزاروں سال زندہ رہنے کا کیا چکر ہے۔

خوشبو : ارے کچھ نہیں ان کے دماغ میں بیٹھ گیا ہے کہ وہ ہزاروں سال سے زندہ ہیں اور اگر مخالفت کرو تو برا مان جاتے ہیں اور لڑنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ ویسے عام حالت میں بڑے خوش مزاج ہیں۔

(سہیل بڑبڑاتا ہوا کمرہ میں آتا ہے)

سہیل : بزدل— کم بخت کہتا ہے استعفا دے دوں گا مگر کمرے میں نہیں جاؤں گا۔ کسی مولوی کو بلا کر حاضرات بٹھوایئے— بزدل— (خوشبو کو دیکھ کر) تم ابھی یہیں کھڑی ہو— مرغوب چچا کے یہاں نہیں چلو گی۔

خوشبو : مرغوب چچا کے یہاں! کیوں؟

سہیل : وہ کچھ مرغوں سے پرانی دشمنی نکالنے والے ہیں۔

خوشبو : کیا ابھی چلنا ہوگا۔

سہیل : تم کل چلی جانا اور سب آج ہی اور ابھی جائیں گے۔ عطیہ لینے آتی ہی ہوگی۔

خوشبو : اب ان مرغوں کو بھی بھگتنا پڑے گا۔ آیئے موی باجی (کمرہ سے چلی جاتی ہے۔ موی آگے بڑھتی ہے۔ سہیل اس کا راستہ روک کر)

سہیل : تسنیم—

موی : میں عرض کر چکی ہوں میں تسنیم نہیں ہوں۔

سہیل : اگر تسنیم نہیں ہیں تو پھر کون ہیں آپ۔

موی : میں موی ہوں مہرالنساء

سہیل : مہرالنساء۔ کچھ سال ہوئے ایک شہنشاہ تھا جہانگیر، اس کی بیوی کا نام مہرالنساء تھا وہ اسے پیار سے نور جہاں کہا کرتا تھا۔

موی : (بیزاری سے) میں وہ مہرالنساء نہیں ہوں۔

سہیل : (خوش ہوکر) تو پھر تسنیم ہیں جو چھ سو سال پہلے میرے ساتھ کالج میں پڑھا کرتی تھیں۔

موی : (بے حد بیزاری سے) آپ کس جنم کی باتیں کر رہے ہیں۔

سہیل : ہمارا تو وہی جنم ہے ممکن ہے آپ نے دوسرا جنم لیا ہو اور اُس جنم کی باتیں بھول گئی ہوں مگر آپ ہیں تسنیم۔

موی : میں کہہ رہی ہوں کہ میں تسنیم نہیں ہوں۔

سہیل : کیسے نہیں ہیں ضرور ہیں (رومینٹک انداز میں) کیا دن تھے وہ بھی نہ کوئی غم تھا نہ فکر۔ (عطیہ آتی ہے اور دروازے پر ہی رک جاتی ہے) ہم جھرنوں اور آبشاروں کے کنارے پکنک مناتے تھے باغوں میں قہقہے لگاتے گھوما کرتے تھے۔ پھر یکایک آپ ہم سے جدا ہوگئیں ہماری زندگی مسلسل ٹریجڈی بن گئی ان دنوں میں ہم کس قدر اداس رہے آپ اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتیں۔

موی : (اکتاہٹ کے لہجے میں) جانے کہاں کی اڑا رہے ہیں آپ۔ (عطیہ پر نظر پڑتی ہے) ارے آیئے نا۔ وہاں کیوں کھڑی ہیں۔

(سہیل عطیہ کو دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔ عطیہ آگے بڑھ کر طنزیہ لہجے میں)

3B

عطیہ : آپ نے ابا حضور کا پیغام بڑی ای کو کیسے پہنچایا ہوگا۔

سہیل : پیغام پہنچا دیا گیا ہے۔ (موی سے) آپ تیاری نہیں کر رہیں۔

موی : آپ کی ایک ہزار سال پرانی باتوں سے فرصت ملے تو کچھ کیا جائے۔

سہیل : گویا ہم ایک ہزار سال سے زندہ نہیں۔ خیر فی الحال تو آپ تیاری کیجیے۔ (موی کمرے سے چلی جاتی ہے۔ سہیل ہنس کر عطیہ سے) تو آج مرغوب چچا نے حاتم کی قبر پر لات مارنے کا ارادہ کر ہی لیا۔ (عطیہ خاموش رہتی ہے) اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ باورچی خانے میں کون سا کارنامہ انجام دیتی ہیں (عطیہ خاموش رہتی ہے) ہیں کیا مون برت رکھا ہے۔

عطیہ : (طنزیہ) میں یاد کر ہی ہوں کہ یہاں کہاں کہاں آبشار اور جھرنے ہیں جہاں آپ پکنک منائیں۔ کون کون سے باغ ایسے ہیں جہاں آپ قہقہے لگاتے گھومتے پھریں۔ (تیزی سے آگے بڑھتی ہے۔ سہیل اس کا راستہ روک کر دونوں بازو پکڑ کر)

سہیل : عطیہ پہلے میری بات سنو۔

عطیہ : (غصہ سے جھٹکا دے کر اپنے بازو چھوڑا کر) بدتمیزی کی ضرورت نہیں۔ اپنی حدود میں رہیے۔

(تیزی سے کمرہ سے چلی جاتی ہے۔ سہیل خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہتا ہے)۔

(پردہ)

تیسرا سین

منظر

(وہی کمرہ۔ امینہ تخت پر بیٹھی چھالیہ کاٹ رہی ہیں۔ پاس ہی صوفے پر اسد بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد امینہ اسد کو دیکھ کر)

امینہ : کل مرغوب میاں کی دلہن کہہ رہی تھیں کہ طاہر میاں کی دلہن ان کے گھر آئی تھیں۔

اسد : (ہنس کر) یہ کوئی تیسری عالمگیر جنگ چھڑنے کا پیش خیمہ تو ہے نہیں کہ آپ

پریشان ہوگئیں۔ عزیز ایک دوسرے کے یہاں آتے جاتے ہی رہتے ہیں۔

امینہ : میں کہتی ہوں آپ کو عقل کب آئے گی۔ ان کا ارادہ نسیم کے لیے عطیہ کو مانگنے کا تھا۔

اسد : گویا ہماری جان چھوٹ گئی اور محاذ تبدیل ہوگیا۔

امینہ : جان نہیں چھوٹ گئی بلکہ محاذ اور ہنگامہ خیز ہوگیا۔

اسد : محاذ اور ہنگامہ خیز ہوگیا۔

امینہ : جی ہاں۔ میں نے کتنی مرتبہ کہا کہ ہم مرغوب میاں کے کان پر ڈال دیں کہ ہم عطیہ کو سہیل کے لیے لیں گے۔

اسد : ڈال دی ہوتی۔ ہم نے آپ کی زبان تو نہیں پکڑی تھی۔

امینہ : مگر میں نے جب بھی بات چھیڑی آپ خاموش رہے — سہیل اور عطیہ کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے نرم گوشے ہیں۔

(اسد کھڑے ہوکر ٹہلنے لگتے ہیں اور سوچتے ہیں۔ کچھ دیر بعد)

اسد : مرغوب کی دلہن نے کیا جواب دیا۔

امینہ : فوراً کیا جواب دیتیں— خاموش رہیں۔ اگر آپ کہیں تو میں بڑی دلہن سے بات کروں۔

اسد : (سوچتے ہوئے) بھئی یہ خاندانی معاملات ہیں کچھ دن خاموش رہیے پہلے مرغوب اور اس کی دلہن کو سوچ لینے دیجیے۔

(کچھ دیر خاموشی رہتی ہے کہ خوشبو کمرے میں آتی ہے امینہ اسے دیکھ کر)

امینہ : عطیہ تمھارے ساتھ نہیں آئی۔

خوشبو : وہ نسیم بھائی کے ساتھ بازار گئی تھیں۔ گھر پر نہیں تھیں۔

امینہ : نسیم کے ساتھ بازار!

(امینہ کے چہرے پر فکر کے آثار پیدا ہوتے ہیں کہ اکبر کمرے میں آکر)

اکبر : سرکار۔ شریف صاحب آئے ہیں۔

اینہ : (برا سا منہ بنا کر) پھر آ گئے۔

اسد : (مسکرا کر) آپ کو شریف صاحب سے چڑ کیوں ہے۔

اینہ : ان کو گھر پر کوئی کام نہیں ہے جب دیکھو وقت بے وقت سر پر سوار ہو جاتے ہیں۔

اسد : (ہنس کر) اب آپ کو پھر چائے بنانا پڑے گی۔

(اینہ برا سا منہ بناتی ہے۔ اسد کمرے سے چلے جاتے ہیں۔ اینہ خوشبو کی طرف دیکھ کر)

اینہ : موی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تم اس کے پاس جا کر بیٹھو۔ میں آ کر چولھے سے سر پھوڑوں۔

(اینہ کمرے سے چلی جاتی ہیں۔ خوشبو اکبر سے)

خوشبو : اکبر میاں۔ بھائی جان اپنے کمرے میں ہیں۔

اکبر : جی نہیں وہ تو مہمان کے ساتھ بازار گئے ہیں۔

خوشبو : کون مہمان؟

اکبر : آپ کی خالہ جان

خوشبو : اچھا تو آپ خالہ جان کو مہمان کہتے ہیں۔

اکبر : جی نہیں۔ میں ان کو بیگم صاحبہ کہتا ہوں بلکہ بڑی بیگم صاحبہ۔ جب وہ غیر ملک نہیں گئیں تھیں تو میں ان کے یہاں مہمان گیا تھا۔ انھوں نے میری بڑی خاطر کی تھی اور ان کا نوکر مجھے پیٹر دکھانے لے گیا تھا۔ خوشبو بی بی چھپن چھری نے کیا کام کیا تھا کہ واہ— بی بی آپ بھی—

خوشبو : اچھا اچھا بس جا کر دیکھیے موی باجی کیا کر رہی ہیں۔

اکبر : بہت اچھا۔

خوشبو : اور سنیے— امی چائے بنا لیں تو ایک پیالی اڑا لائیے۔

(اکبر گردن ہلاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ خوشبو ایک کرسی پر بیٹھ کر پاس رکھا ہوا اخبار اٹھا کر دیکھنے لگتی ہے۔ کچھ دیر بعد اکبر چائے لے کر آتا ہے)

اکبر : بیگم صاحبہ فرما رہی ہیں چائے پینے کا شوق ہے تو ہاتھ پاؤں ہلانا سیکھو۔

خوشبو : کہنے دیجیے (پیالی لے کر) موی باجی کیا کر رہی ہیں۔

اکبر : کتاب پڑھ رہی تھیں میں نے طبیعت کا پوچھا تو کہا ٹھیک ہے۔

خوشبو : ڈیڈی کو چائے دے آیئے۔

اکبر : بس اب جا کر دیتا ہوں۔

(چائے کے لیے مڑتا ہے کہ دوسرے دروازے سے عائشہ اور سہیل آتے ہیں)

سہیل : اکبر میاں۔ یہ بنڈل خالہ جان کے کمرے میں رکھ دینا

(اکبر بنڈل لے کر چلا جاتا ہے)۔

عائشہ : سہیل میاں آج تو تم نے تھکا مارا۔

خوشبو : (کھڑے ہوکر) میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔

عائشہ : نہیں بی بی۔ میں تھوڑی دیر لیٹ کر کمر سیدھی کروں گی۔

(کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ سہیل ایک کرسی پر بیٹھ کر جوتے کے بند کھولتے ہوئے)

سہیل : تمہارے ساتھ عطیہ نہیں آئی۔

خوشبو : وہ نسیم بھائی کے ساتھ کہیں گئی تھیں۔

سہیل : (سوچتے ہوئے) کہاں گئی تھی چچی جان سے پوچھا تھا۔

خوشبو : (بیزاری سے) جس کا جہاں جی چاہے جائے، میں کیوں پوچھتی۔

(سہیل کے چہرے پر فکر کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ جوتے اتار کر ایک طرف رکھ کر)

سہیل : اس سے پہلے تو وہ کبھی نسیم کے ساتھ نہیں جاتی تھی۔

خوشبو : اب جاتی ہیں تو آپ کو کیا اعتراض ہے

سہیل : مجھے کیا اعتراض ہوگا۔

(خاموش ہوکر سوچنے لگتا ہے کچھ دیر بعد موی کمرے میں آتی ہے۔ اس کی چال بدلی ہوئی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خواب میں چل رہی ہو۔ خوشبو اسے دیکھ کر)

خوشبو : آیئے موی باجی۔ اب طبیعت کیسی ہے۔

موی : (غصہ سے خوشبو کو دیکھ کر) گستاخ لڑکی ہم موی وومی نہیں مہارانی کلاوتی ہیں۔

خوشبو : جی۔۔۔ آپ۔۔۔

موی : تم نے سنا نہیں یا سمجھا نہیں کہ ہم مہارانی کلاوتی ہیں۔ رات ہمارے سینک ہمارے پاس آئے تھے اور ہمیں پکڑ وہی خوشی خوشی کا وحشیانہ رقص کیا تھا جو وہ جشن فتح کے موقعے پر کیا کرتے تھے۔

خوشبو : شاید آپ نے کوئی برا خواب دیکھا ہے۔ اس لیے۔۔۔

موی : (غصہ سے) خاموش رہ لڑکی، تو غیر ضروری طور پر بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہی ہے (خوشبو گھبرا کر کبھی موی اور کبھی سہیل کو دیکھتی ہے۔ سہیل بھی پریشان نظر آتا ہے۔ موی سہیل کو دیکھ کر) ہم نے تم کو پہچان لیا ہے۔ تم ہمارے نمک حرام سیناپتی ہو جس نے ہمارے خلاف بغاوت کی تھی اور ہماری بہن اوشا کرن جو تمہاری محبت میں دیوانی ہو رہی تھی تڑپ تڑپ کر مرگئی تھی وہ جنم پر جنم لیتی رہی اور ہمیشہ ناشاد اور نامراد جاتی رہی مگر اب اس جنم میں ہم اسے ناشاد اور نامراد نہیں مرنے دیں گے۔

(سہیل بے حد پریشان نظر آتا ہے کہ اکبر کمرے میں آکر)

اکبر : موی بی بی آپ کو بڑی بیگم بلا رہی ہیں۔

موی : (غصہ سے) منحوس غلام ہم موی نہیں مہارانی کلاوتی ہیں۔

اکبر : (گھبرا کر) جی آپ۔۔۔

موی : اور یہ کون گستاخ بیگم ہے جو ہمارے حضور آنے کے بجائے ہمیں بلانے کی جرأت کر رہی ہے اسے ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔ ہم اس کی گستاخی کی سزا دیں گے۔

اکبر : جی۔۔۔ آپ۔۔۔

موی : (ایک کرسی پر شاہانہ انداز میں بیٹھ کر) تم نے ہمارا حکم نہیں سنا۔

(خوشبو گھبرا کر دروازہ کی طرف دوڑتے ہوئے)

خوشبو : خالہ جان— خالہ جان—

(موی اسی طرح باوقار انداز میں کرسی پر بیٹھی رہتی ہے۔ سہیل اور اکبر بے حد پریشان نظر آتے ہیں کہ عائشہ گھبرائی کمرے میں آتی ہے اور تیزی سے موی کے پاس جاکر)

عائشہ : موی بیٹی—

موی : خاموش— (سہیل کی طرف دیکھ کر) نمک حرام سیناپتی یہ کون عورت ہے جو ہمیں اپنی بیٹی کہہ رہی ہے۔

عائشہ : (گھبرائے ہوئے لہجے میں) موی بیٹی تجھے کیا ہوگیا ہے۔

موی : (بلند آواز سے) خاموش گستاخ عورت۔ (اسد اور امینہ گھبرائے ہوئے کمرے میں آتے ہیں۔ موی اسد کو دیکھ کر کھڑی ہوتی ہے اور باوقار انداز میں ان کے پاس جاکر) ہم تمہیں بھی معاف نہیں کرسکتے۔ تم نے ایک ہزار سال سے ہمارے دشمن کو پناہ دے رکھی ہے۔

(کچھ دیر خاموشی سے موی کو دیکھتے رہتے ہیں پھر آہستہ سے)

اسد : کس دشمن کو

موی : جس نمک حرام نے ہمارے خلاف بغاوت کی تھی جس نے ہماری بہن کی محبت کی قدر نہیں کی تھی۔ اب ہم اس سے انتقام لینے کے لیے آگئے ہیں۔ انتقام۔ انتقام۔ (کانپنے لگتی ہے اور اس طرح چکراتی ہے جیسے گرنے والی ہو اسد اسے سہارا دے کر وہیں زمین پر لٹا دیتے ہیں۔ عائشہ اس کے پاس بیٹھ کر سر زانوں پر رکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر کر)

عائشہ : موی۔ بیٹی موی۔

اسد : عائشہ باجی وہ بے ہوش ہے (سہیل کی طرف دیکھ کر) کیا ہوا تھا۔

سہیل : پتہ نہیں کمرے میں آئیں اور کہنے لگیں۔ میں موی نہیں مہارانی کلاوتی ہوں

اور میں ان کا نمک حرام اور غدار سیناپتی۔

(اسد کچھ پڑھ کر موی پہ دم کرتے ہیں۔ عائشہ آنسو پونچھ کر)

عائشہ : موی— بٹی موی

(کچھ دیر بعد موی آنکھیں کھولتی ہے اور گھبرا کر سب کو دیکھتی ہے۔ پھر بیٹھ کر)

موی : کیا بات ہے آپ سب پریشان کیوں ہیں۔

عائشہ : تمھاری طبیعت اب کیسی ہے۔

موی : (کھڑی ہو کر) ٹھیک ہے۔ کیا ہوا مجھ کو

عائشہ : تم بے ہوش ہوگئی تھیں۔

موی : نہیں تو مجھے نیند کی جھپکی سی آگئی تھی۔ (سب حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں) میں رات کو ٹھیک سے سو نہیں سکی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا رہا کہ جیسے میرے آس پاس وحشیانہ رقص ہوتا رہا ہو۔

اسد : بے خوابی کی وجہ ہے۔ بٹی تم تھوڑی دیر آرام کرلو۔

موی : خالو جان میں ٹھیک ہوں (خوشبو سے) عطیہ بہن تمھارے ساتھ نہیں آئیں۔

خوشبو : وہ گھر پر نہیں تھیں۔ بڑی چچی سے کہہ آئی ہوں۔ آتے ہی وہ انھیں یہاں بھیج دیں گی۔

عائشہ : آؤ بٹی چلو۔ تھوڑی دیر سولو۔

موی : نہیں امی مجھے اس کمرہ میں وحشت ہوتی ہے۔

خوشبو : چلیے آپ میرے کمرے میں آرام کرلیجیے۔

عائشہ : (موی کا ہاتھ پکڑ کر) آؤ بٹی چلو۔

(موی عائشہ کے ساتھ جاتی ہے۔ اسد، امینہ اور خوشبو بھی جاتے ہیں۔ اکبر کچھ دیر خاموش رہ کر)

اکبر : مجھے تو اب اس گھر میں کچھ اثرات معلوم ہوتے ہیں۔

سہیل : (بیزاری) آپ اپنی رائے رہنے دیجیے۔

اکبر : آپ دیکھیے نا آپ ایک ہزار سال سے—

سہیل : آپ خاموش رہیے اور تشریف لے جایئے۔

(اکبر برا سا منہ بنا کر چلا جاتا ہے۔ سہیل صوفے پر بیٹھ جاتا ہے۔ چہرے پر گہرے فکر کے آثار ہیں کہ عطیہ کمرہ میں آتی ہے۔ سہیل کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھتا ہے عطیہ مسکرا کر)

عطیہ : کہیے خیریت— (سہیل خاموش رہتا ہے) ارے سرکار کچھ منہ سے بولیے سر سے کھیلیے۔ آخر کو ایسی بیزاری بھی کیا— ہیں کیا حضور نے مون برت رکھا ہے۔

سہیل : (طنزیہ) تفریح کر آئیں آپ۔

عطیہ : (ایک دم سنجیدہ ہوکر) جی ہاں۔ آپ کو کوئی اعتراض ہے (مسکرا کر) آخر مجھے بھی تو جھرنوں اور آبشاروں کے کنارے پکنک منانے باغوں میں گھومنے اور قہقہے لگانے کا حق ہے۔

سہیل : (طنزیہ) جی ہاں کیوں نہیں۔ یہ حق آپ سے کون چھین سکتا ہے۔ (عطیہ کو غور سے دیکھتا ہے پھر آہستہ سے) احمق کہیں کی۔

عطیہ : (مسکرا کر) شکریہ اس کا میٹھا میٹھا۔ (سنجیدہ ہوکر) ویسے میں بزرگوں کی حکم عدولی نہیں کرتی۔ امی نے کہا کہ موی باجی کے لیے ایک ساری خرید لاؤ میں جانے لگی تو نسیم صاحب تشریف رکھتے تھے ساتھ ہو لیے۔ (سہیل خاموش رہتا ہے) موی باجی کہاں ہیں۔

سہیل : اپنے کمرہ میں ہوں گی۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

عطیہ : کیوں— انھیں کیا ہوا۔

(سہیل کوئی جواب نہیں دیتا۔ اسی وقت خوشبو کمرے میں آتی ہے اور دونوں کو خاموش دیکھ کر)

خوشبو : کیا کوئی جھگڑا ہوگیا۔ (دونوں خاموش رہتے ہیں۔ خوشبو ہنس کر) وہی مرغوں کا جھگڑا ہوگا۔ (عطیہ سوالیہ نظروں سے دیکھتی ہے) کیوں بھائی جان کہہ دوں

(سہیل اب بھی خاموش رہتا ہے۔ عطیہ سے) فرما رہے تھے کہ عطیہ نے اس قدر بوڑھے مرغے پکائے تھے کہ ان کی بزرگی کے احترام میں ان پر میں اپنے دانت تیز نہ کرسکا۔ ایک دو کی عمریں تو ایک ایک ہزار سال کی تھیں۔ میں نے اپنے بچپن میں انھیں بانگ دیتے سنا تھا۔

عطیہ : (خوشبو کی باتوں پر دھیان نہ دے کر) موی باجی کیسی ہے؟

خوشبو : اب تو ٹھیک ہیں (دونوں کو دیکھ کر) شاید جھگڑا سنجیدہ شکل اختیار کرگیا ہے— ارے بھائی جان آپ کو شریف انکل بلا رہے ہیں۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔

سہیل : مجھے شطرنج کھیلنا نہیں آتا۔ مجھے کیوں بلا رہے ہیں۔

خوشبو : کسی ڈاکومینٹ کا انگریزی میں ترجمہ کرانا ہے۔

(سہیل کچھ سوچتا ہے اور پھر کمرے سے چلا جاتا ہے۔ خوشبو عطیہ سے) جھگڑا کس سلسلے میں ہوا ہے۔

عطیہ : جھگڑا وگڑا کچھ نہیں ہوا ہے (ہنس کر) ایک ہزار سال پرانا دماغ ہے گھس گھسا کر ناکارہ ہوگیا ہے— آؤ چلو موی باجی کے پاس چلیں۔

(دونوں آگے بڑھتی ہیں کہ اسد اور امینہ آتے ہیں۔ دونوں کے چہروں سے فکرمندی ظاہر ہورہی ہے۔ عطیہ دونوں کو سلام کرتی ہے)

اسد : خوش رہو— کہاں جارہی ہو۔

خوشبو : موی باجی کے پاس۔

اسد : اس کا خیال رکھنا۔

(دونوں کمرے سے چلی جاتی ہیں)

اسد : یہ موی کو یکایک کیا ہوگیا۔ کیا اسے دورے اس سے پہلے بھی پڑے ہیں۔

امینہ : باجی پریشان ہیں پہلے تو ایسے دورے کبھی نہیں پڑے۔

اسد : رات میں شاید کچھ برے خواب دیکھے ہوں ان کا اثر ہو۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) اور سہیل سے کہیے کہ وہ یہ ایک ہزار سال والا مذاق بند کرے اس کا

بھی برا اثر پڑسکتا ہے۔

(خوشبو گھبرائی کمرے میں آ کر)

خوشبو : ڈیڈی موی باجی کو پھر دورہ پڑ گیا ہے۔

(اسد اور امینہ تیزی سے کمرے سے جاتے ہیں)

(پردہ)

چوتھا سین

منظر

(وہی کمرہ۔ عطیہ صوفے پر خاموش بیٹھی ہے چہرہ پر فکرمندی کے آثار ہیں۔ سہیل کمرہ میں ٹہل رہا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پریشان ہے۔ کچھ دیر بعد عطیہ کو دیکھ کر)

سہیل : کیا مرغوب چچا نے چھوٹی چچی کا پرپوزل قبول کرلیا۔

عطیہ : ابھی نہیں وہ بڑے ابا سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

سہیل : (ٹھنڈی سانس بھر کر) پھر تو نیا ڈوبی سمجھو۔ ڈیڈی نہ صرف ہاں کردیں گے بلکہ اس رشتہ کی افادیت پر ایک لیکچر بھی دے دیں گے۔

عطیہ : (ایک دم جوش میں کھڑی ہوکر) تو پھر میں ضرور انکار کردوں گی۔ مجھ میں اتنی ہمت ہے— تمام عمر میں کانٹ ہیگل اور نیٹشے پر لیکچر برداشت نہیں کرسکتی۔ آپ بڑی اماں سے بات کیوں نہیں کرتے۔

سہیل : خوشبو ان سے سب کچھ کہہ چکی ہے۔

عطیہ : یہ چھوٹی چچی ہمیشہ کی واہیات رہی ہیں۔ سب کچھ جانتے بوجھتے یہ پرپوزل رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔

سہیل : اور طاہر چچا بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے ہیں۔

عطیہ : چمن بوا کہہ رہی تھیں انھیں قابو میں رکھنے کے لیے چھوٹی چچی تعویذ گنڈے اور ٹونے ٹوٹکے کرتی رہتی ہیں۔

(سہیل خاموش ہوکر پھر کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد خوشبو اور موی کمرے میں آتی ہیں۔ خوشبو ہنستے ہوئے)

خوشبو : بھائی جان بڑا مزہ آیا۔ (سہیل خاموش رہتا ہے۔ خوشبو دونوں کو خاموش دیکھ کر) کیا پھر کسی مسئلہ پر ٹھن گئی۔

سہیل : کہاں سے آرہی ہو۔

خوشبو : چھوٹے چچا کے یہاں سے (ہنس کر) آپ ہوتے تو اور مزہ آتا۔ (سہیل سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ دیکھتا ہے) نسیم بھائی حسبِ عادت ہیٹھے کے سپرمین پر لیکچر جھاڑنے لگے۔ موی باجی پہلے تو بڑے خلوص سے برداشت کرتی رہیں پھر ایک دم پھٹ پڑیں اور اقبال کے مردِ مومن پر شروع ہوگئیں بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کنجشک فرومایہ پلٹ پلٹ کر شاہین پر حملے کررہا ہے اور بے چارے شاہین کو منہ چھپانے کو جگہ نہیں (ہنس کر) ایک ہزار سال پہلے آپ کے بچپن میں سپرمین اور مردِ مومن ہوتے تھے؟

سہیل : (بیزاری سے) چھوٹی چچی تو خیریت سے ہیں؟

خوشبو : وہ اپنی خیریت کی اطلاع دینے خود تشریف لانے والی ہیں۔ انھیں سے دریافت کرلیجیے گا۔ (موی دروازہ کی طرف بڑھتی ہے) موی باجی آپ کہاں چلیں؟

موی : سر میں درد ہے تھوڑی دیر آرام کروں گی۔ امی اور خالہ جان کہاں ہیں۔

سہیل : باورچی خانہ میں ہوں گی وہ عورتوں کا کلب گھر وہی ہے۔

خوشبو : ایک ہزار سال پہلے آپ کے بچپن میں بھی عورتیں کچن میں رونق افروز رہتی تھیں (آگے آگے موی اور اس کے پیچھے پیچھے عطیہ کمرہ سے چلی جاتی ہیں)

خوشبو : (ہنس کر) نسیم بھائی کی بوکھلاہٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ (سہیل خاموش رہتا ہے) آپ ہوتے تو اپنے ایک ہزار سال پرانے تجربات بیان کردیتے۔ (سہیل خاموش۔ خوشبو اسے غور سے دیکھ کر) کیا بات کی۔

خوشبو : کس سلسلے میں؟

سہیل : (بیزاری سے) کیا یہاں سیکڑوں سلسلے ہیں۔ سلسلہ صرف ایک ہے۔

خوشبو : امی خود پریشان ہیں۔ کل امی، ڈیڈی اور خالہ جان کی گول میز کانفرنس ہوئی تھی۔ موٹی باجی بھی بطور آبزرور شریک تھیں انھیں ووٹ دینے کا حق نہیں تھا۔

سہیل : پھر کیا نتیجہ نکلا

خوشبو : وہ دونوں ڈیڈی کو سمجھاتی رہیں مگر وہاں وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ بھائیوں بھائیوں میں تفرقہ پڑ جائے گا۔ دلوں میں میل آجائے گا۔

سہیل : (افسردہ لہجے میں) ڈیڈی نے کبھی اپنی اولاد کو اہمیت نہیں دی۔ جانے کس دنیا میں رہتے ہیں۔

خوشبو : (ہنس کر) بھائی جان۔ زمانہ بھائی بھتیجہ واد کا ہے۔ بیچارے ڈیڈی کیا کریں۔

سہیل : جانے بیٹا بیٹی واد کا زمانہ کب آئے گا۔

خوشبو : ڈیڈی کی حکومت میں تو کبھی نہیں آئے گا۔

اسد : (کمرے میں آتے ہوئے) کیا نہیں آئے گا۔ (دونوں خاموش رہتے ہیں — سہیل کی طرف دیکھ کر) شریف صاحب آئیں تو بٹھلانا۔ میں ابھی آتا ہوں۔

سہیل : جی — بہت اچھا۔

(اسد دروازہ کی طرف بڑھتے ہیں کہ امینہ اور عائشہ کمرے میں آتی ہیں۔ امینہ اسد کو باہر جاتا دیکھ کر)

امینہ : آپ کہاں چل دیے۔ طاہر میاں کی دلہن آنے والی ہیں۔

اسد : (بیزاری سے) کیا وہ میرے سر پر تشریف فرما ہوں گی؟ — ایک کام سے جارہا ہوں۔ (سہیل سے) شریف صاحب کو "اسلام کا اقتصادی نظام" دے دینا وہ کئی دن سے مانگ رہے ہیں۔ تم نے یہ کتاب جانے کہاں رکھ دی ہے۔

سہیل : وہ تو آپ ہی کے کمرے میں ہے۔

اسد : میں نے تلاش کی تھی نظر نہیں آئی۔ ذرا تم دیکھ لینا۔

سہیل : بہت اچھا۔

(اسد کمرے سے چلے جاتے ہیں۔خوشبو ہنس کر)

خوشبو : بھائی جان۔ آپ کے بچپن میں ایک ہزار سال پہلے کون سا اقتصادی نظام رائج تھا۔

سہیل : (بے حد سنجیدگی سے) لوٹ مار کا۔ لوگ اپنی ضرورتیں لوٹ مار سے پوری کرتے تھے جیسے آج کل رشوت سے پوری کرتے ہیں اپنے طاہر چچا کی طرح

امینہ : (غصہ سے) سہیل! کیا بدتمیزی ہے

سہیل : میرے بچپن میں چور کو چور کہنا بدتمیزی نہیں تھی (ٹھنڈی سانس بھر کر) صرف ایک ہزار سال میں زمانہ کیسا بدل گیا۔

(اسی وقت خالدہ طاہر صاحب کی بیوی کمرے میں آتی ہیں۔ امینہ اور عائشہ کو سلام کرتی ہیں۔ برقعہ اتار کر تخت پر ڈالتی ہیں چہرہ سے بے حد چالاک معلوم ہوتی ہیں، آنکھیں حلقوں میں برابر گردش کرتی رہتی ہیں)۔

امینہ : آؤ دلہن اچھی تو ہو۔

خالدہ : دعا ہے آپ کی۔ (عائشہ کی طرف دیکھ کر) آپ کا مزاج کیسا ہے۔

عائشہ : بس ٹھیک ہے بی بی— بیٹھو۔

امینہ : خوشبو۔ اکبر سے کہو چائے دے جائے۔

سہیل : بس جائے— لاحول ولا قوۃ— میرے بچپن میں۔

خوشبو : (لقمہ دے کر) لوگ چائے بھی نہیں پلاتے تھے۔

امینہ : (ہنس کر) بس اب چپ رہو۔ جاؤ خوشبو چائے کا کہو۔

(خوشبو ہنستی ہوئی چلی جاتی ہے۔ تینوں تخت پر بیٹھ جاتی ہیں۔ خالدہ عائشہ سے)

خالدہ : سنا ہے آپ واپس تشریف لے جا رہی ہیں۔

عائشہ : ہاں بی بی سوچ کر تو آئی تھی مہینے دو مہینے رہوں گی مگر موی کی طبیعت نے پریشان کر دیا۔

خالدہ : ایسے دورے پہلے بھی پڑے تھے۔

عائشہ : نہیں بی بی وہ تو جانے ایک دم کیا ہوگیا۔ اس کی شادی طے ہوچکی ہے۔ جانے اللہ کو کیا منظور ہے۔

خالدہ : دریا پار کر لینے سے خبیث روحیں پیچھا نہیں کریں— آپ کسی مولوی یا سیانے کو دکھلایئے۔ پیر اللہ والے سنا ہے بھوت پلید اتارنے کے اچھے عالم ہیں۔ کیوں سہیل میاں تم جانتے ہو انھیں۔

سہیل : خوب اچھی طرح۔ ابھی کچھ دن پہلے جوا کھیلتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔

خالدہ : سہیل میاں توبہ کرو۔ خدا کے نیک بندوں پر تو یوں تہمت نہ لگاؤ۔ یہ تو چھپے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ نئے نئے بھیس میں ظاہر ہوتے ہیں۔

سہیل : اور آپ کے پیر اللہ والے ہمیشہ جواری اور شرابی کے ہی بھیس میں ظاہر ہوتے ہیں۔ (خالدہ برا سا منہ بناتی ہے کہ عطیہ کمرے میں آتی ہے)

خالدہ : ارے عطیہ۔ تم بھی یہاں ہو۔

عطیہ : (روکھے پن سے) میرا یہاں ہونا کوئی جرم یا گناہ ہے۔

خالدہ : اے ہے عطیہ کچھ تو بزرگوں کا لحاظ کرو۔ میں نے ایسا کون سا ڈنک مار دیا کہ تم یوں ہتھے سے اکھڑ گئیں۔

(عطیہ کچھ جواب دینا چاہتی ہے کہ سہیل اس کے موڈ کو محسوس کر کے جلدی سے)

سہیل : عطیہ! موی کیا کر رہی ہیں۔

عطیہ : سو رہی ہیں

سہیل : ابھی تو اچھی خاصی جاگ رہی تھیں اب ایک دم سوگئیں۔

عطیہ : یہاں سے جانے کے بعد بستر پر لیٹیں اور سیکنڈوں میں سوگئیں۔

سہیل : وہ سر میں درد کی شکایت کر رہی تھیں— شاید—

عطیہ : نسیم بھائی سے ملنے کے بعد سر میں درد نہ ہوگا تو کیا ہوگا۔

خالدہ : اے ہے عطیہ آج تمھیں کیا ہوگیا ہے۔ پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ دو باتیں کر لیتا ہے تو کون سا گناہ کرتا ہے۔

عطیہ : وہ اپنی قابلیت کا بخار ہم بیچاریوں پر کیوں اتارتے ہیں۔ بڑے ابا یا شریف انکل پر کیوں نہیں اتارتے۔

(اسی وقت موی کمرے میں اس طرح داخل ہوتی ہے، جیسے نیند میں چل رہی ہو سب اسے دیکھ کر خاموش ہوجاتے ہیں۔ موی باوقار انداز میں ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ عائشہ اور امینہ گھبرا کر کھڑی ہوجاتی ہیں۔ موی غور سے خالدہ کو دیکھتی رہتی ہے۔ پھر ایک دم کھڑی ہوکر خالدہ سے)

موی : کلونتی تو— تو نے پھر جنم لے لیا۔

خالدہ : (گھبرا کر) میں— میں کلونتی!

موی : ہاں تو— تو کسی زمانے میں کسی بھیس میں جنم لے میں تجھے پہچان لوں گی۔

عائشہ : (موی کے پاس جاکر) موی بیٹی۔ موی بیٹی۔

موی : (غصہ سے) خاموش گستاخ عورت۔ ہم موی نہیں مہارانی کلاوتی ہیں۔ (اونچی آواز سے) اوشا کرن۔ اوشا کرن۔ (عطیہ کو دیکھ کر) ادھر آؤ میری بہن۔ (عطیہ اپنی جگہ کھڑی رہتی ہے۔ بہت محبت سے) ادھر آؤ۔ (عطیہ تھوڑا آگے بڑھتی ہے موی موڈ بدل کر غصہ سے خالدہ کی طرف اشارہ کرکے) پہچانو اسے۔ یہ کلونتی ہے۔

عطیہ : (گھبرائے ہوئے انداز میں) یہ چھوٹی چچی ہیں۔

موی : (غصہ سے) نہیں یہ کلونتی ہے جس نے ہمارے سیناپتی کو ورغلا کر ہمارے خلاف بغاوت کرائی تھی اور تمھاری شادی اپنے لڑکے کے ساتھ کرنا چاہتی تھی کہ ہمارے تخت پر قبضہ کرسکے۔ (سہیل سے) نمک حرام، تم نے اسے پہچانا۔

سہیل : یہ چھوٹی چچی ہیں۔

موی : نہیں نہیں نہیں۔ یہ کلونتی ہے میں اسے اپنے سات جنموں میں تلاش کرتی رہی ہوں (غصہ سے کانپنے لگتی ہے) اسے میرے سامنے سے ہٹا دو یہ پھر شرارت پر آمادہ ہے اب اگر اس نے شرارت کی اور اوشا کرن کے راستہ میں دیوار بنی تو

میرے فوجی اس کا اور اس کے خاندان کا نام و نشان مٹا دیں گے۔ اب وہ اوشا کرن کی حفاظت کے لیے برابر یہاں رہا کریں گے۔ (مٹھیاں بند کر کے خالدہ کی طرف بڑھتی ہے امینہ اور عائشہ اسے پکڑتی ہیں) انتقام — انتقام۔

(خالدہ گھبرا کر اپنا برقعہ اٹھاتی ہے اور تیزی سے کمرہ سے چلی جاتی ہے۔ موی کچھ دیر کانپتی رہتی ہے پھر بدن ڈھیلا پڑ جاتا ہے آہستہ آہستہ زمین پر بیٹھتی ہے پھر لیٹ جاتی ہے۔ خوشبو چائے لے کر آتی ہے)۔

عائشہ : (آنکھوں میں آنسو بھر کر جھولی پھیلا کر) اے پروردگار اس پر رحم کر۔

موی : (ایک دم بیٹھ کر) کر دیا پروردگار نے رحم کر دیا رحم۔

عائشہ : (گھبرا کر) اب تیری طبیعت کیسی ہے۔

موی : میری طبیعت کو کیا ہوا۔

عائشہ : تجھ پر دورہ پڑا تھا۔

موی : (ہنس کر) مجھ پر کوئی دورہ نہیں پڑا تھا اور نہ کوئی دورہ پڑتا ہے (سب حیرت سے اسے دیکھتے ہیں) سہیل بھائی کا ایک ہزار سال پرانا دماغ گھس گھسا کر زنگ آلود ہو گیا تھا میں نے سوچا تھوڑی اور ہالنگ اور آئلنگ کر دی جائے کیوں سہیل بھائی کیسی رہی۔

سہیل : (بیزاری سے) لعنت ہے۔

موی : (ہنس کر) ایک ہزار سال زندہ رہنے پر۔

عائشہ : تجھ پر خدا کی پھٹکار موی۔ تو نے تو ہم سب کے دماغوں کی اوور ہالنگ کر دی۔

موی : (ہنس کر) اور کلونتی کے دماغ کی بھی۔ (عطیہ کی طرف دیکھ کر) اب راوی چین ہی چین لکھتا ہے اور چین کے علاوہ کچھ نہیں لکھتا۔

خوشبو : (بے حد قلندرانہ انداز میں) اللہ بس باقی ہوس۔

(سب اسے دیکھ کر ہنستے ہیں)

(پردہ)

روپ متی

پہلا ایکٹ — پہلا سین

(رات کا پچھلا پہر۔ بازار کا ایک حصہ جہاں متعدد چھوٹے بڑے چبوترے بنے ہوئے ہیں جن پر دن میں دوکاندار اپنی دوکانیں سجاتے ہیں۔ اس وقت دو بڑے چبوتروں پر آمنے سامنے دو چار بیت پارٹیاں بیٹھی ہیں جن میں مقابلہ ہو رہا ہے۔ مشعلیں روشن ہیں۔ کچھ لوگ مقابلے سے لطف اندوز ہونے کے لیے موجود ہیں۔ پہلی پارٹی دف پر گاتی ہے۔

پہلی پارٹی

تخیلات سلامت بلند بام ہوں میں
زمیں سے کام مجھے کیا فلک مقام ہوں میں

یہ کون کہتا ہے دیوانہ جانیے مجھ کو
خرابِ جلوۂ جانا نہ جانیے مجھ کو
امینِ حرمتِ میخانہ جانیے مجھ کو
شراب جس سے چھلکتی نہیں وہ جام ہوں میں

جنھیں شعور ہے وہ لوگ صاف صاف کہیں — یہ بات ٹھیک نہیں ہے کہ سب خموش رہیں
فنا، بقا مری ہستی کے دو کرشمے ہیں — مجھے تمام نہ کہنا کہ ناتمام ہوں میں

پڑی ہے مجھ پہ بصد التفات کس کی نظر — کوئی بتائے اگر ہو کسی کو اس کی خبر
طلم کس نے کیا ہے یہ دانے دانے پر — کہ شاد شاد چمن میں بزیرِ دام ہوں میں

وکیلؔ میری تباہی کا اس کو دھڑکا ہے — وقارِ عشق کو ناصح کہاں سمجھتا ہے
مری فنا کا نہایت بلند رتبہ ہے — چراغِ صبح نہیں آفتابِ شام ہوں میں

دوسری پارٹی

جب آہ کی قفس سے کسی بے قرار نے
رنگینیوں میں آگ لگا دی بہار نے

کیفیتِ حیات کا حاصل بنا دیا — ضبطِ فغاں میں عشق نے کامل بنا دیا
سچ تو یہ ہے کہ پیار کے قابل بنا دیا — دل کو کہیں کہیں سے ترے اختیار نے

پھر سارے گلستاں میں نظر آئی تازگی — خوش ہو کے مسکرائی جوانی بہار کی
ہر برگ سے ان کی تجلی برس پڑی — پردہ خزاں کا چاک کیا جب بہار نے

تاروں کو، دن کو سحر، شب کو ماہتاب — گل کو ہنسی، بہار کو گل، نغمے کو رباب
مجھ کو جنوں، نظر کو تڑپ، دل کو اضطراب — تحفے عطا کیے یہ ترے انتظار نے

جب ان کے التفات میں بے کیفیاں ہوئیں — پھر ساری کائنات میں بے کیفیاں ہوئیں
محسوس جب حیات میں بے کیفیاں ہوئیں — وہ خود بڑھے وکیلؔ کے غم کو سنوارنے

(دور سے اذان کی آواز آتی ہے۔ مقابلہ ختم ہو جاتا ہے۔ شمعیں بجھا دی جاتی ہیں۔ سب لوگ اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ دھندلی روشنی میں ایک شخص بازار میں جھاڑو لگاتا ہے اور ایک شخص مشک سے چھڑکاؤ کرتا نظر آتا ہے۔)

پہلا ایکٹ —— دوسرا سین

روپ متی پویلین۔ ایک طرف باز بہادر نماز پڑھ کر دعا مانگ رہا ہے۔ دوسری طرف مسہری پر روپ متی محو خواب ہے کہ مندر سے گھنٹوں اور سنکھ بجنے کی آواز آتی ہے، ایک کنیز آکر موی شمع بجھا دیتی ہے۔ گھنٹوں اور سنکھ کی آواز سے روپ متی جاگ جاتی ہے اور بیٹھ جاتی ہے لیکن آنکھیں نہیں کھولتی۔ کنیز اسے جوتیاں پہناتی ہے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ریلنگ کے پاس لے جاتی ہے اور نربدا کی طرف منھ کر کے کھڑا کر دیتی ہے۔ روپ متی دور نظر آنے والی نربدا کو پرنام کرتی ہے۔ باز بہادر اس کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد روپ متی مڑ کر اسے دیکھ کر۔

روپ متی: آج کا نذرانہ یہ کمسن صبح ہے جو ہم آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

باز بہادر: اس خوبصوت تحفہ کے لیے ہم آپ کے شکرگزار ہیں (کچھ دیر خاموش رہ کر) اس حسین صبح میں ہم عہد کرتے ہیں کہ اگر خدا نے ہم کو ذرا بھی مہلت دی تو ہم نربدا کی ان پوتر لہروں کو جن کے درشن سے آپ کی صبح ہوتی ہے شادی آباد کی دیواروں تک لے آئیں گے۔

روپ متی: ہم آپ کے اس عزم پر ہمیشہ فخر کرتے رہیں گے۔

(دونوں پھر مڑ کر نربدا کو دیکھنے لگتے ہیں کہ کورس میں گانے کی آواز آتی ہے)

آؤ آؤ گاؤ سب۔ منگل چار
آنند منگل رہوئے نسدن—— نت رہے موج بہار
آؤ آؤ گاؤ سب—— منگل چار
روک شوک کوئی نکٹ نہ آئے—— کریں کرپا کرتار

آؤ آؤ گاؤ سب — منگل چار
جگ جگ جیوے سندر جوڑی — پائے سکھ اپار
آؤ آؤ گاؤ سب منگل چار

پہلا ایکٹ —— تیسرا سین

صبح کا وقت۔ بازار جہاں رات کو چار بیت کا مقابلہ ہوا تھا اب انھیں چبوتروں پر دکاندار اپنی دکانیں سجا رہے ہیں کہ ایک اندھا فقیر شاعرانہ دُھن میں گاتا ہوا نظر آتا ہے۔

اندھا فقیر: طلوعِ سحر ہے اُٹھا آفتاب پلا ساقیا مجھ کو جلدی شراب
اٹھاتی ہے فطرت جو رُخ سے نقاب تو کھلتا ہے صبحِ تمنا کا باب
نئی زندگی کی علامت ہے یہ ترا لطف ہے تیری رحمت ہے یہ
ترنگیں نئی دل میں اٹھنے لگیں تمنائیں بھی مسکرانے لگیں
عجب داستاں میں سناؤں تجھے کہ رنگِ دوعالم دکھاؤں تجھے
محبت کی تصویر دکھلاؤں گا میں خوابوں کی تعبیر سمجھاؤں گا

(اندھا فقیر ایک کونے میں جاکر بیٹھ جاتا ہے۔ اپنی لاٹھی زمین پر مار مار کر اور پیالہ میں پیسے بجا کر تال پیدا کرتا ہے کہ ایک لڑکی سر پر ٹوکری رکھے گاتی ہوئی آتی ہے۔ چال میں رقص کا انداز ہے)

لڑکی: املی لے لو مانڈو کی املی لے لو مانڈو کی
میری پھلی نرالی ہے روپ متی کی پیاری ہے
باز بہادر کا من ہرتی سارے جگ کو بھاتی ہے
مایا چکھو مانڈو کی املی لے لو مانڈو کی

(فقیر کے پاس آکر جو ابھی تک لاٹھی اور پیسوں سے تال پیدا کررہا ہے)

لڑکی : بابا سلام

فقیر : جیتی رہ بیٹی۔ آج بڑے سویرے نکل پڑی (ڈھیرے سے ایک کاغذ اسے

دیتے ہوئے) اسد خان کو

لڑکی : (کاغذ لے کر چھپاتے ہوئے) آج بڑی تازہ املیاں لائی ہوں بابا۔ کل کہاں چلے گئے تھے چار گنڈے کی املیاں بچی تھیں تمہارے حصے کے دو ٹکے رکھے ہیں۔ (پیسے فقیر کو دیتی ہے) لو بابا۔

(لڑکی گاتی اور ناچتی ہوئی دوسری طرف جاتی ہے۔ فقیر لاٹھی اور پیسوں سے تال پیدا کرتا رہتا ہے)

لڑکی: املی لے لو مانڈو کی املی لے لو مانڈو کی
اتراتی ہے رانی بن بھاری بھرکم اس کا تن
نین رجھائے اس کا رنگ اس کے لوبھ میں ہے جن جن
سندری دیکھو مانڈو کی املی لے لو مانڈو کی

(گاتی ہوئی دوسری طرف سے چلی جاتی ہے۔ فقیر اسی طرح لاٹھی اور پیسوں سے تال دیتا رہتا ہے گویا اس کے بھیک مانگنے کا طریقہ یہی ہے۔ بازار میں چہل پہل بڑھ گئی ہے۔ دکاندار اپنا مال بیچنے کے لیے آوازیں لگا رہے ہیں۔ ایک شخص جو لباس سے کسان معلوم ہوتا ہے آتا ہے اس کے ساتھ ایک نوجوان اور عورت گھونگھٹ کاڑھے ہوئے آتی ہے۔ مرد چوڑی والی کے پاس رک کر نوجوان سے)

مرد : اورے لچھیا۔ جلدی بیلوں کی جوڑی لے آئیو۔ آج بہت سارو کام کرنو ہے۔

نوجوان : بس تو چل باپو میں پل دو پل میں آئیو۔

(نوجوان کھڑا رہتا ہے)

مرد : اب کھڑا کھڑا میری صورت کیا دیکھے ہے۔ چل جا جلدی آئیو— (نوجوان کچھ آگے بڑھ جاتا ہے۔ مرد چوڑی والی سے) چاچی دو دو چوڑیاں لچھا کی بہو کے ہاتھ میں ڈال دیجو۔

چوڑی والی : ارے چل ہٹ کنجوس کہیں کے۔ دو دو نہیں چار چار ڈالوں گی۔

مرد : (ہنس کر) چل تو کہے ہے تو چار چار ہی ڈال دے۔ پیسے آن کر دوں گا۔

چوڑی والی : کیا پیسوں کی بات کرے ہے۔ کیا میرے بہو نہیں ہے۔ جب پیسے ہوویں تب دیدیجو— آ بہو— بیٹھ۔

(مرد چلا جاتا ہے۔ نوجوان واپس آ کر)

نوجوان : چاچی۔ ہری بانکیں پہنائیو کہ اس کی گوری کلائیوں پر کھوب چمکیں۔

چوڑی والی : چل دور ہو بے سرم کہیں کا۔ بھرے بازار میں چھیڑ کھانی کرے لاج نہیں آتی۔

نوجوان : لاج کا ہے کی چاچی جو رو تو میری ہے۔

(ہنستا ہوا چلا جاتا ہے۔ چوڑی والی عورت کو چوڑیاں پہناتی ہے۔ عورت چوڑیاں پہن کر چوڑی والی کو سلام کرتی ہے۔ چوڑی والی اس کی بلائیں لے کر)

چوڑی والی : جگ جگ جیے۔ سکھ دیکھے۔ بھگوان کرے دس بیٹے ہوں۔

عورت : ہائے دیّا۔

(تیزی سے چلی جاتی ہے۔ دکانداروں کی چیخ پکار۔ فقیر کی لاٹھی اور پیسوں کی تال برابر آتی رہتی۔ تھوڑی دیر بعد املیاں بیچنے والی لڑکی گاتی ناچتی آتی ہے)

لڑکی: املی لے لو مانڈو کی املی لے لو مانڈو کی
کھائے راجا پرجا کھائے کھائے سجنی سجنا کھائے
تم بھی کھاؤ مانڈو کی املی لے لو مانڈو کی
سواد ذرا دیکھو اس کا کھٹے میں ہے میٹھا سا
یاد رکھے گا جیون بھر اس کو جو بھی کھائے گا
لذت لوٹو مانڈو کی املی لے لو مانڈو کی

(فقیر کے پاس جاتی ہے)

فقیر : آ گئی بیٹی۔

لڑکی : ہاں بابا۔ (اِدھر اُدھر دیکھ کر) پرچہ دے آئی ہوں بابا

(گاتی ہوئی جاتی ہے)

املی لے لو مانڈو کی املی لے لو مانڈو کی

پہلا ایکٹ ——— چوتھا سین

(ہیبت خان سپہ سالار کی حویلی کا ایک حصہ۔ ہیبت خان غور وفکر کے عالم میں ٹہل رہا ہے ایک کنیز کچھ گھبرائی اور سہمی ہوئی سی کھڑی ہے۔ ہیبت خان اس کے پاس رک کر)

ہیبت خان : تم فدا خان سے ملی تھیں۔

کنیز : جی ہاں خان محترم۔ وہ تیار ہے— مگر—

ہیبت خان : بڑا معاوضہ چاہتا ہے (کنیز خاموش رہتی ہے) اس کا انتظام ہوجائے گا۔ (کنیز کو ایک خط دے کر) ہماری یہ پیش کش اس تک پہنچا دو۔

کنیز : (خط لے کر کپڑوں میں چھپاتے ہوئے) حکم کی تعمیل کردی جائے گی۔

ہیبت خان : رازداری اور احتیاط سے۔

کنیز : کنیز پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے خانِ محترم

ہیبت خان : (جیسے خود سے کہہ رہا ہو) بوستان خان کا راستہ سے ہٹایا جانا بہت ضروری ہے (کنیز سے) خدا حافظ۔ (جانے کے لیے مڑتا ہے پھر پلٹ کر کنیز کو دیکھ کر) ہم تمھیں یقین دلاتے ہیں کہ ایک دن باعزت طور پر ہم تمھیں اپنی بہو بنا کر اس گھر میں لائیں گے۔

کنیز : خان محترم کی نظر التفات کنیز کا سرمایۂ زندگی ہے

(ہیبت خاں چلا جاتا ہے۔ کنیز کچھ دیر اس طرح کھڑی رہتی ہے جیسے خوشگوار خواب دیکھ رہی ہو۔ مسکراتی ہے اور مڑ کر دوسری طرف جانا چاہتی ہے کہ آڑ میں سے ایک سیاہ پوش نکل کر اس کا گلا دبا دیتا ہے۔ تھوڑی جدوجہد کرنے کے بعد کنیز ختم ہوجاتی ہے— سیاہ پوش اسے زمین پر ڈال کر اس کے کپڑوں سے خط نکال کر ایک طرف غائب ہوجاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک دوسری عورت کچھ گنگناتی ہوئی آتی ہے لاش کو دیکھ کر چیخ کر)

عورت : خون خون۔ (دوڑتی ہوئی ایک طرف جاتی ہے۔ اسی طرح سے تیز تیز قدموں سے ہیبت خان آتا ہے۔ عورت گھبرائے ہوئے لہجے میں) خون— خانِ محترم خون۔

(ہیبت خاں بیٹھ کر کنیز کو ہلاتا ہے پھر کپڑوں میں خط تلاش کرتا ہے جو نہیں ملتا۔ ہیبت خان کھڑے ہو کر عورت سے)

ہیبت خان : گل خان سے کہو کہ حویلی کے تمام دروازے بند کر دیے جائیں اور ہمارے حکم کے بغیر کوئی حویلی سے باہر نہ جانے پائے (عورت جانے کے لیے مڑتی ہے۔ نادر خان کو ہمارے پاس بھیج دو۔)

(عورت چلی جاتی ہے۔ ہیبت خاں کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی ہے۔ کچھ دیر بعد نادر خان آ کر)

نادر خان : خان بابا۔ آپ نے ہمیں یاد کیا۔ (لاش دیکھ کر) لاش خان بابا۔

ہیبت خان : ہاں— (سوچتے ہوئے) نادر

نادر خان : (آگے بڑھ کر) جی۔ خان بابا

ہیبت خاں : ہوشیاری سے یہ لاش بوستان خان کی حویلی میں ڈلوا دی جائے۔

نادر خاں : خان بابا۔ آپ نے ہمیں میدان جنگ میں لاشوں کے انبار لگانے کی تعلیم دی ہے۔ لاشیں ڈھونے کی نہیں۔

(ہیبت خان اسے دیکھتا ہے پھر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر)

ہیبت خان : ٹھیک ہے ہم دوسرا انتظام کرلیں گے۔ تمھارے ذمہ ہم ایک دوسرا کام سپرد کرتے ہیں۔

نادر خان : حکم فرمائیں۔ اگر ہم جان دے کر بھی آپ کے حکم کی تعمیل کر سکے تو ہمارے لیے یہ مہنگا سودا نہ ہوگا۔

ہیبت خان : ہم اس خنزیر کی اولاد کا پتہ لگانا چاہتے ہیں جو ہمارا نمک کھا کر ہم سے نمک حرامی کر رہا ہے

(نادر خان تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر جھکتا ہے۔ ہیبت خاں چلا جاتا ہے۔
نادر کچھ دیر لاش کو دیکھتا رہتا ہے۔ پھر پاؤں سے لاش کو سیدھا کرتا ہے)

پہلا ایکٹ —— پانچواں سین

(باز بہادر کا دربار ہال۔ وزیراعظم بوستان خان، سپہ سالار ہیبت خان، نوجوان اسد خان اور دیگر امراء موجود ہیں اور باز بہادر کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔ سب کے چہروں پر اکتاہٹ کے آثار ہیں۔ کچھ دیر بعد بوستان خان ٹھنڈی سانس بھر کر اکتاہٹ کے لہجے میں)

بوستان خان : انتظار —— انتظار

اسد خان : انتظار ہمارا مقدر ہے عم محترم۔ ہم انتظار کرتے ہیں موسم کے بدلنے کا۔ ہم انتظار کرتے ہیں اچھی فصل آنے کا۔ باپ انتظار کرتا ہے بیٹے کے جوان ہونے کا اور بیٹا انتظار کرتا ہے باپ کے مرنے کا۔ کوئی انتظار کرتا ہے محبوبہ کا اور کوئی انتظار کرتا ہے مقدر بدلنے کا۔ کیے جایئے انتظار۔ جلد ہی مقدر بدلنے والا ہے اور آپ اس انتظار کی زحمت سے نجات پائیں گے۔

بوستان خان: خاموش رہو اسد خاں۔ تم اپنی حدود سے آگے بڑھ کر سوچنے کے عادی ہو۔

اسد خان : میں اپنا مقدر بدلتے دیکھ رہا ہوں عم محترم۔ میں آپ کے اس مقدس عمامہ کو خون آلود دیکھ رہا ہوں۔ میں اپنے سینہ میں تیرتے ہوئے بھالے دیکھ رہا ہوں۔ میں ہیبت خاں کی تلوار کو گھونگھٹ کاڑھے نظر بازیاں کرتے دیکھ رہا ہوں۔

ہیبت خان : اسد خان یہ ہیبت خان کی تلوار ہے جس نے گھونگھٹ میں لجانا اور شرمانا نہیں سیکھا صرف دشمنوں کے سر اڑانا سیکھا ہے۔

اسد خان : لیکن اسی وقت تک جس وقت تک یہ دوست اور دشمن میں تمیز کرتی ہے نابالغ حسینہ کی طرح ہر کسی سے نظر بازی نہ کرتی ہو اور بزم عیش کی چمک دمک نے اسے زنگ آلود نہ کر دیا ہو۔

بوستان خان :(ٹھنڈی سانس بھر کر) ہاں اسد خان تم ٹھیک کہہ رہو۔ بزم عیش کی خمار آلود آنکھیں دوست اور دشمن میں تمیز نہیں کر سکتیں اور میدانِ جنگ میں چمکتی تلواروں سے چندھیا جاتی ہیں۔

ہیبت خان : تلواروں سے کھیلنے والے سپاہی کی آنکھوں میں میدانِ جنگ میں چمکنے والی تلواروں سے اور روشنی آجاتی ہے۔ وہ چندھیاتی نہیں۔

اسد خان : ہاں ان سپاہیوں کی آنکھوں میں جن کی آنکھوں پر حرص و ہوس کے پردے نہ پڑے ہوں اور جن کا سب سے برا میدانِ جنگ عورت کی آغوش نہ ہو (ہیبت خاں شک اور غصہ سے اسد خاں کو دیکھتا ہے۔ اسد خان اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے) عم محترم مجھے بتلایئے کہ ستاروں پر کمندیں ڈالنے والا افغان آنے والے طوفان کی آہٹ کی کیوں نہیں سن رہا ہے۔

ہیبت خان : آنے والا طوفان؟

اسد خان : ہاں مغلوں کی حرص و ہوس کا طوفان جو آندھیاں بن کر ہندوستان کے کونے کونے کو اپنی لپیٹ میں لے لینا چاہتا ہے۔

ہیبت خان : جس دن اس کی نگاہیں مالوے کی طرف اٹھیں گی اس کی آنکھیں نکال کر اس کی ہتھیلیوں پر رکھ دی جائیں گی۔

اسد خان : (طنزیہ) اور اس خنجر سے جو عورتوں کی نگاہوں سے بھی نرم و نازک ہے۔

ہیبت خان : خاموش رہو اسد خاں تم افغانی غیرت کا مذاق اڑا رہے ہو۔

اسد خان : افغانی غیرت صرف تلواروں سے کھیلنے میں ہے انھیں نیلام کرنے اور فروخت کرنے میں نہیں۔ اور اس وقت تک مذاق اڑاتا رہوں گا جب تک افغان توپوں کی گرج، گولیوں کی بوچھار، تلواروں کی جھنکار اور تیروں کی سنسناہٹ میں کسی دوشیزہ کے قہقہے کی سی حلاوت محسوس نہ کریں گے۔

بوستان خان :(سوچتے ہوئے) لیکن ہمارے علم میں یہ بات نہیں لائی گئی ہے کہ مغلوں کی نظریں مالوہ کی طرف اٹھ رہی ہیں۔

اسد خان : آپ جلد ہی سن لیں گے۔ اگر ایک طرف لالچ کی حشیش سے غیرتوں کا سودا کیا جارہا ہے تو دوسری طرف ایک عورت کی ادائیں اس وقت کو قریب سے قریب تر کررہی ہیں۔

بوستان خان : (غصہ سے) خاموش رہو گستاخ۔ تم چاند پر دھول ڈالنے کی کوشش کررہے ہو۔

اسد خان : آپ میری زبان کھنچوا سکتے ہیں کھنچوا لیجیے۔ لیکن یہ نہ بھولیے کہ ان محلات کی بنیادیں ہمارے باپ دادا کی ہڈیوں پر رکھی گئی ہیں اور یہاں کے قبرستانوں میں ان کے مقدس جسم محو خواب ہیں۔ حرص و ہوس اور عورت کی اداؤں سے ان کا سودا نہیں کیا جاسکتا۔

ہیبت خان : (طنزیہ) بدقسمتی سے تمھیں بھی ایک عورت ہی نے جنم دیا ہے۔

اسد خان : لیکن اس نے میرے باپ کو ایسے آنچل کا سایہ نہیں دیا جس نے افغانوں کے خون کی گرمی سرد ہوجائے۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر بوستان خان سے) میں پاگل ہوجاؤں گا عم محترم پاگل۔ مجھے پاگل ہونے سے بچا لیجیے۔

بوستان خان: اسد خاں تم ذرا سوچو کہ —

اسد خان : (بات کاٹ کر) میں سپاہی ہوں عم محترم میرا کام سوچنا نہیں تلوار چلانا ہے۔ (ایک دم رک کر) مگر نہیں ذرا ٹھہریے۔ میں سوچ سکتا ہوں اگر راجا غافل ہوجائے تو پرجا کو سوچنا چاہیے (پاگلوں کی طرح چیخ کر) راجا غافل پرجا ہوشیار۔ راجا غافل پرجا ہوشیار۔

(دروازہ کی طرف جاتا ہے۔ ہیبت خان راستہ روک کر)

ہیبت خاں : تمھارے الفاظ میں بغاوت ہے تم یوں آسانی سے باہر نہیں جاسکتے۔

اسد خان : ہیبت خان۔ مالوے کی محبت اور افغانوں کے وقار کے علاوہ مجھے اور کوئی روکنے والا پیدا نہیں ہوا۔

ہیبت خان : تم جیسے نوجوان غیر ضروری جوش کو عقلمندی سمجھتے ہیں۔

اسد خان : اور تم جیسے بوڑھے بزدلی کو دانشمندی کہتے ہیں۔

ہیبت خان : میری تلوار کو بے نیام ہونے کے لیے نہ للکارو اسد خان

اسد خان : بے نیام تلواروں سے کھیلنا میرا مشغلہ ہے ہیبت خان۔ راستے میں آنے والے ہر ذلیل پتھر کو میں ٹھوکر مار کر گزر جاتا ہوں۔

(دایاں ہاتھ تلوار کے قبضہ پر رکھتا ہے اور بائیں ہاتھ سے ہیبت خان کو راستہ سے ہٹا کر چلا جاتا ہے۔ باہر سے آواز۔ ''راجا غافل پر جا ہوشیار۔ راجا غافل پر جا ہوشیار۔'')

ہیبت خان : اسد خان کے الفاظ میں بغاوت ہے۔

بوستان خان : نہیں۔ وہ ایک نڈر سپاہی اور وطن پرست افغان ہیں۔

ہیبت خان : تو پھر مغلوں کے فرضی خوف نے اسے پاگل کر دیا ہے۔

(باہر سے اسد خاں کی آواز۔ راجا غافل پر جا ہوشیار۔ راجا غافل پر جا ہوشیار)

پہلا ایکٹ ـــــــ چھٹا سین

بازار:

(بازار کا منظر۔ دکانیں لگ چکی ہیں اس وقت دو نوجوانوں میں طاقت کا مقابلہ ہو رہا ہے دونوں ایک دوسرے کو اپنی آغوش میں لیے پوری طاقت سے دبا رہے ہیں۔ کچھ لوگ جن میں دکاندار بھی شامل ہیں چیخ چیخ کر ان کا حوصلہ بڑھا رہے ہیں۔ ایک شخص ڈھیلا ڈھالا لباس پہنے جو صورت سے بھی عجیب نظر آرہا ہے۔ اس سارے ہنگامہ سے لاپرواہ ایک طرف کھڑا آسمان کو تاک رہا ہے۔ کچھ دیر دونوں نوجوانوں میں مقابلہ جاری رہتا ہے پھر ایک معمر شخص آگے بڑھ کر)

شخص : مقابلہ برابر۔

سب لوگ : ہاں ہاں برابر ـــ برابر

(معمر شخص آگے بڑھ کر دونوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھتا ہے۔ دونوں ایک

دوسرے کو چھوڑ کر ہنستے ہیں اور آپس میں گلے ملتے ہیں کہ نوجوان کی نظر تنہا کھڑے ہوئے شخص پر پڑتی ہے۔ بلند آواز سے)

پہلا : ارے وہ دیکھو مرغ بادنما

دوسرا : آج یہ بہت دن کے بعد نظر آرہا ہے۔

(نوجوان مرغ نما بنا دیا بادنما کے پاس جاکر۔ ''السلام علیکم'' مرغ بادنما ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ آنکھوں پر ہاتھ کی چھتری لگائے برابر آسمان کو دیکھتا رہتا ہے۔ ایک نوجوان آسمان کو دیکھتے ہوئے)

نوجوان : بادلوں میں کچھ نظر تو آرہا ہے۔

دوسرا : کیا نظر آرہا ہے

نوجوان : ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مجنوں لیلیٰ کے کتے کو پیار کر رہا ہو۔

دوسرا : (آسمان کی طرف اسی طرح دیکھ کر) مجھے تو ایسا نظر آرہا ہے جیسے فرہاد شیریں کے لیے نہر کاٹ رہا ہو

نوجوان : حضرت آپ کو کیا نظر آرہا ہے

مرغ بادنما : (ان کی باتوں پر دھیان نہ دے کر برابر آسمان کو دیکھتا رہتا ہے۔ پھر اس طرح جیسے خود سے کہہ رہا ہو) سرپٹ دوڑتے ہوئے ہزاروں گھوڑے جن پر گدھے سوار ہیں ان کی چونچیں نیزوں کی طرح ہیں (نوجوان قہقہے لگاتے ہیں۔ مرغ بادنما برابر آسمان کو دیکھتا رہتا ہے پھر ایک دم پریشان سا ہوکر) یہ ان کے سامنے کے بادل دو حصوں میں کیوں بٹ گئے۔ ایک حصہ دوسرے کو اپنے گھیرے میں کیوں لے رہا ہے۔ ارے یہ تو آپس میں ٹکرا گئے۔ گھیرا ٹوٹ گیا۔ یہ بکھرے ہوئے بادل گدوں سے جا ملے۔ (بلند آواز سے) بدشگونی۔ بدشگونی۔ (نوجوان جو اس کا مذاق اڑا رہے ہیں حیرت سے دیکھنے لگتے ہیں) شادی آباد پر منحوس بادل منڈلا رہے ہیں۔ بدشگونی۔

(اندھا فقیر اپنے انداز میں گاتا ہوا آتا ہے)

اندھا فقیر: پلا ساقیا مجھ کو جلدی پلا اٹھا جامِ زریں کو جلدی اٹھا
عجب ذہن و دل میں مرے جنگ ہے وہ حالات ہیں زندگی دنگ ہے
عجب ایک ہنگامہ اٹھنے لگا طبیعت میں طوفان برپا ہوا
عجیب شور ہے زندگی کی طرف اندھیرا بڑھا روشنی کی طرف
مگر شعلۂ جاں سلامت رہے یوں ہی دل میں برپا قیامت رہے
دکھاؤں تجھے میں نئے کارزار رہے میری تیغ قلم آب دار

پہلا ایکٹ ــــــ ساتواں سین

(بوستان خان کی حویلی۔ وزیر اعظم بوستان خان غور و فکر کے عالم میں ٹہل رہا ہے۔ اس کے پاس اسد خان خاموش کھڑا ہے۔ کچھ دیر بعد اسد خان کے پاس رک کر)

بوستان خان: ہم اس پر یقین نہیں کر سکتے کہ ہیبت خان اس حد تک بڑھ سکتا ہے۔

اسد خان : لیکن عم محترم یہ خبر ہیبت خان کی حویلی سے آئی ہے۔

بوستان خاں :ہیبت خان کی حویلی سے!

اسد خان : جی ہاں یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ہیبت خان کا مہمان اس کا عزیز نہیں مغلوں کا جاسوس تھا اور ہیبت خاں نے اسے قلعہ کے غیر محفوظ اور کمزور حصوں کی سیر کرائی تھی۔

بوستان خان: (سوچتے ہوئے) وہ شخص کون ہے جو ہیبت خان کی حویلی کے راز تم تک پہنچاتا ہے۔

اسد خاں : میں خود آج تک معلوم نہ کر سکا۔ شاید وہ خود کو پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے۔

بوستان خان: اور اب وہ جاسوس شادی آباد سے جا چکا ہے۔

اسد خان : جی ہاں۔ (کچھ دیر رک کر) آپ کی حویلی میں بھی جاسوسوں کا جال بچھایا جا چکا ہے۔

بوستان خان : ہمیں اس کا احساس ہے اور ہم اس سے غافل بھی نہیں ہیں۔

اسد خان : (ایک خط بوستان خان کو دے کر) یہ خط ملاحظہ فرمایئے اس پر ہیبت خان کی مہر ہے۔

بوستان خان :(خط پڑھ کر ایک دم چونک کر) فدا خان اور غدار۔نہیں ہم اس پر یقین نہیں کر سکتے۔ یہ ضرور ہیبت خان کی کوئی چال ہے۔

اسد خان : اور وہ خوبصورت کنیز جس کی لاش پائیں باغ میں پائی گئی تھی۔

بوستان خان : ہم اس سے بیٹی کی طرح محبت کرتے تھے اس کی موت کا ہمیں آج تک صدمہ ہے۔

اسد خان : اور وہ ہیبت خان اور فدا خان کے درمیان پیغام رسانی کا کام کرتی تھی۔

بوستان خان: نہیں نہیں اسد خاں یہ ممکن نہیں۔

اسد خان : یہ سچ ہے عم محترم۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ اس کا قتل آپ کی حویلی میں نہیں ہیبت خان کی حویلی میں ہوا ہے۔

بوستان خان : (بلند آواز سے) تو پھر ہمارے دماغ کی شریانیں پھٹ کیوں نہیں جاتیں کہ ہم شرافت اور عزت نفس کا جنازہ اپنی آنکھوں سے نکلتے ہوئے نہ دیکھیں (کچھ دیر خاموش رہ کر) ہمارا وہ نادیدہ دوست یہ خبریں کس ذریعے سے پہنچاتا ہے۔

اسد خان : اس اندھے فقیر کے ذریعہ جو چوک میں بیٹھا رہتا ہے اور اس لڑکی کے ذریعہ جو گا ناچ کر املیاں بیچتی ہے۔ (کچھ دیر رک کر) قبل اس کے کہ فدا خان کوئی شرارت کرے اس کا انتظام کیا جانا ضروری ہے۔

(بوستان خان غور وفکر کے عالم میں پھر ٹہلنے لگتا ہے)

پہلا ایکٹ ——— آٹھواں سین

(روپ متی پویلین۔ روپ متی ایک گاؤ تکیہ سے ٹکی تخت پر بیٹھی ہے۔ سامنے

ایک رقاصہ رقص کر رہی ہے۔ کچھ دیر بعد روپ متی اونچی آواز سے)

روپ متی : بند کرو یہ رقص۔

(رقاصہ رقص بند کر دیتی ہے اور سہمے ہوئے لہجے میں)

رقاصہ : مہارانی۔ کیا ناچیز سے کوئی بھول ہوگئی۔

روپ متی : ہمیں گھنگھروؤں کی آواز سے نفرت ہوگئی ہے (تخت سے اتر کر) اور تم ہمیں مہارانی کہہ رہی ہو جس کے آنچل کی ٹھنڈک نے افغانوں کا خون سرد کر دیا ہے۔ (اسی وقت باز بہادر آہستہ آہستہ آتا ہے اور رقاصہ کو جانے کا اشارہ کرتا ہے۔ رقاصہ سلام کر کے چلی جاتی ہے۔ باز بہادر روپ متی کے پاس آکر)

باز بہادر : ہمارے علم میں لایا گیا ہے کہ اسد خان نے آپ کی شان میں گستاخی کی ہے۔

روپ متی : گستاخی! آپ کے ہوتے ہوئے ہم اپنے لیے کسی گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتے مگر ہاں اس نے ہماری آنکھیں ضرور کھول دی ہیں۔

باز بہادر : ہم اسد خان کو اس کی گستاخی کی سخت سے سخت سزا دیں گے۔

روپ متی : نہیں مہاراج وہ سچا وطن پرست، حق گو، ایماندار اور نڈر سپاہی ہے۔ وہ خوشامدی نہیں ہے اس لیے قابلِ عزت و احترام ہے۔

باز بہادر : اس نے آپ ہی کی شان میں گستاخی نہیں کی ہے بلکہ ہمارے خلاف بھی رعایا کو بھڑکا رہا ہے۔ وہ جو نعرہ لگا رہا ہے اس میں بغاوت ہے اسے معاف نہیں کیا جاسکتا۔

روپ متی : کیا صرف اس لیے کہ وہ مغلوں کے متوقع خطرے کو محسوس کر رہا ہے۔

باز بہادر : تو پھر وہ ہم کو بزدل سمجھ رہا ہے کہ ہم مغلوں کے خوف سے آپ کے آنچل میں چھپے بیٹھے ہیں۔

روپ متی : مہاراج۔ نہ تو بے پروائی بہادری ہے اور نہ خطرے کا احساس بزدلی۔ شیر بہادر ہوتے ہوئے بھی جنگل میں کس قدر چوکنا رہتا ہے۔

باز بہادر : بہ رب کعبہ مہارانی نہ ہم بزدل ہیں اور نہ غافل۔ مالوے کی طرف اٹھتے

ہوئے ہاتھوں کو قلم کردیں گے اور ان کی آنکھوں کو بینائی سے محروم کردیں گے جو مالوے کی طرف دیکھیں گی۔

روپ متی : مگر مہاراج—

باز بہادر : ہم امن کے پجاری ہیں مہارانی۔ ہم لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں بے لگام دوڑتے ہوئے گھوڑے نہیں دیکھ سکتے۔ بہاروں میں مستیاں کرتے نوجوان اور گھونگھٹوں میں مسکراتی شرماتی آنکھیں ہمارے خواب ہیں۔ تاروں بھرا آسمان، باغوں میں کھلے ہوئے پھول اور گنگناتی چنچل ندیاں ہماری زندگی ہیں۔

روپ متی : تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی مہاراج۔ ایک طرف آغوش مادر کی طرح کھلی ہوئی ہتھیلی ہو اور دوسری طرف تنا ہوا مُکا تو تالی نہیں بجے گی، آغوشِ مادر کو ضرور نقصان پہنچ جائے گا۔

(باز بہادر کچھ دیر خاموش رہتا ہے پھر تالی بجاتا ہے ایک عورت آتی ہے)

باز بہادر : ہم بوستان خان کے منتظر ہیں۔

(عورت سلام کرکے چلی جاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد بوستان خان آتا ہے اور سلام کرکے خاموش کھڑا ہوجاتا ہے۔ باز بہادر اس کے پاس جاکر)

باز بہادر : آپ ہمارے بزرگ اور سلطنتِ مالوہ کے وفادار ہیں۔ بتلایئے کیا ہم اپنے فرض سے غافل ہیں (بوستان خاموش رہتا ہے) ہم بزرگوں کی حق گوئی کو گستاخی نہیں سمجھتے۔

بوستان خان: دربار سے مستقل غیر حاضری وفاداروں کے لیے باعثِ تشویش ضرور ہے۔

باز بہادر : لیکن ہمارا دربار میں نہ آنا ہمارے غافل ہونے کی علامت تو نہیں ہے۔

بوستان : وفاداروں کو ان کی موجودگی سے جو حوصلہ ملتا ہے وہ اس سے محروم ہوچکے ہیں۔

باز بہادر : حوصلہ دلوں کی قوت کا نام ہے۔ راجا تو صرف علامت ہوتا ہے لیکن سلطنت ایک حقیقت۔ علامتوں کو زوال آسکتا ہے مگر حقیقت اپنی جگہ پر حقیقت رہتی ہے۔

بوستان خان : میدانِ جنگ میں جھنڈا بھی ایک علامت ہوتا ہے جس کے لیے وفادار خوشی

خوشی اپنی گردنیں کٹا دیتے ہیں لیکن اس کے نظر نہ آنے پر حقیقتیں خواب بن جاتی ہیں۔

(باز بہادر کچھ دیر سوچتا ہے پھر ایک دم جیسے بھڑک اٹھا ہو)

باز بہادر : لیکن اسد خان کو معاف نہیں کیا جاسکتا۔ وہ شاہراہوں اور بازاروں میں ہمیں غافل راجا کا خطاب دیتا پھرتا ہے۔ اس نے مہارانی کی شان میں گستاخی کی ہے۔

بوستان خان: میرے پاس جو اطلاعات ہیں ان سے کہیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس نے غیر وفاداری کا کوئی کام کیا ہو۔

باز بہادر : اور ہیبت خان نے جو معلومات فراہم کی ہیں ان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ رعایا میں بغاوت کے بیج بو رہا ہے۔ اسے آزاد نہیں چھوڑا جاسکتا۔

(بوستان خان سر جھکائے خاموش کھڑا رہتا ہے)۔

پہلا ایکٹ ——— نواں سین

(بازار کا منظر۔ اندھا فقیر اپنی جگہ پر بیٹھا لاٹھی اور پیسوں سے تال پیدا کر رہا ہے لوگ کاروبار میں مصروف ہیں کہ لڑکی املیاں بیچتی ہوئی آتی ہے)

لڑکی : املی لے لو مانڈو کی ــــ املی لے لو مانڈو کی۔

(فقیر کے پاس جاکر) بابا۔ یہ تمہارے دو ٹکے

فقیر : جیتی رہ بیٹی۔ (پیسے لیتے ہوئے) جا بیٹی جا خدا تیرا بھلا کرے۔

(لڑکی گاتی ہوئی آگے بڑھتی ہے)

لڑکی: املی لے لو مانڈو کی املی لے لو مانڈو کی
میری پھلی نرالی ہے روپ متی کی پیاری ہے
باز بہادر کا من ہرتی سارے جگ کو بھاتی ہے

(کچھ نوجوان اس کے گرد حلقہ بنا کر گاتے ہیں۔ ناچتی ہے)

سندری دیکھو مانڈو کی املی لے لو مانڈو کی

(اسد خاں آتا ہے اس کے ہاتھ میں ایک ٹوٹی ہوئی تلوار ہے جس میں گھنگھرو بندھے ہیں۔ اسد خاں نوجوانوں کے پاس آ کر)

اسد خاں : بند کرو یہ ہیجڑوں کی سی ہوحق

(سب خاموش ہوکر حیرت سے اسد خاں کو دیکھتے ہوئے)

ایک نوجوان: ارے اسد خاں تمھیں یہ کیا ہوگیا ہے۔

اسد خاں : اسد خاں پاگل ہوگیا ہے۔ (ٹوٹی ہوئی تلوار اس کے سینہ کی طرف کرتا ہے گھنگھرو بجتے ہیں۔ نوجوان کود کر پیچھے ہٹتا ہے) ارے واہ ڈر گئے تو تمھیں گھنگھروؤں کی جھنکار سنا رہا تھا۔ اب افغانوں کی تلوار میں صرف گھنگھروؤں کی جھنکار ہی رہ گئی ہے۔

(اسد خان تلوار میں لہرا لہرا کر بے ہنگم طور پر ناچتا گاتا ہے۔" سندری دیکھو مانڈو کی" نوجوان قہقہے لگاتے ہیں۔ قمری خان دو سپاہیوں کے ساتھ آتا ہے۔ قمری خان کی آواز بے حد مضحکہ خیز ہے۔)

قمری خان : بند کرو یہ چیخ پکار۔ (سب خاموش ہوجاتے ہیں، اسد خاں! میں کوتوال شہر قمری خان تمھیں سلطانِ اعظم کے حکم سے گرفتار کرتا ہوں، اپنی تلوار میرے حوالے کردو۔

اسد خان : (ہنس کر) قمری خان۔ دوسروں کی تلوار پر نظر ڈالنے سے پہلے اپنی تلوار کی دھار دیکھ لیتے ہیں۔

قمری خان : (اسد خان مجھے اپنی تلوار بے نیام کرنے پر مجبور نہ کرو۔

اسد خان : (ہنس کر) اچھا آپ بھی تلوار بے نیام کرنا جانتے ہیں۔

(قمری خاں بے حد اسٹائل سے پینترا بدل کر تلوار نیام سے نکالتا ہے مگر بجائے تلوار کے صرف دستہ باہر آتا ہے۔ سب لوگ قہقہے لگاتے ہیں۔ اسد خان مذاق اڑانے کے انداز میں)

اسد خان : اس دلہن کو گھونگھٹ ہی میں لجانے شرمانے دو کیوں بیچاری کو بے نقاب

کرتے ہو۔

قمری خان : اسد خان۔ تم کوتوال شہر قمری خان ولد بلبل خان کا مذاق اڑا رہے ہو۔ تمھیں اپنی تلوار میرے حوالہ کرنی ہوگی۔

اسد خان : قمری خان (جوش اور غصہ سے) اسد خان نے ہتھیار کسی کے حوالے کرنا نہیں سیکھا ہے۔

قمری خان : تو پھر مجھے اپنے سپاہیوں کو حکم دینا ہوگا کہ وہ بزور تم سے تلوار چھین لیں۔

اسد خان : اور میں ان پر تلوار نہیں اٹھاؤں گا۔ یہ سلطنت مالوہ کے وفادار محافظ ہیں۔

قمری خان : مگر میں سلطان اعظم کے حکم کی تعمیل کر کے رہوں گا۔

اسد خان : اگر سلطانِ اعظم یہ سمجھتے ہیں کہ اسد خان کو بندی خانے میں ڈالنے سے سلطنتِ مالوہ کا سہاگ اور شباب برقرار رہے گا تو اسد خان کے لیے بندی خانہ جنت سے کم نہیں۔ آؤ چلو۔ بندی خانہ کا تجربہ بھی کرلیں۔ (بلند آواز سے) راجا غافل پر جا ہوشیار۔

(قمری خان اور سپاہیوں کے ساتھ چلا جاتا ہے)

دوسرا ایکٹ —— پہلا سین

(بوستان کا دفتر۔ بوستان خان گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھا ہے۔ سامنے مرغ بادنما کھڑا ہے۔ بوستان اسے اس طرح دیکھ رہا ہے جیسے اپنے کسی سوال کے جواب کا منتظر ہو۔ مرغ بادنما کچھ دیر خاموش رہ کر)

مرغ بادنما : حضرت۔ میں کوئی ولی یا مرشد نہیں ہوں۔ صرف پیش گو ہوں۔

بوستان خان: پیش گو۔

مرغ بادنما : جی ہاں پیش گو۔ میں ہواؤں پر اڑتے ہوئے بادلوں کو دیکھ کر مستقبل کے بارے میں جان لیتا ہوں۔

بوستان خان: تو پھر آپ شاید دنیا کے لیے عجوبہ ہیں۔ ہمارے علم میں تو صرف اس قدر

ہے کہ ہاتھوں کی لکیروں اور ستاروں کی گردش تک یہ علم محدود ہے۔ بخدا زندگی میں پہلی بار آپ کے عجیب علم کے بارے میں سن رہے ہیں۔

مرغ بادنما : کیا آپ اس سے انکار کرسکتے ہیں کہ کسی خطۂ زمین پر چھائے ہوئے بادل اس خطے پر خوش حالی بھی لاسکتے ہیں اور تباہی بھی۔

بوستان خان: ہم اس سے انکار نہیں کرسکتے۔

مرغ بادنما : اور کیا یہ بادل ہر لحہ نئی نئی شکلیں اختیار نہیں کرتے۔

بوستان خان: ضرور کرتے ہیں۔ ہمیں اس سے بھی انکار نہیں۔

مرغ بادنما :اور یہی کسی خطۂ پر چھانے والے بادل اور ان کی بنتی بگڑتی شکلیں میرے علم کی بنیاد ہیں۔ یہ بے موسم کے بادل جو شادی آباد پر چھائے ہوئے ہیں کچھ خوشگوار پیغام لے کر نہیں آئے ہیں (بوستان خان سوچ میں پڑجاتا ہے) حضرت شاید آپ مرغ بادنما پر یقین نہیں کررہے ہیں۔ میرے علم نے کبھی دھوکہ نہیں دیا ہے۔

(بوستان خان خاموش رہ کر سوچتا ہے کہ ہیبت خان آتا ہے۔ بوستان خان اسے دیکھ کر کھڑے ہوتے ہوئے)

بوستان خان: خوش آمدید ہیبت خان۔ صبح بخیر۔

(ہیبت خان بوستان خان کی طرف دھیان نہ دے کر مرغ بادنما کو سر سے پیر تک دیکھتا ہے۔ مرغ بادنما اسے کوئی اہمیت نہ دے کر ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالتا ہے پھر بوستان خان سے)

مرغ بادنما : اب میں اجازت چاہوں گا۔

(جواب کا انتظار کیے بغیر آہستہ چال سے چلا جاتا ہے۔ ہیبت خان کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے مرغ بادنما کے عمل سے تکلیف پہنچی ہے۔ بوستان خان سے مخاطب ہوکر)

ہیبت خان : یہ عجوبۂ روزگار کون تھا

بوستان خان: مرغ بادنما
ہیبت خان : مرغ بادنما! اس کی طرح اس کا نام بھی ایک عجوبہ ہے۔
بوستان خان : عجیب پیش گو ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ بادلوں کی بنتی بگڑتی شکلوں میں مستقبل کو دیکھ لیتا ہے۔
ہیبت خان : اور لوگوں کو بہکاتا ہے۔ ہمارے علم میں لایا گیا ہے کہ وہ اسد خاں کی گرفتاری کے بارے میں عجیب عجیب افواہیں پھیلا کر رعایا میں بے چینی پیدا کر رہا ہے۔
بوستان خان: اسد خاں کی گرفتار سے ہمیں بھی مایوسی ہوئی ہے۔
ہیبت خان : آپ کی مایوسی بے بنیاد ہے۔ کیا وہ راجا غافل پر جا ہوشیار کا نعرہ نہیں لگاتا ہے۔
بوستان خان: پرجا کے ہوشیار ہوئے بنا سلطنتوں کی بنیادیں کمزور ہوتی ہیں۔
ہیبت خان : اور مہارانی کی شان میں گستاخی کی داستان کس باب میں لکھی جائے گی۔
بوستان خان: جس باب میں عظیم سلطنتوں کے المیے تصنیف ہوئے ہیں۔
ہیبت خاں: تو آپ بھی اسد خان کے ہم خیال ہیں۔ (طنزیہ) کہیں مرغ بادنما نے آپ کی بگڑی ہوئی شکل بھی تو بادلوں میں نہیں دیکھ لی۔
بوستان خاں: ہم ضعیف الاعتقاد نہیں ہیں (کچھ دیر رک کر) لیکن سوچتے ہیں کہ جو بوجھ ہمارے کاندھوں پر ہے اب اس کا اٹھانا ہمارے بس کا رہا نہیں ہے۔
ہیبت خان : (طنزیہ) آپ مغلوں سے خوف زدہ ہیں یا ان کی شان وشوکت نے آپ کی نظروں کو خیرہ کردیا ہے۔
بوستان خان: (غصہ سے) ہیبت خان۔ ہماری ان سال خوردہ ہڈیوں میں ابھی اتنی طاقت ہے کہ اسے پیس کر رکھ دیں جو ہمیں غدار کہتا یا سمجھتا ہے۔
ہیبت خان : اور بڑی بڑی سلطنتیں سینے پر برچھی کا وار جھیلنے اور تلواروں کو گلے لگانے سپاہیوں نے نہیں آپ جیسے سیاست دانوں نے تباہ کی ہیں۔
بوستان خان: اور جن ہاتھوں میں ملک وقوم کی حفاظت کے لیے تلواریں دی گئی ہیں انھوں نے وہ تلواریں بیچی بھی ہیں۔ بغاوتیں بھی کی ہیں۔ ملک وقوم کی غلامی کے

پروانوں پر دستخط بھی کیے ہیں۔
(ہیبت خان غصہ سے بوستان خان کو دیکھتا ہے اور تیز تیز قدموں سے چلا جاتا ہے)

دوسرا ایکٹ ——— دوسرا سین

(باز بہادر کا دربار بوستان خان، ہیبت خان اور دیگر امراء مؤدب کھڑے ہیں۔ باز بہادر تخت پر بیٹھا ہے۔ سامنے اسد خاں کھڑا ہے اس کے ہاتھ میں وہی ٹوٹی ہوئی تلوار ہے۔ اس کے پاس قمری خاں اور دو سپاہی کھڑے ہیں۔ باز بہادر غور سے اسد خاں کو دیکھتے ہوئے)

باز بہادر : اسد خان۔ ہمیں تمھارے بزرگوں کا خیال ہے جنھوں نے سلطنت مالوہ کے لیے اپنا خون بہایا ہے مگر تمہاری گستاخیاں بغاوت کی حد میں داخل ہوتی جارہی ہیں۔

اسد خاں : سلطان اعظم۔ میرا مقصد گستاخی کرنا نہیں ہے۔ بغاوت اور غداری کو تو میں ایسا سمجھتا ہوں جیسے کوئی اپنی ماں کے ساتھ زنا کرے۔

باز بہادر: پھر اس ساری چیخ پکار سے تمہارا کیا مقصد ہے۔

اسد خاں : صرف اس قدر کہ کہیں اغیار کے گھوڑے بزرگوں کی ہڈیوں کو روندتے نہ پھریں۔

باز بہادر : کیسے اغیار، کہاں کے اغیار، کس کے اغیار۔ تمھیں مغلوں کے مفروضہ خوف نے بزدل بنا دیا ہے۔ کیا تمھیں افغانوں کی تلواروں پر بھروسہ نہیں ہے۔

اسد خان : (قمری خان کی طرف اشارہ کرکے) قمری خان جیسے افغانوں کی تلوار پر بھروسہ جو نیام میں تلوار نہیں صرف قبضہ لیے پھرتے ہیں (ہیبت خان کی طرف دیکھ کر) ان افغانوں کی تلواروں پر بھروسہ جو زیادہ قیمت ملنے پر بیچ دی جاتی ہیں۔

(ہیبت خان غصہ سے اپنی تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھتا ہے مگر پھر کچھ سوچ کر

ہٹا لیتا ہے۔ اسی وقت ایک کنیز آ کر باز بہادر کو سلام کرتی ہے۔ باز بہادر اس کی طرف دیکھتا ہے)

کنیز : مہارانی فرماتی ہیں کہ اسد خاں ہمارا مجرم ہے اسے سزا دینے کا حق صرف ہم کو ہے۔

باز بہادر : (کچھ دیر رک کر) مہارانی سے کہو کہ وہ ہمارے دل کی عظیم سلطنت پر حکمرانی کرتی رہیں۔ مالوہ کی چھوٹی سی ریاست ہمارے لیے چھوڑ دیں۔ (کنیز سلام کر کے چلی جاتی ہے۔ باز بہادر اسد خاں کی طرف دیکھ کر) اسد خان ہم تمھارا سر بھی اڑوا سکتے ہیں مگر ہمیں کشت و خون سے نفرت ہے۔ تمھیں زنداں میں ڈالنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

اسد خان : ہمیں ہماری توقعات سے بہت کم دیا جارہا ہے۔ ہمیں تو امید تھی کہ ہمیں حکم دیا جائے گا کہ ہم مغلوں کے حرص و ہوس کے قلعہ کو ڈھا ڈالیں اور سلطنت مالوہ کے غداروں کی ہڈیوں کا سرا بنا دیں۔

باز بہادر : اور اس تلوار سے جس سے گھنگھروؤں کا ساز تو پیدا ہوسکتا ہے تلواروں کی جھنکار نہیں۔

اسد خان : یہ ان افغانوں کی تلوار کی علامت ہے جو گھنگروؤں کی آواز کے لیے اپنی تلواریں توڑ چکے ہیں اور مرد میدان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یہ ان افغانوں—

ہیبت خان : (بات کاٹ کر غصہ سے) اسد خاں تم کیا بک رہے ہو سوچ نہیں رہے یہ سلطان باز بہادر کا دربار ہے۔ شادی آباد کا چوک نہیں۔

اسد خان : ہیبت خان۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔ میں نے سرفروشی سیکھی ہے شمشیر فروشی نہیں۔

ہیبت خان : تم افغانوں کی غیرت کو للکار رہے ہو۔

اسد خان : جو اپنی تلواروں کو بیچ دیتے ہیں ان میں کہاں کی غیرت کیسی غیرت۔ وہ

باز بہادر : خاموش۔ اسد خان کو زنداں میں ڈال دیا جائے۔

اسد خان : (جوش بھرے لہجے میں) پہناؤ مجھے ہتھکڑیاں، بیڑیاں کہ لوہا لوہے سے ٹکرائے
یہ ساز مجھے بہت پسند ہے۔
(باز بہادر کھڑا ہو جاتا ہے)

دوسرا ایکٹ ـــــ تیسرا سین

(بازار۔ اندھا فقیر اپنی جگہ پر بیٹھا اپنے مخصوص انداز میں بھیک مانگ رہا ہے اس کے پاس مرغ بادنما کھڑا آسمان کو تاک رہا ہے۔ کچھ نوجوان اس کے پاس آتے ہیں۔

پہلا : کہیے خان۔ آج بادلوں میں کیا نظر آ رہا ہے۔

مرغ بادنما : تمھاری لاشوں پر دوڑتے ہوئے گھوڑے

دوسرا : (ہنس کر) تمھاری محبوباؤں کے گلے میں طوق غلامی

تیسرا : (غصہ اور جوش سے) افغانوں کی لاشوں پر دوڑنے والے اور افغانوں کی محبوباؤں کے گلوں میں طوقِ غلامی ڈالنے والے ہاتھ آج تک پیدا نہیں ہوئے۔

مرغ بادنما : جاؤ جاؤ اپنی اپنی محبوباؤں کے آنچلوں میں پناہ لو۔ تم اسد خاں نہیں ہو سکتے۔

پہلا : اسد خان

مرغ بادنما : (اسی طرح آسمان کو دیکھتے ہوئے) ہاں۔ جسے شادی آباد سے محبت کرنے کے جرم میں بندی خانہ میں ڈال دیا گیا ہے۔

دوسرا : یہ تو سراسر ظلم ہے۔

مرغ بادنما : تو ظلم سہنے کے عادی ہو اس لیے تم پر ظلم کیا جاتا ہے۔

پہلا : ارے دیکھنا وہ منحوس قمری خان آ رہا ہے۔

دوسرا : سنا ہے ہیبت خان اور بوستان خان میں ٹھن گئی ہے۔

پہلا : کل تو دونوں کے آدمیوں میں تلوار بھی چل گئی تھی۔

تیسرا : ہیبت خان خنزیر کی اولاد ہے۔ (غصہ سے) اگر محترم بوستان خان کے خلاف

اس نے کوئی شرارت کی تو اس کی بوٹیاں چیل کوؤں کو ڈال دی جائیں گی۔

(قمری خان سپاہیوں کے ساتھ آکر اپنی مضحکہ خیز آواز سے)

قمری خان : کیوں خنزیرو۔ یہاں کیا اودھم مچا رکھی ہے (تیسرا نوجوان غصہ سے قمری خاں کی طرف بڑھتا ہے۔ ایک سپاہی اپنی تلوار کی نوک اس کے سینہ سے لگادیتا ہے نوجوان پیچھے ہٹ کر اپنی تلوار نکالنا چاہتا ہے مگر دوسرا نوجوان اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ قمری خان مرغ بادنما سے) چلیے میں آپ کے گھر تک جانے کی زحمت سے بچ گیا۔ (مرغ بادنما برابر آسمان کو دیکھتا رہتا ہے) اے مرغ کی اولاد۔ (مرغ بادنما متوجہ نہیں ہوتا) دیکھ لو دیکھ لو ان بادلوں میں اپنی قسمت بھی دیکھ لو۔ (مرغ بادنما کوئی دھیان نہیں دیتا) مرغ بادنما! میں قمری خاں ولد بلبل خان تمھیں ہیبت خان سپہ سالارِ اعظم افواج مالوہ کے حکم سے گرفتار کرتا ہوں۔

تیسرا : کیوں گرفتار کرتے ہو اور یہاں ہیبت خان کا نہیں سلطان باز بہادر کا حکم چلتا ہے۔

قمری خان : تلوار جس کے ہاتھ میں ہوتی ہے حکم اس کا چلتا ہے۔ لے چلو اسے۔

تیسرا : (تلوار نکال کر) تم انھیں یوں آسانی سے نہیں لے جاسکتے۔

(سپاہی اور دوسرے نوجوان بھی تلواریں نکال لیتے ہیں۔ مرغ بادنما ان کے درمیان آکر)

مرغ بادنما : مجھے لے جانے دو۔ مرغ بادنما بندی خانہ میں بھی ہواؤں کا رخ بتلانے کو آزاد رہے گا۔

(مرغ بادنما سپاہیوں کے ساتھ چلا جاتا ہے)

پہلا : (نفرت سے) قمری خان ولد بلبل خان پرندوں کی نسل کا الو۔

دوسرا ایکٹ ـــــ چوتھا سین

(روپ متی پویلین۔ روپ متی تخت پر بیٹھی ہے۔ باز بہادر غور وفکر کے عالم

میں ٹہل رہا ہے۔ ہیبت خان تلوار کا سہارا لیے کھڑا ہے۔ کچھ دیر بعد باز بہادر
اس کے پاس رک کر)

باز بہادر : بوستان خان کو نظر بند ہمارے ایماء کے خلاف کیا گیا ہے۔

ہیبت خان : مگر سلطان اعظم وہ اسد خاں جیسے گستاخ کا حمایتی ہے اور مرغ بادنما جیسے واہیات شخص کی پیش گوئیوں کو قبول کرتا ہے۔

باز بہادر : ان سے رعایا باپ کی طرح محبت کرتی ہے یہ سن کر وہ بغاوت بھی کرسکتی ہے۔

ہیبت خان : کسی بھی شورش کو دبانے کے لیے میری تلوار میں طاقت موجود ہے۔

روپ متی : اس قدر اہم قدم اٹھانے سے پہلے مہاراج کا حکم حاصل کرنا ضروری ہے۔

ہیبت خان : مہارانی سلطنت کو تمام فتنوں اور شورشوں سے محفوظ رکھنا بھی ہماری ذمے داری ہے۔ اپنے فرض سے ہم کیسے غافل رہ سکتے ہیں۔

روپ متی : دوست اور دشمن میں تمیز کرنا مہاراج کی ذمے داری ہے۔ یہ حق آپ کو کس نے دیا ہے۔

ہیبت خان : حق دیا نہیں جاتا ہے لیا جاتا ہے اور یہ حق ہم نے اس لیے لیا ہے کہ کسی فتنہ کا سر اٹھانے سے پہلے اسے کچل دیں۔

باز بہادر : ہم حکم دیتے ہیں کہ بوستان خان کی حویلی سے نگرانی فوراً اٹھا لی جائے اور قرنطینہ ختم کیا جائے۔

ہیبت خان : تین دن بعد حکم کی تعمیل کردی جائے گی۔

باز بہادر : تین دن بعد!

ہیبت خان : جی ہاں۔ تاکہ سلطانِ اعظم اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرسکیں۔ جلد بازی کے فیصلے اکثر برے نتائج پیدا کرتے ہیں۔

(باز بہادر کچھ دیر خاموش رہ کر ہیبت خان کو جانے کا اشارہ کرتا ہے جو چلا جاتا ہے۔ روپ متی تخت سے اتر کر باز بہادر کے پاس آکر)

روپ متی : ہم ہیبت خان کے الفاظ میں بغاوت محسوس کر رہے ہیں۔

باز بہادر : (سوچتے ہوئے) ہم کو اطلاعات ملی تھیں کہ وہ مغلوں سے ساز باز کر رہا ہے۔ اب ہم کو ان کی صداقت پر یقین آ گیا ہے۔ وہ پورے طور پر شرارت پر آمادہ ہے۔

روپ متی : اس کا فوراً انتظام کیا جانا ضروری ہے۔

(باہر سے شور وغل اور چیخ پکار کی آوازیں۔ روپ متی اور باز بہادر ادھر دھیان دیتے ہیں کہ ایک مسلح عورت گھبرائی ہوئی اندر آ کر)

عورت : سلطانِ اعظم۔ مداخلت کے لیے معافی چاہتی ہے۔ (باز بہادر مڑ کر دیکھتا ہے) ہیبت خان کے باہر نکلتے ہی بوستان خان کے وفادار سپاہیوں نے اس پر حملہ کر دیا ہے۔ رعایا بھی ان کے ساتھ مل گئی ہے۔ سخت مار کاٹ ہو رہی ہے۔ ہیبت خان زخمی ہو کر قلعے سے نکل جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ (باہر شور وغل کی آوازیں تیز ہو جاتی ہیں۔ باز بہادر تلوار اٹھا کر تیزی سے دروازہ کی طرف جاتا ہے۔ روپ متی اس کا راستہ روک کر)

روپ متی : مہاراج۔ آپ کا اس ہنگامہ میں جانا مناسب نہیں۔

باز بہادر : انھیں یہ اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ آپس میں تلوار چلا کر افغان طاقت کو زخمی کر دیں۔ (دو چار قدم بڑھ کر رکتا ہے) مہارانی آپ ہیبت خان کی حویلی کا انتظام کر دیجیے کہ عورتوں کی بے حرمتی نہ ہو۔

(باز بہادر تیزی سے چلا جاتا ہے۔ روپ متی عورت سے)

روپ متی : محل کی حفاظت کا انتظام مکمل ہے۔

عورت : جی ہاں مہارانی

روپ متی : شمشاد خاں سے کہو کہ ہیبت خان کی حویلی کی حفاظت کریں کہ وہاں کوئی شرارت نہ کی جا سکے۔

(عورت سلام کر کے چلی جاتی ہے)

دوسرا ایکٹ —— پانچواں سین

(شام کا وقت۔ روپ متی پویلین میں باز بہادر اور روپ متی کھڑے سورج غروب ہونے کا منظر دیکھ رہے ہیں۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ روپ متی مڑ کر باز بہادر کو دیکھ کر)

روپ متی : مہاراج۔ (باز بہادر اسے دیکھتا ہے) ہم کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

باز بہادر : فرمائیے۔ آپ کیا حکم فرماتی ہیں۔

روپ متی : شاید ہماری درخواست منشائے مبارک کے خلاف ہو۔

باز بہادر : ہم اپنی منشائے خاص بھی آپ کے حکم پر قربان کر سکتے ہیں۔

روپ متی : ہم اپنی اس خوش بختی پر دوسرے جنم میں بھی فخر کرتے رہیں گے— لیکن ہماری درخواست—

باز بہادر : آپ پس و پیش فرما رہی ہیں۔ شاید آپ کو ہم پر بھروسہ نہیں۔

روپ متی : ہم آپ پر بھروسہ نہ کرنے کا گناہ نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ ہم کو پس و پیش ضرور ہے اس لیے کہ ہماری درخواست مصلحتِ وقت کے خلاف ہے۔

باز بہادر : مصلحتِ وقت بزدلی کا مہذب نام ہے۔ حق پرست مصلحتِ وقت کا شکار نہیں ہوتے۔ فرمائیے ہم آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔

روپ متی : ہماری خواہش ہے کہ ہیبت خان کے اہل و عیال کو اس کے پاس پہنچا دیا جائے۔

باز بہادر : (پریشان سا ہو کر) یہ آپ کیا فرما رہی ہیں مہارانی۔

روپ متی : یہ جرأت ہم نے اس لیے کی ہے کہ مجرم ہیبت خان ہے اس کے اہل و عیال نہیں۔

باز بہادر : لیکن وہ ہمارا باغی ہے— وہ—

روپ متی : دشمن کی عزت کی حفاظت کرنا بہادروں کی شناخت ہے۔

(باز بہادر سوچتا ہے۔ پھر تالی بجاتا ہے اور مسلح عورت اندر آتی ہے)

باز بہادر : ہم بوستان خان کے منتظر ہیں۔

(عورت سلام کر کے چلی جاتی ہے۔ باز بہادر ٹہلنے لگتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد بوستان خان آتا ہے اور سلام کر کے مؤدب کھڑا ہو جاتا ہے۔ باز بہادر اسے دیکھ کر)

باز بہادر : ہیبت خان کے بارے میں کیا خبر ہے۔

بوستان خان: وہ یہاں سے فرار ہو کر آگرہ پہنچ گیا ہے اور اب وہاں کے منصب داروں میں شامل ہے۔

باز بہادر : اور اس کا لڑکا

بوستان خان: وہ اپنے پورے خاندان کے ساتھ نظر بند ہے۔

بوستان خان: (کچھ دیر خاموش رہ کر) ہم چاہتے ہیں کہ ہیبت حان کے پورے خاندان کو حفاظت کے ساتھ اس کے پاس پہنچا دیا جائے۔

بوستان خان: مگر سلطانِ اعظم—

باز بہادر : ہم آپ کی ہر دلیل سے متفق ہونے کے بعد بھی اپنی رائے تبدیل کرنے کے لیے تیار نہ ہوں گے۔

بوستان خان: (جھک کر) آپ کے حکم کی تعمیل کر دی جائے گی۔

دوسرا ایکٹ —— چھٹا سین

(بازار۔ مرغ بادنما اندھے فقیر کے پاس کھڑا آسمان کو دیکھ رہا ہے۔ لوگ کاروبار میں مصروف ہیں۔ ایک شخص مرغ بادنما کو دیکھ کر دوسرے سے)

پہلا : ارے مرغ بادنما۔ یہ کہاں سے آ گیا۔ اسے تو گرفتار کر لیا گیا تھا۔

دوسرا : (ہنس کر) وہ کہتا ہے کہ مرغ بادنما ہواؤں کا رُخ بتلانے کے لیے آزاد ہے اسے قید نہیں کیا جا سکتا۔

پہلا : محترم بوستان خان کی مہربانی ہوگی۔ اور ہاں سنا ہے ہیبت خان کے متعلقین کو

اس کے پاس بھجوا دیا گیا ہے۔

دوسرا : (نفرت سے) اس لعنتی خنزیر کا نام نہ لو۔ اس کا نام تک منحوس ہے۔ سلطان اعظم کی عالی ہمتی خدانخواستہ انھیں کسی بڑی مصیبت میں گرفتار نہ کرادے۔

پہلا : افغان مصیبتوں سے خوف زدہ ہونے کے لیے پیدا نہیں ہوتے۔

دوسرا : وار ہمیشہ دشمن کے غیر محفوظ حصہ پر کیا جاتا ہے۔

پہلا : بچوں اور عورتوں پر وار کرنا افغان بزدلی سمجھتے ہیں۔

مرغ بادنما : (ایک دم چلا کر) یہ بادل — یہ بادل

پہلا : (مرغ بادنما کی طرف مڑ کر) خان آخر تم بادلوں میں —

مرغ بادنما : خاموش۔ یہ بادل نہیں طوفان ہیں — دیکھو کس قدر کالے اور گھنے ہیں — یہ بے موسم کے بادل شادی آباد کی طرف کیوں بڑھ رہے ہیں۔ یہ منحوس ہیں۔ یہ منحوس ہیں

(منحوس۔ منحوس چیختا ہوا دوڑ کر ایک طرف جاتا ہے۔ سب لوگ حیرت سے اسے دیکھتے ہیں۔ کچھ دیر بعد منادی کرنے والا ڈھول پیٹتا ہوا آتا ہے)

منادی کرنے والا: ہوشیار ہوشیار۔ سنو سنو۔ حکم سلطان باز بہادر کا سنو سنو۔ ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ مغلوں نے بلا سبب شادی آباد پر حملہ کردیا ہے۔ سلطانِ اعظم کا حکم ہے کہ ہر وہ شخص جو تلوار اٹھا سکتا ہے شادی آباد کی حفاظت کے لیے تیار رہے۔

(ڈھول پیٹتا ہوا دوسری طرف چلا جاتا ہے۔ بازار میں بھاگ دوڑ مچ جاتی ہے۔ اندھا فقیر کھڑا ہوجاتا ہے اور تیز تیز لاٹھی کو مارتا اور کٹورے کے پیسے بجاتا ہے۔)

دوسرا ایکٹ —— ساتواں سین

(روپ متی پویلین۔ باز بہادر آہستہ آہستہ ٹہل رہا ہے اور فکرمند معلوم ہوتا

ہے۔ روپ متی خاموش کھڑی رہتی ہے۔ کچھ دیر بعد)

روپ متی : مہاراج۔ طبع عالی شاید فکرمند ہے۔

باز بہادر : ہاں روپ ہم فکرمند ہیں۔ مغلوں سے مقابلہ کے لیے جو فوجیں روانہ کی گئی تھیں ابھی تک ان کی کوئی خبر نہیں آئی۔

روپ متی : بھگوان کی کرپا سے اچھی خبر آئے گی مہاراج

(اسی وقت ایک شخص اندر آکر)

شخص : سلطانِ اعظم کا اقبال بلند ہو۔

(باز بہادر مڑ کر اسے دیکھتا ہے۔ وہ شخص گردن جھکائے خاموش کھڑا رہتا ہے۔)

شخص : سلطانِ اعظم ہرکارہ خبر لایا ہے کہ —

باز بہادر : ہم ہر قسم کی خبر سننے کو تیار ہیں بیان کرو۔

شخص : ایک ایک سپاہی سلطانِ اعظم پر قربان ہو گیا۔ مغل فوجیں تیزی سے شادی آباد کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ حکم ہو تو قلعہ کے دروازے بند کردیے جائیں۔

باز بہادر : (غصہ سے) نہیں۔ کٹہرے میں بند ہو کر صرف غرایا جاسکتا ہے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر مغل جنگل کے قانون پر یقین رکھتے ہیں تو انھیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ شیر اسی وقت تک کچھار میں سوتا رہتا ہے جب تک اسے چھیڑا نہ جائے۔ چھیڑے جانے پر چھیڑنے والا اس کے غیض و غضب سے نہیں بچ سکتا۔ جاؤ بوستان خان سے کہو کوچ کا نقارہ بجوایا جائے ہم خود جاکر مقابلہ کریں گے۔

شخص : جو حکم سلطانِ اعظم

(سلام کرکے چلا جاتا ہے)

باز بہادر : مغل شاید ان افغانی تلواروں کو بھول گئے ہیں جنھوں نے انھیں ڈھکیل ڈھکیل کر ایرانی سرحدوں میں پہنچا دیا تھا۔ شاید وہ ان شیر شاہی توپوں کی گرج کو

بھی بھول گئے جو آج تک ان کے قلعوں میں گونج رہی ہیں۔

(باہر سے نقارہ کی آواز۔ اسی وقت ایک بوڑھی عورت جس کے چہرے پر تقدس ہے، آتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں قرآن شریف ہے۔ اس کے پیچھے ایک اور عورت ہے جس کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ بوڑھی عورت قرآن آگے کرتی ہے۔ باز بہادر قرآن لے کر چومتا اور آنکھوں سے لگاتا ہے۔ بوڑھی عورت قرآن لے کر دوسری عورت کو دیتی ہے)

باز بہادر : مادر مہربان دعا کیجیے گا کہ ہم سرخرو واپس آئیں۔

(بوڑھی عورت ایک تعویذ اس کے گلے میں ڈالتے ہوئے)

بوڑھی عورت: نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِیْب۔ (دوسری عورت سے تلوار لے کر باز بہادر کو دیتے ہوئے) یہ میرے باپ کی وہ مقدس تلوار ہے جو مغلوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے میں استعمال کی گئی تھی۔

(باز بہادر ادب سے تلوار لے کر کمر میں باندھتا ہے اور بوڑھی عورت کو ادب سے سلام کرتا ہے۔ پھر روپ متی سے مخاطب ہو کر)

باز بہادر : اگر خدانخواستہ آپ ہمارے متعلق کوئی منحوس خبر سنیں تو یہ آپ کی ذمہ داری ہوگی کہ شادی آباد کی کسی بے گناہ عورت کا سہاگ نہ لٹے اور کسی ماں کی گود سونی نہ ہو۔ (روپ متی اپنا پیش قبض باز بہادر کی کمر میں لگاتی ہے) یہ تو آپ کی حفاظت کے لیے ہے روپ۔

روپ متی : بھگوان کے بعد باز کے بازو ہماری حفاظت کے لیے کافی ہیں۔

باز بہادر : الوداع۔

روپ متی : بھگوان کو سونپا۔

(بوڑھی عورت قرآن شریف لے کر دونوں ہاتھوں سے اونچا اٹھاتی ہے۔ باز بہادر جھک کر اس کے نیچے سے نکلتا ہے)۔

بوڑھی عورت: خدا حافظ

(باز بہادر تیزی سے سیڑھیاں اتر کر باہر چلا جاتا ہے۔ باہر سے آوازیں۔
سلطان باز بہادر زندہ باد۔ مہاراج باز بہادر کی جے۔ نقارہ کی آواز دور ہوتی
جارہی ہے اور پھر ختم ہو جاتی ہے۔ روپ متی خاموش کھڑی رہتی ہے۔ کچھ دیر
بعد ایک درد بھری آواز)

آواز : یارب عظیم۔ کیا ایک افغان میدان جنگ میں نہیں بندی خانہ میں گھٹ گھٹ
کر جان دے گا۔

روپ متی : یہ کس کی آواز ہے۔

عورت : اسد خاں کی۔ جو بندی خانہ میں بند ہے۔

روپ متی : (سوچ کر) اسے ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔

(عورت تیزی سے اتر کر جاتی ہے اور کچھ دیر بعد اسد خان کو لے کر آتی
ہے۔ اسد خان ادب سے روپ متی کو سلام کرتا ہے)

روپ متی : آؤ اسد خان۔ ایک بہادر افغان کا صحیح مقام بندی خانہ نہیں میدانِ جنگ ہے
(ایک تلوار دے کر) یہ وہ تلوار ہے جو کئی معرکوں میں مہاراج کے زیب
کمر رہی ہے۔

اسد خانؔ : (ادب سے تلوار لے کر) مہارانی۔ اسد خان اس تلوار کا حق ادا کرے گا۔ اور
وعدہ کرتا ہے کہ آپ کا شکریہ ادا کرنے ضرور آئے گا۔

(اسد خان تیزی سے زینہ کی طرف جاتا ہے)

روپ متی : اسد خان۔ تم ہماری سواری کا خاص گھوڑا بھی لے جاسکتے ہو۔

اسد خان : شکریہ مہارانی

(زینہ اتر کر تیزی سے بھاگتا ہوا باہر چلا جاتا ہے۔ روپ متی بوڑھی عورت سے)

روپ متی : مادر مہربان۔ آپ بھی جا کر خدا سے ہماری کامیابی کی دعا کیجیے۔

(عورت، اور بوڑھی عورت چلی جاتی ہے۔ روپ متی خاموش کھڑی رہتی ہے کہ
اندھے فقیر کی آواز آتی ہے)

اندھافقیر: نہیں ساقیا مجھ کو کوئی طلب بتاؤں مگر کیا میں اس کا سبب
ہٹا سامنے سے میرے جام سے مرے دل کو بھاتی نہیں کوئی شے
یہاں تو اداسی ہے تنہائی ہے بلا سے کہیں بزم آرائی ہے
یہ جو زندگی ایک آزار ہے مرا دل خود اس سے بیزار ہے
مری زندگی میں اجالا نہیں چراغ تمنا بھی جلتا نہیں
عجب یہ زمانے کا ہے فیصلہ کہ جل کر بچھڑنا مقدر ہوا
جدا گوشت ناخن سے ہونے لگا مرا یار مجھ سے بچھڑنے لگا
خدا جانے کیا ہے اس کا سبب بچھڑنے کی خاطر ہی ملتے ہیں سب

(روپ متی خاموش کھڑی دور خلاء میں دیکھ رہی ہے آہستہ آہستہ سایے بڑھنے لگتے ہیں جیسے دن ڈھل رہا ہو کہ اسد خان زخموں سے چور آتا ہے اور زینہ کے پاس آکر گر پڑتا ہے۔ روپ متی تیزی سے اتر کر نیچے آتی ہے اور بیٹھ کر اسد خاں کا سر اپنے زانوؤں پر رکھتی ہے۔ اسد خاں نحیف آواز میں)

اسد خان : مہارانی ہمارا سب کچھ لٹ گیا۔ (اپنی مٹھی کھول کر روپ متی کی طرف کرتے ہوئے) یہ ہیبت خاں کی وہ منحوس زبان ہے جس سے اس نے سلطانِ اعظم سے گستاخی اور مغلوں سے وفاداری کا اعلان کیا تھا۔

(کچھ دیر بعد اسد خان کی گردن ایک طرف کو ڈھلک جاتی ہے)

تیسرا ایکٹ ـــــ پہلا سین

(باز بہادر کا دربار ہال۔ باز بہادر کے تخت پر ادھم خان بیٹھا ہے۔ اس کے آس پاس اس کے فوجی افسر کھڑے ہیں۔ ادھم خان ایک افسر کی طرف دیکھ کر)

ادھم خاں : طغرل بیگ

طغرل بیگ: (تھوڑا جھک کر) خانِ اعظم

ادھم خان : ان مغرور افغانوں کی اس طرح سرکوبی کی جائے کہ یہ دوبارہ سر اٹھانے کی ہمت نہ کر سکیں۔

طغرل بیگ: خانِ اعظم۔ سڑکیں ویران اور گھر سنسان کیے جا چکے ہیں اور شادی آباد کو قبرستان بنایا جا چکا ہے۔

ادھم خان : (ہنس کر) خوب۔ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

(ایک سپاہی اندر آکر سلام کر کے)

سپاہی : رانی روپ متی نے آپ کو کوئی پیغام بھیجا ہے۔

ادھم خان : (قہقہہ مار کر) ہارے ہوئے جواری کی کٹی ہوئی قسمت اور رانی (مغرور لہجے میں) پیغام بر کو حاضر کرو۔ ہم پیغام ضرور سنیں گے۔

(سپاہی چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد بوڑھی عورت آتی ہے۔ ادھم خان اس کے چہرے کے تقدس کو دیکھ کر سکتے میں رہ جاتا ہے پھر خود پر قابو پا کر)

ادھم خان : کیا افغانوں میں مردوں کا اس قدر قحط پڑ گیا ہے کہ عورتوں سے پیغام رسانی پر مجبور ہو گئے ہیں۔

بوڑھی عورت: ہم صرف یہ کہنے آئے ہیں کہ بے گناہوں کا خون کرنا خدا کو پسند نہیں۔

ادھم خان : میدانِ جنگ میں کون ظالم ہے اور کون مظلوم یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔

بوڑھی عورت: شادی آباد کی سڑکیں، مکانات، کھیت کھلیان، اور باغات میدانِ جنگ نہیں ہیں۔ کوسوں دور میدانِ جنگ میں قسمتوں کا فیصلہ ہو چکا ہے۔

ادھم خان : (فخریہ) اور قسمت نے ہمارا ساتھ دیا ہے۔

بوڑھی عورت: اور خدا کے بخشے ہوئے اس انعام کی تو بے حرمتی کر رہا ہے ناشکری کر رہا ہے— اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے اس سے ڈر— رانی روپ متی نے صرف اتنا کہا ہے کہ بے گناہوں کا قتلِ عام بہادروں کو زیب نہیں دیتا۔

(جواب کا انتظار کیے بغیر چلی جاتی ہے۔ ادھم خان کچھ دیر سکتے کے عالم میں بیٹھا رہتا ہے۔ پھر آہستہ سے)

ادھم خان : یہ کون عورت تھی جو خدا کا حکم ہمیں سنانے آئی تھی۔

ایک درباری: خانِ اعظم کہا جاتا ہے کہ اس نے سات حج کیے ہیں۔ حافظِ قرآن ہے۔ تین سو حافظ عورتیں رات دن اس کے ساتھ عبادت میں مشغول رہتی ہیں۔

ادھم خان : (طنزیہ) باز بہادر نے عبادت کو بھی پیشہ بنا دیا تھا کہ عورتیں عبادت کے لیے نوکر رکھی جاتی تھیں۔

(ایک شخص اندر آکر)

شخص : خانِ اعظم۔ اطلاع ملی ہے کہ رانی روپ متی کا ایک قاصد ظلم و ستم کی داستان بیان کرنے کے لیے آگرہ روانہ ہوگیا ہے۔

ادھم خان : اور تم نے اسے نکل جانے دیا۔ (شخص گردن جھکا لیتا ہے۔ ادھم خان کچھ سوچ کر) جانے دو۔ اکبر کو اگر اکبر اعظم بننا ہے تو اسے ہمیشہ ادھم خان کی ضرورت رہے گی۔

(قہقہہ مار کر ہنستا ہے)

تیسرا ایکٹ —— دوسرا سین

(روپ متی پویلین۔ رات کا وقت۔ باریک پردے گرے ہوئے ہیں اندر ایک شمع روشن ہے، نیم تاریکی میں روپ متی کا سایہ ٹہلتا نظر آرہا ہے باہر دو عورتیں ننگی تلواریں لیے پہرہ دے رہی ہیں کہ ایک شخص جس نے اپنا چہرہ چھپا رکھا ہے آہستہ آہستہ چوکنے انداز میں چڑھ کر اوپر آتا ہے۔ پہرے دار عورتیں اپنی تلواریں اس کے سینہ کی طرف کرکے اسے روک دیتی ہے۔)

پہلی عورت : کون ہو تم

مرد : (تیزی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر) خاموش بے وقوف ادھم خان کے جاسوس ہر طرف موجود ہیں۔ میں نادر خان ہوں۔ مہارانی سے کہو میں کچھ

عرض کرنا چاہتا ہوں۔

(دوسری عورت اندر جاکر)

دوسری عورت: مہارانی۔ نادر خان آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔

روپ متی : کون نادر خان؟ ہیبت خان کا لڑکا؟

دوسری عورت: جی ہاں مہارانی

روپ متی : وہ ہم سے کیا عرض کرنا چاہتا ہے۔ (عورت خاموش رہتی ہے۔ روپ متی پردے کے پاس آکر) نادر خان۔ اب تم ہم سے اور کیا چاہتا ہے؟

نادر خان : اپنے ناکردہ گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں مہارانی۔ خدا گواہ ہے کہ میں وہ نہیں ہوں جو میرا کم بخت باپ تھا۔

روپ متی : اور اتنی سی بات کہنے تم چوروں کی طرح چھپ کر یہاں آئے ہو۔

نادر خان : جی نہیں۔ ایک بڑے مقصد کے لیے۔

روپ متی : کیا تمھارے باپ کے مقصد سے بھی بڑا تمھارا کوئی مقصد ہے۔

نادرخان : میں نے آپ کو کسی محفوظ مقام پر پہنچانے کے انتظامات مکمل کر لیے ہیں۔ خدا را مہارانی مجھ پر بھروسہ کیجیے۔

روپ متی : ہم شادی آباد کو نہیں چھوڑ سکتے۔

نادر خان : شاید آپ مجھ پر بھروسہ نہیں کر رہی ہیں۔

روپ متی : اب ہمیں صرف بھگوان پر بھروسہ ہے۔

نادر خان : مہارانی۔ افغان صرف لڑائی ہارے ہیں ہمت نہیں۔ غیور افغان آپ کو اپنی ماں سمجھتے ہیں اور آپ پر اپنی جانیں قربان کرنے کو اپنی سعادت۔

روپ متی : ہم افغانوں کے شکرگزار ہیں۔ لیکن مہاراج نے یہاں کی عورتوں اور بچوں کی حفاظت ہمارے سپرد کی تھی اس لیے ہم شادی آباد کو نہیں چھوڑ سکتے۔

نادر خان : ادھم خاں کمینہ اور خنزیر کی اولاد ہے اس سے کسی بھلائی کی توقع بیکار ہے۔

روپ متی : ہم اپنی قسمت پر شاکر ہیں۔ شکریہ نادر خان۔ اب تم جاسکتے ہو۔

نادر خان : مگر مہارانی—

(روپ متی پردے کے پاس سے ہٹ جاتی ہے۔ ترکن نادر خان کو تلوار سے جانے کا اشارہ کرتی ہے۔ نادر خان مایوسی کے انداز میں آہستہ آہستہ زینہ اترتا ہے)

تیسرا ایکٹ—— تیسرا سین

(بوستان خان کی حویلی جہاں وہ نظر بند ہے اور غور وفکر کے عالم میں ٹہل رہا ہے کہ نادر خان آتا ہے۔ بوستان خان اسے دیکھ کر)

بوستان خان: نادر خان— تم—

نادر خان : (گردن جھکا کر) جی ہاں۔ بد بخت باپ کی بدنصیب اولاد۔

بوستان خاں: لیکن تم یہاں تک پہنچے کیسے؟

نادر خان: ادھم خان کو یہ یقین دلا کر کہ میں آپ کو آپ کا فیصلہ بدلنے پر مجبور کردوں گا۔

بوستان خان: (غصہ سے) تم سمجھتے ہو کہ تمھارے کہنے پر ہم اپنا فیصلہ بدل دیں گے۔

نادر خان: ہرگز نہیں۔ (بوستان خان کے قریب آکر) میں ایک اور مقصد کے لیے حاضر ہوا ہوں۔

بوستان خان: ایک اور مقصد!

نادر خان: جی ہاں۔ مہارانی کو آزاد کرانے کے مقصد سے ۔ ہمیں آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ (بوستان خان مشکوک نظروں سے نادر خان کو دیکھتا ہے۔) عم محترم خدا کے لیے مجھ پر بھروسہ کیجیے۔ (بوستان خان خاموش رہتا ہے) میں ہی اندھے فقیر کے ذریعے اسد خان کو خبریں بھیجا کرتا تھا۔

بوستان خان: تم— (نادر خان سر جھکا لیتا ہے۔ بوستان خان کچھ سوچ کر۔ جیسے وہ ابھی نادر خان کی طرف سے مشکوک ہے) ہم خود نظر بند ہیں تمھاری کیا مدد کرسکتے ہیں۔

نادر خان : آپ ایک مرتبہ اجازت دے دیجیے پھر جس طرح بھی ہوگا ہم آپ کو یہاں سے نکال لیں گے۔ (بوستان خان کوئی جواب نہیں دیتا اور ٹہلنے لگتا ہے۔ نادر خان کچھ دیر خاموش رہ کر) اگر ہم ایک غدار کی طرح آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہوں تو سمجھ لیجیے گا کہ ہماری ماں ہمارے باپ کی وفادار نہیں تھی اور ہماری پیدائش مشکوک حالات میں ہوئی ہے۔

بوستان خان: (ایک دم مڑ کر) اپنی ماں کو اتنی بڑی گالی نہ دو نادر خان اس کی رگوں میں۔ غیور افغانوں کا خون ہے۔ ہم تم پر اعتماد کرتے ہیں۔

(نادر خان اس کے ہاتھ چوم کر)

نادر خان : آپ نے ہم پر اعتماد کرلیا ہم نے آدھی لڑائی جیت لی۔ ہمیں اب صرف آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ آپ کا یہاں سے نکل جانا بہت ضروری ہے۔

بوستان خان: (کچھ دیر خاموشی سے ٹہلتا ہے۔ پھر نادر خان کے پاس رک کر) نادر خان، تم مہارانی کو یہاں سے نکال لے جانے کی کوشش کرو۔ ہم اس وقت تک محفوظ ہیں۔ جب تک ادھم خان کو یہ امید ہے کہ امن قایم کرنے میں ہم اس کی مدد کرسکتے ہیں۔

نادر خان: عم محترم۔ ادھم خان خنزیر کی اولاد ہے اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔

بوستان خان: کوئی فاتح اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھ سکتا جب تک اسے کچھ غدار نہ مل جائیں۔ وہ ہمیں ہر قسم کے لالچ دے رہا ہے وہ ہمیں خرید لینا چاہتا ہے اور جب تک وہ مایوس نہیں ہوجاتا ہم محفوظ ہیں— تم مہارانی سے ملنے کی کوشش کرو۔

نادر خان : میں ان سے مل چکا ہوں مگر انھوں نے مجھ پر بھروسہ نہیں کیا۔ آپ ایک مرتبہ اجازت تو دے دیں اگر ہم آپ کو نکال لے جانے میں کامیاب ہوگئے تو ایک بڑی طاقت بن جائیں گے پھر مہارانی کو نکال لینا زیادہ مشکل نہ ہوگا۔

بوستان خان: اور اس سے دشمن چوکنا ہوجائے گا۔ جو طاقت تم ہماری آزادی کے لیے

صرف کرنا چاہتے ہو وہ افغانوں کی آزادی اور مہارانی کو کسی محفوظ مقام پر پہنچانے میں صرف کرو۔ ہمارا کیا ستر برس کے ہوچکے ہیں موت ہمیں آواز دے رہی ہے ہم اس موت کو خوشی سے لبیک کہیں گے جو ادھم خان کی تلوار سے آئے۔

نادر خان : (مایوسی کے لہجے میں) عم محترم۔

بوستان خان: (بات کاٹ کر) نادر خان۔ (آگے بڑھ کر اس کی پیشانی چوم کر) مہارانی کو کسی طرح یہاں سے نکال لے جاؤ۔ یہی ہماری سب سے بڑی خواہش ہے ہم تمھاری کامیابی کے لیے دعا گو رہیں گے (نادر خان مایوسی سے بوستان خان کو دیکھتا ہے) کسی طرح بھی یہ خبر مہارانی تک پہنچا دی جائے گی کہ وہ تم پر بھروسہ کریں۔

نادر خان : عم محترم۔

(جذباتی انداز میں بوستان خاں سے گلے ملتا ہے)

تیسرا ایکٹ——— چوتھا سین

(باز بہادر کا دربار ہال۔ ادھم خان تخت پر بیٹھا ہے۔ کچھ اور لوگ بھی موجود ہیں۔ ایک رقاصہ رقص کررہی ہے۔ ادھم خان اس کے رقص سے متاثر ہوکر)

ادھم خان : بخدا ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ اکھڑ افغان ایسے فنکاروں کی سرپرستی بھی کرسکتے ہیں۔

ایک شخص : جہاں کی رانی رقص و موسیقی کی آفتاب ہو وہاں ان کنیزوں کی کیا حیثیت ہوسکتی ہے۔

ادھم خان : روپ متی کی فنکاری کے چرچے ہم نے آگرہ دربار میں بھی سنے تھے۔

(طغرل بیگ گھبرایا ہوا داخل ہوکر)

طغرل بیگ: خانِ اعظم۔ بوستان خان کو آزاد کرانے کے لیے افغانوں نے مغل سپاہیوں پر حملہ کر دیا ہے سخت کشت و خون ہو رہا ہے۔

ادھم : (غصہ سے کھڑے ہوکر) اور تم بزدلوں کی طرح یہ خبر ہمیں سنانے آئے ہو۔ اگر تم افغانوں کی کھوپڑیوں کا مینار بنا کر اس پر مغلوں کا جھنڈا نصیب کر کے آتے تو ہمیں خوشی ہوتی۔

طغرل بیگ: وہاں مرزا خان موجود ہیں وہ آپ کی خواہش پوری کر دیں گے۔

(ادھم خان سوچتا ہے پھر ایک دم)

ادھم خان : یہ ان ناہنجار افغانوں کی چال معلوم ہوتی ہے۔ کہیں وہ ہماری توجہ اس طرف موڑ کر روپ متی کو تو آزاد کرانا نہیں چاہتے۔ طغرل بیگ تم کمک لے کر روپ متی کے محل پر فوراً پہنچو۔

(طغرل بیگ سلام کر کے تیزی سے جاتا ہے۔ ادھم خان تخت پر بیٹھ کر)

ادھم خان : رقص جاری ہو۔

(رقاصہ پھر ناچنے لگتی ہے)

تیسرا ایکٹ —— پانچواں سین

(روپ متی پویلین۔ زینہ کے نیچے مغل سپاہی پہرہ دے رہے ہیں اور پردے کے پاس دو عورتیں ننگی تلواریں لیے کھڑی ہیں کہ کچھ سنیاسی گاتے ہوئے آتے ہیں)

سنیاسیوں کا گانا

دنیا ساری سمجھو جھوٹی جھوٹا سب سنسار رے
کایا جھوٹی مایا جھوٹی جھوٹا جگ بیوپار رے
مال خزانہ دھن دولت سب جوبن اور جوانی رے
آوے اِت سے جاوے اُت کو جیسے جل کی دھار رے

آرام میں جو رام کو بھولے   تکلیف میں وہ ڈوبے گا
ہر دم طالب ہو ہر کا   ہے بے رم سنسار رے

سپاہی : اے تم لوگ کون ہو اور ادھر کہاں چلے آرہے ہو۔

سنیاسی : ہم سنیاسی ہیں بابا۔ ہمارے لے ہمارا استھان ہے۔ زبدا میا کی پریکرما کو نکلے ہیں۔

سپاہی : مگر ادھر تمھاری زبدا میا نہیں ہے۔

سنیاسی : (بلند آواز سے) زبدا میا کی جے۔

(سب سنیاسی زبدا میا کی جے پکارتے ہیں۔ اور چھپی ہوئی تلوار نکال کر سپاہیوں پر حملہ کر دیتے ہیں۔ چیخ پکار شور وغل — ایک سنیاسی تیزی سے زینہ پر چڑھتا ہے کہ طغرل بیگ سپاہیوں کے ساتھ آتا ہے اور 'مہابلی کی جے' کا نعرہ لگا کر لڑائی میں شامل ہو جاتا ہے۔ زینہ پر چڑھتا ہوا سنیاسی پھر واپس آکر لڑائی میں شامل ہو جاتا ہے لیکن اپنی کم تعداد دیکھ کر زور سے چلاتا ہے۔ ''زبدا میا کی جے۔'' سب سنیاسی زبدا میا کی جے پکارتے ہیں اور بھاگ جاتے ہیں)

تیسرا ایکٹ —— چھٹا سین

(ادھم خاں تخت پر بیٹھا ہے۔ اس کے آس پاس اس کے امراء اور فوجی افسر کھڑے ہیں جن میں نادر خان بھی ہے۔ ادھم خان کے سامنے بوستان خان مطمئن انداز میں کھڑا ہے۔ ادھم خان کچھ دیر خاموش رہ کر)

ادھم خان : بوستان خان۔ ہم نے آپ کی بزرگی کا احترام کرتے ہوئے آپ کو کافی وقت دیا کہ آپ ہماری پیش کش پر غور فرما لیں۔ آپ کو بے عزت کرکے ہمیں تکلیف ہوگی۔

بوستان خان: عزت اور ذلت خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ عزت نہ کسی کے دیے سے ملتی ہے اور نہ کسی کے چھیننے سے چھنتی ہے۔

ادھم خان : اب ہم آپ کو زیادہ وقت دے کر شورش اور بدامنی کو برداشت نہیں کرسکتے۔

بوستان خان : شورش اور بدامنی کو روکنا حاکم کا کام ہے۔ ہمارا نہیں۔
ادھم خان : کل کی شورش میں پچاس سے زیادہ مغل سپاہیوں کی قیمتی جانیں ضائع ہوئی ہیں۔
بوستان خان: اور ان سے کہیں زیادہ پُرامن شہریوں کی لاشیں سڑکوں پر پڑی سڑ رہی ہیں۔ وہ جانیں بھی بے قیمت نہیں تھیں۔
ادھم خان: انھوں نے بغاوت کی، سزا پائی۔
بوستان خان: آزادی کے لیے تلوار اٹھانا بغاوت نہیں ہوتی۔
ادھم خان: ہم آپ کو فیصلے کرنے کے لیے ایک دن کی مہلت اور دیتے ہیں۔ اگر پھر بھی آپ نے فیصلہ نہیں کیا تو مجبوراً آپ کو پابجولاں آگرے بھیجنا پڑے گا۔
بوستان خان: اگر تم ہمارا سر بھیجو گے تو ہم خود کو زیادہ خوش قسمت سمجھیں گے۔
ادھم خان : طغرل بیگ۔ ہم روپ متی کا فیصلہ سننے کے منتظر ہیں۔
طغرل بیگ : مغرور سر ابھی تک جھکنے سے انکار کر رہا ہے۔
ادھم خان : (فخریہ انداز میں) اور ہم مغرور سر جھکانے کے لیے پیدا ہوئے ہیں (مسکرا کر) خیر پیاسا ہی کنویں کے پاس جاتا ہے، ہم خود جائیں گے۔
(نادر خان ایک دم مشتعل ہوکر اپنا پیش قبض نکالتا ہے اور پھینک کر ادھم خان کو مارنا چاہتا ہے کہ پاس کھڑا ہوا ایک فوجی افسر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ ادھم خان غصہ سے کھڑے ہوکر)
ادھم خان : نادر خان—
نادر خان : ادھم خان۔ تم وہ خنزیر ہو جسے کسی رانی کے متعلق گفتگو کرنے کا بھی سلیقہ نہیں۔ تمھارے بوجھ سے دنیا کو ہلکا ہو جانا چاہیے۔
ادھم خان : ہمیں تمھارے باپ کا خیال ہے ورنہ—
نادر خان : اس ناپاک روح کا ہمارے سامنے ذکر نہ کرو ادھم خان جس پر ہماری آنے والی نسلیں لعنت بھیجیں گی اگر روز قیامت خدا نے ہم سے ہمارے باپ کے

لیے سزا تجویز کرنے کے لیے کہا تو ہم کہیں گے کہ اسے ذلیل ترین دوزخ میں رکھا جائے جو اسے قبول کرتے ہوئے اپنے وجود پر لعنت بھیجے۔

ادھم خان : (غصہ سے کانپتے ہوئے) طغرل بیگ۔ اس بے وقوف کی گردن شہر کے مصروف ترین چوراہے پر مار دی جائے کہ ایسے ناعاقبت اندیش نوجوان کو عبرت حاصل ہے۔ (کچھ فوجی نادر خان کو گھسیٹ کر لے جاتے ہیں)

تیسرا ایکٹ ــــــ ساتواں سین

(روپ متی پویلین۔ باریک پردے پڑے ہوئے ہیں۔ روپ متی کا صرف سایہ سا نظر آرہا ہے جو تخت پر نیم دراز بیٹھی ہے اس کے پاس ایک لڑکی کھڑی ہے۔ پردہ کے باہر دو عورتیں ننگی تلواریں لیے کھڑی ہیں۔ زینہ کے نیچے مغل سپاہی پہرہ دے رہے ہیں کہ ادھم خان تیز تیز قدموں سے آتا ہے اس کے ساتھ طغرل بیگ اور کچھ سپاہی ہیں۔ ادھم خان زینہ چڑھ کر پردے کے پاس پہنچتا ہے۔ عورتیں تلواروں سے اس کا راستہ روکتی ہیں۔ ادھم خان اپنی تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھتا ہے پھر کچھ سوچ کر ہٹا لیتا ہے۔ نوجوان لڑکی پردے کے پاس آجاتی ہے)۔

ادھم خان : جاکر کہو کہ قسمت کا فیصلہ دیکھ لینے کے بعد بھی یہ مغرور سر کیوں نہیں جھکا (نوجوان لڑکی روپ متی کے پاس جاکر)

نوجوان لڑکی: ادھم کہتا ہے کہ ــــ

روپ متی : اس سے کہو کہ ہمیں عزت سے زیادہ سر عزیز نہیں۔

(دوران گفتگو نوجوان لڑکی برابر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آتی جاتی رہتی ہے جیسے ایک کی بات دوسرے سے کہہ رہی ہو)

نوجوان لڑکی: مہارانی صاحبہ فرماتی ہیں کہ ــــ

ادھم خان : (غصہ سے) بدتمیز کنیز۔

نوجوان لڑکی: تمیز سے بولو۔ ہم کنیز نہیں رضیہ ہیں محترم بوستان خان کی عزت دار لڑکی۔

ادھم خان : (چند سیکنڈ رک کر) تو پھر تم بھی اپنے مغرور اور بے وقوف باپ سے کچھ زیادہ دانشمند نہیں۔

رضیہ : (طنزیہ) ہماری دانشمندی یا غیر دانشمندی کا فیصلہ کرنے کا اختیار تمھیں کس نے دیا ہے۔

ادھم خان : (فخریہ لہجے میں) ہماری تلوار نے۔ خیر کہو کہ میدانِ جنگ میں سر ہی نہیں عزت بھی ہاری جاتی ہے۔

روپ متی : کہو کہ میدانِ جنگ میں وہی سر کٹتے ہیں جنھیں عزت عزیز ہوتی ہے۔

ادھم خان : کہو کہ فاتح مفتوح کا سر ہی نہیں عزت بھی جیت لیتا ہے۔

روپ متی : کہو کہ شریف اور بہادر میدانِ جنگ میں اپنی بہادری کا ثبوت دیتے ہیں۔ ڈاکو اور لٹیرے گھروں کو لوٹتے اور عزت داروں کو بے عزت کرتے ہیں۔

ادھم خان : (حسرت سے) مفتوح کیا اور اس کی عزت کیا۔ کہو کہ یہ بے جا غرور دانشمندی کے خلاف ہے۔

روپ متی : ہمارا فیصلہ سنا دو کہ اپنی عزت پر ہم ہزاروں دانشمندیاں قربان کرسکتے ہیں۔

ادھم خان : (ایک دم بھڑک کر) اور ہمارا فیصلہ بھی سنا دو کہ ادھم خاں کو تڑپتی لاشیں، بلکتے بچے، سر پیٹتی بیوائیں، جلتے مکان اور اجڑے کھیت کھلیان بے حد پسند ہیں (مڑ کر اونچی آواز میں) طغرل بیگ (طغرل بیگ تیزی سے زینہ چڑھ کر اوپر آتا ہے) یہ مغرور عورت اس پنجرے سے باہر نہ جانے پائے اور نہ یہ کسی سے مل سکے۔

طغرل بیگ: حکم کی تعمیل کی جائے گی۔

ادھم خان : لشکر میں اعلان کرادیا جائے کہ شادی آباد کی ہر چیز تین دن کے لیے انھیں بخشی جاتی ہے ان کے کسی فعل کی باز پرس نہ ہوگی۔

(تیز تیز غصہ میں زینہ اترتا ہے)

تیسرا ایکٹ ـــــ آٹھواں سین

(بازار ویران اور سنسان ہے۔ اِدھر اُدھر لاشیں اور سامان بکھرا پڑا ہے۔ اندھا فقیر اپنی دھن میں گاتا ہوا گزر رہا ہے۔ لاشوں اور سامان سے ٹکرا رہا ہے۔ لاٹھی اور کٹورے کے پیسوں سے تال پیدا کرنے کی کوشش مگر کٹورے میں پیسے نہیں ہیں اس لیے صرف لاٹھی کی ہی آواز آرہی ہے)۔

اندھا فقیر:
لہو رنگ ساقی پلا دے شراب　　کہ ہے آتشِ غم میں دل بھی کباب
خوشی چار دن ساتھ دیتی نہیں　　غموں کی فراوانی رُکتی نہیں
بہت آج مغموم دل ہے مرا　　سرِ شام جیسے دیا بجھ گیا
اب اک غم زدہ دل کا سُن ماجرا　　مگر تو بھی دل اپنا تھامے ذرا
ہر اک لفظ کرتا ہے آہ و بکا　　ہر ایک حرف تصویرِ غم بن گیا
زبان چپ ہوئی قلم رک گیا　　عجب طرح سے دل کا ماتم ہوا
سناؤں میں کیا لفظ خاموش ہیں　　کہ صد چاک ہیں حرف غم کوش ہیں

(اندھا فقیر اپنی مخصوص جگہ پر جاکر سر جھکا کر بیٹھ جاتا ہے لاٹھی تال پیدا کرنے کے لیے زمین پر مارتا ہے)

تیسرا ایکٹ ـــــ نواں سین

(روپ متی پویلین۔ محافظ عورتیں ہٹا دی گئی ہیں۔ زینہ کے نیچے مغل سپاہی پہرہ دے رہے ہیں۔ رضیہ اور روپ متی پردے کے پیچھے نظر آرہی ہیں۔ روپ متی گاؤ تکیہ سے ٹکی بیٹھی ہے۔ رضیہ پاس کھڑی ہے روپ متی کچھ دیر بعد۔

روپ متی : رضیہ یہ پردے ہٹا دو۔

رضیہ : (ایک دم رو کر) نہیں مہارانی نہیں۔

روپ متی : (کھڑے ہوکر محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر) روتے نہیں ہیں رضیہ۔

کھیل ہمیں ہنستے ہنستے کھیلنا چاہیے چاہے وہ زندگی ہی کا کھیل کیوں نہ ہو (خود آگے بڑھ کر پردے ہٹا دیتی ہے۔ ذرا اونچی آواز سے) ادھم خان سے کہا جائے کہ ہم اس سے ملنا چاہتے ہیں۔

(ایک سپاہی تیزی سے جاتا ہے۔ رضیہ اور زیادہ ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ روپ متی رضیہ کی طرف مڑتی ہے کہ بوڑھی عورت زینہ کے پاس آتی ہے۔ مغل سپاہی اسے زینہ چڑھنے سے روک دیتا ہے)

بوڑھی عورت: میں کوئی جاسوس نہیں ہوں۔ صرف دعائیں دینے آئی ہوں۔

(بوڑھی عورت کی آواز سن کر روپ متی پھر پلٹتی ہے)

سپاہی : تم اپنے لیے دعا کرو کہ خدا تمھاری مشکل آسان کرے۔

بوڑھی عورت : ہم خدا کے خوف سے ہر وقت کانپتے رہتے ہیں تو اپنی سوچ جو خدا کو چھوڑ کر ادھم کی پوجا کرتا ہے۔

سپاہی : (چند سیکنڈ رک کر) حاکم کا حکم ماننا ہمارا فرض ہے۔

بوڑھی عورت: وہی حکم جو قرآن اور حدیث کے مطابق ہو۔

روپ متی : (تھوڑا آگے بڑھ کر) مادرِ مہربان آپ نے کیوں تکلیف فرمائی کہ ایک معمولی دربان آپ کی بےعزتی کر رہا ہے۔

بوڑھی عورت: میں خدا سے ہر دم دعا مانگتی ہوں کہ روزِ قیامت وہ مجھے اپنے دربار میں بے عزت نہ کرے۔

روپ متی: بوستان خان کی امانت ہماری سپردگی میں تھی لیکن اب شاید ہم اس کی حفاظت نہ کر سکیں اس لیے اسے آپ کی حفاظت میں دیتے ہیں۔

بوڑھی عورت: خدا سب سے بڑا محافظ ہے، ہم کیا، وہی اس کی حفاظت کرے گا۔

(روپ متی رضیہ کے پاس آکر جو ہچکیوں سے رو رہی ہے۔ کاندھے پر ہاتھ رکھتی ہے)۔

روپ متی : ہمیں حوصلہ دو رضیہ کہیں تمھارے آنسو دیکھ کر ہمارے قدم ڈگمگا نہ جائیں۔

رضیہ : (روتے ہوئے) لیکن آپ نے ادھم خان کو کیوں بلایا ہے، وہ وحشی ہے درندہ ہے۔

روپ متی : جب رعایا کی کسی کنیا کی لاج لٹتی ہے تو ہزاروں رانیوں کی لاج لٹ جاتی ہے۔ جب ایک سہاگن کا سہاگ لٹتا ہے تو ہزاروں رانیاں بیوہ ہوجاتی ہیں۔ کیا رعایا کے لاج اور سہاگ کی حفاظت کرنا ہمارا فرض نہیں ہے۔ دو دن سے جو کچھ ہورہا ہے ہم اسے برداشت نہیں کرسکتے۔ جاؤ رضیہ ادھم خان آتا ہوگا۔

رضیہ : بابا خان نے ہم سے کہا تھا کہ ہم ایک پل کے لیے آپ کو تنہا نہ چھوڑیں (خنجر نکال کر غصہ اور جوش سے) ابھی بوستان خان کی بیٹی کے خنجر کی دھار کند نہیں ہوئی ہے کہ کوئی اس زینہ پر چڑھنے کی جرأت کرسکے۔

روپ متی : بھگوان تمھارے خنجر کی دھار یوں ہی تیز رکھے۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) محترم بوستان خان نے یہ بھی کہا ہوگا کہ تم ہمارا کہا مانوگی۔ تم مادر مہربان کے ساتھ چلی جاؤ اس کے بعد ہم تم کو اور کوئی حکم نہ دیں گے۔ (رضیہ کا ہاتھ پکڑ کر زینہ تک لاتی ہے) جاؤ رضیہ بھگوان تمھاری رَکشا کرے۔

(رضیہ ایک مایوسی کی نظر ڈالتی ہے اور آہستہ آہستہ زینہ اتر کر بوڑھی عورت کے ساتھ جاتی ہے۔ روپ متی انھیں اس وقت تک دیکھتی رہتی ہے۔ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہوجائیں۔ پھر آکر تکیہ سے ٹیک کر بیٹھ جاتی ہے۔ انگوٹھی میں چھپا ہوا زہر کھاتی ہے اور چہرہ دوپٹہ سے چھپا لیتی ہے کچھ دیر بعد ادھم خان زینہ چڑھ کر آتا ہے۔ تخت کے پاس پہنچ کر طنزیہ لہجے میں)

ادھم خان : آخر یہ مغرور سر جھک کر ہی رہا۔ (قہقہہ مار کر) طاقت نے دانشمندی کی راہ دکھلا ہی دی۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) ہم اس روئے تاباں کے دیکھنے کے منتظر ہیں جس کے چرچے ہم آگرہ دربار میں سنا کرتے تھے۔ (ہنستا ہے پھر تلوار نیام سے نکال کر) بخدا ہم دلہنوں کے گھونگھٹ بھی تلوار کی نوک سے

اٹھاتے ہیں (تلوار کی نوک سے گھونگھٹ اٹھاتا ہے۔ دوپٹہ تلوار کی نوک میں الجھا چلا آتا ہے۔ ادھم خان روپ متی کو دیکھ کر گھبرا کر پیچھے ہٹ کر) یہ کیا کرلیا تم نے یہ کیا کرلیا۔

کچھ دیر سکتہ کے عالم میں کھڑا رہتا ہے۔ پھر اپنی تلوار روپ متی کے قدموں میں رکھ کر گردن جھکا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

(پردہ)

رسائل میں شائع ڈرامے

گورکن

کردار

(1) عیدو (گورکن) (2) سکینہ (عیدو کی بیوی) (3) شبراتی (عیدو کا لڑکا) (4) گلشن (ایک بھکارن) (5) پولیس انسپکٹر (6) زیدی، عمر (دو ڈاکٹر) (7) سپاہی، راہ گیر، جج، وکیل وغیرہ وغیرہ

پہلا ایکٹ

پہلا سین

منظر

(بڑے بڑے درختوں کے درمیان میں ایک قبرستان کا منظر۔ جھاڑیوں اور بڑے بڑے درختوں کے باعث سورج کی کرنیں اپنا راستہ بنانے سے مجبور ہیں۔ ہر طرف ایک وحشت ناک تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ چاروں طرف قبروں کے تودے ہیں جن میں کچھ خام ہیں اور کچھ پختہ قبریں ہیں۔ اکثر جگہ سے شکستہ ہو چکی ہیں۔ اس خاموشی میں بعض اوقات کتوں کے بولنے کی آوازیں آجاتی ہیں جس سے اس :   ور پراسرار خاموشی میں

وحشت کا اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ درختوں کے اِس جھنڈ میں کچھ سفید پوش لوگ کھڑے نظر آتے ہیں۔ مردہ دفن کیا جا چکا ہے۔ سب لوگوں کے ہاتھ دعائے مغفرت کے لیے اٹھے ہوئے ہیں۔ دعا کے بعد لوگ آہستہ آہستہ قبر کے پاس سے علیحدہ ہونے لگتے ہیں۔ کچھ لوگ پرانی قبروں پر سے گزر کر اور کچھ ان قبروں سے بچ بچا کر ایک پگڈنڈی پر سے گزرنے لگتے ہیں۔ پگڈنڈی کے دونوں جانب قبریں ہیں اور پگڈنڈی کے آس پاس فقیروں کا ایک جم غفیر ہے۔ عیدو اور شبراتی آہستہ آہستہ لوگوں کے پیچھے چل رہے ہیں۔ گو دوسرے لوگوں کے چہروں پر پریشانی اور خوف و ہراس ظاہر ہے لیکن عیدو اور شبراتی کے چہروں پر ایک اطمینان ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موت اور زندگی ان کے نزدیک بے معنی چیزیں ہیں۔ یا وہ اب ایسے واقعات کا اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ ان کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ شبراتی کے چہرہ پر ایک اطمینان بخش مسکراہٹ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دل ہی دل میں مسکرا رہا ہے۔ تین آدمی ان جانے والے لوگوں سے علیحدہ ہو کر رک جاتے ہیں۔ چہروں پر دوسروں کے مقابلہ میں غم اور رنج کے آثار زیادہ ہیں۔ رونے کے باعث آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں)

پہلا آدمی رُکنے کے بعد چاروں طرف دیکھ کر)۔

پہلا : عیدو بابا

(عیدو تیز تیز قدموں سے آگے آجاتا ہے اور تینوں کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اُمید و بیم کے چہرہ پر آثار ہیں اور کسی فائدہ کی اُمید سے آنکھیں چمک رہی ہیں۔ شبراتی بھی پاس آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پہلا جیب میں ہاتھ ڈال کر)

پہلا : بابا

عیدو : جی سرکار۔

پہلا : (عیدو کا چہرہ دیکھ کر) دیکھو بابا— چبوترہ ذرا ٹھیک سا بنا دینا۔

عیدو : سرکار!— یہ کام ہم لالچ سے نہیں فرض سمجھ کر کرتے ہیں۔

دوسرا : بابا— عالیشان مقبرہ بنوا دو— یا صرف مٹی کا ڈھیر لگوا دو— لیکن اِس سے ذرا ہمارے دل کو تسکین ہو جاتی ہے۔

تیسرا : (پُرحسرت لہجہ میں) کسی نے سچ کہا ہے:

"ہمیں کیا جو تربت پہ میلے رہیں گے
تہ خاک ہم تو اکیلے رہیں گے"

پہلا : (دو روپے دیتے ہوئے) یہ لو بابا۔

عیدو : (حیرت سے روپے دیکھتے ہوئے)— سی— سرکار۔

پہلا : (ایک روپیہ اور دیتے ہوئے) یہ اور لو— بابا۔

عیدو : (پہلے شخص کا چہرہ دیکھتے ہوئے) لیکن سرکار— ہمیں حق تو پورا ملنا چاہیے۔

دوسرا : (ذرا بگڑ کر) یہ حق کا کون سا وقت ہے؟— جو دے دیا لے لو۔

عیدو : لیکن سرکار ہمارے بھی تو بال بچے ہیں اِس پر ہماری زندگی کا دار و مدار ہے۔

دوسرا : لیکن تم لوگ تو یہ چاہتے ہو کہ لوٹ لو۔

شبراتی : لیکن ہم خیرات تو نہیں مانگ رہے— اپنا حق اور محنت ہی تو طلب کر رہے ہیں۔

دوسرا : (بگڑ کر) تو پھر کیا خزانہ لٹا دیں تم لوگوں کو— وقت بے وقت کی رٹ اچھی نہیں معلوم ہوتی۔

پہلا : ارے بھئی— ایسا نہ کہو— (ایک روپیہ اور دیتے ہوئے) یہ اور لو— عیدو بابا۔

(عیدو سلام کر کے روپیہ لے لیتا ہے۔ تینوں آہستہ آہستہ قدموں سے آگے بڑھنے لگتے ہیں پگڈنڈی کے دونوں جانب اپاہج قسم کے فقیر قطار در قطار بیٹھے ہیں۔ کوئی اپنی لنگڑی ٹانگ دکھا رہا ہے۔ کوئی کٹا ہوا ہاتھ۔ کوئی اپنا اندھا پن جتلا رہا ہے۔ کسی عورت کے پاس دو چار بچے رو رو کر ہمدردی کے طالب ہیں۔ لیکن سب کی آنکھیں ان تینوں آنے والے شخصوں پر جمی ہوئی ہیں۔

پہلا شخص ان لوگوں کو پیسے خیرات کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ باقی دونوں اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ ایک کونہ میں گلشن خاموش بیٹھی ہے۔ نوجوان ہے حسین ہے۔ میلے کچیلے کپڑے پہنے ہے جو اکثر جگہ سے پھٹے ہوئے ہیں اور مشکل اپنے جسم کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہے پہلا شخص اسے بھی پیسے دے کر آگے بڑھ جاتا ہے)۔

دوسرا : (گلشن کی طرف اشارہ کر کے تیسرے سے) ان لوگوں نے خیرات مانگنا پیشہ بنا رکھا ہے— بھلا ان کو دینے کا کیا ثواب؟

تیسرا : اچھی ہٹی کٹی ہے (گلشن سے) محنت مزدوری کیوں نہیں کرتی؟

(آگے بڑھ جاتا ہے۔ گلشن غصہ سے دونوں کو دیکھتی ہے۔ جب وہ دو چار قدم بڑھ جاتے ہیں تو طنزیہ لہجے میں)

گلشن : ہٹی کٹی ہے— جوان ہے— محنت مزدوری کیوں نہیں کرتی؟— (طنزیہ مسکرا کر)— تو کوٹھے پر بیٹھ جاؤں؟

(تینوں چلے جاتے ہیں اور فقیروں کا یہ قافلہ آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ گلشن پگڈنڈی پر سے اٹھ کر ایک پختہ قبر پر بیٹھ جاتی ہے۔ شبراتی تیز تیز قدموں سے قبروں کو کودتا پھاندتا آتا ہے اور پیچھے سے گلشن کو گدگدا دیتا ہے)

گلشن : (مصنوعی طور پر گھبرا کر) ہائے اللہ— یہ کون ہے؟

شبراتی : (قہقہہ لگا کر) کیوں ڈر گئی؟— بڑی بہادر بنتی ہے۔ تو تو—

گلشن : (شوخی سے) دیکھو جی— ہمیں یوں نہ ڈرایا کرو

شبراتی : چڑیا کا دل تیرے سینہ میں ہے— (اس کے پاس قبر پر بیٹھتے ہوئے) اچھا یہ بتا آج کتنے پیسے ملے۔

گلشن : (مسکرا کر) اِکنی دکھلاتے ہوئے) ایک آنہ—

شبراتی : بس (مسکرا کر) تجھ پر سے تو ایک روپیہ بھی قربان ہے۔

گلشن : چلو ہٹو جی۔۔ (شوخی سے) ہم سے ایسی باتیں نہ کیا کرو۔۔ موت پڑے ان مردوں پر۔۔ ایسے گھور گھور کر دیکھتے ہیں۔ جیسے کھا ہی تو جائیں گے؟

شبراتی : (مسکرا کر) تو ہے ہی ایسی چیز۔

گلشن : خیرات، رحم اور ہمدردی کے طور پر نہیں دیتے۔

شبراتی : (مسکرا کر) تیری جوانی اور حسن دیکھ کر دیتے ہیں۔

گلشن : اچھا یہ تو بتلاؤ۔۔ وہ جوڑے کا وعدہ کب پورا ہوگا۔

شبراتی : بہت جلد۔

گلشن : نامعلوم کتنے مہینے سے تو تسلی دے رہے ہو۔۔ اب یہ دیکھو (اپنا پھٹا کرتا اور پائجامہ دکھلا کر)۔۔ تار تار ہوگیا ہے۔

شبراتی : اب تجھے کیا بتلاؤں اپنی مشکلات۔ اچھا کچھ دن اور صبر کرلے۔ پھر تمام شہر میں تو ہی تو نظر آئے گی (دور سے عیدو کے چیخنے کی آواز آتی ہے۔۔ شبراتی بیٹا شبراتی)

شبراتی : (چیخ کر) آیا۔ بابا۔ (گلشن سے) بابا پکار رہا ہے۔۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ (شبراتی اٹھ کر جاتا ہے اور مڑ مڑ کر مسکرا کر گلشن کو دیکھتا جاتا ہے۔ گلشن حسرت سے شبراتی کو جاتے دیکھتی رہتی ہے)۔

(پردہ)

دوسرا سین

(ڈاکٹر زیدی کی تجربہ گاہ۔ رات کے تقریباً بارہ بجے ہیں۔ ڈاکٹر زیدی ایک آرام کرسی پر لیٹا ہوا آرام کررہا ہے۔ چشمہ اتار کر اس نے پاس ایک میز پر رکھ لیا ہے۔ سگریٹ کا دھواں تجربہ گاہ میں پھیل رہا ہے۔ کبھی کبھی آنکھیں بند کیے ہی کیے ڈاکٹر زیدی سگریٹ کا کش لگا لیتا ہے۔ کچھ دیر وہ اسی حالت میں تھکا ہوا لیٹا رہتا ہے۔ پھر اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ سگریٹ کے

دو چار مسلسل کش لیتا ہے اور پھر اٹھ کر تھکے تھکے قدموں سے چل کر ایک میز پر ایک لاش کی چیرا پھاڑی میں مشغول ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر عمر تیز تیز قدموں سے تجربہ گاہ میں داخل ہوتا ہے اور ڈاکٹر زیدی کے پاس جا کر رازدارانہ لہجہ میں)

ڈاکٹر عمر : ڈاکٹر! — پروفیسر ختم ہی ہونے والا ہے۔

ڈاکٹر زیدی: (کام چھوڑ کر ڈاکٹر عمر کی طرف دیکھ کر) — کیا مطلب؟

عمر : (قریب آ کر) ڈاکٹر بوس کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہو چکی ہیں۔ میں خود ڈاکٹر بوس سے ملا تھا۔

ڈاکٹر زیدی: (کچھ سوچتے ہوئے) اَب آخر کیا کیا جائے؟

ڈاکٹر عمر : جس طرح بھی ہو لاش حاصل کی جائے (رازدارانہ لہجہ میں) سنا ہے۔ ڈاکٹر بوس بھی لاش حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ڈاکٹر زیدی: تو آپ پروفیسر کی بیوی سے نہیں ملے۔

ڈاکٹر عمر : معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ وہ لاش کسی قیمت پر دینے کو تیار نہیں۔

(ڈاکٹر زیدی کسی گہری سوچ میں ٹہلنے لگتا ہے۔ کبھی سر ہلاتا ہے۔ کبھی آنکھیں مٹکاتا ہے۔ کبھی ہاتھوں سے کچھ اشارے کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی گہرے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ڈاکٹر عمر ایک آرام کرسی پر دراز ہو جاتا ہے اور سگریٹ جلا کر اس کے کش پر کش لگانے لگتا ہے۔ اس کے چہرہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی گہری سوچ میں ہے۔ ڈاکٹر زیدی آہستہ آہستہ قدموں سے ڈاکٹر عمر کے پاس آ کر)

ڈاکٹر زیدی: تعجب ہے۔ صرف پچیس سال کی عمر اور دماغی صلاحیتوں کا یہ عالم — (پھر کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے) پھر خود سے باتیں کرتے ہوئے) پروفیسر کے دماغ میں قدرت نے ضرور کوئی چیز رکھی تھی۔ جو عام لوگوں کو نصیب نہیں — (تیز تیز قدموں سے ڈاکٹر عمر کے پاس جا کر) — ڈاکٹر! پروفیسر کی لاش ضرور

حاصل کی جائے گی اور اس کے دماغ کا تجربہ کر کے ضرور کوئی نیا انکشاف کیا جائے گا۔

ڈاکٹر عمر : (کچھ سوچتے ہوئے) لیکن — آخر کیسے؟

ڈاکٹر زیدی: (بڑبڑاتے ہوئے) ضرور حاصل کی جائے گی۔ (کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے۔ سگریٹ جلا کر کش پر کش لیتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ قدموں سے ڈاکٹر عمر کے پاس جا کر) ڈاکٹر عمر! — تمھیں معلوم ہے کہ پروفیسر کون سے قبرستان میں دفن ہوگا۔

ڈاکٹر عمر : (غور سے ڈاکٹر زیدی کا چہرہ دیکھ کر) صحیح تو علم نہیں — مگر — شاید عیدوہی کے قبرستان میں ہو۔ کیونکہ پروفیسر کے ماں باپ کی قبریں وہیں ہیں۔

(ڈاکٹر زیدی پھر آہستہ آہستہ قدموں سے ٹہلنے لگتا ہے۔ پھر ڈاکٹر عمر سے مخاطب ہو کر)

ڈاکٹر زیدی: ڈاکٹر — اوّل تو اِس امر کی کوشش کرو کہ پروفیسر کی لاش حاصل کر لی جائے (سگریٹ کا کش لے کر) اور اگر نہ مل سکے تو یہ معلوم کرو کہ وہ کس قبرستان میں دفن کیا جاتا ہے — اور کس جگہ۔

ڈاکٹر عمر : میں خود اِس کی کوشش کر رہا ہوں۔ (کسی آئندہ کامیابی سے مسکرا کر) ہم ضرور تجربہ کر کے دنیا کے سامنے کوئی نئی چیز پیش کریں گے (اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور دروازہ کی جانب بڑھتا ہے)

(پردہ)

تیسرا سین

(قبرستان کے ایک حصہ میں جھونپڑی نما ایک مکان۔ مکان میں صرف ایک کمرہ اور کمرہ کے سامنے ایک دالان کمرہ کی مغربی دیوار میں ایک روشن دان ہے لیکن چونکہ دیواریں انتہائی نیچی نیچی ہیں۔ اِس واسطے یہی روشن دان کھڑکی

کا بھی کام دیتا ہے۔ رات کے تقریباً نو بجے ہیں۔ اِس واسطے اِس کھڑکی اور روشن دان میں سے صرف قبرستان کی تاریکی کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ کبھی کبھی اِس روشن دان سے سرد ہوا کے جھونکے داخل ہوجاتے ہیں۔ اِس مختصر کمرہ کے ایک کونہ میں باورچی خانہ کا سامان موجود ہے۔ ایک الگنی پر کپڑے لٹکے ہوئے ہیں۔ ایک کونے میں ایک چار پائی بچھی ہے۔ جس پر ایک کثیف اور میلا کچیلا بستر بچھا ہے۔ جنوبی جانب ایک دروازہ ہے۔ جس کے سامنے ایک دالان ہے اور دالان کے سامنے ایک بڑا سا میدان۔ اِس وقت کمرہ میں عیدو، شبراتی اور سکینہ ایک چٹائی پر بیٹھے ہیں۔ ان لوگوں کے درمیان ایک انگیٹھی رکھی ہے جس میں انگاروں کے مقابلہ میں دھواں زیادہ ہے۔ عیدو ایک چھوٹا سا حقہ گڑگڑا رہا ہے۔ ایک طاق میں ایک چھوٹا سا چراغ ٹمٹما رہا ہے جس کی روشنی عیدو کی غربت چھپانے کے واسطے انتہائی مدھم ہے)

سکینہ : (عیدو کا چہرہ دیکھ کر) آخر اب لونڈیا کی کچھ فکر کرو نا۔

عیدو : (کھوئے ہوئے انداز میں)۔۔۔ ہوں۔۔۔ میں بھی اسی فکر میں ہوں (حقہ گڑگڑا کر) لونڈیا کو گھر میں بٹھائے رکھنا کسے اچھا معلوم ہوتا ہے (پھر حقہ گڑگڑانے لگتا ہے)

سکینہ : ہاں جبھی لونڈیا جوان ہوجائے تو اس کی فکر کردینا ہی اچھا ہے۔ ایک ہمارا زمانہ تھا اور ایک یہ۔ جوان ہونے سے پہلے دیواریں کودنے لگتی ہیں۔

عیدو : (ٹھنڈی سانس بھر کر) کیا بتلاؤں۔ روزگار کی یہ حالت ہے کہ دوچار دن میں کہیں ایک مردہ کی شکل دکھائی دیتی ہے۔

سکینہ : ہماری ہی آنکھوں نے طاعون کا بھی دور دیکھا ہے (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہمارے ہی اِس قبرستان میں جنازوں کا میلہ سا لگا رہتا تھا۔

عیدو : اور سو سو خوشامدیں کرتے تھے۔ اِس زمانہ کے لوگوں کی نیتیں بھی اچھی تھیں اور اب یہ حالت ہے کہ اگر موقع ملے تو گورکن کے ہی کپڑوں کا کفن بنادیں۔

شبراتی : جب نیتیں اچھی تھی تو خدا کا قہر بھی جلد جلد نازل ہوتا تھا— اور جب سے یہ بگڑیں تو خدا نے بھی مخلوق کی طرف دیکھنا ہی چھوڑ دیا— (ٹھنڈی سانس بھر کر)— نہ وبا پھیلتی ہے اور نہ طاعون—

سکینہ : ان انگریز ڈاکٹروں نے تو سب روزی ہی ختم کردی۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) طاعون، ہیضہ اور وباؤں کو تو شہر میں گھسنے ہی نہیں دیتے۔

شبراتی : اگر کسی کے مرنے سے ہمارا پیٹ بھر جائے۔ تو اِن ڈاکٹروں کا کیا بگڑے۔

سکینہ : پھر ان کی جیب کیسے گرم ہو؟

(عیدو حقہ گڑگڑانے لگتا ہے۔ کچھ دیر خاموش رہتی ہے۔ صرف حقہ کی گڑگڑاہٹ آتی رہتی ہے۔ شبراتی اٹھ کر روشندان سے باہر دیکھنے لگتا ہے)

عیدو : (سکینہ سے مخاطب ہوکر) اب لڑکی کا معاملہ ہے کچھ برتن بھانڈے بھی ہوں۔ کچھ گہنا بھی ہو— کچھ کپڑے بھی ہوں۔ نہیں تو برادری والے ہی نام رکھیں گے۔

سکینہ : ہاں— یہ تو ہے ہی— لیکن ہماری دعا ہے کہ شادی کے بعد وہ خوش رہے

(عیدو حقہ گڑگڑانے لگتا ہے)

عیدو : (شبراتی سے مخاطب ہوکر) شبراتی بیٹا— تو نے اِس لونڈیا سے بھی کہہ دیا یا نہیں— (کیا سوچتے ہوئے) کیا نام ہے اِس کا— گلشن— اچھا گاتی ہے۔

شبراتی : (کھوئے ہوئے انداز میں) پرسوں جلسہ کے لیے (پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے) ہاں کہہ دیا ہے وہ آجائے گی۔

عیدو : جلسہ کا اور انتظام بھی تمھیں ہی کرنا ہوگا— اب میں بوڑھا ہوگیا ہوں ورنہ—

شبراتی : (اِسی طرح کھوئے ہوئے انداز میں) سب ٹھیک ہوجائے گا۔

(روشن دان سے باہر دیکھنے لگتا ہے۔ عیدو حقہ گڑگڑاتا ہے)

(پردہ)

چوتھا سین

(ڈاکٹر زیدی کی تجربہ گاہ۔ ڈاکٹر زیدی ایک آرام کرسی پر دراز ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض آرام کرنے کی خاطر لیٹا تھا اور لیٹے لیٹے سو گیا۔ جلا ہوا پورا سگریٹ ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا ہے۔ ڈاکٹر زیدی شب خوابی کا لباس نہیں پہنے ہے بلکہ وہی لباس پہنے ہے جو وہ اپنے تجربات کے دوران میں پہنتا ہے۔ گو دن کے ساڑھے دس بج رہے ہیں۔ لیکن تمام تجربہ گاہ میں ابھی تک روشنی ہے۔ اوزار آس پاس بکھرے پڑے ہیں۔ اسی میز پر ایک لاش رکھی ہے۔ لاش والی میز پر ایک بہت طاقتور بلب جل رہا ہے۔ ڈاکٹر کی آرام کرسی کے پاس ایک چھوٹی سی میز رکھی ہے جس پر سگریٹ کا ٹن، ماچس اور ایک کھلی ہوئی کتاب رکھی ہے۔ ایک کھلی ہوئی کتاب ڈاکٹر کے سینہ پر پڑی ہے جس سے ظاہر ہے کہ ڈاکٹر کتاب دیکھتے دیکھتے سو گیا ہے۔ ڈاکٹر عمر گھبرایا ہوا تجربہ گاہ میں داخل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زیدی کو سوتے دیکھ کر پہلے تمام کمرہ کی روشنیاں گل کر دیتا ہے گھڑی ساڑھے دس بجاتی ہے۔ ڈاکٹر عمر پہلے کشمکش و پیچ کی حالت میں تجربہ گاہ میں ٹہلتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر زیدی کے پاس جاتا ہے۔ اس کو آواز دینے کی کوشش کرتا ہے لیکن پھر رک جاتا ہے ٹن سے ایک سگریٹ نکال کر جلاتا ہے اور کچھ سوچ کر ڈاکٹر زیدی کے سینہ پر سے کتاب اٹھا لیتا ہے اور ڈاکٹر زیدی آنکھیں کھول کر دیکھتا ہے اور پھر آنکھیں بند کر لیتا ہے)

ڈاکٹر عمر : (آہستہ سے) ڈاکٹر صاحب — (ڈاکٹر زیدی آہستہ آہستہ آنکھیں کھولتا ہے) ڈاکٹر صاحب — (ڈاکٹر زیدی آنکھیں کھول کر ملتا ہے۔ پھر ڈاکٹر عمر کو دیکھ کر ایک دم چونک کر)

ڈاکٹر زیدی: کیوں ڈاکٹر؟

ڈاکٹر عمر : (رازدارانہ لہجہ میں) پروفیسر کا انتقال ہوگیا۔
ڈاکٹر زیدی: انتقال — (کچھ سوچ کر) کیا واقعی؟
ڈاکٹر عمر : ہاں ڈاکٹر صاحب — (سرگوشی کے لہجہ میں اور اُس کو دفن بھی کر دیا گیا۔
ڈاکٹر زیدی: (تعجب سے) — دفن؟ — کس وقت؟
ڈاکٹر عمر : (رازادانہ لہجہ میں) تقریباً 9 بجے — میں خود دفن میں شریک ہوا تھا — وہیں سے چلا آرہا ہوں — (آہستہ سے) عیدو ہی کے قبرستان میں دفن کیا گیا ہے۔
ڈاکٹر زیدی: ٹھیک ہے (تیزی سے کرسی سے اٹھتا ہے۔ سگریٹ جلاتا ہے۔ وہیں لباس تبدیل کرتا ہے۔ پھر ڈاکٹر عمر سے مخاطب ہوکر) بس چلو۔
ڈاکٹر عمر : (تعجب کے لہجہ میں) کہاں ڈاکٹر صاحب؟
ڈاکٹر زیدی: (دروازہ کی جانب جاتے ہوئے) میرے پیچھے پیچھے آؤ۔
(ڈاکٹر عمر ڈاکٹر زیدی کے پیچھے پیچھے تجربہ گاہ سے نکل جاتا ہے)
(پردہ)

پانچواں سین

(قبرستان کی پگڈنڈی پر عیدو۔ ڈاکٹر زیدی اور ڈاکٹر عمر کھڑے ہیں۔ ڈاکٹر زیدی کی نظریں عیدو کے چہرہ پر جمی ہوئی ہیں۔ عیدو کے چہرہ سے پریشانی ظاہر ہورہی ہے اور اس کے ساتھ چہرہ پر عجیب قسم کی کشمکش کے آثار ہیں۔ بار بار وہ گردن کو اس طرح جنبش دیتا ہے جیسے کوئی فیصلہ کرنے کے بعد اسے مسترد کر رہا ہے)

ڈاکٹر عمر : (عیدو کو مخاطب کرکے) — بابا — آخر ہرج ہی کیا ہے۔ ہمارا کام ہوجائے گا — تمھیں روپیہ مل جائے گا۔
عیدو : (گھبرا کر) تمھارے روپے تمھیں مبارک ہوں — میں مردہ فروش نہیں بن سکتا۔

ڈاکٹر زیدی: لیکن بابا—

عیدو : نہیں نہیں بابا— نہیں— میں ایمان نہیں بیچ سکتا۔

ڈاکٹر زیدی: بابا— تم اپنے فیصلہ پر دوبارہ غور کرو۔

عیدو : نہیں سب کچھ غور کر چکا ہوں۔ اب آپ زیادہ پریشان نہ کیجیے۔

(ڈاکٹر عمر اور ڈاکٹر زیدی غمگین قدموں سے پگڈنڈی پر چلنے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر عمر طنزیہ مسکرا کر اپنے آپ سے)

ڈاکٹر عمر : بھوکے مر رہے ہیں۔ لیکن ایمان اور مذہب نہیں بیچ سکتے— ہونہہ— واہ رائے مذہب اور ایمان— (نفرت سے) بے وقوف انسان۔

(ڈاکٹر زیدی اور ڈاکٹر عمر پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ قدموں سے جاتے رہتے ہیں۔ عیدو ایک پختہ قبر سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا ہے اور کسی گہری سوچ میں مبتلا ہو جاتا ہے)

عیدو : (بڑبڑاتے ہوئے) پانچ سو روپیہ— نہیں۔ نہیں۔ اے خدا مجھے اس لالچ سے بچا— میں لاشیں فروخت کر کے اپنی لڑکی کی شادی نہیں کرنا چاہتا (خاموش ہو جاتا ہے اور آنکھیں بند کیے بیٹھا رہتا ہے۔ شبراتی کچھ گنگناتا ہوا آتا ہے۔ عیدو کو اسی حال میں بیٹھا دیکھ کر گھبرا کر)

شبراتی : بابا—

عیدو : (ایک دم بیدار ہو کر) کون— بیٹا— کیوں؟

شبراتی : یہاں کیا کر رہے ہو۔

عیدو : کچھ بھی تو نہیں (کھڑے ہوتے ہوئے) ویسے ہی تھک گیا تھا— سوچا یہاں بیٹھ کر آرام کر لوں— تم یہاں کیا کر رہے ہو۔

شبراتی : قبر کا چبوترا بنا رہا تھا۔

عیدو : اچھا— (جاتے ہوئے) دیکھو بھئی ذرا ٹھیک سا بنانا— تم کام بگاڑتے بہت ہو۔

(عیدو چلا جاتا ہے۔ شبراتی کھڑا رہتا ہے۔ دور سے گلشن آتی دکھائی دیتی ہے۔ شبراتی مسکرا کر اسی پختہ قبر پر بیٹھ جاتا ہے۔ مسکراتی ہوئی آتی ہے اور شبراتی کے پاس قبر پر بیٹھ جاتی ہے)

شبراتی : (مسکرا کر)— کیوں ری آج بہت دیر لگا دی۔

گلشن : (خوشی سے تالیاں بجا کر) آج بڑا مزا آیا— ایک صاحب نے مجھے ایک آنہ دیا— ان کی میم صاحبہ کہنے لگیں۔ ایسی عورتیں ہی تو شریفوں کے گھر بگاڑتی ہیں۔

شبراتی : تو— پھر تو نے کیا کہا

گلشن : میں کیا کہتی— خاموش ہوگئی— صاحب کہنے لگا۔ تم بھی تو کئی گھر بگاڑ چکی ہو۔ میں تو مارے ہنسی کے لوٹن کبوتر بن گئی اور میم صاحبہ بھی ایسی کٹیں کہ واہ بس دیکھنے کا مزا تھا۔

شبراتی : اچھا چل ان باتوں کو رہنے دے۔ ایک بات سن— آج شام اپنے یہاں مجلس ہوگی۔

گلشن : (خوش ہوکر) اچھا۔

شبراتی : ہاں— اور سن— تجھے بھی گانا پڑے گا۔

گلشن : نہ بابا— مجھ سے یہ نہ ہوگا۔

شبراتی : (شرارت سے مسکرا کر) چل رہنے دے نظر لگ جائے گی کیا— دیکھ زیادہ نہ نا کر۔

(دونوں خاموش ہوجاتے ہیں۔ پھر گلشن اپنے پھٹے ہوئے کرتے کو دیکھ کر جس میں سے پیٹ نظر آرہا ہے)

گلشن : آخر وہ جوڑے کا وعدہ کب پورا ہوگا۔ مرد نہ معلوم پھٹے ہوئے کرتے میں سے کیا مسکرا مسکرا کر دیکھتے ہیں۔

شبراتی : (کچھ سوچ کر) میں خود فکر میں ہوں۔ بہت جلد بنوا دوں گا۔

گلشن : بس بس رہنے بھی دو۔۔۔ اگر ابھی تک دو چار کفن ہی چراتے تو میرا جوڑا بن جاتا (شبراتی کسی گہری سوچ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ گلشن اُسے سوچ بچار میں دیکھ کر) کیا سوچ رہے ہو۔

شبراتی : (ٹھنڈی سانس بھر کر) میں سوچ رہا ہوں گلشن کہ کچھ لوگ دنیا میں ایسے بھی ہیں۔ جن کو کفن کے واسطے سلک اور ریشمی کپڑے میسر ہیں۔۔۔ اور کچھ ایسے ہیں جو اپنا بدن بھی نہیں چھپا سکتے۔

گلشن : کہاں کی باتوں میں پڑے ہو۔۔۔ چھوڑو بھی۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔

شبراتی : (اِسی طرح کھوئے ہوئے انداز میں) آج جو پروفیسر دفن ہوا ہے۔ اِس کا کفن سِلک کا تھا گلشن۔

گلشن : (سمجھاتے ہوئے) دنیا کا کاروبار یوں ہی چلتا ہے۔ کوئی شال میں مست کوئی کھال میں مست۔

شبراتی : نہیں۔۔۔ (پرعزم لہجہ میں) یہی سوچنا تو حماقت ہے۔

گلشن : (بات ٹالنے کی غرض سے) اچھا آج کی مجلس میں تم بھی گاؤ گے نا۔

شبراتی : (کھوئے ہوئے انداز میں) ہاں۔۔۔ (دور قبروں کو گھورنے لگتا ہے۔ گلشن حیرت سے اس کا چہرہ تکتی ہے۔ پھر شبراتی ایک دم مکا ہوا میں ہلا کر) مجھے بھی کرنا چاہیے۔۔۔ میں ضرور یہی کروں گا۔ (اٹھ جانے کے واسطے تیار ہو جاتا ہے)

(پردہ)

چھٹا سین

(عیدو کے مکان کے سامنے کا میدان۔ میدان میں عیدو کے برادری کے لوگ جمع ہیں۔ حقہ کے دور چل رہے ہیں۔ ایک جانب گلشن اور شبراتی بیٹھے ہیں۔ رات کے تقریباً 11 بجے ہیں۔ چاندنی کھلی ہوئی ہے۔ سب لوگ حلقہ باندھے بیٹھے ہیں اور بیچ میں لکڑیوں کا ایک الاؤ لگا ہوا ہے۔ سب لوگ مست

معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے شراب پی رکھی ہے اور کچھ پی رہے ہیں۔ عیدو سب سے علیحدہ بیٹھا لوگوں کی مستی دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ بعض اوقات ان لوگوں میں سے کوئی شراب کے نشہ میں گانے کی کوئی بے تکی سی تان الاپ دیتا ہے جس پر سب لوگ قہقہے لگاتے ہیں۔ عیدو گلشن سے مخاطب ہوکر)

عیدو : گلشن بیٹا— تو پھر ہو جائے کوئی چٹپٹی سی چیز۔ (گلشن مسکرا کر شبراتی کو دیکھتی ہے۔ لیکن شبراتی کسی گہری سوچ میں مستغرق ہے۔ وہ گلشن کے اس طرح دیکھنے پر کوئی دھیان نہیں دیتا گلشن شبراتی کو دھکا دے کر)

گلشن : کیا سوچ رہے ہو۔

شبراتی : (ایک دم چونک کر) کچھ بھی تو نہیں۔

گلشن : تو پھر بولتے کیوں نہیں (شبراتی کھوئے ہوئے انداز میں بلا وجہ مسکرا دیتا ہے) بابا جی گانے کا کہہ رہے ہیں۔

شبراتی : (اسی طرح کھوئے ہوئے انداز میں) تو پھر گا کیوں نہیں دیتی۔

گلشن : کون سی چیز گاؤں؟

شبراتی : جو بھی تجھے پسند ہو۔

(گلشن کچھ سوچنے لگتی ہے۔ عیدو مہمانوں کی خاطر میں مشغول ہو جاتا ہے۔ حقوں کی گڑگڑاہٹ اور لکڑیوں کے جلنے کی آواز آتی رہتی ہے۔ عیدو گلشن کے پاس آکر)

عیدو : کیا سوچ رہی ہے بیٹا— (مسکرا کر)— شرماتی ہے۔ اری پگلی شرم کا ہے کی ہے۔ سب اپنے ہی لوگ ہیں (عیدو یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ گلشن پھر شبراتی کو دیکھتی ہے۔ جو اسی طرح کھوئے ہوئے انداز میں بیٹھا ہے۔ کچھ سوچنے لگتی ہے۔ قبل اس کے کہ گلشن کچھ گانا شروع کرے ایک شخص کھڑا ہوکر چار بیت شروع کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ کچھ لوگ اور گاتے ہیں۔ سب

لوگوں کے ہاتھوں میں دف ہیں۔ پہلے تین مصرعے تو وہ شخص کہتا ہے۔ چوتھے مصرعے پر باقی لوگ اس کا ساتھ دیتے ہیں اور اپنے اپنے دف کو بے تحاشہ پیٹتے ہیں اور اکثر کے چہروں اور جوش سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دف کو پھوڑ ڈالے گا)

پہلا: رفتار سے انکے کبھی گفتار سے اُلجھے
بے طرح یہ ہر ایک طرح دار سے الجھے
آنکھوں سے لڑے گیسوئے خمدار سے الجھے
یہ حضرتِ دل روز ہی دو چار سے الجھے

سب لوگ: یہ حضرتِ دل روز ہی دو چار سے الجھے

(اپنے اپنے دف کو خوب پیٹتے ہیں اور چوتھے مصرعہ کو مکرر مکرر دہراتے ہیں۔)

پہلا: دل دے کے عجب حال ہے جنجال میں یارب
وہ پیچ پڑے ہیں کہ سلجھتے نہیں یارب
الجھاؤ سے الجھاؤ ہیں اس عشق میں یارب
دلدار سے انکے تھے کہ اغیار سے الجھے

سب لوگ: دلدار سے انکے تھے کہ اغیار سے الجھے

(سب لوگ دف بجا بجا کر ایک ساتھ گاتے ہیں۔ شبراتی خاموشی سے اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ گلشن چار بیت سننے میں اس قدر مشغول ہے کہ اسے شبراتی کے جانے کی خبر نہیں ہوتی)

پہلا: بسمل بھی ہو جیدار اگر یار ہو سفاک
ہے لطف اسی میں کہ مقابل بھی ہو بیباک
کیا سیر ہو شانے سے لڑے گر دل صد چاک
ایک ایک گرفتار گرفتار سے الجھے

سب لوگ: ایک ایک گرفتار گرفتار سے الجھے

(گلشن آس پاس دیکھتی ہے اور شبراتی کو نہ پاکر چاروں طرف گھبرا گھبرا کر شبراتی کو دیکھنے کی کوشش کرتی ہے اور لوگوں میں اسے نہ پاکر اٹھ کر چلی جاتی ہے)

(پردہ)

ساتواں سین

(قبرستان میں جھاڑیوں اور درختوں کی پرخوف تاریکی کبھی کبھی گیدڑوں اور کتوں کی آوازیں آجاتی ہیں۔ شبراتی ان سب سے بے نیاز قبروں پر سے گزرتا چلا جارہا ہے۔ اِس کے قدموں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی بڑے ارادہ کی تکمیل کرنا چاہتا ہے۔ دور پروفیسر کی قبر پر دوسایہ حرکت کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ شبراتی کے قدم رُک جاتے ہیں۔ لیکن یکایک کسی جانور کے بولنے پر پروفیسر کی قبر پر ٹارچ کی روشنی ہوتی ہے۔ جو فوراً گل ہوجاتی ہے۔ شبراتی کو کسی کی موجودگی کا یقین ہوجاتا ہے اور وہ تیز تیز قدموں سے قبر کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ جھاڑیوں میں گڑبڑ ہونے کے باعث ٹارچ پھر جلتی ہے لیکن فوراً ہی بند ہوجاتی ہے۔ شبراتی قریب پہنچ کر)

شبراتی : کون ہے؟

ڈاکٹر زیدی: (آواز کو انتہائی ڈراؤنی بنا کر) تم چلے جاؤ۔ ہم یہ لاش قبر سے ضرور نکالیں گے۔

شبراتی : تم قبر سے لاش نہیں نکال سکتے۔

ڈاکٹر زیدی: (اِسی آواز میں) وہیں کھڑے رہ ورنہ ـــــ

شبراتی : (اور آگے بڑھ کر) چلو ہٹو ـــــ یہ دھونس کسی اور کو دینا ـــــ (بالکل قریب پہنچ کر) کون ہو تم ـــــ کیا کر رہے ہو یہاں۔

ڈاکٹر زیدی: (ٹارچ روشن کرکے) ہم لوگ ڈاکٹر ہیں۔ صبح عیدو بابا سے ملے تھے۔ ہمیں اِس لاش کی ضرورت ہے۔

شبراتی : (پرعزم لہجہ میں) تم لاش نہیں لے سکتے۔

ڈاکٹر عمر : ہم تمھیں پانچ سو روپیہ دے سکتے ہیں۔

شبراتی : (تعجب سے)— پانچ سو— (کچھ سوچ کر) نہیں نہیں یہاں لاشیں فروخت نہیں ہوتیں۔ ان کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔

ڈاکٹر زیدی: دیکھو لاش ہم کو مل گئی۔ تو اس سے انسانیت کو فائدہ ہوگا۔

شبراتی : (نفرت سے) چلو ہٹو بھی— لوگ ویسے ہی کم مرتے ہیں— تم لوگ اور دوائیں ایجاد کرلو گے۔

ڈاکٹر زیدی: لیکن سنو تو—

شبراتی : (قطع کلام کرکے) بس کہہ دیا کچھ نہیں سنتے۔ اب جاتے بھی ہو۔ یا کچھ اور لوگوں کو آواز دے کر بلاؤں۔

ڈاکٹر زیدی: (ڈاکٹر عمر سے) اچھا چلو (آگے بڑھتے ہوئے) اگر لاش آج رات نہ ملی تو خراب ہوجانے کا اندیشہ ہے (دونوں ڈاکٹر تیز تیز قدموں سے تاریکی میں غائب ہوجاتے ہیں۔ شبراتی قبر کے پاس کھڑا سوچتا رہتا ہے)

(پردہ)

آٹھواں سین

(پولیس اسٹیشن۔ پولیس انسپکٹر اپنے کمرہ میں بیٹھا ہے اور کچھ کاغذات غور سے دیکھ رہا ہے۔ میز پر ایک ٹیبل لیمپ رکھا ہے۔ ڈاکٹر عمر اور ڈاکٹر زیدی گھبرائے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔ انسپکٹر دونوں ڈاکٹروں کو گردن اٹھا کر دیکھتا ہے اور فوراً کھڑے ہوکر دونوں سے مصافحہ کرتے ہوئے ڈاکٹر زیدی سے مخاطب ہوکر)

انسپکٹر : کہیے ڈاکٹر صاحب کیسے تکلیف فرمائی۔

ڈاکٹر زیدی: معاف کیجیے گا— بے وقت تکلیف دی مگر مجبوری تھی۔

انسپکٹر : ڈاکٹر صاحب— میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔

ڈاکٹر زیدی: ابھی میں اور (ڈاکٹر عمر کی طرف اشارہ کرکے) ڈاکٹر عمر اپنی تجربہ گاہ سے

واپس آرہے تھے — راستہ میں عیدو کا قبرستان ہے۔ وہاں عجیب تماشہ دیکھا۔

انسپکٹر : کہیے کہیے۔

ڈاکٹر زیدی: ایک شخص پروفیسر ذکی کی قبر کھودنے کی کوشش کر رہا تھا — شاید عیدو کا لڑکا تھا۔ اس کو منع کیا تو مرنے مارنے کو تیار ہوگیا — اِس واسطے سوچا کہ آپ کو اطلاع کر دیں۔

انسپکٹر : شکریہ! — کیا وہ ابھی گرفتار کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر زیدی: جی ہاں — بشرطیکہ آپ وقت پر پہنچ گئے۔

انسپکٹر : تو پھر چلیے —

(تیزی سے دروازہ کی جانب جاتا ہے۔ ڈاکٹر عمر اور زیدی ایک دوسرے کو فاتحانہ مسکراہٹ سے دیکھتے ہیں اور پھر انسپکٹر کے ساتھ کمرہ سے نکل جاتے ہیں)

(پردہ)

نواں سین

(قبرستان کی وہی قبر۔ وہی تاریکی وحشت۔ وہی رات کا منظر۔ اسی تاریکی میں شبراتی قبر کو دوبارہ مٹی سے بند کر رہا ہے۔ سفید کپڑوں کا ایک ڈھیر پاس لگا ہے۔ یکا یک پاس سے لوگوں کے چلنے اور جھاڑیوں کی کھڑ بڑ معلوم ہوتی ہے۔ شبراتی گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے اور پھر تیزی سے قبر بند کرنے میں مشغول ہوجاتا ہے۔ آواز اور کھڑ بڑ قریب تر ہوتی جاتی ہے۔ قبر بند کرتے کرتے شبراتی نظر اٹھا کر دیکھتا ہے اور اسے کچھ لوگوں کی موجودگی کا علم ہوتا ہے۔ وہ گھبرا کر کپڑے کا ڈھیر ایک درخت پر پھینک دیتا ہے اور کھڑا ہوجاتا ہے۔ کچھ لوگ قریب آتے ہیں۔ اور متعدد ٹارچ اس پر پڑنے لگتے ہیں)

انسپکٹر : (تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے) دیکھو بھاگنے نہ پائے (شبراتی حیرت سے لوگوں کا چہرہ تاکنے لگتا ہے۔ کچھ سپاہی دوڑ کر اسے گھیرے میں لے لیتے

ہیں) کون ہو تم۔

شبراتی : (گھبراتی ہوئی نظروں سے انھیں دیکھ کر— شبراتی— عیدو کا لڑکا۔

انسپکٹر : (اور قریب آ کر ٹارچ سے اسے غور سے دیکھ کر) اتنی رات گئے یہاں کیا کر رہے ہو؟

شبراتی : (گھبرا کر) قبر برابر کر رہا تھا۔ کسی نے توڑ ڈالی ہے۔

انسپکٹر : لیکن آخر رات ہی کو کیوں؟— (قہقہہ لگا کر) کیا کفن چرانے آئے تھے—؟

شبراتی : نہیں نہیں— حضور بھلا ہم اور کفن—

انسپکٹر : (سپاہیوں سے) لے چلو مردود کو—

شبراتی : لیکن حضور—

انسپکٹر : بس خاموش رہو— اب جیل خانہ میں اس کا جواب دینا (سپاہی شبراتی کو گھسیٹ کر لے جاتے ہیں)

(پردہ)

دوسرا ایکٹ

پہلا سین

(عیدو کا مکان۔ کمرہ میں ایک چٹائی بچھی ہے۔ جس پر عیدو بیٹھا ہے۔ چہرہ سے اُداسی اور حزن و ملال ظاہر ہو رہا ہے۔ اس کی نظریں بے معنی طور پر مختلف اشیا پر جم جاتی ہیں۔ اندر وہیں جمی رہتی ہیں۔ سکینہ اس کے پاس بیٹھی رو رہی ہے۔ رات کا وقت ہے۔ چراغ جل رہا ہے۔ لیکن اس کی روشنی بمشکل تمام کمرہ میں پھیل رہی ہے۔ روشندان کے پاس گلشن کھڑی ہے۔ جو دور قبروں کی تاریکی میں دیکھ رہی ہے۔ اس کے چہرہ پر فکر و پریشانی کے آثار ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے وہ کسی بڑے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ عیدو بار بار اپنی بیوی کو دیکھتا ہے لیکن ہر بار کچھ کہنے کی خود میں

ہمت نہ پا کر خاموش ہو جاتا ہے۔ سکینہ برابر ہچکیوں سے رو رہی ہے۔ عیدو بڑی مشکل سے حسرت بھری نگاہوں سے سکینہ کو دیکھ کر)

عیدو : اب اِس طرح پریشان بیٹھے رہنے سے کیا ہوگا۔ صبح سے تمھارے حلق میں کچھ بھی نہیں گیا ہے۔ کچھ کھا پی لو— (سکینہ اور زیادہ ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ عیدو سمجھانے کے لہجہ میں) اگر رونے دھونے میں ہر کام ہوجایا کرے تو پھر ہر شخص ہی رو دھو کر اپنا کام کرالے۔

سکینہ : کیا معلوم— اس نے بھی کچھ کھایا پیا ہے یا نہیں— (کچھ سوچتے ہوئے آنسو پونچھ کر) نامعلوم کس حال میں ہوگا۔

عیدو : خدا پر بھروسہ کرو۔ وہی سب کا نگہبان ہے۔

سکینہ : (روتے ہوئے) اگر میرا بچہ چھوٹ جائے۔ تو بڑے پیر کی نیاز دلاؤں۔

گلشن : (آہستہ آہستہ قدموں سے عیدو کے پاس آ کر) لیکن بابا— آخر وہ وہاں گئے کیوں تھے۔

عیدو : (ٹھنڈی سانس بھر کر) کیا بتاؤں بیٹی اس کی بڑی لمبی داستان ہے۔ جب شبراتی چھ سات سال کا تھا۔ ایک روز ضد کرنے لگا کہ کہانی سناؤ— میں نے کہانی تو نہیں سنائی۔ اس کو بتلایا کہ جمعرات کے دن تمام مردے قبروں سے نکلتے ہیں اور قبروں پر بیٹھ کر ناچ رنگ میں مشغول ہوجاتے ہیں۔

گلشن : (تعجب سے) کیا واقعی عیدو بابا۔ مردے قبروں سے جمعرات کے دن نکلتے ہیں۔

عیدو : (یقین کے لہجہ میں) ہاں— نکلا کرتے تھے لیکن اب ان کا نکلنا بند ہوگیا ہے۔

گلشن : (اشتیاق آمیز لہجہ میں) کیوں بند ہوگیا ہے— عیدو بابا!

عیدو : (اٹھ کر روشن دان کے پاس جا کر کھڑا ہوجاتا ہے اور (قبروں کو تاریکی میں دیکھتے ہوئے) جس روز میں نے شبراتی کو یہ بات بتلائی۔ اس روز سے وہ مردوں کا ناچ رنگ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ہر جمعرات کو رات رات بھر

جاگنا اس کا کام تھا۔ ایک جمعرات کو ہم لوگوں کی نظریں بچا کر قبرستان میں چلا گیا۔ (انگلی سے روشن دان میں سے اشارہ کرکے) وہ دیکھو بڑے بڑے درختوں کے درمیان ایک میدان نظر آرہا ہے۔ اس میں مردوں کی محفل جمی ہوئی تھی۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ میں نے اسے جاکر پکڑ لیا— ورنہ خدا جانے کیا غضب ہوجاتا— بس وہ دن کہ آج کا دن مردے پھر قبروں سے نہیں نکلے— اب جب بھی مردوں کا جی چاہتا ہے وہ شبراتی کو بلا لیتے ہیں— شاید انھوں نے ہی بلایا ہوگا۔

(کمرہ میں پھر خاموشی ہوجاتی ہے۔عیدو اسی طرح قبروں کو دیکھتا رہتا ہے۔ گلشن خاموش کھڑی رہتی ہے۔سکینہ برابر عیدو کے چہرہ کو کھوئے ہوئے انداز میں گھورتی رہتی ہے۔گلشن عیدو کے چہرہ کو دیکھ کر)

گلشن : عیدو بابا— اب انھیں رہا کرانے کی کوشش کرونا۔

عیدو : اگر کچھ روپیہ پولیس والوں کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔تو کام بن جاتا— لیکن روپیہ آئے کہاں سے۔

گلشن : تو کیا پولیس والے انھیں بغیر مقدمہ چلائے چھوڑ سکتے ہیں؟

عیدو : ہاں کیوں نہیں— وہ چاہیں تو کیا نہیں کرسکتے۔

گلشن : اور بابا— تم وکیل کے یہاں بھی تو گئے تھے۔

عیدو : ہاں پہلے تو وہ بہت بگڑا— سمجھا میں مفت میں کام چلانا چاہتا ہوں— لیکن جب میں نے محنتانہ دینے کو کہا۔تو راضی ہوگیا۔

گلشن : اس نے کچھ اُمید بھی دلائی ہے۔

عیدو : ہاں— اس نے کہا تو ہے کہ بچانے کی پوری کوشش کرے گا۔

(پھر خاموش ہوجاتی ہے۔گلشن کسی گہری سوچ میں مبتلا ہوجاتی ہے۔عیدو قبرستان کی تاریکی کو دیکھتا رہتا ہے۔سکینہ کی ٹھنڈی ٹھنڈی سانسوں کی کبھی کبھی آواز آجاتی ہے۔کچھ دیر کھڑی رہنے کے بعد گلشن آہستہ آہستہ اس کمرہ

سے نکل جاتی ہے)۔

(پردہ)

دوسرا سین

(پولیس انسپکٹر کا کمرہ۔ پولیس انسپکٹر ایک کرسی پر بیٹھا اپنی مونچھوں کو بل دے رہا ہے۔ دو سپاہی اس کے پاس کھڑے ہیں۔ گلشن فرش پر بیٹھی ہے۔ اس کی رحم طلب نگاہیں۔ پولیس انسپکٹر کے چہرہ پر جمی ہوئی ہیں۔ آنکھوں میں بار بار آنسو آتے ہیں جنھیں وہ پی جانے کی کوشش کرتی ہے اور پھر مجبور ہوکر اپنے دوپٹہ کے پلو سے پونچھ لیتی ہے انسپکٹر کی شرارت آمیز نگاہیں گلشن کے چہرہ پر جمی ہوئی ہیں اور چہرہ پر ایک عجیب شرارت آمیز مسکراہٹ کھیل رہی ہے۔ سپاہی حسرت بھری نگاہیں گلشن کے چہرہ پر ڈال رہے ہیں اور بار بار انسپکٹر کی موجودگی کا احساس کر کے نظریں نیچی کر لیتے ہیں)۔

ایک سپاہی : (انسپکٹر کی طرف دیکھ کر) حضور یہی تو وہ بھکارن ہے۔ یہ بہت عمدہ گاتی ہے۔

انسپکٹر : (عجب شان سے مسکرا کر)— کیوں تجھے گانا بھی آتا ہے۔

گلشن : سرکار!— میں گانا وانا کیا جانوں— میں تو صرف خیرات مانگنا جانتی ہوں۔

دوسرا سپاہی: حضور میں نے تو خود گاتے سنا ہے۔ بھیڑ لگ جاتی ہے۔ جب یہ گاتی ہے۔

پہلا سپاہی : (گلشن سے مخاطب ہوکر)— گاتی کیوں نہیں— ہماری سرکار گانا بہت پسند کرتے ہیں۔

گلشن : میں گانا کیا جانوں— مجھے تو بھکارن کی صدائیں آتی ہیں۔ (انسپکٹر کا چہرہ دیکھ کر) تو کیا سرکار میں اس سے ایک بار بھی نہیں مل سکتی۔

انسپکٹر : نہیں یہ تو قانون کے خلاف ہے۔

گلشن : (رحم طلب نگاہوں سے انسپکٹر کو دیکھ کر) اگر حضور اجازت دیں تو— میں عمر بھر حضور کی جان و مال کو دعا دیتی رہوں گی۔

انسپکٹر (شرارت سے) تمھیں دعا دینے کے علاوہ بھی کوئی کام آتا ہے۔

گلشن : سرکار— بھکاری تو جان و مال ہی کو دعا دے سکتے ہیں— اِس کے علاوہ ان کے پاس ہوتا ہی کیا ہے۔

انسپکٹر : (کھڑے ہوتے ہوئے) اچھا۔ (پہلے سپاہی سے)— اِسے ملزم سے ملنے کی اجازت ہے (دروازہ کی جانب جاتا ہے۔ دوسرے سپاہی کو آنکھ سے ایک عجیب اشارہ کرتا ہے اور کمرہ سے نکل جاتا ہے)

دوسرا سپاہی : (گلشن سے) ہمارے انسپکٹر صاحب بھی بڑے رحم دل ہیں۔

پہلا سپاہی : انسان کیا دیوتا ہیں دیوتا۔

(گلشن اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے سپاہیوں سے)

گلشن : چلیے۔ مجھے ان سے ملا دیجیے۔

پہلا سپاہی : چلو۔

دوسرا سپاہی : (کچھ سوچتے ہوئے) اگر تو ایک کام کرے تو ملزم چھوٹ سکتا ہے۔

گلشن : (فوراً) کیا کروں؟— (اشتیاق سے) کیا وہ چھوٹ سکتے ہیں۔

دوسرا سپاہی : جرم تو سنگین ہے مگر— (کچھ سوچتے ہوئے) اگر انسپکٹر صاحب چاہیں تو چھوٹ بھی سکتا ہے (گلشن سے مخاطب ہوکر) تو انسپکٹر صاحب کے گھر جاکر ان کی خوشامد کیوں نہیں کرتی۔

گلشن : (ٹھنڈی سانس بھر کر) میں نے یہاں کیا کم خوشامد کی۔

پہلا سپاہی : یہاں کی بات اور ہے وہاں کی اور—

گلشن : لیکن—

دوسرا سپاہی : تو جاکر تو دیکھ— گھر پر شاید رحم آجائے۔

گلشن : اچھا— (دروازہ کی جانب جاتے ہوئے)— چلو مجھے اُن سے ملا دو۔

(سپاہی اور گلشن کمرہ سے نکل جاتے ہیں)

(پردہ)

تیسرا سین

(جیل خانہ کی تاریک کوٹھری۔ فرش پر ایک سیاہ کمبل بچھا ہوا ہے۔ جس پر شبراتی بیٹھا ہے۔ دروازہ کے سامنے جس پر لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی ہیں ایک سپاہی پہرہ دے رہا ہے۔ شبراتی کسی خیال میں کھویا ہوا ہے۔ گردن اور نظریں جھکی ہوئی ہیں۔ سپاہی دروازہ کھولتا ہے اور گلشن اندر داخل ہوتی ہے۔ شبراتی اپنے خیالات میں کچھ اس طرح منہمک ہے کہ اسے دروازہ کھلنے اور گلشن کے داخل ہونے کا قطعی علم نہیں ہوتا۔ گلشن آہستہ آہستہ چل کر اس کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ دو چار بار وہ شبراتی پر نظریں جما کر کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اس کے لب ہلتے ہیں۔ مگر جوش جذبات کے باعث آواز نہیں نکلتی۔ بدقت جذبات پر قابو پا کر)

گلشن : شبراتی — (شبراتی اِس غیر متوقع آواز سے چونک پڑتا ہے اور گلشن کا چہرہ دیکھ کر ایک دم کھڑا ہو جاتا ہے۔ دونوں ہاتھوں کو اِس طرح بڑھاتا ہے۔ جیسے وہ اِسے اپنے آغوش میں لینا چاہتا ہے پھر ایک دم رُک کر)

شبراتی : گلشن! — تو یہاں کیسی؟

گلشن : میں تم ہی سے ملنے آئی ہوں۔

شبراتی : (ایک دم دوسری طرف منہ پھیر کر) یا میرا مذاق اڑانے۔

گلشن : (تعجب سے) تمھارا مذاق اڑانے — (پریشان سی ہو کر) کیا مطلب ہے تمھارا۔

شبراتی : مجھے اِس حالت میں دیکھ کر ہر شخص ہی مذاق اڑائے گا۔

گلشن : نہیں شبراتی — میری طرف دیکھو (ہاتھ سے اُس کا منہ اپنی جانب کر کے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) شبراتی گلشن بھکاری ضرور ہے۔ مگر کمینی نہیں۔ (دونوں ایک دوسرے کو تاکنے لگتے ہیں۔ پھر ایک دم شبراتی اسے اپنے آغوش

میں لینے کے واسطے ہاتھ بڑھاتے ہوئے)

شبراتی : میری گلشن — (باہر سے سپاہی کے کھانسنے کی آواز آتی ہے۔ اور شبراتی حسرت سے اپنے بڑھے ہوئے ہاتھ گرا دیتا ہے)

گلشن : آخر یہ واقعہ پیش کیسے آیا۔ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا — اور پھر تم ناچ رنگ میں سے اٹھ کر وہاں گئے ہی کیوں تھے؟

شبراتی : (کچھ سوچتے ہوئے) کچھ نہیں گلشن۔ یوں ہی چلا گیا تھا۔

گلشن : نہیں نہیں — مجھے سچ سچ بتلاؤ — عیدو بابا نے تمھارے لیے وکیل کیا ہے اور تم بہت جلد چھوٹ جاؤ گے۔

شبراتی : (کچھ دیر سوچتا ہے۔ پھر سرگوشی کے انداز میں مسکرا کر) تمھارے لیے کفن چرانے۔

گلشن : (حیرت سے) کفن چرانے؟

شبراتی : (مسکرا کر) — ہاں — تم ہی نے تو کہا تھا۔

گلشن : تو میری وجہ سے — (پریشان سے ہو کر)۔ میں تو مذاق کر رہی تھی اور تم سچ مچ — (باہر سے سپاہی کی آواز)

سپاہی کی آواز: چلو نکلو — پانچ منٹ ہو گئے (گلشن اور شبراتی ایک دوسرے کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں)

گلشن : تم گھبرانا نہیں — میں انسپکٹر کے گھر جا کر ان کی خوشامد کروں گی۔ شاید وہ کچھ —

شبراتی : (قطع کلام کر کے) نہیں نہیں — (گلشن کو کاندھے کے پاس سے پکڑ کر ہلاتے ہوئے)۔ تم انسپکٹر صاحب کے گھر ہرگز نہ جانا — مجھے سزا بھگتنا منظور ہے۔ لیکن تمھارا وہاں جانا منظور نہیں۔

(سپاہی دروازہ کھولتا ہے اور گلشن حسرت سے شبراتی کو دیکھتے ہوئے دروازہ کی جانب بڑھتی ہے اور بار بار مڑ مڑ کر شبراتی کو دیکھتی جاتی ہے)

(پردہ)

چوتھا سین

(انسپکٹر کے سونے کا کمرہ۔ رات کے تقریباً گیارہ بجے ہیں۔ انسپکٹر ایک پرتکلف مسہری پر لیٹا ہوا ایک کتاب دیکھ رہا ہے۔ کمرہ کی دیواروں پر بہترین تصاویر آویزاں ہیں۔ ایک میز پر کتابیں، قلم دوات رائٹنگ پیڈ وغیرہ قرینے سے رکھے ہیں۔ ایک الماری کی کچھ کتابیں بہترین گرد پوش کی رکھی ہیں۔ انسپکٹر ایک ناول کے مطالعہ میں مشغول ہے۔ انسپکٹر کا ملازم کمرہ میں داخل ہوکر)

ملازم : حضور— ایک عورت آپ سے ملاقات کرنا چاہتی ہے۔

انسپکٹر : (برابر کتاب پر نظریں جمائے ہوئے) کون عورت ہے؟

ملازم : لباس سے تو بھکارن معلوم ہوتی ہے مگر ہے حسین۔

انسپکٹر : (ملازم کا چہرہ دیکھ کر) پوچھا نہیں کیا کام ہے۔

ملازم : وہ کہہ رہی ہے۔ اِسے آپ ہی سے کچھ عرض کرنا ہے۔

انسپکٹر : (کچھ سوچتے ہوئے)— کون عورت ہوسکتی ہے۔
(پھر ملازم کی طرف دیکھ کر) میں اس وقت بہت مشغول ہوں۔

ملازم : حضور میں نے تو بہت ٹالنے کی کوشش کی— مگر وہ کہتی ہے اِسے ایک ضروری کام ہے۔ اِسی وقت ملنا چاہتی ہے۔

انسپکٹر : (کچھ دیر سوچ کر) اچھا اِسے یہیں بھیج دو۔

ملازم : (جاتے ہوئے) بہت اچھا حضور—

(ملازم کمرہ سے چلا جاتا ہے۔ انسپکٹر کتاب بند کرکے مسہری سے اُتر کر کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے گلشن داخل ہوتی ہے۔ انسپکٹر حیرت سے گلشن کا چہرہ تاکنے لگتا ہے۔ چہرہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی گہری سوچ میں مبتلا ہوگیا ہے۔ گلشن کچھ دیر انسپکٹر کو دیکھتی رہتی ہے۔ اِس کے چہرہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے)

گلشن : سلام— سرکار۔

انسپکٹر : (گردن ہلا کر) سلام— (پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد) کہو کس کام سے آئی ہو۔

گلشن : رحم طلب نگاہوں سے انسپکٹر کو دیکھ کر) سرکار، (پھر خاموش ہوجاتی ہے۔ انسپکٹر سگریٹ جلا کر پینے لگتا ہے۔ پھر یکا یک مسکرا کر)

انسپکٹر : اچھا تم شبراتی کے معاملہ میں کچھ کہنا چاہتی ہو۔

گلشن : (نظریں جھکا کر) جی ہاں سرکار— اگر حضور—

انسپکٹر : (قطع کلام کرکے) بھئی میں نے تو اسی روز کہا تھا کہ میں مجبور ہوں۔

گلشن : سرکار!— میں آپ سے رحم اور ہمدردی کی اُمید لے کر آئی ہوں۔

(انسپکٹر کچھ دیر خاموشی سے سگریٹ پیتا رہتا ہے۔ پھر ایک دم گلشن کو مسکرا کر دیکھ کر)

انسپکٹر : ارے بیٹھو نا گلشن— (گلشن وہیں فرش پر بیٹھنے لگتی ہے) نہیں نہیں۔ وہاں نہیں۔ (قریب جا کر ہاتھ پکڑ کر مسہری کی طرف لے جاتے ہوئے مسہری کی طرف اشارہ کرکے) وہاں۔

گلشن : (گھبرا کر) سرکار— (بیٹھتے ہوئے رکتی ہے۔ دونوں ہاتھ اُس کے کاندھے پر رکھتے ہوئے انسپکٹر اسے بٹھا دیتا ہے اور شرارت آمیز نظروں سے اُسے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر مسکرا کر)

انسپکٹر : کیوں گلشن تمھیں شبراتی سے بہت محبت ہے— (گلشن شرم سے گردن جھکا لیتی ہے۔ انگلی سے گلشن کا چہرہ اپنی جانب کرتے ہوئے) گلشن تم ہو بلا کی حسین۔

گلشن (نظریں نیچی کرکے)— سرکار۔

انسپکٹر : یہ سرکار ورکار نہ کہو— (مسہری پر گلشن کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور اپنا ہاتھ اس

کی گردن میں حمائل کر دیتا ہے۔ گلشن گھبرا کر مسہری سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے)۔

گلشن : سرکار — نہیں۔

انسپکٹر : (ہاتھ پکڑ کر)۔ دیکھو گلشن۔ بلا معاوضہ تو کوئی کام نہیں ہوتا۔

گلشن : لیکن سرکار — ایک غریب بھکارن آپ کو کیا معاوضہ دے سکتی ہے۔ صرف سرکار کا رحم و کرم —

انسپکٹر : آجکل رحم و کرم کے لیے تو دنیا میں کوئی کام نہیں ہوتا۔ گلشن کے چہرہ پر نظریں گاڑ کر) اور تمھیں معلوم ہے شبراتی کا جرم سنگین ہے۔

گلشن : اگر آپ میری مدد فرمائیں — تو میں آپ کی دولت و عزت کو ہمیشہ دعا دیتی رہوں گی۔

انسپکٹر : (مسکرا کر) گلشن! — اِن دعاؤں کا میرے خزانہ میں کافی انبار ہو گیا ہے — اور — اب! ان کی ضرورت نہیں۔ اگر تم — (مسکرا کر گلشن کا چہرہ دیکھنے لگتا ہے)

گلشن : سرکار — میں —

انسپکٹر : (قطع کلام کر کے) گلشن! — میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ (دروازہ کی طرف اشارہ کر کے) دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اگر تم یہ چاہتی ہو کہ شبراتی رہا ہو جائے تو — یہ دروازہ بند کرنا ہوگا اور اگر نہیں — تو دروازہ کھلا ہوا ہے۔ تم جا سکتی ہو۔

گلشن : (آنکھوں میں آنسو بھر کر) تو کیا وہ کسی صورت میں رہائی نہیں ہو سکتی۔

انسپکٹر : صرف ایک صورت میں — کہ دروازہ بند ہو جائے۔

گلشن : (تھکے تھکے قدموں سے دروازہ کی جانب جاتے ہوئے) خدا حضور کو خوش رکھے — (انسپکٹر گلشن کو جاتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے۔ گلشن دروازہ کے پاس جا کر رک جاتی ہے پھر ایک دم پلٹ کر فرش پر گر کر رونے لگتی ہے)۔

انسپکٹر : گلشن! — میں مجبور ہوں۔

(گلشن کچھ دیر روتی رہتی ہے۔ کھڑی ہوتی ہے۔ دروازہ کی جانب دیکھتی ہے۔

انسپکٹر کے چہرہ کو دیکھتی ہے۔ کچھ سوچتی ہے۔ پھر انسپکٹر کے چہرہ کو دیکھ کر)

گلشن : سرکار — دروازہ بند کر دیجیے۔

(انسپکٹر دروازہ بند کر دیتا ہے۔ گلشن برابر ہچکیوں سے روتی رہتی ہے۔ انسپکٹر گلشن کا ہاتھ پکڑ کر مسہری پر بٹھا دیتا ہے)

گلشن : لیکن سرکار ایک وعدہ کیجیے۔

انسپکٹر : (پاس بیٹھتے ہوئے) کیا وعدہ۔

گلشن : کہ میرے بعد بھی وہ رہا کر دیے جائیں گے۔

انسپکٹر : (گلشن کا چہرہ دیکھ کر) لیکن تم کہاں جاؤ گی۔

گلشن : (پرعزم لہجہ میں) جہاں دنیا کا ہر شخص گیا ہے — اور جہاں ہر شخص کو جانا ہے (ہچکیوں سے رونے لگتی ہے) جلدی کیجیے سرکار۔ (انسپکٹر کا چہرہ دیکھ کر) آج کی رات کے بعد دنیا میری منحوس شکل نہ دیکھ سکے گی)

(انسپکٹر مسہری سے اٹھ کر کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے۔ اس کے چہرہ سے صاف ظاہر ہے کہ وہ کسی بڑی کشمکش میں مبتلا ہو گیا ہے۔ چہرہ پر کبھی کبھی ایسے جذبات ظاہر ہوتے ہیں۔ جیسے وہ کسی چیز سے نفرت کر رہا ہے۔ گلشن کے پاس آ کر)

انسپکٹر : گلشن۔ (پھر کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے)

گلشن : سرکار — آپ سوچ کیا رہے ہیں۔ عزت و ناموس عصمت۔ محبت، یہ سب دھوکے ہیں (انسپکٹر کے پاس جا کر) اس نے میرے لیے جرم کیا۔ میں اُس کے لیے قربانی دے رہی ہوں (انسپکٹر کا ہاتھ پکڑ کر) آیئے۔

انسپکٹر : (ہاتھ چھوڑ کر) گلشن! میں سوچ رہا ہوں کہ میں وہ نہیں کر سکتا جو کرنا چاہتا تھا۔

گلشن : (تعجب سے) نہیں کر سکتے (التجا آمیز لہجہ میں) خدا کے لیے ایسا نہ کہیے۔ میں ہر قیمت پر اس کو رہا کرانا چاہتی ہوں۔ خود غرض بننا نہیں چاہتی سرکار (ہاتھ پکڑ کر) سرکار —

انسپکٹر : (ہاتھ چھوڑ کر) گلشن تم جا سکتی ہو (دروازہ کے پاس جا کر دروازہ کھول دیتا

ہے) جاؤ گلشن — میں اسے رہا کرانے کی کوشش کروں گا (گلشن حیرت سے انسپکٹر کا چہرہ دیکھتی ہے) خدا کے لیے گلشن جاؤ — ورنہ میری نفس مجھے دھوکہ دے دے گی — گلشن — خدا کے لیے میری نفس کو نہ آزماؤ — جاؤ گلشن — جاؤ — میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ شبراتی کو چھوڑنے کی کوشش کروں گا (ایک آرام کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) گلشن خدا کے لیے جاؤ۔ للہ جاؤ —

(گلشن آہستہ آہستہ قدموں سے کمرہ سے نکل جاتی ہے۔ انسپکٹر سر جھکائے گہری سوچ میں بیٹھا رہتا ہے)۔

(پردہ)

پانچواں سین

(جیل خانہ کی تاریک کوٹھری، کوٹھری کے راستے پولیس کا سپاہی برآمدہ میں ٹہل رہا ہے جس کے بھاری بھاری قدموں کی آواز کوٹھری کی تاریک اور خاموش فضا میں ایک عجیب وحشت پیدا کررہی ہے۔ برآمدہ کے سامنے میدان میں چاند مسکرا رہا ہے اور دور سے کہیں ریڈیو پر کسی مغنیہ کے گانے کی آواز آرہی ہے۔ شبراتی اپنے سیاہ کمبل میں جو اوڑھنے یا بچھانے جس طرح چاہے استعمال کرسکتا ہے کے لیے دیا گیا ہے لیٹا ہے۔ اُس کی نظریں کوٹھری کی چھت پر جس میں بے شمار مکڑی کے جالے ہیں جمی ہوئی ہیں۔ شبراتی کچھ دیر اسی حالت میں لیٹا رہتا ہے۔ پھر اٹھ کر دروازہ کے پاس آتا ہے۔ سلاخوں کو پکڑے ہوئے کچھ دور چاندنی میں کچھ دیکھتا رہتا ہے۔ سپاہی برابر چکر لگا رہا ہے — کچھ دیر شبراتی یوں ہی کھڑا رہتا ہے۔ پھر گانا شروع کردیتا ہے)۔

شبراتی کا گانا

جگر ہی میں خوں ہے نہ آنکھوں میں پانی
مریضِ محبت کی یہ ہے نشانی

محبت کی پریوں نے کھیلی ہے ہولی
کہ زخم جگر کی ہے یہ خوں فشانی
جہاں پے بہ پے بجلیاں گر رہی ہیں
میرے آشیاں کی وہی ہے نشانی
بہاروں میں رونے کا عادی ہوں احسن
میرے آنسوؤں میں ہے میری کہانی

(احسن اسمٰعیل)

(گانا ختم ہونے کے بعد سپاہی ایک زوردار قہقہہ لگاتا ہے۔ پھر اپنے بھاری بھاری قدموں سے طبلہ کی تھاپ پیدا کرتا ہوا شبراتی کے پاس آکر ایک اور زوردار قہقہہ لگا کر)

سپاہی : گالو بیٹا— گالو— (پھر ایک اور طنزیہ قہقہہ لگا کر) جس کی یاد میں تم یہ گیت گا رہے ہو— جانتے بھی ہو وہ ہے کہاں؟

شبراتی : (گھبرا کر) کہاں ہے جمعدار صاحب— خدا کے لیے جمعدار صاحب بتلایئے وہ خیریت سے تو ہے۔

سپاہی : (قہقہہ لگا کر) بہت خیریت سے۔ ایسے عیش میں ہے۔ جو کبھی اِس کے باپ کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔

شبراتی : جمعدار صاحب— کیا مطلب ہے آپ کا۔

سپاہی : بیٹا تم یہاں گیت گا گا کر اپنا دِل خوش کر رہے ہو— وہ کسی اور کا دل خوش کر رہی ہے۔ (پھر ٹہلنے لگتا ہے)

شبراتی : خدا کے لیے جمعدار صاحب— ٹھیک کہیے گلشن ہے کہاں۔

سپاہی : وہ— (قریب آکر قہقہہ لگا کر) کوٹھیوں میں مخملی گدوں پر آرام کر رہی ہے (پھر ایک زوردار قہقہہ لگاتا ہے)

شبراتی : (سلاخوں پر گرفت مضبوط کر کے) میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

سپاہی : مطلب نہیں سمجھے۔ (قہقہہ لگا کر) بیٹا— وہ انسپکٹر صاحب کے ساتھ گل چھرے اڑا رہی ہے۔

شبراتی : انسپکٹر صاحب کے ساتھ۔ (گھبرا کر) نہیں نہیں۔ وہ ایسا نہیں کرسکتی۔

سپاہی : (طنزیہ)— بیٹا تمھارے خواب میں نہیں کرسکتی (پھر ٹہلنے لگتا ہے)

شبراتی : (سوچتے ہوئے) لیکن میں نے اُسے وہاں جانے سے منع کردیا تھا۔
(سپاہی زوردار قہقہہ لگاتا ہوا پاس سے گزرتا ہے۔ شبراتی اُس کا چہرہ دیکھ کر)
جمعدار صاحب کیا صحیح ہے؟

سپاہی : (رُک کر مسکرا کر) جھوٹ۔ بالکل غلط— (قہقہہ لگاتا ہے)۔ جب تم انسپکٹر صاحب کی سفارش پر رہا کردیے جاؤ گے تب تو یقین آئے گا۔
(سپاہی ٹہلنے لگتا ہے۔ شبراتی کسی گہری سوچ میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ چل کر کمبل پر لیٹ جاتا ہے اور آہستہ آہستہ بڑبڑاتا ہے۔)

شبراتی : گلشن!— بے وفا— میں تجھے اس قدر نیچ نہیں سمجھتا تھا۔ کمینی کہیں کی۔
(پھر کچھ سوچنے میں مشغول ہوجاتا ہے)

(پردہ)

چھٹا سین

(عدالت کا کمرہ۔ جج ایک اونچے مقام پر بیٹھا ہے۔ شبراتی کٹہرے میں کھڑا ہے۔ ایک طرف گلشن اور عیدو کھڑے ہیں۔ ایک طرف کرسیوں پر ڈاکٹر عمر اور ڈاکٹر زیدی بیٹھے ہیں۔ انہی کے پاس پولیس انسپکٹر اور وکیل وغیرہ بیٹھے ہیں سرکاری وکیل چیخ چیخ کر بول رہا ہے)

سرکاری وکیل: مائی لارڈ (شبراتی کی طرف اشارہ کرکے) یہ شخص جس کی رحم طلب نگاہیں حضور والا سے ہمدردی اور کرم کی بھیک مانگ رہی ہیں۔ انسانیت کے چہرہ پر ایک بدنما داغ ہے۔ جہاں ہم اپنے عزیزوں کی روحوں کو خدا کے سپرد کرتے

ہیں۔ وہیں ہماری یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ ان کے جسم بھی اسی طرح محفوظ رہیں جس طرح ہم نے انھیں محفوظ کردیا ہے۔ (شبراتی کی طرف اشارہ کرکے) ہم اُن سے یہ توقع کرتے ہیں کہ ان کی حفاظت کریں گے— مائی لارڈ— لیکن اِس واقعہ نے ثابت کردیا ہے کہ یہ شخص (شبراتی کے پاس جاکر) انسانیت سوز جرم کا مرتکب ہوا ہے۔حضور عالی— کیا انسپکٹر پولیس اگر موقع واردات پر نہ پہنچ جاتے تو یہ شخص اپنے ناپاک ارادہ سے باز آجاتا— ہرگز نہیں— کیا یہ لاش کی بے حرمتی نہیں کرتا اور اپنے اِس ارادہ کی تکمیل نہیں کرتا جسے لے کر اس نے قبر کھودا تھا— اس نے نامعلوم کتنی لاشوں کی بے حرمتی کی ہوگی— کتنی لاشوں کو اس نے قبر سے نکال کر جانوروں کی خوراک بنا دیا ہوگا۔ جن لاشوں میں ہماری باپردہ اور باعصمت ماؤں اور بہنوں کی لاشیں بھی ہوں گی— مائی لارڈ— اس شخص کے پھٹے پرانے کپڑوں کو دیکھیے— اور اندازہ لگایئے کہ ان کپڑوں کے اندر اِن کپڑوں سے بھی اور سیاہ قلب حرکت کررہا ہے— حضور والا— اس شخص پر رحم کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ انسانیت کا گلا گھونٹا جائے— فرض کی دھجیاں اڑائی جائیں اور انصاف کے گلے پر الٹی چھری پھیر دی جائے اور دنیا کو بتلا دیا جائے کہ انصاف،فرض اور رحم کے جذبات انسان کو حقیقت سے دور لے جاتے ہیں۔ اور دنیا ترقی کی اِس شاہراہ پر گامزن ہوچکی ہے۔ جہاں انسان اپنے اعلیٰ جذبات کو ذبح کررہا ہے— مائی لارڈ — میں انصاف کا واسطہ دے کر عدالت عالیہ سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس مجرم کے ساتھ ہرگز رعایت کا برتاؤ نہ کرے جو اس قدر خوفناک جرم کا مرتکب ہوا ہے۔ مجھے عدالت عالیہ کی حق پسندانہ پاس اور انصاف پروری سے قوی امید ہے کہ وہ حقیقت کی روشنی میں اِس گراہی کو دیکھے گی۔ مجھے امید ہے مائی لارڈ کہ یہ شخص جس کی غربت جس کا افلاس، جس کی تنگ دستی اور جس کا جابرانہ عمل ہماری نظروں کے سامنے

ہے۔ ہرگز ہرگز معاف نہیں کیا جائے گا بلکہ کیفر کردار کو پہنچایا جائے گا۔

(کمرہ عدالت پر ایک خاموشی چھا جاتی ہے۔ ڈاکٹر عمر اور ڈاکٹر زیدی ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھتے ہیں۔ شبراتی کے چہرہ پر مایوسی کی جھلک پیدا ہوتی ہے اور عیدو کے چہرہ پر ناامیدی کی— گلشن کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے ہیں۔ شبراتی کا وکیل اپنی کرسی سے اٹھ کر آہستہ آہستہ سامنے آتا ہے اور کہنا شروع کرتا ہے)

شبراتی کا وکیل: مائی لارڈ— جب انسانیت موت کے دروازہ پر پہنچتی ہے تو وہ انصاف کا واسطہ دیتی ہے اور جب انسانیت فنا ہو جاتی ہے تو وہ حقیقت کو تلاش نہیں کرتی بلکہ حقیقت کو فنا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ابھی عدالت عالیہ سے جملوں کی بہترین تراش خراش کے ساتھ اِس بات کی اپیل کی گئی ہے کہ پھٹے پرانے کپڑوں میں ہمیشہ ایک ناپاک اور گندی روح ہوتی ہے اور ہر میلے اور پھٹے پرانے کپڑے پہننے والا اِس امر کا مستحق ہے کہ اُسے پھٹے پرانے کپڑے پہننے کی سزا دی جائے— کیا یہ انسانیت کی موت نہیں۔ مائی لارڈ— میں عدالت عالیہ کی توجہات کو رحم اور ہمدردی کی طرف منعطف کرانا نہیں چاہتا— بلکہ حضور والا کی توجہات کو حقائق کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں— (آہستہ آہستہ چل کر ڈاکٹروں کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے)(عیدو کے بیانات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ڈاکٹر زیدی اور ڈاکٹر عمر پروفیسر کی لاش حاصل کرنا چاہتے تھے۔ جس کا اعتراف خود ڈاکٹر صاحبان بھی کر چکے ہیں— پھر ڈاکٹر صاحبان کا اس قدر رات کو قبرستان میں جانا کیا معنی رکھتا ہے— ڈاکٹر صاحبان کا بیان ہے کہ وہ اپنی تجربہ گاہ سے گھر لوٹ رہے تھے— اول تو تجربہ گاہ اور ڈاکٹر صاحبان کے گھر کا راستہ قبرستان سے نہیں گزرتا۔ دوسرے انسپکٹر صاحب پولیس کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر صاحبان اپنی کار میں انسپکٹر صاحب کے پاس پہنچے۔ قبرستان میں کوئی راستہ موٹر کے لیے نہیں ہے صرف ایک پگڈنڈی ہے جس پر انسان کا گزر بھی بہ مشکل ہو سکتا ہے—

پھر موٹر کو لبِ سڑک کھڑا کر کے ڈاکٹر صاحبان کا اس قدر رات کو قبرستان میں جانا کیا معنی رکھتا ہے (دونوں ڈاکٹر ایک دوسرے کو گھبرا کر دیکھتے ہیں) یقیناً کوئی برا ارادہ لے کر قبرستان میں داخل ہوئے تھے۔ مائی لارڈ!— کیا مفلس اور غریب ہونا کوئی بڑا جرم ہے جس کی سزا ہتھکڑیاں اور جیل خانہ کی تاریک کوٹھری ہی ہوسکتی ہے— اگر اسی— (شبراتی کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے پھٹے پرانے کپڑے پہننے والے سیاہ قلب انسان نے اپنی مفلسی اور غربت کے باعث لاش نکالنے کی کوشش کی تھی تو کیا وہ اُس سے بڑے جرم کا مرتکب ہوا جس کے مرتکب — صاف و شفاف بہترین سوٹ میں ملبوس— روشن قلب ڈاکٹر صاحبان ہوئے ہیں— مائی لارڈ!— کسی غریب کو روپیہ کا لالچ دینا خود ایک جرم ہے۔ لاش نکالنے کی کوشش کا جرم اسی غریب پر عائد نہیں ہوتا بلکہ ڈاکٹر صاحبان پر بھی ہوتا ہے جنھوں نے مفلس اور فاقہ کش انسان کو پانچ سو روپیہ کا لالچ دیا— اور پھر اُسے جرم کرنے کی ترغیب دی— اور جب اُس نے اپنی پاک بازی اور نیک نیتی کے باعث جرم کرنے سے انکار کیا تو ڈاکٹر صاحبان کا جذبہ انتقام جاگا— مائی لارڈ!— کیا عدالت عالیہ ان تمام حالات پر غور نہیں کرے گی۔ حضور عالی— (شبراتی کی طرف اشارہ کر کے) اِس شخص کو سزا دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ حقائق کا خون کیا جائے— نام و نمود اور شہرت کے پیچھے دوڑنے والوں کو ہر قسم کے ارتکاب جرم کی اجازت دے دی جائے۔ جیسا کہ ڈاکٹر صاحبان کا کیس ہے— اور یہ ثابت کر دیا جائے کہ شوقِ تحقیق نے ہمیں اس قدر دیوانہ بنا دیا ہے کہ ہم اپنی انسانیت اور اعلیٰ جذبات کھو چکے ہیں— مائی لارڈ— کون کہہ سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحبان نے اس شخص کی گرفتاری کے بعد لاش قبر سے نہیں نکالی ہے۔ (غور سے ڈاکٹروں کا چہرہ دیکھتا ہے جن پر خوف پریشانی اور گھبراہٹ ہے)— مائی لارڈ میں عدالت عالیہ سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ کسی نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے نفس معاملہ کی

اچھی طرح تحقیقات کرے— حضور عالی!— عدالت ایک کسوٹی ہے جو انصاف دلائل کی بنا پر نہیں کرتی اور نہ انصاف بھیک کے طور پر دیتی ہے بلکہ واقعات اور حقائق کی روشنی میں کھرا اور کھوٹا پرکھتی ہے— مائی لارڈ — کیا میں اُمید کروں کہ اِس پھٹے پرانے کپڑوں میں کھڑے ہوئے شخص کو اِس کی مفلسی کی سزا نہ دی جائے گی جب کہ ایک ایسا انصاف کیا جائے گا جو آئندہ کے لیے نمونہ ہوگا۔

(وکیل اپنی جگہ پر بیٹھ جاتا ہے۔ شبراتی کے چہرہ پر اُمید و بیم کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ جج کچھ لکھنے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر اٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن انسپکٹر انھیں روک دیتا ہے۔ گلشن اور شبراتی کی نظریں چار ہوتی ہیں تو شبراتی نفرت سے منہ دوسری جانب کرلیتا ہے۔ جج فیصلہ سناتا ہے۔ کمرۂ عدالت پر خاموشی طاری ہوجاتی ہے)۔

جج : حکم دیا جاتا ہے کہ معاملہ کی تحقیقات کے واسطے ڈاکٹر عمر اور ڈاکٹر زیدی کو حراست میں لے لیا جائے اور فوراً اُن کی تجربہ گاہ پر لاش کی تلاش کرائی جائے اور تجربہ گاہ میں نہ ملنے کی صورت میں بحکم عدالت قبر کھود کر لاش دیکھی جائے۔

(عدالت برخاست ہوجاتی ہے۔ ڈاکٹر پولیس کی حراست میں لے لیے جاتے ہیں)۔

(پردہ)

تیسرا ایکٹ

پہلا سین

(پولیس اسٹیشن کے سامنے کی سڑک۔ پولیس اسٹیشن کے پھاٹک پر ایک بڑا درخت اور کچھ جھاڑیاں ہیں۔ ان جھاڑیوں میں گلشن بیٹھی ہے۔ سڑک پر لوگوں کی آمد و رفت ہے۔ دو نوجوان جو صورت سے طالب علم معلوم ہوتے ہیں گلشن کے پاس سے گزرتے ہیں ان میں سے ایک گلشن کو دیکھ کر)

ایک نوجوان :یار رمیش غضب کی چیز ہے۔
دوسرا نوجوان: کون؟— کدھر ہے۔
پہلا نوجوان: (گلشن کی طرف اشارہ کرکے) وہ دیکھو— کیا اندھے ہوئے چلتے ہو۔
دوسرا نوجوان: ابے ہاں یار— غضب کی حسین ہے۔
پہلا نوجوان: بعض وقت قدرت بھی ہم کنواروں سے مذاق کرتی ہے۔
دوسرا نوجوان: چلو دو چار گالیاں بھی سن لیں— (دونوں گلشن کی جانب بڑھتے ہیں۔ دوسرا ایک دم چونک کر سائیکل پر آتے ہوئے ایک شخص کو اشارہ کرکے) ارے پروفیسر ریاض آرہے ہیں۔
(دونوں تیز تیز سڑک پر چلنے لگتے ہیں)
گلشن کسی گہری سوچ میں بیٹھی رہتی ہے۔ ایک بوڑھا سپاہی پاس سے گزرتا ہے)

گلشن : جمعدار صاحب!

سپاہی : (پلٹ کر گلشن کو دیکھ) کون ہے؟— ارے گلشن— یہاں کیا کررہی ہے بیٹا—

گلشن : ان کا پوچھنے آئی تھی۔ وہ خیریت سے تو ہیں۔

سپاہی : کون شبراتی؟— اچھا ایک گانا سنا دے پھر تجھے ایک خوش خبری سناؤں۔

گلشن : کیا خوش خبری جمعدار صاحب۔

سپاہی : (مسکرا کر)— پہلے گانا—

گلشن : پہلے خوشخبری۔

سپاہی : اچھا تو— سن— جرم ڈاکٹروں پر ثابت ہوگیا ہے اور لاش ان کی تجربہ گاہ سے برآمد ہوگئی ہے۔

گلشن : (خوشی سے کھڑی ہوکر) سچ مچ جمعدار صاحب— وہ رہا—

سپاہی : ہاں۔ ہاں— وہ آج ہی رہا ہونے والا ہے۔ (گلشن خوشی سے ناچنے لگتی ہے۔ اور خوش ہو ہو کر گاتی ہے)

(گانے کے دوران میں لوگوں کا کافی مجمع ہوجاتا ہے اور وہ ایک دائرہ بنا کر

کھڑے ہوجاتے ہیں۔ گانے کے دوران میں لوگ گلشن کو پیسے بھی دیتے جاتے ہیں۔ گانا ختم ہونے کے بعد یہ مجمع چھٹ جاتا ہے۔ گلشن سڑک کی دوسری جانب مالی کی دکان سے ایک ہار خرید کر پھر اپنی جگہ پر آبیٹھتی ہے۔ شبراتی آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جو آہستہ آہستہ قدموں سے چل رہا ہے گلشن اٹھ کر بار بار اُس کی جانب بڑھنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن پھر رک جاتی ہے۔ شبراتی اپنی دُھن میں کچھ سوچتا ہوا اس کے پاس سے گزر جاتا ہے۔ گلشن بہ مشکل اپنے جذبات پر قابو پاکر آگے بڑھ کر ہار اُس کے گلے میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے)

گلشن : شبراتی— میرے اچھے شبراتی۔

(شبراتی نفرت سے گلشن کو دیکھتا ہے اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ گلشن ...... ہار اس کے گلے میں ڈال کر)

گلشن : میرے اچھے شبراتی— (شبراتی غصہ سے ہار کو نوچ کر پھینک دیتا ہے اور آگے بڑھ جاتا ہے) آخر تمھیں ہو کیا گیا ہے۔

شبراتی : (غصہ سے پلٹ کر گلشن کو دیکھ کر) پاگل ہوگیا ہوں۔ (نفرت سے) رہیں ناخودداری بیچنے والی بھکارن (آگے بڑھ جاتا ہے)

گلشن : (شبراتی کا ہاتھ پکڑ کر) شبراتی کیا میری محبت کا یہی بدلہ ہے۔

شبراتی : (نفرت)۔ ہوں۔ محبت کا بدلہ (غصہ سے ہاتھ کو جھٹکا دے کر) یہ نفرت کی پہلی سیڑھی ہے۔

گلشن : (تعجب سے) نفرت؟ کیوں آخر۔

شبراتی : (غصہ سے) یہ اپنے انسپکٹر صاحب سے پوچھو۔ جن کے مخملی گدوں، آرام دہ کوٹھی اور تیز رفتار موٹر نے تمھاری آنکھوں میں چکاچوند پیدا کردی۔

(گلشن ایک دم ٹھٹک کر کھڑی ہوجاتی ہے اور نفرت سے شبراتی کا چہرہ دیکھتی ہے پھر غصہ سے)

گلشن : کمینے کہیں کے— ہونا مردوں کا مال کھانے والے سیاہ قلب۔

(دونوں ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور مختلف اطراف میں۔ آہستہ آہستہ قدموں سے روانہ ہو جاتے ہیں۔ سیدھی سڑک پر دور تک جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن مڑ کر ایک دوسرے کو نہیں دیکھتے۔)

(پردہ)

دوسرا سین

(قبرستان کا منظر۔ وہی پگڈنڈی۔ وہی قبر شبراتی اِس پختہ قبر پر بیٹھا ہے جس پر بیٹھ کر وہ گلشن سے ملاقات کیا کرتا تھا۔ انگلی سے قبر پر شکلیں بناتا ہے اور مٹا دیتا ہے۔ اس کی ماں پاس آ کر کھڑی ہو جاتی ہے)

سکینہ : بیٹا— آخر تمھیں ہو کیا گیا ہے۔ نہ کھاتے ہو۔ نہ پیتے ہو۔ تمھاری وجہ سے ہم لوگوں کا کھانا پینا حرام ہو گیا ہے۔

شبراتی : ماں— (خاموش ہو جاتا ہے)

سکینہ : اب بیٹا دیکھو نا— تم ہی ہمارا سہارا ہو۔ جب تمھاری یہ حالت ہوگی۔ تو ہم کیسے زندہ رہ سکیں گے۔

شبراتی : ماں— میں دل کو بہت بہلانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر—

سکینہ : اب بیٹا تم ہی سوچو۔ بھلا اِس طرح پریشان ہونے سے کیا ہوگا۔

شبراتی : کچھ بھی ہو ماں— لیکن میرا دل بار بار یہی سوال کرتا ہے کہ آخر اس نے ایسا کیا ہی کیوں۔ کیا وہ اس قدر خود غرض ہو سکتی ہے۔

سکینہ : بیسویں صدی ہے بیٹا— بیسویں— خود غرضی ہی کا زمانہ ہے۔

شبراتی : لیکن ماں— اگر میں نے غصہ میں کچھ کہہ بھی دیا تو اُسے چلا تو نہ جانا چاہیے تھا۔

سکینہ : ہاں بیٹا— لیکن اب تم اس کے متعلق سوچتے ہی کیوں ہو— اگر تم کہو تو میں اس کو منا لاؤں۔

شبراتی : نہیں ماں — ہرگز نہیں — ہم غریبوں کے پاس عزت کے علاوہ اور ہے ہی کیا۔ اُسے تو ہم یوں برباد نہ ہونے دیں گے — ماں — میں اس سے نفرت کرتا ہوں — آخر پھر وہ یاد کیوں آتی ہے۔

سکینہ : بھول جانے کی کوشش کرو بیٹا۔

شبراتی : لیکن میں اسے بھول بھی تو نہیں سکتا۔

سکینہ : اچھا چلو — کھانا کھالو — تمھارے بوڑھے باپ نے ابھی تک کچھ بھی نہیں کھایا ہے۔

شبراتی : لیکن ماں مجھے تو بھوک نہیں۔

سکینہ : کیسے نہیں۔

شبراتی : سچ کہہ رہا ہوں ماں۔

سکینہ : اگر تم نہیں کھاؤ گے تو ہم بھی نہیں کھائیں گے۔
(شبراتی کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنے لگتی ہے۔)

(پردہ)

تیسرا سین

(شبراتی کا قبرستان والا مکان۔ مکان کے سامنے والے میدان میں ایک کار آکر رکتی ہے کار سے انسپکٹر پولیس اُتر کر دروازہ کے پاس جاتا ہے۔ کچھ دیر سوچتا رہتا ہے۔ پھر آہستہ سے آواز دیتا ہے)۔

انسپکٹر : شبراتی — اباں شبراتی۔

شبراتی کی آواز: کون ہے؟

انسپکٹر : ذرا باہر آنا — (خاموشی سے کھڑا ہوجاتا ہے، شبراتی دروازہ کھول کر باہر نکلتا ہے۔ انسپکٹر کو دیکھ کر ایک دم غصہ سے)

شبراتی : اب کیسے تشریف لائے ہیں یہاں (نفرت سے) بدقسمتی سے یہاں کوئی حسین

اور جوان عورت نہیں ہے۔

انسپکٹر : (کچھ گھبرا کر)— لیکن میں— اس لیے تو نہیں آیا۔

شبراتی : دونوں ہاتھ بڑھا کر) تو پھر لیجیے۔ نکالیے ہتھکڑیاں—

انسپکٹر : (پریشان سا ہو کر) خدا کے لیے شبراتی میری بھی تو سنو—

شبراتی : معاف کیجیے گا— انسپکٹر صاحب! میرے سینہ میں وہ دل نہیں ہے جسے آپ بہلانا چاہتے ہیں انسپکٹر صاحب!— (جوش میں)— اگر آپ کے پاس جوانی اور دولت ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ غریبوں کے جذبات سے کھیلیں— اور اگر آپ کے پاس حکومت ہے تو اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ آپ غریبوں کی محبت اور عصمت کا مذاق اڑائیں اور غریب کے پھٹے ہوئے کپڑوں سے ناجائز فائدہ حاصل کریں۔

انسپکٹر : لیکن میرے— بھائی— میری بھی تو سن۔

شبراتی : آپ کی سنوں— یہی کہیں گے آپ کہ میں نے تمھیں رہا کرانے کی کوشش کی— اس لیے کہ میں گلشن سے محبت کرتا تھا— اور وہ تم سے محبت کرتی تھی اور میں اب بھی گلشن سے محبت کرتا ہوں۔ (نفرت کے لہجے میں) آپ انسپکٹر صاحب!— گلشن کی حسن و جوانی سے خوب رس چوسیے۔ مجھے اس سے کیا— اب میں اس سے نفرت کرتا ہوں— سخت نفرت۔

انسپکٹر : لیکن میں کہنا یہ چاہتا تھا شبراتی کہ تمھیں سخت غلط فہمی ہوئی ہے۔

شبراتی : (نفرت سے)— ہُنہ— غلط فہمی— جی ہاں غلط فہمی ہی ہوئی ہے— کہ میں نے ایک بھکارن سے محبت کی جس کا کوئی ضمیر نہیں۔ جو کسی ایک سے محبت نہیں کرسکتی۔ جو اسے پیسہ دے دے وہ اس سے محبت کرتی ہے۔

انسپکٹر : شبراتی۔ گلشن اب بھی تم سے محبت کرتی ہے۔

شبراتی : (پاگلوں کی طرح قہقہہ لگا کر)— ضرور کرتی ہے اسی لیے تاکہ اس کی جوانی و حسن تیز رفتار موٹر، عالیشان کوٹھی— قیمتی لباس اور انسپکٹر نام پر بھینٹ ہوچکی

ہے — اب مجھ سے محبت نہیں کرے گی۔ تو کس سے محبت کرے گی — اچھا انسپکٹر صاحب۔ السلام علیکم (پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتا — (قبرستان کی طرف چلا جاتا ہے۔ انسپکٹر حیرت سے اُسے تاکتا رہتا ہے)۔

(پردہ)

چوتھا سین

(ایک سڑک کا منظر۔ سڑک پر لوگوں کی کافی آمد و رفت۔ موٹر، سائیکلیں تانگہ وغیرہ گزر رہے ہیں۔ چوراہے پر گلشن کھڑی ہے۔ چہرہ سے وحشت معلوم ہوتی ہے۔ ایک شخص جو ایک پھٹا ہوا سا سوٹ پہنے ہے۔ پاگلوں کی طرح صدا لگاتا ہوا گزر رہا ہے۔ کبھی کبھی پاگلوں کی طرح قہقہے بھی لگا دیتا ہے۔ اس کے چہرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شریف خاندانی اور تعلیم یافتہ ہے لیکن حوادثِ روزگار اور ناکامیوں نے اس کا دماغ ماؤف کردیا ہے)۔

نوجوان کی صدا: لوگو زندگی کا نام ٹریجڈی ہے — اور وہی زندگی کامیاب ہے جس کا انجام ٹریجڈی ہو۔ (گلشن کے چہرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی سے اکتا چکی ہے۔ اس کا حسن اور جوانی سے معلوم ہوتا ہے جیسے اجڑی ہوئی دوکان ہے۔ لوگوں کو گھور گھور کر دیکھنا اور پھر اس پر عجیب و غریب حرکات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے ہوش و حواس کھوچکی ہے۔ اول تو اگر کوئی اس کو پیسہ بطور خیرات دیتا ہے تو وہ لینے کے واسطے ہاتھ نہیں بڑھاتی — اور اگر بڑھاتی ہے تو مجذوبوں کی طرح بڑ لگاتی ہے۔ ''کسی کے ساتھ احسان نہ کرو۔ ورنہ تمھیں پچھتانا پڑے گا۔ محبت دھوکہ ہے۔'' انسپکٹر آہستہ آہستہ اپنی کار لیے آرہا ہے۔ موٹر گلشن کے پاس کھڑی کرکے)

انسپکٹر : گلشن!

گلشن : (اسی طرح بڑبڑاتے ہوئے) کسی کے ساتھ احسان نہ کرو۔ ورنہ تمھیں پچھتانا

پڑے گا— محبت ایک دھوکا ہے (پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتی ہے۔ دو شخص پاس سے گزرتے ہیں)

ایک : بیچاری پاگل ہوگئی ہے۔

دوسرا : (شرارت سے گلشن کی طرف مسکرا کر) لیکن ہے— جوان اور حسین۔

(دونوں گزر جاتے ہیں۔ انسپکٹر موٹر سے اُتر کر گلشن کے پاس آتا ہے)۔

انسپکٹر : گلشن۔

گلشن : ہاہاہا— انسپکٹر صاحب— (انسپکٹر کے چہرہ کو پاگلوں کی طرح گھور کر)— میں کس قدر حسین ہوں ہاہاہا۔

انسپکٹر : گلشن— میں شبراتی کو بلاؤں؟

گلشن : شبراتی — ہاہاہا— مردوں کا مال کھانے والا۔ سیاہ قلب— اور میں— خودداری فروخت کرنے والی بھکارن جو دوسروں کو بھیک میں اپنی جوانی اور حسن دیتی ہے— (انسپکٹر کی طرف اشارہ کرکے) اور آپ— عالیشان کوٹھی کے مالک تیز رفتار موٹر پر چڑھنے والے— اور مخملی گدوں پر آرام کرنے والے انسپکٹر۔ (پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتی ہے)

انسپکٹر : اچھا گلشن— تم یہیں انتظار کرو— میں شبراتی کو لے کر ابھی آتا ہوں—

گلشن : نہیں نہیں— میں اس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔ مجھے اِس سے نفرت ہے۔

(پاگلوں کی طرح سڑک پر ایک طرف بھاگ جاتی ہے انسپکٹر کچھ دیر سوچتا رہتا ہے پھر موٹر میں بیٹھ کر تیزی سے ایک جانب چلا جاتا ہے)۔

(پردہ)

پانچواں سین

(قبرستان کا منظر۔ ایک مردہ ابھی دفن ہوا ہے لوگ آہستہ آہستہ قبرستان کی پگڈنڈی پر سے گزر رہے ہیں۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں۔ بادل

گرج رہے ہیں۔ بجلی چمک رہی ہے۔ شبراتی ایک قبر کے پاس کھڑا ہے۔ انسپکٹر دوسری جانب سے تیز تیز چلا آ رہا ہے۔ کچھ پریشان سا معلوم ہوتا ہے۔ اور کچھ سوچ بھی رہا ہے۔ شبراتی کے چہرہ پر بھی پریشانی ہے۔ غم و رنج کی ایک مکمل تصویر معلوم ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برسوں کا بیمار ہے۔ انسپکٹر شبراتی کے قریب آ کر ۔۔۔)

انسپکٹر : شبراتی۔

شبراتی : (نفرت سے انسپکٹر کا چہرہ دیکھ کر) فرمایئے۔

انسپکٹر : کیا کر رہے ہو۔

شبراتی : (طنزیہ) کفن یا مردہ نہیں چرا رہا ہوں۔

انسپکٹر : (پریشان ہو کر) خدا کے لیے میری بات سنو۔

شبراتی : (طنزیہ مسکرا کر) یہی کہیں گے آپ کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔

انسپکٹر : ہاں ۔۔۔ یہی کہوں گا۔

شبراتی : اور یہ میں سن چکا ہوں۔

انسپکٹر : (پریشان ہو کر) بخدا شبراتی ۔۔۔ یہ صحیح ہے ۔۔۔ میں حلفیہ کہتا ہوں کہ جس روز میں نے گلشن کو اپنی کوٹھی پر بلایا تھا۔ اسی روز سے میں نے اسے اپنی بہن بنا لیا ہے۔

شبراتی : (چونک کر) ۔۔۔ بہن ۔۔۔

انسپکٹر : بہن ۔۔۔ خدا کے لیے شبراتی اس پر یقین کرو اور چلو ۔۔۔ ورنہ اِس پاگل پن میں دیوانی ہو جائے گی ۔۔۔

شبراتی : پاگل پن میں ۔۔۔

انسپکٹر : ہاں ۔۔۔ وہ آدھی پاگل ہو گئی ہے ۔۔۔ خدا کے لیے جلدی چلو ۔۔۔

شبراتی : (گھبرا کر) لیکن وہ ہے کہاں۔

انسپکٹر : (شبراتی کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے) بس چلو ۔۔۔ ورنہ ۔۔۔ وہ ۔۔۔

شبراتی : (گھبرا کر پگڈنڈی پر دوڑتے ہوئے)— چلیے (دونوں پگڈنڈی پر دوڑنے لگتے ہیں)۔

(پردہ)

چھٹا سین

(ایک سڑک کا منظر، بادل گرج رہے ہیں۔ بجلی چمک رہی ہے اور موسلا دھار بارش شروع ہو چکی ہے۔ سڑک پر دور ایک چوراہا نظر آرہا ہے۔ بارش کا پانی سڑک پر بہہ رہا ہے۔ گلشن بے تحاشہ سڑک پر دوڑی چلی جارہی ہے۔ دور سے انسپکٹر کی کار آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ گلشن مڑ کر موٹر کو دیکھتی ہے اور پھر بھاگنے لگتی ہے۔ موٹر گلشن سے قریب تر ہوتی جاتی ہے۔ شبراتی کے چلانے کی آواز آرہی ہے۔ ''گلشن، گلشن'' شبراتی موٹر میں سے جھانک رہا ہے۔ جب موٹر اور گلشن سے قریب ہو جاتی ہے تو شبراتی گھبرا کر چلتی موٹر سے کود پڑتا ہے اور سڑک پر گر جاتا ہے۔ سر اور منہ سے خون بہنے لگتا ہے مگر وہ اس سے بے نیاز پھر اٹھ کر گلشن کے پیچھے دوڑتا ہے۔

شبراتی : گلشن۔ خدا کے لیے رک جاؤ میں آرہا ہوں۔

انسپکٹر : (موٹر سے اُتر کر) گلشن ٹھہر جاؤ۔

(گلشن برابر بھاگتی رہتی ہے۔ انسپکٹر بھی ان دونوں کے پیچھے بھاگنے لگتا ہے۔ چوراہے کے قریب جا کر شبراتی گلشن کو پکڑ لیتا ہے۔ چوراہا پر ایک موٹر دوسری طرف سے آکر مڑتی ہے۔ گلشن اور شبراتی موٹر سے ٹکرا جاتے ہیں اور دونوں سڑک پر گر جاتے ہیں۔ گلشن کا سر شبراتی کے سینہ پر ہوتا ہے۔ دو مردہ جسم ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوتے ہیں۔ انسپکٹر کھڑا ہوا دونوں کو حسرت سے دیکھ رہا ہے)۔

(پردہ)

(مطبوعہ: 'نیرنگِ خیال'، لاہور)

مریم و زلیخا

کردار

(1) عشرت (ایک نوجوان پروفیسر) (2) زلیخا (عشرت کی بہن) (3) انوار صاحب (عشرت کے چچا) (4) خالدہ (انوار صاحب کی بیوی) (5) مریم (انوار صاحب کی بیٹی) (6) ریاض صاحب (انوار صاحب کے بھائی) (7) بیگم ریاض (ریاض صاحب کی بیوی) (8) انور (ریاض صاحب کا لڑکا) (9) عابد (انور کا دوست) (10) شہناز (انور کی دوست۔ ایک سوسائٹی پسند خاتون) (11) اکرم (عشرت کا خالہ زاد بھائی)...... ملازم وغیرہ

پہلا ایکٹ

پہلا سین

(انوار صاحب کا کمرہ۔ کمرہ کی آرائش درمیانی طبقہ کے لوگوں کی طرح ہے۔ کمرہ میں دری کا فرش ہے۔ مغربی جانب ایک تخت بچھا ہے جس پر سفید فرش ہے۔ فرش پر ایک قالین ہے اور ایک بڑا تکیہ رکھا ہے۔ مشرقی جانب ایک سنگار میز ہے جس پر قد آدم آئینہ لگا ہے، دیواروں پر قرآنی آیات آویزاں

ہیں۔ مشرقی جانب دیواروں پر مولانا محمد علی اور ...... محمد علی جناح کی تصاویر آویزاں ہیں۔ سنگار میز کے پاس ایک دروازہ ہے، جس کے سامنے ایک برآمدہ اور زینہ نظر آرہا ہے۔ دروازہ کی جانب ایک چھوٹی سی میز رکھی ہے جس پر رحل پر ایک قرآن رکھا ہے۔ جنوبی جانب بھی ایک دروازہ ہے جو دوسرے دروازے کھلتا ہے۔ اس پر بھی پردے پڑے ہیں۔ درمیان کے کمرہ میں ایک میز رکھی ہے۔ جس پر کچھ اخبار اور رسائل بے ترتیب پڑے ہیں۔ تخت کے پاس ایک کھڑکی ہے جس میں سے دور تک شہر کا منظر اور ایک مسجد کے مینار نظر آتے ہیں۔ شام کا وقت ہے کھڑکی میں سے غروب آفتاب کا منظر دکھائی دے رہا ہے۔ سورج کی ہلکی ہلکی شعاعیں داخل ہورہی ہیں۔ انوار صاحب کمرہ میں بے صبری سے ٹہل رہے ہیں۔ انوار صاحب ایک معمر انسان ہیں اور انتہائی سادہ لباس پہنتے ہیں۔ خالدہ تخت پر بیٹھی ہیں ان کی عمر تقریباً 35 سال کے قریب ہے۔ وہ بھی انتہائی سادہ لباس پہنتی ہیں۔

انوار صاحب: (مشرقی دروازہ سے باہر جھانکتے ہوئے) بہت دیر کردی ان لوگوں نے۔ (کمرہ میں ٹہلنے لگتے ہیں پھر خود ہی سے باتیں کرتے ہوئے) گاڑی لیٹ ہوگئی ہوگی (خالدہ کے پاس جاکر) بزرگوں نے سچ کہا ہے عورتوں کی عقل گدی میں ہوتی ہے۔ بلاوجہ تمھارا کہا مانا۔ مجھے اسٹیشن جانا ہی چاہیے تھا (پھر بے صبری سے کمرہ میں ٹہلنے لگتے ہیں۔ کھڑکی کے پاس جاکر غروب آفتاب کا منظر دیکھتے ہیں پھر گھڑی دیکھ کر) ابھی وقت ہے۔ میں اسٹیشن پہنچ سکتا ہوں۔

خالدہ : کیوں جی۔ کیا عشرت کے ساتھ زلیخا بھی آرہی ہے۔

انوار صاحب: تمھارا تو دماغ خراب ہوگیا ہے۔ ساتھ نہیں لائے گا تو تمھارے بھروسے پر وہاں چھوڑ آئے گا (ٹہلنے لگتے ہیں) اسٹیشن نہ جاکر میں نے بھی کیا غلطی کی ہے۔ مگر ان بیچاروں نے بھی بڑی مصیبتیں برداشت کیں۔ کسی سے مدد تو کجا۔ ہمدردی کی بھی خواہش نہیں کی (گھڑی دیکھ کر) گاڑی آئے ہوئے

تو آدھ گھنٹہ ہو گیا ہوگا۔

خالدہ : (مسکرا کر) کتنی مرتبہ کہا کہ اس گھڑی کو پنشن دے دیجیے۔ آپ کی عمر سے تو زیادہ ہوگی اس کی عمر— ؟

انوارصاحب: آپ کو تو مذاق سوجھا ہے— (ٹہلنے لگتے ہیں۔ میز کے پاس جا کر اخباروں کو اُلٹ پلٹ کرتے ہیں عشرت اور زلیخا مشرقی دروازہ سے داخل ہوتے ہیں۔ عشرت ایک خوبصورت نوجوان ہے صرف قمیض اور پتلون پہنے ہے۔ دراز قد ہے۔ زلیخا ایک دبلی پتلی خاتون ہے۔ عمر اٹھارہ سال سے زیادہ نہیں۔ چہرہ پر معصومیت ہے۔ ہلکی گلابی رنگ کی ساڑی پہنے ہے)

عشرت : چچا جان۔ آداب عرض ہے۔

انوارصاحب: (فوراً مڑ کر) اوہ۔ بیٹا تم آ گئے۔ میں تو تمھارا ہی انتظار کر رہا تھا— (دوڑ کر بغل گیر ہوتے ہوئے) بہت دیر کی تم نے؟

خالدہ : (تخت سے اُتر کر) کہو بیٹی زلیخا— اچھی تو ہو۔

زلیخا : (شرما کر) آداب عرض ہے چچی جان

انوارصاحب: (زلیخا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) زلیخا بیٹی اچھی تو تھیں۔

زلیخا : (شرما کر نیچی نگاہیں کر کے) دعا ہے آپ کی۔

انوارصاحب: یہ زلیخا تو چار سال میں کافی بڑی ہوگئی۔ جس وقت میں نے اسے دیکھا تھا یہ ایک چھوٹی سی گڑیا تھی۔

زلیخا : (شرما کر مسکراتے ہوئے) تو چچا آپ کا خیال ہے کہ میں ہمیشہ اتنی ہی بڑی رہتی (کمرہ میں چاروں طرف دیکھ کر) مریم آپا کہاں ہیں۔

خالدہ : (ذرا بلند آواز سے) اری مریم— او مریم— دیکھو کمبخت جانے کہاں ہوگئی۔

مریم کی آواز: آئی امی!— (جنوبی دروازہ سے داخل ہوتی ہے)

انوارصاحب: دیکھ بیٹی— یہ عشرت آیا ہے۔ تیرا بھائی ہے۔ سلام کر۔

مریم : (شرما کر) بھائی جان آداب عرض ہے۔

عشرت : (مسکرا کر) کہو مریم اچھی تو ہو— بھئی تم تو بالکل بدل گئی ہو— (شرارت سے) اب پہلی سی چھچھوندر نہیں رہیں (مریم شرما کر نیچی نظریں کرلیتی ہے)

انوار صاحب: بیٹا! مجھے یہ سن کر بے حد مسرت ہوئی کہ تم یہاں پروفیسر ہوکر آرہے ہو— (زلیخا سے مخاطب ہوکر)— کیوں زلیخا تو بھی کچھ پڑھتی پڑھاتی ہے یا نہیں۔

عشرت : جی ہاں چچا جان۔ اس نے اسی سال میٹرک پاس کیا ہے۔ اب اس کا ارادہ آرٹ کالج میں داخلہ لینے کا ہے۔ مصوری سے اسے کافی شوق ہے۔

انوار صاحب: نہیں بھئی— مجھے لڑکیوں کا کالج میں پڑھنا بالکل پسند نہیں— اور کیا یہ پردہ نہیں کرتی؟

عشرت : پردہ تو کرتی ہے— یہاں کئی گرلس آرٹ کالج بھی تو ہیں۔

انوار صاحب: پھر تو کوئی ہرج نہیں (مریم سے مخاطب ہوکر) اری بیٹی بہن بھائی کے لیے چائے لانا— (مریم جانے کے واسطے مڑتی ہے)

عشرت : رہنے دو مریم— (مریم رک جاتی ہے۔ انوار صاحب سے مخاطب ہوکر) چچا جان پہلے غسل وغیرہ کرلیا جائے کافی تکان ہوگئی ہے۔

انوار صاحب: ہاں ہاں۔ ضرور ضرور— تمھارا سامان وغیرہ کہاں ہے؟

عشرت : آپ کا ملازم لا رہا ہے۔

انوار صاحب: اچھا تو تم غسل وغیرہ کرو۔ مریم چائے کا انتظام کرتی ہے۔ (عشرت اور زلیخا جنوبی دروازہ کی جانب مڑتے ہیں) اور ہاں بیٹا عشرت اب تمھیں ہمارا بھی ایک کام کرنا ہوگا۔

عشرت : (رُک کر) فرمایئے۔ میں حاضر ہوں۔

انوار صاحب: (مریم کی طرف اشارہ کرکے) اسے بھی پڑھنے لکھنے کا بہت شوق ہے۔ اب تمھیں اسے پڑھانا ہوگا۔

عشرت : اگر میں آپ کی کوئی خدمت کرسکوں تو اسے اپنے لیے باعث فخر تصور کروں

گا۔ (شرارت آمیز مسکراہٹ سے مریم کو مخاطب کر کے) لیکن صاحب یاد رہے میں اپنے شاگردوں کو پیٹتا بہت ہوں۔

مریم : (شرما کر) اگر کوئی شاگرد آپ کو اس کا موقع ہی نہ دے۔

عشرت : (مسکرا کر) تو میں ایسے مواقع پیدا کر لیتا ہوں (سب قہقہہ لگاتے ہیں)

انوار صاحب: مگر بھئی، تم لوگ اتنے روز رہے کہاں۔

خالدہ : اے ہے— سب کچھ اسی وقت پوچھ لوگے— بچے تھکے ماندے آئے ہیں کچھ دم لینے دو— یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی— تم تو بالکل سٹھیا گئے ہو۔

عشرت : (مسکرا کر) چچی جان ہرج ہی کیا ہے۔ بزرگ اپنے بچوں کی گزشتہ زندگی سے خوش اور آئندہ زندگی کے تصورات سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

انوار صاحب: تمھاری چچی کو تو لڑنے کا ہیضہ ہے— ہاں بھئی— اب تم لوگ غسل وغیرہ کر لو— (مریم سے) جاؤ بیٹی تم چائے کا انتظام کرو اور ہاں عشرت اسے اپنا ہی گھر سمجھو— گرم پانی کی ضرورت ہو تو کہہ دو۔

عشرت : (مسکرا کر) چچا جان! میں تکلف تو نہیں کروں گا۔

(پردہ)

دوسرا سین

(اکرم کا کمرہ۔ ہر چیز بے ترتیب۔ کمرہ میں ہزاروں جلی ہوئی سگریٹوں کے ٹکڑے۔ دو چار کرسیاں۔ ایک چار پائی شکستہ اور خستہ حالت میں۔ جس میں ایک پایہ نہ ہونے کی وجہ سے پایہ کی جگہ کرسی رکھ دی ہے۔ جنوبی جانب ایک دروازہ ہے جس کے پاس ایک پرانا سا پیانو رکھا ہے جس پر گرد جمی ہوئی ہے۔ تمام کمرہ میں ردی کاغذات اور پھٹے ہوئے اخباروں کے ٹکڑے پڑے ہیں۔ شرقی جانب چار پائی بچھی ہے جس کے پاس ایک کھڑکی ہے جو کھلی ہوئی ہے۔ آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔ جس کی شعاعیں کھڑکی میں سے داخل

ہو رہی ہیں۔ کھڑکی میں سے دور تک کا منظر دکھائی دے رہا ہے۔ جنوبی جانب ایک پردہ ہے جس پر ایک نامکمل تصویر بنی ہے۔ اس کے پاس ایک چھوٹی سی میز رکھی ہے جس پر مصوری کا سامان بے ترتیب پڑا ہے۔ ٹوٹے جوتے، اور میلے کپڑے تمام کمرہ میں بکھرے پڑے ہیں۔ طاق میں ایک ٹائم پیس رکھی ہے۔ اکرم چارپائی پر پڑا سو رہا ہے ایک پھٹا ہوا سا لحاف اوڑھے ہے۔ اکرم ایک دبلا پتلا اور دراز قد نوجوان ہے چہرہ سے لاابالی پن ظاہر ہے۔ سورج کی شعاعیں اکرم کے چہرہ پر پڑ رہی ہیں۔ اکرم کروٹ تبدیل کر کے لیٹ جاتا ہے کچھ دیر لیٹا رہتا ہے پھر اٹھ کر بیٹھتا ہے۔ تکیہ کے نیچے سے سگریٹ کا پیکٹ نکالتا ہے۔ پیکٹ میں سگریٹ نہ ہونے کی وجہ سے ایک عجیب طنزیہ مسکراہٹ مسکراتا ہے۔ پھر سورج کو دیکھ کر)۔

اکرم : معلوم ہوتا ہے کہ اب نظامِ قدرت میں بھی تبدیلیاں شروع ہو گئی ہیں۔ ابھی پانچ بھی نہیں بجے اور سورج طلوع ہو گیا۔۔۔ (گھڑی ساڑھے نو بجاتی ہے۔ میں نظامِ فلکی کے مہتمم کو اس کی شکایت لکھوں گا (ایک انگڑائی لیتا ہے پھر اٹھ کر آہستہ آہستہ پیانو کے پاس جاتا ہے اور الٹی سیدھی انگلیاں مارنے لگتا ہے) اب یہ بیچارا بھی بہت پرانا ہو گیا ہے۔

(پھر پیانو کے پاس بیٹھ کر اقبال کی مندرجہ ذیل غزل گاتا ہے)

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمھارے پیامی نے سب راز کھولے
خطا اس میں بندہ کی سرکار کیا تھی!
تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی!

کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی!

(اٹھ کر کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے پھر کیلنڈر کو دیکھ کر)

اکرم : ہیں۔کل 23 تاریخ تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج 24 یعنی دس بجنے سے پہلے مجھے تین ماہ کا کرایہ ادا کرنا ہے (گھڑی کو دیکھ کر یہ لیجیے صرف پندرہ منٹ باقی رہ گئے ہیں (تیزی سے ایک پاجامہ اور قمیض اٹھا کر دروازہ کی جانب بڑھتا ہے۔ مالک مکان کا نوکر کلو داخل ہوتا ہے)

— کہو بھئی کلو اچھے تو ہو— بڑے سویرے آگئے آج تو—

کلو : میں تو اپنے وقت پر آیا ہوں— لیکن آپ کو بھاگنے میں دیر ہوگئی سرکار۔ (طنزیہ مسکراتا ہے) سرکار کا حکم ہے کہ جب تک کرایہ نہ گنوالوں آپ کو نہ جانے دوں۔

اکرم : ضرور! ضرور! کرایہ نا— (دروازہ کی جانب بڑھتا ہے)

کلو : تو لائیے— آپ کے یہاں چکر لگاتے لگاتے تو میرے پاؤں بھی ٹوٹ گئے۔

اکرم : ارے بھئی کوئی رسید وغیرہ بھی دو گے یا نہیں۔

کلو : (جیب سے ایک رسید نکال کر دیتے ہوئے) یہ لیجیے سرکار نے قبل ازوقت ہی لکھ دی تھی۔

اکرم : اچھا تو تم یہاں انتظار کرو— میں ابھی آیا۔ سمجھے۔

کلو : ابھی کیوں نہیں— مالک کا حکم ہے کہ جب تک کرایہ نہ گنوالوں آپ کو نہ جانے دوں۔

اکرم : اماں کلو۔ مذاق کرتے ہو۔ میرا سامان بھی تو ہے اسے بھی لے جانا ہے نا۔

کلو : کچھ بھی ہو— آپ کو پہلے کرایہ ادا کرنا ہوگا— (اکرم کی بغل میں کپڑوں کی طرف اشارہ کرکے) اور یہ کیا ہے؟

اکرم : میرے کپڑے ہیں۔ انھیں لانڈری میں دینا ہے۔ کلو آج تمھیں بھی انعام

ملے گا۔

کلو : آپ تو ہمیشہ ہی انعام دیا کرتے ہیں۔

اکرم : (مسکرا کر) بس آج لو۔۔۔ (آگے بڑھتا ہے)

کلو : (سامنے آ کر) پہلے کرایہ ادا کیجیے پھر جانے دوں گا۔

اکرم : (غصہ سے) عجیب بدتہذیب ہو۔۔۔ کہہ تو رہا ہوں ابھی ادا کروں گا۔۔۔ میرے پاس سو روپیہ کا نوٹ ہے۔ اسے بھی تو کیش کرانا ہے۔

کلو : لیکن دیکھیے آج ضرور ادا کر دیجیے گا۔

اکرم : (دروازہ کی جانب جاتے ہوئے۔۔۔ ضرور۔۔۔ تم بالکل مطمئن رہو۔

(کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ کلو کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے)

(پردہ)

تیسرا سین

(انوار صاحب کے مکان کا ایک دوسرا کمرہ۔ یہ کمرہ عشرت کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ اس میں بھی دری کا فرش ہے۔ مشرقی جانب ایک دروازہ ہے جس کے سامنے سے ایک سڑک گزرتی ہے۔ سڑک کچھ سنسان رہتی ہے۔ کبھی کبھی کوئی تانگہ یا سائیکل گزر جاتی ہے۔ کیونکہ اس کمرہ میں پردہ نشین خواتین کی آمد و رفت رہتی ہے اس واسطے پردے اور چق ہمیشہ پڑی رہتی ہے۔ جنوبی جانب ایک مسہری بچھی ہے جس کے پاس دائیں جانب ایک چھوٹی سی میز پر ٹیبل لیمپ رکھا ہے اور بائیں جانب ایک چھوٹی میز پر کتابوں کا بے ترتیب انبار ہے۔ مسہری کے پاس مغربی جانب دیوار کے پاس ایک میز رکھی ہے جس پر کتابیں قلم دوات اور دیگر ضروری سامان سلیقہ سے رکھا ہے۔ میز پر مریم اور زلیخا کے فوٹو جو عشرت نے اپنے کیمرہ سے اتارے ہیں رکھے ہیں۔ دیواروں پر اچھی سینریاں آویزاں ہیں۔ شمالی جانب ایک دروازہ

ہے جس کے سامنے برآمدہ ہے۔ برآمدہ کے سامنے صحن نظر آرہا ہے۔ درمیان کمرہ میں ایک میز رکھی ہے جس کے پاس دو ایک کرسیاں پڑی ہیں۔ شمالی دروازہ کے پاس آرام کرسی پر عشرت محو مطالعہ ہے۔ کچھ کتابیں پاس ہی فرش پر پڑی ہیں۔ صبح کا وقت ہے آفتاب طلوع ہو چکا ہے۔ عشرت کے چہرہ پر شگفتگی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتاب کے مطالعہ میں آس پاس کے ماحول سے قطعی بے نیاز ہے۔ مریم کمرہ میں داخل ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ دبے پاؤں عشرت کی آرام کرسی کی پشت پر آکر کھڑی ہوجاتی ہے۔ کچھ دیر مسکراتی ہے۔ پھر انگلی منہ میں لے کر کچھ سوچتی ہے پھر دونوں ہاتھ عشرت کے سر کی جانب بڑھاتی ہے پھر یکایک کسی خیال کے آجانے پر دونوں ہاتھ ہٹا لیتی ہے۔ مسکراکر)۔

مریم : ماسٹر صاحب

عشرت : ہیں— کون مریم؟

مریم : (سامنے آکر) جی ماسٹر صاحب— کیا آج—

عشرت : (قطع کلام کرکے) دیکھو مریم تم مجھے ماسٹر صاحب نہ کہا کرو۔

مریم : (شوخی سے) کیوں؟

عشرت : (مسکراکر) ماسٹر صاحب کا نام سُن کر میرے سامنے 20-25 روپیہ پانے والے غریب ماسٹر کا نقشہ— کھنچ جاتا ہے۔

مریم : (شوخی سے) اور آپ ہیں ایک پروفیسر دو سو روپیہ پانے والے۔

عشرت : نہیں یہ بات تو نہیں۔

مریم : اور کیا بات ہے۔ اچھا کیا کہا کروں آپ سے۔

عشرت : (کچھ سوچ کر) نام لیا کرو۔ اچھا کہا۔

مریم : لیکن نام لینا تو ادب کے خلاف ہے۔

عشرت : میں بھی تو تمھارا نام لیتا ہوں۔

مریم : آپ کو ضرور لینا چاہیے۔ (مسکرا کر) چائے پی جیے گا یا نہیں۔
عشرت : (شرارت سے مسکرا کر) اب آ کر چائے کی خبر لی آپ نے۔
مریم : میں تو آپ کا انتظار کر رہی تھی۔
عشرت : (مسکرا کر) لیکن میں تو چائے پی چکا ہوں۔
مریم : (تعجب سے)۔ کب؟
عشرت : (مسکرا کر) جب حضور مریم محو خواب تھیں۔
مریم : اچھا۔
عشرت : جی ہاں۔ کیا آج پڑھنے لکھنے کا ارادہ نہیں ہے؟
مریم : کیوں نہیں۔ ابھی لاؤں کتابیں۔
عشرت : یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ضرور لاؤ۔ (مریم کمرہ سے چلی جاتی ہے۔ عشرت کتاب بند کر کے رکھ دیتا ہے اور کسی گہری سوچ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کبھی چہرہ پر مسکراہٹ آتی ہے، کبھی فکر پھر کتاب اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگتا ہے۔ پھر مسکرا کر "لیکن یہ خواب حقیقت میں تبدیل نہ ہو جائے۔" مسکراتا ہے مریم داخل ہوتی ہے)
عشرت : لے آئیں کتابیں؟
مریم : جی ہاں (جا کر درمیانی کمرہ والی میز پر بیٹھ جاتی ہے۔ عشرت دوسری کرسی پر پاس ہی بیٹھ جاتا ہے)
عشرت : کیا پڑھنے کا ارادہ ہے۔
مریم : اردو (کتاب کھولتے ہوئے) ذرا اس شعر کا مطلب سمجھا دیجیے۔
عشرت : شعر پڑھو۔
مریم : ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تری جوانی تک!
(عشرت کے چہرے پر پریشانی ظاہر ہونے لگتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ

کسی بڑے مسئلہ کو حل کر رہا ہے۔ پھر ایک دم گھبرا کر)

عشرت : یہ فانی کا شعر ہے۔

مریم : یہ تو مجھے بھی معلوم ہے — لیکن میں شعر کا مطلب پوچھ رہی ہوں۔

عشرت : دیکھو مریم تم ایسے اشعار کا مطلب نہ پوچھا کرو۔

مریم : (تعجب سے) کیوں؟

عشرت : (پریشان ہوکر) میں تشریح نہیں کرسکتا۔ ان کی تشریح کے لیے میری زبان نہیں کھلتی۔

مریم : تو کالج میں بھی آپ طلبا کو اسی طرح پڑھاتے ہوں گے — کہ اِس شعر کا مطلب نہ پوچھو۔ میں تشریح نہیں کرسکتا (مسکرا کر) وہاں بھی آپ شرماتے ہوں گے۔

عشرت : نہیں یہ بات تو نہیں ہے۔

مریم : بہرحال میں تو یہی سمجھتی ہوں۔

عشرت : جب میں کالج میں لیکچر دیتا ہوں تو میرے جذبات کچھ اور ہوتے ہیں — یہاں کچھ اور

مریم : خیر کچھ بھی ہو۔ آپ کو مطلب بتلانا ہوگا۔

عشرت : ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تری جوانی تک

مریم : اس کا مختصر مطلب تو یہ ہے کہ تیری جوانی — (پھر ایک دم چونک کر اور گھبرا کر) مطلب یہ ہے کہ شاعر کے محبوب کی جوانی اور قیامت کا فتنہ برابر ہے — اور — (کلثوم ملازمہ داخل ہوکر)

کلثوم : چھوٹی بی بی۔ آپ کو بیگم بلا رہی ہیں۔

مریم : اچھا ابھی آئی — (عشرت سے مسکرا کر) ماسٹر صاحب میں ابھی آتی ہوں (اٹھ کر کمرہ سے نکل جاتی ہے)

عشرت : دل کی بھی عجیب حالت ہے۔ نامعلوم میں مریم کو دیکھ کر اس قدر گھبرا کیوں جاتا ہوں۔ خدا ہی خیر کرے — اور وہ بھی مجھے — (کچھ سوچتے ہوئے) چوروں کی طرح کیوں دیکھتی ہے (مریم کو صحن میں جاتے ہوئے دیکھ کر) ۔

تیرے سر و قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہیں!

(پردہ)

چوتھا سین

(انور کی کوٹھی کا ایک شاندار کمرہ۔ کمرہ میں بہترین آرائش ہے۔ کمرہ قیمتی صوفے سیٹ اور بہترین فرنیچر سے آراستہ ہے۔ کمرہ میں ایک جانب چھوٹا سا اسٹیج تیار کیا گیا ہے جس پر اس وقت پر دے پڑے ہیں۔ اسٹیج کے بالکل سامنے ایک دروازہ ہے جس پر قیمتی ریشمی پردے ہیں۔ اس وقت تمام کمرہ میں چہل پہل ہے۔ انور کے کچھ دوست جن میں کچھ خواتین بھی شامل ہیں اپنے اپنے مخصوص دوستوں کے ساتھ برج وغیرہ کھیل رہی ہیں۔ کچھ لوگ شطرنج کھیل رہے ہیں۔ ہر طرف سے قہقہوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ انور کی عمر تقریباً 25 سال کی ہے۔ قد کسی قدر دراز ہے ایک بہترین سلک کا سوٹ پہنے ہے۔ ادھر اُدھر گھوم رہا ہے اور آنے والے مہمانوں کا خیر مقدم کر رہا ہے۔ انور دروازہ کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ عابد اپنی کرسی سے اٹھ کر انور کے پاس جاتا ہے اور مسکرا کر انور کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر)۔

عابد : کیوں میاں انور۔ عشرت صاحب کے ساتھ آپ کی وہ بھی آرہی ہیں یا نہیں۔

انور : ابے کیا پاگل ہوا ہے — وہ تو پردہ کرتی ہے۔

عابد : (مسکرا کر) ہشت۔ پردہ فرماتی ہیں۔ احترام مدنظر رہے اور ہاں نام لینے

سے پہلے وضو بھی کیا تھا یا نہیں؟

انور : ابے چل— بلاوجہ مذاق۔

عابد : تاڑنے والے بھی غضب کی نظر رکھتے ہیں۔ اگر یہ بات نہیں تو عشرت صاحب کی اس قدر شاندار پارٹی کیا معنی؟

(انور آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس کے دو دوست بری طرح شطرنج پر جھکے ہوئے ہیں، عابد پیچھے پیچھے جاتا ہے)۔

ایک : لو بیٹا رشید— بچو شہ۔ (قہقہہ لگا کر) اور وہ وزیر صاحب غائب۔

رشید : دیکھو ریمش شطرنج کھیلا کرو تو سنجیدگی سے— مجھے کھیل میں یہ ہو حق بالکل پسند نہیں۔

انور : (قریب آکر مسکرا کر رشید کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر) کٹوا دو بادشاہ— مائی ڈیئر۔

رشید : (غصہ سے) کیا مذاق کرتے ہو۔

عابد : (سنجیدگی سے) تو کیا بلا بادشاہ کے فوج نہیں لڑسکتی۔

رشید : (بازی کو الٹتے ہوئے) دیکھو مسٹر عابد مجھے تمھارا یہ مذاق بھی پسند نہیں۔

(سب لوگ قہقہہ لگاتے ہیں۔ کچھ سیکنڈ بعد عشرت داخل ہوتا ہے۔ (انور عشرت کو دیکھ کر)

انور : لو— عشرت بھائی آگئے (تیزی سے عشرت کے استقبال کو جاتا ہے اور اسے لاکر ایک صدر مقام پر بٹھاتا ہے۔ عابد اسٹیج پر چڑھ کر جس پر ابھی تک پردے پڑے ہوئے ہیں)۔

عابد : خواتین اور حضرات! آپ لوگوں کا پیمانہ صبر یقیناً لبریز ہو چکا ہے۔ چنانچہ مسٹر رشید کے مہروں نے بے صبری میں دس قلابازیاں کھائیں کہ ایک ایک کرکے سب فرش پر کود پڑے (سب لوگ قہقہے لگاتے ہیں) آپ لوگوں کو اس کا تو علم ہو چکا ہے کہ مسٹر انور نے اپنے چچا زاد بھائی مسٹر عشرت حسین ایم اے

ان فلاسفی اور اردو کے یہاں پروفیسر ہوکر آنے کے اعزاز میں شکم پری کے واسطے آپ لوگوں کو تکلیف دی ہے۔

شہناز : (کھڑی ہوکر) اور آپ لوگوں کو یہ سن کر بھی بے حد افسوس ہوگا کہ چونکہ مسٹر عابد عرصہ سے بدہضمی کے مرض میں مبتلا ہیں اس لیے شکم پری میں حصہ نہ لے سکیں گے (سب لوگ قہقہہ لگاتے ہیں عشرت صرف مسکراتا ہے)

عابد : حضرات! آپ لوگوں کو یہ سن کر بھی بے حد مسرت ہوگی کہ مسٹر عشرت حسین ایک بہترین انقلابی شاعر ہیں۔ چونکہ مسٹر عشرت حسین اس وقت ہمارے مہمان ہیں اس واسطے مجبوراً ان سے ہم یہ درخواست نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی کوئی تازہ نظم سنانے میں بخل سے کام نہ لیں اس واسطے پیٹ پوجا شروع ہونے سے پہلے آپ لوگ مس اندو، کا ایک ڈانس ملاحظہ فرمایئے۔

(اسٹیج سے اُتر کر ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ پردہ آہستہ آہستہ ہٹتا ہے، اور مس اندو، کا ڈانس شروع ہوتا ہے۔ ڈانس کے دوران میں سب لوگ خاموش رہتے ہیں اور دلچسپی کے ساتھ ڈانس دیکھتے رہتے ہیں۔ ڈانس ختم ہونے کے بعد سب لوگ تالیاں بجاتے ہیں)

انور : (عشرت سے مخاطب ہوکر) عشرت بھائی کھانے کے کمرہ میں تشریف لے چلیے۔

(عشرت انور کے ساتھ جاتا ہے۔ سب لوگ دونوں کے پیچھے پیچھے قہقہے لگاتے ہوئے جاتے ہیں)۔

(پردہ)

پانچواں سین

(انوار صاحب کے مکان کا وہی کمرہ جو عشرت کے لیے مخصوص کردیا گیا ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ پر موجود ہے۔ دن کے تقریباً ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔ عشرت درمیانی کمرہ کی میز پر بیٹھا ہے۔ آس پاس کچھ کتابیں بکھری پڑی ہیں۔ زلیخا

B

اس کے پاس ایک کرسی پر بیٹھی ہے)۔

زلیخا : بھائی جان!— دو مہینے ہوگئے۔ کہیں ہمارے یہاں رہنے سے چچا جان کو تکلیف نہ ہونے لگے۔

عشرت : (سگریٹ کا کش لے کر) ہاں زلیخا۔ میں بھی کئی روز سے اسی چکر میں ہوں۔ اب جا کر کہیں مکان ملا ہے۔

زلیخا : جب ہم بالکل بے یار و مددگار تھے ہم نے کسی کے سہارے کی تمنا نہیں کی— اب تو آپ ماشاء اللہ—

عشرت : (کچھ سوچتے ہوئے) زلیخا! میں تو یہاں آ کر ٹھہرنا ہی نہیں چاہتا تھا— مگر مجبوری بھی ایک بلا ہے۔

زلیخا : (شرارت سے مسکرا کر) جی ہاں۔ کس بلا (بلا پر زور دے کر) نے آپ کو مجبور کر رکھا ہے۔

عشرت : اب دیکھو— جب جانے کا ارادہ کرو۔ چچا جان کسی نہ کسی بہانہ سے روک لیتے ہیں۔

زلیخا : (شرارت سے) خیر چچا جان کا تو آپ کو اس قدر خیال نہیں۔

عشرت : (تعجب سے) چچا جان کا خیال نہیں؟ (طنز کو محسوس کر کے مسکرا کر)— تو پھر کس کا خیال ہے۔

زلیخا : (شرارت سے) کسی کی تعلیم کا۔

عشرت : ہشت۔ پگلی۔ بہت شریر ہوگئی ہے۔

زلیخا : بھائی جان!— مریم آپا مجھے بہت پسند ہیں— میرا خیال ہے کہ—

عشرت : پھر وہی پاگلوں کی سی باتیں— (شرارت سے مسکرا کر) میرے اوپر پہلے تمھارا فرض ہے۔

زلیخا : (شرما کر نیچی نگاہیں کر کے) تو کیا آپ کو مریم آپا پسند نہیں—؟

عشرت : (مسکرا کر فہمائش کے لہجہ میں) ایسی باتیں نہ کر— کوئی سن لے گا۔

زلیخا : (شرارت سے) آپ مریم آپا کا نام سن کر گھبرا کیوں جاتے ہیں؟

عشرت : اس لیے کہ تو پگلی ہے۔ چل جا اپنا کام کر۔

زلیخا : تو پھر دوسرے مکان میں کب چلیے گا؟

عشرت : بس دو چار ہی روز میں

(مریم داخل ہوتی ہے)

عشرت : آؤ مریم سبق یاد کیا یا نہیں۔

مریم : (کھوئے ہوئے انداز میں) میں کس روز سبق یاد نہیں کرتی۔

زلیخا : (مسکرا کر) اور بھائی جان— آپ بھی مریم آپا کو پیٹنے کے مواقع پیدا کر ہی لیتے ہوں گے۔

عشرت : (مسکرا کر) اچھا اب آپ تشریف لے جایئے۔

(زلیخا مسکراتی ہوئی کمرہ سے نکل جاتی ہے۔ اس کی جگہ پر مریم بیٹھ جاتی ہے لیکن انداز سے ظاہر ہے کہ وہ کسی گہری سوچ میں ہے۔ اس کی نگاہیں عشرت کے ایک فوٹو پر جمی ہوتی ہیں جو اس کے سامنے دیوار پر آویزاں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماحول سے قطعی بے نیاز ہے۔)

عشرت : (کاپی لے کر) تو اس کی انگریزی بناؤ۔ (کچھ لکھ کر دیتا ہے۔ مریم کاپی پر نظریں جما دیتی ہے۔ عشرت کی نگاہیں مریم کے چہرہ پر جمی ہوئی ہیں۔ جیسے اس کی دلی کیفیات کا مطالعہ کر رہا ہو) کیا سوچ رہی ہو مریم؟

مریم : (گھبرا کر) کچھ نہیں— (لکھا ہوا غور سے پڑھ کر) کیا لکھا ہے آپ نے۔

عشرت : میں تمھیں بہت محنت سے پڑھاتا ہوں۔

مریم : لیکن آپ نے—

عشرت : اچھا اس کی انگریزی پھر بنانا۔

مریم : (کھوئے ہوئے انداز میں) کیا آپ دوسرے مکان میں جا رہے ہیں؟

عشرت : ہاں— کیا تمھیں دکھ ہو رہا ہے۔

مریم : یہ تو آپ اپنے ہی دل سے پوچھیے۔

عشرت : مجھے تو بہت دکھ ہو رہا ہے— مگر کیا کروں مجبور ہوں— مگر میں تمھیں روز پڑھانے آیا کروں گا۔

مریم : اور اگر—

عشرت : بھول گئے— پگلی— (پھر جیسے کچھ کہتے کہتے اگر) اچھا اس وقت تو پڑھو۔

مریم : آج میرا دل بہت گھبرا رہا ہے— کل پڑھوں گی۔

(اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ جانے کے واسطے مڑتی ہے۔ عشرت بھی کھڑا ہو جاتا ہے اور مریم کے پیچھے پیچھے قدم بڑھاتا ہے۔ سامنے لگے ہوئے قد آدم آئینہ پر عشرت کی نظر پڑتی ہے جس میں دونوں کا عکس نظر آ رہا ہے۔ عشرت مریم کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر)

عشرت : مریم!— اگر ہماری ایک ایسی تصویر کھینچئے تو تمھیں پسند ہوگی یا نہیں—! (مریم کے چہرہ پر گھبراہٹ کے آثار پیدا ہوتے ہیں)— مریم جواب دو— تمھیں پسند ہوگی یا نہیں—

مریم : (تیزی سے کمرہ سے جاتے ہوئے) آپ کا خیال بے سود ہے۔ (مسکراتے ہوئے)— ابا میاں میری شادی کے متعلق طے کر چکے ہیں۔

(تیزی سے کمرہ سے نکل جاتی ہے۔ عشرت مسکرانے لگتا ہے)۔

(پردہ)

چھٹا سین

رات کے تقریباً 11 بجے ہیں۔

اکرم کے مکان کا کمرہ۔ اس مکان کو اب عشرت نے کرایہ پر لے رکھا ہے۔ لیکن اب اس کمرہ میں سوائے اکرم کے پیانو کے اور اس کی بوسیدہ گاؤن جو نامعلوم کیوں سامنے لٹک رہی ہے، کوئی چیز موجود نہیں۔ مشرقی جانب ایک

دروازہ قائم کرلیا گیا ہے، جو ایک دوسرے کمرہ میں کھلتا ہے۔ نئے دروازہ کے پاس ایک مسہری بچھی ہے۔ پورے کمرہ میں دری کا فرش ہے۔ اکرم کے پردہ کے پاس ایک دوسرا پردہ لٹک رہا ہے جس پر ایک سینری بنی ہوئی ہے۔ کھڑکی کے پاس ایک میز رکھی ہے۔ جس پر کچھ کتابیں اور ضروری سامان رکھا ہے۔ زلیخا ایک کرسی پر بیٹھی کتاب کے مطالعہ میں مشغول ہے۔ دروازہ یکا یک کھلتا ہے اور اکرم داخل ہوتا ہے۔ زلیخا کو دیکھ کر گھبرا سا جاتا ہے۔ زلیخا کی بھی نظر اکرم پر پڑتی ہے اور گھبرا کر مسہری کی آڑ میں چھپ جاتی ہے۔

زلیخا : (گھبرائی ہوئی آواز میں) آپ کون ہیں؟

(اکرم گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ جانے کے واسطے دروازہ کی جانب مڑتا ہے۔ پھر کچھ سوچ کر رک جاتا ہے)

اکرم : کیا میں بھی آپ سے ہی یہی سوال کرسکتا ہوں کہ آپ کون ہیں؟

زلیخا : یہ میرا مکان ہے۔ میں اس میں رہتی ہوں۔

اکرم : (تعجب سے) آپ کا مکان؟— میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا— (چاروں طرف دیکھ کر) یہاں کی ہر چیز تو میری دکھائی دے رہی ہے (پیانو کی طرف اشارہ کرکے) یہ میرا پیانو ہے۔ (گاؤن کی طرف اشارہ کرکے)— یہ میرا گاؤن ہے— اوہ ہو— آپ نے اس کو اس قدر بے دردی سے یوں ڈال رکھا ہے۔ اگرچہ یہ پرانا ہوگیا ہے لیکن میرے لیے بہت قیمتی ہے۔ یہ میری محبوبہ نے مجھ کو دیا تھا اور اس کو اس کے دادا نے— اور اس کو ایک ترکی وزیر نے۔ اور ترکی وزیر کو—

زلیخا : خیر میں آپ سے اس کی تاریخ نہیں پوچھ رہی— آپ مجھے کوئی چور معلوم ہوتے ہیں جو اس طرح ایک پردہ نشیں عورت کے گھر میں گھس آئے۔

اکرم : لیکن میں صحیح عرض کرتا ہوں کہ دو ماہ پیشتر میں اس کمرہ میں رہتا تھا۔ کرایہ نہ ادا

کرنے کے باعث مالک مکان نے مجھے شہر بدر نہیں تو مکان بدر ضرور کردیا تھا۔

زلیخا : تو یوں کہیے — آپ بزدل ہونے کے ساتھ ساتھ نادھند بھی ہیں۔

اکرم : دیکھیے آپ مجھے ذلیل کر رہی ہیں۔

زلیخا : شریف آدمی خود رسوائی کے خوف سے ڈرتا ہے۔ وہ کسی کے مکان میں اس طرح داخل نہیں ہوتا۔

اکرم : مجھے علم نہ تھا کہ میرا مکان اس طرح کسی دوسرے کو کرایہ پر دے دیا جائے گا اور مجھ سے بھی کرایہ مکان کا تقاضا جاری رہے گا (افسردہ لہجہ میں) مجھے یہاں آنے کا افسوس ہے۔ (کچھ سوچ کر) معلوم ہوتا ہے کہ آج کی سرد رات بھی کسی پولیس اسٹیشن پر گزارنا پڑے گی۔

زلیخا : پولیس اسٹیشن پر؟— (تعجب سے) کیا مطلب ہے آپ کا؟

اکرم : مطلب یہ کہ اکثر سرد راتیں میں پولیس اسٹیشن پر گزارنے کا عادی ہو چکا ہوں۔

زلیخا : کس جرم میں؟

اکرم : چور یا آوارہ ہونے کے شبہ میں۔

زلیخا : تو کیا آپ کا اور کوئی مکان نہیں ہے۔

اکرم : جی نہیں۔ (جانے کے واسطے مڑتے ہوئے) خدا حافظ!

عشرت کی آواز: زلیخا— کون ہے؟

زلیخا : ایک صاحب گھس آئے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔ یہ ان کا مکان ہے۔

(اکرم رک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ عشرت شب خوابی کا لباس پہنے ہوئے داخل ہوتا ہے)

اکرم : (اپنی ہی دھن میں) نہ میں بزدل ہوں اور نہ نادھند — کل کرایہ ادا کر کے اپنا فرنیچر لے جاؤں گا۔

عشرت : (اکرم کو دیکھ کر) ارے اکرم— یہ چوروں کی طرح کیوں گھس آیا۔ (زلیخا سے) یہ تو اپنی خالہ فرحت کا لڑکا ہے اس سے کیا پردہ کرتی ہے۔

زلیخا : (آہستہ آہستہ شرما کر مسہری کی آڑ سے نکلتے ہوئے) اکرم بھائی— آپ نے تو ڈرا دیا۔

اکرم : (عشرت سے) اس روز آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ پھر میں قطعی بھول گیا کہ آپ یہاں ہیں۔ آج میرے پاس کچھ روپیہ تھا سوچا کہ چل کر کرایہ ادا کردوں تو— (مسکرا کر) بزدل اور نادھند کا خطاب مل گیا۔

عشرت : (زلیخا سے) اچھا زلیخا اب تم دوسرے کرہ میں چلو۔ یہ کرہ آج سے اکرم کے لیے ہے۔

اکرم : لیکن عشرت بھائی یاد رہے۔ میں اس کرہ کا ماہ بماہ کرایہ ضرور ادا کروں گا۔

عشرت : کیا پاگل ہوگیا ہے— کرہ تو کیا مکان ہی تیرا ہے!

اکرم : شکریہ— لیکن میں بلا کرایہ ادا کیے تو نہ رہوں گا۔

عشرت : اچھا دیکھا جائے گا۔

اکرم : اچھا دیکھیے یہ ہوسکتا ہے— (چاروں طرف دیکھ کر) میرا فرنیچر کہاں ہے؟

زلیخا : (مسکرا کر) وہ سب قیمتی فرنیچر محفوظ ہے۔

اکرم : تو پھر آپ میرا فرنیچر استعمال کیجیے اور میں آپ کا کرہ۔

عشرت : (مسکرا کر) ہاں یہ شرط منظور ہے (زلیخا سے) اچھا زلیخا۔ اب تم دوسرے کرہ میں جاؤ— اسے یہاں آرام کرنے دو (دونوں دوسرے کرہ کی جانب جاتے ہیں عشرت مڑ کر) اور دیکھو اکرم تکلف کی ضرورت نہیں۔ سمجھے۔

(زلیخا اور عشرت کرہ سے نکل جاتے ہیں۔ اکرم چاروں طرف کرہ کو دیکھ کر مسکرا کر)

اکرم : واہ رے کرہ۔ نہ تو میرا پیچھا چھوڑتا ہے اور نہ میں تیرا۔

(مسکراتا ہے)

(پردہ)

ساتواں سین

(عشرت کے مکان کا سب سے مختصر کمرہ جس میں الماریاں رکھی ہیں اور الماریوں میں بہترین گرد پوش کی کتابیں سلیقہ سے رکھی ہیں۔ کمرہ کا ایک دروازہ اکرم کے کمرہ میں ہے اور دوسرا عشرت کے سونے کے کمرہ میں۔ یہ کمرہ عشرت کی لائبریری کا کام دیتا ہے۔ کمرہ میں دو ایک آرام کرسیاں رکھی ہیں اور کچھ پرانے قسم کے صوفے۔ مغربی جانب ایک کھڑکی ہے۔ چونکہ اس جانب کوئی شہری آبادی نہیں ہے۔ اس واسطے دور تک کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ میدان ہیں اور میدانوں کے بعد پہاڑ۔ اس وقت دن کے تقریباً چار بجے ہیں۔ پہاڑ پر دور سے ایک ندی بہتی ہوئی آتی ہے جو دوری کے باعث ایک سفید لکیر معلوم ہوتی ہے۔ میدانوں میں پگڈنڈیوں کا ایک جال بھی بچھا ہوا ہے۔ زلیخا اس کمرہ میں ایک صوفے پر بیٹھی ایک ٹیبل کلاتھ کاڑھ رہی ہے۔ اکرم داخل ہوتا ہے اور کھڑکی کے پاس کھڑا ہوکر پہاڑوں کو دیکھنے لگتا ہے۔ زلیخا دو ایک مرتبہ نظر اٹھا کر اکرم کو دیکھتی ہے اور پھر اپنے کام میں مشغول ہوجاتی ہے۔ اکرم کچھ دیر پہاڑوں کو دیکھتا رہتا ہے پھر زلیخا سے مخاطب ہوکر)۔

اکرم : دیکھئے میں کئی مرتبہ عرض کر چکا ہوں کہ میں اس کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ کوئی میری زندگی میں اس طرح داخل ہونے کی کوشش کرے جس طرح آپ کرتی ہیں۔

زلیخا : (مڑ کر اکرم کو دیکھ کر) میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔

اکرم : آخر آپ میرا فرنیچر میرے کمرہ میں کیوں نہیں لگوا دیتیں۔

زلیخا : (تعجب سے) اور آپ کی وہ چارپائی بھی۔

اکرم : جی ہاں— وہ چارپائی بھی— کہیے آپ کو اس میں کوئی اعتراض ہے۔

زلیخا : جی— اعتراض تو نہیں— لیکن کیا آپ کو اس پر تکلیف نہیں ہوتی۔

اکرم : (غصہ سے) میری تکلیف اور راحت کا مجھے احساس ہوتا ہوگا نہ کہ آپ کو۔

زلیخا : لیکن اس چارپائی پر تو ہر شخص ہی کو تکلیف ہوتی ہوگی۔

اکرم : لیکن مجھے نہیں۔ سمجھیں آپ۔ اگر آپ میرے ساتھ کوئی ہمدردی کرنا چاہتی ہیں۔ تو یہ قیمتی فرنیچر فوراً ہٹوا دیجیے — ورنہ مجھے کوئی دوسرا مکان تلاش کرنا پڑے گا۔

(اکرم کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتا ہے۔ اور زلیخا خاموش بیٹھی کچھ سوچتی رہتی ہے۔ انور داخل ہوتا ہے)

انور : کہو زلیخا — کیا ہو رہا ہے؟

زلیخا : اوہ — انور بھائی (سر پر پلو ڈالتے ہوئے) آداب عرض ہے، بہت دن میں درشن دیے — کرسی کی طرف اشارہ کر کے) تشریف رکھیے۔

انور : (مسکرا کر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے) آج کل بہت مصروف ہو۔

زلیخا : جی ہاں — مصروفیت کچھ زیادہ ہے۔ بھائی جان کی شادی کے بھی تو بہت تھوڑے ہی دن رہ گئے ہیں۔

انور : (سگریٹ جلا کر) عشرت بھائی کہاں ہیں (اکرم سے) اکرم صاحب! سگریٹ پی جیے گا؟

اکرم : (اسی طرح باہر دیکھتے ہوئے) جی نہیں شکریہ!

زلیخا : ابھی کالج سے واپس نہیں آئے۔

انور : بہت دیر کر دی۔

زلیخا : جی ہاں — آج کچھ دیر ہو گئی۔

انور : جس عرصہ میں آپ لوگ باہر رہے۔ کافی تکلیف برداشت کرنا پڑی ہوگی — عشرت بھائی کی بلا وجہ کی ضد تھی۔

زلیخا : جی نہیں — دن بہت ہنسی خوشی سے گزر گئے (طنزیہ) غریب عزیزوں کو لوگ اپنا کہتے ہوئے شرماتے ہیں۔

انور : نہیں زلیخا— واقعی ابا میاں کو تمھارے چلے جانے کا بے حد صدمہ تھا— وہ اکثر اس کا اظہار کیا کرتے تھے۔

زلیخا : جی ہاں۔ ممکن ہے ان کو ہمدردی ہو۔

انور : (تعجب سے) اور محبت نہیں (زلیخا خاموش ہوجاتی ہے، سگریٹ کا کش لے کر) اور ہاں زلیخا سنا ہے کل تمھیں کالج میں تقاریر کے جلسہ میں پہلا انعام ملا۔ بہت خوشی ہوئی۔

زلیخا : جی ہاں ملا تو ہے۔ شکریہ اس نوازش کا۔

انور : تو اس خوشی میں کل ہمارے یہاں جلسہ ہوگا— آؤ گی۔ (اکرم سے مخاطب ہوکر) آپ بھی تشریف لائیے گا۔

اکرم : شکریہ! میں حاضر نہ ہوسکوں گا۔

انور : (مسکرا کر) کیوں؟

اکرم : میں ایسے جلسوں کو محض بے کار سمجھتا ہوں۔

انور : (کسی قدر بگڑ کر) تو آپ تشریف نہیں لائیے گا۔

اکرم : (سنجیدگی سے) اس تشریح کی ضرورت نہیں۔

انور : (زلیخا سے) میرا خیال ہے زلیخا تم تو آؤ گی۔

زلیخا : (نفرت آمیز نگاہوں سے انور کو دیکھ کر) آپ شاید بھول رہے ہیں کہ میں پردہ نشین ہوں۔

انور : لیکن وہاں پردہ کا خاص انتظام ہے۔

زلیخا : تو کیا یہ مناسب ہے کہ آپ کے احباب وہاں بیٹھ کر طوائف سے عریاں مذاق کریں اور میں مزے لے لے کر سنوں۔

انور : جلسہ تو تمھاری شاندار کامیابی کے سلسلہ میں کیا جارہا ہے۔

زلیخا : جلسہ طے کرنے سے پہلے آپ کو میری رائے لینا ضروری تھا۔

انور : لیکن مجھے یقین تھا کہ تم انکار نہ کرسکو گی۔

زلیخا : مجھے سخت افسوس ہے۔

انور : (اٹھ کر) شکریہ! (غصہ سے کمرہ سے نکل جاتا ہے)

اکرم : تو آپ بھی جلسہ میں تشریف نہیں لے جائیں گی۔۔ کیا وجہ دریافت کرسکتا ہوں۔

زلیخا : (طنزیہ) کیا میں یہ معلوم کرسکتی ہوں کہ میرے پرائیویٹ معاملات سے آپ کا تعلق؟

(اکرم کے چہرہ پر پشیمانی ظاہر ہوتی ہے اور وہ کمرہ سے نکل جاتا ہے)۔

(پردہ)

آٹھواں سین

(عشرت کے مطالعہ کا کمرہ۔ عشرت ایک آرام کرسی پر بیٹھا مطالعہ کررہا ہے۔ پاس ہی ایک چھوٹی سی میز رکھی ہے۔ جس پر قلم دوات رکھے ہیں۔ کبھی کبھی عشرت کتاب میں سے کچھ نوٹس بھی لیتا جاتا ہے۔ مریم داخل ہوکر بڑی میز کی کتابیں ترتیب سے رکھنے لگی ہے۔ عشرت کتاب بند کرکے میز پر رکھ دیتا ہے اور مریم کو مسکرا مسکرا کر دیکھتا ہے اور پھر اٹھ کر مریم کے پاس جاتا ہے اور مریم کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر)۔

عشرت : آخر مریم تمھیں اس کام دھندے سے فرصت بھی ملتی ہے یا نہیں۔

مریم : (اپنے کام میں مشغول رہتے ہوئے) کیوں نہیں۔ (مڑ کر عشرت کا چہرہ مسکراتا دیکھ کر) آخر کام ہی ایسا کیا ہے؟

عشرت : میں تمھیں دن رات مشغول ہی دیکھتا ہوں۔۔ (مریم آہستہ آہستہ چل کر کھڑکی کے پاس کھڑی ہوجاتی ہے اور پہاڑوں کا منظر دیکھنے لگتی ہے۔ عشرت بھی پاس آکر کھڑا ہوجاتا ہے) کھانا تم اپنے ہاتھ سے پکاتی ہو۔ کمروں کے بے ترتیب سامان کو تم ترتیب دیتی ہو، اور جب ان کاموں سے فرصت ملتی ہے تو کچھ سینے پرونے بیٹھ جاتی ہو (مسکرا کر) ارے صاحب آپ کے وقت

میں کچھ ہمارا بھی حصہ ہے۔

مریم : (مریم مڑ کر عشرت کا چہرہ دیکھ کر) یہ کام میرے فرائض میں سے ہیں— کیا ان سے غفلت کسی طرح بھی جائز ہے۔

عشرت : (مسکرا کر) مانا یہ اب آپ کے فرائض ہیں— لیکن یہ بھی تو آپ کا فرض ہے کہ کچھ دیر ہم سے گفتگو کریں۔

مریم : لیکن آپ تو دن رات کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ کیا کتابوں سے دلچسپ بھی کوئی چیز ہوسکتی ہے؟

عشرت : (مسکرا کر) کیوں نہیں!

مریم : کون سی چیز ہے وہ؟

عشرت : (مسکرا کر) بیوی کی شکل میں مریم۔

مریم : (مسکرا کر شرارت سے) اچھا۔

عشرت : جی— اور میں کب منع کرتا ہوں کہ جس وقت میں مطالعہ کر رہا ہوا کروں— آپ تشریف نہ لایا کیجیے۔

مریم : لیکن مجھے خود اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ آپ کے مطالعہ میں ہرج نہ ہو۔

عشرت : لیکن میں آج سے اختیار دیتا ہوں کہ حضور مریم جس وقت چاہیں تشریف لاسکتی ہیں۔

مریم : اچھا چلیے۔ کھانا کھا لیجیے— کالج میں دیر ہوجائے گی۔

عشرت : اوہ۔ کیا نو بج گئے— اچھا بھئی کھانا یہیں لے آؤ۔

(مریم کمرہ سے چلی جاتی ہے۔ عشرت کھڑکی میں سے باہر دیکھتا رہتا ہے اور مسکراتا جاتا ہے۔ مریم کھانا لاکر میز پر رکھ دیتی ہے۔ عشرت ایک کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگتا ہے)۔

عشرت : زلیخا کہاں ہے؟

مریم : اپنے کمرہ میں ہوگی۔

عشرت : اچھا (کھانا کھانے لگتا ہے) ارے مریم ہمارے ساتھ نہیں کھاؤ گی۔

مریم : پہلے آپ کھا لیجیے۔ میں اور زلیخا ساتھ کھائیں گے۔ (پنکھا جھلنے لگتی ہے)

عشرت : بھئی دیکھو یہ چیز غلط ہے۔ تم ہمارے ساتھ کھانا نہیں کھاتیں — (کچھ دیر خاموش رہ کر) آج کل کھانا بہت لذیذ پک رہا ہے — یہ حضور مریم پکاتی ہیں یا زلیخا۔

مریم : (مسکرا کر) آپ ہی فرمائیے۔

عشرت : اس کھانے میں تو تمھاری چوڑیوں کی جھنکار معلوم ہوتی ہے۔

مریم : (مسکرا کر) اس حوصلہ افزائی کا شکریہ۔

(عشرت کچھ دیر خاموش رہتا ہے اور مریم پنکھا جھلتی رہتی ہے۔ پھر عشرت مریم کا چہرہ دیکھ کر)

عشرت : انور تو نہیں آیا تھا۔

مریم : وہ تو روز ہی تشریف لاتے ہیں۔ مگر میں ان کا آنا مناسب نہیں سمجھتی۔

عشرت : (مسکرا کر) کیوں؟

مریم : کچھ اچھے انسان معلوم نہیں ہوتے — آپ کو نا معلوم کیوں پسند ہیں۔

عشرت : (مسکرا کر) اور میں اس میں کوئی برائی نہیں پاتا۔

مریم : اور میں ان میں وہ تمام برائیاں پاتی ہوں — جو ان کے طبقہ کے لوگوں میں ہوتی ہیں۔

عشرت : (مریم کا چہرہ دیکھ کر) مریم بات دراصل یہ ہے کہ زلیخا نے ہوش سنبھالا تو ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ مفلس بھائی کے ساتھ اس نے زندگی گزاری — اب بھائی چاہتا ہے کہ اس کی آئندہ زندگی فراغت سے بسر ہو۔

مریم : (پنکھا جھلتے ہوئے) یہ تو ہر بھائی کی خواہش ہوتی ہے لیکن صرف دولت ہی انسان کی زندگی نہیں سدھار سکتی۔ اسے محبت کی بھی خواہش ہوتی ہے — اور یہ زلیخا کو اکرم ہی کے پاس ملے گی۔

عشرت : تو تمھیں یقین ہے کہ زلیخا کی زندگی انور کے ساتھ تباہ ہوجائے گی۔

مریم : مجھے یقین ہی نہیں بلکہ میرا اس پر ایمان ہے کیونکہ نہ انور کو زلیخا سے محبت ہے— اور نہ زلیخا کو انور سے— بلکہ—

عشرت : مریم!— تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو۔

مریم : زلیخا کی حرکات وسکنات سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اکرم ہی سے محبت کرتی ہے۔

عشرت : لیکن کوئی جان بوجھ کر تو مکھی نہیں کھاتا— اکرم جس قسم کا انسان ہے وہ ظاہر ہے۔

مریم : ظاہری چیزوں پر نہ جایئے— لاابالی پن پر جایئے— یہ اس وقت تک ہے، جس وقت تک شادی نہیں ہوتی ہے۔

عشرت : لیکن فطرت کیسے تبدیل ہوسکتی ہے۔

مریم : بڑے بڑے لاابالی شادی کے بوجھ سے دب کر ذمہ داری محسوس کرنے لگتے ہیں۔

عشرت : لیکن— (زلیخا داخل ہوتی ہے اور خاموشی سے کھڑکی کے پاس جاکر کھڑی ہوجاتی ہے۔ عشرت غور سے زلیخا کے چہرہ کو دیکھتا ہے۔ دو چار لقمے کھاکر کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ عشرت کے جانے کے بعد زلیخا کھوئے انداز میں مریم کی جانب مڑکر)

زلیخا : مریم آپا! آپ بلاوجہ کیوں میرے لیے بھائی جان سے مخالفت مول لے رہی ہیں۔

مریم : (پرعزم لہجہ میں) نہیں زلیخا۔ میں عورت ہوں۔ میرے دل میں عورت کی عظمت ہے— اس کے دکھ درد کو سمجھتی ہوں اور اس کے لیے ہمدردی کا ایک بے پناہ سمندر موجزن ہے— تم مطمئن رہو— میں اپنی ہر امکانی کوشش اس امر کے لیے صرف کردوں گی کہ تمھیں انور کے ہاتھوں تباہ نہ ہونے دوں— خواہ مجھے کیسی ہی قربانیاں کیوں نہ دینی پڑیں۔

(زلیخا کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور وہ کسی گہری سوچ میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی ہے۔ مریم کھانے کے برتن وغیرہ اٹھا کر لے جاتی ہے)

(پردہ)

نواں سین

عشرت کا مطالعہ کا کمرہ۔ مریم کھڑکی کے پاس بیٹھی ایک کتاب دیکھ رہی ہے۔ اکرم اپنے کمرہ میں سے اس کمرہ میں داخل ہوتا ہے اور الماریوں میں رکھی ہوئی کتابوں کو دیکھتا رہتا ہے پھر کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

مریم : (اکرم کا چہرہ دیکھ کر) آؤ اکرم میاں (ایک کرسی کی طرف اشارہ کرکے) بیٹھو— کہاں رہتے ہو آجکل۔

اکرم : ایک ٹیوشن ملنے والی ہے۔ اس واسطے کچھ مصروفیت ہوگئی ہے۔

مریم : (مسکرا کر) کب تک چلے گی یہ ٹیوشن؟

اکرم : جب تک وہ لوگ نباہ سکیں (کچھ دیر خاموش رہ کر) بھابی!— آج میرے ساتھ سنیما چلیے۔

مریم : (مسکرا کر) شکریہ! لیکن میں تو آج تک سنیما نہیں گئی۔

اکرم : بس تو آج چلیے— (مریم اس طرح مسکراتی ہے جیسے کسی بچہ کی ضد پر مسکرا رہی ہو) آپ تو دنیا کی چوکھٹ پر کھڑی ہو کر گھبرا رہی ہیں۔ زندگی کا لطف اسی میں ہے کہ انسان دنیا کی رنگینیوں میں کھو جائے۔

مریم : (سنجیدہ ہو کر) اکرم میاں!— اسلام نے جہاں ہم کو مذہب کے ٹھوس عقائد دیے ہیں وہیں انسان کا نفسیاتی تجربہ بھی کیا ہے۔ عورت کمزور ہے اور دنیا کے راستہ پر پیچ و خم— ہزاروں دوراہے اور سہ راہے ہیں۔ نہ معلوم کہاں لغزش ہو جائے اس واسطے اسلام نے عورت کی دنیا محدود کر دی ہے۔ اس کا گھر ہی اس کی دنیا ہے۔

اکرم : جب آپ اس چیز سے واقف ہیں تو پھر آپ سے لغزش کا امکان نہیں۔

مریم : (مسکرا کر) اور میرا خیال ہے جو اس سے واقف ہوتا ہے وہ ہی سب سے پہلے گمراہ ہوتا ہے۔

اکرم : لیکن یہ تو بزدلی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

مریم : مسلمان عورت کا اس طرح بزدل ہونا ہی اس کی زندگی کی معراج ہے۔

اکرم : (مریم کا ہاتھ پکڑ کر) بھابی!— آپ عورت ہیں لیکن آپ کے انداز دیویوں کے سے— آپ کے خیالات ایک شریف عورت کے خیالات کی معراج ہیں— جی چاہتا ہے کہ آپ کی پرستش کروں (عشرت داخل ہوتا ہے اور سکتہ کے عالم میں کھڑا رہ جاتا ہے اکرم برابر ہاتھ پکڑے رہتا ہے۔ لیکن مریم گھبرا کر ہاتھ چھڑاتی ہے اکرم عشرت سے مخاطب ہوکر) عشرت بھائی میں تو بہت دیر سے آپ کا انتظار کررہا تھا۔

عشرت : (کھوئے ہوئے انداز میں) ہاں دیر ہوگئی۔

اکرم : سینما چلیے گا۔

عشرت : نہیں— میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

مریم : (گھبرا کر) طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ (قریب جاکر) کیا سر میں درد ہے۔ لایئے میں دبادوں۔

(اکرم آہستہ آہستہ کمرہ سے نکل جاتا ہے)

عشرت : (غصہ سے چیخ کر) میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ میں اس وقت ایک دماغی الجھن میں مبتلا ہوں۔

مریم : اس لیے تو کہتی ہوں کہ اس قدر مطالعہ نہ کیا کیجیے۔ لیکن آپ دن رات—

عشرت : (اکتا کر) خدا کے لیے مریم میری نظروں کے سامنے سے ہٹ جاؤ— تم نے میرے اعتبار کے قلعہ کو مسمار کردیا— میں تم سے محبت کرتا تھا۔ لیکن اب مجھے تم سے نفرت ہوگئی ہے۔

مریم : (مریم کے چہرہ پر پریشانی ظاہر ہونے لگتی ہے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے ہیں۔ آنسو پونچھتے ہوئے) آپ مجھ سے نفرت کرسکتے ہیں لیکن یہ کہہ کر کہ میں کسی اور سے محبت کرتی ہوں ایک شادی شدہ عورت کی توہین

نہیں کرسکتے۔

عشرت : لیکن میں کہتا ہوں کہ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ— (دھکا دیتا ہے اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے مریم روتی ہوئی کمرہ سے نکل جاتی ہے)

(پردہ)

دوسرا ایکٹ

پہلا سین

(اکرم کا کمرہ۔ ہر چیز اپنی جگہ پر بدستور ہے۔ صرف کھڑکی کے پاس مصوری کا سامان رکھا ہے جو اکرم کے کمرہ سے اٹھا کر یہاں رکھ دیا گیا ہے۔ ایک پردہ پر کھڑکی میں سے نظر آنے والا منظر نامکمل حالت میں بنا ہے۔ زلیخا غور سے اس نامکمل منظر کو دیکھ رہی ہے۔ اکرم آہستہ آہستہ کمرہ میں داخل ہوتا ہے اور غور سے اس پردہ کو دیکھنے لگتا ہے۔ زلیخا اکرم کو دیکھ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی ہے)۔

اکرم : (زلیخا کو دیکھ کر) آپ آج کل بہت مصروف ہیں ملاقات ہی نہیں ہوتی۔

زلیخا : جی ہاں۔ مصروفیت تو کچھ ضرور زیادہ ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ میرا اس قدر زیادہ خیال کیوں رکھتے ہیں۔

اکرم : جی ہاں۔ میں بھی بار بار یہی سوچتا ہوں کہ آپ مجھے بار بار کیوں یاد آتی ہیں۔ شاید یہ وجہ ہو کہ آپ میرا خیال رکھتی ہیں۔

زلیخا : (طنزیہ لہجہ میں) میں آپ کا خیال رکھتی ہوں اور اس کے معاوضہ میں آپ میرا۔

اکرم : یہ تو نہیں کہہ سکتا۔ اور معاوضہ کے متعلق میں نے کبھی نہیں سوچا— لیکن جب تنہائی میں گھبراتا ہوں تو یہی دل چاہتا ہے کہ— آپ سے گفتگو کروں— اِس لیے کہ شاید آپ بھی تنہائی میں گھبراتی ہوں گی۔

زلیخا : میری تنہائی پر آپ کو رحم آتا ہے اور آپ ہمدردی کرنے لگتے ہیں۔

اکرم : یہ بھی نہیں کہہ سکتا کیونکہ ہمدردی کے وقت انسان کے جذبات وہ نہیں ہوتے جو آپ کے متعلق سوچنے میں ہوتے ہیں۔

زلیخا : مریم آپا بھی آپ کا انتہائی خیال رکھتی ہیں۔ آپ ان کے متعلق کیوں نہیں سوچتے۔

اکرم : آپ کے خیال رکھنے اور بھابی جان کے خیال رکھنے میں کچھ فرق محسوس کرتا ہوں۔ (دور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتا ہے)

زلیخا : (اشتیاق آمیز لہجہ میں) کیا فرق محسوس کرتے ہیں آپ؟

اکرم : (اسی طرح پہاڑوں کو دیکھتے ہوئے) میں محسوس کرتا ہوں کہ بھابی میرا خیال فرض سمجھ کر رکھتی ہیں اور آپ ہمدردی کی حدود سے گزر کر— (زلیخا کے چہرہ کو دیکھ کر)— لیکن معاف کیجیے گا میں اسے پسند نہیں کرتا۔

زلیخا : پسند نہیں کرتے۔ کیوں آخر؟

اکرم : میں اس چیز کی خواہش نہیں کرتا۔ جس سے دوسروں کو تکلیف ہو— میری وجہ سے آپ کو تکلیف ہوتی ہے نا۔

زلیخا : (چہرہ پر مسرت کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ اکرم کا چہرہ دیکھ کر) تو آپ کو میری تکلیف کا احساس ہوتا ہے؟

اکرم : ضرور— لیکن معاف کیجیے گا۔

زلیخا : (قطع کلام کر کے) بس خاموش رہیے— آپ اس قسم کی باتیں کر کے میرا دل دکھاتے رہتے ہیں۔

اکرم : مجھے افسوس ہے— (انتہائی سنجیدگی سے) لیکن میں مجبور ہوں۔

زلیخا : بہت بہتر— میں آئندہ انشاء اللہ اس کی کوشش کروں گی۔

اکرم : جی نہیں— بلکہ آپ—

زلیخا : (قطع کلام کر کے) میں سمجھ گئی— آپ کو دوسروں کے جذبات سے کھیلنے میں لطف آتا ہے— آپ— دروازہ پر دستک)

اکرم : کون صاحب

آواز : کیا مسٹر اکرم تشریف رکھتے ہیں۔

اکرم : جی ہاں— زلیخا کی طرف دیکھتا ہے۔ زلیخا خاموشی سے پاس کے کرہ میں چلی جاتی ہے) اندر تشریف لائیے۔

(ایک شخص کمرہ میں داخل ہوتا ہے۔ اکرم غور سے اسے دیکھتا ہے)

آنے والا شخص: مجھے احسن کہتے ہیں۔ عابد صاحب نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔

اکرم : (ایک کرسی کی طرف اشارہ کرکے) تشریف رکھیے۔

احسن : (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) عابد صاحب نے آپ کو ابھی یاد فرمایا ہے۔

اکرم : بہت بہتر— (جاکر شیروانی پہننے لگتا ہے)

احسن : (ذرا بلند آواز سے) آپ تو اس روز سے ایسے غائب ہوئے کہ رسید تک نہ دی— شہناز بار بار آپ کو پوچھتی ہے۔

اکرم : (شیروانی پہنتے ہوئے) جی ہاں کیا عرض کروں— حاضر نہ ہوسکا— خیریت سے تو ہیں آپ کی شہناز۔

احسن : کچھ پریشان سی رہتی ہیں— میرا تو خیال ہے کہ—

اکرم : (دروازہ کی جانب بڑھتے ہوئے) تشریف لائیے۔

احسن : (کرسی سے اٹھتے ہوئے) آپ کے نام انھوں نے ایک خط بھی دیا تھا— (جیب سے خط نکال کر خاموشی سے میز پر رکھ دیتا ہے اور دروازہ سے باہر نکل جاتا ہے۔ اکرم آئینہ دیکھ کر دروازہ کی جانب بڑھتا ہے۔ زلیخا داخل ہوکر)

زلیخا : چائے تو پیتے جایئے۔

اکرم : میں اس وقت ایک ضروری کام سے جارہا ہوں—

(دروازہ سے نکل جاتا ہے۔ زلیخا کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہے۔ پھر میز کے پاس جاکر خط اٹھاکر پڑھتی ہے۔ چہرہ پر فکر اور پریشانی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ کھڑکی کی جانب جاتی ہے اور ٹھنڈی سانس بھرکر)

زلیخا : نام بھی دلکش ہے اور انداز تحریر بھی پراثر—
(کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی ہے)
(پردہ)

دوسرا سین

(ایک بہت ہی پرتکلف کمرہ۔ تمام کمرہ میں دری کا فرش۔ مشرقی جانب ایک دروازہ جس پر بہترین ریشمی پردہ۔ جنوبی جانب ایک کھڑکی اور ریشمی پردے۔ کمرہ مکان کے بالائی حصہ کا ہے۔ کھڑکی میں سے نیچے دیکھنے پر ایک سڑک نظر آتی ہے جس پر ہمیشہ کافی آمد و رفت رہتی ہے مغربی جانب ایک اور دروازہ ہے جو دوسرے کمرے میں کھلتا ہے۔ اس پر بھی قیمتی پردے ہیں۔ اس دروازہ کے دونوں جانب دو بڑی بڑی الماریاں ہیں۔ قیمتی بہترین گرد و پوش کی کتابیں سلیقہ سے رکھی ہیں۔ کھڑکی کے پاس ایک ڈریسنگ ٹیبل ہے جس میں ایک قد آدم آئینہ لگا ہے۔ تمام کمرہ میں بہترین صوفے سیٹ لگے ہیں۔ درمیان کمرہ میں ایک چھوٹی سی میز رکھی ہے جس پر کچھ اخبارات اور رسائل بے ترتیب پڑے ہیں۔ کمرہ میں بہترین تصاویر آویزاں ہیں۔ ایک صوفے پر عابد بیٹھا ایک اخبار دیکھ رہا ہے۔ احسن اور اکرم داخل ہوتے ہیں۔ عابد اکرم کو دیکھ کر—)

عابد : تشریف لائیے— اکرم صاحب— (کھڑے ہو کر مصافحہ کرتے ہوئے) میں تو آپ کا بہت دیر سے انتظار کر رہا ہوں (اکرم کو صوفے پر بٹھاتے ہیں)

اکرم : (بیٹھتے ہوئے) ابھی احسن صاحب پہنچے اور میں حاضر ہو گیا۔

عابد : (مسکرا کر) آٹھ دن بعد تشریف لائے وہ بھی بلانے پر۔

اکرم : کیا عرض— آج کل—

عابد : (قطع کلام کرکے) مصروفیت زیادہ ہے۔ (اکرم مسکراتا ہے) آخر آپ نے

شہناز کے پڑھانے کے متعلق کیا سوچا۔

اکرم : میں تو آپ کی ہر خدمت کے واسطے تیار ہوں۔

عابد : (مسکرا کر) جی۔۔ اس روز بھی آپ نے یہی فرمایا تھا۔ لیکن بھول گئے (احسن سے) احسن صاحب ذرا شہناز کو بلایئے گا (احسن اٹھ کر دوسرے کمرہ میں جاتا ہے) اکرم صاحب کیا عرض کروں میری صرف ایک ہی بہن ہے اور اس کی دلجوئی میرا فرض۔

اکرم : جی ہاں۔ بہن ہونا ایک نعمت ہے۔۔ مجھے اکثر بہن نہ ہونے پر سخت افسوس ہوتا ہے۔

عابد : اس کو مصوری سے بہت شوق ہے۔۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے اس شوق کی تکمیل ہو جائے۔

اکرم : جی ہاں ضرور ہے۔۔ پہلی ملاقات میں میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اس کو بھی محض فیشن سمجھ کر پسند کرتی ہیں۔

عابد : جی نہیں یہ بات نہیں۔۔ بچپن سے اس کا رجحان اس جانب ہے)

(شہناز داخل ہوتی ہے۔ خوبصورت ہے۔ لباس اور بات چیت سے پتہ چلتا ہے کہ موجودہ تہذیب کی پرستار ہے۔ اکرم کو دیکھ کر)

شہناز : اکرم صاحب۔۔ آداب عرض ہے۔۔ آپ تو اس طرح غائب ہوئے جیسے ہمیں بھول ہی گئے۔

اکرم : (مسکرا کر) اگر بھول نہیں گیا۔ تو بھول جاتا۔

شہناز : (مصافحہ کرتے ہوئے کہیے خیریت تو ہے۔۔ کیا کوئی قصور ہو گیا ہم سے؟

اکرم : قصور؟۔۔ جی نہیں۔۔ مگر میں اکثر لوگوں سے مل کر انھیں بھول جاتا ہوں۔

عابد : (مسکرا کر) شہناز مبارک ہو۔۔ اکرم صاحب نے تمھیں پڑھانے کا وعدہ کرلیا ہے۔

شہناز : زہے نصیب۔۔ لیکن ابھی تو میں کشمیر چچا جان کے پاس جا رہی ہوں۔

عابد : تو ہرج ہی کیا ہے۔ اکرم صاحب بھی تمھارے ساتھ ہی چلے جائیں گے۔

اکرم : لیکن ـــ

عابد : ہرج ہی کیا ہے ـــ ارے صاحب کشمیر تو خدا نے آپ کے ہی ذوق کے لوگوں کے لیے پیدا کی ہے۔

اکرم : ضرور کی ہے۔ لیکن وہ ہمارے جیب میں کچھ چاندی سونے کے سکے ڈالنا بھول گیا۔

عابد : اس کی فکر نہ کیجیے۔

اکرم : اس کی فکر تو ضروری ہے۔

عابد : لیکن آپ شہناز کے ساتھ جائیں گے ـــ پھر مصارف کی کیا فکر؟

اکرم : میں ان کا استاد بن کر جاؤں گا ـــ نہ کہ ان کے دروازہ کا فقیر۔

عابد : تو پھر یہ کیجیے ـــ کہ میں آپ کو دو مہینے کی تنخواہ پیشگی ادا کردوں۔

(اکرم کچھ سوچنے لگتا ہے)

شہناز : اب سوچنے کی کوئی بات نہیں۔ قیام چچا جان کے یہاں ہوگا۔

اکرم : (اٹھتے ہوئے) ـــ تو پیشگی تنخواہ لینا مجھے منظور ہے ـــ اچھا مجھے اب اجازت دیجیے۔

عابد : (اٹھ کر مصافحہ کرتے ہوئے) تو پھر تیار رہیے۔

اکرم : بہت بہتر (کمرہ سے نکل جاتا ہے)۔

عابد : تو پھنس گئے بھائی ـــ (تینوں ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھتے ہیں)۔

(پردہ)

تیسرا سین

(عشرت کی لائبریری۔ زلیخا کھڑکی کے پاس کھڑی ایک تصویر بنانے میں مشغول ہے۔ تھک کر برش وغیرہ میز پر رکھ دیتی ہے اور کھڑکی سے باہر دیکھنے

لگتی ہے۔ چشمہ اتارتی ہے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں (چشمہ صاف کرتے ہوئے افسردہ لہجہ میں)

زلیخا : اب آنکھیں بالکل جواب دے چکی ہیں — (پھر غور سے تصویر کو دیکھنے لگتی ہے۔ مریم داخل ہونے لگتی ہے)

مریم : (قریب آکر) آخر زلیخا تم اپنی آنکھوں کے پیچھے ہاتھ دھوکر کیوں پڑ گئی ہو؟

زلیخا : مریم آپا — یہ سمجھتے ہوئے کہ اب یہ آنکھیں زیادہ عرصہ تک کام نہیں دے سکتیں۔

مریم : لیکن کوئی جان بوجھ کر تو کنوئیں میں نہیں گرتا۔

زلیخا : (مریم کا چہرہ دیکھ کر) ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اب یہ آنکھیں زیادہ عرصہ تک کام نہ دے سکیں گی۔

مریم : (سمجھاتے ہوئے) ڈاکٹروں کی بات نہ کہو — معمولی آشوب چشم ہے — آنکھوں کو کچھ روز آرام دو۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ نقصان نہیں پہنچے گا۔

زلیخا : (حسرت سے) اور مجھے اب یقین ہے کہ یہ زیادہ عرصہ تک کام نہ دیں گی — پھر کیوں نہ ان سے زیادہ سے زیادہ کام لے لیا جائے۔

مریم : یہ کوئی دلیل نہیں ہوتی — کیا کوئی مریض یہ سوچ کر کہ اسے مرنا ہے دوا سے ناامید ہو جاتا ہے۔

زلیخا : بہرحال مریم آپا — مجھے تصویر مکمل کرنا ہے (کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے) نام اور شہرت کے لیے نہیں — ممکن ہے اکرم اس کو دیکھیں اور انھیں میرا خیال آجائے (انور داخل ہوتا ہے)

انور : بھابی۔ آداب عرض ہے!

مریم : (مسکراکر) آؤ انور میاں — مزاج تو اچھے ہیں؟

انور : مہربانی ہے آپ بزرگوں کی۔ (زلیخا سے) کہو زلیخا آنکھوں کا کیا حال ہے؟

زلیخا : صرف چند دن کی مہمان ہیں۔

انور : تو پھر چند دن کے واسطے انھیں وصیت دے دو نا۔

زلیخا : (تصویر کو دیکھ کر) یہ تصویر ہی تو مکمل کرنا ہے۔

انور : وہ تو ہوتی رہے گی۔ آخر ایسی جلدی ہی کیا ہے۔

زلیخا : جلدی ہی ہے۔

انور: (مریم سے) بھابی! کیا آج چائے بھی نہیں ملے گی۔

مریم : ضرور ملے گی (کمرہ سے نکل جاتی ہے)

انور : زلیخا!— میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ—

زلیخا : (قطع کلام کر کے) تصویر کشی ترک کر دوں (طنزیہ) آپ کی اور بھی تو بہت سی ذاتی رائیں ہیں۔ کن کن پر عمل کروں گی میں۔

انور : لیکن میں تو ہمیشہ صائب رائے دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

زلیخا : (طنزیہ مسکرا کر) آپ کی نوازشات کا شکریہ— لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی ان صائب رایوں کا حق صرف میرے ہی لیے کیوں محفوظ ہے۔

انور : آپ کا مزاج تو کچھ چڑچڑا ہو گیا ہے— ورنہ پہلے تو آپ ایسی نہیں تھیں اور آج کل معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے گھر کے لوگوں سے ملنا جلنا بھی ترک کر دیا ہے۔

زلیخا : "کیا لطف زندگی کا جب دل ہی بجھ گیا ہو" ہارا ہوا جواری تو—!

انور : (قطع کلام کر کے) دوسری بازی لگانے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اعتراف شکست وہ اپنی توہین سمجھتا ہے۔

زلیخا : یہ عورت کی ہار ہے۔ جو راکھ ہونے کے بعد بھی دل میں گرمی چھپائے رکھتی ہے۔

انور : لیکن یہ راکھ پارس سے کم نہیں۔

زلیخا : جی ہاں۔ ملمع اچھا کر سکتی ہے— مگر سونا نہیں بنا سکتی۔

انور : زندگی کا نام ہی ملمع ہے— ہر شخص وہ نہیں ہوتا جو نظر آتا ہے۔

زلیخا : (پلٹ کر انور کا چہرہ دیکھ کر) معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت پھر کوئی بے وقت کی بھیرویں چھیڑنے کا ارادہ ہے— میں شاید آپ سے کئی مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ یہ گندگی میرے قدموں میں نہ ڈالیے۔

انور : لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک کلی کھلنے سے پہلے مرجھائی جارہی ہے۔ چاہتا ہوں کہ ایک نغمۂ پیار سنا کر اسے مست کردوں۔

زلیخا : (طنزیہ) تو گویا— ''سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔'' سمجھ لیجیے کہ کلی کی تمام پنکھڑیاں مضمحل ہوچکی ہیں اور اب اس کا مسکرانا غیر ممکن ہے۔

انور : اس کی پنکھڑیاں اس واسطے مضمحل ہوگئی ہیں کہ اس نے قوانین فطرت کو اچھی طرح نہیں سمجھا ہے۔

زلیخا : اور وہ قوانین آپ کے قوانین سے ہم آہنگ نہیں ہیں (غصہ سے) دیکھیے مسٹر انور— میں اپنی بھابی کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرسکتی۔

انور : لیکن اس طریقہ سے آپ عشرت بھائی کی حکم عدولی کررہی ہیں۔

زلیخا : اس کی ذمہ دار اور جوابدہ میں ہوں— آپ نہیں— امید ہے کہ آپ مجھے آئندہ پریشان نہ کریں گے۔

انور : (غصہ سے— شکریہ بہتر ہوا کہ آج آپ نے اپنی رائے دے دی— (دروازہ کی جانب جاتے ہوئے) خدا حافظ—

زلیخا : (غصہ اور لاپرواہی سے) فی امان اللہ!

(انور کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ زلیخا دور پہاڑوں کو دیکھنے لگتی ہے)

(پردہ)

چوتھا سین

(عشرت کی لائبریری۔ عشرت ایک آرام کرسی پر بیٹھا ایک کتاب دیکھ رہا ہے۔ زلیخا داخل ہوتی ہے ۔عشرت کتاب پر سے نظریں اٹھا کر سگریٹ کا کش لیتا ہے اور زلیخا کو ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہے۔ زلیخا خاموشی سے کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔)

عشرت : زلیخا! میں نے تمھیں ایک ضروری کام کے لیے بلایا ہے۔ چونکہ نفس معاملہ کا

تعلق تمھاری ذات سے ہے اس واسطے تمھاری رائے کی ضرورت ہے۔

زلیخا : لیکن بھائی جان! آپ کی رائے پر میری رائے کبھی اہمیت نہیں رکھ سکتی۔

عشرت : (سنجیدگی سے) میں تمھیں صرف رائے دینے کا حق رکھتا ہوں۔ لیکن مجبور نہیں کرسکتا۔

زلیخا : میرا خیال ہے کہ آپ کو مجبور کرنے کا بھی حق ہے۔

عشرت : ریاض چچا نے انور کا پیغام دیا ہے— اگر کھلے الفاظ میں نہیں تو کم ازکم دبے الفاظ میں میں نے اسے منظور بھی کرلیا ہے— انور میں کچھ ذاتی کمزوریاں ضرور ہیں اور جس طرح انور میں کمزوریاں ہیں ویسی ہی ایک دوسرے شخص میں بھی ہوسکتی ہیں— اکرم میں بھی کمزوریاں ہیں— لیکن

زلیخا : (قطع کلام کرکے) بھائی جان!— کمزوریاں تو ہر انسان میں ہوتی ہیں لیکن کمزوریوں کی وجہ سے ہم کسی دوسرے کو اچھا یا برا تو نہیں کہہ سکتے۔

عشرت : نہیں نہیں— میرا مطلب یہ نہیں کہ میں اکرم کو پسند نہیں کرتا۔ اکرم سے زیادہ مجھے اور کون عزیز ہوسکتا ہے۔ لیکن اکرم نے جس طرح زندگی کو تباہ کررکھا ہے— وہ ظاہر ہے — اور یہ اُمید ہی نہیں کہ وہ آئندہ سدھر جائے— اور پھر اس کی— خیر میں چاہتا ہوں کہ اب تم وہ مصائب برداشت نہ کرو— جو میرے ساتھ رہ کر برداشت کرچکی ہو۔ انور کے پاس دولت بھی ہے اور عزت بھی۔ بظاہر ایسی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ جس پر شک کیا جاسکے— اب تمھارا کیا خیال ہے؟

زلیخا : بھائی جان!— جہاں تک عزت اور دولت کا تعلق ہے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے صاف ارشاد فرمایا ہے کہ ہم کسی کو بھوکا نہیں مارتے— اور ہمارے نزدیک عزت و ذلت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ ہم جسے چاہیں عزت دیں جسے چاہیں ذلت— اور پھر دولت اور عزت دونوں بے وفا ہیں۔ لیکن جب آپ رضوان چچا سے کوئی وعدہ کرچکے ہیں— تو میں آپ کی حکم عدولی نہیں کروں گی۔

عشرت : لیکن میں تمھاری رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

زلیخا : آپ کی رائے ہی میری رائے ہے— لیکن مریم آپا اس رشتہ کو پسند نہیں کرتیں۔

عشرت : (غصہ سے) تم اپنی بھابی کا نام بار بار کیوں لیتی ہو— جانتی ہو کہ میں اس سے نفرت کرتا ہوں۔

زلیخا : نفرت تو کسی انسان سے بھی اچھی نہیں— اور پھر میں جانتی ہوں کہ مریم آپا کی طرح نیک، ہمدرد اور اونچے اخلاق کی عورتیں بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔

عشرت : جو کچھ میں اپنی آنکھ سے دیکھ چکا ہوں اس نے ثابت کردیا ہے کہ وہ ان صفات کی نہیں— بہرحال تمھیں ان جھگڑوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں— میں نے جس چیز کے لیے تمھیں بلایا ہے اس کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے؟

زلیخا : میں نے عرض تو کیا— جب آپ وعدہ ہی کر چکے ہیں— تو پھر آپ کے حکم پر جان دے دوں گی۔

(اٹھ کر اپنے جذبات پر قابو پاتی اور آنسو پونچھتی کمرہ سے نکل جاتی ہے)

(پردہ)

پانچواں سین

(عشرت کے مطالعہ کا کمرہ۔ عشرت ایک آرام کرسی پر بیٹھا کتاب دیکھ رہا ہے۔ کھڑکی کھلی ہوئی ہے جس میں سے دور تک کا منظر دکھائی دے رہا ہے۔ صبح کے تقریباً ساڑھے نو بجے ہیں مریم داخل ہوتی ہے۔ چہرہ پر افسردگی ہے۔ قدم آہستہ آہستہ اٹھ رہے ہیں۔ لباس سے ظاہر ہے کہ کئی روز سے تبدیل نہیں کیا گیا۔ عشرت کے پاس آکر)۔

مریم : کھانا تیار ہوگیا ہے۔ یہیں لے آؤں۔

عشرت : (اسی طرح کتاب میں مشغول رہتے ہوئے) ابھی نہیں۔

مریم : کالج میں دیر ہوجائے گی آپ کو۔

عشرت : (بگڑ کر) ہزار بار سمجھایا کہ جب میں پڑھ رہا کروں تم دخل درمعقولات نہ کیا کرو— لیکن تمھاری سمجھ میں نہیں آتا۔

مریم : آپ تو دن رات ہی پڑھا کرتے ہیں۔ آخر آپ کے وقت میں کچھ میرا بھی حق ہے۔

عشرت : (غصہ سے) میں حق وق کچھ نہیں جانتا— بس چلی جاؤ۔

مریم : (رو کر) لیکن سوچیے تو آپ ظلم کر رہے ہیں۔

عشرت : اگر تمھیں یہاں تکلیف ہے تو اپنے میکے چلی جاؤ— وہاں آرام ملے گا— میں خوشی سے اجازت دیتا ہوں۔

مریم : (پرعزم لہجہ میں) لیکن عورت کی لاش ہی شوہر کے گھر سے نکلتی ہے۔

عشرت : میرے لیے تم مرچکی ہو۔

مریم : لیکن مرنے کے بعد بھی آپ کی خدمت میرا فرض ہے (آنسو پونچھ کر) جب تک عورت ذات پر آپ نے جو حملہ کیا ہے اور مجھ پر جو الزام لگایا ہے اس کو غلط ثابت نہ کردوں گی میں ہرگز نہیں جاؤں گی— اس کے بعد آپ کو اختیار ہوگا۔

عشرت : (غصہ سے) لیکن مجھے اس کی ضرورت نہیں— تم میرے لیے سوہانِ روح ہو۔

مریم : مجھے اس کی ضرورت ہے— اگرچہ میری جان بھی ضیق میں ہے۔

(عشرت غصہ سے کتاب پھینک دیتا ہے اور کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے۔ مریم خاموش کھڑی آنسو بہاتی رہتی ہے)

عشرت : (غصہ سے) لایئے کھانا لایئے— اس کو زہر مار کروں— (مریم آنسو پونچھتی ہوئی کمرہ سے نکل جاتی ہے عشرت غصہ سے کمرہ میں ٹہلتا رہتا ہے۔ مریم کھانا لاکر میز پر رکھ دیتی ہے۔ عشرت بیٹھ کر کھانے لگتا ہے۔ مریم پنکھا جھلنے لگتی ہے عشرت پہلا لقمہ لے کر غصہ سے مریم کی شکل دیکھ کر) جب آپ کو کھانا پکانے میں دلچسپی نہیں— تو پھر پکانے ہی کی زحمت کیوں گوارا کرتی ہیں۔

مریم : (سہم کر) یہ بات تو نہیں ہے۔

عشرت : میں کئی روز سے دیکھ رہا ہوں کہ کسی دن کھانے میں مرچیں زیادہ ہیں تو کسی دن نمک— جب امور خانہ داری میں دلچسپی نہیں تو پھر—

مریم : جس روز مجھے آپ کے کاموں میں دلچسپی نہ رہے گی میں خودکشی کرلوں گی۔

عشرت : (حقارت سے) اس قدر غیرت مند تو نظر نہیں آتیں (غصہ سے) کھانا پکا کر چکھا بھی تھا کہ مزا درست ہے یا نہیں— اس قدر نمک ہے کہ کڑوا ہوگیا ہے۔ (غصہ سے رکابی اٹھا کر پھینک دیتا ہے اور کھانا چھوڑ کر کھڑا ہوجاتا ہے)

مریم : (التجا آمیز لہجہ میں) ٹھہریے میں دوسرے کھانے کا انتظام کرتی ہوں۔

عشرت : (غصہ سے) اب آپ اپنے ہی واسطے انتظام کیجیے گا مجھے ضرورت نہیں۔ (کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ مریم خاموش بیٹھی رہتی ہے آنسو جاری ہوجاتے ہیں)

مریم : (ٹھنڈی سانس بھر کر)

کل تک یہی گلشن تھا صیاد بھی بجلی بھی
دُنیا ہی بدل ڈالی تعمیر نشیمن نے

(کھانے کے برتن وغیرہ جمع کرنے لگتی ہے۔ انوار صاحب داخل ہوتے ہیں۔ مریم منہ چھپا کر آنسو پونچھتی ہے)۔

انوار صاحب: کہو بیٹی مریم اچھی تو ہو۔

مریم : آداب عرض ہے ابا جان— دعا ہے آپ کی۔

انوار صاحب: (ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے) کچھ غمگین نظر آرہی ہو۔

مریم : (چہرہ پر مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے) جی نہیں۔

انوار صاحب: تمھاری ماں کہہ رہی تھیں کہ تمھارے اور عشرت کے تعلقات کچھ ناخوشگوار ہوگئے ہیں۔

مریم : (غمگین مسکراہٹ سے) امی کو تو بلا وجہ شبہات ہوجاتے ہیں۔

انوار صاحب: (مریم کا چہرہ غور سے دیکھ کر) تمھارے چہرہ سے بھی یہی ظاہر ہے— دیکھو

بیٹی— ویسے تم جس وقت چاہو آسکتی ہو— لیکن اگر عشرت کو ناراض کرکے آئیں تو اس گھر کا دروازہ تم کو ہمیشہ بند ملے گا۔

مریم : (پرعزم لہجہ میں) ابا جان!— آپ مطمئن رہیے— میں زندگی کی بازی لگا کر خاندانی عزت— عورت اور خاص طور پر مسلمان عورت کے نصب العین کی حفاظت کروں گی۔

انوار صاحب: شاباش بیٹی مجھے تم سے ایسی ہی اُمید ہے—(کھڑے ہوتے ہوئے)— اچھا خدا حافظ۔

مریم : (کھڑے ہوتے ہوئے) ٹھہریے تو میں آپ کے واسطے پان لاؤں۔

انوار صاحب: نہیں، مجھے اس وقت اور بھی کام ہیں۔

زلیخا : (داخل ہوتے ہوئے) آپ کو تو ہمیشہ ہی کام رہتے ہیں چچا جان۔ (مریم کمرہ سے نکل جاتی ہے)

انوار صاحب: ارے بیٹی زلیخا!— تو کہاں چھپی ہوئی تھی—اب تیری آنکھوں کا کیا حال ہے۔

زلیخا : ٹھیک ہی ہے— ڈاکٹر نے چشمہ کا استعمال کرایا ہے۔

(مریم پان لے کر داخل ہوتی ہے۔ انوار صاحب پان کھا کر)

انوار صاحب: اچھا بیٹیو— اب میں چلتا ہوں۔

زلیخا : آپ تو ایک عرصہ میں تشریف لائے ہیں۔ بہت یاد ہونے لگتے ہیں۔

انوار صاحب: (مسکرا کر) تو خود ہی کیوں نہیں چلی آتی)۔ اب آیا کرے گی نا۔

زلیخا : ضرور۔

انوار صاحب: خدا حافظ— (کمرہ سے نکل جاتے ہیں)

زلیخا : مریم آپا— بھائی جان آپ سے اِس قدر بدسلوکی سے پیش آتے ہیں۔ لیکن میں آپ کے چہرہ پر شکن تک نہیں دیکھتی۔

مریم : (مسکرا کر) تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے— زلیخا— تمھارے بھائی جان مجھ سے اب بھی ویسی ہی محبت کرتے ہیں اور پھر تکالیف برداشت کرنا تو ہمارا فرض ہے۔

زلیخا : لیکن بھائی جان تو ظلم کی حد تک زیادتی کرتے ہیں اور انھیں احساس نہیں ہوتا۔

مریم : جس روز غلط فہمی دور ہوجائے گی۔ ان میں احساس پشیمانی کی حد تک بیدار ہوجائے گا۔

زلیخا : آفرین ہے آپ کی ہمت پر۔ اچھا مریم آپا میں کچھ دیر اور تصویر پر کام کرلوں۔

مریم : بھئی تم تو پاگل ہوگئی ہو۔۔۔ کچھ آنکھوں کو آرام بھی دوگی یا نہیں۔ تم نے مجھے اور پریشان کررکھا ہے۔

زلیخا : مریم آپا!۔۔۔ تصویر نمائش میں بھیجنے کے لیے صرف چار ہی روز تو رہ گئے ہیں۔ (مسکرا کر کمرہ سے نکل جاتی ہے)

مریم : (ٹھنڈی سانس بھر کر)۔

یارب تیری رحمت سے مایوس نہیں فانی
لیکن تیری رحمت کی تاخیر کو کیا کہیے

(پردہ)

تیسرا ایکٹ

پہلا سین

کشمیر میں شہناز کے چچا کی کوٹھی۔ کوٹھی کے سامنے اک چھوٹا سا باغیچہ۔ انتہائی حسین۔ شام کا وقت ہے شہناز اور اکرم آرام کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ اکرم دور پہاڑوں پر غروب آفتاب کا منظر غور سے دیکھ رہا ہے۔ شہناز ایک اخبار کے مطالعہ میں مشغول ہے۔ شہناز یکا یک اخبار پر سے نظریں اٹھا کر۔

شہناز : اکرم صاحب؟

اکرم : (اسی طرح غروب آفتاب کا منظر دیکھتے ہوئے) جی۔

شہناز : آپ مسٹر انور کو جانتے ہیں۔

اکرم : کون انور؟

شہناز : خان بہادر ریاض احمد کے صاحبزادے۔

اکرم : جی ہاں— بہت اچھی طرح۔

شہناز : وہ میرے بڑے دوست ہیں— آج خط آیا ہے ان کی شادی ہونے والی ہے— مجھے بھی شرکت کی دعوت دی ہے۔

اکرم : شادی۔ بہت خوب۔ کس سے ہو رہی ہے شادی۔

شہناز : کوئی پروفیسر عشرت حسین ہیں۔ ان کی بہن سے۔

اکرم : (ایک دم چونک کر) عشرت حسین کی بہن— یعنی زلیخا سے؟

شہناز : نام کا تو مجھے علم نہیں— کیا زلیخا نام ہے؟

اکرم : جی ہاں۔

شہناز : تو آپ پروفیسر عشرت حسین سے واقف ہیں۔

اکرم : جی واقف ہی نہیں بلکہ وہ میرے قریبی عزیز ہیں اور میں انہی کے یہاں رہا کرتا تھا۔

شہناز : بہت خوب! تو پھر آپ زلیخا کو اچھی طرح جانتے ہوں گے— کوئی سوسائٹی گرل ہوں گی وہ۔

اکرم : جی نہیں— وہ ایک سیدھی سادھی اور صرف ہندستانی لڑکی ہے۔

شہناز : تو آپ کو بھی دعوت نامہ آج ہی آجائے گا۔

اکرم : لیکن میں شادی میں شرکت نہیں کروں گا۔
(کسی گہری سوچ میں مبتلا ہو جاتا ہے)

شہناز : کیوں شرکت نہیں کیجیے گا— آپ کو تو ضرور شرکت کرنا ہوگی— ورنہ عشرت صاحب ناراض نہ ہوں گے۔

اکرم : ہوا کریں— مجھے اکثر کسی کی ناراضگی کی پروا نہیں ہوتی۔

شہناز : میں تو کل روانہ ہو رہی ہوں— اور آپ—

اکرم : میں بھی چلوں گا۔

شہناز : جا کر تو عشرت صاحب کے یہاں ہی ٹھہریے گا پھر کیسے شرکت نہ کیجیے گا۔

اکرم : اب میں وہاں کبھی نہیں جاؤں گا۔

شہناز :تو پھر۔

اکرم : (طنزیہ مسکرا کر) آپ مطمئن رہیے میں آپ پر بھی بار نہیں بنوں گا— میں آسانی سے کہیں بھی رہ سکتا ہوں۔

(کسی سوچ میں ٹہلنے لگتا ہے)

(پردہ)

تیسرا ایکٹ

پہلا سین

(مریم کے سونے کا کمرہ۔ رات کے تقریباً بارہ بجے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ اور کبھی کبھی بارش بھی ہونے لگتی ہے۔ مریم اپنے بستر پر پڑی کروٹیں بدل رہی ہے۔ کچھ دیر یوں ہی کروٹیں بدلتی رہتی ہے۔ پھر اٹھ کر ایک کتاب اٹھا لیتی ہے اور بستر پر لیٹے لیٹے اس کی ورق گردانی کرنے لگتی ہے۔ زلیخا داخل ہوتی ہے)۔

زلیخا :مریم آپا۔

مریم : (گھبرا کر) کون؟ زلیخا— (اٹھ کر بیٹھتے ہوئے) کہو خیریت تو ہے۔

زلیخا : جی ہاں خیریت ہے۔ نیند نہیں آرہی تھی سوچا کہ چل کر آپ سے گفتگو کروں۔

مریم : (بستر پر اشارہ کرتے ہوئے)— آؤ بیٹھو—

(زلیخا بستر پر بیٹھ جاتی ہے۔ کچھ دیر سوچتی رہتی ہے)

زلیخا : مریم آپا— نامعلوم میں پریشان کیوں رہتی ہوں— کسی کام میں بھی دل نہیں لگتا۔

مریم : اپنا دل بہلانے کی کوشش کرو— ناامیدی ایک گناہ عظیم ہے۔

زلیخا : جی ہاں میں یہ جانتی ہوں— مگر—

مریم : اکرم ضرور آئے گا مجھے یقین ہے۔

زلیخا : وہ ضرور آئیں گے — مجھے بھی یقین ہے — لیکن وہ چلے کیوں گئے۔ مانا کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتے تھے — شہناز

مریم : (تعجب سے) شہناز — کون شہناز؟

زلیخا : میں بھی نہیں پہچانتی اسے — مگر وہ ان سے محبت کرتی تھی اور شاید وہ بھی اس سے — مری نظروں کے سامنے رہتے مجھے تسکین ہوتی۔

مریم : غلط — وہ تمھارے سوا اور کسی سے محبت نہیں کرسکتا — مجھے یقین ہے مگر کچھ لاابالی ہے —

زلیخا : وہ آئیں گے ضرور — مگر شاید میں انھیں دیکھنے کے قابل نہ رہوں گی۔

مریم : پھر وہی ناامیدی — آخر تم اس قدر قنوطی کیوں ہوگئی ہو۔

زلیخا : کیا کہوں مریم آپا — دل کچھ بیٹھا سا جاتا ہے۔ بہت بہلانے کی کوشش کرتی ہوں مگر —

(عشرت شب خوابی کا لباس پہنے داخل ہوتا ہے اور زلیخا سے مخاطب ہوکر)

عشرت : زلیخا — اس قدر رات کو یہاں کیا ہورہا۔

زلیخا : نیند نہیں آرہی تھی۔ اس واسطے مریم آپا کے پاس آگئی۔

عشرت : تمھیں میرے پاس آنا چاہیے تھا۔

زلیخا : لیکن مریم آپا بھی تنہائی میں گھبراتی ہوں گی۔

عشرت : (غصہ سے) مرنے دو انھیں — گناہوں کا کفارہ صرف تنہائی ہوسکتی ہے۔

زلیخا : گناہ؟ — (تعجب سے) مریم آپا اور گناہ؟ — وہ کوئی گناہ کرہی نہیں سکتیں۔

عشرت : یہ تمھارا خیال ہے — میں جو کچھ جانتا ہوں۔ تمھیں اس کا علم نہیں۔

زلیخا : آپ کو غلط فہمی بھی تو ہوسکتی ہے۔

عشرت : (طنزیہ مسکرا کر) غلط فہمی؟ میں آج تک جو چیز تم سے چھپانا چاہتا تھا اسے کہہ دینے پر مجبور ہوں — یہ تمھارے ساتھ ظلم کررہی ہیں اور میرے ساتھ اپنا

فرض بھول گئی ہیں — مجھے دھوکہ دے رہی ہیں۔

مریم : (کسی قدر برہم ہوکر) کیا مطلب ہے آپ کا؟

عشرت : مطلب؟ — (طنزیہ مسکرا کر) میں اس کا ثبوت دیتا ہوں (کمرہ سے نکل جاتا ہے اور چند منٹ بعد واپس آتا ہے (ایک خط مریم کو دکھلاتے ہوئے) یہ ہے اس کا ثبوت — یہ اکرم سے خط و کتابت کیا معنی؟

مریم : (تعجب سے) اکرم سے خط و کتابت؟ — (غصہ سے) — یہ غلط ہے میں اس قدر ذلیل نہیں ہوسکتی۔

عشرت : اس کا ثبوت تو یہ موجود ہے — جس خط میں اُس نے تم سے پیمانِ وفا باندھا ہے — اور نہ معلوم کیا کیا لکھا ہے۔

مریم : یہ سراسر غلط ہے — یا کسی کی بڑی چال ہے۔

عشرت : (مسکرا کر) مگر یہ ثبوت — !

(زلیخا پریشان ہوکر عشرت کا چہرہ دیکھتی ہے مریم رونے لگتی ہے)

عشرت : تمھارے آنسو تمھارا گناہ نہیں چھپا سکتے۔

مریم : لیکن میں نے کوئی گناہ کیا بھی ہو —

عشرت : اس کا ثبوت تو یہ ہے۔

زلیخا : بھائی جان — اگر یہ خط گناہ کا ثبوت ہے تو اکرم اس کے ذمہ دار ہوسکتے ہیں مریم آپا نہیں — وہ اس قدر ذلیل ہیں مجھے علم نہ تھا۔

عشرت : جی ہاں کیوں ہونے لگا — وہ تو بدقسمتی سے میرے ہاتھ پڑ گیا۔

مریم : میرے خدا —

عشرت : (غصہ سے) — گناہوں میں خدا کا سہارا کیوں ڈھونڈتی ہو — (زلیخا کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے) — چلو اٹھو یہاں سے۔

(اپنے کمرہ میں لے جاتا ہے۔ مریم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے)۔

(پردہ)

دوسرا سین

(مزدوروں کے محلے کی جھونپڑی۔ جھونپڑی میں ایک پرانی سی چارپائی بچھی ہے جس پر ایک میلا اور گندہ بستر بچھا ہے۔ اس کے پاس ایک چٹائی بچھی ہے۔ جس پر ایک پھٹا پرانہ بستر ہے۔ چارپائی پر ایک بوڑھی عورت عمر تقریباً 60 سال ہے بیٹھی ہے۔ بہت ہی میلا اور بوسیدہ لباس پہنے ہے۔ چٹائی کے بستر پر اکرم دھوپ کا چشمہ لگائے بیٹھا ہے۔ جھونپڑی میں ایک الگنی ہے جس پر کچھ میلے کپڑے لٹک رہے ہیں۔ جھونپڑی کے ایک کونہ میں چولھا رکھا ہے جس کے گرد کچھ مٹی کے برتن بے ترتیب پڑے ہیں۔ اکرم چٹائی پر کچھ کھویا کھویا بیٹھا ہے۔ یکا یک اخبار بیچنے والے لڑکے کی آواز آتی ہے:'' ایک پردہ نشین خاتون زلیخا کو آل انڈیا آرٹ ایگزیبیشن میں پہلا انعام مل گیا'')

اکرم : (ایک دم چونک کر) ماں زلیخا کو پہلا انعام مل گیا۔ ایک اخبار تو خریدو—
(بوڑھی عورت اٹھ کر باہر جاتی ہے اور اکرم بے صبری میں دروازہ کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ بوڑھی عورت اخبار لے کر واپس آتی ہے)

اکرم : کیا لکھا ہے اس میں ماں!

عورت : میں کیا جانوں بیٹا— وہ لڑکا کہہ رہا تھا کہ کسی زلیخا کو پہلا انعام مل گیا ہے۔

اکرم : (چہرہ پر خوشی کے آثار پیدا کرکے)— زلیخا کو؟

عورت : ہاں بیٹا— اگر تمھاری تصویر پوری ہو جاتی تو—

اکرم : اس وقت مجھے اس قدر خوشی نہ ہوتی—

عورت : کیا تم زلیخا کو جانتے ہو۔

اکرم : (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہاں ماں— میں اسے جانتا ہوں— وہ میری عزیز ہے— میں شاید اس سے

عورت : بیٹا— تم ایک پراسرار طریقہ سے دروازہ پر سوتے ہوئے ملے— اس کے

بعد تم نے کوئی راز نہیں بتلایا۔۔ پھر مکان میں آگ لگی اور تم نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے میرا سامان بچانے کی کوشش کی۔۔ جس کا خمیازہ۔۔

اکرم : پھر میرے بیمار ہو جانے پر میری ماں نے خدمت کی۔۔

عورت : خدمت ہی تو نہیں کر سکتی ورنہ۔

اکرم : ارے چھوڑو ماں۔۔ قسمت کا لکھا پورا ہوتا ہے۔۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری اگر حقیقی ماں بھی ہوتی تو وہ اس قدر خدمت نہ کرتی۔

عورت : مجھے سب سے بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ تم اپنی تصویر مکمل نہ کر سکے۔ ورنہ پہلا انعام تم ہی کو ملتا۔

اکرم : ماں! زندگی میں بہت سی خواہشات ہوتی ہیں۔ سب ہی تھوڑی پوری ہو جاتی ہیں۔

عورت : لیکن بیٹا تم کہہ رہے تھے کہ اس تصویر سے تمھاری زندگی کا گہرا تعلق ہے۔

اکرم : (ٹھنڈی سانس بھر کر) ماں تھا تو۔۔ لیکن ''اب پورا ہو گیا ہے ماں کیا تم مجھے وہاں جانے کی اجازت دو گی۔

عورت : نہیں۔۔ جن دشمنوں نے مکان میں آگ لگائی تھی کہیں وہ تمھیں بھی مجھ سے نہ چھین لیں۔۔ میں تو ہرگز نہ جانے دوں گی۔ اور پھر تم مجھے ہمیشہ ماں کہتے رہے ہو۔۔ بھلا ایک ماں اس حالت میں کیسے اجازت دے سکتی ہے۔

اکرم : لیکن میری پیاری ماں۔۔ خدا میری حفاظت کرے گا۔'' میں بہت جلد واپس آجاؤں گا۔

عورت : لیکن جاؤ گے کہاں۔

اکرم : اس سے ملنے۔۔ اسے مبارکباد دینے۔

عورت : کس سے ملنے بیٹا۔

اکرم : زلیخا سے۔۔ میری ماں مجھے اجازت دے دو۔۔ میں اس سے صرف ایک بار ملنا چاہتا ہوں۔۔ اسے اس کی شاندار کامیابی پر مبارکباد دینا چاہتا ہوں۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) اور شاید اس کی شادی کی بھی۔۔

عورت : تو کیا اس کی شادی ہو چکی ہے—

اکرم : اس وقت تک تو نہیں ہوئی تھی— لیکن اب ہو ضرور گئی ہوگی۔ ماں میں ضرور جاؤں گا— مجھے اجازت دے دو— پھر موت مجھے تمھارے ہی آغوش میں لے آئے گی۔ (عورت سے بچوں کی طرح چمٹ جاتا ہے)

(پردہ)

تیسرا سین

(انور کی کوٹھی کا ایک شاندار کمرہ۔ تمام کمرہ میں بہترین قالین کا فرش صوفے مناسب جگہوں پر رکھے ہیں۔ تمام دروازوں پر قیمتی پردے لٹک رہے ہیں۔ دیواروں پر بہترین تصاویر آویزاں ہیں۔ مغربی دیوار پر انور کا ایک بہت بڑا فوٹو آویزاں ہے۔ اس کے بالکل سامنے والی دیوار پر قائداعظم کا فوٹو سنہری فریم میں آویزاں ہے۔ تمام کمرہ کے ساز وسامان سے مالک کی دولت مندی کا ثبوت ملتا ہے۔ بیگم ریاض ایک صوفے پر بیٹھی ہیں اور ریاض صاحب غصہ سے کمرہ میں ٹہل رہے ہیں۔ تیز تیز قدموں سے بیگم ریاض کے پاس جاکر)۔

ریاض صاحب: انور کی ماں!— تم مری ناک کٹوا کے رہوگی۔

بیگم ریاض : آپ کی عزت میری عزت— لیکن آپ خود غور فرمایئے کہ انور کے جذبات کو کس قدر ٹھیس پہنچے گی— اب وہ شادی کی قطعی مخالفت کر رہا ہے۔

ریاض صاحب: وہ ابھی بچہ ہے— اپنی بھلائی برائی نہیں سمجھ سکتا۔

بیگم ریاض : وہ بچہ ضرور ہے— لیکن زلیخا اپنی بصارت کھو چکی ہے۔ وہ انور کے دل میں روشنی نہیں تاریکی بن کر آئے گی۔

ریاض صاحب: کچھ بھی ہو— میں نے عشرت کو پیغام دیا اور اس نے منظور کر لیا ہے۔ اب میں کس منہ سے انکار کروں۔ (غصہ سے کمرہ میں ٹہلنے لگتے ہیں)

بیگم ریاض : عشرت سمجھ دار لڑکا ہے۔ اب وہ اس کو بھی منظور نہ[illegible]ے گا کہ—

ریاض صاحب: انور کی ماں — یہ تمھارا خیال ہے۔ عشرت کے دل کو ہماری اس خودغرضی سے کس قدر چوٹ لگے گی۔ کبھی اس پر تم نے غور نہیں کیا۔

بیگم ریاض : عشرت کبھی یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ انور زلیخا سے شادی کرنے کے بعد کسی اور سے شادی کرے اور اگر انور کی زلیخا سے شادی ہوگئی تو یہ ہوکر رہے گا۔

ریاض صاحب: یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ اگر ایسا ہوا تو میں انور کو اپنی جائداد سے محروم کردوں گا۔

انور : (داخل ہوکر) ابا جان آپ کی جائداد پر میرا قانونی اور مذہبی حق ہے۔ آپ اس سے مجھے کیسے محروم کرسکتے ہیں۔

ریاض صاحب: کیوں نہیں کرسکتا۔ (غصہ سے انور کے پاس آکر) جب تک میں زندہ ہوں اس کا میں مالک ہوں جسے چاہوں دوں۔

انور : لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ نہ میں زلیخا سے محبت کرتا ہوں اور نہ وہ مجھ سے۔

ریاض صاحب: اور ابھی چند روز پیشتر تو تم اس کے پیچھے دیوانے ہوئے جارہے تھے۔

انور : وہ دیوانگی نہیں تھی خودغرضی تھی — یہ جانتے ہوئے کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے میں اسے حاصل کرنے کی ہر جائز اور ناجائز کوشش کررہا تھا۔

ریاض صاحب: اور اب میری ناک کٹوانے کے درپے ہو۔

انور : سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ہندوستانیوں کی ناک موم کی کیوں بنائی جاتی ہے — جو بار بار —

ریاض صاحب: (غصہ سے) خاموش رہو بدتمیز۔ میں تمھارا باپ ہوں اسی دن کے لیے لکھایا پڑھایا تھا کہ مجھ سے اس طرح گفتگو کرو۔

انور : میری تعلیم و تربیت آپ کا فرض تھا جو آپ نے ادا کیا۔ اب فرض کے معاوضہ کی توقع کیا معنی۔

ریاض صاحب: کمینہ — (انور کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کرتے ہیں) میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ میں تمھاری منحوس شکل دیکھنا نہیں چاہتا — (انور غصہ سے کمرہ سے

نکل جاتا ہے) انور کی ماں یاد رہے کہ اب اگر انور میرے گھر میں داخل ہوا تو گولی مار دوں گا— (پاس رکھا ہوا ایک گلدان اٹھا کر انور کی تصویر پر مارتے ہیں)— وہ اب میرے لیے مر چکا ہے— آج سے میں اپنی تمام جائداد زلیخا اور اس کے شوہر کے نام کرتا ہوں۔

(کمرہ میں ٹہلنے لگتے ہیں)

(پردہ)

چوتھا سین

(اکرم کا کمرہ۔ زلیخا کھڑکی کے پاس بیٹھی ہے۔ تمام سامان وہی ہے جو اکرم کے زمانہ میں تھا۔ اکرم کی بنائی ایک نامکمل تصویر پاس ہی لٹک رہی ہے۔ عشرت اکرم کا ہاتھ پکڑے ہوئے داخل ہوتا ہے۔ اکرم دھوپ کا چشمہ لگائے ہے۔ عشرت اسے لاکر چارپائی کے پاس لا کھڑا کر دیتا ہے)

عشرت : (زلیخا سے) زلیخا! اکرم آیا ہے۔

زلیخا : کس لیے؟ میرا مذاق اڑانے یا مریم آپا پر کچھ اور الزامات لگانے!

اکرم : نہیں زلیخا! میں تمھیں مبارک باد دینے آیا ہوں۔

عشرت : (کچھ سوچ کر) میں جا کر اکرم کے واسطے چائے کا انتظام کروں (کمرہ سے نکل جاتا ہے)

زلیخا : مبارکباد کیسی۔

اکرم : تمھاری شاندار کامیابی پر۔

زلیخا : (تعجب سے) شاندار ناکامی؟— میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا زلیخا— انور میں آخر ایسی برائی ہی کیا ہے۔ شادی خانہ آبادی ہوتی ہے۔

زلیخا : شادی— کیسی شادی— جب کہ میں سب کچھ کھو چکی ہوں آپ شادی کا نام لیتے ہیں۔

بعد تم نے کوئی راز نہیں بتلایا— پھر مکان میں آگ لگی اور تم نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے میرا سامان بچانے کی کوشش کی— جس کا خمیازہ—

اکرم : پھر میرے بیمار ہو جانے پر میری ماں نے خدمت کی—

عورت : خدمت ہی تو نہیں کر سکتی ورنہ۔

اکرم : ارے چھوڑو ماں— قسمت کا لکھا پورا ہوتا ہے— لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری اگر حقیقی ماں بھی ہوتی تو وہ اس قدر خدمت نہ کرتی۔

عورت : مجھے سب سے بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ تم اپنی تصویر مکمل نہ کر سکے۔ ورنہ پہلا انعام تم ہی کو ملتا۔

اکرم : ماں! زندگی میں بہت سی خواہشات ہوتی ہیں۔ سب ہی تھوڑی پوری ہو جاتی ہیں۔

عورت : لیکن بیٹا تم کہہ رہے تھے کہ اس تصویر سے تمھاری زندگی کا گہرا تعلق ہے۔

اکرم : (ٹھنڈی سانس بھر کر) ماں تھا تو— لیکن ''اب پورا ہو گیا ہے ماں کیا تم مجھے وہاں جانے کی اجازت دو گی۔

عورت : نہیں— جن دشمنوں نے مکان میں آگ لگائی تھی کہیں وہ تمھیں بھی مجھ سے نہ چھین لیں— میں تو ہرگز نہ جانے دوں گی۔ اور پھر تم مجھے ہمیشہ ماں کہتے رہے ہو— بھلا ایک ماں اس حالت میں کیسے اجازت دے سکتی ہے۔

اکرم : لیکن میری پیاری ماں— خدا میری حفاظت کرے گا۔'' میں بہت جلد واپس آجاؤں گا۔

عورت : لیکن جاؤ گے کہاں۔

اکرم : اس سے ملنے— اسے مبارکباد دینے۔

عورت : کس سے ملنے بیٹا۔

اکرم : زلیخا سے— میری ماں مجھے اجازت دے دو— میں اس سے صرف ایک بار ملنا چاہتا ہوں— اسے اس کی شاندار کامیابی پر مبارکباد دینا چاہتا ہوں— (ٹھنڈی سانس بھر کر) اور شاید اس کی شادی کی بھی—

عورت : تو کیا اس کی شادی ہو چکی ہے —

اکرم : اس وقت تک تو نہیں ہوئی تھی — لیکن اب ہو ضرور گئی ہوگی۔ ماں میں ضرور جاؤں گا — مجھے اجازت دے دو — پھر موت مجھے تمھارے ہی آغوش میں لے آئے گی۔ (عورت سے بچوں کی طرح چمٹ جاتا ہے)

(پردہ)

تیسرا سین

(انور کی کوٹھی کا ایک شاندار کمرہ۔ تمام کمرہ میں بہترین قالین کا فرش صوفے مناسب جگہوں پر رکھے ہیں۔ تمام دروازوں پر قیمتی پردے لٹک رہے ہیں۔ دیواروں پر بہترین تصاویر آویزاں ہیں۔ مغربی دیوار پر انور کا ایک بہت بڑا فوٹو آویزاں ہے۔ اس کے بالکل سامنے والی دیوار پر قائداعظم کا فوٹو سنہری فریم میں آویزاں ہے۔ تمام کمرہ کے ساز و سامان سے مالک کی دولت مندی کا ثبوت ملتا ہے۔ بیگم ریاض ایک صوفے پر بیٹھی ہیں اور ریاض صاحب غصہ سے کمرہ میں ٹہل رہے ہیں۔ تیز تیز قدموں سے بیگم ریاض کے پاس جا کر)۔

ریاض صاحب: انور کی ماں! — تم مری ناک کٹوا کے رہوگی۔

بیگم ریاض : آپ کی عزت میری عزت — لیکن آپ خود غور فرمایئے کہ انور کے جذبات کو کس قدر ٹھیس پہنچے گی — اب وہ شادی کی قطعی مخالفت کر رہا ہے۔

ریاض صاحب: وہ ابھی بچہ ہے — اپنی بھلائی برائی نہیں سمجھ سکتا۔

بیگم ریاض : وہ بچہ ضرور ہے — لیکن زلیخا اپنی بصارت کھو چکی ہے۔ وہ انور کے دل میں روشنی نہیں تاریکی بن کر آئے گی۔

ریاض صاحب: کچھ بھی ہو — میں نے عشرت کو پیغام دیا اور اس نے منظور کرلیا ہے۔ اب میں کس منہ سے انکار کروں۔ (غصہ سے کمرہ میں ٹہلنے لگتے ہیں)

بیگم ریاض : عشرت سمجھ دار لڑکا ہے۔ اب وہ اس کو بھی منظور نہ ... ے گا کہ —

اکرم : زلیخا— کیا تم مجھ سے اب اس قدر نفرت کرنے لگی ہو کہ بیٹھنے تک کو نہیں کہوگی۔

زلیخا : تشریف رکھیے آپ!

اکرم : (چارپائی پر بیٹھتے ہوئے) زلیخا— کیا تم مجھے معاف نہیں کرسکتیں۔ واقعات نے مجھے مجبور کیا کہ میں یہاں سے چلا جاؤں— عشرت بھائی اور بھابی دونوں مجھے انتہا سے زیادہ کمینہ سمجھتے تھے۔

زلیخا : نہیں نہیں— ایسا نہ کہیے— مریم آپا آپ کو ہمیشہ سے اب تک ایک شریف انسان سمجھتی رہی ہیں۔

اکرم : عشرت بھائی مجھے ضرور ایک کمینہ انسان سمجھنے لگے تھے— لیکن اگر وہ واقعی میرا اقدام تھا تو میں دنیا کا سب سے زیادہ کمینہ انسان ہوں— میں نے عشرت بھائی کے شکوک کو رفع کردیا ہے جب میں نے تمھاری کامیابی کا پیغام سنا تو دل مچل گیا اور مبارکباد دینے تمھارے پاس آگیا— دل مچل رہا تھا۔ میری مبارکباد قبول کرو۔ تاکہ میں ایک تسکین قلب کو لے کر واپس جاؤں اور پھر تمھیں اپنی منحوس شکل نہ دکھاؤں ۔ پہلے میں تم سے محبت کرتا تھا— لیکن اب انور تمھارا—!

زلیخا : (بے تاب سی ہوکر) نہیں نہیں— ایسا نہ کہیے— میں کسی دوسرے کی نہیں ہوسکتی— اب میری انور سے کبھی شادی نہ ہوگی— کیا آپ مجھ سے اب بھی ویسی ہی محبت کرتے ہیں؟

اکرم : تو کیا تمھاری شادی نہیں ہوئی۔

زلیخا : ہاں اکرم!— لیکن سچ بتاؤ کیا تم اب بھی مجھ سے ایسی ہی محبت کرتے ہو؟

اکرم : کیوں نہیں؟

زلیخا : (کرسی سے کھڑی ہوکر) تو آیئے۔ مجھے سہارا دیجیے— ہم عشرت بھائی کو بھی یہ خوشخبری سنا دیں— وہ بھی خوش ہوں گے۔

اکرم : (ٹھنڈی سانس بھر کر) لیکن مجھے تو اب سہارا تمھیں دینا ہوگا— (چشمہ اتار

کر) کیا تم دیکھتی نہیں کہ میں اپنی آنکھیں کھو چکا ہوں۔

زلیخا : (گھبرا کر) آپ اپنی آنکھیں۔

اکرم : کیا اب— تم مجھے—

زلیخا : نہیں نہیں اکرم— اب بھی میں تم سے ویسی ہی محبت کرتی ہوں— آؤ ہم دونوں ایک دوسرے کو سہارا دیں— میں نے بھی اپنی آنکھوں کی روشنی دے کر تمہیں حاصل کیا۔

(دونوں ٹٹول کر ایک دوسرے کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں)

(پردہ)

پانچواں سین

(مریم کے سونے کا کمرہ۔ مریم ایک کرسی پر بیٹھی ہے۔ انور اس کے پاس فرش پر بیٹھا ہے۔ مریم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ انور بھی رو رہا ہے اور بار بار آنسو پونچھتا جاتا ہے)

انور : (التجا آمیز لہجہ میں) نہیں آپا— آپ پر جو مصائب پڑے ہیں ان سب کا ذمہ دار میں ہوں— خدا کے لیے مجھے معاف کر دیجیے۔

مریم : انور میاں مصائب کا تعلق کسی کی ذات سے نہیں ہوتا— سب تقدیر کی وجہ سے ہوتا ہے۔ کسی پر بھی الزام نہیں لگایا جاسکتا۔

انور : لیکن سب کچھ میری خودغرضی کی بنا پر ہوا ہے۔

مریم : جو کچھ ہونا تھا وہ ہوگیا— جو کچھ ہونا ہے وہ ہوگا۔ آپ کیوں مفت میں۔

انور : اب میرا ضمیر ملامت کر رہا ہے— کیا آپ معاف نہیں کرسکتیں۔

مریم : مجھے آپ سے معافی مانگنا چاہیے کہ میں زلیخا کے معاملہ میں ہمیشہ آپ کی مخالفت کرتی رہی— لیکن وہ ایک اصولی مخالفت تھی—!

انور : آپ مجھے عورت کے روپ میں دیوی معلوم ہوتی ہیں۔ کوئی آسانی حور ہیں

جو مجھ سے ذلیل انسان کو رہنمائی کرنے کے واسطے دنیا میں آئی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کی پرستش کروں (مریم کا ہاتھ پکڑ کر چومتا ہے۔ عشرت داخل ہوتا ہے)

عشرت : (غصہ سے) میرے گھر کے اسٹیج پر جس کمینہ پلاٹ پر ڈرامہ کھیلا جارہا ہے یہ کبھی ختم بھی ہوگا یا نہیں— (طنزیہ) اس واسطے انور اور زلیخا کی شادی کی مخالفت کی جاتی تھی۔ میں پچاس ہزار مہر کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوں— ورنہ—

: (غصہ سے) عشرت بھائی— آپ پچاس ہزار مہر کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ مریم آپا شرافت کی زنجیروں میں اور میں محبت کی زنجیروں میں— ورنہ—

عشرت : (غصہ سے) خاموش رہ کمینہ کہیں کے— اگر میں نے تجھے اس طرح اپنے گھر میں آنے جانے کی اجازت دے دی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تو اپنے کمینہ پن سے میرے فہم و ادراک میرے ہوش و حواس اور صبر و چین پر ڈاکہ ڈالے۔

مریم : (غصہ سے) آپ پچاس ہزار مہر کی فکر نہ کیجیے— میں عورت کی پاکیزگی اور نیکی کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے معاف کیا۔ اب انشاء اللہ آپ میری شکل نہ دیکھیں گے— لیکن جانے سے پہلے یہ کہے جاتی ہوں کہ آپ نے جو کچھ سمجھا ہے وہ غلط ہے— میں اکرم اور انور سے بھائیوں کی طرح محبت کرتی ہوں وہ نہیں جو آپ کے مجرم دماغ نے سوچ رکھا ہے۔

عشرت : (تعجب سے) بھائی کی طرح۔

انور : جی ہاں— میں دنیا کا بدترین انسان ہوسکتا ہوں لیکن رگوں میں جو شرافت کا خون ہے اس کی روانی ابھی بند نہیں ہوئی ہے۔ (مریم کا ہاتھ پکڑ کر) چلیے بہن آپا— میں آپ کی خدمت کروں گا۔

عشرت : مریم! (اکرم اور زلیخا داخل ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے

ہیں۔ مریم کے چہرہ پر غصہ کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔

مریم : اکرم صاحب! وہیں کھڑے رہیے۔ میں آپ سے پردہ کروں گی۔

اکرم : مجھ سے — پردہ — میں تو اب آپ کو نہیں دیکھ سکتا۔

مریم : (نفرت سے) نہ دیکھ سکیں (اکرم دوسری طرف منہ پھیر لیتا ہے) گناہ اگر چھپالیا جائے تو وہ رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتا — یہ سب آپ کے اعمال کا نتیجہ ہے۔

اکرم : میرے اعمال کا نتیجہ — کیا بھابی آپ بھی مجھے قصور وار سمجھتی ہیں۔

مریم : آپ نے اپنا گناہ چھپانے کے واسطے یہاں سے منہ کالا کرلیا تھا — لیکن —

عشرت : مریم

اکرم : بھابی۔ میں ہمیشہ دعویٰ کرسکتا تھا کہ یہ میری جرأت نہیں — لیکن اس کا ثابت کرنا اسی قدر مشکل تھا — اسی واسطے بہانہ تراش کر چلا گیا تھا — (زلیخا سے ہاتھ چھڑا کر) اگر آپ مجھے اب بھی قصوروار سمجھتی ہیں تو میں ہمیشہ کے واسطے چلا جاتا ہوں۔ (قدم بڑھاتا ہے)

زلیخا : (حسرت سے) کیا جس سہارے کا وعدہ کیا تھا اکرم اس سے دامن چھڑا رہے ہو۔

اکرم : زلیخا — فی امان اللہ — مجھے بھول جاؤ۔

انور : (دوڑ کر اکرم کو پکڑتے ہوئے) اکرم بھائی ٹھہریے۔ قصوروار میں ہوں — آپ نہیں — وہ خط کی سازش میری تھی — میں نے ہی آپ کو کشمیر بھیجا تھا — اور جب ایک رات جھونپڑی میں زندگی گزار رہے تھے۔ میں نے ہی اس میں آگ لگائی تھی — خدا کے لیے میرے جرموں کو معاف کر دیجیے۔

اکرم : انور — تم۔

انور : ہاں اکرم بھائی — میں — خدا کے لیے معاف کر دیجیے۔

زلیخا : اکرم معاف کردو — معاف کرنا سب سے بڑی سزا ہے۔

اکرم : لیکن بھابی۔

زلیخا : جب آپ بے قصور ہیں تو ـــ

عشرت : مریم! میں کس سے اپنے قصور کی معافی مانگوں اکرم سے ـــ تم سے ـ ـ ـ یا زلیخا سے۔ کم از کم تم تو میرے مجرم دماغ کی خطا معاف کردو۔

مریم : (آنسو پونچھتے ہوئے) ـــ معاف کرنا عورت کی فطرت ہے ـــ میں فطرت کے خلاف کیسے کرسکتی ہوں ـــ!

(اکرم، زلیخا، عشرت اور انور۔ تعجب سے مسکرانے لگتے ہیں)

(پردہ)

(مطبوعہ: 'حور' لاہور، خاص نمبر 1948)

ایک پاگل

افرادِ تمثیل

جج صاحب (1) نزاکت (جج صاحب کی لڑکی) (2) اسد (نزاکت کا شوہر) (3) شوکت (اسد کا کاروباری منیجر) (4) عذرا (شوکت کی بیوی) (5) مسعود (نزاکت کا دوست)

اسٹیج کی ترتیب

(اسٹیج دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جب پردہ اٹھتا ہے تو سامنے ایک ڈرائنگ روم نظر آتا ہے، جس میں صوفے سیٹ، پیانو، ٹیلیفون اور دیگر آرائش و زیبائش کا سامان نظر آتا ہے۔ کمرے کو بے حد سلیقہ سے سجایا گیا ہے۔ خوب صورت ریشمی پردے ہیں جو دائیں اور بائیں جانب کے دروازوں پر پڑے ہوئے ہیں دوسرا حصہ تاریکی میں رہتا ہے۔ جب اس حصے میں روشنی ہوتی ہے تو پہلے حصہ میں آہستہ آہستہ تاریکی چھاجاتی ہے۔ جس رفتار سے اس حصہ میں تاریکی چھاتی ہے اسی رفتار سے دوسرے حصہ میں روشنی پھیلتی ہے۔ جب پہلے اسٹیج کا پردہ اٹھتا ہے تو جج صاحب پیانو کے پاس کھڑے اسے غور سے دیکھتے نظر آتے ہیں۔ ان کے پاس ذرا فاصلے پر ایک الماری کے پاس شوکت کھڑا نظر آتا

ہے جس نے الماری میں سے کوئی کتاب نکالی ہے، اور اس کی ورق گردانی کر رہا ہے۔ جج صاحب کچھ دیر پیانو کو دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر شوکت کی طرف مخاطب ہو کر۔)

جج صاحب: شوکت میاں!

شوکت : (نظریں اٹھا کر جج کو دیکھتا ہے۔ کتاب بند کر کے ہاتھ میں لیے ہوئے جج صاحب کے پاس آتے ہوئے) جی جج صاحب۔

(جج صاحب پھر پیانو کو غور سے دیکھتے ہیں۔ شوکت جج صاحب کے پاس آ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

جج صاحب: بھئی اس پیانو کو درست کرا دو— (مسکرا کر) تم جانتے ہو نزاکت بے حد ضدی ہے— (زیر لب مسکرا کر) کہیں نئے کی فرمائش نہ کر بیٹھے۔

شوکت : مگر اب تو یہ بہت پرانا ہو گیا ہے۔ (مسکرا کر) نئے کی فرمائش میں وہ حق بجانب ہوں گی۔

جج صاحب: پرانا سا پرانا ہے (مسکرا کر) نزاکت کی ماں نے اپنی جوانی میں خریدا تھا— مگر اب خریدنا فضول خرچی ہوگی— (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) کیا بجا ہے؟

شوکت : (اپنی کلائی پر گھڑی دیکھ کر) ساڑھے دس بجے ہیں۔

جج صاحب: ساڑھے دس!— (اپنی کلائی پر گھڑی دیکھتے ہیں) نزاکت ابھی تک کلب سے نہیں لوٹی۔

شوکت : جی نہیں ابھی تک نہیں— (مسکرا کر جس میں بے حد خفیف طنز محسوس ہوتا ہے) کلب میں زندگی تو ساڑھے دس بجے شروع ہوتی ہے۔

جج صاحب: مگر یہ طریقہ بے حد غلط ہے— (سوچتے ہوئے) میں آزادی کے خلاف نہیں، مگر اس کا اس طرح راتوں کو تنہا رہنا بھی مجھے پسند نہیں۔ میری ایک سماجی حیثیت ہے اس پر اس کا بے حد خراب اثر پڑے گا۔

شوکت : مگر سوال ان کی تنہائی کا ہے۔ (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) مسٹر اسد تو مہینوں ان کی خبر نہیں لیتے۔

جج صاحب: یہی تو اس کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے— (پیانو پر بے ربط انگلیاں مار کر) میں نوجوانوں کے احساسات کو خوب سمجھتا ہوں۔

شوکت : اب مسٹر اسد چار مہینے سے غیر حاضر ہیں۔ انھیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ بیوی کے لیے بھی ان کی کچھ ذمہ داریاں ہیں۔

جج صاحب: اسد بے حد کاروباری ذہنیت کا انسان ہے (ایک صوفے پر بیٹھ کر سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) بیٹھو۔

شوکت : (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) شکریہ! چار مہینے پہلے جب مسٹر اسد تشریف لے جا رہے تھے۔ میں نے نزاکت صاحبہ کے احساسات کو سمجھا تھا کہ ان کے دل میں مسٹر اسد کے ساتھ رہنے کی کس قدر خواہش ہے۔

آہستہ آہستہ اس اسٹیج پر تاریکی پھیل جاتی ہے اور دوسرا روشن ہو جاتا ہے جس کی ترتیب پہلے کی طرح ہے۔

اسد : کلو، ارے کلو— دیکھو جانے کم بخت کہاں غائب ہو گیا۔

نزاکت : سامان گاڑی پر رکھ رہا ہے آخر ایسی وحشت کیا ہے۔ (مسکرا کر) ہتھیلی پر سرسوں کیوں جما رہے ہو۔

اسد : کہیں ٹرین مس نہ ہو جائے۔

نزاکت : تو کہاں کا خدا کا غضب ہو جائے گا۔ کل بھی جایا جا سکتا ہے۔ تمھیں ابھی آئے ہوئے مشکل سے دو تین دن ہوئے ہیں۔

اسد : تم تو چاہتی ہو کہ میں چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھ رہوں۔ مرد کمانے کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔

نزاکت : اور تم اپنی تخلیق کے منصب کو صحیح طور پر پورا کر رہے ہو!

اسد : اگر انسان کے پاس روپیہ نہ ہو تو پھر اس کی زندگی کیا ہوئی؟

نزاکت : مگر عورت اپنے شوہر کے ساتھ رہے یہ بھی تو اس کی بڑی تمنا ہوتی ہے۔

اسد : تم تو سترھویں صدی کی باتیں کرتی ہو۔

نزاکت : اورتم اس صدی کی باتیں کرتے ہو جب انسان کاروباری حیوان ہوگا۔
اسد : (بات ٹالنے کے انداز میں) بلاوجہ تم تو بحث پر اتر آئیں۔
نزاکت : خیر چھوڑو۔ یہ بتلاؤ کب واپس آرہے ہو؟
اسد : ابھی گھر سے نکلا نہیں ہوں کہ تم کو واپس آنے کی فکر پڑ گئی— (دروازے کی جانب جاتے ہوئے)— اچھا— خدا حافظ— اور ہاں دیکھو اپنی صحت کا خیال رکھنا اور ابا میاں سے میرا سلام کہہ دینا۔

(آہستہ آہستہ یہ اسٹیج تاریک اور پہلا روشن ہوجاتا ہے۔)

شوکت : (جج صاحب سے) اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مسٹر اسد کی کس قدر زیادتی ہے۔ وہ تو کہیے کہ نزاکت تعلیم یافتہ ہیں ورنہ جذبات کی رو میں بہہ جانا کس قدر آسان ہے۔
جج صاحب: یہی تو خوف ہے۔ اب تمھاری بیوی ڈیڑھ سال سے بیمار ہے تم خود سوچو تمھارے جذبات کیا ہوں گے۔
شوکت : میں نے جذبات سے جنگ کی ہے اور ان پر قابو پایا ہے۔
جج صاحب: اور کبھی وہ بے قابو بھی ہوسکتے ہیں۔
شوکت : (مسکرا کر) جی ہاں جب فرصت ملے۔ مصروف آدمی گناہ نہیں کرسکتا۔
جج صاحب: اور کلب کے ماحول میں فرصت ہی فرصت ہوتی ہے۔
شوکت : لیکن نزاکت صاحبہ میں ایسے جراثیم نہیں۔
جج صاحب: (کھڑے ہوکر) خدا کرے ایسا ہی ہو— اور ہاں تم حسابات کو تو ٹھیک طرح سے رکھ رہے ہو نا؟
شوکت : جی ہاں— اس طرف سے آپ مطمئن رہیے۔
جج صاحب: ہمیں تم پر پورا بھروسہ ہے۔
شوکت : (کھڑے ہوکر) شکریہ!
جج صاحب: اور ہاں تمھاری بیوی کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔

شوکت : جی ہاں۔صرف کمزوری باقی رہ گئی ہے۔

جج صاحب: ہاں بھئی ذرا خیال رکھنا، اس نے کافی بیماری اٹھائی ہے۔

(کمرے سے نکل جاتے ہیں۔شوکت سگریٹ جلا کر دوچار کش لیتا ہے اور کچھ سوچنے لگتا ہے۔ دوسرے اسٹیج پر اس قدر روشنی ہوتی ہے کہ اس پر صرف ایک سایہ سا حرکت کرتا نظر آتا ہے۔

آواز : آداب عرض ہے۔

شوکت : (تعجب سے) کون ہے؟

آواز : (دبے دبے سے قہقہے کے بعد) نہیں پہچانے؟ تعجب ہے! تم تو کہا کرتے تھے کہ تمام ساز اس آواز کے زیر و بم سے بنائے گئے ہیں — اب پہچانے؟

شوکت : کون؟ فرحت!

آواز : ہاں فرحت۔اب تم مجھے نہیں دیکھ سکتے، مگر میں تمھاری اطلاع کے لیے کہوں کہ میں نے کاہی ساڑی پہنی ہے۔ جو تم کو بے حد پسند تھی اور میرے سیاہ بال بھی کھلے ہوئے ہیں۔

شوکت : لیکن تم اس وقت کیوں آئی ہو؟

آواز : آج جب میں نے کاہی ساڑھی پہنی اور اپنے کھلے ہوئے بال آئینے میں دیکھے تو تمھاری یاد آ گئی۔بس چلی آئی، کہیے آپ کی بیگم صاحبہ اب کیسی ہیں؟

شوکت : بس کمزوری باقی ہے۔

آواز : ڈیڑھ سال ہو گیا بیماری کو؟

شوکت : اس سے بھی زیادہ۔

آواز : مجھے تم سے ہمدردی ہے۔

شوکت : تمھاری ہمدردی کا شکریہ۔مگر اب مجھے اس کی ضرورت نہیں۔تم نے میری زندگی تباہ کی ہے۔

آواز : میں نے!— (قہقہہ) بھئی تم ابھی تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہو۔

شوکت : غلط فہمی! یہ حقیقت ہے۔

آواز : نہیں حقیقت نہیں غلط فہمی ہے۔تم نے مجھے سمجھنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔

شوکت : میں نے تم کو خوب سمجھا ہے۔تم پھول کی خوشبو بن جانا چاہتی تھیں جس کو صرف سونگھا جائے مگر چھوا نہ جاسکے یہ کون سی محبت تھی؟

آواز : (قہقہہ) میں نے تمھاری خواہش پوری نہیں کی بس تم ناراض ہوگئے۔

شوکت : میرے دل میں اب بھی تمھاری تمنا ہے۔

آواز : اچھا!— تم اب بھی فضول باتیں کرنے کے عادی ہو چھوڑو ان چونچلوں کو۔ یہ کہو نزاکت کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے۔

شوکت : ایک معقول خاتون ہے۔

آواز : بدھو کے بدھو رہے۔

شوکت : یہ کیا بدتمیزی ہے!

آواز : وہ تمھاری طرف مائل ہے،تم سمجھتے کیوں نہیں، عجیب انسان ہو۔

شوکت : تم یہ فضول باتیں کیوں کرنے لگیں۔

آواز : مجھے تم سے ہمدردی ہے۔تمھاری بیوی ڈیڑھ سال سے بیمار ہے نا۔

شوکت : اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ایک نیک خاتون—

آواز : (قہقہہ)— نیک خاتون! نیک خاتون!! (قہقہہ)

شوکت : کیا پاگل پن ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نے ایک مرتبہ مسعود کو کس بری طرح دھتکارا تھا۔

آواز : کون مسعود؟

شوکت : کبھی اس کا کلاس فیلو تھا— کئی مہینے کی بات ہے۔

آہستہ آہستہ دونوں اسٹیج تاریک ہوجاتے ہیں پھر آہستہ آہستہ دوسرے اسٹیج پر روشنی ہوجاتی ہے۔مسعود اور نزاکت بات کرتے ہیں۔

نزاکت : اس قدر پستی میں نہ گرو کہ پھر اٹھ ہی نہ سکو۔

مسعود : زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ انسان دلائل سے نہیں جذبات سے کام لیتا ہے۔

نزاکت : تمھارے جذبات گندے ہیں۔ تمھیں معلوم نہیں کہ میں شادی شدہ ہوں۔

مسعود : یہ شادی تمھاری مرضی کے خلاف ہوئی ہے۔ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں۔

نزاکت : میں تم سے محبت کرتی تھی مگر اب نہیں۔

مسعود : نزاکت! میں جانتا ہوں کہ اسد تمھیں وہ محبت نہ دے سکا جو ایک شوہر کو اپنی بیوی کو دینا چاہیے۔ تم ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح حسرت ہی کو اپنی زندگی بنالینا چاہتی ہو۔

نزاکت : یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔

مسعود : یقیناً ہے۔ مگر میری زندگی سے کھیلنے کا تمھیں کیا حق تھا؟

نزاکت : میں کسی کی زندگی سے نہیں کھیلی۔ اپنی زندگی سے کھیلی ہوں۔

مسعود : پھر تم میرے اس قدر قریب کیوں آ گئی تھیں کہ میری سانسوں میں بھی تمھاری تمنا جاگ اٹھی تھی۔

نزاکت : مسعود! تم خدا کے لیے یہاں سے جاؤ۔ میں اب تم کو اپنے دل سے نکال چکی ہوں۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔ تمھیں مجھ سے اب کچھ نہیں ملے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اپنی زندگی سے بیزار ہو جاؤں۔

(مسعود کمرے سے چلا جاتا ہے دوسرا اسٹیج بھی تاریک ہو جاتا ہے اور پھر دونوں اسٹیج پر اس قدر روشنی ابھرتی کہ صرف دو سائے نظر آتے ہیں)

آواز : اور بس — تم نے یہ سمجھ لیا کہ وہ ایک نیک خاتون ہے!

شوکت : اس میں کیا شک ہے؟

آواز : ابھی بھی کچھ اور کہوں گی تو تم بگڑ جاؤ گے۔

شوکت : (قہقہہ) کہہ ڈالو جو کچھ کہنا ہے۔ تمھیں فضول باتیں کرنے میں مزا آتا ہے اور مجھے انھیں سننے میں۔

آواز : شکریہ! اچھا سنو۔ درحقیقت نزاکت سماج سے بے حد ڈرتی ہے۔

شوکت : کیا مطلب؟

آواز : اگر اس کو یقین ہوجائے کہ اس کا گناہ پوشیدہ رہے گا، پھر اس کے سامنے گناہ کی کوئی حقیقت نہیں۔

شوکت : (قہقہہ تمھاری فضول باتیں ہوتی دلچسپ ہیں مگر میں ان سے عاجز آگیا ہوں۔

آواز : اگر تمھاری محبت پھولوں کی خوشبو کی طرح ہوتی تو میری باتوں سے عاجز نہ آتے۔ دیکھو میں تو تمھاری باتوں سے عاجز نہیں ہوں۔

شوکت : مگر میں فضول باتیں کرنے کا عادی ہی نہیں ہوں۔

آواز : مجھے تم سے ہر لحہ ہمدردی پیدا ہوتی جارہی ہے۔

شوکت شکریہ! لیکن اس مہربانی کی وجہ؟

آواز : اس لیے کہ تم بے حد بدقسمت ہو۔

شوکت : لیکن میں نے تو خود کو کبھی بدقسمت نہیں سمجھا۔

آواز : مجھے تمھاری یہی باتیں تو پسند ہیں۔ مگر مجھے ہمدردی اس لیے ہے کہ تمھیں محبوبہ ملی تو وہ بقول تمھارے محبت کو پھولوں کی خوشبو بنائے رکھنا چاہتی تھی۔ بیوی ملی تو بیمار۔ اور جس نے تم سے جسمانی طور پر قریب ہونے کی کوشش کی اس سے تم ڈر گئے۔

شوکت : تم سچ مچ سمجھ دار ہو۔ ارے بھئی میں تو اس کا احسان مند ہوں۔

آواز : احسان مند —!

شوکت : اس نے مجھ پر بے حد احسان کیے ہیں۔ اس نے میری بیوی کے ساتھ ہمدردی کی ہے — ہاں ایک روز میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ مجھ سے قریب آگئی ہے اور اس کی سانسیں میرے دل کی دھڑکنوں میں محسوس ہورہی ہیں۔ اس کی خوشبو میرے احساسات میں معطر ہورہے ہیں۔ اس کی سیاہ زلفوں نے —

آواز : بس بس رہنے دو۔ تم تو شاعری کرنے لگے۔ یہ تمھاری بڑی کمزوری ہے کہ ہر

خوب صورت عورت کو دیکھ کر شاعری کرنے لگتے ہو۔

شوکت : میں سچ کہہ رہا ہوں۔

آواز : (طنزیہ آواز میں) اور تم جھوٹ کب بولتے ہو؟ خیر یہ بتلاؤ وہ مجھ سے بھی زیادہ حسین ہے؟

شوکت : یہ اس کا تم خود سے مقابلہ کیوں کرنے لگیں؟

آواز : اچھا چھوڑو— یہ بتلاؤ جب تم نے اس کو حسین روپ میں دیکھا تو پھر کیا ہوا؟

شوکت : میں نے اس کے متعلق سوچا۔ مگر ایک دن شام کو کوئی چھ مہینے پہلے—

(دونوں اسٹیج تاریک ہوجاتے ہیں پھر دوسرے اسٹیج پر آہستہ آہستہ روشنی ابھرتی ہے اور وہ روشن ہوجاتا ہے۔ عذرا صوفے پر بیٹھی ہے اور نزاکت پاس کھڑی ہے)

نزاکت : کہیے اب آپ کا مزاج کیسا ہے؟

عذرا : کچھ زیادہ بہتر نہیں۔

نزاکت : آپ آرام کیجیے نا۔

عذرا : (پھیکی سی مسکراہٹ سے) آرام نہیں کرتی تو کہاں کے پتھر توڑتی ہوں۔

نزاکت : آپ کی بیماری کی وجہ سے مسٹر شوکت بے حد پریشان ہیں۔

عذرا : ڈیڑھ سال کی بیماری سے تیماردار پریشان نہیں ہوتا، اکتا جاتا ہے۔

نزاکت : لیکن وہ تو موت کے فرشتے سے بھی آپ کو چھین لینے کا عزم کرچکے ہیں۔ آپ کو مایوس نہیں ہونا چاہیے اس طرح وہ ناامید ہوجائیں گے۔

عذرا : میں انہی کے لیے زندہ ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ— (خاموش ہوجاتی ہے۔ نزاکت سوالیہ انداز میں دیکھتے ہوئے)

نزاکت : آپ خاموش کیوں ہوگئیں؟

عذرا : (خفیف سی پھیکی مسکراہٹ سے) جانے دیجیے وہ تو یونہی سی بات تھی۔

نزاکت : کیا کہنے کے لائق نہیں؟

عذرا : مگر کہنے سے حاصل؟

نزاکت : (مسکرا کر) آپ نے میرے دل میں تجسس پیدا کر دیا ہے۔

عذرا : وہ کسی اور سے محبت کرتے تھے۔ مگر ایک دن یکا یک انھوں نے مجھ سے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

نزاکت : لڑکی نے بے وفائی کی ہوگی؟

عذرا : یہ راز معلوم نہ ہوسکا۔

نزاکت : پھر وہ لڑکی کہاں گئی؟

عذرا : اس نے کہیں اور شادی کرلی۔ کئی دن تک وہ بے حد پریشان رہے کھوئے کھوئے اداس اداس۔ میں نے ہر چند انھیں خوش رکھنے کی کوشش کی، اور وہ ابھی اس غم کو دور نہ کرپائے تھے کہ میں بیمار ہوگئی۔

نزاکت : وہ شاید اب اس کو بھول چکے ہیں۔

عذرا : اور نہ بھی بھولے ہوں تو کیا؟ وہ اب مجھ سے محبت کرتے ہیں۔

نزاکت : (مسکرا کر) اور اب اگر کوئی ان کی زندگی میں داخل ہو جائے تو پھر—؟

عذرا : میں خوش ہوں گی— میں تو مردوں سے بدتر ہوں۔

نزاکت : آپ کے دل میں کس قدر وسعت ہے۔ آپ کو زندہ رہنے کا عزم کرلینا چاہیے۔

عذرا : وہ تو میں نے کرلیا ہے۔ (مسکرا کر) میں یوں آسانی سے موت کے قابو میں آنے والی نہیں۔

نزاکت : آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟

عذرا : تکلیف کیسی؟ آپ کی مہربانیوں اور ہمدردیوں نے ہی تو اب تک زندہ رکھا ہے۔

نزاکت : شرمندہ نہ کیجیے— چند دن بعد ہم پہاڑ پر جائیں گے۔

عذرا : (مسکرا کر) آپ حکم دیں اور میں تعمیل نہ کروں؟

(نزاکت چلی جاتی ہے۔ اسٹیج آہستہ آہستہ تاریک ہوتا ہے۔ دوسرا اسٹیج روشن ہوجاتا ہے پھر دوسرے اسٹیج پر روشنی کی کرن ہوتی ہے جس میں ایک سایہ ابھرتا ہے۔

آواز : بس!— اتنی سی بات ہے!

شوکت : ایسی ہمدرد بیوی اور ایسی محسنہ سے بے ایمانی کی جاسکتی ہے۔

آواز : (قہقہہ) یہ تم اخلاق کے پابند کب سے ہوگئے؟

شوکت : اور میں اخلاق کا پابند کب نہیں تھا۔

آواز : تو تم میرے ہونٹ کیوں چوم لینا چاہتے تھے؟

شوکت : اس لیے کہ مجھے تمھارے ہونٹوں پر مسکراہٹ بے حد بھلی معلوم ہوتی تھی۔

آواز : بڑے خودغرض ہو۔ اس مسکراہٹ کو چرا لینا چاہتے تھے۔

شوکت : نہیں— میں تو اس مسکراہٹ کی گدگداہٹ کو اپنے ہونٹوں پر محسوس کرنا چاہتا تھا، مگر جانے کیوں تمھیں ضد پیدا ہوگئی تھی۔

آواز : اس لیے کہ میرا ضمیر اس کو قبول نہیں کرتا تھا۔

شوکت : اور میری یہ خواہش آرزو بن گئی تھی جس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

آواز : اور اسی لیے تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

شوکت : ہاں— اس لیے کہ مجھے یقین ہوگیا تھا کہ تمھارے دل میں میرے لیے جگہ نہیں ہے۔

آواز : اگر میں ضمیر کشی کرتی تو تم سمجھتے کہ میرے دل میں تمھارے لیے جگہ ہے۔

شوکت : تم اپنی ضد کو اپنا ضمیر کہہ رہی ہو۔

آواز : ممکن ہے ایسا ہو، مگر اب میں جارہی ہوں۔ اگر نزاکت ویسی نہ ہوئی جیسی تم سمجھ رہے ہو...

شوکت : یہ تمھاری خام خیالی ہے۔ وہ نیک اور شریف خاتون ہے۔

آواز : (قہقہے) خدا حافظ—

(قہقہے آہستہ آہستہ ختم ہوجاتے ہیں دوسرا اسٹیج بالکل تاریک ہوجاتا ہے۔ شوکت سگریٹ جلا کر اس کے دوچار کش لیتا ہے اور ایک صوفے پر بیٹھ کر سوچنے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد نزاکت کے قہقہے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ شوکت غور سے قہقہے کو سنتا ہے اور اٹھ کر بائیں جانب دروازے کے پاس آڑ میں

چھپ جاتا ہے۔ نزاکت اور مسعود کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ نزاکت پھر ایک قہقہہ لگاتی ہے، اور آئینے کے پاس جاکر اپنی شکل دیکھتی ہے۔ مسعود نزاکت کے پاس آکر)

مسعود : غالب نے کیا خوب کہا ہے۔

نزاکت : (شوخی سے) جی!— کیا کہا ہے غالب نے؟

مسعود : یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

نزاکت : (مسکراکر) آپ ہم سے دوستی ترک کرکے بھی دیکھ لیجیے۔

مسعود : عورت کی اس قدر بڑھی ہوئی خود اعتمادی مرد کے لیے تکلیف دہ ہوتی ہے۔

نزاکت : (شوخی سے) یا مرد کا امتحان ہوتی ہے اور اس امتحان میں وہ کبھی پورا نہیں اترتا۔

مسعود : (خالص ڈرامائی انداز میں):

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو

مرا ہونا برا کیا ہے نواسنجان گلشن کو

(جذباتی انداز میں نزاکت کے دونوں بازو پکڑتا ہے۔ نزاکت دونوں بازو چھڑاکر)

نزاکت : تم ہمیشہ جذباتی ہوجاتے ہو۔

مسعود : جب آگ لگتی ہے تو اس میں سے دھواں نکلتا ہے۔

نزاکت : (ایک صوفے پر بیٹھ کر) لیکن اس آگ سے ساری دنیا کو کیوں جلایا جائے۔

مسعود : جب آگ لگتی ہے تو وہ کسی اخلاق کی پابند نہیں ہوتی۔

(نزاکت کے بالوں سے کھیلتا ہے نزاکت مسکراکر اس کے ہاتھ علاحدہ کرتے ہوئے)

نزاکت : یہ کیا بیہودگی ہے۔

مسعود : یہ جناب، آج اس قدر بدمزہ کیوں ہورہی ہیں۔ کیا کسی کی یاد ستارہی ہے؟

نزاکت : کس کی؟

مسعود : (مسکرا کر) جو ہزار کے پندرہ سو بنانے کی فکر میں دبلے ہوئے جا رہے ہیں۔

نزاکت : ہزار کے پندرہ سو!— (مسکرا کر)— یہاں تو یہی چرچا رہتا ہے کہ ہزار کے آٹھ سو رہ گئے!

مسعود : ہیں سمجھ دار! کب تشریف لا رہے ہیں؟

نزاکت : خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

مسعود : آپ بھی کافی سعادت مند زوجہ ہیں۔

نزاکت : آٹھ دس روز سے تو خط بھی نہیں آیا۔

مسعود : مصروفیت بری بلا ہے۔لیکن جناب نے کلب میں یہ کیا حرکت فرمائی تھی۔

نزاکت : کون سی؟

مسعود : اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا۔انصار سے کیا شاعرانہ باتیں ہو رہی تھیں۔

نزاکت : (مسکرا کر) اوہ— انصار— بھئی وہ قطعی بے ضرر قسم کا انسان ہے۔ اس سے ہر قسم کا مذاق جائز ہے۔لیکن آپ نے جاسوسی کا پیشہ کب سے اختیار کرلیا ہے—؟ (مسعود پھر اس کے دونوں بازو پکڑ کر اپنی جانب کھینچتا ہے۔نزاکت اس سے علاحدہ ہوتے ہوئے) کیا بدمذاقی ہے۔کوئی دیکھ لے گا۔ ہمیشہ وقت بے وقت کا مذاق اچھا نہیں لگتا۔

مسعود : (ٹھنڈی سانس بھر کر) وقت بے وقت! ٹھیک ہے۔

نزاکت : لیکن یہ تو سوچیے یہ میرا گھر ہے نوکر چاکر ہیں ابا جان ہیں۔ آپ پر تو جیسے ہمیشہ بھوت سوار رہتا ہے۔

مسعود : لیکن میں زاہد خشک بھی تو نہیں ہوں۔ جو جذبات پر اخلاق کا پردہ ڈالتا ہے۔

نزاکت : اگر کوئی غیر اخلاقی کام کیا جائے تو اس کے بھی کچھ اصول ہونا چاہئیں۔

مسعود : قاعدے مقرر کرنے سے بداخلاقی اخلاق بن جاتی ہے۔ جانے عورت بعض اوقات اس قدر بزدل کیوں ہوجاتی ہے۔

نزاکت : ہم کو سوسائٹی میں کئی لبادے اوڑھنا پڑتے ہیں۔ گھر پر ایک جج کی لڑکی

ہوں۔ یہاں مجھے عزت کرانے کے لیے خود اپنی عزت کرنا پڑتی ہے اور پھر گھر ابا جان—

مسعود : آپ کے ابا جان کی باہر بے حد عزت ہے۔ وہاں آپ کی خودداری کو ٹھیس نہیں پہنچتی؟

نزاکت : باہر کی جس دنیا میں ہم رہتے ہیں وہ ایک حمام ہے جس میں سب ننگے ہیں۔ جہاں ایک کو دوسرے کے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔

مسعود : (ٹھنڈی سانس بھر کر) ٹھیک ہے، باہر کی بے راہ روی انجمن آرائی ہے جو خلوت میں وقار اور خودداری بن جاتی ہے۔

نزاکت : اور پھر تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ میری دوسری حیثیت ایک بیوی کی بھی ہے۔

مسعود : جی ہاں ایک شوہر کی جو آٹھ آٹھ دس دس مہینے یہ نہیں سوچتا کہ وہ ایک جوان عورت کا شوہر بھی ہے (نزاکت سوچ میں پڑ جاتی ہے، مگر اس کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس نے اپنے جذبات پر قابو پالیا ہے۔ مسعود آہستہ آہستہ پیانو کے پاس جاتا ہے اور اس کی کیز پر انگلیاں مار کر) کہیے آپ کا پیانو درست ہوا؟

نزاکت : جی نہیں— ابھی نہیں— میں نے مسٹر شوکت سے کہا تھا، وہ کہہ رہے تھے ہو جائے گا۔

مسعود : ارے ہاں— مسٹر شوکت کی بیگم صاحبہ کا مزاج اب کیسا ہے؟

نزاکت : اب تو ٹھیک ہے، صرف کمزوری باقی ہے۔

مسعود : کافی عرصے سے بیمار ہیں۔

نزاکت : ہاں ڈیڑھ سال ہو گیا ہے۔

مسعود : مسٹر شوکت سے آپ کو کوئی ہمدردی نہیں؟

نزاکت : کیوں نہیں۔ انھیں اپنی بیوی سے بے حد محبت ہے۔ ان کی تیمارداری میں دن رات ایک کر دیے ہیں۔

مسعود : قابلِ رحم ہے بے چارا— (شرارت سے مسکرا کر) کس قدر خشک زندگی ہے۔ (نزاکت کے پاس آ کر) اچھا بھئی چل دیا— (گھڑی دیکھ کر) گیارہ بج رہے ہیں۔ کل کلب کس وقت پہنچ رہی ہو؟

نزاکت : وہی سات بجے۔

مسعود : (شرارت سے) مگر انصار تو پانچ بجے ہی پہنچ جاتے ہیں۔

نزاکت : تو میں بھی پانچ بجے پہنچ جاؤں گی۔

مسعود : خدا حافظ— (دروازے کی جانب جاتا ہے۔ نزاکت اس کے پیچھے پیچھے جاتی ہے) اب تم آرام کرو— کل میں کلب ذرا جلدی پہنچ جاؤں گا۔

نزاکت : میں بھی جلد آنے کی کوشش کروں گی۔

مسعود : (مسکرا کر) صرف کوشش؟— اچھا جاؤ، آرام کرو۔

نزاکت : جب تک میں مہمان کو دروازے تک نہ پہنچا آؤں مجھے تسلی نہیں ہوتی۔

مسعود : کیوں؟

نزاکت : کہیں پھر واپس نہ آ جائے۔

(مسعود مسکراتا ہے، نزاکت قہقہہ مار کر ہنستی ہے، دونوں کمرے سے نکل جاتے ہیں۔ شوکت پردے کی آڑ سے نکل کر صوفے پر بیٹھ جاتا ہے۔ قہقہے کی آواز آتی ہے۔ اس بار دوسرے اسٹیج پر صرف ایک کرن ابھرتی ہے جس میں صرف سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

شوکت : اب کیوں آئی ہو؟

آواز : کچھ نہیں ویسے ہی سلام کرنے چلی آئی تھی۔

شوکت : کیا مطلب؟

آواز : کچھ نہیں— نزاکت بے حد شریف خاتون ہے۔ چند دنوں میں کایا پلٹ گئی۔

شوکت : (بیزاری سے) خاموش رہو۔

آواز : ارے تو ناراض کیوں ہوتے ہو چلو میں مانے لیتی ہوں کہ وہ بے حد شریف ہے۔

(قہقہے کی آوازیں آتی ہیں) جو آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہیں، شوکت خاموش بیٹھا سگریٹ پیتا رہتا ہے۔ کچھ دیر بعد نزاکت گنگناتی ہوئی پھر داخل ہوتی ہے اور شوکت کو دیکھ کر)

نزاکت : اوہ مسٹر شوکت آپ!— اس وقت یہاں!!

شوکت : میں تو بہت دیر سے یہاں موجود تھا، مگر آپ بے حد مصروف تھیں۔

نزاکت : بہت دیر سے!

شوکت : جی ہاں— آپ دونوں کے آنے سے پیشتر ہی میں یہاں موجود تھا۔

نزاکت : لیکن یہ تہذیب کے خلاف ہے کہ آپ کسی کی تنہائی کی یوں مخبری کریں۔ میں آپ کو نیک انسان سمجھتی تھی۔

شوکت : (نزاکت کے قریب آتے ہوئے) اور میں بھی آپ کو نیک خاتون ہی سمجھتا رہا— لیکن

نزاکت : لیکن—؟ (التجا آمیز لہجے میں) آپ خدا کے لیے اس وقت تشریف لے جائیے۔

شوکت : آخر کیوں؟

نزاکت : اگر کسی نے دیکھ لیا تو میرے متعلق کیا رائے قائم کرے گا۔

شوکت : اور آپ کے متعلق رائے کس کی بری ہے۔ آپ جج کی صاحب زادی ہیں۔ اس لیے سوسائٹی میں عزت ہے۔ دولت مند شوہر کی بیوی ہیں، اس لیے عیش حاصل ہے۔ آپ جوان ہیں اس لیے ناپسندیدہ مسرتیں بھی میسر ہیں۔

نزاکت : لیکن مسٹر شوکت—

شوکت : گھبرائیے نہیں۔ میں کم ظرف نہیں ہوں۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔

نزاکت : ہمدردی!

شوکت : صحیح معنوں میں ہمدردی۔ اس لیے کہ میری بیوی ڈیڑھ سال سے موت و زیست کی کش مکش میں مبتلا ہے۔

نزاکت : تو پھر آپ کو ان سے ہمدردی کرنا چاہیے۔

شوکت : اس دوران میں میں نے شدید جذباتی ہیجان سے جنگ کی ہے۔ اس لیے میں آپ کے جذبات کو سمجھتا ہوں۔

نزاکت : آپ کی ہمدردی کا شکریہ! لیکن آپ کی ہمدردی کی تاویل بداخلاقی کا جواز نہیں ہوسکتی۔

شوکت : (طنزیہ) ان منطقی استدلالوں کو چھوڑیے۔ آیئے ہم ایک معاہدہ کرلیں اس ہیجانی اور عبوری دور کے لیے۔

نزاکت : مسٹر شوکت! میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ اس قدر پست ہوجائیں گے۔

شوکت : چھوڑیے۔ جب حمام میں ننگے ہوجاتے ہیں تو ایک دوسرے کی پردہ پوشی کرنا ہی پڑتی ہے۔

نزاکت : (غصہ سے) مسٹر شوکت! آپ پر ہمارے احسانات ہیں۔

شوکت : آپ نے میری محنت خریدی ہے احسان نہیں کیا اور پھر یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔

نزاکت : مہنگا! آپ کا مطلب؟— کہ میں—

(باہر سے جج صاحب کی آواز)

جج صاحب: نزاکت! نزاکت!!

نزاکت : (بلند آواز سے) جی— ابا جان— (جج صاحب کے قدموں کی آواز) مسٹر شوکت خدا کے لیے آپ تشریف لے جایئے۔

شوکت : میرے یہاں موجود رہنے میں کیا حرج ہے۔

نزاکت : خدا کے لیے مسٹر شوکت Please۔ ابا جان آرہے ہیں وہ کیا سوچیں گے۔

شوکت : فرض کیجیے مسٹر مسعود یہاں ہوتے پھر؟

نزاکت : خدا کے لیے بحث نہ کیجیے۔ (اس کا ہاتھ پکڑ کر پردے کی آڑ میں کرکے) مسٹر شوکت خدا کے لیے (شوکت پردے کی آڑ میں ہوجاتا ہے۔ نزاکت گھبرائی ہوئی پیانو کے پاس جاکر کھڑی ہوجاتی ہے۔ جج صاحب داخل ہوتے ہیں)

جج صاحب: تم واپس آگئیں؟

نزاکت : (گھبرائے ہوئے انداز میں) کبھی کی ابا جان یہ دیکھیے میں نے لباس تبدیل کرلیا ہے— (اپنے کپڑوں کی طرف دیکھ کر) اوہ— میرا مطلب ہے ابھی تبدیل کرتی ہوں۔

جج صاحب: آخر تم اس قدر گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟

نزاکت : گھبرائی ہوئی! نہیں— میں تو—

جج صاحب: دیکھو نزاکت میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ تم اتنی رات گئے تک کلب میں رہو۔

نزاکت : بہت اچھا۔ میں جلد واپس آجایا کروں گی۔

جج صاحب: میری اپنی سماجی حیثیت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگ مجھ پر انگلیاں اٹھائیں، اور پھر تم خود سوچو اسد کی سماج میں کیا حیثیت ہے ہم دونوں کی عزت اور وقار تمھارے ہاتھ میں ہے۔

نزاکت : میں اس کو جانتی ہوں ابا جان۔

جج صاحب: تم بچی نہیں ہو کہ تم کو سمجھایا جائے۔ ہاں میں نے مسٹر شوکت سے کہہ دیا ہے وہ پیانو درست کرادیں گے۔

نزاکت : شکریہ!

جج صاحب: اور ہاں میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب تم مسٹر شوکت کے ساتھ کام کیا کرو، ایک تو کام کی نگرانی ہوگی— دوسرے—

نزاکت : لیکن مسٹر شوکت بہت نیک اور انتہائی دیانت دار ہیں اس سے انھیں تکلیف ہوگی۔

جج صاحب: میرا مقصد تمھیں کام پر لگانا ہے۔ اسے بددیانت سمجھنا نہیں۔

نزاکت : لیکن ایسی باتوں سے لوگ بلا وجہ مشتعل ہوجاتے ہیں۔

جج صاحب: نہ یہ شک ہے اور نہ مسٹر شوکت کی دیانت پر حملہ۔

نزاکت : میں کلب جانا چھوڑ دوں؟ مجھے کسی دوسرے کام پر لگا دیجیے۔ مگر میں مسٹر شوکت کو ناراض کرنا نہیں چاہتی۔

جج صاحب: لیکن کیوں۔۔۔؟

نزاکت : ان کے ہم پر احسانات ہیں۔ اس سے انھیں دکھ ہوگا۔

جج صاحب: چند روز پہلے تو تم کہا کرتی تھیں کہ حسابات کی جانچ ہونا چاہیے۔ اب یہ ہمدردی کیوں پیدا ہوگئی؟

نزاکت : اگر آپ فرماتے ہیں تو میں بھی کچھ کام دیکھ لیا کروں گی۔

جج صاحب: میں تمھارے کلب جانے کے خلاف نہیں ہوں، مگر وقت پر آنا اور جانا چاہیے۔ (واپس جاتے ہوئے) اب جا کر سو جاؤ، اور کل سے مسٹر شوکت کے ساتھ کام کرو۔

(کمرے سے نکل جاتے ہیں شوکت پردہ کی آڑ سے نکل کر)

شوکت : شکریہ! آپ نے میری بڑی وکالت فرمائی۔

نزاکت : (التجا آمیز لہجہ میں) مسٹر شوکت خدا کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دیجیے۔

شوکت : آپ نے میرے تصورات کے محل کو یکایک ڈھادیا ہے آپ کے متعلق میرے کس قدر اچھے خیالات تھے۔ مجھے آپ سے کس قدر ہمدردی تھی۔ میں آپ کی کس قدر عزت کرتا تھا، مگر معلوم ہوا کہ یہ محض میری خام خیالی تھی آپ وہ نزاکت نہیں ہیں جن کے لیے میں روحوں سے لڑا ہوں جس کی میں نے ان سے وکالت کی ہے۔

نزاکت : مسٹر شوکت خدا کے لیے مجھے تنہا۔۔۔

شوکت : میں نے وہ منظر بھی دیکھا ہے جب آپ نے مسٹر مسعود کو گھر سے نکال دیا تھا کہ وہ آپ کی شادی ہو جانے کے بعد بھی آپ سے محبت کر رہے تھے اور آج وہی مسعود ہیں جن کے لیے آپ بے چین ہیں جن سے ملنے کے لیے آپ اپنے شوہر اور باپ کی عزت کی پروا نہیں کر رہی ہیں۔

نزاکت : مسٹر شوکت خدا کے لیے آہستہ بولیے۔

شوکت : نزاکت صاحبہ! آپ نے کتنی مرتبہ میرے دل میں تمناؤں کو جگایا ہے۔ کتنی مرتبہ آپ نے مجھ سے قریب ہونے کی کوشش کی ہے مگر میں نے اس کو محض

آپ کی معصومیت سمجھا۔ آپ کی سادگی سمجھا اور خود کو دھوکا دیا۔ لیکن اب میں خود کو دھوکا نہیں دے سکتا۔

(نزاکت کی طرف بڑھتا ہے۔ نزاکت پیچھے ہٹ کر)

نزاکت : مسٹر شوکت! اس وقت آپ ہوش میں نہیں ہیں جا کر آرام کیجیے۔

شوکت : جی نہیں۔ میں قطعی ہوش میں ہوں۔ ہاں جو بے وقوفی کا پردہ نظروں پر پڑا تھا وہ ہٹ گیا ہے۔

(نزاکت کے اور قریب ہو جاتا ہے۔ نزاکت پیچھے ہٹتے ہوئے)

نزاکت : آخر آپ کو ہو کیا گیا ہے؟

شوکت : میں پاگل ہو گیا ہوں۔ آپ نے میرے سکون اور دماغ میں زلزلہ پیدا کر دیا ہے— میں پاگل ہو گیا ہوں پاگل—

(نزاکت کے دونوں بازو پکڑ لیتا ہے)

نزاکت : (چیخ کر) ابا میاں—! ابا میاں—!!

شوکت : (پاگلوں کے انداز میں) خوب زور سے چیخیے کہ زمین و آسمان اور کائنات آپ کی چیخوں سے بھر جائے۔

نزاکت : (چیخ کر) مجھے چھوڑ دیجیے— ابا میاں— (آزاد ہونے کے لیے جھٹکے دیتے ہوئے) ابا میاں ابا میاں— ابا میاں—

(شوکت قہقہے لگاتا ہے اور نزاکت بار بار ابا جان۔ ابا جان پکارتی ہے۔ جج صاحب گھبرائے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔ شوکت کو نزاکت کے دونوں بازو پکڑے ہوئے دیکھ کر)

جج صاحب : (بلند اور غصہ کی آواز سے) شوکت! یہ کیا بے ہودگی ہو رہی ہے؟

شوکت : (قہقہے لگا کر) جج صاحب! آپ بھی دیکھ لیجیے۔ یہ نزاکت ہیں اور میں شوکت۔ یہ مسٹر اسد کی بیوی ہیں اور مسٹر مسعود کی داشتہ ہیں جن کے آغوش میں انھیں راحت نصیب ہوتی ہے۔

جج صاحب: (جھٹکا دے کر نزاکت کو چھڑاتے ہوئے) کیا ہمارے احسانوں کا یہی بدلہ ہے؟

شوکت : (پاگلوں کی طرح قہقہے لگا کر) احسان! کس کے احسان؟ کیسے احسان؟ آپ نے جو کچھ معاوضہ دیا ہے میں نے ہمیشہ اس سے زیادہ کام کیا ہے۔

(پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتا ہے، اور نزاکت کی جانب بڑھتا ہے۔ جج صاحب شوکت کو دھکا دے کر)

جج صاحب: تم پاگل ہوگئے ہو۔ تمھیں پولیس کے حوالے کیا جانا چاہیے۔

(ٹیلی فون کی جانب بڑھتے ہیں، شوکت قہقہے لگا کر)

شوکت : ضرور پولیس کو بلایئے، تاکہ دنیا کو معلوم ہوجائے کہ جج صاحب کی صاحب زادی کیا گل کھلا رہی ہیں۔

جج صاحب: مجھے اس کی پروا نہیں کہ بعد میں کیا ہوگا— (رسیور اٹھا کر)— پولیس اسٹیشن— ہلو— کون مسٹر رفیع۔ ذرا یہاں تشریف لایئے۔ جی ہاں مرے گھر پر، ذرا جلدی— (رسیور رکھ کر) میں نے تمھیں شریف سمجھا تھا— مگر—

شوکت : (طنزیہ) میں شریف نہیں ہوں۔ شریف ہیں یہ نزاکت جو شوہر کے ہوتے ہوئے عشق بازی کرتی ہیں۔ شریف ہیں مسٹر اسد جو روپے کی دھن میں بیوی کی جوانی کو بھول گئے ہیں۔ شریف ہیں مسٹر مسعود جو نزاکت کے جسم کی تکا بوٹی کر دینا چاہتے ہیں— اور شریف ہیں آپ جو—

جج صاحب: خاموش رہو۔

(شوکت کی بیوی عذرا کمرے میں داخل ہوتی ہے)

عذرا : کیا بات ہے جج صاحب؟

جج صاحب: آپ کے شوہر کا کارنامہ ہے جن کی نیکی اور شرافت کی قسم کھانے میں میں فخر محسوس کرتا تھا۔

عذرا : لیکن ہوا کیا کچھ فرمایئے تو؟

جج صاحب: یہ ابھی معلوم ہو جاتا ہے مسٹر شوکت اپنی زبان سے پولیس کو سب کچھ بتلا

دیں گے۔ میں نے سمجھا تھا کہ یہ شریف انسان ہے، ایمان دار ہے، مخلص ہے میں نے اپنا مکان رہنے کو دیا۔ تمھیں اپنی اولاد کی طرح چاہا۔ تمھاری بیماری پر اپنا روپیہ پانی کی طرح بہایا مگر آج انھوں نے میری عزت اور خاندانی عصمت پر حملہ کیا۔۔۔ یہی شرافت ہے ان کی؟

شوکت : میں نے حملہ کیا؟ جی ہاں اور مسٹر مسعود کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جج صاحب: تمھیں اپنے فعال سے سروکار ہونا چاہیے، دوسروں سے واسطہ۔۔۔ ابھی پولیس تمھاری منطق دانی کا مزاج درست کردے گی۔

نزاکت : لیکن ابا جان۔ اس سے بڑی بدنامی ہوگی۔

جج صاحب: خاموش رہو۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔

عذرا : جج صاحب! انھوں نے ضرور جرم کیا ہے اور انھیں سزا بھی ملنا چاہیے۔۔۔ مگر یہ تو فرمائیے میں نے کیا قصور کیا ہے۔ میں ڈیڑھ سال سے بیمار ہوں اور اب، جبکہ اس قابل ہوئی کہ زندگی کا سکھ اٹھا سکوں تو آپ میرے شوہر کو مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں۔۔۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ کیا ان کی عدم موجودگی میں مجھے کوئی مسعود اور کوئی دوسرا شوکت مل سکتا ہے؟ (جج صاحب خاموش ہوکر سوچنے لگتے ہیں۔ کچھ دیر بعد پولیس کمرے میں داخل ہوتی ہے)

انسپکٹر : کیا بات ہے جج صاحب؟۔۔۔ (جج صاحب خاموش رہتے ہیں۔ عذرا اور نزاکت جج صاحب کو دیکھتی ہیں)۔۔۔ جج صاحب! کیا بات ہے؟

جج صاحب: (سوچتے ہوئے)۔۔۔ معاف کیجیے گا۔ آپ کو تکلیف ہوئی... ایک پاگل گھر میں گھس آیا تھا۔۔۔

(انسپکٹر مسکراتا ہے۔ سب حیرت سے جج صاحب کو دیکھتے ہیں)

(پہلے اسٹیج کا پردہ گر جاتا ہے)

(پردہ)

(مطبوعہ: 'افکار' کراچی، جولائی 1959)

جرعۂ آخریں!

کردار

(1) رشدی (ایک آرٹسٹ) (2) اندو (ایک بہترین رقاصہ) (3) منصور (رشدی کا دوست) (4) ورما (سب انسپکٹر پولیس) (5) ڈاکٹر ہریش

منظر

(ایک مختصر کمرہ میں رشدی بیماری کی حالت میں چارپائی پر لیٹا ہے۔ پاس ہی ایک میز پر چند شیشیاں بے ترتیبی سے رکھی ہیں۔ میز پر ایک لڑکی کی تصویر ہے اور تصویر کے پاس ایک آئینہ رکھا ہے۔ کمرہ میں دو چار کرسیاں پڑی ہیں۔ ایک کونہ میں ایک ٹوٹا ہوا ستار پڑا ہے۔)

رشدی : (تصویر کو دیکھتے ہوئے) ایک سال ہوا جب تو نے میرے دکھتے تاروں کو چھیڑا تھا— میرے دل و دماغ پر اپنے گھنگرو بجائے تھے۔ پگلی ہے تو اندو! مقابلہ کرنے چلی تھی (کھانستا ہے۔ مسکرا کر) ساز کے ساتھ ہی تو رقاصہ کے گھنگرو بجتے ہیں۔ (آئینہ میں دیکھ کر) مگر رشدی تم نے بھی اس روز بڑی

غلطی کی اُسے اس قدر نہ نچانا تھا— اس کی ضد ایک معصوم شرارت تھی— (تصویر کو دیکھ کر) اندو معاف کرنا۔ اس وقت رشدی ایک ضدی آرٹسٹ تھا۔ حساس مرد نہیں (تکیہ کے نیچے سے شراب کی بوتل نکالتا ہے۔ بوتل ہاتھ سے چھوٹ کر گر جاتی ہے۔ بکھری ہوئی شراب کو حسرت سے دیکھ کر) آخری وقت میں تو نے بھی ساتھ چھوڑ دیا— اے سوسائٹی کی عزیز ترین دلہن جب سوسائٹی نے میرا ساتھ نہ دیا تو میں نے تیرا دامن پکڑا— اور تو— اپنی تمام عشوہ طرازیوں کے ساتھ میری رگ رگ میں سما گئی۔ آج تو بھی مجھ سے جدا ہو رہی ہے؟

(منصور ڈاکٹر کو ساتھ لیے کمرہ میں داخل ہوتا ہے)

ڈاکٹر : (بکھری ہوئی شراب دیکھ کر) شراب؟

رشدی : (مسکرا کر) سوسائٹی کی عزیز ترین ملکیت! کیف کی دیوی!! عورت کا حسین ترین عکس!!!

منصور : مگر تمھیں تو اس سے پرہیز کی سخت تاکید تھی۔ تمھارے جگر اور پھیپھڑے...

رشدی : (بات کاٹ کر) تم جگر اور پھیپھڑوں کو روتے ہو (ڈاکٹر سے مخاطب ہو کر) تو ڈاکٹر صاحب آپ علاج کرنے تشریف لائے ہیں؟

ڈاکٹر : (تسلی دے کر) جی ہاں مسٹر رشدی! گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ جلد...

رشدی : (بات کاٹ کر) اچھا ہو جاؤں گا— خیر آپ علاج شروع کیجیے (ڈاکٹر رشدی کا معائنہ شروع کرتا ہے)

رشدی : (ڈاکٹر کا چہرہ غور سے دیکھ کر) ڈاکٹر صاحب آپ کسی سے محبت بھی کرتے ہیں یا نہیں؟

ڈاکٹر : ہاں کیوں نہیں۔ میں ہر مریض سے محبت کرتا ہوں۔

رشدی : کیا میں آپ کا نام معلوم کر سکتا ہوں؟

ڈاکٹر : مجھے ڈاکٹر ہریش کہتے ہیں۔

رشدی : (ڈاکٹر کا چہرہ غور سے دیکھ کر) تو ڈاکٹر ہریش آپ بلاتفریق مذہب و ملت سب ہی سے محبت کرتے ہیں؟

ڈاکٹر : (اپنے کام میں مشغول رہتے ہوئے) یہ تو ہمارا فرض ہے۔

رشدی : (طنزیہ مسکرا کر) سماج آپ کو سب سے محبت کرنے پر لعنت ملامت نہیں کرتا؟ آپ کی راہ میں حائل نہیں ہوتا؟

ڈاکٹر : (رشدی کا چہرہ غور سے دیکھ کر) جی نہیں۔

(رشدی مسکرا کر خاموش ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر منصور سے مخاطب ہو کر)

ڈاکٹر : مسٹر منصور! جگر اور پھیپھڑے...

رشدی : (بات کاٹ کر) سب ہی یہی چیز کہتے ہیں۔ کوئی نئی چیز نہیں— ارمان کچھ—

منصور : (بات کاٹ کر) خاموش رہو— ہاں ڈاکٹر کیا عرض کروں— کثرتِ استعمال سے...

ڈاکٹر : (بات کاٹ کر) خیر! یکا یک استعمال سے روکنا بھی مضر ہے... اور—

رشدی : (بات کاٹ کر) شکریہ ڈاکٹر! بس تم ہی ایک ہمدرد ملے ہو— اجازت تو دی—

ڈاکٹر : (رشدی سے) دوا کا استعمال ضرور کیجیے گا...

رشدی : (مایوسانہ مسکراہٹ سے) بہت بہتر...

(ڈاکٹر دروازہ کی جانب جاتا ہے۔ منصور اس کے پیچھے پیچھے جاتا ہے۔ دونوں کمرہ سے نکل جاتے ہیں)

رشدی : (تصویر کو دیکھ کر) اندو! (مسکراتا ہے) وہ میرا علاج کرنا چاہتے ہیں— ہیں نا احمق (تصویر کو تکتا رہتا ہے— منصور واپس آتا ہے۔

منصور : (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) تمھارے پاس یہ شراب کہاں سے آئی؟

رشدی : (مسکرا کر) پینے والوں کو کیا کمی (بگڑ کر) مگر تم مجھے شراب پینے کو کیوں روکتے ہو؟— تمھاری سوسائٹی کی تو یہ سب سے زیادہ قابل قدر محبوبہ ہے— سوسائٹی میں تو اس کے ساتھ رہنا جرم نہیں۔

منصور : (بناوٹی ناراضگی سے) آپ کے نزدیک جرم ہے ہی کیا؟

رشدی : (مسکرا کر) اور آپ کے نزدیک جرم کیا نہیں— شراب پینا آپ کے نزدیک جرم ہے۔ دوسرے مذہب کی لڑکی سے ملنا جلنا جرم ہے— اس سے شادی کا خیال جرم ہے۔ (نفرت سے) سماج کے بزدل شکار!

منصور : سماج ہمارا بنایا ہوا ہے— اس پر عمل کرنا فرض ہے۔

رشدی : عورت مرد کے لیے بنائی گئی ہے— اس پر سماج کا حق نہیں۔

منصور : لیکن ہر عورت پر ہر مرد کا بھی حق نہیں۔

رشدی : اچھا ذرا سگریٹ جلا کر دو— (منصور کے چہرہ کو غور سے دیکھ کر) عورت کی محبت اور جوانی ایک ہی چیز کے دو نام ہیں— جب تک اس میں جوانی ہے وہ ہر مرد کی ملکیت ہے— جب اُس کی جوانی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ سوسائٹی کی ملکیت ہو جاتی ہے— تا کہ— اس کی رہنمائی کرے۔

منصور : (سگریٹ دیتے ہوئے) رشدی! تم زندگی کو ہمیشہ جن زاویوں سے دیکھتے رہے ہو۔ ان پر عام لوگوں کی نظر کبھی نہیں پہنچی— مگر اس وقت تم نے عورت کو جس نظر سے دیکھا ہے۔ وہ میرے لیے مایوس کن ہے۔

رشدی : (سگریٹ کا کش لے کر) آخری وقت میں زیادہ پریشان نہ کرو منصور! نسوانیت میں اس چیز کو نہیں سمجھتا جس کو تم نسوانیت کہتے ہو۔ میرے نزدیک (کھانستا ہے) نسوانیت عورت کی اس ذمہ داری کا نام ہے۔ جس کو حسن و شباب کہتے ہیں— جس وقت وہ مرد کی محبت کا جواب محبت میں دے سکتی ہے اور اس کی محبت کی صحیح امین رہ سکتی ہے۔

منصور : رشدی! میں نے تمھارے ڈرامے دیکھے ہیں۔ اور انہی سے تم کو سمجھا ہے۔ لیکن پھر بھی میں تم سے متفق نہیں— میں عورت کو مرد کے شباب کا عکسِ رنگین سمجھتا ہوں— جو ایک فریب سے زیادہ نہیں—

رشدی : (مسکرا کر) یہ تمھارا فریب خیال ہے منصور! جو حسنِ نسوانی کو مہلک سمجھتا

ہے— وہ عورت کے راز کو نہیں سمجھتا— اور جس نے عورت کے راز کو نہیں سمجھا (مسکرا کر) جانتے ہو عورت سے شکست کھانے میں کیا لطف آتا ہے (آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرا کر) تم کیا جانو؟

منصور : (کچھ دیر سوچ کر) رشدی! لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عورت کی عشوہ طرازیاں اور جادونگاہی مرد کے لیے (رشدی کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے) ایسے ہی نتائج چھوڑتی ہے۔

رشدی : (مسکرا کر) اسی کو عورت کی معراج کہتے ہیں۔ عورت کی زندگی کی یہی آخری منزل ہے۔

منصور : لیکن حسنِ بے پرواہ پر اپنی جوانی اور زندگی قربان کر دینا بھی ذلت ہے۔

رشدی : ہاں— اب کچھ ہوش کی بات کہی— لیکن تم نے وہ وقت نہیں دیکھا۔ جس وقت اس کی وہ کمزوریاں جو درحقیقت عورت کی قوتیں ہیں، میرے سامنے مغلوب ہوگئی تھیں— اور— اندو کے غرورِ نسوانی نے عجز و انکساری میں تبدیل ہوکر اسے سراپا رنگینیت کی دیوی بنا دیا تھا—

منصور : میں جانتا ہوں کہ اندو میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ایک حقیقی حسن میں ہونا چاہیے۔ میں اس سے بھی انکار نہیں کرسکتا کہ اس نے محبت کا جواب محبت میں دے کر اپنے عورت ہونے کا ثبوت دیا ہے— لیکن میں اس کو بھی نہیں بھول سکتا ہوں کہ اس کے باعث ایک بڑے آرٹسٹ کی زندگی تباہ ہوئی۔

رشدی : (مسکرا کر) تم نے اپنی اس پرزور تقریر میں— اندو کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان سے کہیں بالاتر ہے— لیکن جہاں میرے متعلق آپ نے اپنی رائے دی ہے۔ اس کے متعلق میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ محبت کی لطیف حماقتیں ہیں— اسی کو—

(دروازہ پر کوئی دستک دیتا ہے)

منصور : کون صاحب ہیں؟

آواز : کیا مسٹر رشدی اندر ہیں؟
منصور : جی ہاں — تشریف لائیے۔
(ایک پولیس سب انسپکٹر اور دو سپاہی داخل ہوتے ہیں)
منصور : (تعجب سے) ورما۔
ورما : (رشدی سے) مسٹر رشدی! مجھے اطلاع ملی ہے۔ کہ اندو، گھر سے فرار ہوکر آپ کے یہاں آئی ہے (کمرہ میں چاروں طرف دیکھ کر) میں آپ کے مکان کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔
منصور : (گھبرا کر) اندو؟ — یہاں — نہیں تو۔
رشدی : (آہستہ سے) جناب سب انسپکٹر صاحب آپ خوشی سے تلاشی لے سکتے ہیں۔
ورما : کیا آپ مجھے یقین دلا سکتے ہیں کہ وہ یہاں موجود نہیں ہے۔
منصور : ہاں ورما — وہ یہاں نہیں آئی۔
رشدی : (منصور سے) اس وقت یہ ورما نہیں سب انسپکٹر پولیس ہیں — کم ازکم تمھیں مسٹر کہنا لازم ہے۔
ورما : کیا کیا جائے — فرض نے ہمیں انسان نہیں بلکہ ایک غیر حساس مشین بنا دیا ہے۔
رشدی : پولیس مین — تم اپنا فرض ادا کرو۔ لیکن مجھے فکر ہے۔ اندو نے یہ اچھا نہیں کیا۔
ورما : (چاروں طرف غور سے دیکھ کر) نہیں ہے (سپاہیوں سے) تم لوگ جاؤ۔
(سپاہی جاتے ہیں۔ ورما ہیٹ اُتار کر ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)
ورما : (رشدی کو غور سے دیکھ کر) رشدی! تمھارا افسانہ کالج کی تاریخ کا ایک رنگین ورق ہے۔ لیکن مجھے خبر نہ تھی کہ وہ ایسے مہلک نتائج پیدا کرے گا۔
رشدی : پیارے ورما! زندگی چند اوراقِ پریشاں کو جمع کرنے کا نام ہے — بس سمجھ لو کہ میں اس فرض کو کامیابی سے ادا نہ کرسکا۔
ورما : میرا ضمیر آج مجھ سے بغاوت کررہا ہے — آج مجھے وہ کام کرنا پڑتا ہے۔

رشدی— جس نے مجھے میری زندگی سے باغی بنا دیا ہے۔

رشدی : (مسکرا کر) ایسا نہ کہو ورما۔ فرض ہر حالت میں فرض ہے۔ تمھیں اپنے فرض سے بغاوت کا خیال بھی جائز نہیں۔

ورما : (کچھ سوچ کر جوشیلے الفاظ میں) لیکن وہ فرض ہی کیا، جس پر انسانیت قربان ہوتی ہو— جس پر دوستی کی بھینٹ دینا پڑے— جو مظلوم پر روز ظلم جائز قرار دے۔

رشدی : (ورما کا چہرہ دیکھ کر) تم اسے فرض کی ہار قرار دیتے ہو— میں اسے مگر اپنی سب سے بڑی خوش قسمتی تصور کر رہا ہوں— مجھے ذلیل ہونا ہی تھا— ہوا— خدا کا شکر ہے کسی غیر کے سامنے نہیں— اپنے ہی دوست کے سامنے— (رشدی آنکھیں بند کر لیتا ہے)

منصور : (ورما سے) عجیب ضدی شخص ہے— شراب

رشدی : (آنکھیں کھولتے ہوئے بات کاٹ کر) ورما! کیا اس کی تلاش کرو گے— اندو نے بڑی نادانی کی—

ورما : فرض اور محبت— میں سمجھتا ہوں محبت مقدم ہے تم میرے عزیز دوست ہو میرا فرض ہے کہ میں اس کی تلاش کروں (سگریٹ جلا کر) سماج کے ہاتھوں میں...

منصور : (بات کاٹ کر) ورما...

ورما : (سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے) دینے کے لیے نہیں سماج کے بندھن توڑنے کے لیے— وہ سماج ہی کیا جو زندگیوں سے کھیلتا ہو—

رشدی : (ورما کا چہرہ دیکھتے ہوئے) مجھے تمھاری دوستی پر ناز ہے ورما— لیکن میرے لیے اس سماج سے بغاوت نہ کرو۔ جس کے تم ایک رکن ہو— جس کی گود میں تم پلے ہو (کھانستا ہے) دیکھو ورما فرض— فرض ہے—— (سمجھاتے ہوئے) اگر اندو کو کہیں پالو تو میرے پاس نہ لانا۔ اس کو اس کے گھر پہنچا دینا (آنکھیں بند کر کے) اور کہہ دینا میں خیریت سے ہوں۔

ورما : زندگی فرائض کی ادائیگی ہی کا نام ہے (سگریٹ کا کش لے کر) جو احساسِ مروت کو کچل دے۔ وہ فرض نہیں۔ (پرعزم لہجہ میں) میں آج اس گندے سماج سے باغی ہوں۔ جو انسانیت اور محبت کو ٹھکرانا سکھاتا ہے)

(اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے)

رشدی : (اس کا چہرہ دیکھ کر) کہاں چلے ورما؟ باغی نہ بنو۔

ورما : (بات کاٹ کر) نہیں مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے۔

(ہیٹ اٹھا کر لگاتا ہے اور کمرہ سے نکل جاتا ہے)

رشدی : (چلا کر) ورما! ورما!!— چلا گیا (منصور سے مخاطب ہوکر) منصور اسے روکو بڑی غلطی کررہا ہے— ورما۔ (افسوس کے لہجہ میں) آخری وقت میں زندگی آسان نہیں مشکل تر ہوئی جارہی ہے (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں)

منصور : (تسلی آمیز لہجہ میں) رشدی! تم تو گھبرا گئے— یہ بزدلی کیسی— تم تو ہمیشہ مشکل سے مقابلہ کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے— ناامیدی کو تم گناہ قرار دیتے تھے۔ خود ہی اس گناہ میں مبتلا ہورہے ہو۔

رشدی : نہیں منصور— ناامیدی کو اب بھی میں لوازمات زندگی میں گنتا ہوں— لیکن (کھانستا ہے)— تم لوگوں کے احسانات برداشت نہیں کرسکتا— تم نے—

منصور : (بات کاٹ کر) کیسی باتیں کرتے ہو رشدی!— یہ تو میرا فرض تھا۔

رشدی : تم نے میری ایسی خدمت کی ہے کہ میرا حقیقی بھائی بھی نہ کرتا— ورما اپنی آئندہ زندگی مشکلات میں مبتلا کرنے چلا گیا۔ (کھانستا ہے) منصور کسی طرح اس کو روکو (آنکھوں میں سے آنسو بہنے لگتے ہیں)

منصور : (رشدی کے بالوں سے کھیلتے ہوئے) رشدی میں ورما کو ابھی بلوا لوں گا— تم فکر کیوں کرتے ہو— پریشاں نہ ہو۔

رشدی : (آنکھیں بند کرکے) ایسا معلوم ہوتا ہے منصور کہ آخری لمحات سکون سے نہیں گزریں گے— (مانا کہ زندگی اور مشکلات کا چولی دامن کا ساتھ ہے— مانا

کہ — (کھانستا ہے) زندگیاں تباہ ہوتی ہیں— سب کچھ ہوتا ہے— لیکن کیا ایسا نہیں ہوتا کہ آخری وقت میں مشکلات دور ہٹ جائیں۔ تا کہ موت— موت— سے کھیلنے میں لطف آئے— چہرہ پر پریشانی نہ ہو بلکہ ہارے ہوئے سپاہی کی طرح مسکراہٹ ہو— منصور!— منصور!! کیا سوگئے۔

منصور : (رشدی کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) تم منصور کو زیادہ پریشان نہ کرو— تمھاری ناامیدی... رشدی...

رشدی : نہیں منصور۔ میں ناامید نہیں (آنکھیں کھول کر) میں اپنی ناامیدی میں ایک طمانیت محسوس کررہا ہوں۔ (آنکھیں بند کرلیتا ہے) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج اندو بالکل میرے پاس ہے— میرا دل کہہ رہا ہے کہ میرے— آخری وقت وہ ضرور آئے گی— خود ہی آئے گی— (کھانستا ہے) تم اس کا خیال رکھو گے نا منصور؟

منصور : پھر وہی بہکی بہکی باتیں— پھر وہی ناامیدی— جب تم عزیز ہو— کیا اندو عزیز نہ ہوگی— رشدی....

رشدی : (آنکھیں بند کیے ہوئے) منصور!— منصور!! وہ آئے گی نا— مگر نہ آئے تو بہتر ہے— اس کی کافی بدنامی ہوچکی ہے— اندو تم نہ آنا۔

(اندو گھبرائی ہوئی کمرہ میں داخل ہوتی ہے)

اندو : میں آگئی— رشدی! رشدی!!

رشدی : (آنکھیں کھول کر اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے) بڑی غلطی کی تم نے اندو۔

اندو : (پلنگ کے پاس زمین پر بیٹھتے ہوئے) رشدی تم اِسے غلطی کہتے ہو— لیکن میں— اِسے زندگی کی سب سے بڑی جیت سمجھتی ہوں۔

(منصور اٹھ کر کمرہ سے باہر جاتا ہے)

رشدی : (اندو کے چہرہ پر آنکھیں جما کر) مجھے یقین تھا اندو۔ کہ تم ضرور آؤ گی (کھانستا ہے) مگر میں چاہتا تھا کہ تم نہ آؤ۔ (بڑی سی ٹھنڈی سانس لے کر)

ابھی ورما تمھاری تلاش میں آیا تھا۔

اندو : (رشدی کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر) رشدی! اب میں اس سوسائٹی کے بندھن میں نہیں ہوں— مجھے ورما— اور سوسائٹی کی پرواہ نہیں۔

رشدی : (آنکھیں بند کرتے ہوئے) یوں نہ کہو اندو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم لوگ سماج سے کیوں باغی ہوئے جارہے ہو (کھانستا ہے) ورما سماج سے روٹھ گیا۔تم سماج کو برا کہہ رہی ہو (مسکراتا ہے) ہاں— (آنکھیں کھول کر) اندو— اِس دن کو بھول جاؤ— جس روز لوگوں نے یہ سمجھا تھا کہ اندو ہاری ہے اور رشدی— جیتا ہے۔

اندو : نہیں رشدی— میں وہ دِن کیسے بھول سکتی ہوں— میں نے ہی ضد کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ تم مجھے نہ بچا سکو گے— مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمھارے ستار کے تاروں میں ایک جادو تھا— رشدی! مجھے کیا معلوم تھا کہ جب تم انھیں چھیڑتے ہو تو انسان کیا— جانور— جانور ہی نہیں۔ بلکہ بے جان چیزیں رقص کرنے لگتی ہیں۔

رشدی : لوگ سمجھتے ہیں کہ اس روز میری جیت ہوئی— نہیں (آنکھیں کھول کر اندو کے چہرہ کو غور سے دیکھتے ہوئے) میں سچ کہتا ہوں اندو— اس روز میں سب کچھ ہار گیا تھا— اندو، بہتر ہے کہ تم چلی جاؤ— یہ دنیا—

اندو : (رشدی کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) نہیں رشدی۔ میں اب واپس جانے کے لیے نہیں آئی ہوں۔

رشدی : (آنکھیں بند کرکے) اندو— وہ دن بھی کیا کہا تھا— بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کل ہی کی بات ہے— لیکن اندو۔ آج بھی میری زندگی کا رنگین ترین دن ہے (آنکھیں کھول کر اندو کا چہرہ دیکھتے ہوئے) یہ سمجھ کر کہ— ''رنگینیاں سمٹ کر انسان ہوگئی ہیں'' (اندو کے چہرہ پر بہتے ہوئے آنسو پونچھ کر) کیوں پگلی روتی کیوں ہے، (مسکرا کر) یہ موتی بہانے کے لیے نہیں

ہیں— اچھا اندو، ایک بات مانوگی؟

اندو : اپنی اندو، پر اتنا بھی اعتبار نہیں کیا۔

رشدی : میں چاہتا ہوں کہ تم سماج سے بغاوت نہ کرو— مذہبوں نے ہم کو جدا جدا کردیا ہے۔ تو ہم الگ رہیں— لیکن ہماری روحیں جدا نہیں— ہماری یہ پاکیزہ روحیں ایک دوسرے سے مل چکی ہیں اور سماج کی گندی آنکھیں انھیں نہیں دیکھ سکتیں— اندو— تم واپس چلی جاؤ۔

اندو : رشدی! کیسی باتیں کرتے ہو؟

رشدی : اندو! میرا آخری وقت ہے— دل تو یہی چاہتا ہے کہ تم میرے پاس بیٹھی رہو اور میں۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) تمھاری شکل دیکھا کروں۔

اندو : میں اسی واسطے تمھارے پاس آئی ہوں— میں نے غلطی کی تھی— شاید۔

رشدی : (اندو کا چہرہ غور سے دیکھ کر) نہیں اندو، اب یہ مناسب نہیں— زمانہ کے رنگ میں رنگ جانا— (کھانستا ہے)— یہی موجودہ دور میں سب سے بڑی کامیابی ہے۔

اندو : لیکن رشدی تم تو کہا کرتے تھے کہ زمانہ کو اپنے رنگ میں رنگ لینا جیت ہے۔

رشدی : ہاں وہی ٹھیک ہے مگر میں ناکامیوں سے کچھ اس قدر مایوس ہوگیا ہوں کہ اب خود پر اعتبار نہیں رہا۔ اندو بہتر ہے تم واپس چلی جاؤ— میری آخری خواہش پورا کرنے میں بخل نہ کرو۔

اندو : لیکن.........

رشدی : لیکن کچھ نہیں اندو— چلی جاؤ— پرسکون موت مرنے دو۔

اندو : (اٹھ کر کھڑی ہوتی ہے رشدی پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالتی ہے۔ دو چار قدم دروازہ کی جانب بڑھتی ہے یکایک رشدی کی جانب مڑ کر) رشدی! کیا میرا آخری رقص بھی نہیں دیکھو گے۔

رشدی : اندو! (مڑ کر بدقت اندو کا چہرہ دیکھتے ہوئے) تمھارا رقص میرے دل و دماغ

میں سمایا ہوا ہے— میں اِس سے ہمیشہ مدہوش رہتا ہوں—

اندو : لیکن میں اپنی زندگی کا آخری رقص کرنا چاہتی ہوں— تمہارا ستار کہاں ہے؟

رشدی : (ستار کی جانب مسکرا کر دیکھ کر) سب تار ٹوٹ گئے ہیں۔

اندو : خیر...

(بڑھ کر میز کی دراز میں سے گھونگرو نکالتی ہے۔ اور باندھ کر رقص شروع کردیتی ہے۔ رشدی برابر اس کو تکتا رہتا ہے۔ رقص ختم کرنے کے بعد رشدی کے پاس آتی ہے۔اس کے چہرہ پر سے بہتے ہوئے آنسو پونچھ کر)

اندو : لو رشدی اب جاتی ہوں— یہ نہ سمجھنا کہ اب میں شاید پھر اس سماج کی ہوکر رہوں گی۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔ میں باغی ہوں۔

رشدی : نہیں اندو۔نہیں (کچھ دیر خاموش رہ کر) اچھا اندو، کیا تم مجھے اپنے ہاتھ سے ایک دو گھونٹ شراب پلا سکتی ہو۔

اندو : (تعجب سے) شراب؟

رشدی : ہاں ہاں— شراب شراب— سب ہی لوگ اس کو برا کہتے ہیں— (مسکرا کر) لیکن میں اس کو برا نہیں سمجھتا— شراب پینے والا ایک ایسا انسان ہوتا ہے جو ہر غم پر فاتحانہ مسکراتا ہے۔ جو ہر شکست پر.... (مسکرا کر خاموش ہوجاتا کچھ دیر بعد) وہ اُن انسانوں سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔ جو خود کو انسان کہتے ہیں— (اپنے لحاف کی طرف اشارہ کرکے) اس کے نیچے ایک بوتل رکھی ہے۔اندو، (التجا آمیز لہجہ میں) صرف ایک گھونٹ پلا دینا..

اندو : (لحاف کی جانب بڑھتے ہوئے) میں آپ کو شراب پلانے کو تیار ہوں... مگر ایک وعدہ کیجیے...

رشدی : کیا وعدہ؟

اندو : یہی کہ آپ جلد شراب پینا چھوڑ دیں گے۔

رشدی : (مسکرا کر) انشاء اللہ یہ میری زندگی کی آخری، شراب ہوگی۔

اندو : آپ وعدہ کرتے ہیں۔

رشدی : ہاں وعدہ— اور— تم سے

(لحاف کے نیچے سے شراب کی بوتل نکال کر گلاس میں رشدی کو دیتی ہے)

رشدی : (گلاس لیتے ہوئے) اندو— ایک آخری رقص اور

اندو : جو تمھارا حکم رشدی۔

رشدی : حکم نہیں درخواست...

(اندو، رقص شروع کر دیتی ہے)

رشدی : (رقص دیکھتے دیکھتے ایک دم چلا کر) بس کرو— اندو— اندو— بس کرو۔

(رقص جاری رہتا ہے)

رشدی : اب برداشت کی طاقت نہیں (شراب کا پیالہ ہاتھ سے گرتا ہے)

بس کرو اندو— میری اندو، بس کرو

(رقص اور تیزی سے ہوتا ہے)

رشدی : (آہستہ آواز میں) بس اندو۔

(رشدی کو ایک ہچکی آتی ہے۔ اندو رقص بند کر کے رشدی کے پاس آتی ہے)

اندو : (قریب آ کر ایک دم) منصور بھیا...

(منصور گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے)

اندو : (چیخ کر) منصور بھیا...

(مردہ رشدی سے لپٹ کر رونے لگتی ہے)

(پردہ)

(مطبوعہ رسالہ 'نیرنگِ خیال' لاہور، جولائی 1945)

رنگ میں بھنگ

کردار

(1) کھیا (ادھیڑ عمر گاؤں کا چودھری) (2) متوا (کھیا کا ہم عمر ایک کاشتکار) (3) شیوچرن (کھیا کا نوجوان لڑکا) (4) رمیا (متوا کی لڑکی) (5) شیوتان (کھیا کا ایک محنتی ملازم، نوجوان)

منظر

(ایک چھوٹا سا گاؤں۔ کچھ جھونپڑیاں۔ جن کے بیچ میں ایک میدان ہے۔ یہ گاؤں گھنے جنگلوں کے بیچ میں آباد ہے جس کے آس پاس کئی میل تک کوئی آبادی نہیں ہے۔ گاؤں میں کچھ آدی باسی قبیلے آباد ہیں۔ شام کا وقت ہے سورج غروب ہو چکا ہے۔ اور چاند نکل رہا ہے۔ مکانوں کے اندر ہلکی ہلکی روشنی ہے۔ کھیا کے دروازہ پر ایک لالٹین لٹکی ہوئی ہے اس کے نیچے ایک چارپائی پر کھیا بیٹھا ہوا حقہ گڑگڑا رہا ہے۔ میدان کے بیچ میں ایک 25,30 فٹ اونچی لکڑی گڑی ہوئی ہے جس کی چھال وغیرہ نکال کر خوب چکنا کردیا گیا ہے۔ کچھ لوگ اس لکڑی کے گرد جمع ہیں اور اس پر تیل مل کر اور چکنا کررہے

ہیں۔ بعض مکانوں کے سامنے کتے بیٹھے ہیں۔ جو کبھی کبھی گردن اٹھا کر بھونک دیتے ہیں اور پھر گردن جھکا کر خاموش ہوجاتے ہیں۔ کھیا خاموش بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا ہے اور لوگوں کو لکڑی پر تیل ملتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ کچھ دیر بعد بلند آواز سے۔

کھیا : ارے شیوتانورے، اوشیوتانو۔

(دور سے شیوتان کی آواز۔ ''آیو کھیو۔'' کھیا پھر حقہ گڑگڑانے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد شیوتان آکر)

شیوتان : کائیں (کیا) کہے ہے۔

کھیا : کہاں مرگوتھو (تھا) گھنٹو بھر سے ہیلا پاڑ (ہیلا پاڑنا۔آواز دینا) رہو ہوں۔

شیوتان : ڈھورڈنگر کونڈ (بند) رہو تھو۔ تو تو چاہے ہے تمھاری (تیری) نجروں کے سامنے پھروبرتھاڑو (کھڑا) رہوں۔

کھیا : جیب بہت چلنے لاگی ہے۔ بامرگو آج کھریدو تھو یا کائیں (کیا) کیو؟

شیوتان : مُرگی بن کے ساتھن میں کونڈ دیو۔

کھیا : سات بیر چولن[1] پر سے اتار لیو تھو باکو جا (یا) نہیں؟

شیوتان : اتار نہ لیتو تو کائیں (کیا) ماری (میری) مڑیا (سر) کی کھیر رہتی۔

کھیا : چولن پر سے سات بیر اتار لیوے ہیں تو با (وہ) گھر پر بندجائے ہے۔ مورکھ دیوی کی کرپا بنی رہے ہیں باپر۔

شیوتان : تھاری چاکری نے تو جندگی اجیرن کردی ہے۔ جناور بن (جانور) کی بھانتی جانے ہے مورے کو۔ (بڑبڑا کر) جا کر باکر کمر سیدھی کرنے کی بھی پھرست ناہی ملے ہے۔

کھیا : دیکھ رے شیوتانو تھارے کرتوتن بھلی بھانتی جانو ہوں گاؤں کی چھوری بن کو تاکن جھاکن کی پھرصت چاہے ہے پر گانٹھ میں باندھ رکھیو جا پچھن باجی

1۔ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ نئے خریدے ہوئے مرغ اور مرغی کو سات بار چولھے کے چکر دے لو تو وہ گمتا نہیں ہے۔

ٹھیک ناہی ہے۔ تہاری (شیوتان کچھ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہے جو سمجھ میں نہیں آتا۔ کھیا اُسے بڑبڑاتا دیکھ کر) کا من ہی من میں بانچے (پڑھنا، بولنا) ہے (شیوتان کوئی جواب نہیں دیتا) جاجرا شیوچرنا کو مورے پاس بھیج دیجو۔

کھیا : ارے باکو (اس کا) پیچھو بھی چھوڑو گے جانا ہیں۔ تنک ادھر تو آؤ۔
(مٹوا پلٹ کر کھیا کو دیکھ کر)

مٹوا : آج تو چھوراہن کو جور (زور) آجانو ہے۔ آج کے دنا تو جان پڑو گے اننے ماتا ہن کو دودھ پچائیو (ہضم) ہے جانا ہیں۔
(کھیا قہقہہ مار کر ہنستا ہے۔ حقہ گڑگڑا کر اونچی آواز سے)۔

کھیا : کرلو تمرے من کی چیت چھوکرا ہن کی نہ راہے تو ایک بکرو ہاروں گو تمرے کو۔

مٹوا : (مٹوا دوڑ کر کھیا کے پاس آکر ہاتھ بڑھا کر) رہی کھیو۔ مار ہاتن پر ہات۔ چھوہرا ہن نے بھی ماتا ہن کو دودھ پچایو ہے۔ (کھیا چند سیکنڈ سوچتا ہے اور حقہ گڑگڑاتا ہے۔ کھیا کا چہرہ دیکھ کر) کائیں ہٹ گیو پیچھے۔ (ہنس کر) جیب دے کر مکر بے ہے۔ (کھیا مسکرا کر اس کا چہرہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتا ہے مٹوا مسکرا کر) جارا ہی بات۔

کھیا : (مسکرا کر) اپنی جوانی میں سات بیر جھنڈو توڑو[1] ہے۔

مٹوا : (ہنس کر) تھارو من چاہے تو آجائیو میدان میں۔ تھاری جوآنی کائیں لٹ گئی ہے۔ (کھیا اس طرح مسکراتا ہے جیسے اُسے اپنی گذری ہوئی جوانی یاد آ گئی ہو۔ شیوچرن آتا ہے۔ 20-22 سال کی عمر ہے بدن گٹھیلا اور کسرتی ہے کھیا اُسے

---

[1] یہ تہوار عام طور پر فصلیں کٹ جانے کے بعد منایا جاتا ہے۔ ایک 30-25 فٹ اونچی لکڑی زمین میں گاڑ دی جاتی ہے اور اسے خوب چکن کردیا جاتا ہے۔ اس کے اوپری سرے پر کچھ روپے اور ناریل باندھ دیا جاتا ہے مرد اور عورتیں جمع ہوتی ہیں اور گاتی ہیں نوجوان اس پر چڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اور لڑکیاں بانس کی پھچیوں سے انھیں مار مار کر چڑھنے سے روکتی ہیں یہ کھیل اس وقت تک ہوتا رہتا ہے جب تک کوئی نوجوان اس لکڑی پر چڑھ کر وہ روپے اور ناریل حاصل نہ کر لے یہ جھنڈا توڑنا کہلاتا ہے۔

دیکھ کر مسکراتے ہوئے)

کھیا : ارے شیو چرنا۔ کائیں ارادہ ہے (گڑی ہوئی لکڑی کی طرف دیکھ کر) جرا دیکھ لیجو۔ (شیو چرن لکڑی کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر سینہ پھلا کر)

شیو چرن : کائیں یا جھنڈو۔ ماں کے دودھ کی سوگند ایک بن میں نہ توڑ لیو تو اپنی ماں کا جنا نہ جانیو۔

کھیا : (متوا کی طرف مسکراتے ہوئے) دیکھے ہے؟ پھیرے ہے تو پھیرے ہاتن کو کائیں ہنی کرائے ہے۔

متوا : (ہنس کر فخریہ انداز میں) مردن کا ہاتھ ہے کھیا پہاڑ سے ٹکرا جائے ہے تو گیل (راستہ لے کر چھوڑے ہیں۔ (مڑ کر واپس جاتے ہوئے) جیت چھوکری بن کی راہے گی۔

کھیا : (ہنس کر) تو بھی تو ہار دیکھ ایک بکرو۔

متوا : (مڑ کر متوا کو دیکھکو) ہارو۔ کائیں جانے ہے ایک بکرن کے لیو پیٹھ موڑ جاؤ نگو۔ (کھیا ہنستا ہے۔ متوا مڑ کر) گھڑ بن کی سواری بھی راہی۔[1]

کھیا : (ہنس کر) اچھا بابھی راہی۔ (حقہ گڑ گڑا کر) نکر نہ جائیو۔ (متوا ہنستا ہوا گڑی ہوئی لکڑی کی طرف جاتا ہے۔ دوسری طرف سے کچھ لڑکیاں جنھوں نے موٹے مگر گہرے رنگ کے کپڑے پہن رکھے ہیں اور اپنے طور پر خوب میک اپ کیا ہے گاتی ہوئی آتی ہیں)۔

لڑکیوں کا گانا

بائی بڑ و گھر دیکھو ہمیں آیاری　　بائی بڑ و تمر و نام
بڑی من راسی چونڈری
بائی بڑو تمر و گھر

---

1 ہارنے والا جیتنے والے کو پیٹھ پر بٹھا کر پورے میدان کا چکر لگاتا ہے۔

بائی چھوٹی موٹی بواڑ ہی کرے　　بائی منڈھائی کو ہوگیا دس ٹرک
بڑی من راسی چونڈڑی
بائی بڑو تمرو نام
بائی رتیں ٹیوٹے باگری　　بائی منڈھائی کو ہوگیو دس ٹرک
بڑی من راسی چونڈڑی
بائی بڑو تمرو نام

بائی بڑو گھر دیکھیو ہم آیا ری

بائی بڑو تمرو نام[1]

کھیا : (حقہ گڑگڑاتے ہوئے مسکرا کر) آج تو چھوری ہن پر بڑو جوبن دکھائی پڑے ہے (ہنس کر) کائیں ارادو ہے (شیون چرن کی طرف دیکھ کر لڑکیوں سے) شیو چرنا چھاتی ٹھوکے ہے بولے ہے ایک ہلن میں جھنڈو نہ توڑلیو تو اپنی ماں کا جنانہ جانیو۔

رمیا : (جو سب سے تیز طرار دکھائی دیتی ہے) کائیں شیو چرنا ہی نے ماں کا دودھ پچایو ہے۔ (شیو چرنا کی طرف دیکھ کر) بھول گیو تین دناں ہلدی تھپت راہی تھی گئے بیر (وقت)

شیو چرن : ہلدی تھپت راہی تھی مہندی تو ناہیں تھپی تھی ہاتن میں۔

رمیا : تو لگائے ہے ہوڑ شرط) جھنڈن پاس بھٹک بھی لے گو تو کنواری ہن کی جتی میں بھید جانیو۔ (چیلنج کرتے ہوئے) ہار گیو تو ہاتن میں مہندی تھپ وائے گو؟

شیو چرن : منجور ہے۔ پر جیت گیو تو ہلدی ملوائے گی پنڈن پر (کھیا مسکراتا ہے اور حقہ گڑگڑاتا ہے۔ دوسری لڑکیاں کھل کھلا کر ہنستی ہے رمیا شرما کر نظریں

---

1. ہم تمھارے بڑے گھرانے اور بڑا نام سن کر آئے ہیں۔ تمھاری چھوٹی بہو دودھ بلوتی ہے۔ تو رسی ٹوٹ جاتی ہے اور وہ تھک کر گر پڑتی ہے۔ تمھارے یہاں دودھ دہی کی اس ۔۔ر افراط ہے۔

نیچی کر لیتی ہے) کائیں اب ہوڑ کائیں نہ لگائے ہے۔ بڑی اترائے پھرے ہے جوبن پر۔

دوسری لڑکی: کائیں سورمائی جتائے ہے۔ سب نجرن کے سامنے آجاؤ گو۔ تھوڑی بیر ملا لگالیجیو چھاتی کا سارا جور۔ ہمرے ہاتن نے بھی کھیتوں کو نیندو ہے۔ چار گھڑن موڑ پر رکھ کر راڑ لگائے ہے۔

کھیا : (مسکرا کر حقہ گڑگڑاتے ہوئے) آج چھوہری ہن تو بڑو جور دکھائے ہیں۔ (دوسری لڑکی کی طرف دیکھ کر) نجرن کے بان نہ ماریو چھوہرا ہن پر۔

شیوچرن : جائی تو بکھیڑ دے ہے۔ جبر (بخار) چڑھ آئے ہے ان تینوں کے بان سے۔

رمیا : پرجیتو تھاڑہ ہے۔ گیرت ہوئے تو کوئین (کواں) کی میڑ دیکھ لے جا کر۔

شیوچرن : ڈھکیل اپنے ہاتن سے۔ نائیں بولوں تو ڈھوون سنگ کونڈ دیجو۔ پر آج کے دنا تو تھاڑے سے ہوڑ لاگی ہے پنچوں بیچ ہلدی نہ ملوائی پنڈن پر تو شیوچرنا کہیو۔

(مٹوا ان سب کی طرف آتے ہوئے)

مٹوا : دس روپیہ سے کم نہ لیجو کھیا سے برس برس کا تیوہار ہے۔

کھیا : (حقہ گڑگڑا کر) سوار پیو کی ریت پرکھن سے چلی آئے ہے۔ بائے انکار نہیں۔ دو گڑ کی بھیلی اور ٹریل سنگ میں لیجو۔

مٹوا : (چارپائی پر بیٹھ کر) باریق رواجن پرکھوں کے سنگ ہو لیے کھیو۔ کون انوا پر چلے ہے۔

کھیا : کائیں نہ چلے ہے باریق رواجن تو آدی باسیوں کا جیون ہیں مورکھ۔

---

1 بندیج: بندوبست: بیساکھ میں اماوس کی رات کو تمام مرد گاؤں سے باہر نکل جاتے ہیں اور ان راستوں پر جمع ہو جاتے ہیں اور کسی کو کسی حالت میں گاؤں میں داخل نہیں ہونے دیتے۔ پوجا پاٹ کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس طرح بھوت پلید کا بندوبست کر دیا جاتا ہے۔ اور سال بھر تک گاؤں ان بلاؤں سے پاک رہتا ہے۔

مٹوا : بندتِ کملہ کے دناں پولس کو داروگو گاؤں میں گھس آئیو۔ کاتیں ہوئے تھے باریتی
رواجن۔ اورت (عورت) نکال لے گیو۔

کھیا : کون جات برادری کی تھی بارانڈ۔ جانو (زمانہ (تو ایہو ہے کہ گیل دیکھ کر
پاؤں رکھنو پڑے ہے۔ پولس کے داروگا ہے سے بیر لے کر کائیں جیوگو۔

مٹوا : گاؤآں میں لائی اُورت داروگا ہیڑے جاوے۔ آدی باسیوں کی ناک کٹا
دی تھارے نے مردن کی جور بھی نائی آجانے دیو دیکھ لیو باکو تیجو۔

کھیا : کائیں تیجو؟

مٹوا : لچھیا ڈھوان سے پچل کر مرگیو تیسرے دنا۔ با کی ہتھیا تھاری موڑ پر ہے۔

کھیا : جاکی آجائے ہے کون روکے ہے باکو۔

مٹوا : پریتم تو توڑ دیو تھارو نے۔ (ہنس کر) تھارو جنتو من چاہے۔ جور لگالے
پر چھوری ہن دس روپیہ سے بنا تھارو پنڈ دنا ہیں چھوڑن کی۔

کھیا : تو جا بیر چھوہری ہن کی بڑی بکیلی (وکالت) کرے ہے۔ (ہنس کر) تھاری چھوہری
نے شیوچرنا سے ہوڑ لگائی ہے۔

مٹوا : (فخریہ ہنس کر) مٹوا کی چھوہری سے کھیا۔ کائیں دبے گی شیوچرنا سے۔

کھیا : (ہنس کر حقہ گڑگڑاتے ہوئے) بابھی دیکھ لیجو کائیں ویری ہے بامیں (حقہ مٹوا
کو دے کر ہنستے ہوئے) کائیں ہٹی کرائے ہے۔ (شیوچرن کی طرف دیکھ
کر) اپنی ماں سے کہیو سوا روپیا اور پوجن کا سیندور لے آوے۔

رمیا : کائیں سوا روپیہ کو پاٹ بانچھو ہے کھیا۔ گھر والی کو لہنگو باجار میں منگوانو کوارا
دوے ہے۔

کھیا : (ہنس کر) آج جا چھوہری تو بڑوسوں (منہ) پھاڑے ہے۔ ہلدی ملن جائے
گی تھارے بابیر دس روپیا کی ناہی سوا رپیا کی جیب راہی موری۔ (رمیا شرما
کر نظریں نیچی کر لیتی ہے۔ شیوچرن مسکراتا ہوا چلا جاتا ہے۔ مٹوا ہنس کر حقہ
گڑگڑانے لگتا ہے۔ لڑکیاں گاتی ہوئی گڑی ہوئی لکڑی کی طرف جاتی ہیں)۔

گانا

ہٹ پڑے گورا نار　　　باڑی لگا دے آگن میں
باڑی لگا دے آگن میں

کھیا　: (حقہ مٹوا کے ہاتھ سے لے کر گڑگڑا کر) شوبچرنا نے آج اپنی متی (مت۔ رائے) دے دی ہے۔

مٹوا　: (کھیا کا چہرہ سوالیہ نظروں سے دیکھ کر) کائیں متی دے دی ہے باتے۔

کھیا　: (ہنس کر) تھاری چھوہری کے لیے۔ پنچوں کے بیچ ہلدی ملن کی ہوڑ لگائی ہے باسے۔

مٹوا　: شیوچرنا کی بھلی چلائی۔ باتو اس رانڈ کے پیچھے پھرے ہے۔

کھیا　: کون رانڈ کی بات کہے ہے مٹوا۔

مٹوا　: ارح بائی لچھیا کی رانڈ۔

کھیا　: کائیں کہے ہے مٹوا۔ کسم دیوی میتو کی مڑیا اتارلوں گوشیوچرنا کی۔

مٹوا　: سارو گاؤں جانے ہے کائیں ڈھکی چھپی بولوں ہوں تھارے سے۔

کھیا　: (سوچتے ہوئے حقہ گڑگڑاتا ہے۔ پھر حقہ مٹوا کی طرف بڑھا کر) بارانڈ چھٹی چھنال ہے۔ کھدی چپچولاگی ہوگی۔ (پھر کچھ سوچ کر) ابھی تین دنا گاؤں سے گائب رہی۔ جا کائیں لچھن ہیں۔

مٹوا　: پربھید نہیں کھلوکاں سا گئی تھی چھنال۔

کھیا　: اپنے یارن کو من ٹھنڈو کرن گئی تھی۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) کھیر با بکھیڑو کو میں جان لوں گو۔ بات تھاری چھوہری کی ہے۔

مٹوا　: (حقہ گڑگڑا کر) فصلن کی حالت تھاری نجروں کے آگے ہے۔ چھوہری کا بیاہ ہوئے تو کچھ گہنو پاتو ہو۔ دو چار لہنگن مگون ہو اور دو چار پنچوں کی پنگت جو دری ہے۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) اس بیر برکھا نے کمر توڑ دئی۔

کھیا　: گہنو پاتو اور لہنگن لگن کے لے تھاری جندگی پڑی ہے جب من چاہے

کردیجیو۔ آدی پاسیوں کی پنگت کی بات بھلی کہی تھارے نے۔ اپنو اپنو آٹو دال باندھ لائیں گے کھوب گمت (محفل) جم جائے گی۔[1]

مٹوا : باتو ٹھیک ہے۔ پر دیوی کی کرپا سے ایک چھوری ہے۔ کچھ کیو بنا من نہیں مانوگو۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) بکھت (وقت) پر برکھانے بڑو دھوکو دیو۔ اور جب برسن لاگی تو بچی کچھی فصلن کو بھی لے ڈوبی۔

کھیا : کائیں گیر کے گھر جارہی ہے۔ جیسے تھارے گھرموں (منہ) کھولے پھرے ہے مورے گھر بھی پھرے گی[2] (مٹوا حقہ گڑگڑا کر سوچنے لگتا ہے۔ کھیا مٹوا کا چہرہ دیکھ کر) کائیں سوچ ہے۔ ہای بھرلے۔ دیوی کی کرپاراہی تو جا فصلن سے ہی چھوری کے ہاتن پیلے ہوجائیں گے۔ (کھیا کی بیوی ایک تھال میں کچھ سیندور ایک جلتا ہوا دیا دو گڑ کی بھیلیاں۔ ناریل اور سوا روپیا رکھے آئی ہے اور تھال کھیا کے سامنے رکھ دیتی ہے۔ کھیا مسکرا کر مورے سامنے کائیں دھرے ہے آج کی پوجن مٹوا کے موڑ مانڈھ دی ہے مورے نے۔

مٹوا : باکھیا جائیں ہوئے ہے جا کام تھارو ہے۔

کھیا : (ہنس کر) اری چھوری ہن سند ہوجا مٹوا سوار پیا کے لیے پیٹھ دکھائے ہے۔

مٹوا : سوا روپیا کی کائیں بات ہے۔ پر تھارو کام موئے موڑ کائیو، مانڈے ہے۔

کھیا کی بیوی: سیوا روپیا کی بات ناہی ہے تو انٹی سے سوا روپیا کائیں نہ نکالے ہے۔

مٹوا : آج تو جا گھونگھٹ میں کھوب بولے ہے۔ (اپنی کمر میں لپٹی ہوئی دھوتی میں سے روپیہ نکال کر تھالی میں رکھتے ہوئے) جالے— (ہنس کر) گھڑی بیر کے لیے گھونگھٹ ہٹالے۔ سوا روپیا تھارے پر سے اوتاردوں۔ (کھیا کی

---

[1] آدی باسی اکثر شادیوں میں خود اپنا کھانا ساتھ لے آتے ہیں۔ صاحب خانہ جس قدر کھانے کا انتظام کرسکتا ہے سب کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ کھانا ختم ہوجانے پر پانی دیا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کھانا ختم ہوگیا ہے سب لوگ ہنسی خوشی اٹھ جاتے ہیں۔ کسی کو کوئی شکایت نہیں ہوتی خود اپنے ساتھ لایا کھانا پکا کر کھالیتے ہیں اور جوش سے رات بھر گاتے بجاتے ہیں۔

[2] بہو منہ چھپا کر اور بیٹی منہ کھول کر چلتی ہے۔

بیوی گھونگھٹ اور لمبا کرلیتی ہے۔ مٹوا قہقہہ مار کر ہنس کر) جان پڑے ہے چھوہری بمن کو سرہانو کو مارا دوہے۔

کھیا : (ہنس کر) گاؤں کی بہو ہے گھونگھٹ کا ہے نائیں کاڑھے گی۔

مٹوا : تو انٹی میں چھپا رکھ جاکو۔ جوآن چھورن کی مان بن گئی پر بہو بنی پھرے ہے۔

کھیا : دل لگی کو دنا آوے تو خوب دل لگی مارلیجو۔ تنک جاکر پوجن کراوے۔

مٹوا : تھاروکام موئے کائیں سوجے ہے۔

یا : لوگن کو جان پڑجاؤ گو تھارو سے ناتو جوڑلیو ہے موئے۔ (زور سے آواز 'جے شنکر۔ جے بھولے ناتھ' کھیا آواز کی طرف دیکھ کر) آج بمن دیوتا پدہارے ہیں۔ (مٹوا کے ہاتھ سے حقہ لے کر) تو دیوی کی پوجا کرادے میں بمن دیوتا کو سنبھالوں۔

(مٹوا کھڑا ہوجاتا ہے کھیا کی بیوی تھالی اٹھالیتی ہے۔ آگے آگے مٹوا اور پیچھے پیچھے کھیاں کی بیوی جاتے ہیں کہ پاس کے مکان کے پیچھے سے ایک برہمن 'جے شنکر جے بھولے' کہتا ہوا آتا ہے۔ ماتھے پر تلک لگی ہوئی ہے۔ آنکھوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بے حد چالاک اور شرارت پسند ہے۔ کھیا کے پاس آکر)

برہمن : جے بھولے۔ جے شنکر۔

(کھیا چارپائی سے کھڑے ہوکر چارپائی کی طرف اشارہ کرکے)۔

کھیا : پدھارو دیوتا۔

برہمن : (پالتی مار کر چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے) جے شنکر۔ جے بھولے۔ (آنکھیں بند کرکے) ہری اوم۔ ہری اوم۔

کھیا : بڑے دنا میں درشن دیے دیوتاؤں نے۔

برہمن : ہری اوم۔ ہری اوم۔ (آنکھیں کھول کر کھیا کو دیکھ کر) ہم یہ کہنے آئے ہیں کہ تیرے گھر پر پاپی گرہ لگ گئ ہے۔

کھیا : (گھبرا کر) کائیں بولو ہو دیوتا۔ دیوی میو کو پرساد چڑھا نوتو جندگی بھرنہیں بھولو۔

برہمن : ہری اوم۔ ہری اوم— تو نے پاپ کیا ہے۔ دیوی میا تم سے ناراض ہے۔

کھیا : دیوی میو موئے سے ناراج ہے۔ موئے نے پاپ کیو ہے۔

برہمن : تتھا استو تیر ہتھیا ہے۔

کھیا : (گھبرا کر حیرت سے) میرے موڑ ہتھیا ہے۔ اموہے نے پاپ کیو ہے!! کائیں کہو ہو دیوتا۔ جا پاپ تو مورے سے جندگی بھرنہیں ہو یو۔

برہمن : لچھیا کی ہتھیا۔ تو نے اس کو بدھ کیا اور پھر ڈھوروں میں ڈال کر اڑا دی کی ان سے کچل کر مر گیا۔

کھیا : کائیں کہو ہو دیوتا۔ جا تو گھور پاپ ہے۔

برہمن : گھور پاپ۔ گھور پاپ۔ (آنکھیں بند کر کے) ہری اوم۔ ہری اوم۔ (گلے میں پڑی ہوئی مالا کو تیزی سے گنتا ہے) ہری اوم۔

کھیا : پر دیوتا با سے موری کون بیر تھی۔ جو با کو بدھ کر دیو۔

برہمن : (بڑی بڑی آنکھیں نکال کر مالا کے دانے گنتے ہوئے) تو برہمن دیوتا جھوٹ بولتے ہیں۔ ہری اوم۔ ہری اوم۔ گھور پاپ۔ (غصہ سے کھیا کو گھورتے ہوئے) اس کا تیری چھوہری سے رشتہ تھا اس کو چھپانے کے لیے تو نے اس کی ہتھیا کی۔

کھیا : کائیں کہو ہو دیوتا۔ موری چھوہری کا با سے رشتو جا تو جھوٹ ہے دیوتا۔

برہمن : جھوٹ ہے۔ برہمن دیوتا جھوٹ کہہ رہے ہیں۔ ہری اوم۔ ہری اوم— اکال تیرے گاؤں کو نشٹ کر دے گا۔

کھیا : (گھبرا کر) اکال!

برہمن : ہم انتریامی ہیں۔ سب کچھ جانتے ہیں۔

کھیا : جا تو ست ہے۔ پر جا گھور پاپ مورے موڑ نہیں ہے۔

برہمن : ہری اوم ہری۔ تیری چھوہری نے کھیت میں چلتا ہوا ہل چھینا۔[1]

کھیا : جا سچ ہے۔ بیر با تو دھرم کو کام تھو۔

برہمن : پر دیوی میا اس سے ناراض تھی۔ اسی کے پاپ سے ہتھیا ہوئی۔ دیوی اکال لائے گی گاؤں پر۔ ہری اوم۔ ہری اوم۔ کل جگ ہے۔ گھور پاپ ہو رہے ہیں۔ گھور پاپ۔ اونما۔ ہری اوم۔

(شیو چرن آتا ہے اور برہمن کو دیکھ کر برا سا منہ بنا کر دونوں ہاتھ جوڑ کر)

شیو چرن : نمسکار دیوتا۔

برہمن : (آنکھیں کھول کر) جے گوندا (مالا کے دانے گنتے ہوئے) ہری اوم ہری اوم۔ (کھیا سے) تجھے اپنے پاپ کا ڈنڈ بھوگنا پڑے گا۔

شیو چرن : کیسو پاپ۔

کھیا : بمن دیوتا کہے ہیں۔ میں نے لچھیا کی ہتھیا کی ہے۔

شیو چرن : لچھیا کی ہتھیا؟ (برہمن سے) کائیں اپنے ہوش میں ہو مہاراج۔ پولس نے کھوب تکی کات کرلئی تھی۔ پنچ نامو لکھیو گیو تھو۔

برہمن : ہم انتریامی ہیں۔ لوگوں کے من کی بات جانتے ہیں۔

شیو چرن : جنو ہواؤ گے۔ پر جہاں سے بکھیڑ و ناہی چلو گو۔

کھیا : ارے شیو چرنا کائیں کہے ہے۔ بمن دیوتا ہیں دیوتا۔

شیو چرن : اپنے گھرن پہ دیوتا بنے راہیں۔ کون جائے ہے انو کو روکن کو۔ پر الٹی سیدھی باتیں بنا کر روپیا اینٹھن کی کائیں بدی ہے۔

برہمن : (برہمن غصہ سے کھڑے ہو کر) گھور پاپ۔ (شیو چرن کی طرف دیکھ کر) تو نے برہمن دیوتا کا اپمان کیا ہے۔ دیوی میا تیرے اوپر جبر لائے گی۔

---

1. جب وقت پر بارش نہیں ہوتی تو عورتیں کسی بھی کھیت میں گاتی بجاتی جاتی ہیں۔ ایک عورت مرد کا لباس پہنے ہوتی ہے وہ کھیت میں چلتا ہوا ہل جھٹک کر چلاتی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ایسا کرنے سے بارش ہونے لگتی ہے۔

شیو چرن : تھاری مرجی تو چلائے ہے نا دیوی میو۔ جاہوتو تو گھرن پہ پوجا ہوتی تھاری۔ گاؤں گاؤں مٹھیا بھرآٹن کے لیے کائیں بھٹکتو پھرتو۔

برہمن : ہری اوم۔ ہری ادم۔ (کھیا سے) پاپی گرہ ہے۔ تیرے اوپر سب جان جائے گا۔ اپنے کرم کے پھل بھوگے گا۔ ہری اوم۔ ہری ادم۔ جے گوندا۔

(غصہ سے چلا جاتا ہے۔ دور تک جے گوندا اور ہری اوم کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ کھیا شیو چرن کی طرف دیکھ کر)

کھیا : تھارے نے جا کائیں کیو۔ بمن دیوتا کو تاراج کردیو۔

شیو چرن : جاکے لچھن بھلی جاتی جانو ہوں۔ ایک رانڈ بھگالایتھو۔ جب پکڑ و گیو تو پولس والن کو دے دلا کر پنڈو چھڑایو۔

(شیو چرن چلا جاتا ہے۔ کھیا سوچنے لگتا ہے۔ گڑی ہوئی لکڑی کے گرد مرد اور عورتیں حلقہ باندھ کر بیٹھ گئے ہیں۔ ڈھولک بجتی ہے۔ کھیا اس دوران میں حقہ گڑگڑاتا رہتا ہے۔ کھیا کچھ دیر بعد اونچی آواز سے)۔

کھیا : اوشیوتانو۔ اوشیوتانو۔ کائیں جا کر مرگیو۔

(شیوتان گھیرے میں سے اٹھ کر آتے ہوئے)

شیوتان : کائیں کہے ہے۔

کھیا : (حقہ شیوتان کو دے کر) جراتھوڑی تمباخو تو دھرلا جا میں۔ جلدی آئیو۔

(شیوتان حقہ لے کر برا سا منہ بنا کر چلا جاتا ہے۔ ڈھولک کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ کچھ دیر بعد شیوتان حقہ لے کر واپس آتا ہے۔ کھیا اُسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے) آج کے دنا تو بڑو چھیلو بنو ہے۔ کون سی چھوہری پہ نجر گاڑی ہے تھارے نے۔ موئے تو پتو (پتہ) چلے۔ (شیوتان شرما کر نظریں نیچی کرلیتا ہے) کائی چھوہری بھانتی (طرح) سرمجائے ہے۔ (شیوتان کوئی جواب نہیں دیتا۔ کھیا حقہ گڑگڑا کر مسکراتے ہوئے) اب جہان کائیں تھاڑو ہے۔ باتیری گیل تاک راہی ہوگی۔

(شیوتان پھر حلقہ میں جا کر بیٹھ جاتا ہے مٹوا چلا کر)

مٹوا : کائیں کھیو جہاں آنے کو ارادو نا ہی ہے۔ (سب لوگوں کو مخاطب کر کے) دیکھو ہو پیٹھ دکھا گیواہی جا گہ۔ (جگہ) بیٹھو بیٹھو دُکا گڑا گڑائے ہے۔

کھیا : (ہنس کر) تھارو سے دبنے والو جانے ہے۔ (حلقہ میں جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ حقہ گڑگڑا کر ہنستے ہوئے) ابھی ہیٹی ہوئی جائے ہے تھاری۔ گھڑ ین کی سواری تھارے موڑ رہے گی۔

مٹوا : کائیں بات کرے ہے (لڑکیوں کی طرف دیکھ کر) دیکھ لے چھوہری ہن کے بل۔ (چاروں طرف دیکھ کر) شیوچرنو دکھائی نائی دے ہے۔

کھیا : آتو ہوگو۔ کائیں جانے ہے پیٹھ موڑ گیو۔

(ڈھولک کی آواز تیز ہوجاتی ہے مردوں کا گانا)

مرد : کہاں کی تو سگو گوالن   کہاں دودھ لے جائے

کہاں کی تو سگو گوالن

کہاں دودھ لے جائے

عورتیں : گڑھ متھرا کی سگو گوالن   گوکل دودھ لے جائے

گڑھ متھرا کی سگو گوالن

گوکل دودھ لے جائے

برج ہوئے اب جانے دو

مرد : کہاں کی تو سگو گوالن   کہاں دودھ لے جائے۔

(شیوتان دوڑ کر گڑی ہوئی لکڑی پر چڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لڑکیاں دوڑ کر بانس کی پچیوں سے اُسے مارتی ہیں۔ شیوتان گھبرا کر واپس اپنی جگہ پر بیٹھ جاتا ہے۔ لڑکیاں بھی اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ شیوچرن آتا ہے چہرہ سے بہت سنجیدہ نظر آتا ہے۔ اس کے چہرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی گہری سوچ میں ہے۔)

مٹوا : کائیں شیو چرنو کدھر گیو تھو۔ (شیو چرن کوئی جواب نہیں دیتا) بڑو گمبھیر دکھائی پڑے ہے۔ (ہنس کر) کائیں سوچے ہے ہاتن میں مہندی تھپوانو پڑے گی۔

مکھیا : (ہنس کر) او شیو چرنا کائیں سوچے ہے۔ بول دے شیر کی بھانتی حملو۔

(ڈھولک بجتی رہتی ہے۔ شیو چرن حلقہ میں بیٹھ جاتا ہے۔ پھر ایک دم اٹھ کر لکڑی کی طرف دوڑتا ہے۔ لڑکیاں بانس کی پچھیوں سے اسے مار مار کر روکتی ہیں۔ شیو چرن پھر واپس آکر حلقہ میں بیٹھ جاتا ہے)۔

مٹوا : دیکھ لیو مکھیو۔ کائیں پھیرے ہے ہاتن تو پھیرے۔ کائیں ہنسی کرائے ہے۔

مکھیا : کائیں گھبرائے ہے۔ (مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر) سانجھ بھئے گانٹھوں کو گھڑین کی سواری۔

مٹوا : (ہنس کر) یا بھی سامنے آیو جائے ہے۔ (ایک عورت کی آواز "دھائی ہے پنچوں کی دھائی ہے۔" سب لوگ ادھر دیکھتے ہیں) لچھیا کی بہو جان پڑے ہے۔ جارانڈ کیا سوانگ بھرنے چلی ہے۔

(عورت لکڑی کے پاس آکر)

عورت : پنچوں کی دہائی ہے۔

مٹوا : کائیں دہائی دیوے ہے۔ کچھ بولے گی بھی جا ہیلو پاڑے جائے گی۔

عورت : موئے تھارو سے کچھ لینو نائیں۔ میں پنچوں کے بیچ آئی ہوں۔

مٹوا : تو بیچ کائیں دھرتی میں سما گیو ہیں۔ تھاری نجرن کے سامنے ہیں بولے کائیں ناہی۔

عورت : (شیو چرن کی طرف اشارہ کرکے) شیو چرنا نے موری عجت پہ ہاتھ ڈالو ہے۔

مکھیا : عجت پہ ہاتھ ڈالو ہے۔ (غصہ سے کھڑے ہوکر) کائیں شیو چرنا۔ بول کائیں جے ست ہے۔

شیو چرن : غصے سے جھوٹ بولے ہے۔ جا ہسا ری چھل باجی ہے۔

ایک بوڑھا : پر فیصلو پنچوں دو آرو ہوگو۔

شیوچرن : (اس کی طرف دیکھ کر) منجور ہے۔

دوسرا بوڑھا: با کی عجت ہمری عجت ہے۔ جا تو گھور پاپ ہے۔

شیوچرن : جرور ہے۔ (کھڑے ہوکر عورت کے پاس آکر) اپنی بکیلی کے لیے اپنے کھصم کو کائیں نہ لائی ساتھن میں۔

پہلا بوڑھا : کون کھصم کی بات بولے ہے شیوچرنا۔

شیوچرن : بائی بمن دیوتا جوتنک دیر بھئی ہری گونداـ ہری گوندا باچھ تو گیو ہے۔ اُساری میں ڈھکی چھپی بات ہوئے تھی موری نجر پڑگئی تو جا چھل کرایو ہے اس نے اس رانڈ سے۔

عورت : جا سب جھوٹ ہے۔ (شیوچرن کی طرف اشارہ کرکے) جا پاپی ہے۔ جھوٹ بولے ہے۔

شیوچرن : جا بھید تو ابھی کھلوجائے ہے۔ با بمن دیوتا کو گھسیٹو لاتو ہوں۔ پنچوں کے بیچ۔ (عورت کی طرف اشارہ کرکے) جا رانڈ تین دنا کہا سا گئی تھی یا بھید بھی کھل جاؤگو۔

(غصہ اور جوش سے تیزی سے دوڑتا ہوا اس طرف جاتا ہے جدھر برہمن گیا ہے اور جدھر سے عورت آئی ہے۔ دو تین نوجوان اور دوڑ کر شیوچرن کے پیچھے جاتے ہیں)۔

(پردہ)

(مطبوعہ: رسالہ 'پگ ڈنڈی' امرتسر، جون 1964)

زمرد کا گلوبند

کردار

(1) بہار (ایک خاتون) (2) بلبل (ایوب کی بچی) (3) صاحب (بہار کا افسر) (4) ڈرائیور (صاحب کا موٹر ڈرائیور) (5) ایوب (ایک کاشتکار) (6) بوڑھا (ڈاک بنگلہ کا ملازم)

منظر

(ایک دیہاتی ڈاک بنگلہ کا کمرہ— جب پردہ اٹھتا ہے تو ڈرائیور اور بہار باتیں کرتے نظر آتے ہیں— بہار ایک کرسی پر بیٹھی ہے جس کے پیچھے میز پر ٹائپ رائٹر اور کاغذات رکھے ہیں— ڈرائیور بہار کے سامنے کھڑا ہے۔ اس کے چہرے سے پریشانی اور اکتاہٹ ظاہر ہو رہی ہے اور بہار مسکرا رہی ہے)۔

ڈرائیور : بی بی جی تمھارے تو نہ کوئی آگے ہے نہ پیچھے، میری تو بیوی ہے بچے ہیں۔ آٹھ دن ہو گئے ہیں کہ ان کی شکل نہیں دیکھی۔ میں تو باز آیا ایسی نوکری سے۔

بہار : رحمت علی یہ نوکری ہے دوسروں کی غلامی۔

ڈرائیور : ہاں ہاں نوکری ہے بی بی جی نوکری۔ دوسرے کی غلامی مگر نوکری کے ساتھ

بیوی بچے بھی ہیں۔ جانے ان کا کیا حال ہوگا۔ بچوں کی ماں روز ہی یاد کرتی ہوگی۔

بہار : (مسکرا کر) تمھاری بیوی تم سے بہت محبت کرتی ہے۔

ڈرائیور : کیوں نہیں، میں بھی تو اس سے محبت کرتا ہوں۔ دو دن الگ، ہوں تو برسوں معلوم ہونے لگتے ہیں۔ (بہار خاموش رہتی ہے جیسے کسی سوچ میں ہو، کچھ دیر خاموش رہتی ہے پھر ڈرائیور اس کا چہرہ دیکھ کر) بی بی جی! تمھارا دل نہیں گھبراتا؟

بہار : گھبراتا کیوں نہیں۔ مگر مجبوری جو ہے۔

ڈرائیور : تم صاحب سے چلنے کو کیوں نہیں کہتیں؟؟

بہار : دیکھتے نہیں بارش نے سب راستے بند کر دیے ہیں۔

ڈرائیور : اگر بارش یونہی ہوتی رہی تو کیا ہم ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو رہیں گے؟

بہار : بارش ہمیشہ تو ہوتی نہیں رہے گی۔

ڈرائیور : مگر یہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ بی بی جی! (بہار ڈرائیور کا چہرہ دیکھتی ہے) یہاں سے تین میل دور ریلوے اسٹیشن ہے وہاں سے ریل مل جاتی ہے۔

بہار : پر تین میل جانا کوئی آسان نہیں؟

ڈرائیور : تین میل! کہاں کے دور ہیں بی بی جی— چٹکی بجاتے گزر جاتے ہیں—

بہار : تمھارے لیے چٹکی بجاتے گزر جائیں گے مگر صاحب—!

ڈرائیور : اب صاحب کوئی چھوئی موئی تو نہیں ہیں کہ تین میل بھی نہ چل سکیں۔ بس بات تمھاری ہے۔ رہا گاڑی کا تو میں پھر آ کر لے جاؤں گا۔ جب راستہ صاف ہو جائے گا۔

بہار : میرا کیا ہے— میں بھی چل لوں گی—

(صاحب داخل ہو کر)

صاحب : ڈرائیور! ہم نے سگریٹ لانے کو کہا تھا۔

ڈرائیور : حضور ڈاک بنگلہ کا ملازم لینے گیا ہے۔

صاحب : ہم نے تم سے کہا، تم نے دوسرے نوکر سے کہا، وہ اپنے بچے سے کہے گا اور ہم کو سگریٹ نہیں ملے گی۔

ڈرائیور : حضور! میں نے یہاں کے راستے نہیں دیکھے اور پھر سنا ہے بازار تین میل دور ہے۔

صاحب : کہاں کا دور ہے— تم جا کر ایک گھنٹے میں واپس آ سکتے تھے—

ڈرائیور : حضور! تین میل دور یہاں سے اسٹیشن ہے۔ وہاں سے ہم کو ریل گاڑی مل سکتی ہے۔

صاحب : بکو مت— اس کیچڑ میں ہم تین میل نہیں چل سکتے۔ (بہار سے مخاطب ہو کر) مس بہار—

بہار : یس سر۔

صاحب : کھانا بہت خراب مل رہا ہے۔

بہار : یس سر۔

صاحب : ہم نے کہا تھا تم پکاؤ۔ بڈھا ملازم کھانا پکانا نہیں جانتا۔

بہار : رات میں میں نے اپنے ہی ہاتھ سے پکایا تھا سر۔

صاحب : تم نے پکایا تھا— اتنا خراب کھانا! تم سے اچھا تو بڈھا پکاتا ہے۔ تم کیسی عورت ہو بالکل فضول بے وقوف۔

بہار : یس سر۔

صاحب : (ایک کاغذ دیتے ہوئے) اس کو ابھی ٹائپ کر دو، اور دیکھو دفتر تار دے دو کہ ہم یہاں پھنس گئے ہیں راستہ صاف ہونے پر روانہ ہوں گے۔

بہار : (کاغذ لیتے ہوئے) یس سر۔

صاحب : اور ہماری وائف کو بھی تار دے دو— وہ بھی یاد کرتی ہوگی۔

بہار : یس سر۔

صاحب : ڈرائیور! جا کر دیکھو نوکر سگریٹ لایا یا نہیں۔

ڈرائیور : بہت اچھا حضور۔

(ڈرائیور چلا جاتا ہے)

صاحب : مس بہار! یہ ڈرائیور کیا بکواس کر رہا تھا—

بہار : اس کو اپنے بیوی بچے یاد آ رہے ہیں۔ وہ جانا چاہتا ہے۔

صاحب : نان سینس! بیوی بچوں کے لیے بے چین ہے۔ (مغرور مسکراہٹ کے بعد) بیوقوف زیادہ بچے پیدا کرنا چاہتا ہے (بہار خاموش رہتی ہے) تم نے کیا کہا؟

بہار : میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔

صاحب : ہمیں بھی اپنے بیوی بچے یاد آ رہے ہیں مگر ہم اس کی طرح بے چین نہیں ہیں—

بہار : سر اس کی خوشیاں صرف بیوی بچوں تک محدود ہیں۔ غریب آدمی ہے—

صاحب : ہم نے اسے غریب نہیں کر دیا— اگر ایسی ہی بے چینی ہے تو نوکری کیوں نہیں چھوڑ دیتا—

بہار : اس لیے کہ— (خاموش ہو جاتی ہے، صاحب سوالیہ انداز میں بہار کو دیکھتے ہیں بہار چند سیکنڈ خاموش رہ کر) میں نوکری نہیں چھوڑ سکتی، آپ نوکری نہیں چھوڑ سکتے۔

صاحب : میں اپنی حالت سے مطمئن ہوں نوکری کیوں چھوڑوں۔

بہار : اس نے بھی مطمئن رہنے کے لیے ہی نوکری کی تھی۔ مگر اس کو اطمینان نہیں ملا۔ بے چینی ملی، پریشانی ملی، ڈانٹ ڈپٹ اور جھڑکیاں تو جیسے اس کا مقدر ہو چکی ہیں—

صاحب : نان سینس! یہ قسمت ہے مس بہار— اس سے لڑا نہیں جا سکتا۔

بہار : بعض لوگ دوسروں کی قسمت پر بھی قبضہ کر لیتے ہیں۔ اس لیے کہ...

صاحب : (غصہ سے) سب بکواس ہے۔

بہار : یس سر—

صاحب : مس بہار! تم بعض اوقات اول فول بکنے لگتی ہو۔

بہار : مگر سر—

صاحب : نو— نو— نو— میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ (دروازہ کی جانب جاتے ہوئے) اس نوٹ کو ابھی ٹائپ کر دو اور دیکھو اسپیلنگ کی غلطیاں نہ ہوں۔ خیال رکھنا۔

بہار : لیس سر—

(صاحب دوسرے کمرہ میں چلے جاتے ہیں۔ بہار جاکر ٹائپ مشین کے پاس بیٹھ جاتی ہے۔ ٹائپ کے رولر پر کاغذ لگا کر صاحب کا نوٹ پڑھنے لگتی ہے۔ پھر کاغذ میز پر رکھ کر دونوں ہاتھ سر پر پھیر کر بال برابر کرتی ہے اور کی بورڈ پر انگلیاں رکھ کر ٹائپ کرنے لگتی ہے— کچھ دیر بعد ڈاک بنگلہ کا ملازم داخل ہوکر)

بوڑھا : بی بی جی! سلام۔

بہار : سلام بابا۔ آگئے۔

بوڑھا : ہاں بی بی جی— ایسی بارش تو زندگی میں نہیں دیکھی۔

بہار : ہاں— تھمنے کا نام ہی نہیں لیتی—

بوڑھا : سب راستے کیچڑ سے اٹے پڑے ہیں— گھٹنوں گھٹنوں پانی ہے۔ پندرہ سال سے اس ڈاک بنگلہ میں ہوں مگر ایسی حالت نہیں دیکھی۔

بہار : تمھیں بازار جانے میں بڑی تکلیف ہوئی ہوگی۔

بوڑھا : بیوی بچوں کی خاطر سب کچھ ہی کرنا پڑتا ہے بی بی جی۔

بہار : تمھارے بیوی بچے کچھ کام نہیں کرتے؟

بوڑھا : (مسکرا کر) بچے تو ابھی چھوٹے چھوٹے ہیں بی بی جی—

بہار : اور بیوی!؟

بوڑھا : (تعجب سے مسکرا کر) تو کیا اس سے نوکری کراؤں بی بی جی!

بہار : کیا حرج ہے۔ یہ تو تمھارا ہاتھ بٹانا ہوگا۔

بوڑھا : اور گھر کا کام کاج— روٹی پکانا، کپڑوں کا سینا پرونا اور بچوں کی دیکھ بھال—

کیا یہ ہاتھ بٹانا نہیں ہے—؟

بہار : مگر بابا— اس بڑھاپے میں تکلیف ہوتی ہوگی۔ کوئی نہ کوئی سہارا تو ہونا ہی چاہیے—

بوڑھا : بی بی جی۔ جب بیوی بچوں کو خوش دیکھتا ہوں تو مجھے سہارا مل جاتا ہے۔ مجھ میں اور طاقت آجاتی ہے۔ جب میں کما کر دو پیسے بھی اس کے ہاتھ پر رکھتا ہوں تو دونوں ہی کو خوشی ہوتی ہے۔ اس خوشی کا حال اپنے میاں سے پوچھو۔

بہار : (مسکرا کر) میرے میاں!

بوڑھا : ہاں ہاں— یہ صاحب—

بہار : (مسکرا کر) وہ میرے شوہر نہیں ہیں۔

بوڑھا : (تعجب سے) شوہر نہیں ہیں! اور تم ان کے ساتھ اکیلی پڑی ہوئی ہو! پھر کون ہیں یہ؟

بہار : (مسکرا کر) وہ تو میرے افسر ہیں بابا۔

بوڑھا : تو تم نوکری کرتی ہو!

بہار : ہاں— کیا برائی ہے نوکری کرنے میں؟

بوڑھا : برائی! (کچھ دیر خاموش رہ کر) کوئی برائی نہیں۔ معاف کرنا بی بی جی— میں بوڑھا بیوقوف آدمی ہوں۔

بہار : (مسکرا کر) تو تم انھیں میرا شوہر سمجھتے رہے ہو۔

بوڑھا : ہاں۔ بی بی جی! بلکہ میں نے تو اپنی بیوی سے یہ بھی کہا تھا کہ دیکھ بی بی جی اپنے شوہر کا کتنا، کہنا مانتی ہیں۔ پر تو تو میری ہر بات میں میں میخ نکالتی ہے۔

بہار : بابا افسر کی ہر بات پر تو یس سر کہنا ہی پڑتا ہے۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) کیوں بابا! کبھی تمھاری بیوی سے تمھاری لڑائی تو نہیں ہوتی—

بوڑھا : ہوتی کیوں نہیں— مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ جلد ہی ختم بھی ہوجاتی ہے۔

بہار : (مسکرا کر) کیسے ختم ہوجاتی ہے؟

بوڑھا : میاں بیوی کی لڑائی کیا بی بی جی— کبھی وہ مجھ کو منا لیتی ہے اور کبھی میں

اس کو (بہار مسکراتی ہے) اور اگر بی بی جی وہ بھی کمانے لگے تو لڑائی کبھی ختم ہی نہ ہو—

بہار : (مسکرا کر) کیوں بابا؟

بوڑھا : اب میں تمھیں سمجھاؤں— رشید کی بیوی ہے مزدوری کر کے کماتی ہے اور روز رشید سے لڑتی ہے۔ اس کی بات سننے کی برداشت نہیں پر جہاں مزدوری کرتی ہے وہاں مالک کی ہر بات پر جی سرکار جی سرکار کرتی رہتی ہے اور ان کی ہر بات میں ہاں میں ہاں ملاتی ہے۔ بی بی جی برا نہ ماننا پرانے خیال کا بوڑھا ہوں—

بہار : (سوچتے ہوئے) نہیں نہیں بابا کوئی بات نہیں۔

بوڑھا : اب بی بی جی—! میں کہتا ہوں اگر عورت شوہر کی دو باتیں برداشت کر لے تو کہاں کی برائی ہے اور پھر بی بی جی شوہر کی تو دو باتیں ٹالی بھی جاسکتی ہیں— مگر صاحب کی کوئی بات ٹالی نہیں جاسکتی۔

بہار : (مسکرا کر) ہاں بابا سچ ہے۔

بوڑھا : بی بی جی— برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟

بہار : ہاں ہاں بابا پوچھو۔

(بہار مسکرا کر کرسی پھیر کر بوڑھے کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتی ہے)

بوڑھا : بی بی جی برا نہ ماننا۔ میں تو پرانے خیال کا بوڑھا ہوں۔ (بہار مسکراتی ہے۔ مجھے آج کل کی باتیں ذرا نئی لگتی ہیں۔ کیا تمھیں یہ اچھا لگتا ہے کہ لوگ تمھارے متعلق کچھ کچھ سوچیں۔

بہار : کچھ کچھ! (مسکرا کر) میں تمھاری بات نہیں سمجھی بابا—؟

بوڑھا : یہی کہ جیسے میں نے تم کو صاحب کی بیوی سمجھ لیا۔ (بہار کے چہرہ پر سنجیدگی پیدا ہوجاتی ہے اور وہ کچھ سوچنے لگتی ہے بوڑھا اس کا چہرہ غور سے دیکھ کر) بی بی جی برا نہ ماننا۔ ایک خیال دل میں گزرا تھا۔

بہار : کوئی بات نہیں بابا— اب اگر لوگ غلطیاں کریں تو میرے اوپر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔

بوڑھا : مگر لوگوں کو بری بات کہتے زبان بھی تو نہیں پکڑی جا سکتی۔

بہار : کسی کی زبان کون پکڑ سکتا ہے بابا— ہمیں اپنے پر اعتماد ہونا چاہیے۔

بوڑھا : بی بی جی! میں تم پر اعتراض نہیں کر رہا۔ بوڑھا بیوقوف آدمی ہوں۔ جو دل میں آتا ہے بک دیتا ہوں۔ ایک بات کہوں برا تو نہ مانو گی۔

بہار : (جو کسی گہری سوچ میں مبتلا ہو چکی ہے)—

بوڑھا : بی بی جی— عورت بی بی فاطمہ کی طرح نیک کیوں نہ ہو پر اس کے متعلق کوئی بری بات کہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کی عزت جاتی رہتی ہے (بہار خاموش رہتی ہے اور کوئی جواب نہیں دیتی— چند منٹ بالکل خاموش رہتی ہے۔ بوڑھا بہار کا چہرہ دیکھ کر) برا مان گئیں بی بی جی؟ (بہار اب بھی خاموش رہتی ہے بوڑھا دروازہ کی طرف پلٹ کر) میں تو بھول ہی گیا۔ آج صبح ایوب میاں آگئے ہیں۔ ان کی خبر لوں جا کر—

بہار : (ایک دم چونک کر) ایوب میاں!

بوڑھا : ہاں پاس کے گاؤں میں اِن کی کاشت ہے۔ بڑے بھلے مانس ہیں (بہار خاموش رہتی ہے بوڑھا دروازہ کے پاس جا کر) بی بی جی! میری باتوں کا برا نہ ماننا۔ (بہار اب بھی خاموش رہتی ہے، بوڑھا چند سیکنڈ رکتا ہے پھر پلٹ کر) بی بی جی! (بہار گردن اٹھا کر دیکھتی ہے) کیا تمھاری شادی نہیں ہوئی—!؟

بہار : ہوئی تھی بابا— طلاق ہو گئی۔

بوڑھا : طلاق!

(بڑے تعجب سے بہار کا چہرہ دیکھتا ہے۔ کچھ دیر سوچتا ہے اور پھر اس طرح سوچتا ہوا کمرہ سے باہر نکل جاتا ہے جیسے مزید سوال کی ضرورت نہیں۔ بہار کچھ دیر بیٹھی ہوئی سوچتی رہتی ہے۔ پھر پلٹ کر ٹائپ کرنے لگتی ہے۔ چند

منٹ بعد رولر میں سے کاغذ نکال کر پڑھتی ہے اور پھر اس طرح پھاڑ ڈالتی ہے جیسے سب کچھ غلط ہوگیا ہو— دوسرا کاغذ رولر میں لگاتی ہے۔ پھر سر پر ہاتھ پھیر کر ٹائپ کرنے کے لیے تیار ہوتی ہے کہ ایک چھ سات سالہ بچی داخل ہوکر بہار کی طرف بڑھتے ہوئے)

بچی : ممی! آداب۔ (بہار پلٹ کر بچی کو دیکھتی ہے) بچی پہلے تو سہم جاتی ہے مگر پھر ذرا ہمت کرکے آگے بڑھتے ہوئے) آپ میری ممی ہیں نا— (بہار اب بھی کوئی جواب نہیں دیتی مگر محبت بھری نظروں سے بچی کو غور سے دیکھتی رہتی ہے، بچی سہم کر کھڑی ہوجاتی ہے) پاپا نے کہا تھا کہ آپ میری ممی ہیں—

بہار : (مسکرا کر) آجاؤ آجاؤ— کہاں ہیں تمھارے پاپا—

بچی : دوسرے کمرے میں ہیں— ابھی تو انھوں نے بتلایا تھا کہ آپ میری ممی ہیں— جب آپ برآمدہ میں کھڑی تھیں—

(بچی بہار کے ذرا اور قریب ہوجاتی ہے، بہار ہاتھ بڑھا کر بچی کو پکڑ لیتی ہے اور محبت سے اسے گود میں بٹھا کر پیار کرتے ہوئے)

بہار : تم بڑی پیاری بچی ہو— کیا نام ہے تمھارا؟

بچی : بلبل!

بہار : بلبل! بڑا ہی پیارا نام ہے۔ کس نے رکھا ہے یہ نام۔

بلبل : پاپا نے— وہ مجھے بہت پیار کرتے ہیں۔

بہار : اچھا—

(بہار مسکراتی ہے اور کچھ دیر سوچ کر بچی کو پھر محبت سے پیار کرتی ہے اور کچھ کہنا ہی چاہتی ہے کہ ایوب کمرے میں داخل ہوکر)

ایوب : ارے بلبل تو یہاں کیا کررہی ہے؟

(بہار نظریں اٹھا کر ایوب کو دیکھتی ہے، بلبل بہار کی گود سے کود کر ایوب کی طرف دوڑتے ہوئے)

بلبل : میں ممی کے پاس آئی تھی پاپا!

بہار : آپ! یہاں؟

ایوب : ہاں چند گھنٹوں کے لیے یہاں ٹھہر گیا تھا— بوڑھا ملازم بڑا مخلص آدمی ہے۔ جب یہاں سے گزرتا ہوں تو اس کے پاس ٹھہرنا ہی پڑتا ہے۔

بہار : کب واپس جائیں گے آپ؟

ایوب : بس ابھی— پاس والے گاؤں میں میری کاشت ہے، اور کل بلبل کی سالگرہ کا دن بھی ہے— کل یہ سات سال کی ہو جائے گی—

بہار : بڑی پیاری بچی ہے۔

ایوب : یہ ایک سال کی تھی جب اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ بڑی محنت کرنا پڑی ہے اسے پالنے میں۔

بہار : پھر آپ نے دوسری شادی نہیں کی؟

ایوب : (مسکرا کر) ہاں تیسری شادی نہیں کی۔ اور اب ارادہ بھی نہیں ہے۔ (بہار کچھ سوچنے لگتی ہے۔ ایوب چند سیکنڈ خاموش رہ کر) کیا تم اپنے شوہر سے مجھے متعارف نہیں کراؤ گی—؟

بہار : میرا شوہر!!

ایوب : کیوں؟ اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ میں ایسا گیا گزرا نہیں ہوں کہ لوگوں سے ملاقات کے قابل بھی نہ ہوسکوں۔

بہار : اوہ— وہ (مسکرا کر) وہ مرے شوہر نہیں ہیں۔

ایوب : شوہر نہیں ہیں! مگر بوڑھے نے تو مجھے یہی بتلایا تھا۔

بہار : وہ میرے افسر ہیں—

ایوب : افسر! (تعجب سے) کیا تم نے نوکری کر لی ہے؟

بہار : ہاں— آپ سے طلاق کے بعد ہی میں نے نوکری کر لی تھی۔ میں ان کی پرائیویٹ سکریٹری ہوں۔

ایوب : پھر تو خوب آرام سے گزر رہی ہوگی ــ؟

بہار : آرام سے! (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) میں اس زندگی سے اکتا چکی ہوں۔

ایوب : اکتا چکی ہو! تم نے تو اسی زندگی کے لیے مجھ سے طلاق لی تھی۔

(بہار کا چہرہ غور سے دیکھتا ہے۔ بہار خاموش رہتی ہے)

چھوڑ دو اس نوکری کو کوئی دوسری کرلو۔ (طنزیہ) تبدیلی تو زندگی میں لہر پیدا کرتی ہے۔

بہار : نہیں ــ یہ بات نہیں ــ!

(بہار سوچنے لگتی ہے، ایوب سوالیہ انداز میں اس کا چہرہ دیکھنے لگتا ہے کہ شاید وہ کچھ اور کہے، مگر بہار خاموش رہتی ہے۔ بلبل کبھی ایوب کو اور کبھی بہار کو حیرت سے دیکھتی ہے۔ چند منٹ خاموش رہتی ہے۔

بلبل : ممی! آپ ہمارے گھر کیوں نہیں چلتیں؟

(ایوب بلبل کا ہاتھ پکڑ کر)

ایوب : آؤ بیٹی۔ چلیں ــ

(دروازہ کی جانب جاتا ہے، بہار چند سیکنڈ خاموش رہ کر)

بہار : سنیے! (ایوب پلٹ کر سوالیہ انداز میں بہار کو دیکھتا ہے) کیا بلبل کو تھوڑی دیر آپ میرے پاس نہیں چھوڑ سکتے۔

ایوب : کوئی حرج نہیں، مگر میں ابھی روانہ ہوجانا چاہتا ہوں۔

بہار : اس بارش اور کیچڑ میں!

ایوب : بارش اور کیچڑ ــ (مسکرا کر) میں تو اس کا عادی ہوں اور پھر کل بلبل کی سالگرہ ہے ــ آج مجھے کچھ تیاریاں کرنی ہیں۔ اور چند دوست بھی آج گاؤں پہنچنے والے ہیں۔

بلبل : پاپا ــ ممی کو بھی لے چلیے ــ میں انھیں اپنی گڑیوں کا گھر دکھلاؤں گی۔ (بہار کو دیکھ کر) ممی! میں نے گڑیوں کا گھر خوب سجایا ہے۔

(دوسرے کمرہ سے آواز)

صاحب : مس بہار!

بہار : یس سر۔

صاحب : ڈرائیور سگریٹ لایا؟

بہار : نو سر—

صاحب : (کمرہ میں داخل ہوکر) سب نمک حرام ہیں— حرام خور (بہار کھڑی ہوجاتی ہے، صاحب ایوب کی طرف دیکھ کر) آپ کی تعریف؟

ایوب : میں ایک کاشتکار ہوں۔ میرا نام ایوب ہے۔

صاحب : آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟

ایوب : (مسکرا کر) کچھ نہیں۔

صاحب : (ایوب کی مسکراہٹ سے چڑ کر طنزیہ) میرا مطلب ہے کہ جناب کی تشریف آوری کا مقصد کیا ہے؟

ایوب : (اسی لہجے میں مگر طنزیہ مسکراہٹ سے) میں نے جناب کی خدمت میں عرض کیا کہ— "کچھ نہیں۔"

بلبل : (ایک دم ہنس کر) پاپا— یہ آدمی تو شنکر سے بھی زیادہ موٹا ہے۔

صاحب : (غصہ سے بلبل کو دیکھ کر) نان سینس۔ (بہار سے مخاطب ہوکر) نوٹ ٹائپ کرلیا؟

بہار : ابھی کرتی ہوں۔

صاحب : تار روانہ کردیے؟

بہار : ابھی نہیں۔ ڈرائیور جانے کہاں غائب ہے۔

صاحب : نان سینس— تم سب نمک حرام ہو۔

بہار : (کسی قدر برہم ہوکر) سر! ہم لوگ جانور نہیں ہیں۔ انسان ہیں۔

صاحب : جانور! نان سینس— مس بہار! تم نوکر ہو یہ تمھاری ڈیوٹی ہے (بہار خاموش

رہتی ہے، صاحب ایوب کی طرف دیکھ کر) تمھیں ایسے فضول لوگوں سے باتوں سے کہاں فرصت ہے؟

ایوب : مسٹر! آپ بہار کے افسر ہوسکتے ہیں میرے نہیں! مجھے فضول کہنے کا تمھیں کیا حق ہے؟

صاحب : نان سینس! مین۔

ایوب : شٹ اَپ۔

بہار : مسٹر ایوب۔ پلیز۔ میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ خاموش رہیے۔

ایوب : کیوں خاموش رہوں۔ وہ تمھارے افسر ہوسکتے ہیں، تم لیس سر لیس سر کرتی رہو۔ میں ایک آزاد انسان ہوں اور جیسے کو تیسا جواب دینا جانتا ہوں۔

صاحب : مسٹر ایوب! آپ جاسکتے ہیں۔

ایوب : کیوں؟— نہ میں آپ کے پاس نوکری کی درخواست لے کر آیا ہوں اور نہ کسی نفع کی توقع سے اور پھر یہ ڈاک بنگلہ آپ کی ذاتی جاگیر بھی نہیں ہے؟

صاحب : آپ بے حد ضدی معلوم ہوتے ہیں۔

ایوب : جی نہیں! میں بلاوجہ کسی کے رعب میں آنے کا عادی نہیں ہوں—

صاحب : مس بہار! (بہار خاموش رہتی ہے، صاحب بہار کا چہرہ دیکھ کر جس پر اکتاہٹ کے آثار ہیں اور جو کسی گہری سوچ میں ہے) مس بہار!! (بہار اب بھی خاموش رہتی ہے۔ صاحب جھنجھلا کر بلند آواز سے) مس بہار!!!

بہار : (چونک کر) جی!

(صاحب بہار کو اس طرح دیکھتے ہیں کہ جیسے اس نے "جی" کہہ کر ان کی بڑی توہین کی ہو)

صاحب : ان صاحب سے تمھارا کیا تعلق ہے؟

(بہار خاموش رہتی ہے، ایوب مسکرا کر بہار کو دیکھتا ہے پھر بلبل کا ہاتھ پکڑ کر)

ایوب : آؤ بیٹی چلیں۔

(بلبل بہار کو دیکھتی ہے اور پھر ایوب کے ساتھ کمرہ سے نکل جاتی ہے)

صاحب : مس بہار! میں نے پوچھا اس شخص سے تمھارا کیا رشتہ ہے؟

بہار : (سوچتے ہوئے) مسٹر ایوب سے؟

صاحب : ہاں۔ بے حد ضدی اور بدتمیز انسان ہے۔۔

بہار : وہ میرے شوہر رہ چکے ہیں (کسی قدر اکتاہٹ سے) آپ کو ان سے ایسی گفتگو نہیں کرنا چاہیے تھی۔

صاحب : نان سینس۔۔ تمھیں میرے اوپر اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے تم میری ماتحت ہو۔۔

بہار : لیکن آپ کو بھی میرے جذبات کو مجروح کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

صاحب : جذبات! نان سینس۔۔ نوکری میں جذبات سے کام نہیں لیا جاتا۔۔

بہار : (کسی قدر بگڑ کر) مگر نوکری کے بعد انسان پتھر یا مشین بھی نہیں بن جاتا۔

صاحب : تمھارا اب اس سے کیا تعلق ہے۔ جو تم اس کی اس قدر ہمدرد بن رہی ہو۔ بے حد فضول اور بدتمیز ہے۔

بہار : فضول اور بدتمیز! آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہ ہو مگر پھر بھی ایک جذباتی لگاؤ باقی ہے۔ سب سے پہلے وہ میری زندگی میں داخل ہوا تھا۔

صاحب : پھر تم نے نوکری کیوں کی تھی۔ طلاق کیوں لی تھی۔ کیا تم کو پتہ نہیں تھا کہ نوکری میں خودداری نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔۔

بہار : میں نے زندگی میں بہت سی غلطیاں کی ہیں اور اب ان کا اعادہ کرنا نہیں چاہتی (غصہ سے) میں نے سمجھا تھا کہ آزاد زندگی آرام کی زندگی ہے۔۔ لیکن اب مجھے پتہ ہوگیا ہے کہ یہ میرا وہم تھا۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) میں نے سمجھا تھا کہ شوہر کی لگائی ہوئی پابندیاں میری آزادیوں میں رکاوٹ ہیں مگر اب محسوس کررہی ہوں کہ ان میں خلوص ہمدردی اور محبت کے جذبات تھے۔

صاحب : نان سینس۔تم جذباتی ہوتی جارہی ہو۔۔

بہار : بلاشبہ۔۔ اب میں آپ کی غلامی سے عاجز آچکی ہوں،شوہر کی اطاعت میں ایک سکون ہے مگر آپ کی اطاعت میں ذہنی، دماغی کوفت اور بدنامی۔۔

(بہار رونے لگتی ہے، صاحب نان سینس کہتے ہوئے دوسرے کمرہ میں چلے جاتے ہیں۔ بہار چند منٹ روتی رہتی ہے اور اس دوران میں وہ اپنے آنسوؤں پر بھی قابو پانے کی کوشش کرتی ہے اور بار بار اپنے پلو سے آنسو پونچھتی ہے۔ پھر کرسی پر بیٹھ کر کچھ سوچنے لگتی ہے۔۔ بوڑھا داخل ہوکر)

بوڑھا : بی بی جی میں یہ سگریٹ لے آیا تھا۔ دینا بھول گیا۔

بہار : (نیچی نظروں سے) میز پر رکھ دو بابا۔

بوڑھا : (میز پر سگریٹ کا ٹین رکھتا ہے اور بہار کو غور سے دیکھ کر) تم رو رہی ہو بی بی جی! کیا بات ہے؟

بہار : کوئی بات نہیں بابا۔

بوڑھا : نہیں۔۔ کوئی بات ضرور ہے۔۔ کیا ماں باپ بہن بھائی کی یاد ستارہی ہے۔

بہار : میرا کوئی نہیں ہے بابا۔

بوڑھا : کوئی نہیں ہے! یہ تو بہت برا ہے۔ کیا صاحب ناراض ہوگئے؟

بہار : (آنسو پونچھ کر) نہیں بابا۔ آج نہ معلوم کیوں اس بڑی دنیا میں اپنے آپ کو اکیلی محسوس کررہی ہوں۔

بوڑھا : اکیلی! مگر بی بی جی...

بہار : (قطع کلام کر کے) بابا۔ میں نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا کہ میں اکیلی ہوں۔ میں نے زندگی کو ایک مسلسل کام سمجھا تھا مگر آج (بوڑھا اس کا چہرہ غور سے دیکھتا ہے) میں کام سے تھک چکی ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک شکستہ کشتی پر سوار ہوں اور میرا کوئی مدد کرنے والا نہیں۔ (بوڑھا حیرت سے بہار کا چہرہ دیکھتا ہے بہار کچھ دیر خاموش رہ کر) بابا۔ کیا ایوب میاں گئے؟

بوڑھا : ابھی نہیں — جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ کیوں بی بی جی؟

بہار : میں ان سے ملنا چاہتی ہوں — ان کی بچی بہت پیاری ہے۔

بوڑھا : ہاں بہت پیاری بچی ہے۔ وہ تو اکثر اس ڈاک بنگلہ میں آ کر ٹھہرتے ہیں۔ بڑے بھلے مانس ہیں۔ کل تو میرے سب بچے ان کے ہاں جائیں گے۔ بلبل بٹیا کی سالگرہ ہے۔

بہار : بابا کتنی دور ہے ان کا گاؤں۔

بوڑھا : یہی کوئی دو تین کوس۔ کیا تم ان کو جانتی ہو۔

بہار : ہاں بابا — میری شادی انہی سے ہوئی تھی۔

بوڑھا : کیا بلبل تمھاری بیٹی ہے!

بہار : نہیں بابا۔ مگر ابھی اس نے مجھے ممی کہا تھا۔ مجھے بڑی بھلی معلوم ہوئی تھی۔ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔ کیا وہ ایک بار آ جائیں گے۔

بوڑھا : کیوں نہیں۔ وہ میرا کہنا کبھی نہیں ٹالتے۔

(بوڑھا کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ بہار کچھ دیر سوچتی رہتی ہے پھر ٹائپ کی طرف مڑ کر ٹائپ کرنے لگتی ہے۔ صاحب پھر کمرہ میں داخل ہو کر)

صاحب : نوٹ ٹائپ ہو گیا مس بہار!

بہار : (اپنے کام میں مشغول رہتے ہوئے) ابھی نہیں —

صاحب : نان سینس — پھر یہ کیا ہو رہا ہے؟

بہار : میں اپنا استعفیٰ ٹائپ کر رہی ہوں۔

صاحب : نان سینس۔ کیا مطلب ہے؟

بہار : استعفیٰ کا مطلب نوکری چھوڑنا ہوتا ہے۔ اب میں نوکری کرنا نہیں چاہتی —

صاحب : نان سینس —

(غصہ میں کمرہ میں ٹہلنے لگتے ہیں۔ بہار ٹائپ کرتی رہتی ہے کچھ دیر بعد بوڑھا داخل ہو کر)

بوڑھا : بی بی جی — ایوب میاں تو جا چکے ہیں۔

بہار : (پلٹ کر بوڑھے کو دیکھ کر) جا چکے ہیں؟

(ایک دم خاموش ہو جاتی ہے)

بوڑھا : میں تمھیں ان کے گاؤں تک پہنچا سکتا ہوں — نزدیک ہی ہے۔

بہار : ہاں بابا — پہنچا دو۔ میں کل بلبل کی سالگرہ میں شرکت کرنا چاہتی ہوں —

(کاغذ رول میں سے نکال کر اس پر دستخط کرتی ہے اور صاحب کی طرف دیکھ کر کاغذ میز پر رکھتے ہوئے) یہ میرا استعفیٰ ہے۔

صاحب : نان سینس۔

(پردہ)

(مطبوعہ: رسالہ 'شاہراہ' دہلی، جنوری 1960)

طوفان

کردار

(1) مسٹر زیڈ (پولیس کا افسر) (2) مسٹر ایکس (محکمۂ جاسوسی کا افسر) (3) مسٹر ی (ایک باغی) (4) مسٹر آر (دوسرا باغی) (5) بڑھیا (آزادی کی خواہشمند ایک جوشیلی عورت) (6) نوجوان (بڑھیا کا لڑکا) (7) مالک ہوٹل (ایک سرمایہ دار)

منظر

(ایک ہوٹل کا کمرہ۔ کمرہ ہوٹل کے بالائی حصہ کا ہے چونکہ اس قصبہ میں یہی ایک ہوٹل ہے اور حکومت کے اراکین اکثر اس ہوٹل میں قیام کرتے ہیں، اس واسطے بہترین فرنیچر سے آراستہ ہے۔ تمام کمرے میں دری کا فرش ہے، مشرقی جانب ایک دروازہ ہے جس پر ریشمی پردے پڑے ہوئے ہیں۔ دروازے کے سامنے ایک برآمدہ نظر آرہا ہے جس پر ایک آرام کرسی پڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ جنوبی دروازے سے لگی ہوئی ایک مسہری بچھی ہے جس پر صاف و شفاف بستر ہے۔ اس کے پاس ایک چھوٹی سی میز ہے، اس پر ایک ٹیبل لیمپ رکھا ہے، جس پر سبز شیشے کا شیڈ ہے۔ میز پر دوچار اخبار بھی پڑے ہیں۔

کمرے کے مغربی جانب ایک کھڑکی ہے جس پر دروازے کی طرح ریشمی پردے ہیں اس وقت پردے ہٹے ہوئے ہیں۔ کھڑکی میں کھڑے ہوجانے سے ایک سڑک دکھائی دیتی ہے۔ اس پر ہمیشہ ٹرافک رہتا ہے، جس کے باعث کمرے میں شور وغل کی آواز آتی رہتی ہے۔

کھڑکی میں سے کچھ فاصلے پر پہاڑ نظر آتے ہیں اور ان پہاڑوں پر بہتی ہوئی ایک تیز روندی دکھائی دیتی ہے جس کے بہنے کی آوازیں اکثر خاموشی میں اس کمرے میں سنائی دیتی ہیں۔ موسم اس وقت طوفانی ہے۔ بادل چھائے ہوئے ہیں۔ تیز ہوا چل رہی ہے اور بجلی بھی کبھی کبھی ایک کڑاکے کے ساتھ چمک جاتی ہے۔ مسٹر زیڈ کھڑکی میں کھڑا، ندی کی تیزی، بادلوں کی گرج ہوا کے طوفان اور بجلی کی چمک سے قطع نظر اس وقت اپنی نگاہیں ٹرافک پر جمائے ہوئے ہے، لوگوں کے ہجوم۔ گاڑیوں اور موٹروں کی بھاگ دوڑ، پولیس اور فوج کی غیر معمولی مصروفیات اس وقت کسی غیر معمولی حادثہ کی جانب اشارہ کررہی ہیں— مسٹر زیڈ ایک دراز قد انسان ہے، مونچھیں بڑی بڑی ہیں اور آنکھیں اندر دھنسی ہوئی، سیاہی مائل سوٹ پہنے ہے۔ وہ خاموشی سے کھڑا سڑک پر نظریں جمائے رہتا ہے، چند منٹ کے بعد مسٹر ایکس داخل ہوتا ہے مسٹر ایکس پستہ قد ہے، جسم بھرا ہوا ہے اور باتیں کرتے وقت آنکھوں کو مستقل طور پر مٹکاتا رہتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انتہائی خطرناک اور چالاک انسان ہے کمرے میں داخل ہوکر مسٹر زیڈ کو فوجی سلام کرتا ہے اور پھر خاموش کھڑا ہوجاتا ہے۔ مسٹر زیڈ مسٹر ایکس کو دیکھ کر۔

مسٹر زیڈ : قاتل کا کوئی پتہ چلا؟

مسٹر ایکس : حضور والا— ابھی تک نہیں۔

مسٹر زیڈ : (غصہ سے) ابھی تک نہیں— یہ ہماری کمزوری اور حکومت کی توہین ہے (سوچتے ہوئے) اور پھر قاتل کی سراغرسانی پر تو دو ہزار روپے انعام بھی مقرر ہے۔

مسٹر ایکس : حضور والا! ضرور مقرر ہے، لیکن یہاں بغاوت کے آثار ہیں۔ اب حکومت کو

اپنا رویہ تبدیل کرنا پڑے گا۔ سختی سے کام چلتا نظر نہیں آتا۔

مسٹر زیڈ : بغاوت؟ اس حکومت کے خلاف بغاوت جوان کی عزت۔ ناموس۔ امن وسکون اور دولت کی حفاظت کرتی ہے— (غصے سے) یہ بغاوت نہیں سرکشی ہے۔

مسٹر ایکس : حضور والا! سرکشی اور بغاوت ہم معنی ہیں۔ حفاظت ہی مقصود ہے تو پیار اور ظلم کا اتحاد ہونا چاہیے— ایک طرفہ وزن پلڑے کو زمین سے اٹھنے نہیں دیتا۔

مسٹر زیڈ : (مسٹر ایکس کو غور سے دیکھ کر) تم حکومت کی مشینری کے ایک پرزے ہو، تمھارے اوپر حکومت کی بنیادیں ہیں اگر تم ڈگمگائے تو دیواریں گر پڑیں گی۔ تمھیں مستقل مزاج ہونا چاہیے۔

مسٹر ایکس : میرے قدم کبھی نہیں ڈگمگاتے— لیکن اب میں روزانہ کی اطلاعات سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حکومت کو اپنا رویہ تبدیل کرنا چاہیے۔ ورنہ یہ قصر استبداد منہدم ہوتا نظر آتا ہے۔

مسٹر زید : (غصے سے) میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ تمھارے خیالات پر بھی وہی فضا اثر انداز ہے، جو میں نے اس گندے قصبے میں آکر محسوس کی ہے۔

(مسٹر ایکس فوجی سلام کر کے کمرے سے نکل جاتا ہے مسٹر زیڈ کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے، چہرے کے اتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ذہنی پریشانی میں مبتلا ہے کمرے میں ٹہلتا رہتا ہے، کچھ دیر بعد آہستہ آہستہ بڑبڑاتا ہے)۔

مسٹر زیڈ : محکمۂ جاسوسی ناکام ہو چکا ہے! وہ محکمہ جس کے بل بوتے پر آج تک عوامی تحریکوں کو کچلا گیا ہے، سرکش جماعتوں کے پرخچے اڑائے گئے ہیں۔

(پھر خاموشی سے کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد مالک ہوٹل میں داخل ہوتا ہے۔ بہت موٹا تازہ اور بے ڈول انسان ہے۔ مسٹر زیڈ کو سلام کر کے)

مالک ہوٹل : حضور والا! کیا آج شام کھانے کا انتظام ہوٹل میں ہوگا— یا— (مسٹر زیڈ کا چہرہ طنز آمیز نگاہوں سے دیکھ کر) آج بھی آپ کہیں مدعو ہیں۔

(مسٹر زیڈ مالک ہوٹل کو سر سے پیر تک دیکھتا ہے جیسے اس نے اس طنز کو محسوس کر لیا ہے)

مسٹر زیڈ : میں آج کھانا ہوٹل ہی میں کھاؤں گا— مگر دیکھو— میں اس قدر چارج ادا کرنے کو تیار نہیں۔

مالک ہوٹل : لیکن حضور—

مسٹر زیڈ : (قطع کلام کرکے) تم لوگ تو چاہتے ہو کہ ہم کو جس قدر الاؤنس حکومت کی جانب سے ملتا ہے وہ سب تمھاری نذر کر جائیں۔ میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کھانا اور اڑانا جانتے ہیں۔ میں ہر روپیہ میں سے کچھ نہ کچھ پس انداز کرنا چاہتا ہوں سمجھے۔

مالک ہوٹل : سمجھ گیا سرکار۔

مسٹر زیڈ : ہاں دو روپے سے زیادہ نہ ہو۔ مین کھانے کا بل اس سے زیادہ ادا کرنے کو تیار نہیں— مجھے صرف پچیس روپے یومیہ ہی تو الاؤنس ملتا ہے (پھر کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ مالک ہوٹل سلام کرکے دروازے کی جانب جاتا ہے۔ مسٹر زیڈ مالک ہوٹل سے مخاطب ہوکر)

مسٹر زیڈ : اور ہاں بھئی— ایک بات تو اور سنو۔

مالک ہوٹل : (رُک کر) فرمایئے۔

مسٹر زیڈ : (مالک ہوٹل کے پاس آکر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر) تمھارے اس ہوٹل میں تو ہر قسم ہی کے لوگ آتے ہوں گے!

مالک ہوٹل : جی ہاں۔

مسٹر زیڈ : کیا تم ان میں سے کسی پر شک کر سکتے ہو جس نے قصبہ کے مجسٹریٹ کا قتل کیا ہے۔

مالک ہوٹل : حضور والا! بہت مشکل ہے۔ لوگ اس قسم کی گفتگو ہوٹل اور سرعام کرتے ہوئے گریز کرتے ہیں۔

مسٹر زیڈ : تم ہماری کچھ رہنمائی کرو۔ (دو انگلیاں اٹھا کر اوپر زور دیتے ہوئے) دو ہزار انعام مقرر ہے۔

مالک ہوٹل : دو ہزار!— (کچھ اس انداز سے کہتا ہے جیسے کسی نے دو ہزار روپیہ اُس کے ہاتھ میں رکھ دیا ہے) لیکن سرکار معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام کسی جماعت کا ہے فرد کا نہیں۔

مسٹر زیڈ : (کچھ سوچتے ہوئے) ہاں۔ ہمارے محکمہ جاسوسی کو بھی یہی اطلاع ملی ہے کہ یہاں کوئی دہشت پسند جماعت موجود ہے، اس میں لوگ شامل ہیں اس کا کوئی پتہ نہیں چل سکا ہے۔

مالک ہوٹل : اور ایسے لوگ عام شہریوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کا شناخت کرنا سخت دشوار ہے۔

(کمرے میں کچھ دیر کامل خاموشی رہتی ہے۔ مسٹر زیڈ کمرے میں ٹہلتا رہتا ہے، مالک ہوٹل خاموش کھڑا کھڑکی سے باہر دیکھتا رہتا ہے۔ مسٹر زیڈ مالک ہوٹل سے مخاطب ہو کر)

مسٹر زیڈ : تم جانتے ہو جب کسی ملک میں شورش اور بغاوت پھیلتی ہے تو اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟ (مالک ہوٹل مستفسرانہ انداز میں مسٹر زیڈ کا چہرہ دیکھتا ہے۔ مسٹر زیڈ مالک ہوٹل کا چہرہ اس انداز سے گھورتے ہوئے جیسے اسے ڈرانے کی کوشش کر رہا ہو)— تباہی و بربادی قتل و غارت۔ پولیس اور فوج کی گولیاں— لوٹ مار تمھارے اس ہوٹل اور دیگر خوبصورت عمارتوں میں آگ وطوفان— تاریخ بغاوت ایسے ہی واقعات سے بھری پڑی ہے— لیکن اگر ایسی شورشوں کو قبل از وقت ہی دبا دیا جائے تو—

مالک ہوٹل : (قطع کلام کر کے) اس کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں؟

مسٹر زیڈ : ہاں— ملک ان تمام لعنتوں سے پاک ہو جاتا ہے۔

مالک ہوٹل : (سوچتے ہوئے) ملک میں تباہی و بربادی پھیلے گی۔ (کمرے میں چاروں

طرف دیکھ کر) یہ خوبصورت کمرہ، یہ قیمتی فرنیچر، سب تباہی کی نذر ہوجائے گا۔ میں برباد کردیا جاؤں گا (کھڑکی میں سے پہاڑوں کو دیکھنے لگتا ہے۔ پہاڑوں پر بہتی ہوئی ندی اپنے ساتھ بڑے بڑے درختوں کو بہا کر لاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ پھر جیسے خود ہی سے باتیں کررہا ہو) یہ ندی آجکل کس قدر خونخوار ہوگئی ہے۔ کیسے بڑے بڑے درخت جڑ سے اکھاڑ کر رکھ دیے ہیں۔

مسٹر زیڈ : (مالک ہوٹل کے چہرے پر پریشانی محسوس کرتے ہوئے) اس ندی میں طوفان آرہا ہے نا— اگر اس قصبہ میں بغاوت پھیلی تو پھر اس کمرے اور ہوٹل ہی کی کیا حقیقت ہے۔ سرکاری عمارتیں— خوبصورت ٹاؤن ہال۔ قیمتی لائبریریاں۔ درسگاہیں سب تباہ ہوجائیں گی— بچے یتیم، خوبصورت جوان عورتیں بیوہ، تمھارے بینک لوٹ لیے جائیں گے— تمھارا سرمایہ برباد ہوجائے گا۔ تم مفلس ہوجاؤ گے۔

مالک ہوٹل : (بیتاب ہوکر التجا آمیز لہجہ میں) تو مجھے اس تباہی سے بچایئے۔

مسٹر زیڈ : گھبراؤ نہیں۔ اس کی کوشش کی جارہی ہے تم بھی کوشش کرو کہ قاتل کا سراغ لگ جائے—

ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کرتی ہے۔

مالک ہوٹل : میں آپ کی ہر ممکن مدد کرنے کو تیار ہوں— لیکن قاتل کون ہے اس کا مجھے علم نہیں۔

مسٹر زیڈ : (کچھ سوچ کر) حکومت نے دو ہزار روپیہ مقرر کیا۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) میری تحقیقات سے قاتل کا سراغ ضرور ملے گا، (سگریٹ جلا کر پینے لگتا ہے، دو تین کش لے کر مالک ہوٹل کے پاس جاتا ہے اور اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر رازدارانہ لہجے میں) ایک سودا کرتے ہو۔

مالک ہوٹل : (تعجب سے) سودا؟

مسٹر زیڈ : ہاں سودا— (رازدارانہ لہجے میں) اگر قاتل کا سراغ مل گیا تو میں تمھیں مطلع کردوں گا— اور تم حکومت کو۔ تمھیں دو ہزار روپیہ مل جائے گا۔ بس ایک ہزار تمھارا ایک ہزار میرا۔ (مالک ہوٹل کسی گہری سوچ میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ مسٹر زیڈ اس کا چہرہ گھورتا ہے۔ مسٹر زیڈ کے چہرہ پر امید وبیم کے ملے جلے اثرات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ چند سیکنڈ وہ خاموش کھڑا رہتا ہے۔ پھر اس انداز سے جیسے وہ مالک ہوٹل کے سوچ بچار سے گھبرا گیا ہو) جواب دو دوست یہ ایک ایسا کوئی بڑا مسئلہ تو نہیں۔ (پھر مسکرا کر ہاتھ مالک ہوٹل کی طرف بڑھاتے ہوئے) لو ہاتھ ملاؤ اور کہو— مجھے منظور ہے۔

مالک ہوٹل : (آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھا کر ملاتے ہوئے) مجھے منظور ہے مگر—

مسٹر زیڈ : (قطع کلام کرکے) اب اگر وگر کچھ نہیں۔ بس جاؤ اور خاموشی سے اپنا کام کرو۔ (مالک ہوٹل دروازہ کی جانب بڑھتا ہے) لیکن دیکھو— (مالک ہوٹل رک کر مسٹر زیڈ کا چہرہ دیکھتا ہے کسی کو یہ راز معلوم نہ ہو ورنہ باغی شہر میں اودھم مچا دیں گے اور پھر تباہی و بربادی۔
(مالک ہوٹل کچھ سوچتا ہوا کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ مسٹر زیڈ ٹہلنے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد مسٹر ایکس داخل ہوتا ہے اور مسٹر زیڈ کو فوجی سلام کرکے)

مسٹر ایکس : حضور والا۔ کچھ مشکوک لوگ گرفتار کیے گئے ہیں۔ اگر حکم ہو تو آپ کے سامنے حاضر کروں۔

مسٹر زیڈ : ضرور— ابھی لاؤ۔ سگریٹ پھینک دیتا ہے اور دوسری سگریٹ جلا کر ایک صوفے پر بیٹھ جاتا ہے۔ مسٹر ایکس کمرہ سے نکل جاتا ہے اور چند منٹ بعد مسٹر زیڈ کے آنکھ کے اشارہ پر 'مسٹری' کو لے کر داخل ہوتا ہے۔ اور خود کمرے سے نکل جاتا ہے۔ مسٹر زیڈ کچھ دیر مسٹری کو سر سے پیر تک دیکھتا رہتا ہے۔ پھر کچھ طنز آمیز لہجہ میں)— ہوں— تو آپ ہی باغیوں کے

سرغنہ ہیں—۔

مسٹر سی : (تعجب سے) سرغنہ! گویا باغیوں کی یہی قسمیں ہوتی ہیں (زور دار قہقہہ لگا کر۔ ہمارے یہاں تو کوئی ایسی تفریق نہیں۔ (مسکراتے ہوئے) ہمارے یہاں سب لیڈر ہیں اور سب سپاہی ہم سب اپنے حقوق کے تحفظ کے واسطے ظلم و استبداد کے خلاف دوش بدوش کھڑے ہیں۔ طنزیہ لہجہ میں) یہ چھوٹے بڑے اور امیر وغریب کی تفریق آپ ہی کو مبارک ہو۔

مسٹر زیڈ : لیکن حکومت کے خلاف بغاوت کا انجام جانتے ہو؟

مسٹر سی : اگر حقوق کا تحفظ اور ظلم کے خلاف احتجاج بغاوت ہے تو میں خوش ہوں کہ میری زندگی کا مقصد حاصل ہو رہا ہے۔ اِس بغاوت پر زندگی کے تمام عیش قربان۔ (فاتحانہ مسکراہٹ سے مسٹر زیڈ کو دیکھتا ہے۔)

مسٹر زیڈ : لیکن بغاوت کا انجام تباہی و بربادی ہے خون کی ہولی ہے۔فنون و ادب کو تباہ کرنا ہے بزرگوں کی یادگاروں کو خون سے رنگنا ہے۔

مسٹر سی : (مسکرا کر) یہ ایک خوشگوار انتقام ہے۔ (طنزیہ لہجہ میں) بزرگوں کی وہ عمارتیں جن میں کبھی آزادی کے گیت گائے جاتے تھے اب اپنی غلامی پر ماتم کر رہی ہیں (جوش میں ذرا بلند آواز سے) اب اُن کے در و دیوار کو ہمارے خون کے نقش و نگار کی ضرورت ہے۔طوفان کے دھارے میں بہہ کر ہمیں وہ حاصل کرنا ہے جس کے لیے ہماری روحیں بے چین ہیں جس میں اب ان عمارتوں کی ضرورت نہیں جن پر انصاف کے نام کے پرچم اڑتے ہیں لیکن جو ہر شام انصاف کے نام پر ماتم کر کے شب کی سیاہیوں میں اپنی گردنیں جھکا لیتے ہیں۔ ہمیں وہ ادب اور آرٹ نہیں چاہیے جو روح کو بیدار نہیں کرتا بلکہ اُسے لوری دے کر سلاتا ہے۔

مسٹر زیڈ : لیکن بغاوت کا انجام موت ہے۔

مسٹر سی : (مسکرا کر) اور موت— آزاد زندگی کی پہلی سیڑھی ہے۔

مسٹر زیڈ : تو پھر قتل کا پتہ نہیں دے سکتے ہیں۔

مسٹر سی : (جوشیلے لہجہ میں) عوام باغی ہیں۔ اُن کی روحیں باغی ہیں۔ ان کے جذبات باغی ہیں۔ کچل دیجیے ان جذبات کو مٹا دیجیے ان روحوں کو آپ کا مجرم خود بخود فنا ہو جائے گا۔ ایک شانِ استغنیٰ سے دروازہ کی جانب دیکھتا ہے۔ مسٹر زیڈ تالی بجاتا ہے۔ مسٹر ایکس داخل ہوتا ہے)

مسٹر زیڈ : دوسرے شخص کو لاؤ۔

(مسٹر ایکس مسٹر سی کو اپنے ساتھ لے کر کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد ایک دوسرے شخص مسٹر آر کو لے کر داخل ہوتا ہے۔ مسٹر آر کی عمر پچاس سال سے زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ معمولی لباس پہنے ہے۔ مسٹر آر کو کمرہ میں چھوڑ کر مسٹر ایکس کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ مسٹر زیڈ مسٹر آر کو دیکھ کر ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے)

مسٹر زیڈ : تشریف رکھیے۔

مسٹر آر : (طنزیہ مسکرا کر)۔ تشریف؟ حضور والا! آپ یہ کیا فرما رہے ہیں! آپ حاکم ہیں اور میں باغی۔ میں آپ کے مقابلہ میں کھڑا ہی رہوں گا بیٹھنا ٹھہراؤ ہے اور ٹھہراؤ بغاوت کی موت۔ (مسکرا کر) میں بیٹھنا نہیں چاہتا۔ (سینہ پھلا کر) میں آپ کے مقابلہ میں کھڑا رہنے کا عزم کر چکا ہوں۔

مسٹر زیڈ : ابھی ہم نے مسٹر سی کے خیالات معلوم کیے ہمیں خوشی ہے کہ آپ لوگوں میں مستقل مزاجی ہے۔

مسٹر آر : (فاتحانہ مسکرا کر) مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ کو ہماری مستقل مزاجی اور اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔

مسٹر زیڈ : (سگریٹ کا کش لے کر) لیکن دیکھو بھئی اس طرح ہڑبونگ مچانے سے تو کچھ حاصل نہ ہوگا۔ تمھارا جذبہ آزادی صحیح ہے لیکن انقلاب کے ذریعہ کسی چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ انقلاب ہر چیز کی موت ہے۔ حتی کہ انقلاب

کے دھارے میں خود انقلاب کی روح بہہ جاتی ہے۔ اور چٹیل میدان کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہتا۔

مسٹر آر : (طنزیہ مسکرا کر) دلائل حقیقت کی کسوٹی قرار نہیں دیے جاسکتے۔ حقیقت کو جھٹلانا صرف دلائل ہی کا کام ہے۔ (جوشیلے لہجہ میں) لیکن ہماری روح کو جس قدر کچلا گیا ہے ہمارے جذبات کا جس طرح مذاق اڑایا گیا ہے وہ انقلاب ہی چاہتے ہیں... (افسردہ لہجہ میں) ہمارے اس چھوٹے سے قصبہ میں کیسا امن و امان تھا۔ لیکن یہاں فوجی چھاؤنیاں قائم کی گئیں اور اس کے بعد ہر طرف شیطانی قہقہے فضا میں گونجنے لگے۔ وہ دوشیزائیں جن کی معصومیت اور پاکیزگی کی فرشتے قسم کھاتے تھے۔ ایک بھی دوشیزہ نہ رہی۔ سب کی عزت و ناموس پر ڈاکے پڑے۔ اُن میں سے بہت سی خودکشی کی نذر ہوگئیں۔ بہت سی کوٹھوں کی رونق بن کر گاہکوں سے اشارہ بازی کرنے لگیں اور بہت سی ایسے امراض کی شکار ہوگئیں جن کا کوئی علاج نہیں۔ ایسے حالات میں بھی اگر مردوں کی روح بیدار نہ ہو تو ان مردوں پر لعنت ہے۔

مسٹر زیڈ : مجھے اس کا افسوس ہے — میں —

مسٹر آر : (قطع کلام کرکے) افسوس نہ کیجیے ورنہ حکومت کی کرسی بیوہ ہوجائے گی۔ چمکدار چاندی سونے کے سکے کسی کی جیب میں کھنکنے کے واسطے بیتاب ہوکر اپنی آب و تاب کھودیں گے۔

مسٹر زیڈ : (غصہ سے) لیکن اس بغاوت اور سرکشی کا انجام جیل خانہ کی تاریک کوٹھری ہے۔ سمجھ لو اسے۔

مسٹر آر : مرحبا۔ اس تاریک کوٹھری پر جس میں روح جگمگا اٹھے۔ جہاں روح بیدار ہو جہاں صحیح جذبات کی تخلیق ہو۔ جہاں کی نیند میں بیداری ہو جہاں کے خوابوں میں آزادی کے نغمے سنائی دیں وہ تاریک کوٹھری جس کے مقدر میں ہو میں

اس مقدر پر رشک کرتا ہوں۔

مسٹر زیڈ : (کچھ دیر سوچ کر) اگر تم قاتل کا پتہ بتلا دو تو حکومت آزاد کردے گی اور تمھارے ساتھ ہمدردانہ سلوک بھی کرے گی۔

مسٹر آر : اگر حکومت کی عقل کا اس قدر دیوالیہ ہوگیا ہے تو میں سوائے ماتم کے اور کیا کرسکتا ہوں۔ ہاں مجھے قاتل کا پتہ معلوم ہے اور آپ بھی اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ (جوشیلے لہجہ میں) وہ نفرت و حقارت کا طوفان ہے جس کی موجیں اب اس قدر گستاخ ہوگئی ہیں کہ اب وہ بندوں کو توڑ کر طوفان لانے کے لیے بیتاب ہیں۔ (دور دروازہ کی جانب دیکھ کر) کیا اب آپ مجھے جانے کی اجازت دیں گے؟ مسٹر زیڈ تالی بجاتا ہے۔ مسٹر ایکس داخل ہوتا ہے اور فوجی سلام کرکے کھڑا ہو جاتا ہے۔

مسٹر زیڈ : اور کوئی ہے؟ (مسٹر ایکس نفی میں سر ہلاتا ہے) ان دونوں بدمعاشوں کو حراست میں رکھو۔ (مسٹر ایکس فوجی سلام کرکے مسٹر آر کا ہاتھ پکڑتا ہے)

مسٹر آر : (مسکرا کر) میں خوش ہوں کہ آپ مجھے صحیح جگہ بھیج رہے ہیں۔ جہاں میری آزاد روح اور ناقابل تسخیر جذبات آپ کے پیدا کیے ہوئے فلسفۂ زندگی کو جس کا کھوکھلا پن اب ظاہر ہو چکا ہے۔ فدا کردیں گے (مسٹر ایکس کے ساتھ کمرہ سے نکل جاتا ہے مسٹر زیڈ اٹھ کر خاموشی سے کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے اور کچھ سوچتا جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد مالک ہوٹل داخل ہوتا ہے اور مسٹر زیڈ کے پاس جا کر راز دارانہ لہجہ میں)

مالک ہوٹل : حضور والا ایک بوڑھی عورت آپ سے ملاقات کرنا چاہتی ہے۔ شاید اس سے کوئی پتہ چل سکے۔

مسٹر زیڈ : جلد لاؤ اُسے۔

(مالک ہوٹل کمرہ سے نکل جاتا ہے اور چند سیکنڈ بعد ایک بوڑھی عورت کو ساتھ لے کر داخل ہوتا ہے اور اُسے کمرہ میں چھوڑ کر خود کمرہ سے نکل جاتا

ہے عورت کی عمر تقریباً پچاس سال کے قریب ہے جس وقت وہ کسی چیز پر نظریں جما کر اُسے دیکھتی ہے تو پیشانی کے بل اُس کے عزم و ارادہ کی پختگی کا اظہار کرتے ہیں۔

مسٹر زیڈ : کہو ماں! مجھ سے کوئی کام ہے۔

بڑھیا : ہاں تم حکومت کے ایک اعلیٰ افسر ہو۔ میں تمھارے پاس ایک فریاد لے کر آئی ہوں۔

مسٹر زیڈ : کہو کہو۔ میں تمھاری فریاد ضرور سنوں گا اور انصاف کرنے میں اپنی تمام کوشش صرف کردوں گا۔

بڑھیا : میں ایک مظلوم عورت ہوں۔ میرا صرف ایک ہی لڑکا ہے حسین اور عقلمند۔ وہ فوج میں ملازم تھا۔ جنگ شروع ہوئی اور اس نے جنگ پر جانے سے انکار کردیا۔ کیونکہ جنگ کے نعرے کچھ اور تھے روح کچھ اور جسے اس نے سمجھ لیا ملک و قوم کے لیے وہ جان دے سکتا تھا مگر غلامی کی زنجیریں اور مضبوط کرنے کے واسطے نہیں۔ اب آپ ہی بتلایئے کہ یہ اس کے ساتھ ناانصافی نہیں تو اور کیا ہے اُسے جیل خانہ کی کوٹھری میں ٹھونس دیا گیا ہے۔

مسٹر زیڈ : تو ماں صرف تمھارے ایک ہی لڑکا ہے۔

بڑھیا : ہاں میرا ایک ہی لڑکا ہے۔

مسٹر زیڈ : تم اس سے محبت بھی کرتی ہو؟

بڑھیا : بے پناہ— کون اپنی اکلوتی اولاد سے محبت نہیں کرتا؟

مسٹر زیڈ : اور تم یہ بھی چاہتی ہو کہ وہ آزاد کردیا جائے۔

بڑھیا : کیوں نہیں۔ وہ کون سی ماں ہے جو اپنی اولاد کی آزادی کی خواہش مند نہیں؟

مسٹر زیڈ : (بڑھیا کا چہرہ غور سے دیکھ کر) تمھارا اکلوتا لڑکا آزاد کیا جاسکتا ہے لیکن ایک شرط پر۔

بڑھیا : وہ شرط بھی بیان کردو۔

مسٹر زیڈ : تو وعدہ کرو کہ شرط پوری کرو گی۔

بڑھیا : اگر پوری کرنے کے قابل ہوئی تو ضرور پوری کروں گی۔

مسٹر زیڈ : تو اس شخص کا پتہ بتلاؤ جس نے مجسٹریٹ کا قتل کیا ہے۔

(بڑھیا کے چہرہ پر غصہ کے آثار پیدا ہوتے ہیں اور وہ نفرت سے مسٹر زیڈ کا چہرہ دیکھتی ہے؟ کچھ دیر خاموش رہ کر)

بڑھیا : کیا آپ اس کو گرفتار کرسکیں گے؟

مسٹر زیڈ : ہم اس کو گرفتار ہی نہیں کریں گے بلکہ اسے فنا کردیں گے۔

بڑھیا : تو سن لیجیے۔ وہ دوشیزاؤں کی لوٹی ہوئی عصمتیں ہیں۔ وہ غریبوں کی آہیں ہیں۔ وہ دولت مندوں کی عیش پرستی ہے۔ وہ آزادی کے خواب ہیں۔ وہ غلامی سے نفرت ہے۔ (جوش میں آکر آپ یہ چاہتے ہیں کہ میرے بچہ سے میری محبت کا ناجائز فائدہ اٹھائیں۔ اگر میرے ایسے سو لڑکے بھی ہوتے تو میں انھیں آزادی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیتی۔ فخر و غرور سے سر اونچا کرکے چلتی اور لوگوں سے کہتی کہ میں نے اپنے سو بچے آزادی کی راہ میں بھینٹ کر دیے ہیں۔ سب لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے میں۔ یہی آنسو بہاتی مگر خوشی کے۔ یہ تو ایک ہی لڑکا ہے، رہنے دیجیے اس کو تاریک کوٹھری میں بند۔ یہی اس کی کامیابی ہے اور میں خوش ہوں کہ مجھے اس کی آزادی نہیں ملک کی آزادی چاہیے۔

مسٹر زیڈ : دیکھو ماں۔ بلاوجہ کی ہٹ نہ کرو۔

بڑھیا : مجھے ماں نہ کہو۔ بوڑھی عورت جس وقت ماں کا لفظ سنتی ہے تو اس کے دل سے محبت کے سوتے بہہ نکلتے ہیں۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔

(مسٹر ایکس گھبرایا ہوا کمرہ میں داخل ہوتا ہے اور جلدی جلدی کہنا شروع کرتا ہے)

مسٹر ایکس : حضور والا! ایک شخص جو کئی روز سے جیل خانہ میں بند تھا قاتل کا پتہ دینے

کے لیے تیار ہے جلد اور جلد اس کا بیان قلم بند کر لیجیے ورنہ کہیں—

مسٹر زیڈ : فوراً اسے حاضر کرو۔

(مسٹر ایکس کمرے سے نکل جاتا ہے اور مسٹر زیڈ بڑھیا کی موجودگی کے احساس سے قطعی بے پروا ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ مسٹر ایکس نوجوان کو لے کر داخل ہوتا ہے اور نوجوان اور بڑھیا کی آنکھیں چار ہوتی ہیں اور دونوں ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ نوجوان بڑھیا کو دیکھ کر ایسے لہجے میں جس میں نفرت اور طنز دونوں موجود ہیں)

نوجوان : کیوں ماں مجھ سے بہت محبت ہے— اس محبت میں کس بے قصور کی گردن کٹوانے کا ارمان دل میں ہے— ماں میں—

بڑھیا : (قطع کلام کرکے) مجھے بار بار ماں نہ کہہ (نفرت سے دوسری جانب منھ پھیر لیتی ہے) اگر تو پیدا ہی نہ ہوتا تو میں خوش ہوتی— ذلیل بزدل کہیں کا— کس کی گردن کٹوانا چاہتا ہے (پھر ایک دم پلٹ کر نوجوان کے پاس جاکر) تجھ جیسے غدار کو دنیا میں رہنے کا حق نہیں— (ایک چھپے ہوئے خنجر سے نوجوان پر حملہ کرتی ہے)۔ قبل اس کے کہ تو کسی کا نام بتلائے میں تیری زبان ہمیشہ کے واسطے بند کر دینا چاہتی ہوں۔ (مسٹر ایکس دوڑ کر بڑھیا کا ہاتھ روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر قبل اس کے کہ وہ اس کے پاس پہنچے خنجر اپنا کام کر چکتا ہے۔ مسٹر ایکس اور زیڈ حیران کھڑے رہ جاتے ہیں۔ نوجوان فاتحانہ مسکرا کر بڑھیا کو دیکھتا ہے، پھر خنجر سینے سے نکالتے ہوئے)

نوجوان : ماں! میں نے زندگی کی عین راحت حاصل کر لی ہے۔ میں خوش ہوں کہ میری زندگی تمھارے صحیح جذبات کی نذر ہوئی۔ (پھر چند سیکنڈ کھڑا رہتا ہے۔ خنجر ہاتھ میں لے کر لڑکھڑاتا ہوا مسٹر زیڈ کے پاس جاتا ہے) یہ میں آپ کو قاتل کا نام بتلانا چاہتا ہوں۔ (ایک دم مسٹر زیڈ پر خنجر سے حملہ کرتا ہے اور مدافعت

سے پہلے ہی خنجر مسٹر زیڈ کے سینے میں پیوست ہوجاتا ہے اور وہ گر پڑتا ہے)
اب سن لیجیے اس قاتل کا نام— مجسٹریٹ کا قاتل اب آپ کا بھی قاتل ہو چکا ہے۔

(نوجوان یہ کہتا ہوا فرش پر گر پڑتا ہے۔ دونوں کے سینوں سے خون فرش پر مختلف سمتوں میں بہنے لگتا ہے)۔

بڑھیا : بیٹا!— ((اس پر جھک کر)۔ میرا بہادر بیٹا۔

نوجوان : (اپنے دونوں ہاتھ عورت کی گردن میں حمائل کرتے ہوئے) ماں! زندگی کا مقصد— آزادی حاصل کرنا ہے— میں اس قدر بزدل تو— نہیں ہوں کہ— جو کام میں نے آزادی کی— خاطر کیا ہے اسے پوشیدہ رکھ کر— غلامی کی زنجیروں کو اور مضبوط کرادوں— اور پھر اس ظالم گورنمنٹ کے ظلم کا نشانہ کوئی ایسا بے قصور— بن جائے جس سے—— ہماری تحریک آزادی کو بہت سی امیدیں ہیں۔

بڑھیا : جب آزادی کی خواہش جوشیلی نہیں بلکہ سنجیدہ ہوجاتی ہے، جب نفرت و حقارت کے جذبات زندگی سے وزنی ہوجاتے ہیں۔ پھر تحریک آزادی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ سمجھ لے کہ اب ہم پس و پیش کے دوراہے پر نہیں کھڑے ہیں۔ ہم نے آزادی کی راہ پر قدم بڑھا دیا ہے اور غلام آباد کو جانے والی سڑک کو ڈائنامیٹ لگا کر ہمیشہ کے واسطے فنا کردیا ہے۔

(نوجوان کے ہاتھ ڈھیلے ہوکر بڑھیا کی گردن کو چھوڑ دیتے ہیں۔ بڑھیا کی آنکھوں سے دو آنسو نوجوان کے بہتے ہوئے خون پر گر کر جذب ہوجاتے ہیں۔ بڑھیا کھڑی ہوکر نوجوان کی لاش کو فاتحانہ انداز میں مسکرا کر دیکھنے لگتی ہے۔ بادل زور سے گرجتا ہے اور تیز ہوا کے جھونکے کمرے میں داخل ہوتے ہیں، دور سے انقلاب زندہ باد۔ آزادی ہمارا حق ہے۔ غلام رہنا بے عزتی پر مسکرانا ہے کی آوازیں آتی ہیں جو آہستہ

آہستہ تیز ہوتی جاتی ہیں۔ مسٹر ایکس دوڑ کر کھڑکی کے پاس جاکر کھڑکی بند کرتے ہوئے)۔

مسٹر ایکس : غضب کی تیز ہوا ہے۔

بڑھیا : طوفان ہے طوفان— وہ ان بند دروازوں کو توڑ ڈالے گا— (پھر نوجوان کی لاش کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے) دیکھ بیٹا آخر طوفان آہی گیا۔

(پردہ)

(مطبوعہ: رسالہ 'افکار' بھوپال، جون 1947)

ننھا مجاہد

(بچوں کے لیے)

ایک ایکٹ کا ڈراما

کردار

(1) شاعر (جو تباہی دیکھ کر پاگل سا ہوگیا ہے) (2) سیٹھ جینی لال (جو درحقیقت فساد کا بانی ہے مگر اب گھبرا کر حواس باختہ ہوگیا ہے۔) (3) کارندہ (جینی لال کا ہمراز اور ندیم) (4) بچہ (کارندہ کے لڑکے کا لڑکا، پولس کے سپاہی وغیرہ

منظر

(ایک فساد زدہ قصبہ۔ جہاں فساد کے بعد ملٹری اور پولیس نے قبضہ کرلیا ہے۔ اس قصبہ کے سب سے بڑے سیٹھ جینی لال کے کارندہ کا مکان۔ مکان کا ایک کمرہ۔ رات کا وقت ہے۔ کمرہ میں ایک معمولی سا چراغ جل رہا ہے۔ چراغ کی روشنی بہ مشکل تمام کمرہ میں ہورہی ہے اور تمام کمرہ میں چراغ کا دھواں پھیل رہا ہے۔ مغربی اور مشرقی جانب دو دروازے ہیں۔ جو دوسری طرف کھلتے ہیں۔ جنوبی جانب بھی ایک دروازہ ہے جو بیرون

مکان کھلتا ہے یہ دروازہ اس وقت بند ہے۔ شمالی جانب ایک چھوٹی سی چارپائی بچھی ہے جس پر ایک معمولی بستر بچھا ہے۔ بستر پر ایک چھوٹا سا بچہ جس کی عمر 9-8 سال کی ہے سو رہا ہے۔ اس کے پاس ایک چٹائی پر بوڑھا کارندہ بیٹھا ہے اس کی عمر تقریباً 55 سال کی ہے۔ کمرہ میں سیٹھ جینی لال موجود ہیں۔ موٹا تازہ جسم ہے اور عمر تقریباً 60 سال کے قریب۔ ایک میلی سی دھوتی باندھے اور ایک بنگالی میلا کچلا کرتہ پہنے۔ کمرہ میں اس طرح گھوم رہے ہیں جیسے پاگل ہو چکے ہیں۔ کچھ آہستہ آہستہ بڑبڑاتے جاتے ہیں۔ چہرہ کے اتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بڑی کش مکش اور پریشانی میں مبتلا ہیں۔ کارندہ برابر خاموش بیٹھا کچھ سوچ رہا ہے۔ بالکل خاموشی ہے۔ سڑکو پر کبھی دور سے اور کبھی نزدیک سے کتوں کے چیخنے کی آواز آجاتی ہے۔ یا کبھی سڑک پر سے گشت کرنے والے سپاہی باتیں کرتے گزرتے ہیں تو قصبہ میں زندگی کا احساس ہوتا ہے۔

جینی لال : (ٹہلتے ہوئے) منیم جی! میں پاگل ہوجاؤں گا۔ خوف سے میرا دل لرز رہا ہے۔

کارندہ : سیٹھ جی! گھبرانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ آپ خاموشی سے جاکر کمرہ میں آرام کیجیے۔

جینی لال : میں اس گاؤں سے جلد از جلد بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ اگر پولیس کو میری موجودگی کا علم ہوگیا تو...

کارندہ : (پریشان ہوکر) رات تو آپ کسی طریقہ سے گزار لیجیے صبح کچھ پولیس کو دینے دلانے... یا... کوئی اور تدبیر سوچی جائے گی۔

جینی لال : لیکن صبح تک میں بالکل پاگل ہوجاؤں گا۔ میرا دماغ کام نہیں کررہا ہے۔ (پھر ٹہلنے لگتے ہیں۔ کارندہ کسی گہری سوچ میں گردن جھکا کر مبتلا ہوجاتا ہے۔ سیٹھ جی کچھ دیر ٹہلتے رہتے ہیں اور پھر خود ہی بڑبڑاتے ہوئے) میں یقینی پاگل ہوجاؤں گا... بالکل پاگل ہوجاؤں گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سب تدبیروں پر پانی پھر گیا۔ سب تدبیریں الٹی ہوگئیں۔

(شاعر مغربی دروازہ سے داخل ہوکر خوب قہقہے لگاتا ہے پھر جینی لال کے پاس جاکر)

شاعر : (طنزیہ انداز میں) سب تدبیریں الٹی ہوگئیں، (پاگلوں کی طرح قہقہے پر قہقہے لگاتا ہے)

کارندہ : (سمجھانے کے لہجے میں) شاعر خاموش رہو۔ یہ وقت

شاعر : (تیز تیز قدموں سے کارندہ کے پاس جاکر قطع کلام کرکے) کیوں خاموش رہوں؟... میری روح پر ہتھوڑے مارے جائیں اور میں خاموش رہوں۔ ہرگز نہیں۔ (پھر قہقہے لگاکر)... میں چیخوں گا... چلاؤں گا../ قہقہے لگاؤں گا... میں سیٹھ جینی لال کا غلام نہیں ہوں (پھر قہقہے لگاتا ہے)

جینی لال : (پریشان ہوکر) شاعر! تم اپنے قہقہوں سے مجھے پاگل بنادو گے۔

شاعر : ہاں۔ میں چاہتا ہوں کہ جن کے دلوں میں احساس نہیں ہے۔ وہ میری طرح پاگل ہوجائیں۔ انھیں دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔

کارندہ : (اٹھ کر سیٹھ کے پاس جاکر) سیٹھ جی آپ جاکر آرام کیجیے (ہاتھ پکڑ کر مشرقی دروازہ کے پاس لے جاتا ہے اور سیٹھ کو دوسرے کمرے میں چھوڑ کر دروازہ بند کرلیتا ہے۔ شاعر کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے۔ کارندہ پھر آکر چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے۔ شاعر کچھ دیر ٹہلنے کے بعد)

شاعر : سیٹھ جینی لال۔ (قہقہے لگاتا ہے)

کارندہ : (ٹھنڈی سانس بھر کر جیسے خود سے کہہ رہا ہو)۔

بیچارہ شاعر : بالکل پاگل ہوگیا ہے۔

شاعر : ہاں پاگل ہوگیا ہوں۔ مجھے حق ہے کہ میں پاگل ہوجاؤں۔ مجھے حق ہے کہ میں سب کچھ ہوجاؤں۔ (کارندہ کے پاس جاکر) کیا تمھاری روح نہیں کانپ رہی ہے؟ کیا خوفناک تباہی سے تمھارے مردہ احساسات میں اب بھی روح نہیں پھونکی؟ قہقہہ لگاکر)

کارندہ : (پریشان ہوکر) شاعر تمام گاؤں میں پولیس اور فوج پھر رہی ہے۔ تمھاری یہ چیخ چلاہٹ کہیں...

شاعر : (قطع کلام کرکے) میں پولیس سے نہیں ڈرتا۔ میں فوج سے نہیں ڈرتا۔ ہتھکڑی اور بیڑی کی مجھے پرواہ نہیں۔ (پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ خود سے باتیں کرتے ہوئے) میں نے اس گاؤں میں نغمے گائے۔ میں نے اس گاؤں کے پتھروں اور کنکروں سے محبت کی۔ لیکن آج میں اس جنت نشان میں ایک وحشت پاتا ہوں۔ ایک تاریکی پاتا ہوں۔ ایک خوف و ہراس پاتا ہوں۔ ہرگز نہیں۔ (چیخ چیخ کر) میں چیخوں گا۔ چلاؤں گا۔ جان دے دوں گا۔ میں یہ تباہی برداشت نہیں کرسکتا (قہقہے لگاتا ہے۔ پھر چیخ چیخ کر) آئے پولیس اور فوج گرفتار کرے مجھے۔ میں جیل خانہ کی کوٹھری میں ایک خونی نظم لکھوں گا اور اس کی دیواروں کو اپنے خون سے لکھے ہوئے اشعار سے مزین کروں گا۔

(پھر پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتا ہے۔ کارندہ اٹھ کر اس کے پاس آتا ہے اور کاندھے پر ہاتھ رکھ کر)

کارندہ : شاعر! تم بہت تھک گئے ہو۔ جاکر آرام کرو۔

شاعر : (قہقہہ لگا کر) میں تھک گیا ہوں؟ میں نہیں تھک سکتا۔ اب موت ہی مجھے تھکائے گی۔

کارندہ : تو پھر خاموش رہو۔ تمھاری یہ چیخ چلاہٹ اور تمھارے دل کا یہ درد مجھے بھی پاگل کردے گا۔

شاعر : (قہقہے لگا کر) تم اور پاگل؟ تم پاگل نہیں ہوسکتے۔ تم سیٹھ کے کارندہ ہو۔ اور ایک غلام! غلام کبھی پاگل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس کے جذبات ہمیشہ مردہ رہتے ہیں۔ تم نے اپنے جوان لڑکے کی موت دیکھی اور پاگل نہیں ہوئے۔ (قہقہے لگا کر) اور یہ بھی جانتے ہو کہ اس کی موت کا سبب کون ہے۔ تم انتقام تک نہیں لے سکتے۔ تم پاگل کیا ہوگے...!

کارندہ : شاعر! میرے بھی کچھ احساسات ہیں۔ میرے بھی کچھ جذبات ہیں۔ لیکن مجھ

میں ضبط کا مادہ زیادہ ہے... نہیں...

(شاعر لاپرواہی سے کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے۔ جیسے اسے کارندہ کی باتوں میں دلچسپی نہیں۔ پھر خود ہی بڑبڑاتے ہوئے)

شاعر : (آہستہ آہستہ بڑبڑاتے ہوئے) گاؤں کی معصوم دوشیزائیں گھاٹ پر جاتیں تو ان کا اشنان روح میں تازگی اور جذبات میں نئی روح بیدار کرتا تھا۔ ان کے قہقہے ان کی معصوم شرارتیں۔ ان کی آپس کی چھیڑ چھاڑ۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی فردوسی چیزیں ہیں۔ تکلف اور تصنع سے بری۔ وہ محبت اور خلوص کی دیویاں معلوم ہوتی تھیں۔ مگر یہ سب باتیں اب تو خواب ہیں۔

(کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے) اور کمرہ پر کامل خاموشی طاری ہوجاتی ہے۔ کہیں کہیں شاعر کچھ بڑبڑا دیتا ہے۔ یکا یک چارپائی پر سوتا ہوا بچہ کسی چیز سے ڈر کر چیخ مارتا ہے۔ بوڑھا کارندہ اسے گود میں اٹھا لیتا ہے۔ بچہ کچھ دیر گھبرا کر بوڑھے کارندہ کو دیکھتا رہتا ہے)

...... : کارندہ۔ کیا ہوا بیٹا۔

بچہ : دادا۔ میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ بہت خوفناک خواب مجھے اپنی آغوش میں چھپاؤ دادا۔

شاعر : (کارندہ کے پاس جاکر) بزدل۔ غلام کے آغوش میں پناہ نہیں میرے ننھے مجاہد۔ نہیں۔ میں معصوم مجاہد کو غلام کی آغوش میں پناہ نہیں لینے دوں گا۔ (بچے کو اپنے آغوش میں لے کر) میرے ننھے مجاہد آغوش میں آ۔ جس آغوش میں کسی کا خوف نہیں۔ اس آغوش میں آ۔ جس کی آغوش میں مجاہدین کی جنت ہے (بچے کو لے کر ...... کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ پھر آہستہ سے بچہ سے) میرے ننھے مجاہد خواب پھر خواب ہے۔ تمھیں حقیقت سے بھی نہ ڈرنا چاہیے۔ تم ایک بہادر بچے ہو۔

بچہ : شاعر چچا۔ میرا خواب بہت خوفناک ہے۔

شاعر : مجاہد کا خواب ہمیشہ خوفناک ہوتا ہے۔ کیا خواب تم نے دیکھا ہے ننھے۔

بچہ : (کانپتی ہوئی آواز میں) میں نے آسمان پر ایک بہت ہی خوفناک سیاہ بادل دیکھا۔ جو ہمارے تمام گاؤں پر چھا گیا۔ پھر اس نے ننھے ننھے چھوٹے بادلوں کو دیکھا اور ان کی طرف جھپٹا۔ چھوٹے ٹکڑے مل کر ایک جگہ جمع ہوگئے۔ اس خوفناک سیاہ بادل نے ان چھوٹے چھوٹے بادلوں پر ٹکر ماری۔ ایک خوفناک گرج پیدا ہوئی۔ میں ڈر گیا (خوف سے کانپتے ہوئے شاعر سے چمٹ جاتا ہے)

شاعر : دیکھو میرے دوست۔ میں تمھیں مجاہد کہتا ہوں۔ اور مجاہد ڈرا نہیں کرتے (بچے کو محبت سے پیار کرکے) پھر کیا ہوا میرے ننھے مجاہد۔

بچہ : (خوف زدہ آواز میں) پھر چھوٹے چھوٹے بادلوں کے ٹکڑے سرخ ہوگئے اور آسمان سے خون کی بارش ہونے لگی... میرے بابا۔ اپنی چھوٹی سی پرانی چھتری لے کر لپکے اور انھوں نے گاؤں کے تمام لوگوں کو... تورا۔ کریم۔ بھگوان داس اور رامو کو اپنی اس چھتری میں چھپا لیا۔
... پھر جانتے ہو کیا ہوا؟

کارندہ : (پریشان سا ہوکر) بیٹا۔ خاموش رہو۔ تمھارا خواب خوف ناک ہے۔

شاعر : (بچہ کو پیار کرکے) ننھے مجاہد تمھارا خواب ایک حسین خواب ہے۔ بیان کرو پھر کیا ہوا۔

بچہ : پھر ایک عجیب و غریب قسم کا جانور بابا کی طرف لپکا۔ (پھر خوف سے شاعر سے چمٹ جاتا ہے)۔

شاعر : کیوں ننھے مجاہد پھر ڈر ے۔ خوف تمھارا غلام ہے اور تم اس کے آقا۔

بچہ : اس کا بدن سور کی طرح تھا۔ منہ کتے کی طرح اور پنجے بھیڑیے کی طرح۔ اس کے پنجے خون میں بھرے ہوئے تھے۔ منہ میں انسانوں کی ہڈیاں تھیں۔ میرے بابا نے اس کا مقابلہ کیا مگر اس نے بابا کو گرادیا اور پھر سب لوگ خون

میں لت پت ہو گئے۔ میں اپنی لاٹھی لے کر اس جانور کی طرف لپکا۔ تو وہ مجھ سے ڈر کر بھاگ گیا۔

شاعر : شاباش۔ ننھے مجاہد شاباش۔ تیرا عزم و استقلال اس بھیڑیے کو ضرور ختم کر دے گا۔ جو اس تباہی کا سبب ہے۔
(قہقہے لگاتا ہے اور پھر بچے کو محبت سے پیار کرتا ہے)

بچہ : (شاعر کے چہرہ کو غور سے دیکھ کر) چچا شاعر! میرا بابا کہاں گیا ہے۔ (بوڑھے کارندہ کو دیکھ کر) دادا کہتا ہے کہ وہ میرے لیے عمدہ عمدہ کھلونے لینے گیا ہے۔ (پھر بوڑھے کو دیکھ کر جس کی آنکھوں میں آنسو ہیں)... دادا... جب میں بابا کا ذکر کرتا ہوں تو تمھاری آنکھوں میں آنسو کیوں آجاتے ہیں؟

کارندہ : دیکھو بیٹا۔ تم اپنے بابا کا ذکر بار بار نہ کیا کرو اس سے مجھے دکھ ہوتا ہے۔
(شاعر زور زور سے قہقہے لگاتا ہے اور بچہ کو گود میں لے کر ٹہلنے لگتا ہے۔ قہقہے لگانے کے بعد)

شاعر : ننھے مجاہد! تیرے دادا کی آنکھیں بے نور ہو چکی ہیں۔ وہ کھلی ہوئی ہیں مگر دیکھ نہیں سکتیں (بچہ کو چارپائی پر بٹھا کر زمین پر بیٹھ جاتا ہے اور پھر سمجھانے کے لہجہ میں) معصوم مجاہد! (کارندہ کی طرف اشارہ کرکے) یہ ایک غلام کی آنکھیں ہیں۔ جو صرف روسکتی ہیں۔ ان میں عزم و ارادہ نہیں۔

بچہ : (معصومانہ انداز میں) ایسا کیوں ہوتا ہے۔ شاعر چچا۔

شاعر : ایسا کیوں ہوتا ہے؟ (قہقہہ لگا کر) اس لیے کہ غلام کی آنکھیں فرماں برداری کے لیے کھلتی ہیں۔ بغاوت کے لیے نہیں۔

بچہ : تو کیا میرا دادا بھی غلام ہے؟

شاعر : کیوں نہیں؟

بچہ : میں اپنے دادا کو غلام نہیں رہنے دوں گا۔ اسے اپنی طرح مجاہد بناؤں گا۔

شاعر : (طنزیہ لہجہ میں) ایسا نہ کہو ننھے مجاہد۔ تیرے دادا کو دکھ ہوتا ہے۔ مجاہد کا نام

سن کر اس کی روح کانپ جاتی ہے۔

(کارندہ سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ جاتا ہے۔ سڑک پر سے کچھ سپاہی باتیں کرتے ہوئے گزرتے ہیں۔ جن کی آواز کمرہ میں آتی ہے۔ جینی لال کمرہ میں داخل ہوتے ہیں۔ اُنھوں نے کرتا اتار رکھا ہے۔ بال بکھرے ہوئے ہیں۔ آنکھوں سے وحشت برس رہی ہے۔ جیسے وہ پاگل ہو چکے ہیں۔ پہلے تو شاعر کو دیکھ کر پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتے ہیں۔ پھر کارندہ کے پاس جاکر رازدارانہ لہجہ میں)

جینی لال : منیم جی! پولیس نے اس مکان کے گرد گھیرا ڈال رکھا ہے۔ اب ہم گرفتار ہونے والے ہیں۔

کارندہ : گرفتار! سیٹھ جی!...

جینی لال : (قہقہے لگا کر) ہاں۔ گرفتار... (رازادارانہ لہجہ میں) پولیس کو ہمارے سب راز معلوم ہوگئے ہیں۔ ان کو یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ فساد ہم نے کرایا ہے۔ میرا مکان بھی ہم نے خود ہی جلایا ہے۔ بیمہ کمپنی ہے نا...

کارندہ : سیٹھ جی۔ آپ جاکر سو جایئے۔ اس وقت آپ...

جینی لال : (ڈرمائی انداز سے قطع کلام کرکے) سوئے اور کھوئے آکر گرفتار ہی کرلے گی۔ اور ہاں۔ ہم دروازہ مضبوطی........... (دروازہ کے پاس جاتا ہے اور اُسے کھولتا ہے۔ کارندہ دوڑ کر سیٹھ کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہے)

کارندہ : سیٹھ جی کیا کرتے ہو۔ (دروازہ بند کرکے چٹائی پر آکر بیٹھ جاتا ہے)

جینی لال : (رازدارانہ لہجہ میں) اور پولیس کو یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ تمھارے لڑکوں کو میں نے قتل کرایا ہے۔ وہ فساد روکنا چاہتا تھا نا... (قہقہے لگاتا اور پھر اٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے)۔ پھر کارندہ کے پاس جاکر مصلحت اس میں تھی کہ اسے قتل کرادیا جائے۔ (پاگلوں کی طرح قہقہے لگا کر) قتل۔ قتل... ہاہاہا۔

بچہ : (چارپائی سے اٹھ کر سیٹھ کے پاس جاکر) تم نے میرے بابا کو قتل کرایا ہے۔

اباش۔ تیرا عزم...
ع کلام کرکے) انتقام۔
ظروں سے بچہ کو گھورتا ہے اور اس کے منہ پر
ہ چیخ کر رونے لگتا ہے۔ کارندہ جینی لال کی
بچہ کو دیکھتا ہے۔ اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے اور سیٹھ

ں وقت تک سب کچھ برداشت کرتا رہا۔ لیکن
۔ تم انسان نظر نہیں آتے۔
وش رہو۔ اب مجھے کسی کا خوف نہیں۔
ں۔ ہرگز نہیں۔ اب میرا جذبہ انتقام جاگا ہے۔
ہ۔ سیٹھ ایک اور طمانچہ بچہ کے رسید کرتا ہے۔
ہ۔ سیٹھ اور کارندہ ایک دوسرے سے چیخ چیخ
کر گفتگو کرتے ہیں۔ جو سمجھ میں نہیں آتی۔ شاعر برابر قہقہے لگائے جاتا ہے۔
پولیس دروازہ کھول کر داخل ہوتی ہے۔

جینی لال : (دوڑ کر بچہ کو ایک اور طمانچہ مار کر) خاموش رہو۔

بچہ : (روتے ہوئے) نہیں رہتا۔ میں مجاہد ہوں۔ انتقام لوں گا۔

سپاہی : (جینی لال کو پکڑتے ہوئے) اور وہ۔ تو آپ سیٹھ جینی لال ہیں۔ آپ تو خود ہی پھنس گئے۔ ہم تو دو روز سے آپ کی تلاش میں تھے۔ (شاعر قہقہہ لگاتا ہے)

جینی لال : لیکن...

سپاہی : لیکن کچھ نہیں۔ (ہتھکڑیاں پہناتا ہے)

(جینی لال پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتا ہے۔ پھر اپنی جگہ پر اس طرح کودتا ہے جیسے ناچ رہا ہو۔ کارندہ دھیرے دھیرے مشرقی دروازہ کی جانب جاتا

ہے۔ دوسرا سپاہی اُسے دوڑ کر پکڑتا ہے)

دوسرا سپاہی: آپ کہاں تشریف لے جارہے ہیں (ہتھکڑیاں ڈالتے ہوئے) یہ زنجیریں سونے کی ہیں۔

(پولیس دونوں کو لے جاتی ہے۔ شاعر قہقہے لگاتا ہے۔ بچہ مسکرا کر دونوں کو جاتے ہوئے دیکھتا ہے)

(پردہ)

(مطبوعہ: 'قوم' دہلی سالنامہ، 1947)

سواگت

افراد تمثیل

(1) نسیم (ایک نوجوان) (2) نگہت (نسیم کی بیوی) (3) فضل علی (ایک مرد)
(4) شمیمہ (فضل علی کی بیوی) (5) شیر علی (دوسرا مرد) (6) گڈی (شیر علی کی بچی)

منظر

(سورج ابھی ابھی غروب ہوا ہے، تاریکی آہستہ آہستہ کمرہ میں پھیلتی جارہی ہے۔ کمرہ میں لالٹین جل رہی ہے جس کی روشنی مشکل سے کمرہ میں پھیل رہی ہے۔ کمرہ معمولی طور پر سجا ہوا ہے۔ پرانے قسم کا مگر معمولی سامان ہے جو صاف ستھرا ہے۔ کرسیاں اور میزیں وغیرہ سلیقہ سے رکھی ہوئی ہیں۔ دیواروں پر جانوروں کی تصاویر آویزاں ہیں۔ کمرہ میں ایک مسہری بچھی ہے جس پر صاف ستھرا بستر ہے۔ مسہری کے پاس ایک چھوٹی سی گول میز رکھی ہے۔ مغربی کونے میں ایک چھوٹی سی الماری رکھی ہے جس میں کچھ کتابیں ہیں مگر کتابوں پر پہلی ہی نظر میں اندازہ ہو جاتا ہے کہ کتابیں پرانی ہیں اور عرصہ سے کوئی نئی کتاب خرید کر اس میں اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔

مشرق کی طرف ایک دروازہ ہے جو ایک دوسرے کمرہ میں کھلتا ہے۔ اس پر ایک پردہ پڑا ہوا ہے۔ یہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔ جنوبی جانب ایک اور دروازہ ہے۔ جو بند ہے۔ اس پر بھی ایک پردہ پڑا ہوا ہے۔ شمال کی جانب جو دروازہ ہے وہ بیرون مکان کھلتا ہے اور صدر دروازہ کا کام دیتا ہے۔ اس وقت کمرہ میں نسیم اور اس کی بیوی نگہت کھڑے ہیں۔ نگہت بے پروائی سے تصاویر کو اچٹتی نگاہ سے دیکھ رہی ہے۔ نسیم کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد نگہت کو دیکھ کر۔

نسیم : نگہت! تم یہاں تھوڑی دیر آرام کرو۔ میں گاڑی لے کر ابھی آتا ہوں۔

نگہت : مگر یہ جگہ تو بالکل ویران معلوم ہوتی ہے۔ آدمی نہ آدم زاد۔

نسیم : (مسکرا کر) ایسا سجا سجایا مکان کہیں ویران ہوسکتا ہے (شمالی دروازہ کی طرف جاتے ہوئے) میں زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں واپس آجاؤں گا۔

(نسیم چلا جاتا ہے۔ نگہت خاموش کھڑی تصاویر کو دیکھتی رہتی ہے کہ اس دروازہ سے ایک شخص داخل ہوتا ہے اس کی بڑی بڑی مونچھیں اور سرخ سرخ آنکھیں ہیں۔ وہ سیاہ اوور کوٹ پہنے ہے اور فیلٹ کیپ لگائے ہے۔ نگہت اِسے دیکھ کر، گھبرا کر۔

نگہت : آپ کون ہیں؟

نگہت : (کانپتی ہوئی آواز میں) مگر ایسے شخص کو یہاں ملازم کیوں رکھ چھوڑا ہے۔

شیر علی : ملازم! (قہقہہ مار کر) بظاہر ملازم ہے مگر دراصل وہ اِس کوٹھی کا مالک بن بیٹھا ہے (دروازہ کی طرف جاتا ہے۔ نگہت خوف زدہ نظروں سے اِسے دیکھتی ہے۔ شیر علی پھر پلٹ کر ایک دروازہ کی طرف اشارہ کرکے، اِس دروازہ کو نہ کھولنا۔ یہ کچن کا دروازہ ہے۔

نگہت : (سہمے ہوئے انداز میں) کیوں؟

شیر علی : اِسی کچن میں اِس انگریز کی مچھلی خرگوش میں تبدیل ہوئی تھی (نگہت کی طرف آتے ہوئے) ایک مرتبہ کچھ مسافر یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ جب وہ اس

کچن میں کھانا کھانے گئے تو انھوں نے دیکھا کہ ان کا کھانا غائب ہے اور
اس کی جگہ سات خرگوش بیٹھے ہوئے ہیں اور حیرت کی بات یہ تھی کہ ان سب
کی دموں میں مچھلی پکڑنے کے کانٹے چھدے ہوئے تھے۔

(نگہت اِس قدر خوف زدہ ہوجاتی ہے کہ اس کی آواز نہیں نکلتی۔ شیر علی پھر دروازہ کی طرف جاتا ہے۔ نگہت سہمے ہوئے لہجہ میں ہمت کر کے)۔

نگہت : کیا آپ تھوڑی دیر اور نہیں ٹھہر سکتے۔

شیر علی : جی نہیں۔ آج کل ادھر مردم خور شیر کا زور ہے اور مجھے اس کی تلاش کرنا ہے۔
(کمرہ سے چلا جاتا ہے۔ نگہت سہمے ہوئے انداز میں ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ سردی کا احساس زیادہ ہوجاتا ہے اور وہ اپنی شال اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیتی ہے کہ یکا یک بندوق چلنے کی آواز آتی ہے اور ایک خرگوش دوڑتا ہوا کمرہ میں داخل ہوتا ہے اور دوسرے کمرہ میں چلا جاتا ہے۔ نگہت کی بے اختیار چیخ نکل جاتی ہے اور وہ کھڑی ہوجاتی ہے۔ شیر علی اس وقت کمرہ میں داخل ہوتا ہے اور نگہت سے) کہاں گیا؟

نگہت : (خوف سے کانپتے ہوئے ایک دروازہ کی طرف اشارہ کر کے) اِس کمرہ میں۔

شیر علی : بچ گیا کم بخت (نگہت سہمے ہوئے انداز میں سوالیہ نظروں سے شیر علی کو دیکھتی ہے) وہی انگریز تھا۔ جونہی وہ مجھے نظر آیا میں نے اس پر گولی داغ دی اور جب میں نے غور سے دیکھا تو انگریز غائب تھا اور اس جگہ ایک خرگوش تڑپ رہا تھا۔ جونہی میں اِس کے پاس پہنچا وہ بھاگا اور اس کمرہ میں گھس آیا۔ خیر کوئی بات نہیں۔
(پھر جانے کے لیے مڑتا ہے۔ نگہت التجا آمیز لہجہ میں)

نگہت : خدا کے لیے آپ تھوڑی دیر ٹھہر جایئے۔

شیر علی : (پلٹ کر نگہت کو دیکھتے ہوئے) کیوں؟

نگہت : میرے شوہر گاڑی لے کر آتے ہی ہوں گے۔ مجھے ڈر معلوم ہو رہا ہے۔

شیر علی : ڈرنے کی کوئی بات نہیں (پلٹ کر اِس کمرہ کا دروازہ بند کر کے جس میں

خرگوش گیا تھا) میں نے دروازہ بند کردیا ہے اور وہ اب نہیں آئے گا۔ ڈرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔

(شیر علی چلا جاتا ہے، نگہت پھر تنہا رہ جاتی ہے۔ خوف سے اس کا برا حال ہے۔ کچھ دیر بعد ایک شخص لنگڑاتا ہوا کمرہ میں آتا ہے اس کے ہاتھ میں ایک مردہ خرگوش ہے۔ نگہت کو دیکھ کر)

مرد : تم کون ہو؟

نگہت : میں — میں —

مرد : (تحکمانہ لہجہ میں) میں میں کیا — بولتی کیوں نہیں۔

شیر علی : میں ایک مسافر ہوں (قہقہہ مار کر) راستہ بھول کر اِدھر آگیا ہوں (اپنے کندھے سے بندوق اُتار کر اِسے لوڈ کرتے ہوئے) مگر تم کون ہو؟

نگہت : میں بھی مسافر ہوں۔ میری گاڑی راستہ میں بگڑ گئی تھی۔ میرے شوہر اسے ٹھیک کر کے لاتے ہی ہوں گے۔

(شیر علی قہقہے پر قہقہہ لگاتا ہے اور بندوق کو الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے)

شیر علی : مسافر ہو! (قہقہہ لگا کر) اچھا اچھا۔

نگہت : آخر تم قہقہے کیوں لگا رہے ہو (کمرہ کی مدھم روشنی میں شیر علی کے چہرے پر خفیف مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے) اس ریسٹ ہاؤس میں عجیب پُراسرار سناٹا ہے (ٹہلنے لگتی ہے پھر اس انداز سے جیسے خود سے کہہ رہی ہو) کم بخت نوکر بھی جانے کہاں جا کر مرگیا ہے (شیر علی قہقہہ مار کر ہنستا ہے) مسافر! یوں قہقہے نہ لگاؤ۔ مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے۔

شیر علی : تم مجھ سے ڈر رہی ہو! (رعب دار تحکمانہ لہجہ میں) ڈرو نہیں۔ میں تم کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔

نگہت : مگر مجھے تمھاری سرخ سرخ آنکھوں اور بڑی بڑی مونچھوں سے ڈر معلوم ہو رہا ہے۔

شیر علی : (قہقہہ مار کر) تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اِن سرخ سرخ آنکھوں اور بڑی بڑی مونچھوں سے تو فضلو بھی ڈرتا ہے۔

نگہت : فضلو! فضلو کون ہے؟

شیر علی : فضلو اِس ریسٹ ہاؤس کا ملازم ہے۔ لیکن وہ گیا کہاں۔ تم نے اسے کہیں بھیجا ہے؟

نگہت : نہیں۔۔۔ مگر فضلو۔۔۔!

(خوف سے آواز حلق ہی میں رک جاتی ہے)

شیر علی : فضلو! (ایسا قہقہہ مارتا ہے جس سے ریسٹ ہاؤس کی خاموش فضا پراسرار اور ہیبت ناک بن جاتی ہے۔ عورت خوف سے کانپنے لگتی ہے) اس نے اپنی زندگی میں ہزاروں ڈاکے ڈالے ہیں اور کم از کم سات آٹھ خون کیے ہیں۔

نگہت : یا اللہ۔۔۔

شیر علی : مگر ڈرو نہیں۔ جب سے میری گولی سے اِس کی ٹانگ ٹوٹی ہے وہ میرے نام تک سے ڈرتا ہے۔

نگہت : تمہاری گولی!

شیر علی : ہاں میری گولی (بندوق اونچی کر کے) اِسی بندوق کی گولی سے (قہقہہ مار کر) وہ میرے گاؤں میں ڈاکہ ڈالنے آیا تھا مگر اپنی اچھی خاصی ٹانگ میری گولی کی نذر کر گیا۔

نگہت : مگر تم۔۔۔

شیر علی : میں! (قہقہہ مار کر) میں اکثر راتوں کو اس علاقہ میں گھوما کرتا ہوں۔

نگہت : اس تاریکی میں!

شیر علی : ہاں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اِس ریسٹ ہاؤس میں بھوت پلید رہتے ہیں اور مجھے بھوت پلید دیکھنے کا بہت شوق ہے۔

نگہت : (خوف سے کانپتے ہوئے) عجیب واہیات شوق ہے۔

شیر علی : واہیات! یہ تو اپنے اپنے شوق کی بات ہے۔ ویسے اِس علاقہ میں شیر اور چیتے بہت ہیں۔ ابھی کل ہی کی بات ہے۔ یہ سڑک جو مشرق کی طرف جاتی ہے اس پر یہاں سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلہ سے ایک شیر مویشی اٹھا کر لے گیا۔

نگہت : اوہ میرے خدا— ہماری گاڑی بھی تو اِسی سڑک پر کوئی دو فرلانگ کے فاصلہ پر بگڑی ہے اور وہ— (خاموش ہو جاتی ہے اور ٹہلنے لگتی ہے۔ پھر جیسے اکتا کر) آخر اس جگہ ریسٹ ہاؤس بنانے کی کیا ضرورت تھی۔

شیر علی : دراصل یہ ریسٹ ہاؤس نہیں ہے کوئی پچاس سال پہلے ایک انگریز نے یہ کوٹھی اپنے رہنے کے لیے بنوائی تھی۔

نگہت : اِس سنسان اور ویران علاقہ میں؟

شیر علی : یہ جگہ اب سنسان اور ویران ہے لیکن جب وہ انگریز یہاں تمباکو کی کاشت کرتا تھا یہ جگہ خاص آباد تھی۔

نگہت : مگر وہ انگریز—!

شیر علی : ہاں وہ انگریز— اس کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا (نگہت سوالیہ نگاہوں سے شیر علی کو دیکھتی ہے) اگر تم کہو تو میں ایک سگریٹ پی لوں (نگہت خاموش رہتی ہے۔ شیر علی سگریٹ جلا کر ایک لمبا کش لے کر) ہاں تو یہاں سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلہ پر ایک ندی ہے۔ ایک روز یہ انگریز اس ندی پر مچھلی کا شکار کھیل رہا تھا کہ اس نے ایک بڑی سی مچھلی شکار کی اور اپنے جھولے میں رکھ کر لے آیا اور گھر آ کر جب اس نے جھولے میں سے مچھلی نکالی تو اس کے حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ مچھلی جھولے میں نہیں تھی۔

نگہت : مچھلی جھولے میں نہیں تھی!

شیر علی : ہاں— اس کی جگہ پر ایک خرگوش تھا (نگہت کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ جاتا ہے اور منہ سے چیخ نکل جاتی ہے) ڈرو نہیں۔ اِس سے بھی عجیب واقعہ یہ تھا کہ خرگوش ذبح کیا ہوا تھا اور اس کی دم میں مچھلی پکڑنے کا کانٹا چھدا ہوا تھا۔ یہ

دیکھ کر وہ انگریز اس قدر گھبرایا کہ اس کا ہارٹ فیل ہوگیا۔ اسی وقت سے یہ جگہ ویران اور سنسان پڑی ہوئی ہے۔ (نگہت خوف سے بے جان سی ہوجاتی ہے اور ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے (شیر علی قہقہہ مار کر) ڈرو نہیں۔ ہاں وہ انگریز اب بھی کبھی نظر آجاتا ہے۔

نگہت : (خوف سے کانپتے ہوئے) اب بھی۔

شیر علی : ہاں اب بھی۔ ایک دو مرتبہ میں بھی اسے دیکھ چکا ہوں۔

نگہت : یا میرے خدا۔

شیر علی : اس کے کاندھے پر ایک جھولا لٹکا ہوتا ہے اور وہ اکثر لوگوں سے کہتا ہے ''میری مچھلی کہاں ہے۔'' اگر اب وہ مجھے نظر آیا تو میں اسے گولی مار دوں گا۔

نگہت : (ہمت کرکے) تم الف لیلیٰ کے قصے سنا کر مجھے ڈرا رہے ہو۔

(شیر علی قہقہے لگاتا ہے جس سے ایک نیم تاریک فضا میں عجیب خوف کا احساس ہوتا ہے۔ تیز ہوا کے جھونکے کمرہ میں داخل ہوتے ہیں اور جلتا ہوا چراغ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بجھ جائے گا۔ ان ہواؤں کے ساتھ سردی کا احساس بڑھتا جاتا ہے۔ شیر علی برابر قہقہے لگاتا ہے۔ عورت تیز ہوا۔ سردی اور شیر علی کے قہقہوں سے کانپنے لگتی ہے۔ شیر علی کچھ دیر بعد اپنے قہقہوں پر قابو پاکر)

شیر علی : تم الف لیلیٰ کے قصوں پر یقین کرتی ہو؟

نگہت : ہرگز نہیں۔

شیر علی : تو پھر ان قصوں سے ڈر کیوں رہی ہو۔

نگہت : مگر آج کی رات کا ماحول اور واقعات الف لیلیٰ کی کسی داستان سے کم نہیں۔

شیر علی : (قہقہہ مار کر اپنی بندوق کاندھے پر لٹکا کر) اچھا— خیر اب میں چلتا ہوں۔ (نگہت ایک دم جیسے گھبرا جاتی ہے۔ شیر علی غور سے نگہت کو دیکھ کر) اپنے گلے میں پڑے ہوئے نکلس کو چھپالو۔ اگر فضلو کی نظر پڑگئی تو کہیں وہ— (نگہت سوالیہ نظروں سے خوف زدہ انداز میں اسے دیکھتی ہے) ہاں ہاں— وہ

اکثر بھولے بھٹکے مسافروں کو لوٹ بھی لیتا ہے۔

نکہت : میں مسافر ہوں۔ میری گاڑی راستہ میں خراب ہوگئی تھی میرے شوہر اسے لینے گئے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے۔ مگر تم کون ہو۔

مرد : میں فضلو ہوں اِس کوٹھی کا مالک۔

نکہت : مالک!

فضلو : مالک نہیں تو کیا نوکر۔ تم نے یہ خرگوش کیوں مار ڈالا۔

نکہت : میں نے مار ڈالا!

فضلو : (غصہ سے) اور کس نے مار ڈالا۔ ابھی ابھی کوٹھی میں بندوق چلی تھی۔ میں دوڑتا ہوا آیا تو یہ مردہ پڑا تھا۔

نکہت : (سہمے ہوئے لہجہ میں) مگر میں نے گولی نہیں چلائی۔

فضلو : تم نے گولی نہیں چلائی! (تحکمانہ لہجہ میں) پھر آخر کون تھا جس نے گولی چلائی۔

نکہت : وہ ایک اور شخص تھا۔

(فضلو غور سے نکہت کے گلے میں پڑے ہوئے نکلس کو دیکھتا ہے۔ نکہت سہم جاتی ہے اور نکلس کو بلاؤز میں چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ فضلو قہقہے مار کر ہنستا ہے۔ پھر ایک دم اپنے قہقہوں پر قابو پا کر)

فضلو : وہ ایک اور شخص تھا (دھمکانے کے لہجہ میں) دیکھو اجنبی عورت آج تک کسی نے فضلو کے سامنے جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں کی۔ سچ سچ بتاؤ وہ کون شخص تھا؟

نکہت : میں سچ کہہ رہی ہوں۔ کافی لمبا چوڑا مرد تھا۔ اِس کی بڑی بڑی مونچھیں اور سرخ سرخ آنکھیں تھیں۔

فضلو : اور وہ سیاہ اوور کوٹ پہنے تھا۔ (نکہت اثبات میں سر ہلاتی ہے) اور فیلٹ کیپ لگائے تھا۔

نکہت : جی ہاں—

فضلو : (غصہ سے) اس کی یہ ہمت (خرگوش غصہ سے کمرہ میں پھینک کر تیز تیز

قدموں سے لنگڑاتا ہوا اس کمرہ میں جاتا ہے جس میں خرگوش گیا تھا۔ چند سیکنڈ بعد بندوق لیے ہوئے آتا ہے اور غصہ سے لوڈ کرتے ہوئے) آج وہ میری گولی سے نہیں بچ سکتا۔

نگہت : (بہت ہی سہمے ہوئے انداز میں) مگر وہ—

فضلو : وہ شیر علی تھا۔ مشہور ڈاکو۔

نگہت : مشہور ڈاکو— میرے خدا—

فضلو : ڈرو نہیں— (پھر اس انداز سے جیسے خود سے کہہ رہا ہو) آج تک کسی کو میرے علاقہ میں آنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اِس کی یہ جرأت کہ میرے گھر میں گھس کر گولی چلا دی۔ (کچن میں سے ایسی آوازیں آتی ہیں جیسے کوئی اسٹوو جل رہا ہو۔ نگہت اِس طرف کان لگا کر سنتی ہے۔ فضلو نگہت کی طرف دیکھ کر، ڈرو نہیں کبھی کبھی یہاں ایسی آوازیں بھی آتی ہیں جیسے کوئی اسٹوو جلا رہا ہو اور کبھی کبھی پیالیوں کے کھڑکھڑانے کی بھی آوازیں آتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک انگریز چائے بناتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ وہ میرا دودھ بھی اکثر پی جاتا ہے۔

نگہت : مگر—

فضلو : خاموش رہو (ایک ٹارچ نگہت کے ہاتھ میں دے کر) یہ لو اور جونہی میں کہوں ٹارچ روشن کردینا۔ اِس سامنے والی کھڑکی میں سے دیکھوں تو آج شیر علی میری گولی سے کیسے بچتا ہے۔

نگہت : مگر میں—

فضلو : خاموش رہو۔ فضلو کا نشانہ کبھی خالی نہیں جاتا (ٹارچ اس کی طرف بڑھا کر) یہ لو۔ نگہت ڈرتے ہوئے ٹارچ لیتی ہے) اور ہاں جونہی میں کہوں ٹارچ فوراً روشن کردینا۔ کھڑکی کے پاس جاکر کھڑی ہوجاؤ۔ (نگہت سہمے ہوئے انداز میں کھڑکی کے پاس جاکر کھڑی ہوجاتی ہے۔ فضلو لنگڑاتا ہوا اس کی طرف جاتا ہے۔ نگہت اِس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کی طرف دیکھتی ہے۔ فضلو ہنس کر،

س سے یہ میری ٹانگ جاتی رہی۔

فضلو : اس نے گولی مار کر میری ٹانگ توڑ دی ہے (قہقہہ مار کر) آج تک کوئی مرد ایسا پیدا نہیں ہوا جو فضلو پر گولی چلا سکے۔ (قہقہہ مار کر ہنستا ہے اور پھر خاموش ہوجاتا ہے۔ کچھ دیر بعد جھاڑیوں میں کچھ کھڑکھڑاہٹ ہوتی ہے۔ فضلو بندوق چلانے کے لیے تیار ہوکر آہستہ سے) وہ آرہا ہے۔ ٹارچ جلاؤ۔ (نگہت ٹارچ جلاتی ہے مگر خوف سے اس کے ہاتھ کانپتے ہیں اور ٹارچ گل ہوجاتی ہے) عجیب عورت ہو اِسے ہوشیار کر دیا (نگہت کے ہاتھ سے ٹارچ زمین پر گر پڑتی ہے۔ فضلو ٹارچ اٹھا کر جلاتا ہے۔ آواز جیسے کوئی ناک میں بول رہا ہو۔ "میری مچھلی کہاں ہے۔" فضلو قہقہہ مار کر، ارے یہ تو وہی کم بخت انگریز تھا۔

نگہت : انگریز!

فضلو : ہاں جس نے یہ کوٹھی بنوائی تھی (نگہت بالکل بدحواس ہوجاتی ہے) ڈرو نہیں وہ نقصان نہیں پہنچاتا۔ (نگہت ڈر سے کانپنے لگتی ہے) تمھیں سردی لگ رہی ہے (کچن کی طرف اشارہ کرے) یہ کچن ہے اس میں جاکر کافی بنالو۔

نگہت : نہیں مجھے سردی نہیں لگ رہی ہے۔

فضلو : میں کہتا ہوں جاؤ — یہاں سردی کا موسم خطرناک ہوتا ہے۔

نگہت : مگر وہاں —

فضلو : وہاں کیا ہے۔ بولتی کیوں نہیں۔

نگہت : (سہمے ہوئے لہجہ میں) خرگوش

فضلو خرگوش! کیسے خرگوش، (قہقہہ مار کر) ارے وہ مسافروں والے خرگوش (نگہت اثبات میں سر ہلاتی ہے (فضلو پھر قہقہہ مار کر) جاؤ جاؤ (نگہت کھڑی رہتی ہے۔ فضلو تحکمانہ لہجے میں) میں کہتا ہوں جاؤ۔ (ٹارچ نگہت کو دیتے ہوئے) یہ لو اور اسٹوو جلا لینا (نگہت ڈرتی ڈرتی کچن کی طرف جاتی ہے) اور ہاں

نعمت خانہ پر جو دودھ رکھا ہے اِسے ہاتھ نہ لگانا۔ (نگہت مڑ کر فضلو کو دیکھتی ہے) جاؤ جاؤ ڈرو نہیں۔ وہ اس انگریز کے لیے ہے۔ جب میں اس کم بخت کے لیے دودھ نہیں رکھتا وہ میرا دودھ پی جاتا ہے۔

نگہت : (مڑ کر) میں نہیں جاتی۔

فضلو : (تحکمانہ لہجہ میں) جاؤ۔ بلا وجہ ڈرو نہیں وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا (نگہت کچن کے دروازہ کے پاس جاتی ہے۔ کچن میں کسی کے چلنے پھرنے کی آہٹ ہوتی ہے۔

نگہت : کچن میں کوئی شخص ہے۔

فضلو : فضول شک میں نہ پڑو— جاؤ— (نگہت ہمت کر کے دروازہ کھولتی ہے۔ کچن میں سے تیزی سے کسی شخص کے دوسرے کمرہ میں جانے کی آواز، جاؤ— (نگہت کچن میں چلی جاتی ہے پھر ناک میں بولنے کی آواز ـ''میری مچھلی کہاں ہے۔' نگہت چیخ مار کر پھر اسی کمرہ میں بھاگ آتی ہے) کیا بات ہے؟

نگہت : وہ انگریز— مچھلی

فضلو : لاحول ولا قوۃ۔ تم نے تو پریشان کر دیا (نگہت کی طرف آتے ہوئے) میں دروازہ میں کھڑا ہو جاتا ہوں تم کافی بنا لو (نگہت اب پھر کمرہ میں جاتے ہوئے ہچکچاتی ہے) جاؤ ڈرو نہیں۔ تم شہری لوگ بہت ڈرتے ہو۔ مجھے تو دیکھو میں دن رات، اسی جگہ رہتا ہوں مگر وہ انگریز مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکا (نگہت پھر ہمت کر کے کچن میں چلی جاتی ہے۔ فضلو دروازہ پر کھڑا رہتا ہے۔ پھر ایک دم چونک کر، یہ لالٹین تم نے جلائی ہے۔

نگہت : نہیں۔

فضلو : تو پھر کس نے جلائی ہے۔ اوہ یہ بھی اِسی منحوس انگریز کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔

نگہت : مگر کافی تو تیار میز پر رکھی ہے۔

فضلو : کافی تیار رکھی ہے! کیا کہہ رہی ہو!! نگہت کی آواز نہیں آتی، یہ بھی اِسی منحوس انگریز کی شرارت ہے۔ اچھا وہی کافی اٹھا لاؤ (نگہت بھاگتی ہوئی پھر اس کمرہ

میں آجاتی ہے) کیا بات ہے؟

نکہت : (بے دم سی ہوکر) خرگوش۔

فضلو : کہاں ہے؟

نکہت : کچن میں۔

فضلو : کچن میں! اچھا تم یہاں بیٹھو۔ میں اِس منحوس کی بنائی ہوئی کافی ہی اٹھائے لاتا ہوں۔ (کچن میں جاتا ہے اور جلدی میں کافی لے کر آتا ہے) یہ لو پی لو۔ تم ڈر بھی رہی ہو اور سردی بھی زیادہ ہے۔

نکہت : میں یہ کافی نہیں پیوں گی۔

فضلو : کافی نہیں پیوں گی! کیوں؟ (قہقہہ مار کر ہنستا ہے) تم انگریز سے ڈر رہی ہو۔ میں نے کہہ دیا کہ وہ تم کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ یہ کافی پی لو۔

نکہت : نہیں نہیں نہیں (رونے لگتی ہے) خدا کے لیے مجھے مجبور نہ کرو۔

فضلو : نہیں پینا تو نہ پیو رو کیوں رہی ہو (دور سے موٹر کے ہارن کی آواز) شاید تمھارے شوہر آرہے ہوں۔ (نکہت کے چہرہ پر اطمینان کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ فضلو مسکرا کر) لو اب تو کافی پی لو۔ (نکہت نفی میں سر ہلاتی ہے۔ بندوق چلنے کی آواز۔ فضلو ایک دم اپنی بندوق اٹھا کر) یہ ضرور شیر علی نے چلائی ہے۔ (لنگڑاتا ہوا تیز تیز دروازہ کی طرف جاتے ہوئے) کہیں کم بخت نے تمھارے شوہر پر نہ چلا دی ہو۔ میں اِسے ابھی جا کر سمجھتا ہوں۔ (کمرہ سے چلا جاتا ہے۔ نکہت پھر کمرہ میں تنہا رہ جاتی ہے۔ اس کے چہرہ پر انتہائی خوف کے آثار ہیں۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیتی ہے۔ موٹر کی آواز قریب تر ہوتی جاتی ہے۔ نکہت گھبرائے انداز میں کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہوجاتی ہے۔ شمیمہ بغل میں ایک خرگوش دبائے ہوئے اِس کمرہ سے آتی ہے جس میں خرگوش گیا تھا۔ نکہت کو دیکھ کر۔

شمیمہ : ارے آپ کافی نہیں پلا رہی ہیں۔

(نکہت ایک دم پلٹ کر چیخ مارتی ہے۔ شمیمہ بغل میں خرگوش دبائے کھڑی مسکراتی ہے۔ نکہت کو جیسے شمیمہ کے مسکرانے سے اطمینان ہوتا ہے۔ شمیمہ برابر خرگوش پر ہاتھ پھیرتی رہتی ہے)۔

نکہت : آپ کون ہیں؟

شمیمہ : میں! (مسکرا کر) میں مسز فضل علی ہوں۔

نکہت : مسز فضل علی!

شمیمہ : جی ہاں (نکہت خوف زدہ نظروں سے خرگوش کو دیکھتی ہے) آپ کافی پیجیے نا۔

نکہت : نہیں۔ میں یہ کافی نہیں پیوں گی۔ (شمیمہ اطمینان سے خرگوش پر ہاتھ پھیرتی ہے) یہ فضلو کون ہے؟ (شمیمہ مسکراتی ہے مگر جواب نہیں دیتی) یہ لنگڑا جو ابھی ابھی یہاں تھا۔

شمیمہ : یہاں تو کوئی لنگڑا فضلو نہیں ہے۔

نکہت : کیسے نہیں ہے۔ وہ ابھی ابھی یہاں تھا اور بندوق کی آواز سن کر گیا ہے۔

شمیمہ : (مسکرا کر) یقین کیجیے یہاں کوئی لنگڑا فضلو نہیں ہے میں ہاں دس سال سے ہوں اور آج تک کسی لنگڑے فضلو کو نہیں دیکھا۔

نکہت : یا میرے خدا— (پھر کچھ سوچ کر) آپ مشہور ڈاکو شیر علی کو جانتی ہیں (شمیمہ نفی میں سر ہلاتی ہے) آپ شیر علی کو بھی نہیں جانتیں جس نے انگریز پر گولی چلائی تھی جس کی بڑی بڑی مونچھیں اور سرخ سرخ آنکھیں ہیں۔

شمیمہ : جی نہیں میں ایسے کسی شیر علی کو نہیں جانتی جس کا حلیہ آپ بتا رہی ہیں۔ ہاں میں ایک شیر علی کو ضرور جانتی ہوں جو مسٹر فضل علی کے گہرے دوست ہیں مگر وہ نہ تو ڈاکو ہیں اور نہ ان کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں۔ وہ قطعی کلین شیو ہیں اور مشہور شکاری۔ (کوٹھی کے احاطہ میں موٹر کا ہارن) یہ کس کی موٹر ہے۔ (کھڑکی سے باہر جھانکتی ہے۔ نکہت تیز تیز قدموں سے کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے)

نکہت : میرے شوہر آ گئے۔

(نیچے سے ایک بچی کے چیخنے کی آواز۔ "آنٹی، آنٹی۔")

شمیمہ : آجاؤ گڈی۔

(چند سیکنڈ خاموشی رہتی ہے۔ پھر ایک دس گیارہ سالہ بچی دوڑتی ہوئی کمرہ میں آ کر شمیمہ سے)

گڈی : آنٹی (شمیمہ سے لپٹ کر) لایئے خرگوش مجھے دیجیے۔

شمیمہ : (خرگوش دیتے ہوئے، تم نے اپنی آنٹی کو آداب نہیں کیا۔ (گڈی پلٹ کر نکہت کو دیکھتی ہے اور شرما کر ہاتھ اٹھا کر سلام کرتی ہے)۔ یہ تمھارے چچا نسیم کی بیگم ہیں۔

(نسیم۔ شیر علی اور فضلو داخل ہوتے ہیں۔ فضلو اب لنگڑا نہیں رہا ہے۔ نکہت حیرت سے تینوں کو دیکھتی ہے۔ تینوں مسکراتے ہیں۔ گڈی شیر علی کو دیکھ کر)

لڑکی : پاپا یہ موچھیں میں لوں گی۔

(شیر علی مسکرا کر موچھیں اپنے چہرہ سے نکال کر گڈی کو دیتا ہے۔ گڈی اپنے چہرہ پر لگا کر کودتی ہے)

شیر علی : (مسکرا کر) معاف کرنا بھابی۔ ہم نے سوچا آپ پہلی بار آ رہی ہیں تو آپ کا سواگت شاندار ہو جائے۔ میرا نام شیر علی ہے۔ (فضل کی طرف اشارہ کر کے) یہ مسٹر فضل علی ہیں اور خرگوشوں کی تجارت کرتے ہیں۔ (شرارت سے مسکرا کر) یہ سواگت مہنگا تو نہیں تھا۔

نکہت : (مسکرا کر شرم سے گردن جھکائے ہوئے) تھا تو بہت ہی مہنگا۔

(پردہ)

(مطبوعہ: رسالہ 'کپ ڈنڈی' امرتسر، جولائی 1961)

مانڈو کا پھول

کردار

(1) باز بہادر (مانڈو کا سلطان) (2) روپ متی (باز بہادر کی ملکہ) (3) رضیہ (روپ متی کی سہیلی) (4) ٹھاکر (روپ متی کا باپ) (5) ادھم خاں (اکبر کی فوجوں کا سپہ سالار، مصاحب، درباری، رقاصہ وغیرہ

پہلا سین

منظر:

(باز بہادر کا محل: باز بہادر ایک گاؤ تکیہ سے سہارا لیے بیٹھا ہے۔ کچھ مصاحب بیٹھے ہیں۔ ایک رقاصہ رقص کر رہی ہے۔ رقص ختم ہونے کے بعد باز بہادر کھڑا ہو جاتا ہے۔ تمام مصاحب اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ باز بہادر رقاصہ کے پاس جاتا ہے اور اپنے گلے سے موتیوں کا ہار اتار کر رقاصہ کو پہنا کر)

باز بہادر : ہم تمھارے فن سے بے حد خوش ہوئے رقاصہ! یہ تمھارا انعام ہے۔

رقاصہ : (جھک کر سلام کرتے ہوئے) جہاں پناہ کی ذرہ نوازی ہے کہ ناچیز کی

ہمت افزائی فرمائی۔ حضور کا نیر اقبال تا ابد روشن رہے۔

باز بہادر : ہم فن کاروں کی قدر کرتے ہیں۔ آج سے تم ہماری خدمت میں رہوگی!

رقاصہ : (سلام کرتے ہوئے) کنیز کے لیے یہ حوصلہ افزائی باعث فخر ہوگی۔

باز بہادر : (ایک مصاحب کی طرف مخاطب ہوکر) غضب کا رسیلا گلا ہے ظالم کا اور بدن کا لوچ تو خود رقصِ مجسم ہے۔

مصاحب خاں: بجا ارشاد فرمایا جہاں پناہ نے۔

باز بہادر : مصاحب خاں! تم نے ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کے دربار بہت دیکھے ہیں۔ دلی کے دربار کی بہار بھی دیکھی ہے۔ ایران اور مصر کے دربار بھی تمھاری نظروں میں ہیں۔ سچ بتاؤ۔ کیا ان درباروں میں ہمارے فن کاروں کا کوئی ثانی ہے؟

مصاحب خاں: جہاں پناہ! اس کمترین نے ہفت اقلیم کی بادشاہتیں دیکھی ہیں۔ لیکن فن ہر جگہ اجڑا پڑا ہے۔ کہیں فن کار ہوس پرست امرا کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں کہیں شہنشاہوں کی خونی تلواریں ان کا تعاقب کررہی ہیں۔ کہیں شہزادوں کی جوانیاں فن کاروں کے گلے کا رس اور بدن کا لوچ لوٹ رہی ہیں — فن کار کہیں آزاد نہیں۔

باز بہادر : یہ فن کی توہین ہے۔ کلاکاروں کی توہین ہے۔ یہ خدا کی سب سے بڑی نعمت کی ناشکرگزاری ہے۔

مصاحب خاں: بجا ارشاد فرمایا جہاں پناہ نے — فن کی ترقی کے لیے امن و امان کی ضرورت ہے۔ فن رزم گاہ میں نہیں بزم میں پرورش پاتا ہے۔ فن توپوں کی گرج میں نہیں پائل کی جھنکار میں ہے۔ نغمے گولیوں کی سنسناہٹ میں نہیں، قہقہوں میں ہیں۔

باز بہادر : مصاحب خاں! آخر دنیا نے ہزاروں سال کے تجربے کے بعد اس راز کو کیوں نہیں پایا۔ دنیا آخر کب تک خونی ہولی کھیلتی رہے گی۔ یہ دور کب ختم

ہوگا اور وہ دور کب آئے گا۔ جب توپوں کی گرج پائل کی جھنکار میں تبدیل ہوجائے گی۔

مصاحب خاں: جب خدا کی پھیلائی ہوئی زمین پر میرا اور تیرا باقی نہ رہے گا۔ جب انسانوں کے ہاتھوں میں خونی تلواریں نہ ہوں گی۔

باز بہادر : ہم تمھارے اس جواب سے خوش ہوئے مصاحب خاں!

مصاحب خاں: (جھک کر سلام کرتے ہوئے) جہاں پناہ کی ذرّہ نوازی ہے۔

باز بہادر : ہم چاہتے ہیں کہ دنیا میں امن و امان ہو، عیش و عشرت ہو۔ اگر ہم اپنے محل میں عیش میں مشغول ہوں تو مزدور اپنے جھونپڑوں میں رنگ رلیاں منائے اور کسان کے لیے ہر دن عید اور ہر شب شبِ برات ہو۔ ہرن کو شکاری کا خوف نہ ہو اور بلبل صیاد کے دام سے آزاد رہے۔

مصاحب خاں: حضور کا اقبال بلند ہو۔ ایک کلاکار اور شاعر کی اس سے بڑھ کر اور کیا تمنا اور خواہش ہوسکتی ہے!

باز بہادر : لیکن مصاحب خاں! تم نے ہمارے اس سوال کا جواب نہیں دیا۔

مصاحب خاں: کس سوال کا جہاں پناہ!

باز بہادر : کہ کیا تم نے ہمارے فن کاروں کا ثانی کسی دربار میں دیکھا ہے۔

مصاحب خاں: میں نے عرض تو کیا جہاں پناہ کہ نہیں— مگر—

باز بہادر : ہاں ہاں بولو۔ تم خاموش کیوں ہوگئے؟

مصاحب خاں: لیکن جہاں پناہ—

باز بہادر : شاید تمھیں اپنے جہاں پناہ سے خوف ہے کہ وہ تمھارے ساتھ بے انصافی کرے گا۔ تمھیں آزادی سے بولنے کی اجازت ہے۔

مصاحب خاں: جب حضور نے بولنے کی اجازت عطا فرمائی ہے تو یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ ہزاروں پھول جنگل میں کھلتے ہیں اور ان کی بہار دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔

باز بہادر : ہم تمھارا مطلب نہیں سمجھے۔ صاف صاف کہو وہ کون سا پھول ہے جو جنگل میں کھلا ہے اور اب تک ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے۔ ہم اس پھول کی تلاش میں دریا اور صحرا ایک کر دیں گے۔

مصاحب خاں: جہاں پناہ! وہ سارنگ پور کے ٹھاکر کے گھر کی ایک نوخیز کلی ہے۔

باز بہادر : سارنگ پور! ہم کئی مرتبہ شکار کھیلتے ہوئے وہاں گئے ہیں۔ لیکن ہمیں کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟

مصاحب خاں: دیکھ تو وہی سکتا ہے جو اس کے حسنِ جہاں سوز کی تاب لا سکے۔ کلیم تو ایک جھلک کی تاب نہ لا سکے اور بے ہوش ہوکر گر پڑے۔ وہاں تو تمام تجلّیاں اس رخِ انور میں مچل رہی ہیں۔

باز بہادر : تم ہمارے شوقِ دید کو شہ دے رہے ہو، مصاحب خاں کیا نام ہے اس پری جمال کا؟

مصاحب خاں: روپ متی! جہاں پناہ — وہ حسن کی دیوی ہی نہیں رقص اور موسیقی میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ میرے پاس وہ الفاظ کہاں کہ اس کی تعریف کر سکوں۔

باز بہادر : مصاحب خاں۔

مصاحب خاں: جہاں پناہ! یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے۔ یہ ایسی ہی سچائی ہے۔ جیسے ہم روز سورج کو طلوع ہوتے دیکھتے ہیں۔ جب وہ ستار پر کوئی دھن چھیڑتی ہے تو ہرن کلیل کرنا بھول جاتے ہیں۔ پانی کی لہریں اس کو سر اٹھا اٹھا کر دیکھتی ہیں — طاؤس اپنا رقص بھول جاتا ہے۔ فضا ساکت ہوجاتی ہے جہاں پناہ۔

باز بہادر : مصاحب خاں —

مصاحب خاں: جہاں پناہ! اس کی انگلیاں مخروطی ہیں، آنکھیں نرگسی ہیں، زلفیں شب فرقت سے دراز ہیں، گردن صراحی دار ہے۔ اس کے دانت الماس کی طرح ہیں۔ پیشانی ہلال کو شرماتی ہے ابرو دودھاری تلوار ہیں، عارضِ رنگین سے گلاب شرماتا ہے۔ اگر وہ اپنا جوڑا کھول دے تو دنیا میں اندھیرا ہوجائے۔

باز بہادر : مصاحب خاں!

مصاحب خاں: جہاں پناہ:

جو ہاتھوں کو رنگِ حنا مل گیا ہے
ہتھیلی پہ گویا کنول کھل گیا ہے

اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ایک ایسی کلاکار ہے ۔

''اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک''

باز بہادر : یہ سب مبالغہ ہے۔

مصاحب خاں: جہاں پناہ یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے۔ میرے کانوں نے اس کے نغمے سنے ہیں۔ میں نے اُسے محوِ خرام دیکھا ہے۔

باز بہادر : ہمارے دل میں اسے دیکھنے کا شوق بیتاب ہو گیا ہے— علی خاں!

علی خاں : (جھک کر سلام کرتے ہوئے) ارشاد عالی! جہاں پناہ!

باز بہادر : ہم شکار کھیلنے سارنگ پور جائیں گے۔ تیاری کا حکم کرو۔

علی خاں : جو ارشاد جہاں پناہ!

(علی خاں جھک کر سلام کرتا ہے۔ باز بہادر جاتا ہے)

(پردہ)

دوسرا سین

(ایک جنگل کا منظر۔ روپ متی اور رضیہ آتی ہیں روپ متی چاروں طرف دیکھتی ہے جہاں بسنتی پھول کھلے ہیں۔ پھر رضیہ سے مخاطب ہو کر—)

روپ متی : اری رضو! دیکھ تو کیسے بسنتی پھول کھلے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ جنگل میں منگل منایا جائے۔ جا میرا ستار تو لا۔

رضیہ : نا— روپا— میں تو نہیں جاتی۔

روپ متی : (کیوں؟— کیا تیرا جی اس بہار کو دیکھ کر) نہیں مچلتا؟

رضیہ : مچلتا تو ہے — پھر —

روپ متی : پھر کیا؟ — بولتی کیوں نہیں

رضیہ : مجھے تیرا خیال ہے۔

روپ متی : میرا کیا خیال ہے؟

رضیہ : کہ کہیں کوئی دشمن آ گیا تو میری شکنتلا کو لے اڑے گا۔

روپ متی : چل جا میں تیری سفارش کر دوں گی کہ ہماری رضیہ کو بہت دن سے کسی کی تلاش ہے۔ جا اب تو میرا ستار لے آ (رضیہ جاتی ہے اور روپ متی ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی ہے۔ رضیہ واپس آتی ہے اور روپ متی کو کچھ کھوئی کھوئی سی دیکھ کر)

رضیہ : کیوں کیا بات ہے روپا؟

روپ متی : کچھ نہیں رضیہ۔ میں ایک خواب دیکھ رہی تھی۔

رضیہ : اوہو! اب تو دشمن کے خواب دکھائی دینے لگے کیا۔ خواب دیکھ رہی تھی؟

روپ متی : کچھ نہیں۔ چل لا ستار دے!

(ستار رضیہ کے ہاتھ سے لیتی ہے اور تاروں پر انگلی رکھتی ہے۔ اس وقت ایک ہرن کے پیچھے باز بہادر تیر کمان میں جوڑے ہوئے آتا ہے، ستار کی آواز سن کر ادھر متوجہ ہوتا ہے ایک درخت کی آڑ میں چھپ جاتا ہے۔ روپ متی گاتی ہے)

(گانا ختم ہونے کے بعد باز بہادر آگے بڑھتا ہے۔ علی خاں جو اس کے ساتھ ہے)

علی خاں : کیا حکم ہے سرکار؟

باز بہادر : خاموش!

رضیہ : (ان دونوں کو دیکھ کر) یہ کون گستاخ اس جنگل میں چلا آیا ہے۔ معلوم نہیں یہاں روپ متی کی حکومت ہے۔ اے میاں شکاری تم شکار کھیلتے ہو یا تاک

جھانک کرتے ہو۔ چلو چلو اپنی راہ لو!

باز بہادر : کیا تمھاری رانی نے پردیسیوں سے یہی سلوک کرنا سکھایا ہے (روپ متی سے)—

تو کہ رنگین خوابوں میں کھوئی ہوئی ہے۔ اتنی غافل ہے گویا کہ سوئی ہوئی ہے۔

رضیہ : اے ہے یہ تو بڑا نٹ کھٹ ہے۔

روپ متی : رضو! ان سے پوچھو کیا راستہ بھول گئے ہیں۔ کہاں جانا ہے؟

باز بہادر : ایک بھولے بھٹکے مسافر کو اس کی راہ مل گئی ہے۔

رضیہ : اے ہے بڑے زبان دراز ہو۔ تم کوئی کوی ہو یا ڈاکوؤں کے سردار؟

باز بہادر : میں حسن کا پجاری ہوں۔ کلا کا عاشق ہوں۔ نرت پر جان دیتا ہوں۔ سنگیت پر مرتا ہوں۔

روپ متی : ان سے پوچھو کس دیس کے رہنے والے ہیں؟

باز بہادر : جہاں شانتی ہو، امن ہو، نغمے ہوں، پازیب کی جھنکار ہو بس وہیں میرا وطن ہے۔ انسانیت سے مجھے محبت ہے۔ فن اور کلا میرا مذہب ہے۔

روپ متی : ان سے پوچھو کیا ایک روز ہمارے مہمان بننا پسند کریں گے؟

باز بہادر : یہ میرے لیے باعث فخر ہوگا۔

رضیہ : مگر جب آپ کلاکار ہیں تو پھر یہ تیر یہ کمان یہ تلوار اور پیٹھ پر یہ ڈھال کیوں ہے؟

باز بہادر : یہ تیر کمان اور یہ تلوار میری زندگی نہیں اور نہ مجھے ان سے دلچسپی ہے یہ تو ایسی ہی ہیں جیسے ایک باپ اپنے بچوں کی حفاظت کے لیے تیر و کمان اپنے پاس رکھ لے۔

(دور سے روپ متی کے باپ کی آواز، روپا، روپا)

روپ متی : پتا جی آرہے ہیں۔

رضیہ : (گھبرا کر) اب کیا ہوگا؟ اے میاں مسافر اپنی راہ لو اگر پتا جی نے دیکھ لیا تو خیر نہیں۔

باز بہادر : مگر تمھاری روپا نے تو ہمیں اپنا مہمان بنا لیا ہے۔ (ٹھاکر کا داخلہ اور روپ متی سے مخاطب ہوکر)

ٹھاکر : روپا تم یہاں کیا کررہی ہو۔ میں کب سے تمھارا انتظار کررہا ہوں۔ میں نے آج ایک نئی دھن نکالی ہے۔ (باز بہادر کو دیکھ کر) تم کون ہو؟

باز بہادر : آپ کا مہمان۔

ٹھاکر : میرے مہمان؟

روپ متی : پتا جی یہ ہمارے مہمان ہیں۔ انھیں نرت اور سنگیت سے پریم ہے۔

ٹھاکر : نرت اور سنگیت سے پریم ہے! (باز بہادر کو غور سے دیکھ کر) نہیں یہ نہیں ہوسکتا جس کے کاندھے پر کمان ہو۔ جس کا ترکش تیروں سے بھرا ہوا ہو۔ جس کی پیٹھ پر ڈھال ہو جس کی کمر میں تلوار ہو وہ نرت اور سنگیت کا پریمی نہیں وہ پائل کی جھنکار میں نغمے نہیں سن سکتا۔ وہ قہقہوں کا پجاری نہیں دشمن ہے۔

باز بہادر : ٹھاکر! اگر تمھیں فن اور کلا کو بچانے کے لیے تلوار اٹھانا پڑے۔ اگر تمھیں امن کی حفاظت کے لیے تیر چلانا پڑیں تو کیا تم خاموش رہو گے؟

ٹھاکر : ہرگز نہیں!

باز بہادر : تو پھر مجھے کیوں دوش دیتے ہو؟

ٹھاکر : (باز بہادر کو غور سے دیکھ کر) مگر تم— مگر آپ— ہیں کون مہاراج—؟

باز بہادر : مہاراج نہیں اپنی پرجا کا سیوک۔

ٹھاکر : نہیں نہیں مہاراج ایسا نہ کہو۔ ہم سے بڑی بھول ہوئی۔ اری روپا یہ تو ہمارے مہاراج ہیں— آیئے مہاراج پدھاریے ہم آپ کی کیا سیوا کرسکتے ہیں؟

باز بہادر : سیوا کرنا تو ہمارا کرتو ہے۔ کچھ ہمیں حکم دیجیے۔

ٹھاکر : مہاراج پدھاریے۔ غریب کی کٹیا آپ کے چرنوں سے سورگ بن جائے گی۔ میری اولاد ہمیشہ گھمنڈ سے کہے گی کہ اس میں دیوتاؤں کے پوتر چرن آئے تھے۔ مہاراج ہمیں نراش نہ کیجیے!

باز بہادر : مگر اس وقت ٹھاکر—؟

ٹھاکر : نہیں مہاراج یہ نہیں ہوسکتا۔ جب آپ روپا کو وچن دے چکے ہیں کہ ہمارے مہمان رہیں گے تو پھر اپنے وچن سے نہ پھریے۔ اگر مہاراج نے اپنے وچن کا پالن نہیں کیا تو پرجا کے لیے یہ کوئی اچھی مثال نہ ہوگی۔

باز بہادر : آپ کا خلوص ہمارا دامن پکڑ رہا ہے۔ چلیے (باز بہادر آگے آگے جاتا ہے۔ اس کے پیچھے ٹھاکر۔

روپ متی : علی خاں اور رضیہ آتے ہیں۔

(پردہ)

تیسرا سین

ٹھاکر کا مکان:

ٹھاکر : مہاراج! ہماری اس جھونپڑی کی قسمت پر اب سورگ بھی شرمائے گا۔

باز بہادر : ٹھاکر ہمیں مہاراج نہ کہو ہم تو پرجا کے امین ہیں۔ ہم اسی وقت تک مہاراج ہیں جب تک اپنا فرض ادا کررہے ہیں۔ اگر ہم اپنی پرجا کے لیے امن و سکون اور شانتی فراہم نہیں کرسکتے تو ہم سب سے بڑے اپرادھی ہیں۔

ٹھاکر : مہاراج مالوہ کی پرجا کی اس سے بڑھ کر اور کیا خوش قسمتی ہوسکتی ہے کہ اسے آپ جیسا مہاراج مل گیا۔ جس کی پرجا کو ایسی شانتی نصیب ہے جو دیوتاؤں کے راج میں بھی میسر نہیں۔

باز بہادر : ہماری سب سے بڑی اچھائی یہی ہے کہ ہماری پرجا سکون اور شانتی سے رہے ہر جگہ نرت کلا کی محفلیں ہوں، سنگیت کے چرچے ہوں، ہم اپنی تمام رعایا کو کلاکار بنا دینا چاہتے ہیں جن کے دلوں میں انسانیت سے محبت ہوتی ہے جو دنیا کے انسانوں کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں۔ ایک فن کار اور کلاکار ہی انسانیت سے پریم سکتا ہے۔

ٹھاکر : مگر مہاراج—

باز بہادر : اگر ہم زندہ رہے تو انسانوں کو ایسے رشتے میں جوڑدیں گے جو کبھی ایک دوسرے پر تلوار نہ اٹھائیں، جن میں میرے اور تیرے کا فرق نہ ہو۔ جو اپنے مذہب پر چل کر دوسرے مذہب سے بیر نہ رکھیں۔ سب مذہب دنیا میں برابر ہیں کوئی چھوٹا اور بڑا نہیں۔ مذہب کے نام پر لڑنے والے ایسے کتے ہیں جو پانی میں اپنا عکس دیکھ کر اس پر جھپٹ پڑتے ہیں۔

ٹھاکر : مہاراج میں تو کلاکار ہوں، میں نے اپنی روپا کو دھرم ودّیا سے بڑھ کر سنگیت اور نرت کی تعلیم دی ہے اسے مانوتا سے پریم کرنا سکھایا ہے۔

باز بہادر : ابھی ہم نے اس کا سنگیت سنا۔ وہ ایسی کلی نہیں جو بن میں کھل کر مرجھا جائے۔ اگر تم مناسب سمجھو تو ہمیں اجازت دو کہ ہم اسے اپنے محل میں لے جاکر اس کی کلا کو عروج پر پہنچادیں۔

ٹھاکر : مگر مہاراج! جو کلی بن میں کھلی ہے اسے چمن کی ہوا کبھی راس نہیں آسکتی۔

باز بہادر : ٹھاکر! تمھیں شاید اپنے مہاراج پر وشواش نہیں— وہ قسم کھا کر کہتا ہے کہ وہ تمھاری روپا کو سارے مالوہ کی رانی بنا کر رکھے گا۔

ٹھاکر : نہیں مہاراج۔ آپ جیسا کلاکار کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ سچائی سے پریم ہی تو اس کا دھرم ہے۔

باز بہادر : تو پھر آپ ہم پر اعتبار کریں۔

ٹھاکر : مہاراج! میں نے اسے کلا کی دیوی کی دیوداسی بنایا ہے۔ اگر وہاں رہ کر وہ کلا دویا کی تکمیل کرسکے تو مجھے کوئی عذر نہیں۔

باز بہادر : اور ہم آپ کو وچن دیتے ہیں کہ اپنے الفاظ کا پالن کریں گے۔ یہ مہاراج باز بہادر کا وچن نہیں۔ کلاکار باز بہادر کا وچن ہے۔

ٹھاکر : رضو بیٹی— روپا کہاں ہے؟ جا اسے بلا تو لا اور کہہ کر آ کہ مہاراج کے چرن چھوئے! اسے ابھی مہاراج کے ساتھ جانا ہے (رضیہ جاتی ہے)

باز بہادر : یہ کون لڑکی ہے ٹھاکر؟۔۔۔ بڑی معصوم اور بھولی بھالی ہے۔

ٹھاکر : یہ میرے متر عزیز جان کی لڑکی ہے مہاراج مرتے سے وہ اسے میری گود میں دے گیا تھا۔ میں نے اسے اپنی ہی لڑکی کی طرح پالا ہے۔ بڑے دُکھ اٹھائے ہیں اسے پالنے میں مہاراج!

باز بہادر : ٹھاکر تم انسان نہیں فرشتہ ہو۔ تم سب سے بڑے انسان ہو۔ جو انسانیت سے محبت کرتا ہے۔

ٹھاکر : مرتے سے جب میرے متر نے رضو کو میری گود میں دیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے وہ نظروں سے کہہ رہا تھا کہ دوست یہ میری امانت ہے۔ اس کی حفاظت نہیں کی تو بھگوان کے سامنے میں تمھارا دامن پکڑوں گا۔ اسے پالنے میں میں نے راتوں کی نیند حرام کردی ہے مہاراج۔ (رضیہ اور روپ متی آتی ہیں)

باز بہادر : آؤ روپا۔۔۔ رضیہ تم بھی بیٹھو۔ آؤ ہمارے پاس بیٹھو۔

ٹھاکر : مہاراج! میں نے رضو کو بھی سنگیت ودّیا کی تعلیم دی ہے۔ (کچھ دیر خاموش رہتی ہے۔ رضیہ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور پھر دوڑ کر روپ متی سے لپٹ جاتی ہے اور روتے ہوئے ہچکیوں میں)

رضیہ : ہائے روپا۔ آج تم جارہی ہو۔ مجھے اکیلی چھوڑ کر۔ پیاری روپا اب مجھے کون محبت سے رضو کہے گا۔ کون صبح صبح مجھے سوتے سے جگائے گا۔ کون میری شرارتوں پر محبت سے مجھے گھڑکیاں دے گا۔ پیاری روپا! میں اپنا ستار توڑ ڈالوں گی۔ اب اس میں سے میٹھے نغمے نہیں نکلیں گے۔

باز بہادر : رضیہ! تجھے یہاں کون چھوڑے جارہا ہے۔ ہم تجھے اپنے ساتھ لے چلیں گے۔

رضیہ : نہیں مہاراج۔ میں تو یہیں رہوں گی۔ نہیں تو پتا جی تنہائی میں گھبرائیں گے۔

باز بہادر : ہم پتا جی کو بھی اپنے ساتھ لے چلیں گے۔

ٹھاکر : نہیں مہاراج! مجھے تو یہیں چھوڑ دیجیے۔ روپا نے کچھ درخت لگائیں وہ

پیاسے رہ کر مرجھا جائیں گے۔ میں ان کی دیکھ بھال کروں گا۔ بیٹی تو پرایا دھن ہے۔ ہم ایک سے تک اس کی رکھشا کرتے ہیں اور پھر دوسرے کی سیوا کرنے کے لیے دیتے ہیں (روپا کے سر پر ہاتھ پھیر کر) جاؤ بیٹی۔ مہاراج کو خوش رکھنا یہی تمھارا دھرم ہے۔

(روپ متی ٹھاکر سے لپٹ کر رونے لگتی ہے۔ ٹھاکر محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہتا ہے۔ باز بہادر اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے اور روپ متی کا ہاتھ پکڑتا ہے۔ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

چوتھا سین

(باز بہادر کا محل رقاصہ ناچ رہی ہے۔ ناچ ختم ہونے کے بعد)

باز بہادر : بہت خوب رقاصہ بہت خوب۔

(رقاصہ جھک کر سلام کرتی ہے۔ روپ متی اپنے گلے کا ہار اتار کر اس کی جانب پھینکتی ہے۔ رقاصہ جھک کر سلام کرتی ہے اور چلی جاتی ہے)

باز بہادر : کہو روپا۔ کیسا ناچتی ہے۔

روپ متی : اچھا ناچتی ہے مہاراج۔

باز بہادر : مگر تم بے دلی سے کہہ رہی ہو روپا!

روپ متی : نہیں تو مہاراج۔ جس کی آپ قدر کریں بھلا میری کیا مجال ہے کہ اس کے خلاف کچھ کہہ سکوں۔

باز بہادر : نہیں نہیں روپا:۔ تمھاری نظروں نے ضرور کچھ کمی دیکھی ہے۔

روپ متی : مہاراج—!

باز بہادر : کہو روپا:— بولو—!!

روپ متی : ابھی اور ریاضت کی ضرورت ہے مہاراج!

باز بہادر : ہم نے بھی کئی مرتبہ اس پر غور کیا ہے۔ ابھی نئی ہے تمھارے ساتھ رہ کر سب

برائیاں دور ہو جائیں گی— مگر روپا! جب سے تم آئی ہو کچھ اداس رہتی ہو۔
کیا ہمارا یہ محل تمھیں پسند نہیں آیا۔

روپ متی : اداس! نہیں تو مہاراج۔ میں کب اداس رہتی ہوں؟

باز بہادر : ہم نے کئی مرتبہ اس پر غور کیا ہے۔ گانا سننے کے بعد ناچ دیکھنے کے بعد کچھ اداس ہو جاتی ہو۔ کہو ہم سے کوئی بھول ہوئی—؟

روپ متی : نہیں مہاراج:— میں بہت خوش ہوں۔

باز بہادر : پھر یہ اُداسی کیسی ہے۔ شاید تم اپنے کو تنہا محسوس کر رہی ہو۔ شاید تمھیں رضیہ کی یاد آتی ہے۔

روپ متی : رضیہ— کبھی کبھی خیال ضرور آتا ہے کہتی ہوگی کہ میں اسے بھول گئی۔

باز بہادر : تو ہم اسے بلوائے لیتے ہیں۔

(تالی بجاتا ہے علی خاں آتا ہے)

علی خاں : ارشاد عالی جہاں پناہ!

باز بہادر : تم فوراً سارنگ پور جاؤ— اور ٹھاکر سے کہو کہ روپ نے رضیہ کو یاد کیا ہے۔

علی خاں : (جھک کر سلام کر کے) بہت بہتر عالی جاہ۔

(جھک کر سلام کرتا ہے اور چلا جاتا ہے)

باز بہادر : لو اب تو خوش ہو جاؤ۔ روپا!

روپ متی : مہاراج میرا کس قدر خیال رکھتے ہیں۔

(ایک ملازم کا داخلہ۔ جھک کر سلام کرتا ہے)

ملازم : عالی جاہ! سپہ سالار اعظم در دولت پر حاضر ہیں اور باریابی کی اجازت چاہتے ہیں۔

باز بہادر : اس وقت کیا کام ہے انھیں؟

ملازم : کوئی بہت ضروری کام ہے جہاں پناہ!

باز بہادر : کیا ضروری کام ہوگا۔ یہی کہ دلی کی طاقت یوں بڑھ رہی ہے۔ گجرات مالوے کو یوں گھور رہا ہے۔ بنگال کے دانت ہم پر لگے ہوئے ہیں— کہہ دو

ہمیں اس وقت فرصت نہیں۔

روپ متی : مہاراج! باریابی کی اجازت دیجیے۔ وہ کبھی بے وقت نہیں آتے۔ کوئی ضروری کام ہوگا۔ (ملازم سے) جاؤ کہہ دو مہاراج یاد فرما رہے ہیں۔

(ملازم جھک کر سلام کرتا ہے اور چلا جاتا ہے)

باز بہادر : یہاں ہمیشہ بے وقت کی بھیرویں چھڑی رہتی ہے۔

روپ متی : مہاراج! راجہ کا فرض ہے کہ وہ سوتے جاگتے۔ اٹھتے بیٹھتے کسی وقت بھی اپنے فرض سے غافل نہ ہو۔

باز بہادر : مگر روپا یہ کم بخت تو ایک منٹ بھی آرام نہیں کرنے دیتے۔ بزدلوں کو ہمیشہ دلی کا خطرہ لگا رہتا ہے۔

روپ متی : مہاراج! ہوشیار رہنا بزدلی نہیں۔ راجہ اپنی پرجا کا باپ ہی نہیں محافظ بھی ہوتا ہے۔ اگر چوکیدار غافل ہوجائے تو حفاظت کیسے ہو:

باز بہادر : روپا:— تم بہت سمجھدار ہو۔

روپ متی : مہاراج کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن ہم کو غافل سمجھ لے اور پرجا دکھ درد سے ایسی گھبرا جائے کہ وہ مجھے دوش دے کہ روپا نے مہاراج کو ہم سے چھین لیا ہے۔

(سپہ سالار داخل ہوتا ہے اور جھک کر سلام کرکے)

سپہ سالار : جہاں پناہ کا اقبال بلند ہو۔

باز بہادر : کہیے کیسے تکلیف فرمائی؟

سپہ سالار : جہاں پناہ! دلی کی طرف سے ابھی ایک ہرکارہ خبر لایا ہے کہ دلی کی فوجیں ادھم خاں کے زیر کمان مالوہ کی طرف کوچ کر رہی ہیں۔

(باز بہادر غصہ سے اٹھ کر کھڑا ہوجاتا ہے اور ران پر ہاتھ مار کر)

باز بہادر : اور تم بزدلوں کی طرح یہ خبر مجھے سنانے آئے ہو۔ جاؤ اور مالوے کی طرف نظر کرنے والوں کی آنکھیں پھوڑ دو۔ مالوے کی راتوں کا جوبن لوٹنے والوں کے ہاتھ کاٹ دو۔ تمھارے ہاتھ میں تلواریں ہیں۔ تم افغانوں کی اولاد ہو۔

(سپہ سالار جھک کر سلام کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ باز بہادر ٹہلنے لگتا ہے۔
روپ متی اسے پریشان سا دیکھ کر)

روپ متی : مہاراج! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں! ابھی افغانوں میں اتنی شکتی ہے جو
مغلوں کا منہ توڑ جواب دے سکتے ہیں۔

باز بہادر : ہاں۔ روپا افغانوں کی تلوار ابھی کند نہیں ہوئی ہے (کچھ دیر خاموش رہتی
ہے۔ روپ متی باز بہادر کا چہرہ دیکھتی رہتی ہے پھر کچھ سوچ کر)

روپ متی : مہاراج— اگر اچھا ہو تو ایک رقص ملاحظہ فرمایئے۔ میں نے آج ہی ترتیب
دیا ہے۔

باز بہادر : ہاں روپا ضرور—!

(روپ متی پاؤں میں گھنگھرو باندھتی ہے اور رقص شروع کرنے کے لیے
گھنگھرو بجاتی ہے۔ اُسی وقت بگل اور نقارہ کی آواز آتی ہے)

باز بہادر : روپ بند کردو ان گھنگھروؤں کی آواز کو۔ اب جنگ ہوگی جو ان سریلے نغموں
کو اور گھنگروؤں کی آواز کو ختم کردے گی۔ اب جنگ ہوگی مالوے کے لہلہاتے
کھیتوں میں۔ امن وسکون کا خاتمہ ہوجائے گا۔ انسانیت الٹی چھری سے ذبح
کردی جائے گی۔ اب جنگ ہوگی۔ ان لہلہاتے کھیتوں میں جن کو ہمارے
کسان اپنے خون سے سینچتے ہیں اور جن میں سنہری بالیاں لہراتی ہیں جنھیں
دیکھ کر کسانوں کے سر غرور سے اٹھ جاتے ہیں۔

روپ متی : مگر مہاراج—!

باز بہادر : روپا! اب جنگ ہوگی ہمارے ان گاؤں میں جہاں ہمارے معصوم اور بھولے
بھالے کسان بستے ہیں۔ ان ندیوں کے کناروں پر جنگ ہوگی جہاں ہماری
کنیائیں پانی بھرنے جاتی ہیں اور وہ پگڈنڈیاں روند ڈالی جائیں گی جہاں پر
معصوم دوشیزاؤں کے الڑھ قدم پڑتے ہیں— (کچھ دیر خاموشی سے ٹہلتا رہتا
ہے پھر روپ متی کو دیکھ کر) روپا!

روپ متی : مہاراج—!

باز بہادر : تلواریں اب انسانیت کا خون چوسیں گی اور برستے ہوئے تیر ارمان بھرے دلوں کو چھید ڈالیں گے۔ ان آموں کے درختوں کے نیچے جنگ ہوگی جن کے نیچے بیٹھ کر چرواہے بانسریاں بجاتے ہیں۔ اپنے محبوبوں کو بلاتے ہیں اور چھپ چھپ کر محبت کے گیت گاتے ہیں۔

روپ متی : فتح ہماری ہوگی!

باز بہادر : ضروری ہوگی!— مگر روپا مالوے کی وہ راتیں خونی چادر اوڑھ لیں گی جن میں نشیلی ہوائیں چلتی ہیں اور جن پر چاند اپنی کرنیں نچھاور کرتا ہے— روپا ہم ضرور کامیاب ہوں گے مگر کتنی مائیں بے اولاد ہو جائیں گی۔ کتنی سہاگنوں کی مانگوں کا سیندور لٹ جائے گا۔ کتنی بہنیں اپنے بھائیوں کے پیارے محروم ہو جائیں گی— روپا کاش دنیا میں جنگ کبھی نہ ہوتی—!

روپ متی : لیکن مہاراج اپنی حفاظت کے لیے تلوار اٹھانا اپنا دھرم ہے اپنا کرتو ہے۔ بڑھتی ہوئی طاقت غرور پیدا کرتی ہے۔ ولی کا سر غرور سے تن گیا ہے وہ جھک کر رہے گا۔ بھگوان انیائے نہیں کرتا۔

باز بہادر : بھگوان انیائے کرتا ہے یا نہیں— مگر باز جنگ نہیں چاہتا امن چاہتا ہے۔ اپنے لیے امن دوسروں کے لیے امن، دشمن کے لیے امن دوست کے لیے امن۔
(پھر ٹہلنے لگتا ہے پردۂ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

(پردہ)

پانچواں سین

(ٹھاکر کے مکان کے سامنے کا منظر۔ علی خاں آتا ہے۔)

علی خاں : ٹھاکر صاحب۔ ارے ٹھاکر صاحب۔

آواز : ٹھاکر صاحب گھر پر نہیں ہیں۔

علی خاں : تو پھر گھر پر کون ہے مہارانی نے مجھے بھیجا ہے۔

(رضیہ آتی ہے)

رضیہ : روپا نے تمھیں بھیجا ہے— ارے تم—؟

علی خاں : جی ہاں مہارانی نے مجھے بھیجا ہے اور آپ کو یاد فرمایا ہے۔ مجھے حکم ہے کہ میں آپ کو لے کر فوراً مانڈو پہنچوں۔ ٹھاکر کہاں ہیں؟

رضیہ : وہ تو کہیں گئے ہیں آتے ہی ہوں گے۔ کیا روپا محلوں میں رہ کر بھی مجھے نہیں بھولی کس قدر اچھی ہے وہ! وہ خیریت سے تو ہے۔ مہاراج تو اچھے ہیں؟

علی خاں : جی ہاں سب خیریت ہے۔ جلدی تیاری کیجیے!

رضیہ : (جذباتی طور پر) کس قدر اچھی ہے وہ! مجھے کس قدر پیار کرتی ہے۔ مجھے آج تک نہیں بھولی۔

علی خاں : اس چاند سے مکھڑے کو کون بھول سکتا ہے۔ وہ کون کافر ہے جو اس چاند سے مکھڑے سے پریم نہ کرے۔

رضیہ : (رضیہ کے چہرے پر سرخی آجاتی ہے اور غصہ سے) تم ہمارے گھر پر ہماری توہین کررہے ہو۔ اگر پتا جی ہوتے تو تمھیں اس گستاخی کا مزہ چکھاتے۔

علی خاں : ٹھاکر صاحب کی کیا ضرورت ہے۔ آپ ہی کوئی سزا تجویز کیجیے۔

رضیہ : بہت بدتمیز ہو۔ تمھیں ایک کنواری لڑکی سے بات کرنے کا بھی ڈھنگ نہیں آتا۔ کس احمق نے تمھیں دربار میں رکھ چھوڑا ہے۔

علی خاں : جہاں پناہ باز بہادر—

رضیہ : ہائے اللہ— مہاراج کی شان میں گستاخی!

علی خاں : یہ گستاخی نہیں حسن کی ایک معصوم شوخی ہے۔

رضیہ : تم گستاخ بھی ہو— اگر روپا سے تمھیں اس گستاخی کی سزا نہ دلواؤں تو میرا بھی نام— (ٹھاکر آتا ہے)—

پتا جی— یہ— یہ—

ٹھاکر : ارے علی خاں۔ فرمایئے کیسی تکلیف کی۔ خیریت تو ہے۔

علی خاں : جی ہاں سب خیریت ہے۔ مہارانی نے مجھے بھیجا ہے۔

ٹھاکر : وہ خیریت سے تو ہے۔ مہاراج تو خوش ہیں؟

علی خاں : جی ہاں۔ مہارانی نے رضیہ بیگم کو یاد فرمایا ہے۔

ٹھاکر : آیئے پدھاریے۔ اندر آیئے۔ اری بیٹی رضیہ یہ تو ہمارے مہمان ہیں تو نے بٹھایا تک نہیں۔ معاف کرنا علی خاں۔ ابھی بچی ہے۔ آیئے آیئے — جا بیٹی مہمان کے لیے دودھ تو لا —!

(تینوں جاتے ہیں)

پردہ

چھٹا سین

(باز بہادر کا محل۔ باز بہادر اور روپ متی گاؤ تکیہ سے ٹکے بیٹھے ہیں۔ ایک مرد اور عورت رقص کر رہے ہیں۔ دو چار منٹ رقص دیکھنے کے بعد باز بہادر تالی بجاتا ہے۔ رقص رک جاتا ہے، باز بہادر انھیں جانے کا اشارہ کرتا ہے۔ دونوں جھک کر سلام کرتے ہیں۔ باز بہادر اٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے۔ روپ متی بھی اٹھ کر کھڑی ہوتی ہے اور باز بہادر کے قریب جا کر)۔

روپ متی : کہیے مہاراج کیسی طبیعت ہے؟

باز بہادر : روپا — جو فوجیں دلی کی فوجوں کے مقابلہ کے لیے گئی تھیں ان کی کوئی خبر نہیں آئی۔

روپ متی : اچھی ہی خبر آئے گی مہاراج۔ آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں —!

باز بہادر : میرا دل آج بہت گھبرا رہا ہے۔

(پھر ٹہلنے لگتا ہے)

روپ متی : مہاراج! — میں نے آج ایک نیا گیت لکھا ہے۔ اگر آپ فرمائیں تو پیش کروں؟

باز بہادر : ہاں روپا— کوئی ایسا گیت جس سے دل بہل سکے۔ (روپ متی ستار اٹھاتی ہے اور اس کے تاروں کو چھیڑتی ہے۔ ایک ملازم داخل ہوکر خاموش کھڑا ہو جاتا ہے۔ (بہادر اسے دیکھ کر) کہو تم خاموش کیوں ہو۔

ملازم : عالی جاہ۔ ابھی ایک ہرکارہ خبر لایا ہے کہ ہمارے ہراول دستہ کو شکست ہوئی۔ ایک ایک سپاہی میدان میں کام آیا۔ دلی کی فوجیں مانڈو کے پاس پہنچ چکی ہیں۔ اگر حکم ہو تو قلعہ کے دروازے بند کر دیے جائیں۔

باز بہادر : نہیں— ہم بزدلوں کی طرح قلعہ بند ہو کر نہیں لڑیں گے۔ میدان میں جا کر مقابلہ کریں گے۔ روپا ہماری تلوار لاؤ۔ روپ متی جاتی ہے) شاید مغل ان افغانی تلواروں کو بھول گئے ہیں جنھوں نے انھیں ڈھکیل ڈھکیل کر ایران کی سرحدوں تک پہنچا دیا تھا۔ شاید وہ ان افغانی توپوں کی گرج کو بھول گئے ہیں۔ جو آج تک ان کے قلعوں میں گونج رہی ہیں۔ ابھی شیر شاہی تلوار کی دھار کند نہیں ہوئی ہے۔ ابھی افغانوں کے خون میں گری ہے۔ ابھی ان میں عزت بچانے کے لیے جان دینے کا جذبہ موجود ہے۔ (روپ متی تلوار لیے ہوئے داخل ہوتی ہے)— روپا!— آؤ اور اپنے ہاتھ سے ہماری کمر میں تلوار باندھو— اگر مغلوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ باز جنگ نہیں چاہتا امن چاہتا ہے۔ تو یہ بھی ان کی غلطی ہے ان کی بھول ہے۔ شیر اسی وقت تک کچھار میں سوتا رہتا ہے۔ جب تک اس پر پتھر نہ پھینکا جائے۔ لیکن جب اس کو جگا دیا جاتا ہے تو اس کا غصہ بے پناہ ہو جاتا ہے۔ اگر دلی دربار نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ باز صرف عیش و عشرت کا پرستار ہے تو یہ بھی ان کی غلطی ہے۔ بزم عیش میں رنگ رلیاں منانے والے باز کو آج وہ افغانی روپ میں بھی دیکھ لیں گے۔ آج انھیں معلوم ہوگا کہ اس کی تلوار کی کاٹ کس قدر تیز اور مہلک ہے! (روپ متی آگے بڑھتی ہے اور تلوار اس کی کمر سے باندھتی ہے پھر تیزی سے جاتی ہے اور آرتی کا سامان لا کر اس کی آرتی اتارتی ہے اور اپنا بازو باز بہادر

کی تلوار سے کاٹ کر اپنے خون کا ٹیکہ باز بہادر کے ماتھے پر لگاتی ہے)۔

روپ متی : جاؤ مہاراج۔ تم پر بھگوان کا سایہ رہے!

(باز بہادر روپ متی کے دونوں بازو پکڑ کر سینے سے لگاتا ہے اس کی پیشانی چومتا ہے اور پھر تیزی سے باہر نکل جاتا ہے۔ ملازم بھی چلا جاتا ہے۔ نقارہ اور بگل کی آوازیں آہستہ آہستہ آنا شروع ہو جاتی ہیں جو برابر بڑھتی رہتی ہیں اور پھر قریب معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ لوگوں کے شور وغل کی آوازیں آتی ہیں۔ ایک دم شور وغل، نقارہ اور بگل کی آوازیں کچھ دیر کے لیے بند ہو جاتی ہیں۔ کچھ دیر بعد لوگوں کے بھاگنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ ایک عورت گھبرائی ہوئی داخل ہوتی ہے۔

خادمہ : مہارانی— (خادمہ رونے لگتی ہے)

روپ متی : کیا ہے— (چہرہ پر پریشانی اور گھبراہٹ کے آثار پیدا ہوتے ہیں)

خادمہ : خبر آئی ہے مہارانی کہ مہاراج—

(ہچکیوں سے روتی ہے اور آنسو پونچھتی ہے)

روپ متی : (چہرے پر اطمینان کے آثار پیدا کرتے ہوئے) تم بری خبر لائی ہو— (کچھ دیر پھر سکتے کے عالم میں ہو جاتی ہے اور آنسو پونچھتی ہے۔ خادمہ برابر ہچکیوں سے روتی رہتی ہے) یہ بتاؤ مہاراج کی پیٹھ پر تو زخم نہیں آیا؟

خادمہ : نہیں مہارانی۔ ہماری ہی فوجوں نے دھوکہ دیا اور دشمن سے جا ملیں— مہاراج تنہا لڑتے ہوئے)—

(ہچکیوں سے رونے لگتی ہے)

روپ متی : تو پھر یہ شکست نہیں ہوئی۔

(کچھ دیر بالکل خاموش کھڑی رہتی ہے اور پھر اپنے ہاتھوں کی چوڑیاں توڑ ڈالتی ہے)

(پردہ)

ساتواں سین

(باز بہادر کا محل (ادہم خاں کی محفلِ عیش رقص ہو رہا ہے۔ شراب کا دور چل رہا ہے۔ ایک رقاصہ شراب بھر بھر کے پیالے دے رہی ہے اور رقص کے ساتھ گا رہی ہے۔—)

ادہم خاں : آہاہاہا— جیو میری جان جیو۔ (رقاصہ کو اشارہ سے اپنے پاس بلاتا ہے۔ رقاصہ ہمارے پہلو میں بیٹھو۔اور اپنے ہاتھوں سے ہمیں پیالے بھر بھر کر دو۔ اپنی نگاہوں کی شراب کی ہم پر بارش کردو (رقاصہ اس کے پاس بیٹھ جاتی ہے۔ اور ادہم خاں اس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ رقاصہ شراب کے پیالے بھر بھر دے دیتی ہے۔ ادہم خاں نشے میں کبھی اس کے ہاتھ چومتا ہے۔ کبھی ہونٹوں کو بوسہ دیتا ہے۔ دوسرے لوگ جو وہاں موجود ہیں اسی کی طرح نشے میں چور ہیں رقاصہ جام رکھتی ہے)۔

ادہم خاں : اپنے بانکپن کا صدقہ ایک پیالہ اور میری جان ایک پیالہ اور۔

عید کا دن ہے اندھا دھند پلا دے ساقی
جام مانگوں تو سبو منہ سے لگا دے ساقی

اے مانڈو کی نوخیز کلی—!

طغرل بیگ: نشے میں قہقہہ لگا کر) مانڈو کی نوخیز کلی— ہاہاہا— یہ تو مانڈو کی اس نوخیز کلی کی ایک ادنیٰ کنیز ہے۔ جس کی خوشبو سے سارا مالوہ مہک رہا ہے۔

ادہم خاں : طغرل بیگ۔ تم ہمارے انتخاب کی توہین کر رہے ہو۔

طغرلہ بیگ: میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ایسی ہزاروں کلیاں اس پھول پر سے نچھاور کی جاسکتی ہیں۔

ادہم خاں : طغرل بیگ۔ تم نشے میں بہک جاتے ہو۔ (رقاصہ کے ہاتھ سے شراب کا پیالہ لے کر پی جاتا ہے) تم صرف میدان جنگ کے مرد ہو— بزمِ عیش کے

نہیں — تم صرف تلوار کی دھار پرکھ سکتے ہو۔ عورت کا حسن نہیں۔

طغرل بیگ: میں شراب کے نشے میں کبھی نہیں بہکتا۔ اگر تم اس کے حسن کی ایک جھلک بھی دیکھ لو تو تمھارا یہ غرور سے تنا ہوا سر اس کے قدموں میں جھک جائے اور اس باسی اور جھوٹی شراب کا نشہ کافور ہو جائے تم چچوڑی ہوئی ہڈیوں پر کتے کی طرح گرنا بھول جاؤ۔

ادہم خاں : کون ہے وہ اور ہمارے سامنے کیوں نہیں آئی؟

طغرل بیگ: وہ مہارانی روپ متی ہے۔ حسن کے علاوہ نرت اور سنگیت میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتی۔

ادہم خاں : اسے فوراً ہمارے سامنے حاضر کرو!

(ایک مصاحب جاتا ہے اور ادھم خاں پھر شراب پینے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد مصاحب واپس آکر)

مصاحب : خانِ اعظم! مہارانی کو یہاں آنا منظور نہیں۔

ادہم خاں : (قہقہہ لگا کر) اب بھی مہارانی — (غصے سے) اور تم میں اس قدر قوت نہیں کہ ایک عورت کو گھسیٹ کر ہمارے سامنے لے آؤ!

(مصاحب پھر جاتا ہے اور کچھ دیر بعد روپ متی کو لے کر آتا ہے)

ادہم خاں : (روپ متی کو دیکھ کر) روپ متی جس کی تعریف دلی دربار تک ہے — (روپ متی سے مخاطب ہو کر) قسمت کا فیصلہ دیکھ لینے کے بعد بھی تمھارا غرور سے تنا ہوا سر نہیں جھکا۔

روپ متی : عزت سے جو سر اٹھا ہوا ہوتا ہے وہ کبھی نہیں جھکتا۔

ادہم خاں : میدانِ جنگ میں سر ہی نہیں ہارا جاتا۔ عزت بھی ہاری جاتی ہے مہارانی —!

روپ متی : شریف عزت کے لیے جان دے دیتے ہیں۔ بے عزتی کے لیے سر نہیں بچاتے۔

ادہم خاں : مگر تمھیں قسمت کے سامنے سر جھکانا پڑے گا۔

روپ متی : عزت بچانے کے لیے جو سر اٹھا ہو وہ کبھی نہیں جھکے گا۔ شریف سر سے کھیلتے

ہیں اور کمینے عزت سے۔

ادہم خاں : تمھیں ہماری محفل عیش میں بلبل بن کر چہکنا پڑے گا! اپنے سریلے نغموں سے ہمیں خوش کرنا ہوگا! اپنی نرت سے ہمارا دل بہلانا پڑے گا۔ تم ہارے ہوئے جواری کی لٹی ہوئی قسمت ہو۔ ہارنے کے بعد عزت اور عصمت سب کچھ میدان میں فروخت ہو جاتا ہے۔ دانشمند فاتح کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں۔ یہ اندیش تعلّی عزت اور بے معنی عصمت کا ڈھول پیٹتے ہیں۔ آؤ ہماری بانہوں میں آؤ اور اپنے دستِ نازک سے شراب کا پیالہ بھر کردو۔ عزت اور عصمت— ہاہاہا۔

ایں دفترِ بے معنیٰ غرقِ مے ناب اولے

روپ متی : بزدلوں کے لیے بے معنی ہیں مگر بہادروں کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔

ادہم خاں : یہ دانشمندی کے خلاف ہے۔

روپ متی : میں اس پر ہزاروں دانشمندیاں قربان کرسکتی ہوں۔

ادہم خاں : تو تمھیں ہمارا حکم ماننے سے انکار ہے؟

روپ متی : مجھے تمھارا ہر حکم ماننے سے انکار ہے۔

ادہم خاں : دیکھو پچھتانا پڑے گا۔

روپ متی : میں ہر مصیبت کا مقابلہ کروں گی—!

ادہم : دیکھو سوچ لو۔

روپ متی : میں نے سوچ لیا ہے۔

(روپ متی غصے سے چلی جاتی ہے)

ادہم خاں : اس عاقبت نااندیش محل کے گرد سخت پہرہ لگا دو اور اس بات کا خیال رہے کہ کوئی اس سے نہ مل سکے۔ صرف ایک عورت پاس رہے۔

(پردہ)

آٹھواں سین

روپ متی کا محل۔ روپ متی اور رضیہ۔

رضیہ : روپا۔

روپ متی : ہاں رضو۔۔۔

رضیہ : تم کس قدر اداس رہتی ہو۔

روپ متی : (پھیکی مسکراہٹ سے) اداس! نہیں تو اری یہ تو دنیا ہے۔۔۔ کبھی دن ہے کبھی رات۔ کبھی بہار ہے کبھی خزاں۔

رضیہ : آفریں ہے تم پر روپا۔۔۔ سہاگ لٹا تم خاموش رہیں۔۔۔ حکومت گئی تمھارے ماتھے پر بل نہیں آیا اور اب ان ظالموں کی قید میں رہ کر بھی تم مسکرا رہی ہو۔

روپ متی : مجھے ہمیشہ اس پر فخر ہے گا کہ میرا باپ بہادر تھا۔ شراب ناچ اور موسیقی ہی اس کی زندگی نہیں تھی۔ وہ مرد میدان بھی تھا۔ اس نے مرنا قبول کرلیا لیکن مغلوں کی فرماں برداری قبول نہیں کی۔ وہ آزاد تھا، دنیا کی قید سے آزاد ہوگیا۔ اب دیکھو ہمیں اس مصیبت سے کب چھٹکارا ملتا ہے۔

رضیہ : روپا! ہمیں ہی نہیں ساری رعایا اس مصیبت میں مبتلا ہے، ہمیں ہی ناپ تول کر کھانا نہیں دیا جاتا تمام رعایا کو دیا جاتا ہے۔ ظالم ادہم خاں نے ہر طرف اپنے آدمی چھوڑ رکھے ہیں۔ جنھوں نے زندگی اجیرن کردی ہے۔

روپ متی : مگر ان بے چاروں کا کیا قصور ہے۔ ان پر یہ ظلم کیوں کیا جارہا ہے؟

رضیہ : ظالم ادہم خاں کو ضد پیدا ہوگئی ہے کہ جب تک مہارانی اپنے سنگیت سے اسے خوش نہ کرے گی وہ بھی ظلم کرتا رہے گا۔

روپ متی : تو اسے یہ سب ظلم مجھ پر کرنا چاہیے، بیچاری رعایا نے کیا بگاڑا ہے۔ (لوگوں کے چیخنے چلانے اور کراہنے کی آوازیں)۔۔۔ یہ کیا ہے رضیہ۔ یہ لوگ کیوں چیخ

رہے ہیں۔

رضیہ : روپا۔ (روپ متی سے لپٹ جاتی ہے) ہر روز شہر کے لوگوں کو پکڑ کر محل کے سامنے مارا...... جاتا ہے۔

آوازیں : دہائی ہے مہارانی کی دہائی ہے۔ مہارانی روپ متی کی دہائی ہے۔

روپ متی : رضو بھگوان کے لیے ان کو روکو!

نسوانی آواز: میرا سہاگ لٹ رہا ہے مہارانی اسے بچاؤ—!

روپ متی : کس کا سہاگ لٹ رہا ہے—؟

رضیہ : شہریوں کو پکڑ پکڑ کر محل کے سامنے قتل کیا جا رہا ہے۔

روپ متی : (بلند آواز سے) ارے کوئی ہے۔

(ادہم خاں کا ملازم سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

روپ متی : اپنے سردار سے جا کر کہو رعایا پر یہ ظلم کیوں ہو رہا ہے؟ وہ امن پسند شہری ہیں جو تم پر تلوار نہیں اٹھاتے (ملازم چلا جاتا ہے۔ رونے اور چلانے کی آوازیں برابر آتی رہتی ہیں ملازم واپس آ کر)

ملازم : مہارانی! سردار اعظم نے فرمایا ہے کہ جب تک مہارانی اپنی ضد پر قائم ہیں ان کے کانوں میں یہ آوازیں آتی رہیں گے (چلانے اور کراہنے کی آوازیں اور تیز ہو جاتی ہیں۔

روپ متی : (جھنجھلا کر) بند کرو۔ یہ ظلم و ستم!

ملازم : صرف آپ کے حکم کی دیر ہے۔

آوازیں : ہائے میرا سہاگ لٹا۔ ہائے مار ڈالا۔

(آوازیں تیز ہوتی جاتی ہیں۔ روپ متی کانوں پر ہاتھ رکھ کر)

روپ متی : بند کرو یہ ظلم!— جا کر اپنے سردار سے کہو۔ میں ضرور گاؤں گی۔

(ملازم تیز تیز قدموں سے چلا جاتا ہے۔ آوازیں آہستہ آہستہ کم ہونے لگتی ہیں)

روپ متی : میں نے اچھا ہی کیا رضو— ہمارے مہاراج نے انھیں اس ظلم وستم سے بچانے کے لیے ہی تو جان دی ہے۔ انھیں ان سے کتنا پریم تھا۔ کیا میں ان کے ان محبوبوں کی خاطر ناچ گا بھی نہیں سکتی۔

رضیہ : مگر روپا

روپ متی : رضیہ! جنتا کی لاج رانی کی لاج ہے۔ اگر ایک کنیا کی لاج جاتی ہے تو مہارانیوں کی لاج مٹ جاتی ہے۔ اگر ایک بھی عورت کا سہاگ لٹتا ہے تو مہارانیوں کا سہاگ لٹ جاتا ہے۔ مجھے ان ہزاروں کنیاؤں کی لاج بچانا ہے جن کی نظریں مجھ پر لگی ہوئی ہیں— مجھے ان عورتوں کا سہاگ بچانا ہے جن کی مانگوں کی سرخی کبھی میرے گالوں میں جھلکتی تھی۔

(پردہ)

نواں سین

(باز بہادر کے محل میں ادہم خاں، شراب کا دور چل رہا ہے۔ ادہم خاں شراب کے نشہ میں دھت ہے اور جھوم رہا ہے۔ رقاصہ ناچ رہی ہے......)

ادہم خاں : جیو میری جان جیو۔ ناچو اور خوب ناچو، زندگی کا ناچ، خوشی کا ناچ۔ عیش کا ناچ— ہاہاہا— آج مہارانی روپ متی کا غرور سے تنا ہوا سر جھکے گا۔ ناچو اور اس قدر ناچو کہ دنیا ناچنے لگے، بہاریں بکھیر دو ناچ ناچ کر۔ (ایک افسر سے) ابھی تک مہارانی روپ متی نے درشن نہیں دیے۔

طغرل بیگ: آتی ہی ہوں گی سردار اعظم۔

ادہم خاں : آ بھی چکیں، کہاں تک دکھلائیں گی یہ انتظار۔ (روپ متی کا داخلہ، ہاتھوں میں سونے کی ہتھکڑیاں) آیئے مہارانی جی آیئے۔ بہت دیر میں درشن دیے۔ ہماری آنکھیں تو آپ کے انتظار میں پتھرا گئیں (رقاصہ سے) رقاصہ تم ہمارے پہلو میں بیٹھو جو وقت کی رفتار کو دیکھ لیتا ہے اسے پچھتانا نہیں پڑتا—

ہاہاہا— (رقاصہ ادہم خاں کے پاس بیٹھ جاتی ہے اور ادہم خاں اس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ روپ متی کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہے اور پھر گاتی ہے) (گانا ختم ہونے کے بعد روپ متی بے ہوش ہوکر گر پڑتی ہے۔ ادہم خاں اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے)

ادہم خاں : ہاہاہا— (جاتے ہوئے) مہارانی سے کہہ دینا کہ حضور ادہم خاں کی آغوش آپ کے واسطے حاضر ہے۔ اگر زندگی کے عیش عزیز ہیں تو غلام کا کہنا مان لیجیے۔

(قہقہے لگاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ ملازم روپ متی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ روپ متی اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ رونے اور چلانے کی آوازیں آنے لگتی ہیں)۔

روپ متی : اب یہ ظلم کیوں ہو رہا ہے۔ (کانوں پر ہاتھ رکھ کر) بند کرو یہ ظلم وستم—!

طغرل بیگ: مہارانی سردار اعظم نے فرمایا ہے کہ اس طرح ضد سے کچھ نہ ہوگا۔ بزدل باز بہادر کا خیال دل سے نکال دیجیے۔ وقت کی رفتار کو دیکھیے۔ سردار اعظم صرف آپ کے ایک اشارہ کے منتظر ہیں۔

روپ متی : باز بہادر اور بزدل۔ (پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتی ہے۔ بزدل وہ ہے جو غریبوں پر ظلم کرتا ہے۔ جو کنیاؤں کی لاج پر ہاتھ ڈالتا ہے۔ جو معصوم بچوں کی آہوں پر قہقہے لگاتا ہے۔ بزدل وہ ہے جو طاقت سے مغرور ہو جاتا ہے۔ باز بہادر بزدل نہیں تھا۔ ادہم خاں بزدل ہے۔ کمینہ ہے ذلیل ہے۔

طغرل بیگ: مہارانی!— اس ضد سے کچھ نہ ہوگا۔ (رونے اور چلانے کی آوازیں تیز ہو جاتی ہیں) آپ یہ آوازیں سن رہی ہیں، یہ آپ کی رعایا کی آوازیں ہیں جن کی محنت نے آپ کے لیے عیش فراہم کیا جنھوں نے آپ کی چال میں لوچ بھر دیا تھا جنھوں نے آپ سے محبت کی تھی خوشی اور غمی میں ہمیشہ ان کی

آنکھیں آپ پر لگی رہیں۔ آج وہ آپ کی ایک معمولی ضد کا شکار ہیں۔
جنھوں نے آپ کے لیے سب کچھ قربان کر دیا۔ آج آپ معمولی سی ضد
انھیں مصیبتوں میں گرفتار کیے ہوئے ہے۔ آپ کو ان سے محبت نہیں۔ آپ
کہتی ہیں کہ باز بہادر کو ان سے محبت تھی۔ اگر یہ سچ ہے تو اس کی روح انھیں
یوں بے چین دیکھ کر تڑپ رہی ہوگی۔

روپ متی : باز کی روح!— ہاں ہاں اسے ان سے محبت تھی اس نے ان ہی کے لیے
جان دی ہے۔

طغرل بیگ: اور آپ انھیں مصیبتوں میں گرفتار کر رہی ہیں۔

روپ متی : نہیں میں ان کے لیے سب کچھ کر سکتی ہوں۔

طغرل بیگ: تو پھر آپ کے یہ الفاظ سردار اعظم تک پہنچا دیے جائیں۔

روپ متی : ہاں—

(پردہ)

دسواں سین

روپ متی کا محل، روپ متی۔ بہترین لباس پہنے اور خوب بناؤ سنگھار کیے بیٹھی ہے۔ اس
کے پاس رضیہ کھڑی رو رہی ہے۔

روپ متی : اری پگلی پھر رونا دھونا۔ چل ہٹ تجھے تو رونے دھونے کے علاوہ اور کچھ آتا
ہی نہیں!

رضیہ : مگر روپا! تم نے اس ظالم کی بات مان کر اچھا نہیں کیا۔

روپ متی : اری تو ہی تو کہتی تھی کہ رعایا کی آنکھیں مجھ پر لگی ہوئی ہیں۔ مجھے ان کا
خیال نہیں۔

رضیہ : مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ تم اس قدر بڑی قربانی دینے کو تیار
ہو جاؤ۔

روپ متی : قربانی ہی میں نجات ہے رضو!

رضیہ : مگر تم قیامت کے دن مہاراج کے سامنے کون سا منہ لے کر جاؤ گی۔

روپ متی : (مسکرا کر) یہی جو تو دیکھ رہی ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) اچھا رضو اب تو جا۔ ادہم خاں آتا ہوگا، تیرا اس کے سامنے آنا اچھا نہیں۔

رضیہ : نہیں روپا۔ میں تجھے اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔

روپ متی : کیا پاگل ہوئی ہے۔ چل جا یہاں سے—!

(رضیہ روتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ روپ متی ایک گلاس میں پانی بھرتی ہے۔ اس میں زہر گھول کر پی جاتی ہے اور گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھ جاتی ہے۔ ادہم خاں شراب میں چور داخل ہوتا ہے اور روپ متی کو بیٹھا دیکھ کر)

ادہم خاں: ''رنگینیاں سمٹ کر انسان ہوگئی ہیں۔'' ہاہاہا— آخر تمھارا غرور سے تنا ہوا سر جھک کر ہی رہا— ہاہاہا— اوہ ہو تم تو اب بھی ایسی روٹھی ہوئی بیٹھی ہو جیسے ہم سے کوئی واسطہ ہی نہیں، آخر حماقت پر دانشمندی نے فتح پا ہی لی۔ دنیا میں یہی ہوتا ہے۔ کبھی یہاں دھوپ ہے کبھی چھاؤں، کبھی گرمی ہے کبھی سردی، عقلمند وہی ہے جو خود کو ہر موسم کا عادی بنا لے۔ ہاہاہا— کچھ بولو نا میری جان— (بڑھ کر روپ متی کا ہاتھ پکڑتا ہے اور وہ بے چین ہوکر گر پڑتی ہے۔ ارے تمھیں کیا ہوا روپ متی؟— ارے کوئی ہے—؟

(دو تین ملازم اور رضیہ داخل ہوتے ہیں۔ رضیہ گھبرائی ہوئی روپ متی کے پاس جاتی ہے اور اسے غور سے دیکھ کر)

رضیہ : آخر ظالم تو نے اس کی جان لے ہی لی۔ کمینے بزدل کہیں کے! اب یہ گناہوں کا بوجھ لیے خدا کے حضور میں جائے گا۔ (غصہ سے ایک طمانچہ ادہم خاں کے رسید کرتی ہے) یہ لے تیرا انعام اور دلی کے شہنشاہ سے جا کر کہہ دینا کہ میں مانڈو سے تحفہ میں تمھارے لیے اپنے گال پر ایک طمانچہ لایا ہوں (ادہم خاں غصہ سے اُسے پکڑ کر جھنجھوڑتا ہے۔ رضیہ ایک

اور طمانچہ رسید کرتی ہے۔ ادہم خاں گھبرا کر اسے چھوڑ دیتا ہے) کمینے۔ کتے، ذلیل، بزدل، (ادہم خاں بڑھ کر رضیہ کو گود میں اٹھا لیتا ہے اور قہقہے لگاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ قہقہوں کی آوازیں آتی رہتی ہیں اور روپ متی کی لاش پڑی رہتی ہے۔

(پردہ)

(مطبوعہ: رسالہ 'شاہین' کراچی، اگست، 1950)

چپقلش

کردار

(1) ژولی (2) طاہر (3) حمو (4) جعفر

منظر

(ایک کمرہ جس میں ہر چیز بہت سلیقے سے اور نفاست سے سجی ہوئی ہے۔ صبح کا وقت ہے۔ ژولی سنگھار میز کی طرف پیٹھ کیے کھڑی ہے۔ طاہر صوفے پر بیٹھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ دونوں میں کسی بات پر بحث ہورہی ہے اور ژولی غصہ میں ہے۔ ژولی ایک دو قدم آگے بڑھ کر غصہ سے)

ژولی : طاہر۔ میں بجھے ہوئے سگار کی راکھ نہیں ہوں جسے تم چٹکی بجا کر جہاں چاہو جھٹک دو۔ میری بھی اپنی شخصیت ہے۔

طاہر : تم میرے لیے صرف شخصیت ہی نہیں بلکہ پیاری اور محترم شخصیت ہو (کھڑے ہوکر اس کے پاس آتے ہوئے) (تم بجھے ہوئے سگار کی راکھ نہیں ہو بلکہ وہ متبرک چنگاری ہو جس سے میں زندگی کی حرارت حاصل کرتا ہوں۔

(کسی قدر الجھن سے) لیکن سمجھ میں نہیں آرہا کہ آخر تمھیں ہو کیا گیا ہے۔
صبح صبح اس طرح۔

ژولی : (بات کاٹ کر) تمھارے سلیمہ کے کیسے تعلقات ہیں۔

طاہر : وہ میری سکریٹری ہے۔

ژولی : اور تمھاری داشتہ بھی جس سے اب تم نکاح کرنا چاہتے ہو۔

طاہر : لاحول ولا قوۃ۔ (مسکرا کر) تو محترمہ ژولی کی بڑہی مفروضات کے تانے بانے سے گوندھی گئی ہے۔ ژولی ڈیئر یہ میری بدبختی ہوگی اگر میں تمھارے اعتماد کی بے حرمتی کروں۔

ژولی : تو پھر سلیمہ اپنے شوہر سے طلاق کیوں لینا چاہتی ہے۔

طاہر : میرے لیے نئی خبر ہے۔ ہوگی کوئی گھریلو چپقلش۔

ژولی : اور اس چپقلش کا سبب تم ہو۔

طاہر : میں!

ژولی : جی ہاں آپ مسٹر طاہر۔ جب اس کا شوہر اسے تمھاری سکریٹری دیکھنا پسند نہیں کرتا تو اسے علاحدہ نہ کرنے پر تم کیوں مصر ہو (طاہر خاموش رہتا ہے ژولی اس کا چہرہ غور سے دیکھ کر) اب خاموش کیوں ہو (طنزیہ) کوئی خوبصورت بہانہ نہیں تراش سکتے۔

طاہر : مجھے کوئی بہانہ تراشنے کی ضرورت نہیں ہے۔ (کچھ دیر رک کر) وہ میری کاروبار کی کمزوری ہے۔

ژولی : (طنزیہ) کاروبار کی کمزوری یا صرف کمزوری۔

طاہر : ژولی میرے الفاظ کو غلط معنی دینے کی کوشش نہ کرو۔ صرف کمزوری بہت واہیات لفظ ہے۔

ژولی : اور اس واہیات لفظ کو تم نے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے۔

طاہر : نان سنس (کسی قدر بیزار ہو کر) ژولی آج تمھاری خود اعتمادی متزلزل کیوں

ہورہی ہے۔ بخدا تم میری قسمت ہو۔

ڈولی : (طنزیہ) اچھا۔

طاہر : طنز نہ کرو ڈولی مجھے یقین ہے کہ جس دن میں نے تم سے بیوفائی کی میری قسمت مجھ سے روٹھ جائے گی۔

ڈولی : (کسی قدر نرم پڑتے ہوئے) تو پھر وہ نوکری چھوڑنے کا کہتی ہے تو اس کی تنخواہ میں اضافہ کر کے کیوں روک لیتے ہو۔

طاہر: (مسکرا کر) بے وفا شوہر کی نادان بیوی۔ کاروبار میں بہت کچھ کرنا پڑتا ہے اور اس بہت کچھ سے وہ واقف ہے۔ اس کا منہ بند رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے۔

ڈولی : تو گویا وہ تمھیں بلیک میل کر رہی ہے۔

طاہر : نہیں بلکہ میں خود بلیک میل ہو رہا ہوں اس لیے کہ یہ ضروری ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) مجھے یہ پسند نہ ہوگا کہ سوسائٹی میں میرے متعلق کوئی اسکینڈل مشہور ہو۔

ڈولی : تو کیا سلیمہ کو ہر جگہ ساتھ لیے پھرنے سے تمھاری نیک نامی میں اضافہ ہوتا ہے۔

طاہر : سوسائٹی میں اسے معیوب نہیں سمجھا جاتا بلکہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ڈولی : تو پھر اس کے شوہر کو بھی کوئی نوکری دے دو۔

طاہر : (ہنس کر) اپنی نگرانی کے لیے یا سلیمہ کی نگرانی کے لیے... ڈولی وہ ایک واہیات اور ناکارہ انسان ہے۔ آوارہ گرد۔ شاید تم نے اُسے دیکھا نہیں ہے۔

ڈولی : میں اس سے مل چکی ہوں۔ ایک دن وہ میرے پاس آیا تھا۔

طاہر : تعجب ہے کہ پھر بھی تم نے اسے نہیں سمجھا۔

ڈولی : وہ صورت سے بھولا بھالا اور باتوں سے معصوم معلوم ہوا۔ وہ سلیمہ سے بہت محبت کرتا ہے۔

طاہر : (ہنس کر) محترمہ ڈولی:

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہی دھوکا یہ بازیگر کھلا

نوکر : (کمرے میں آکر) صاحب طارق میاں تشریف لائے ہیں۔

طاہر : اچھا۔ (ڑولی کی طرف دیکھ کر) حضور اپنے دماغ میں یہ فرضی کھچڑی پکانا چھوڑ دیجیے۔

(ہنستا ہوا کمرے سے چلا جاتا ہے۔ نوکر بھی جانے کے لیے مڑتا ہے)

ڑولی : ارے حموسن تو۔ (حمو مڑ کر دیکھتا ہے) مجھے ایک پیالی چائے دے جا اور اخبار آگئے ہوں تو لے آ۔

حمو : بہت اچھا۔

(حمو کمرے سے چلا جاتا ہے۔ ڑولی سنگھار میز کے پاس جاکر اپنی شکل دیکھتی ہے اور سر پر ہاتھ پھیر کر بال برابر کرتی ہے کچھ دیر بعد حمو اخبار لاکر میز پر رکھتا ہے۔ ڑولی میز کے پاس آتے ہوئے)

ڑولی : چائے نہیں لایا۔

حمو : لاتا ہوں سرکار۔

ڑولی : طارق صاحب سے کیا باتیں ہورہی ہیں۔

حمو : پتہ نہیں۔ شکار کا پھر کوئی پروگرام بن رہا ہو۔

ڑولی : یہ نیا مرض لاحق ہوگیا ہے۔

حمو : سرکار تو برابر ٹالتے رہتے ہیں وہ تو طارق صاحب اور سلیمہ بی۔

(خاموش ہوجاتا ہے۔ ڑولی اُسے دیکھتی ہے، کچھ بولنا چاہتی ہے مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہوجاتی ہے۔ ایک اخبار اٹھاتے ہوئے)

ڑولی : تو جعفر صاحب کو جانتا ہے۔

حمو : کون جعفر صاحب۔

ڑولی : سلیمہ بی کے شوہر۔

حمو : اچھا تو ان کا نام جعفر صاحب ہے لوگ تو انھیں خنجر صاحب کہتے ہیں۔ سرکار وہ مشاعرے میں ایسا اچھا گاتے ہیں کہ سب لوگ واہ واہ کرنے لگتے ہیں۔

ڈولی : میں پوچھ رہی ہوں وہ کیسے آدمی ہیں۔

حمو : مجھے کیا پتہ سرکار مگر مشاعرے میں گاتے اچھا ہیں۔

ڈولی : چل جا چائے لے کر آ۔ مشاعرے میں گاتے اچھا ہیں۔ بیوقوف (حمو کمرے میں چلا جاتا ہے۔ ڈولی صوفے پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگتی ہے، تھوڑی دیر بعد حمو چائے لے کر آتا ہے اور ڈولی کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے)۔

حمو : سرکار وہ خنجر صاحب آئے ہیں۔

ڈولی : انھیں صاحب کے پاس پہنچا دے۔

حمو : مگر وہ تو آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

ڈولی : مجھ سے! مجھ سے کیا کام ہے (سوچ کر) اچھا انھیں یہیں لے آ — اور طارق صاحب کے لیے چائے دے آیا۔

حمو : ابھی نہیں۔

ڈولی : انھیں بھی چائے دے آنا۔

(حمو چلا جاتا ہے۔ ڈولی پھر آئینے کے پاس جا کر بال درست کرتی ہے۔ کچھ دیر بعد حمو دروازے کا پردہ ہٹا کر)

حمو : آیئے۔ تشریف لایئے۔

(جعفر کمرے میں آتا ہے اس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ تھکا ہوا ہے۔ ڈولی کو دیکھ کر ہاتھ اٹھا کر سلام کرتا ہے)

ڈولی : آیئے خنجر صاحب۔ ابھی آپ ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔

جعفر : زہے نصیب کہ آپ نے یاد رکھا۔

ڈولی : تشریف رکھیے۔ ابھی حمو کہہ رہا تھا کہ آپ مشاعرہ لوٹ لیتے ہیں۔

جعفر : کون حمو؟

ژولی : یہی ہمارا نوکر۔

جعفر : (اُداسی سے) میں اس کا شکریہ ادا کردوں گا۔

ژولی : لیکن اس میں اداسی کی کیا بات ہے۔

جعفر : (ٹھنڈی سانس بھر کر) جی نہیں، میں اُداس کیوں ہونے لگا اپنی تعریف سن کر کون اُداس ہوتا ہے۔ (حسرت سے) لوگ مجھے گلے باز شاعر کہتے ہیں اسے بھی میری گلے بازی پسند ہوگی (کسی قدر تلخ لہجے میں) آج کے نقاد کی طرح اس نے بھی کب میری روح کی تڑپ اور تنہائی کو محسوس کیا ہوگا۔

ژولی : لوگوں کی بدذوقی کی ہمیں قدر کرنا چاہیے (جعفر کو دیکھ کر) لیکن آپ نے یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے۔

جعفر : (اپنے لباس پر نظر ڈال کر) میرے اس گندے لباس سے شاید آپ کا احساسِ جمال مجروح ہو رہا ہے۔

ژولی : نہیں نہیں میرا یہ مطلب نہیں ہے۔

جعفر : میں تھوڑی ہی دیر میں اپنا منحوس وجود لے کر چلا جاؤں گا۔آپ کو شاید علم نہیں کہ میں چند مہینے سے بیکار ہوں۔

ژولی : مگر سلیمہ تو۔

جعفر : (بات کاٹ کر) محترمہ۔ میری انا کو اس طرح نہ للکاریئے کہ مجھے اپنے وجود سے نفرت ہو جائے۔ بھوکا مرجانا عزتِ نفس کی قربانی سے بہتر ہے (ژولی توصیفی نظروں سے اسے دیکھتی ہے) آپ نے مسٹر طاہر سے میرا دکھ بیان کر دیا۔

ژولی : میں نے ابھی سرسری بات کی ہے مگر وہ۔

جعفر : (لقمہ دے کر) میرے دکھ کو نہ سمجھ سکے۔

ژولی : سمجھیں گے کیوں نہیں اور اگر نہیں سمجھیں گے تو سمجھایا جائے گا۔

جعفر : اور اب تو سلیمہ نے عدالت میں علیحدگی کی درخواست بھی دے دی ہے۔

ڈولی : درخواست دے دی ہے!

جعفر : جی ہاں۔ (صوفے کی طرف دیکھ کر) اگر آپ اجازت دیں تو میں بیٹھ جاؤں۔ رات بھر سو نہ سکا (پھر اپنے لباس کی طرف دیکھ کر) مگر میرا لباس۔

ڈولی : شرمندہ نہ کیجیے۔ تشریف رکھیے۔ آپ نے ناشتہ کیا۔ (بلند آواز سے) حمو۔ ارے حمو۔

جعفر : آپ تکلیف نہ کیجیے میں ناشتہ کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ صوفے پر اس طرح بیٹھتا ہے جیسے اس کے گندہ ہوجانے کا خطرہ ہو)۔

ڈولی : آپ آرام سے تشریف رکھیے۔

جعفر : میں آرام سے ہوں۔

(حمو کمرے میں آتا ہے۔ ڈولی اسے دیکھ کر)

ڈولی : ناشتہ۔

جعفر : آپ تکلیف نہ کیجیے۔

ڈولی : اچھا چائے تو پیجیے۔ (پیالی میں چائے نکالتے ہوئے حمو سے) جا۔ سلیمہ کو فون کر کہ وہ ابھی آ کر مجھ سے ملے۔

حمو : صاحب پہلے ہی فون کر چکے ہیں وہ آتی ہی ہوں گی۔

ڈولی : اچھا۔ جب وہ آئیں تو پہلے میرے پاس لا۔

(حمو چلا جاتا ہے۔ ڈولی چائے کی پیالی جعفر کو دیتی ہے۔ جعفر پیالی لے کر کچھ دیر خلا میں دیکھتا رہتا ہے۔ پھر پیالی میز پر رکھ کر کھڑے ہوتے ہوئے)

جعفر : مسز طاہر (ٹھنڈی سانس بھر کر) مجھے زندگی میں کچھ بھی تو نہیں ملا۔

ڈولی : آپ چائے تو پیجیے۔

جعفر : (اپنی ہی دُھن میں) نقاد مجھے نظر انداز کرتے ہیں۔ پیسہ مجھ سے روٹھا ہوا ہے۔ دل میں سلیمہ کی محبت ہے تو وہ اس کا احترام نہیں کرتی (ٹھنڈی سانس بھر کر) میں دکھوں کا انبار اپنے سینہ میں لیے زندہ ہوں، کاش مسٹر طاہر اسے

محسوس کر سکتے۔

ژولی : مگر طاہر تو قسمیں کھاتے ہیں کہ سلیمہ صرف ان کی سکریٹری ہے۔

جعفر : یہ مسٹر طاہر کی مزید خوش قسمتی ہے کہ آپ ان کی قسموں پر اعتبار کر لیتی ہیں اور میری بدقسمتی یہ ہے کہ سلیمہ میری قسموں پر بھی اعتبار نہیں کرتی (کچھ دیر خاموش رہ کر) اگر کبھی آپ کو فرصت ملے تو آپ ہی میرے دکھوں پر غور کر لینا۔ مسٹر طاہر سے تو کوئی امید نہیں (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) خدا حافظ۔

ژولی : مگر سنیے تو۔

(اُسی وقت طاہر کمرے میں آتا ہے۔ طاہر کے چہرے پر ناگواری کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ جعفر کمرے سے چلا جاتا ہے۔ طاہر آگے بڑھتے ہوئے)

طاہر : یہ کیوں آیا تھا۔

ژولی : اپنا دکھ بیان کرنے (کچھ دیر رُک کر) سلیمہ نے علیحدگی کے لیے عدالت میں درخواست دے دی ہے (طاہر خاموش رہتا ہے) کیا آپ سلیمہ کو مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ ایک مرتبہ اور ٹھنڈے دل سے غور کر لے۔

طاہر : کسی کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا مجھے کیا حق ہے۔

ژولی : رائے دینا دخل دینا نہیں ہوتا۔

طاہر : آپ نے ملاحظہ فرمایا وہ کس قدر نامعقول اور واہیات شخص ہے۔

ژولی : مجھے تو اس میں کوئی واہیات پن اور نامعقولیت نظر نہیں آئی۔

طاہر : یہ بڑھا ہوا شیو، الجھے اور بکھرے ہوئے بال اور گندہ لباس آپ کے نزدیک معقولیت ہے کوئی نفاست پسند عورت اسے برداشت نہیں کر سکتی۔

ژولی : مگر وہ چھ مہینے سے بیکار ہے۔

طاہر : اور جب باکار تھا تب۔ اس نے اپنی زندگی کو بیکاری کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے میں نے سفارش کر کے اسے ایک کمپنی میں رکھا

دیا اُس نے وہاں کیا کیا۔

ڈولی : کیا کیا؟

طاہر : دو مہینے کرسی پر بیٹھ کر اونگھتا رہا صرف کسی مسئلے پر ایک نوٹ لکھا اور وہ بھی نظم میں۔

ڈولی : نظم میں!

طاہر : جی ہاں نظم میں۔ اور سنیے، میں نے کمپنی سے اڈوانس نکلوا کر معقول کپڑے دیے، معلوم ہے ان کپڑوں کا کیا کیا۔

ڈولی : بیچ کر کھاپی گیا ہوگا۔

طاہر : جی نہیں یہ کہہ کر لوگوں میں تقسیم کر دیے کہ مجھے اس لباس سے وحشت ہوتی ہے۔ کمپنی کا روپیہ مجھے ادا کرنا پڑا گھر پر کھانا اس لیے نہیں کھاتا کہ وہ سلیمہ کی کمائی ہے۔

ڈولی : یہ چارج شیٹ آپ نے تیار کی ہے یا سلیمہ نے۔

طاہر : سوال یہ نہیں کہ چارج شیٹ کس نے تیار کی ہے۔ سوال حقائق کا ہے مجھے اس واہیات شخص سے ذرہ برابر بھی ہمدردی نہیں۔

ڈولی : کیوں ہوگی آپ کی دل چسپی تو دونوں کی علاحدگی میں ہے۔

(طاہر کچھ دیر ڈولی کو دیکھتا ہے پھر غمگین لہجے میں)

طاہر : میری سمجھ میں نہیں آتا آج صبح سے آپ کو کیا ہوگیا ہے جعفر اور سلیمہ کے درمیان آپ مجھے کیوں گھسیٹ رہی ہیں۔

ڈولی : اِس لیے کہ آپ کا رول مشکوک ہے۔

طاہر : اگر آپ مجھے بددیانت سمجھنے پر مصر ہیں تو پھر آپ کا علاج لقمان کے پاس بھی نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ سلیمہ آپ لوگوں کے درمیان مسئلہ کیوں بن گئی ہے۔

ڈولی : ہم لوگوں کے درمیان؟

طاہر : جی ہاں مسز طارق میکے تشریف لے گئیں ان کو یقین تھا کہ سلیمہ اور طارق کے

تعلقات ہیں۔ اس وقت طارق آپ ہی کے پاس آیا تھا۔

ژولی : میرے پاس!

طاہر : جی ہاں تاکہ آپ ان کی بیگم صاحبہ کو منا لائیں۔ میں نے کہا بھائی طارق ہماری شیرنی خود صبح سے دہاڑ رہی ہے اور دہاڑتی ہوئی شیرنی کو ہوش وحواس پر قابو نہیں رہتا۔

(ژولی خاموش ہوکر سوچنے لگتی ہے طاہر کچھ دیر کھڑا رہتا ہے پھر دروازے کی طرف جاتا ہے کہ سلیمہ کمرے میں آتی ہے اور طاہر کو جاتا ہوا دیکھ کر)

سلیمہ : آپ نے مجھے یاد فرمایا تھا۔

(طاہر کوئی جواب نہیں دیتا اور کمرے سے چلا جاتا ہے سلیمہ مڑ کر اسے دیکھنے لگتی ہے)

ژولی : (طنزیہ) میں نے بھی آپ کو یاد فرمایا تھا۔

سلیمہ : (مڑ کر ژولی کو دیکھ کر) آپ نے۔

ژولی : جی ہاں۔

سلیمہ : (آگے بڑھتے ہوئے) فرمایئے۔

ژولی : تم مسٹر جعفر سے علیحدگی کیوں اختیار کرنا چاہتی ہو۔

سلیمہ : (پہلے تو ژولی کو غور سے دیکھتی ہے پھر آہستہ سے) یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔

ژولی : نہیں یہ تمھارا ذاتی معاملہ نہیں ہے۔ اس سے کسی اور کا بھی گھر متاثر ہوسکتا ہے۔

سلیمہ : میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔

ژولی : تم سب کچھ سمجھتے ہوئے معصوم بننے کی کوشش کر رہی ہو۔ تمھارے اور طاہر کے کیسے تعلقات ہیں۔

سلیمہ : وہ میرے باس ہیں۔

ژولی : صرف باس یا کچھ اور بھی۔

سلیمہ : (کچھ دیر اس طرح خاموش رہتی ہے جیسے اپنے آپ پر قابو پا رہی ہو۔ پھر)

مسز طاہر لیڈی سکریٹری ہونے کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ وہ اپنے باس کی داشتہ بھی ہو۔

ڈولی : ہاں ہونا تو یہی چاہیے مگر ایسا ہو نہیں رہا ہے۔

سلیمہ : (کسی قدر لہجہ بدل کر) اگر آپ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں تو ایک دن آپ کو شرمندہ ہونا پڑے گا۔

ڈولی : شرمندہ ہونا پڑے گا!

سلیمہ : جی ہاں۔ اس لیے کہ مجھے مسٹر طاہر کی ذات میں اتنی بھی دلچسپی نہیں جتنی اب بھی جعفر کی ذات میں ہے۔

ڈولی : تو پھر تم مسٹر جعفر سے کیوں علاحدگی اختیار کرنا چاہتی ہو۔

سلیمہ : میں نے عرض کیا یہ میرا ذاتی معاملہ ہے (کچھ دیر رک کر) اور اگر آپ جاننا ہی چاہتی ہیں تو سنیے وہ انتہائی غیر ذمہ دار اور غیر ضروری انانیت کا شکار ہے۔

ڈولی : وہ شاعر ہے اور —

سلیمہ : (بات کاٹ کر) شاعر ہونا کوئی سرٹیفکیٹ نہیں ہے کہ انسان غیر ذمہ دار ہو کر واہی تباہی مارا مارا پھرتا رہے آپ ہی کہیے، غور فرمایئے کہ کیا کوئی خوددار عورت یہ برداشت کر سکتی ہے کہ اس کی جائز یافت کو برے معنوں میں کمائی کہا جائے۔

ڈولی : لیکن بحیثیت شاعر تمھیں اسے کچھ نہ کچھ رعایت تو دینا چاہیے۔

سلیمہ : شاعر کی حیثیت سے میں اُسے پسند کرتی رہوں گی، مگر بحیثیت شوہر میں اُسے برداشت نہیں کر سکتی۔ (ڈولی خاموش رہتی ہے) کیا اسی لیے آپ نے مجھے یاد فرمایا تھا۔

ڈولی : سلیمہ۔ میں چاہتی ہوں کہ ایک مرتبہ اور اپنے فیصلے پر غور کر لو کہ بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔

سلیمہ : میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔

طاہر : (کمرے میں آتے ہوئے) مسز جعفر۔ (سلیمہ مڑ کر طاہر کو دیکھتی ہے۔ طاہر

کچھ دیر خاموش رہ کر ایک کاغذ اسے دیتے ہوئے) مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی خدمات سے محروم ہو رہا ہوں۔

سلیمہ : (ایک اچٹتی سی نظر کاغذ پر ڈال کر) شکریہ۔ (مسکرا کر) آپ نے میری بڑی مشکل آسان کر دی۔ (طاہر حیرت سے سلیمہ کو دیکھتا ہے) ابھی چند منٹ پہلے میں نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

طاہر : حسبِ قاعدہ آپ کو ایک مہینے کی مزید تنخواہ مل جائے گی۔

سلیمہ : وہ میرا حق ہے۔ مجھے ملنا ہی چاہیے۔

طاہر : طارق کی بیوی میکے چلی گئی ہے وہ اسے منانے جا رہا تھا اس لیے اب سب پروگرام منسوخ سمجھیے۔

سلیمہ : وہ بھی مسز طاہر کی طرح غلط فہمی میں مبتلا تھیں؟ (مسکرا کر) چلیے اب دونوں بیگمات کو سکون مل جائے گا۔

(دروازے کی طرف جاتی ہے۔ ڈولی اُسے جاتے ہوئے دیکھ کر)

ڈولی : مسز جعفر۔ (سلیمہ مڑ کر دیکھتی ہے) کیا آپ ایک مرتبہ اور اپنے فیصلے پر غور کریں گی (سلیمہ کچھ دیر ڈولی کا چہرہ اس طرح دیکھتی ہے جیسے اس کے دلی خیالات معلوم کرنا چاہتی ہو اور پھر خاموشی سے کمرے سے چلی جاتی ہے۔ ڈولی طاہر سے) آپ جعفر کو کوئی نوکری دے دیجیے تا کہ اس میں جو احساسِ کمتری ہے وہ ختم ہو جائے۔ شاید ان کا گھر تباہ ہونے سے بچ جائے۔

(طاہر خاموش رہتا ہے)

(پردہ)

(مطبوعہ: تعمیر ہریانہ، نومبر 1980)

ڈرامہ ایک روح کا

کردار

(1) انور (2) اسلم (3) بیگم انور (4) نسرین

منظر

(جب پردہ اٹھتا ہے تو کمرہ خالی نظر آتا ہے۔ کچھ دیر بعد دائیں جانب سے اسلم داخل ہوتا ہے اور دروازے پر ہی رک کر کمرے کا جائزہ لیتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ چل کر صوفہ پر آکر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کی پشت پر ایک کھڑکی ہے جس سے ایک شخص جھانکتا ہے۔ پھر کھڑکی کے شیشوں کو کھٹکھٹاتا ہے۔ اسلم مڑ کر دیکھتا ہے۔ وہ شخص ہاتھ اٹھا کر سلام کرتا ہے۔ اسلم کھڑکی کے پاس جا کر اسے کھولتا ہے۔

انور : آپ کب آئے؟

اسلم : بس چلا ہی آرہا ہوں (انور خوف زدہ نظروں سے کمرے کا جائزہ لیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اسلم اسے غور سے دیکھ کر) کیا بات ہے؟ آپ کچھ—

انور : (بات کاٹ کر) آپ نے آنے کی اطلاع بھی نہیں دی۔

اسلم : (ٹھنڈی سانس بھر کر) کس کو اطلاع دیتا۔ کچھ یادیں تھیں جو کھینچ لائیں۔ معلوم ہوا تھا آپ نے ابھی مکان کسی کو کرایہ پر نہیں اٹھایا۔

انور : کیسے اٹھا دیتے— وہ۔

اسلم : (بات کاٹ کر) آپ اندر تشریف لائیے نا۔ کچھ بیمار نظر آرہے ہیں۔

انور : جی ہاں میں کچھ بیمار— مگر نہیں۔ میں بیمار نہیں ہوں۔ (آواز 'انور—انور' انور گھبرا کر مڑ کر دیکھتا ہے)

اسلم : کون ہے؟

انور : میری بیوی۔

(انور کی بیوی کی پاس سے آواز)

بیگم انور : تم پھر یہاں آئے۔

انور : وہ یہ— مسٹر اسلم—

بیگم انور : مسٹر اسلم؟! (کھڑکی کے سامنے آکر) مسٹر اسلم— آپ آگئے!

اسلم : جی ہاں! بس چلا ہی آرہا ہوں۔ (دروازے کی طرف اشارہ کر کے) یہ مسٹر انور کو کیا ہو گیا ہے؟

بیگم انور : (اسلم کی بات پر دھیان نہ دے کر، انور سے) تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ کتنی بار کہا کہ یہاں نہ آیا کرو۔

انور : میں تو مسٹر اسلم...

بیگم انور : اچھا اچھا۔ اب تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ تمھیں اِدھر نہیں آنا چاہیے۔ جاؤ اپنے کمرے میں جاؤ۔

(انور گردن جھکا کر چلا جاتا ہے بیگم انور کھڑی رہتی ہے)

اسلم : بات کیا ہے مسز انور— مسٹر انور کچھ بیمار ہیں؟

بیگم انور : جی نہیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں وہ بیمار نہیں ہے۔

اسلم : مگر صورت سے— ارے آپ اندر تشریف لائیے نا۔ باہر کیوں کھڑی ہیں۔

بیگم انور : (تیزی سے جانے کے لیے مڑتی ہوئے) پھر کسی وقت آؤں گی۔ اس وقت ایک ضروری کام— (بیگم انور آگے بڑھتی ہے)

اسلم : مسز انور سنیے تو۔ آخر کیا بات ہے۔ آپ لوگ اس قدر پریشان کیوں ہیں؟

بیگم انور : وہ، آپ کی بیگم...

اسلم : میری بیگم! کیا مطلب ہے آپ کا؟ اسے مرے ہوئے دو سال ہو چکے ہیں۔

بیگم انور : (مڑ کر، اسلم کو دیکھ کر) مگر ان کی روح یہاں بھٹکتی پھر رہی ہے۔ اچھا ہوا آپ تشریف لے آئے۔

اسلم : روح! (ہنس کر) غضب کرتی ہیں آپ بھی۔ تھوڑی دیر کے لیے تو اندر تشریف لے آیئے (بیگم انور سوچتی ہے) خدا کے لیے مسز انور! (چند سیکنڈ پھر سوچتی ہے۔ پھر کھڑکی کے پاس سے ہٹ جاتی ہے۔ اسلم دروازے کے پاس جا کر پردہ اٹھا کر اس کے استقبال کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے۔ (بیگم انور دروازے پر آتی ہے۔ اس کے چہرے سے خوف ظاہر ہو رہا ہے) تشریف لایئے۔ آیئے آیئے—

(جونہی بیگم انور کمرے میں داخل ہوتی ہے، کمرہ ایک دم روشن ہو جاتا ہے۔ بیگم انور کی خوف زدہ چیخ نکل جاتی ہے۔ اور وہاں جانے کے لیے مڑتی ہے۔ اسلم کے چہرے سے بھی حیرت ظاہر ہوتی ہے مگر وہ تیزی سے بڑھ کر بیگم انور کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے)۔

بیگم انور : مجھے جانے دیجیے مسٹر اسلم— خدا کے لیے....

اسلم : ٹھہر جایئے (بیگم انور کو صوفے پر بٹھلا کر تیزی سے دوسرے کمرے کی طرف جاتا ہے اور دروازے میں کھڑے ہو کر دوسرے کمرے کا جائزہ لیتا ہے پھر مایوسی سے مڑ کر چھت پر لگے بلب کی طرف اشارہ کر کے بیگم انور سے) یہ بلب کس نے روشن کیا ہے؟

بیگم انور : (خوف زدہ آواز میں) مجھے نہیں معلوم— شاید آپ کی مسز کی روح—

اسلم : چھوڑیئے ان فضول باتوں کو۔

بیگم انور : جی... مگر... (یکایک ان کی نظر انور پر پڑتی ہے جو کھڑکی کے پاس کھڑا ہے) تم پھر آ گئے؟

انور : مگر تم—

بیگم انور : خدا کے لیے! (اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کر) تم اپنے کمرے میں جاؤ— میں بہت پریشان ہوں— مجھے اور پریشان نہ کرو۔

انور : مگر تم—

بیگم انور : (بات کاٹ کر) خدا کے لیے انور— فوراً چلے جاؤ۔

انور : مگر—

بیگم انور : (بات کاٹ کر) کیا تم چاہتے ہو کہ میں خودکشی کر لوں۔ (انور پھر خاموشی سے سر جھکا کر چلا جاتا ہے۔ بیگم انور مڑ کر اسلم کو دیکھتی ہیں جو کمرے کا جائزہ لے رہا ہے اور اس کی نظر گلدان میں تازہ پھولوں پر ٹکی ہوتی ہے)

بیگم انور : آپ نے بڑی جلدی کمرے کی صفائی کر لی۔

اسلم : [illegible] نے! مجھے آئے ہوئے دس منٹ بھی نہیں گزرے۔ میں تو سمجھا تھا شاید آپ نے...

بیگم انور : میں نے! جی نہیں مسٹر [illegible] نہیں۔ میں ابھی اور زندہ رہنا چاہتی ہوں۔

اسلم : آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں مسز انور— [illegible] سے) کبھی روح کی باتیں کرتی ہیں، کبھی زندہ رہنے کی۔

بیگم انور : آپ کی بیگم کی روح—

اسلم: پھر وہی روح—

بیگم انور : وہ اس کمرے میں ہانٹ کرتی رہتی ہے۔

اسلم : لاحول ولا قوۃ— آپ ایسی فضولیات پر یقین رکھتی ہیں—

بیگم انور : کیوں نہ رکھوں۔ جب کہ میں نے اپنی آنکھ سے اسے دیکھا ہے۔

اسلم : سب بکواس ہے۔ اوہام پرستی۔

بیگم انور : اوہام پرستی ہی سہی۔ (کمرے کی طرف اشارہ کرکے) پھر یہ کمرہ کس نے سجایا ہے؟ یہ تازہ پھولوں کا تحفہ آپ کو کس نے دیا ہے؟

(اسلم چند سیکنڈ اس طرح خاموش رہتا ہے، جیسے اس کی دلیل پر غور کر رہا ہو۔ پھر قہقہہ مار کر)

اسلم : بخدا مسز انور (گلدان کی طرف اشارہ کرکے) روح کی اس خوش ذوقی پر میں اس سے اپنی زندگی کا سودہ کرسکتا ہوں۔

بیگم انور : ایسا نہ کہیے مسٹر اسلم۔ خدا کے لیے ایسا نہ کہیے۔ وہ ایک بھٹکتی ہوئی روح ہے۔ اس نے میرے شوہر کو اس قدر ہانٹ کیا ہے کہ اب وہ شاید ہی زندہ رہ سکے۔

اسلم : (طنزیہ) آخر میری بیوی کی روح کو آپ کے شوہر سے اس قدر محبت کیوں ہوگئی؟

بیگم انور : مجھے نہیں معلوم— مگر— شاید میرا خیال درست ہو (اسلم سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا ہے۔ بیگم انور کچھ دیر خاموش رہ کر) انور نے آپ کے بارے میں اسے سب کچھ بتلا دیا تھا۔

اسلم : میرے بارے میں! میرے بارے میں کیا بتلا دیا تھا۔

بیگم انور : کہ.... کہ.... جی وہ.... میرا مطلب ہے کہ...

اسلم : (کسی قدر اکتا کر) جلدی کہہ دیجیے— کیا بتلا دیا تھا—؟

بیگم انور : کہ— کہ— آپ کے باپ کا نام وہ نہیں جو آپ بتلاتے ہیں۔

بیگم انور : پھر میرے باپ کا کیا نام ہے؟ (سوچتے ہوئے) مجھے تو وہی نام بتلایا گیا تھا۔ ہے۔ بیگم انور کہ پلہ رہیا کا نام ہے آپ کے باپ کا نہیں۔ (اسلم خاموش رہتا تھی اور ان کی روح انور کو ہانٹ کرے ہی ما، آپ کی بیگم نے خودکشی کرلی

اسلم : بکواس ہے۔ میں ایسی روحوں کا قائل نہیں۔ (ایک دم بلب بجھ جاتا ہے اور کمرے میں نسبتاً تاریکی پھیل جاتی ہے۔ بیگم انور کی خوف زدہ چیخ نکل جاتی ہے۔ اسلم پھر تیزی سے دوسرے کمرے کی طرف بڑھتا ہے کہ ایک عورت کا قہقہہ سنائی دیتا ہے۔ اسلم دوسرے کمرے میں دیکھتا ہے مگر پھر مایوسی کے انداز میں مڑتا ہے۔ بیگم انور خوف سے کانپ رہی ہیں)

بیگم انور : دیکھا۔۔۔ دیکھا۔۔۔

اسلم : (بیگم انور کے قریب آتے ہوئے غصہ سے) مسز انور! ختم کیجیے یہ ایکٹنگ!

بیگم انور : ایکٹنگ!۔۔۔ مسٹر اسلم آپ۔۔۔

اسلم : (بات کاٹ کر) بتلائیے۔ میری غیر موجودگی میں یہاں کون رہتا ہے؟

بیگم انور : یہ خالی رہا ہے مسٹر اسلم۔۔۔ آپ کی بیگم کی روح۔۔۔

اسلم : فضول باتیں نہیں مسز انور۔۔۔ روحوں کو یوں مکان سجانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ ویرانوں میں رہتی ہیں۔

بیگم انور : بخدا مسٹر اسلم! اس میں صرف آپ کی بیگم کی روح رہتی ہے۔

اسلم : رہتی ہے یا آپ نے پیدا کرلی ہے؟...!!

بیگم انور : میں نے پیدا کرلی ہے!

اسلم : جی ہاں۔ آپ نے پیدا کرلی ہے۔ تاکہ میں یہ مکان چھوڑ کر چلا جاؤں۔

بیگم انور : لیکن ہمیں اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ آپ ہمارے لیے بہترین کرایہ دار رہے ہیں۔

اسلم : اور اب کوئی بہترین تر آپ کا کرایہ دار بن گیا ہوگا۔

بیگم انور : خدا کے لیے مسٹر اسلم! کم ازکم ہمیں بے ایمان نہ سمجھیے ہم پہلے ہی سے آپ کے لیے دکھی ہیں۔ ...ے لیے کہہ رہی

اسلم : اور جب ہی مجھے آپ روحوا ...

...رے کمرے کے دروازے پر تیز روشنی ہوتی ہے۔ اسلم اور بیگم انور مڑ کر

دیکھتے ہیں۔ دروازے کی آرام دہ کرسی پر ایک عورت بیٹھی ہے۔ وہ سر سے پیر تک سیاہ لباس میں ہے۔ بڑے بڑے سیاہ بال دونوں شانوں پر پڑے ہیں۔ بیگم انور کی چیخ نکلتی ہے اور چیخ کے ساتھ ہی روشنی غائب ہوجاتی ہے۔ اب اس حصہ میں مقابلتاً تاریکی ہوجاتی ہے۔ بیگم انور اس طرح ہلنے لگتی ہیں جیسے بے ہوش ہوجائیں گی۔ اسلم سہارا دے کر انھیں صوفہ پر بٹھلاتا ہے پھر عورت کی طرف دیکھ کر)

اسلم : نسرین— تم— مگر تم تو—

نسرین : (سپاٹ آواز میں) میں مرچکی ہوں۔

بیگم انور : مسٹر اسلم! خدا کے لیے مجھے میرے کمرے میں پہنچا دیجیے۔

نسرین : اسے اس کے کمرے میں جانے دو—

اسلم : نہیں۔ جب تک مجھے تمھاری حقیقت معلوم نہ ہوجائے، میں انھیں جانے نہیں دوں گا۔

(اسلم آگے بڑھتا ہے)

نسرین : وہیں کھڑے رہو۔ تم مجھے چھو نہیں سکتے۔ میں ایک روح ہوں۔

اسلم : (آگے بڑھتے ہوئے) میں تم کو چھو کر رہوں گا۔ میں روحوں کا قائل نہیں۔

نسرین : بس رک جاؤ— آگے نہ بڑھو (اسلم رک جاتا ہے) کیا میں نے دو سال پہلے ریل کے آگے کود کر خودکشی نہیں کی تھی؟

اسلم : کی ہوگی— مگر لاش کی شناخت میں نے نہیں کی تھی— (بیگم انور ہچکیوں سے رونے لگتی ہے)

نسرین : میں کہتی ہوں اسے جانے دو—!

اسلم : نہیں۔ اس وقت تک جب تک تمھارا میک اَپ صاف کرکے یقین نہ کرلوں۔

نسرین : میری بات کا یقین نہیں؟

اسلم : نہیں۔ بجلی کے یہ شعبدے چھوٹے بچے بھی دکھلا سکتے ہیں۔

نسرین : اچھا! تو پھر میز کی دراز میں تمھارا ریوالور رکھا ہے۔ اس میں چھ شاٹ ہیں۔ ریوالور نکال کر چھ کے چھ میرے سینے پر خالی کردو۔ تمھیں میری حقیقت معلوم ہوجائے گی، اب سوچنے کیا لگے؟ ریوالور نکالو۔ بس! اب ہمت جواب دے گئی؟ (اسلم تیزی سے میز کے پاس جاتا ہے اور دراز سے ریوالور نکالتا ہے) چھ کارتوس ہیں— چیک کرلو (اسلم چیک کرتا ہے) دیکھ لیا، ہیں چھ! اب انھیں میرے سینے پر خالی کردو— تمھیں میری حقیقت معلوم ہوجائے گی۔ (اسلم اس کی طرف ریوالوار تانتا ہے۔ بیگم انور سامنے آکر)

بیگم انور : نہیں مسٹر اسلم! نہیں!!

اسلم : آپ ہٹ جایئے مسز انور۔ انھیں اپنا یہ ارمان بھی پورا کرلینے دیجیے۔

بیگم انور : نہیں! نہیں!! نہیں!!! وہ روح ہے مسٹر اسلم۔ تمھاری بیگم کی روح— (بیگم انور چیختی ہوئی کمرے سے بھاگ جاتی ہے۔ اسلم کے چہرے پر پسینے کے قطرات چمکنے لگتے ہیں اور وہ ریولوار میز پر رکھ کر رومال سے پسینہ پونچھتا ہے)

نسرین : کیوں— کیا اب بھی مجھ سے خوف زدہ ہو؟

اسلم : نہیں۔ میں اب بھی تمھیں روح ماننے کو تیار نہیں۔

نسرین : کیا میں نے دو سال پہلے خودکشی نہیں کرلی تھی؟

اسلم : میں ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ وہاں میں نے صرف سنا تھا۔ میں اس وقت تک۔ یقین نہیں کرسکتا جب تک تمھیں چھوکر نہ دیکھ لوں۔

نسرین : اورتم مجھے چھو نہیں سکتے۔

اسلم : (مڑکر، پھر غصہ سے ریوالور اٹھاکر) تو پھر اس کی گولی تمھیں چھوکر دیکھے گی۔

نسرین : شوق سے۔ مگر پہلے ایک بات کا جواب دو۔ تمھارے باپ کا کیا نام تھا؟

اسلم : نجم الغنی۔ کیا تمھیں شک ہے؟

نسرین : ہاں! یہ نام تمھارے باپ کا نہیں، انور کے باپ کا ہے۔

اسلم : (غصہ سے) اور یہ بات تمھیں انور نے بتلائی تھی؟

نسرین : ہاں!

اسلم : اس کے علاوہ کچھ نہیں بتلایا؟

نسرین : نہیں۔

(باہر سے بیگم انور کے چیخنے کی آواز)

بیگم انور : نہیں انور— نہیں— وہاں نہ جاؤ— وہ ایک خونخوار روح ہے۔

انور : مجھے چھوڑ دو سلمٰی— مجھے چھوڑ دو۔ میں زندہ درگور نہیں رہنا چاہتا۔ (دروازے کے پاس ایسی آوازیں آتی ہیں جیسے دونوں جھوما جھٹکی کر رہے ہوں) مجھے چھوڑ دو سلمٰی۔ مجھے چھوڑ دو۔

اسلم : (دروازہ کھول کر باہر جھانکتے ہوئے) انھیں اندر آنے دیجیے (انور اس طرح کمرے میں آتا ہے جیسے اپنی ہی جھونک میں آ گیا ہو۔ اسلم بھی دھکا لگنے سے ڈگمگا جاتا ہے۔ بیگم انور دروازے پر رک جاتی ہیں)

انور : کہاں ہے وہ؟— کہاں ہے؟ (نسرین کمرے سے غائب ہے) وہ میری جان کیوں نہیں لے لیتی۔ یوں تڑپا تڑپا کر کیوں مار رہی ہے۔ مجھے مار ڈالے۔ مجھے مار ڈالے— (پاگلوں کی طرح چاروں طرف کمرے کو دیکھتا ہے) کہاں گئی— کہاں گئی—؟

اسلم : مسٹر انور! (انور پھٹی پھٹی اور وحشت زدہ نظروں سے اسلم کو دیکھتا ہے۔ اسلم کچھ دیر خاموش رہ کر) میرا باپ کون تھا—؟

انور : مجھے نہیں معلوم۔ بخدا مجھے نہیں معلوم!

اسلم : نجم الغنی؟

انور : نہیں۔ وہ میرے باپ تھے۔

اسلم : اور اس یتیم خانے کے انچارج جہاں میں تین مہینے کی عمر میں داخل کیا گیا

تھا؟ (اثبات میں سر ہلاتا ہے) اور جو میری تین مہینے کی عمر سے اٹھارہ سال کی عمر تک دودھ، روٹی اور کپڑوں میں حصہ بٹاتا رہا۔

انور : جی — جی — مگر — مگر مجھے نہیں معلوم۔

اسلم : تمھیں نہیں معلوم؟ — میرے باپ کا نام بتاؤ۔

انور : مجھے نہیں معلوم۔ وہ یتیم خانے کے ریکارڈ میں ہوگا۔

اسلم : وہ بھی معلوم ہو جائے گا — کیا میری ماں کوئی رنڈی تھی؟

انور : جی — جی —

اسلم : (ریوالور انور کو دکھلاتے ہوئے) میرے ہاتھ میں ریوالور ہے۔ مسٹر انور! تمھیں سچ سچ سب کہنا ہوگا۔

انور : جی! مجھے کچھ نہیں معلوم۔

اسلم : مگر تم نے میری بیوی پر ایسا ظاہر کیا کہ میں رنڈی کی اولاد ہوں۔ مجھے اپنے باپ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ (ایک دم تیز روشنی ہوتی ہے اور نسرین پھر دروازے پر کھڑی نظر آتی ہے۔ دونوں اس کی طرف دیکھتے ہیں)

نسرین : اور اس رنڈی کی بہو کی عزت پر بھی دو مرتبہ حملہ کیا تھا۔

اسلم : (غصہ سے انور کو دیکھ کر) تم انسان نہیں، درندے ہو۔ تمھیں مر ہی جانا چاہیے۔

نسرین : اور میں نے تنگ آ کر خودکشی کر لی اور دو سال سے بالکل تنہا ان دو کمروں میں بھٹک رہی ہوں۔ اسے گولی مار دو اسلم اسے گولی مار دو!

انور : (کانپتے ہوئے) نہیں — نہیں...

اسلم : میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا بزدل —!

بیگم انور : (آگے بڑھ کر) نہیں... نہیں.... وہ گنہگار ضرور ہے مگر... مگر —

نسرین : (بات کاٹ کر اسلم سے) بزدل مرد! اس نے تجھے رنڈی کی اولاد کہا۔ تیری بیوی کی عزت لوٹنے کی کوشش کی اور تو اس سے انتقام بھی نہیں لے سکتا (اسلم انور کی طرف ریوالور تانتا ہے) چلاؤ۔ گولی چلاؤ بزدل نامرد —

انور : نہیں! نہیں!! مسٹر اسلم۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔

نسرین : تجھے مرنا ہی پڑے گا۔

بیگم انور : نہیں مسٹر اسلم — یہ بدروح ہے۔

نسرین : گولی چلاؤ اسلم۔ گولی چلاؤ۔ تمھارا گنہگار تمھارے سامنے موجود ہے۔

(اسلم پھر انور کی طرف ریوالور تانتا ہے مگر اس کا ہاتھ کانپنے لگتا ہے اور چہرے پر پسینہ آجاتا ہے اور ہاتھ نیچے گر جاتا ہے)

اسلم : (آہستہ سے) میں کسی کو قتل نہیں کرسکتا... میں کسی کو قتل نہیں کرسکتا—

نسرین : (تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے) بزدل! بے غیرت!! اگر تو نہیں تو میں اسے قتل کردوں گی۔

(اسلم کے ہاتھ سے ریوالور چھیننے کی کوشش کرتی ہے۔ اسلم اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ چند سیکنڈ جدوجہد ہوتی ہے۔ پھر اسلم ایک دم)

اسلم : یہ روح نہیں ہے! یہ روح نہیں ہے!! (نسرین اسے چھوڑ کر الگ کھڑی ہوجاتی ہے۔ اسلم اسے غور سے دیکھ کر) یہ تم کیا کرتی رہی ہو نسرین؟

نسرین : اگر میں یہ ناٹک نہ کرتی تو — تو —

(نسرین اسلم کے سینے سے لگ کر ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ کچھ دیر بعد ہچکیوں پر قابو پاتے ہوئے)

نسرین : اس نے مجھے بہت دکھ دیا ہے اسلم — بہت دکھ

اسلم : اگر میں تم پر گولی چلا دیتا تو — تم نے بہت بڑا رسک لیا تھا۔

نسرین : (آنسوؤں کے بیچ مسکراتے ہوئے) میں مرتی نہیں اسلم — میں مرتی نہیں۔ روحیں مرا نہیں کرتیں۔ ریوالور میں ڈرانے کے لیے صرف ڈمی کارتوس تھے۔

(انور چند سیکنڈ کھڑا رہتا ہے اور پھر چکر کھا کر گر پڑتا ہے۔ اسلم اسے مڑ کر دیکھتے ہوئے)

اسلم : ارے! کہیں ہارٹ فیل تو نہیں ہوگیا —!

نسرین : (نفرت سے) حرام کی کمائی سے پرورش ہوئی ہے۔ یوں غیرت دار بن کر مر نہیں سکتا۔

(اسلم جھک کر اس کی نبض دیکھتا ہے)

(پردہ)

(مطبوعہ: تعمیر ہریانہ، اگست 1971)

اور یہ انسان

کردار

(1) رام گوپال (فرنیچر پر رنگ کرنے والا کاریگر) (2) رُکمنی (گوپال کی بیوی) (3) آشا (رام گوپال کی لڑکی) (4) احمد حسن (مسجد کا امام) (5) عبدل (چائے فروش) (6) چندر موہن (ایک گاہک)

منظر:

(ایک معمولی مکان کا چھوٹا سا کمرہ، کمرہ میں صرف ایک دروازہ ہے جس کے کھلنے پر ایک دالان نظر آتا ہے۔ جو لب سڑک ہے۔ اگر کمرہ میں دروازہ کے سامنے بیٹھا جائے تو سڑک اور دالان اس طرح سے سامنے آجاتے ہیں جیسے وہ اسٹیج کا ہی حصہ ہوں اس لیے سڑک پر چلنے والے اسٹیج کے کردار ہی معلوم ہوتے ہیں۔ کمرہ بے حد مختصر ہے جس کے آس پاس کچھ کھانا پکانے کے برتن سلیقے سے رکھے ہیں۔ چولھے سے تھوڑے ہٹ کر ایک چھوٹی سی چارپائی بچھی ہے جس پر ایک معمولی بستر بچھا ہے اور اس پر آشا لیٹی ہوئی ہے۔ چارپائی کے پاس دو چٹائیاں بچھی ہیں جن پر رام گوپال اور رکمنی بیٹھے ہیں۔ کمرہ کا دروازہ بند ہے اس لیے کمرہ میں تاریکی ہے اور طاق میں ایک چھوٹا سا چراغ جل رہا ہے۔ صبح

کے تقریباً سات بجے ہیں۔ بارش آہستہ آہستہ ہورہی ہے۔ لیکن موسم کی حالت سے اندازہ ہوتا ہے کہ رات بھر تیز بارش ہوتی رہی ہے۔ آسمان پر ابھی تک گہرے بادل ہیں، ہوا تیز اور سرد ہے۔ کمرہ کا دروازہ بند ہونے کی وجہ سے موسم کا صحیح اندازہ نہیں ہورہا ہے مگر خنکی کا احساس ضرور ہے۔

آشا کمبل اوڑھے لیٹی ہے، منہ کھلا ہوا ہے اور آنکھیں بند ہیں، چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عرصہ کی بیمار ہے۔ عمر تیرہ چودہ برس کی ہے، قبول صورت ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ شباب کے عالم میں اس کا حسن اور نکھر آئے گا اور اس کا شمار خوبصورت لڑکیوں میں ہونے لگے گا۔ کچھ دیر رکمنی اور رام گوپال لحاف لپیٹے خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ پھر رام گوپال انگڑائی لے کر)

رام گوپال : ''آشا کی ماں! رات تو آشا نے آرام سے گزاری؟''

رکمنی : کہاں آرام سے گزاری! تم تو گھوڑے بیچ کر سوتے ہو۔ تین مرتبہ تو میں نے پانی پلایا۔ تیز بخار رہا ہے۔ رات بھر۔

رام گوپال : دو تین مرتبہ تو میری بھی نیند کھلی، پر اس وقت تو وہ شانت تھی۔''

رکمنی : ''مجھے اس کی بیماری کی بڑی چنتا ہے۔'' (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ منہ دوسری طرف پھیر کر آنسو پونچھتے ہوئے۔)

رام گوپال : (ٹھنڈی سانس بھر کر) ''بھگوان پر بھروسہ رکھو آشا کی ماں!''

رکمنی : ''بھگوان پر تو بھروسہ ہے پر کچھ دوا دارو بھی تو چاہیے۔ تین دنوں سے اسے دوا نصیب نہیں ہوئی۔

رام گوپال : بارش پیچھا چھوڑے تو کام بنے، گھر سے نکلنا ہو (خلا میں گھورتے ہوئے) بارش میں کون فرنیچر پر رنگ کراتا ہے؟''

رکمنی : ''مجھے تو آشا کی چنتا کھائے جارہی ہے'' (آنسو پونچھے ہوئے) ''مجھ سے اس کا دکھ نہیں دیکھا جاتا۔'' (کچھ دیر خاموش رہ کر) کارخانے تو جاؤ۔ شاید سیٹھ کچھ پیشگی دے دے۔ کہنا لونڈیا کی دوا کو چاہیے ہیں۔''

رام گوپال : ''سیٹھ ویسے برا آدمی نہیں ہے۔'' (کچھ سوچ کر) ''پر کنجوس ہے پیشگی دینے میں جھک جھک کرتا ہے، اس لیے میں کبھی پیشگی نہیں مانگتا۔

رُکمنی : ''تمھارے کام سے تو وہ خوش ہے، شاید پیشگی دے دے، اچھے کاریگر اسے کہاں ملتے ہیں؟''

رام گوپال : ''وہ تو ٹھیک ہے مگر...''

رُکمنی : ''اگر وہ پیشگی دینے میں حیلے کرے تو کہہ دینا میں دوسرے کارخانے میں چلا جاؤں گا۔'' (آشا کروٹ بدلتی ہے، رُکمنی آشا کی طرف دیکھ کر) ''آشا بیٹی! آشا بیٹی!!'' (آشا آنکھیں کھول کر دیکھتی ہے) ''اب جی کیسا ہے بیٹا؟''

آشا : (نحیف آواز میں) ''ٹھیک ہے ماں! ابھی صبح نہیں ہوئی؟''

رُکمنی : ''ہوگئی بیٹی!'' (اٹھ کر آشا کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر) ''اب تو بخار نہیں ہے۔''

رام گوپال : ''بھگوان نے چاہا تو اب بخار نہیں آئے گا۔''

رُکمنی : ''پر رات تو تیز بخار رہا ہے۔''

(باہر سڑک پر آواز: ''چائے گرم۔'')

رام گوپال : (مسکرا کر) 'عبدل چاچا کو چین نہیں، نہ آندھی دیکھے ہے نہ طوفان۔''

رُکمنی : پکا ساتھ ہے۔ پانچ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور بیوی کی بیماری جان کے ساتھ ہے۔''

(سڑک پر پھر آواز۔ ''چائے گرم۔ رام گوپال، رام گوپال! کیا ابھی تک سویا پڑا ہے۔''؟)

رام گوپال : (دروازہ کی طرف جاتے ہوئے) ''نہیں عبدل چاچا۔ اٹھ گیا ہوں'' (دروازہ کھولتا ہے، دروازہ کے سامنے عبدل کھڑا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں برتن ہے اور دوسرے میں ایک بالٹی جس میں کچھ پیالیاں ہیں۔ ایک پھٹی سی برساتی پہنے ہے۔ رام گوپال اسے مسکرا کر اور دیکھ کر) ''عبدل چاچا! تمھیں چین نہیں؟''

عبدل : ''چین! زندگی چین کا نام نہیں ہے رام گوپال!'' (قہقہہ لگاتا ہے) ''بٹیا کی طبیعت اب کیسی ہے؟''

رام گوپال : ''رات تو تیز بخار تھا۔ پر اب طبیعت ہلکی ہے۔''

عبدل : (مسکرا کر) ''آج چائے نہیں چاہیے؟''

رام گوپال : ''نہیں عبدل چاچا۔ آج کچھ —''

عبدل : (مسکرا کر) ''میں تیرے لیے تھوڑا ہی پوچھ رہا ہوں۔ میں تو بیٹا کے لیے پوچھ رہا ہوں۔'' (بلا رام گوپال کے کہے اندر آجاتا ہے۔ رکمنی اسے دیکھ کر گھونگھٹ کر لیتی ہے، عبدل مسکرا کر) بڈھی ہوگئی پر ابھی تک شرم نہیں گئی (قہقہہ مار کر) '' بہو بنی ہوئی ہے ابھی تک'' (آشا کی طرف دیکھ کر کیوں بٹی! اب تو کیسی ہے؟'' (آشا کے چہرہ پر ہلکی سی مسکراہٹ آتی ہے اور وہ ہاتھ اٹھا کر سلام کرتی ہے) ''جیتی رہ! خدا خوش نصیب کرے!'' (آشا رام گوپال کو دیکھتی ہے) ''اسے کیا دیکھتی ہے؟'' (مسکرا کر) ''اس کنجوس کی جیب سے چار پیسے کب نکلے ہیں؟'' (بالٹی سے پیالی میں چائے بھر کر آشا کی طرف بڑھاتا ہے۔ رکمنی سہارا دے کر آشا کو بٹھلاتی ہے اور عبدل کے ہاتھ سے پیالی لے کر طشتری میں چائے ڈال کر آشا کو پلاتی ہے) ''بہت کمزور ہوگئی ہے بٹیا!''

رام گوپال : ڈیڑھ مہینہ تو ہوگیا ہے عبدل چاچا!''

عبدل : ''سب ٹھیک ہوجائے گا۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ دوا دارو تو کرتا ہے۔''

رام گوپال : (ٹھنڈی سانس بھر کر) ''ہو رہی ہے عبدل چاچا!''

عبدل : ''پیسے کوڑی کی تو ضرورت نہیں؟ اگر ہو تو مجھ سے کہنا، سمجھا! (رکمنی چائے کی پیالی اسے واپس کرتی ہے۔ عبدل پیالی لے کر بالٹی میں ڈالتے ہوئے ''اچھا اب میں چلتا ہوں، دیکھ، شرمانا نہیں، دوا کی ضرورت ہو تو مجھ سے ضرور کہنا!''

رام گوپال : ''ہاں عبدل چاچا! ضرورت ہوگی تو ضرور کہوں گا۔'' (عبدل دروازہ کی طرف جاتا ہے) ''چائے کے پیسے چاچا!''

عبدل : اچھا—!— اُدھار رہے۔ جب بٹیا اچھی ہولے تو کوڑی کوڑی کا حساب کر دینا۔''

(مسکرا کر کمرہ سے نکل جاتا ہے)

رام گوپال : ''عبدل چاچا بھی خوب ہے، دن بھر ہنستا رہتا ہے۔''

رکمنی : ''ایسی ہمدردی کرتا ہے جیسے اپنا ہی ہو۔''

رام گوپال : ''بڈھا ہوگیا ہے پر مسخرہ پن نہیں گیا۔''

آشا : ''بابا؟'' (رام گوپال آشا کی طرف دیکھتا ہے) ''مجھے دروازہ کے سامنے لٹا دو، یہاں تو دم گھٹتا ہے۔''

رام گوپال : ''ٹھنڈی ہوا ہے بٹی! تجھے رات تیز بخار تھا۔''

آشا : ''میں کمبل اوڑھ لوں گی بابا! وہاں سے سڑک نظر آئے گی تو دل بہلے گا۔ میں تو چارپائی پر پڑے پڑے گھبرا گئی۔

رام گوپال : ''جلدی اچھی ہولے، پھر دوڑتی پھرنا، کون روکتا ہے۔''

آشا : ''نہیں بابا! میں یہاں نہیں لیٹوں گی، جی گھبراتا ہے۔''

رام گوپال : ''تجھ سے تو ہلا بھی نہیں جاتا۔ یہاں تک کیسے آئے گی؟''

آشا : ''تم اور ماتا جی پلنگ گھسیٹ کر ادھر کردو۔''

رام گوپال : ''پر بٹی...!''

آشا : ''نہیں بابا! میں رو پڑوں گی۔''

رام گوپال : (چارپائی کے پاس جاکر) ''تو تو بچوں کی سی ضد کرے ہے۔'' (رکمنی سے) ''ذرا ہاتھ لگانا۔'' (رکمنی اور رام گوپال چارپائی کو سامنے کرتے ہیں) ''اب کمبل اچھی طرح لپیٹ لے، بالکل بچی بنی ہوئی ہے۔''

(رام گوپال ایک دم کسی گہری سوچ میں پڑ جاتا ہے، رکمنی اس کا چہرہ دیکھ کر)

رکمنی : ''کیا بات ہے، کس سوچ میں پڑ گئے؟''

رام گوپال : ''کچھ نہیں آشا کی ماں! کوئی بات نہیں۔''

رکمنی : ''پھر بھی— کیا سوچ رہے ہو؟''

رام گوپال : ''یوں چارپائی کو اٹھانا اچھا شگن نہیں ہے۔''

(رکمنی بھی سوچ میں پڑ جاتی ہے۔ رام گوپال خلا میں گھورنے لگتا ہے۔ آشا سڑک کو تک رہی ہے جس پر اب بارش تیز ہوگئی۔ بادل زیادہ گہرے ہوجانے کی وجہ سے تاریکی بڑھ گئی ہے۔ کبھی کبھی بجلی چمکتی اور بادل گرجتے ہیں۔ سڑک سنسان ہے۔ کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز آجاتی ہے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد)

رکمنی : ''آج مسجد کے مولوی صاحب نہیں آئے۔ صبح نماز سے لوٹتے سمے وہ بچی پر جھاڑنے پھونکنے ضرور آتے ہیں، شاید بارش کے کارن۔

رام گوپال : (ایک دم چونک کر) ''پر میں نے تو اذان بھی نہیں سنی۔ میری نیند تو اذان سے کھلتی ہے۔ آشا کی ماں! تونے اذان سنی تھی۔''

رکمنی : ''نہیں، میں نے بھی نہیں سنی۔ شاید ہماری نیند نہیں کھلی۔''

رام گوپال : ''یہ نہیں ہوسکتا۔ میں تو پچیس برس سے اذان کی آواز سے جاگ رہا ہوں۔'' (سوچتے ہوئے) ''بھگوان خیر کرے، بڑی بدشگونی ہوئی۔''

رکمنی : (بات ٹالنے کے انداز سے)''مولوی صاحب کی جھاڑ پھونک سے آشا کی حالت کچھ بدل تو ضرور گئی ہے۔''

رام گوپال : ''بھگوان کا نام لیتے ہیں۔'' (سوچتے ہوئے) ''اور مولوی دل کا سچا ہے— سچے دل سے بھگوان کا نام لو تو وہ پرارتھنا ضرور سنتا ہے۔''

رکمنی : کسی کے ایک پیسے کا روادار نہیں۔ سنتی ہوں، بہت سے مولوی پیسے لے کر بھگوان کا نام لیتے ہیں؟''

رام گوپال : ''اور بھگوان ان کی پرارتھنا نہیں سنتا۔ بھگوان کی دَیا لے لو یا پیسے۔''

(مولوی احمد حسن سڑک پر نظر آتا ہے۔ رام گوپال اسے دروازہ میں سے دیکھ کر) ''مولوی صاحب!

(مولوی مسکراتا ہوا آتا ہے، شرعی داڑھی ہے، سفید لمبا سا کرتا پہنے ہے، ٹخنوں سے اونچا پاجامہ ہے، سر پر سفید عمامہ باندھے ہے، کمرہ میں آکر آشا کی چارپائی پر بیٹھ کر مسکراتا ہے اور آشا کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر)

احمد حسن : ''کیوں بیٹی! اب طبیعت کیسی ہے؟''

آشا : ''ٹھیک ہے مولوی صاحب۔''

رکمنی : (گھونگھٹ کر کے) ''رات بھر تیز بخار رہا ہے۔ رات بھر جانے کیا کیا برائی ہے۔ میرا تو دل گھبراتا ہے مولوی صاحب۔''

احمد حسن : ''خدا کارساز ہے، تو فکر کیوں کرتی ہے بہو؟ خدا پر بھروسہ رکھ! سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

(احمد حسن آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھتا ہے۔ رکمنی اور رام گوپال خاموش کھڑے رہتے ہیں۔ مولوی کچھ دل ہی دل میں پڑھ کر آشا پر دم کرتا ہے۔ پھر مسکرا کر آشا سے) ''بیٹی! اب جلدی سے اٹھ بیٹھ!''

آشا : ''مولوی صاحب! میں تو لیٹے لیٹے گھبرا گئی۔''

احمد حسن : (مسکرا کر) ''اب تو بھلی چنگی ہے، خدا نے چاہا تو جلد ہی دوڑنے پھرنے لگے گی۔''

رام گوپال : ''مولوی صاحب! آج میں نے اذان نہیں سنی۔ یہ تو بڑی بدشگونی ہوئی۔''

احمد حسن : ''آج مسجد میں اذان نہیں ہوئی رام گوپال۔''

رام گوپال : (حیرت سے احمد حسن کا چہرہ دیکھ کر) ''کیوں، خیر تو ہے مولوی صاحب؟''

احمد حسن : ''رات بارش سے مسجد کی چھت چونے لگی تھی۔ ڈر تھا کہ کہیں گر نہ پڑے۔''

رام گوپال : ''پر مولوی صاحب!...''

احمد حسن : اس لیے احتیاط کے طور پر دوسری مسجد میں نماز پڑھ لی۔ اب جا کر دیکھتا

ہوں، کیا حالت ہے۔"

رام گوپال : "پر مولوی صاحب! اذان کا نہ ہونا تو بڑی بری بات ہے۔"

احمد حسن : "ہاں رام گوپال! مگر مجبوری ہے نا۔" (کھڑے ہوکر) "میں جاکر دیکھتا ہوں، کیا حالت ہے۔ کچھ اس کی مرمت کا بند و بست کروں، (دروازہ کی طرف جاتا ہے۔ پھر ایک دم پلٹ کر) "رام گوپال!" (رام گوپال سوالیہ انداز میں احمد حسن کو دیکھتا ہے۔احمد حسن جیب میں ہاتھ ڈال کر) "یہ تعویذ ہے۔ اس میں لوبان کی دھونی دے کر بچی کے گلے میں باندھ دے! اللہ کا نام ہے۔"

(رام گوپال عقیدت سے تعویذ لیتا ہے، مولوی احمد حسن کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ رام گوپال کچھ دیر کھڑا سوچتا رہتا ہے، پھر تعویذ رکمنی کو دے کر)

رام گوپال : "آشا کی ماں! یہ تعویذ آشا کے گلے میں باندھ دے۔ میں جاکر دیکھوں، مسجد کی چھت کی کیا حالت ہے۔"

رکمنی : عقیدت سے تعویذ اپنے ہاتھ میں لیتی ہے اور پھر مسکرا کر) تمھیں مندر کی کبھی ایسی چنتا نہیں ہوئی جیسی مسجد کی ہے۔"

رام گوپال : "مندر اور مسجد دونوں بھگوان کے گھر ہیں پگلی، محلّہ میں مندر نہیں، مسجد تو ہے۔ بھگوان کا نام چاہے مسجد میں لیا جائے چاہے مندر میں سب برابر ہے۔" (دروازہ کی جانب جاتا ہے۔ چندر موہن دروازہ پر آکر رام گوپال کو دیکھ کر)

چندرموہن : "رام گوپال! کہاں چلا؟"

رام گوپال : "نمستے بابو جی۔ ذرا مسجد تک جا رہا ہوں۔"

چندرموہن : "کیوں، کیا بات ہے؟"

رام گوپال : "سنا ہے مسجد کی چھت چو رہی ہے۔آج صبح اذان بھی نہیں ہوئی۔"

چندرموہن : "جب ہی مولوی احمد حسن تیز تیز جا رہا تھا۔"

رام گوپال : ''ہاں۔ وہ ابھی یہیں سے گئے ہیں۔ کہیے بابو جی! کیا سیوا ہے میرے لائق؟''

چندر موہن : ''کچھ فرنیچر پر رنگ کرانا ہے۔''

رام گوپال : ''اس موسم میں؟''

چندر موہن : ''ہاں رام گوپال! بہت ضروری ہے۔ فرنیچر پر آج ہی رنگ ہونا ہے۔''

رام گوپال : ''پر بابو جی! یہ موسم تو رنگ کے لیے اچھا نہیں ہے۔''

چندر موہن : ''مگر مجبوری ہے۔ سیٹھ کی لڑکی کی شادی ہے۔ فرنیچر پر آج رنگ ہوجانا چاہیے۔''

رام گوپال : ''مگر بابو جی — آج.....''

چندر موہن : (قطع کلام کر کے) ''اگر مگر کچھ نہیں۔ جیسا بھی ہو، کچھ فکر نہیں۔ جو کچھ تمھاری مزدوری ہو اس سے دونی لے لینا۔''

رام گوپال : ''دونی مزدوری کا سوال نہیں، سوال پالش کا ہے، پڑوس کی بٹیا کے جہیز پر رنگ فرسٹ کلاس ہونا چاہیے۔ یہ موسم رنگ کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔''

چندر موہن : ''پر مجبوری ہے، سیٹھ نے کہا ہے، جیسا بھی رنگ ہو، پر آج ہونا چاہیے۔''

رام گوپال : ''پر بابو جی! میرا اطمینان نہ ہوگا۔ دو چار روز ٹھہر جاؤ۔ ایسا رنگ کروں گا کہ نظریں لگیں گی — سیٹھ کی کون سی بٹیا کا بیاہ ہے؟''

چندر موہن : ''بملا دیوی کا۔''

رام گوپال : ''بملا دیوی کا! پردہ تو میری آشا کی عمر کی ہے۔ بڑی جلدی بیاہ رچا دیا۔''

چندر موہن : ''بڑے لوگوں کی بچی ہے (مسکرا کر) جلدی جوان ہوجاتی ہے (رام گوپال حسرت سے آشا کی طرف دیکھتا ہے اور خاموش ہوجاتا ہے، آشا سڑک پر ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی ہے۔ کچھ دیر خاموش رہتی ہے۔ پھر چندر موہن رام گوپال کا چہرہ دیکھ کر) کس فکر میں پڑ گیا ہے؟''

رام گوپال : ''کوئی بات نہیں بابو جی!''

چندر موہن : تو فرنیچر تیرے گھر پہنچا دوں؟ کچھ پیشگی کی ضرورت ہو تو کہہ دے۔''

رام گوپال : ''نہیں پیشگی کی ضرورت نہیں، کام ہو لینے دو۔ پیسے بھی مل جائیں گے۔''

رکمنی : ''بابو جی! کچھ پیشگی دے دو، یہ تو شرماتے ہیں، بٹیا کے لیے دوا کی ضرورت ہے۔''

چندر موہن : ''اچھا اچھا۔ (جیب میں سے دس روپے کا نوٹ نکال کر دیتے ہوئے) یہ لو، پر کام شام تک ہو جانا چاہیے۔'' (رام گوپال کو روپے دے کر) ''میں فرنیچر ابھی پہنچائے دیتا ہوں۔''

رام گوپال : ''پر بابو جی! کام من پسند نہ ہو تو نام نہ رکھنا۔''

چندر موہن : (مسکرا کر) ''ارے بابا جیسا بھی ہو جائے ٹھیک ہے۔''

(چلا جاتا ہے۔ رام گوپال، چندر موہن کو سڑک پر جاتے ہوئے دکھتا رہتا ہے، کچھ دیر خاموشی کے بعد)

رکمنی : ''تمھاری مت ماری گئی کیا؟ وہ خود پیشگی دینے کو تیار تھا اور تم انکار کر رہے تھے، جانتے بوجھتے کہ آشا کے لیے دوا کی ضرورت ہے۔''

رام گوپال : ''میری نہیں تیری مت ماری ہے۔ ایک دم پیشگی مانگ بیٹھو تو کیا عزت ہے؟

رکمنی : ''تم عزت کو لیے پھرتے ہو، بیٹی کی حالت سامنے ہے۔

رام گوپال : ''وہ تو ٹھیک ہے آشا کی ماں! پر انسان کی عزت بھی کوئی چیز ہے۔''

رکمنی : ''تم تو کام لینے سے ہی انکار کر رہے تھے''

رام گوپال : ''انسان کے کام کی بھی ایک عزت ہے۔'' (فخریہ مسکرا کر)'' رام گوپال اچھے کاریگروں میں ہے آشا کی ماں۔'' (مولوی احمد حسن سڑک پر تیز تیز دکھائی دیتا ہے رام گوپال اسے دیکھ کر) ''کیوں مولوی صاحب! چھت کی کیا حالت ہے؟''

احمد حسن : (سڑک ہی پر سے) ''اچھی حالت نہیں، بڑا شگاف پڑ گیا ہے۔ اگر فوراً سیمنٹ نہ بھری گئی تو چھت بیٹھ جائے گی۔ میں مزدوروں کو ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔'' (تیز تیز قدموں سے چلا جاتا ہے۔ رام گوپال کسی گہری سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد)

آشا : ''میں! مجھے پانی پلا دو۔ پیاس لگی ہے۔''

رکمنی : ''اچھا بیٹی!'' (گلاس میں پانی بھر کر آشا کو دیتے ہوئے) ''لے بیٹی!'' (آشا رکمنی کے سہارے سے اٹھ کر بیٹھتی ہے اور پانی پی کر پھر لیٹ جاتی ہے۔ رکمنی آشا کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر) ''اب تو بخار نہیں ہے، بھگوان نے چاہا تو اب نہیں آئے گا'' (رام گوپال سے مخاطب ہوکر) ''اب ذرا حکیم جی کے یہاں چلے جاؤ، نہیں تو کام میں ایسے لگو گے کہ سب سدھ بھول جاؤ گے۔ تین دن کی دوائی کے پیسے بھی دیتے آنا۔''

رام گوپال : ''اچھا آشا کی ماں! (کھوئے ہوئے انداز میں) ''جاتا ہوں۔''

رکمنی : ''اور پرہیز کا کھانا بھی لیتے آنا۔ کتنے پیسے دینے ہیں حکیم جی کو؟''

رام گوپال : ''پتہ نہیں، انھوں نے پیسے مانگے ہی نہیں۔ میں نے پوچھا تو کہہ دیا جب بٹیا اچھی ہولے تب دے دینا۔ ایسی جلدی کیا ہے؟''

رکمنی : ''اچھا تو جلدی جاؤ۔ نہیں تو سیٹھ کے یہاں کا کام آجائے گا۔''

رام گوپال : (اسی طرح کھوئے ہوئے انداز میں) ''اچھا جاتا ہوں۔''

رکمنی : (رام گوپال کا چہرہ غور سے دیکھ کر) ''کیا سوچ رہے ہو؟''

رام گوپال : (کھوئے ہوئے انداز میں) کچھ نہیں۔'' (کچھ دیر خاموش رہ کر ٹھنڈی سانس بھر کر) ''بملا دیوی کی شادی ہو رہی ہے!''

رکمنی : (رام گوپال کا چہرہ دیکھ کر) ''اچھا ہی ہے۔ بھگوان کی دیا ہے۔''

رام گوپال : (سوچتے ہوئے) ''اپنی آشا! میں سوچتا ہوں، اس سے عمر میں بڑی ہے مگر...

رکمنی : 'کنیا کے بیاہ کی چنتا تو بھگوان کرتا ہے، ہمیں کیا فکر! جب بھگوان کی دیا ہوگی تو اس کا بیاہ بھی ہوجائے گا۔''

رام گوپال : ''ہاں بھگوان کی دیا!'' (کچھ کہتے کہتے ایک دم خاموش ہوجاتا ہے۔ چند سیکنڈ خاموش رہ کر) : ''مجھے دوائی کی شیشی دے دے! حکیم جی کے یہاں

ہو آؤں۔'' (رکمنی طاق سے ایک شیشی اٹھا کر دیتی ہے) ''رات کو تیز بخار رہا؟''

رکمنی : ''ہاں رات کو تیز بخار تھا۔''

آشا : ''اور بابا سر میں بھی درد تھا۔''

رکمنی : ''اور حکیم جی سے کہنا، بھوک نہیں لگتی۔''

آشا : ''مجھ سے کھچڑی نہیں کھائی جاتی بابا۔''

رام گوپال : ''اب پیٹ میں تو درد نہیں ہے؟''

آشا : ''نہیں بابا۔ اب پیٹ میں درد نہیں ہے۔ (سڑک پر احمد حسن پھر گزرتا ہے۔ اس کے ساتھ دو تین مزدور ہیں)

رام گوپال : مولوی صاحب! میری ضرورت ہو تو بلا لیجو!

احمد حسن : ''اچھا رام گوپال!'' (مزدوروں کے ساتھ چلا جاتا ہے)

رام گوپال : (رکمنی سے) ''میری ٹوپی تو اٹھا دے، جلدی حکیم جی سے مل آؤں، پھر کام کروں۔'' (رکمنی ٹوپی اٹھا کر دیتی ہے۔ رام گوپال سر پر لگاتا ہے اور جانے کے واسطے مڑتا ہے کہ چندر موہن دو تین مزدوروں پر کچھ فرنیچر لے کر آتا ہے اور رام گوپال اسے دیکھ کر) آگئے بابو جی؟

چندر موہن : ''کہاں چل دیا؟''

رام گوپال : ''ذرا حکیم جی کے یہاں جا رہا ہوں۔''

چندر موہن : ''جلدی آجائیو۔'' (مزدوروں سے) ''سامان رکھ دو۔'' (مزدور سامنے دالان میں سامان رکھ دیتے ہیں۔ پھر رام گوپال سے) ''کام ضرور آج شام تک ضرور مل جانا چاہیے۔''

رام گوپال : ''تم چنتا نہ کرو بابو جی! کام وقت پر مل جائے گا۔''

چندر موہن : ''ہاں شادی کا معاملہ ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ...''

چندر موہن : ''نہیں نہیں بابو جی! جب کہہ دیا تو ضرور مل جائے گا۔''

چندرموہن : ''تم بھروسہ کے آدمی تھے اس لیے سیدھا تمھارے پاس آیا۔''
رام گوپال : ''صرف بھروسہ کی وجہ سے!'' (مسکرا کر طنزیہ) ''نہیں تو کسی اور کے پاس جاتے۔''
چندرموہن : ''نہیں'' (شرمندہ سا ہوکر) ''یہ بات نہیں۔ میں نے تو ویسے ہی ایک بات کہی'' (احمد حسن پھر تیز تیز قدموں سے سڑک پر جاتا ہوا نظر آتا ہے)
رام گوپال : ''کیا بات ہے مولوی صاحب؟''
احمد حسن : ''کوئی مزدور چھت پر چڑھنے کے لیے تیار نہیں۔ حالت بہت نازک ہوگئی ہے۔''
رام گوپال : ''تو اب کہاں چل دیے۔
احمد حسن : کسی اور مزدور کو دیکھنے، جو چھت پر چڑھنے کی ہمت کر سکے۔

(احمد حسن آگے بڑھ جاتا ہے، رام گوپال کچھ سوچنے لگتا ہے۔ مسجد کی طرف سے کچھ چیخنے چلانے کی آوازیں آتی ہیں۔ رام گوپال کان لگا کر انھیں سنتا ہے مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ چندرموہن رام گوپال کو دیکھ کر)

چندرموہن : ''اچھا، تو میں چلتا ہوں۔'' (رام گوپال اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیتا۔ چندرموہن اس کا چہرہ غور سے دیکھ کر)
شام کو مزدور پہنچا دوں گا پانچ چھ بجے تک۔'' (رام گوپال اب بھی خاموش رہتا ہے) ''کیا سوچ رہے ہو رام گوپال؟''
رام گوپال : (کھوئے ہوئے انداز میں) ''میں سوچ رہا ہوں بابو جی کہ تمھارا کام نہ کرسکوں گا۔''
چندرموہن : (حیرت سے) ''کیوں؟''
رام گوپال : ''میں مسجد کی چھت پر چڑھنے جا رہا ہوں۔ مسجد کی چھت گرنا نہیں چاہیے۔''
چندرموہن : مگر تم پیشگی...''
رام گوپال : (جیب سے روپے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے) ''یہ رہے تمھارے پیسے؟''
چندرموہن : تمھیں روپے کی ضرورت ہے۔ تمھاری لڑکی......''

تہور حسین : تو صاحب زادے ابھی یہیں تشریف رکھتے ہیں۔

غیور : (سامنے دیوار پر بڑی کلاک کو دیکھ کر) ابا جان! ابھی گاڑی آنے میں ایک گھنٹہ کی دیر ہے۔

تہور حسین : (غصہ سے) اور تم جو راستہ بھر الیکشن لڑتے ہوئے جاؤ گے وہ وقت کس حساب میں ہوگا۔

غیور : مگر ابا جان—

تہور حسین : (بات کاٹ کر غصہ سے) بس خاموش رہو۔ بزرگوں سے بحث کرنا تمھارے الیکشن کا کوئی نعرہ ہے (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) آپ کے سامنے کون سے مقاصد ہیں جن کو سامنے رکھ کر آپ الیکشن بازی فرما رہے ہیں؟ کون سی پارٹی ہے آپ کی۔

غیور : (کھڑے ہوکر) ابا جان— وہ— میرا ارادہ ہے کہ—

تہور حسین : اجی ارادہ تو ہے، میں پوچھتا ہوں کہ آپ کی پارٹی کون سی ہے۔

غیور : ابا جان! میں تو ویسے کی حیثیت سے کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔

تہور حسین : (غور سے غیور کو دیکھ کر) واں ویسے! اِس پارٹی کا نام میں آج ہی سن رہا ہوں۔

غیور : (مسکرا کر) یہ پارٹی نہیں ہے ابا جان۔

تہور حسین : (غصہ سے) تو پھر کیا ہے؟

غیور : یعنی آزاد امیدوار۔

تہور حسین : واہ میاں صاحب زادے۔ گویا ایک چنا بھاڑ پھوڑنے چلا ہے۔

غیور : آزاد امیدوار کی اہمیت اِس لیے ہے کہ وہ حکمراں جماعت اور مخالف کے درمیان پاسنگ کا کام کرتا ہے۔

تہور حسین : گویا تھالی کا بیگن ہوتا ہے (طنزیہ ہنس کر) آپ دونوں سے اپنی آؤ بھگت کرانا چاہتے ہیں۔

غیور : ابا جان اگر میں چن لیا گیا تو اپنے بہت سے کام نکل جائیں گے جیسے وہ اپنی

زمین کا مسئلہ کئی سال سے الجھا ہوا ہے۔

تہور حسین : اِس زمین کی ایسی کی تیسی۔ جھگڑا طے نہیں ہوتا نہ ہو، زمین ہاتھ سے جاتی ہے چلی جائے مگر میں الیکشن کی لعنت اپنے گھر میں برداشت نہیں کرسکتا۔

غیور : ابا جان—

تہور حسین : بس خاموش رہو۔ تم یہ چاہتے ہو کہ تمھارا یہ بوڑھا باپ دربدر بھیک مانگتا پھرے کہ میرے بیٹے کو ووٹ دو۔

غیور : لوگ آپ کی عزت کرتے ہیں۔ آپ کو اپنا بزرگ مانتے ہیں۔ آپ کا ایک اشارہ۔

تہور حسین : (بات کاٹ کر) تو تم یہ چاہتے ہو کہ لوگ میری بے عزتی بھی کریں (بات کا رُخ بدل کر) اور یہ کرسچین لڑکی کون تھی؟

غیور : (گھبرا کر) جی کون سی کرسچین لڑکی!

تہور حسین : جس سے آپ ابھی فلسفۂ تمدن پر بحث فرما رہے تھے (غصہ سے) کون ہے وہ؟

غیور : اوہ— وہ— وہ تو بدری کی فرم میں ملازم ہے۔ اس کی سکریٹری ہے۔

تہور حسین : اچھا اِس کی سیکریٹری ہے! اس کا اور بدری کا کیا رشتہ ہے۔

غیور : جو ایک مالک اور ملازم میں ہوتا ہے۔

تہور حسین : تو آپ لوگ اِسے ساتھ لے کر کیوں گھومتے ہیں۔

غیور : ہم لوگ! یعنی آپ کا مطلب ہے کہ

تہور حسین : جی ہاں میرا مطلب ہے کہ جناب غیور حسین خان صاحب اور پنڈت بدری پرشاد صاحب۔ پرسوں ہی مجھ سے ہرگوند نے کہا تھا کہ آپ موٹر میں لے کر اِسے کہیں جا رہے تھے۔

غیور : تو آپ نے ہرگووند کی بات کا یقین فرما لیا۔

تہور حسین : تو میں تمھاری بات کا یقین فرماؤں اور اُس بوڑھے کی بابت کا نہیں جس نے ساری زندگی اس محلے میں رہ کر گزار دی ہے جو عمر میں مجھ سے بڑا ہے۔ سچ بتاؤ کہاں لے کر گئے تھے اس کو؟

غیور : ایک بڑے افسر سے ملنا تھا، بدری کا ایک کام اٹکا ہوا تھا۔
تہور حسین : تو پھر اِس لڑکی کو لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟
غیور : وہ بدری کی سکریٹری ہے۔ لوگوں سے جان پہچان کرانا مقصد تھا۔
تہور حسین : (طنزیہ) اچھا۔ تو پنڈت بدری پرشاد صاحب عورتوں کے ذریعہ اپنا کام نکالتے ہیں۔ آپ انھیں سمجھا دیجیے گا کہ اگر انھیں سکریٹری رکھنے کا شوق ہے تو کسی مرد کو اپنا سکریٹری رکھیں۔ عورتوں کو سکریٹری رکھنا میں پسند نہیں کرتا (اندرون مکان جاتے ہوئے (اور کان کھول کر سن لیجیے آپ الیکشن وا لیکشن کے چکر میں نہیں پڑیں گے۔)

(تہور حسین اندرون مکان چلے جاتے ہیں۔ غیور پھر صوفے پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگتا ہے کہ نجم النسا مسکراتی ہوئی کمرہ میں آتی ہے اور غیور کو دیکھ کر)

نجم النسا : آج صبح صبح اچھی ڈانٹ پڑی۔
غیور : (نجم النسا کو دیکھ کر بیزاری سے) اچھا آپ اپنی چونچ بند رکھیے ابھی میں کچھ کہوں گا تو آپ ابا جان کے پاس فیصلہ کے لیے جائیں گی۔
نجم النسا : (مسکرا کر) اور وہ حق بات کہیں گے اور آپ کے مردانہ وقار کو ٹھیس پہنچ جائے گی۔
غیور : دیکھو نجم۔۔ زیادہ زبان چلانا اچھا نہیں ہوتا۔ میں چھوٹی ہونے کا خیال کرتا ہوں۔ اور تو برابر سر چڑھے جاتی ہے۔ بس غالب کے دو چار الٹے سیدھے اشعار کیا پڑھ لیے ہیں کہ خود کو جانے کیا سمجھنے لگی ہے۔
نجم النسا : (مسکرا کر) اور غالب آپ کے پلے نہیں پڑتا۔
غیور : پلے پڑے یا نہیں مجھے غالب والب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔
نجم النسا : (مسکرا کر) کیوں دلچسپی ہوگی۔ آپ سیاسیاست میں جو حصہ لیتے ہیں۔ (ہنس کر) الیکشن کے بعد اس کی قلعی بھی کھل جائے گی۔
غیور : ہاں۔ تو تو یہی چاہتی ہے کہ میں الیکشن میں ہار جاؤں۔

نجم النسا : میں کیوں چاہوں گی۔ مگر آپ جن غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں ان کا بھانڈا الیکشن ہی میں پھوٹے گا۔

غیور : کن غلط فہمیوں میں مبتلا ہوں۔ ذرا اپنی چونچ سے تو فرمایئے۔

نجم النسا : یہی کہ مسلمانوں کے سو فیصدی ووٹ آپ کو مل جائیں گے۔ اگر دس فیصدی بھی مل جائیں تو بہت ہے۔

غیور : اور باقی ووٹ۔

نجم النسا : آپ حساب لگاتے وقت کمیونسٹ پارٹی کو کیوں نظرانداز کر دیتے ہیں۔

غیور : مگر مسلمانوں کے ووٹ مسلمان کو ملنا چاہیے۔

نجم النسا : تو ہندوؤں کے ووٹ ہندوؤں کو اور عیسائیوں کے ووٹ عیسائی کو ملنا چاہیے۔ (غیور خاموش ہو جاتا ہے۔ نجم النسا اسے مسکرا کر دیکھ کر) اب آپ اسٹیشن تشریف لے جایئے۔ نہیں تو ابا جان ابھی آپ کے الیکشن کا بخار اُتار دیں گے۔

(غیور گھڑی دیکھتا ہے اور خاموشی سے اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ نجم النسا صوفے پر پڑے ہوئے بے ترتیب اخبار کو ترتیب دے کر میز پر رکھتی ہے کہ تہور حسین داخل ہوتے ہیں۔ انھوں نے باہر جانے کا لباس پہن رکھا ہے۔ نجم النسا کو دیکھ کر)

تہور حسین : (صاحبزادے تشریف لے گئے۔)

نجم النسا : وہ تو اسی وقت چلے گئے تھے۔ لیکن آپ نے یہ کہاں کی تیاری کر لی؟

تہور حسین : صاحب زادے کو فرصت نہیں تھی۔ اس لیے سوچا خود ہی چلا جاؤں۔ گاڑی تو کب کی آگئی ہوگی۔

نجم النسا : مگر رات آپ کو سخت بخار تھا۔

تہور حسین (مسکرا کر) بڑھاپا صدہا بخاروں کا ایک بخار ہے۔ جلدی سے مجھے ایک پان لا دے دیر ہو رہی ہے۔

نجم النسا : مگر ابا جان۔ ڈاکٹروں نے آپ کو مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔

تہور حسین : ان ڈاکٹروں کے بغیر بھی دنیا چلتی ہے اور انسان زندہ رہتے ہیں۔

نجم النسا : مگر ابا جان—

تہور حسین : (بات کاٹ کر) بیٹی! تم لوگوں کے مشورہ کی وجہ سے میں اسٹیشن نہیں گیا۔ پنڈت کیا کہتا ہوگا۔ (گھڑی کی طرف دیکھ کر) اسے آئے ہوئے بھی ایک گھنٹہ ہوگیا۔

نجم النسا : (مسکرا کر) تو اب پنڈت جی کے گھر جانے کی تیاری ہے۔

تہور حسین : (ہنس کر) تو کیا تو سمجھ رہی ہے کہ میں ہوا خوری کے لیے جارہا ہوں (نجم النسا کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اِسے تھپ تھپاتے ہوئے جلدی سے ایک پان لائے۔

نجم النسا : مگر ابا جان! پنڈت جی ابھی سفر سے تھکے ماندے آئے ہوں گے انھیں ذرا آرام کر لینے دیجیے۔ شام کو چلے جایئے گا۔

تہور حسین : (جھنجھلا کر) تم نوجوانوں کو بحث کرنے کا جانے کیا مرض ہے۔ میں بھلا چنگا ہوں۔ چلا جاؤں گا۔ جاؤ پان لادو۔ (نجم النسا دروازہ کی طرف مڑتی ہے) اور میری چھڑی بھی اٹھاتی لانا)

(نجم النسا چلی جاتی ہے۔ تہور حسین کلاک کے نیچے کھڑے ہوکر اس کے پنڈولم کو حرکت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ کبھی کبھی جیب سے گھڑی نکال کر دیکھتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد نجم النسا واپس آکر)

نجم النسا : ابا جان۔

تہور حسین : (مسکرا کر نجم النسا کو دیکھ کر) اِس دور میں تو نوجوانوں میں کاہلی اور سستی عام مرض بن گیا ہے۔ (طنزیہ) صاحب زادے سے اسٹیشن جانے کو کہا تو وہ سیاست بگھارتے رہے۔ بیٹی سے پان لانے کو کہا تو وہ پورے ڈیڑھ گھنٹے میں تشریف لائیں۔

نجم النسا : ابا جان۔ بھائی جان آج کل بے حد مصروف ہیں۔

تہور حسین : بے حد مصروف ہیں۔ باپ نے کما کر رکھ لیا ہے صرف اس لیے مصروفیت ہے۔ (نجم النسا کے ہاتھ سے پان لے کر منہ میں رکھ کر) جس دن جیب خرچ بند ہو جائے گا ساری مصروفیت ہوا ہو جائے گی۔ بھلا پنڈت کیا کہتا ہوگا۔ پورے دس سال بعد آیا ہے۔

(چھڑی نجم النسا سے لے کر دروازہ کی طرف مڑتے ہیں کہ ایک نوکر گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے اور گھبرائے ہوئے انداز میں)

ملازم : سرکار — سرکار۔

تہور حسین : کیا بات ہے؟ اس قدر گھبرایا ہوا کیوں ہے۔

ملازم : سرکار — وہ — وہ —

تہور حسین : وہ وہ کیا لگا رکھا ہے۔ کچھ کہے گا بھی آخر بات کیا ہے۔

ملازم : سرکار! پنڈت جی آگئے۔

تہور حسین : پنڈت جی آگئے! کہاں ہیں؟

ملازم : دروازہ پر۔

تہور حسین : اور تو یہاں بھاگ آیا۔ جا سامان اتروا۔

(ملازم تیزی سے کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ تہور حسین دروازہ کی طرف مڑتے ہیں کہ دروازہ پر آواز۔ ''میں اندر آ جاؤں۔'' نجم النسا تیزی سے دوسرے کمرہ میں چلی جاتی ہے۔ تہور حسین اس طرح دروازہ کو دیکھتے ہیں جیسے گھبرا گئے ہوں۔ خاموش کھڑے رہتے ہیں، پھر آواز۔ ''میں اندر آ جاؤں۔'' تہور حسین اب بھی خاموش رہتے ہیں۔ نجم النسا پردہ کی آڑ سے۔)

نجم النسا : ابا جان! پنڈت جی کو اندر بلا لیجیے۔

تہور حسین : اوہ ہاں۔ آؤ نا۔ بھلا آواز دینے کی کیا ضرورت ۔۔

(پنڈت رام کشور آتے ہیں۔ عمر ساٹھ سال کے قریب ہے۔ ان کے پیچھے ان

کی بیوی لکشمی اور لڑکی راجیشوری داخل ہوتے ہیں۔ تہور حسین اور رام کشور چند سیکنڈ ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر ایک دم بغل گیر ہو جاتے ہیں۔ چند منٹ بعد تہور حسین علیحدہ ہوکر رام کشور کے دونوں بازو پکڑ کر سر سے پیر تک اِس طرح دیکھتے ہیں جیسے کئی سال بعد کسی بچہ سے ملنے پر اس کے بڑھے ہوئے قد کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔

تہور حسین : پنڈت! بالکل وہی ذرا بھی تو نہیں بدلا۔

رام کشور : بدلا کیوں نہیں۔ (مسکرا کر)

مارا زمانہ نے اسداللہ خاں تمھیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

(راجیشوری کی طرف مڑ کر) راجیشوری! خان چاچا کے چرن نہیں چھوئے۔

تہور حسین : (راجیشوری کی طرف مڑ کر) ارے یہ چوہیا تو ایک دم بڑی ہوگئی۔ (راجیشوری شرما کر نظریں جھکا لیتی ہے اور بڑھ کر چرن چھوتی ہے)۔ جیتی رہو بیٹی۔ خوش نصیب ہو۔ (سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں پھر لکشمی کی طرف مڑ کر) ارے بھائی تم (ہنس کر) خدا کی قسم اب تو یہ گھونگھٹ ہٹا دو۔ (لکشمی گھونگھٹ اور زیادہ کرلیتی ہے— یہ لو— (مسکرا کر جھک کر فرشی سلام کرکے) آداب قبول فرمایئے (لکشمی خاموش رہتی ہے۔ تہور حسین قہقہہ مار کر ہنستے ہیں۔ اِسی وقت وجو داخل ہوتا ہے عمر اسی سے کسی حالت میں کم نہیں۔ لکڑی کے سہارے جھک کر چل رہا ہے۔ ایک پرانا سا چشمہ آنکھوں پر ہے۔ پنڈت رام کشور وجو کو دیکھ کر)

رام کشور : ارے وجو چاچا— (بڑھ کر اس سے بغل گیر ہوتے ہیں) وجو چاچا تم تو بالکل بدل گئے ہو۔ (وجو اس طرح ان کی طرف کان بڑھاتا ہے جیسے اس نے سنا نہیں۔ رام کشور بلند آواز سے! میں نے کہا وجو چاچا تم تو بالکل بدل گئے ہو۔

وجو : ارے پنڈت جی بدلوں گا نہیں تو کیا ہوگا۔ آنکھوں سے کم سوجھائی دیتا ہے۔

کانوں سے سنائی نہیں دیتا۔ بس زندگی ہے تو گھسٹ رہی ہے۔

رام کشور : تم تو خان کے گھر کی برکت ہو چاچا برکت۔

وجو : (رام کشور کے چہرہ کے پاس منہ کر کے) اچھے تو رہے پنڈت جی۔ جی ترس گیا تم کو دیکھنے کو۔ (پھر ایک دم جیسے کچھ یاد آجانے پر) وجو نہیں آئی آپ کے ساتھ۔

رام کشور : آئی کیوں نہیں۔ آپ کے پیچھے کھڑی آداب کر رہی ہے۔

(وجو پلٹ کر دیکھتا ہے۔ راجیشوری جھک کر سلام کرتی ہے۔ رجو آنکھوں پر زور دے کر اسے دیکھتے ہوئے)

وجو : جیتی رہو بیٹی (راجیشوری کے چہرہ پر دونوں ہاتھ اِس طرح پھیرتا ہے جیسے اس کا جائزہ لے رہا ہو) کم بخت اب تو بالکل سوجھائی نہیں دیتا (پھر ایک دم کچھ یاد آجانے پر جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک روپیہ نکال کر راجیشوری کو دیتے ہوئے) یہ لے بیٹی۔

رام کشور : ارے وجو چاچا کیا کرتے ہو۔

وجو : میں تو آپ لوگوں کا خادم ہوں۔ پنڈت جی کیا اس قدر گیا گزرا ہوں کہ — (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ رام کشور راجیشوری کو روپیہ لینے کا اشارہ کرتا ہے۔ راجیشوری روپیہ لے کر سلام کرتی ہے) جیتی رہو بیٹی۔ بلند اقبال ہو۔ بہو کہاں ہے؟

رام کشور : آپ کو آداب کر رہی ہے۔

(وجو لکشمی کی طرف مڑتا ہے۔ لکشمی ہاتھ اٹھا کر سلام کرتی ہے)

وجو : (اِس کے سر پر ہاتھ پھیر کر) خوش نصیب رہو بہو۔ سدا سہاگن بنی رہو۔

تہور حسین : وجو چاچا کو سلام اور آداب بھی ہو گیا۔ اب ہمارے سلام کا ابھی تک جواب نہیں ملا۔ ہونے دو راجیشوری کی شادی گن گن کے بدلے چکاؤں گا۔ (قہقہہ مار کر ہنستا ہے۔ لکشمی شرما کر اور گھونگھٹ کو بڑھا لیتی ہے۔ پردہ کی آڑ

سے نجم النسا)

نجم النسا : چاچا ہمارا آداب بھی قبول ہوگیا یا نہیں۔ خدا کی قسم جھکے جھکے کمرا کڑ گئی۔

(رام کشور پلٹ کر دروازہ کی طرف دیکھتا ہے)

تہور حسین : نجم ہے۔ آداب کر رہی ہے۔

رام کشور : اچھا تو یہ بلی پردہ کرنے لگی ہے (مسکرا کر) جیتی رہو بیٹی (ہنس کر) مگر ہم پردہ نشین خواتین کا آداب قبول نہیں کرتے۔

نجم النسا : ہم نے تو دعا پھٹکار ہی لی۔ آداب بھی قبول ہو جائے گا۔

(راجیشوری اور لکشمی دوسرے کمرہ کی طرف جاتی ہیں)

رام کشور : (ہنس کر) بہت حاضر جواب ہوگئی ہے۔ (تہور حسین کی طرف مڑ کر) کیوں خان اس کی آنکھیں اب بھی بلی کی طرح ہیں؟

تہور حسین : (ہنس کر) بالکل ایسی ہی ہیں پنڈت کہ راجیشوری اور لکشمی دوسرے کمرہ میں چلی جاتی ہیں۔ تہور حسین رام کشور کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھلاتے ہوئے) کہو پنڈت سفر تو اچھا گزرا۔ (اس کے پاس بیٹھ کر) کل رات بڑا سخت بخار تھا۔ نجم اور غیور پیچھے پڑ گئے کہ اسٹیشن نہ جاؤں۔ مگر نہ رہا گیا۔ تمھارے گھر جانے کے لیے تیار کھڑا تھا کہ تم آ گئے۔

رام کشور : بدری اپنی گاڑی لے کر اسٹیشن آ گیا تھا مگر میں نے اس سے کہا کہ اگر اپنے گھر پہلے چلا گیا تو تم ناراض ہو جاؤ گے۔ اس لیے سیدھا ادھر چلا آیا (جو فرش پر بیٹھ کر رام کشور کے پاؤں دابنے لگتا ہے۔ رام کشور فوراً دونوں پاؤں صوفے پر رکھ کر) کیا کرتے ہو وجو چاچا۔ کیوں اس بڑھاپے میں مجھ پر گنا ہوں کا بوجھ لاد رہے ہو۔

وجو : پنڈت جی! آپ ہی لوگوں کا نمک کھا کر اس عمر کر پہنچا ہوں۔ ابھی تو ہاتھ پاؤں میں کس بل ہے۔ ایسی خدمت کا موقع کب ہاتھ آئے گا۔

رام کشور : کیسی باتیں کرتے ہو وجو چاچا۔ تم تو ہمارے بزرگ ہو۔

وجو : سرکار نے گھر میں ڈال رکھا ہے تو زندہ ہوں (فخریہ اور جذباتی لہجہ میں) اب سرکار مجھے پنشن دیتے ہیں پنشن۔

رام کشور : تمھارا لڑکا کہاں ہے کس حال میں ہے،

وجو : اچھا ہے خوش حال ہے (تہور حسین کی طرف دیکھ کر) سرکار کی بدولت کچھ پڑھ لکھ گیا ہے۔ سرکاری نوکری کرتا ہے۔ کئی مرتبہ چلنے کو کہا مگر جہاں کا نمک کھا کر زندگی گزار دی اس گھر کو چھوڑنے کو جی نہیں چاہا۔ دو روٹی کھاتا ہوں اور سرکار کو دعا دیتا ہوں۔

رام کشور : (تہور حسین کی طرف دیکھ کر) غیور کہاں ہے۔

تہور حسین : آپ کو لینے اسٹیشن تشریف لے گئے ہیں۔ کیا بتلاؤں پنڈت جان ضیق میں کررکھی ہے۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) صاحب زادے پر سیاست کا بھوت سوار ہے۔ دن رات جانے کہاں کہاں مارے پھرتے ہیں۔ گھر کو سرائے سمجھ رکھا ہے۔ رات کاٹنے کے لیے تشریف لے آتے ہیں۔

رام کشور : کہاں کی برائی ہے (مسکرا کر) تم تو خان اِس طرح کہہ رہے ہو جیسے چھوت کی بیماری لگ گئی ہو بیچارے کو۔

تہور حسین : چھوت کی بیماری سے کہیں مہلک۔ نہ کھانے کا ہوش نہ گھر کی پرواہ۔ کبھی یہ میٹنگ کبھی وہ جلسہ۔ بھئی ناک میں دم کررکھا ہے۔ کم بخت نے۔ تمھارے لڑکے کو دیکھ کر جی باغ باغ ہوتا ہے۔ کیا سعادت مند ہے۔

رام کشور : (ٹھنڈی سانس بھر کر) دور کے ڈھول سہاونے ہوتے ہیں۔ ہمارے دل سے پوچھو۔ کلیجے میں داغ پڑ گئے ہیں۔ صاحب زادے کی سعادت مندی سے۔

تہور حسین : تمھاری یہ جلی کٹی سنانے کی عادت نہیں گئی۔ آخر سعادت مندی کے تم کیا معنی سمجھتے ہو۔

رام کشور : صاحب زادے بلا اجازت کسی آئیڈ کمپنی میں ملازم ہوکر بدیش تشریف لے گئے۔ پانچ سال وہاں رہ کر چار پیسے کما لیے ہیں۔ اب یہاں بزنس کی سوجھی

ہے۔ سب گنوالیں گے تو ہاتھ جھٹک کر باپ کی جیب کاٹنے آجائیں گے۔

تہور حسین : تم کاروبار کو بری نظر سے دیکھتے ہو! کیا تم یہ چاہتے ہو کہ یہ بھی تمھاری طرح تمام زندگی بیس روپے کی مدرسی کرتا۔

رام کشور : ایک بات کا رونا ہو تو رولوں۔ جان ضیق میں کر رکھی ہے۔

تہور حسین : مجھے تو مصر کا چھپا ہوا ایسا کلام پاک لاکر دیا تھا کہ جی خوش ہوگیا۔

رام کشور : یہ دکھانے کی باتیں ہیں۔ اندر سے اس کا جی کس قدر میلا ہے یہ میں خوب سمجھتا ہوں۔

.ور حسین : (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) ماما کا لڑکا کہاں ہے؟ اِسے ساتھ نہیں لائے۔

رام کشور : (ٹھنڈی سانس بھر کر) ساتھ نہیں لاتا تو کہاں لے جاتا۔ بدری کے ساتھ چلا گیا۔

تہور حسین : (آنکھوں میں آنسو بھر کر) کیا جوان موت ہوئی ہے۔ تمھارا ہی دل تھا جو برداشت کر گئے۔

رام کشور : بھگوان کی مرضی کے آگے کس کی چلی ہے خان۔ ہم تو اس کی مرضی پر خوش ہیں۔ (ٹھنڈی سانس بھرتے ہیں۔ چند سیکنڈ خاموش رہ کر) کہو نجم کی شادی کی بات چلی کہیں۔

تہور حسین : پیغام تو کئی آئے مگر مجھے پسند نہ تھے۔ منصور کا پیغام تھا۔ منصور کو تو تم جانتے ہوگے؟ (رام کشور تہور حسین کو اس طرح دیکھتے ہیں جیسے ذہن پر زور دے رہے ہوں) ارے بھئی وجاہت علی خاں کا لڑکا (رام کشور اب بھی اس طرح خاموش رہتے ہیں جیسے نہ پہچانتے ہوں) وہی جو گھوڑا نخاس میں رہتے تھے مشیر المہام کے دفتر میں ملازم تھے۔

رام کشور : ارے وہ جن کی بڑی بڑی کیسری آنکھیں تھیں۔ پان بے حد کھاتے تھے۔

تہور حسین : ہاں ہاں وہی بیچارے کا دو تین سال ہوئے انتقال ہوگیا۔ خدا جنت نصیب کرے۔ بڑا نیک آدمی تھا۔ منصور انہی کا لڑکا ہے۔ ڈاکٹر ہے۔

رام کشور : تو پھر بات چیت کچھ آگے بڑھی۔

تہور حسین : وہ گھرانہ وجو کو پسند نہ آیا۔ اس لیے انکار کر دیا۔ تم تو جانتے ہو میرے جیتے جی وجو کی مرضی کے خلاف اِس گھر میں کچھ نہیں ہوسکتا۔ (وجو اپنی لاٹھی کاندھے سے لٹکائے اس طرح بیٹھا رہتا ہے جیسے یہ باتیں نہ سن رہا ہو۔ پھر ایک دم جیسے کچھ یاد آ جانے پر)

وجو : پنڈت جی! اب رجو بیٹا کے ہاتھ پیلے کرنے کا ارادہ ہے یا نہیں۔

رام کشور : (وجو کے کان کے پاس منہ لے کر جاکر) وجو چاچا اِسی ارادہ سے آیا ہوں۔ آپ لوگوں کی دعا ہوگی تو اس کے ہاتھ بھی پیلے ہو جائیں گے۔

وجو : خدا سے میری دعا ہے کہ نجم بیٹا اور وجو بیٹا کے ہاتھ جلدی پیلے ہو جائیں۔ دونوں جلدی سے اپنے اپنے گھروں کی ہو جائیں۔ پنڈت جی زندگی کا کیا بھروسہ کب بلاوا آ جائے۔

تہور حسین : اچھا پنڈت اب تم نہا دھولو۔ میں کھانے کا انتظام کراتا ہوں۔ تھکے ہوئے آئے ہو کچھ دیر آرام کرلو۔ باتوں کے لیے زندگی پڑی ہے۔

رام کشور : بدری نے کھانے کا انتظام کرلیا ہے۔ اب اجازت دو۔

تہور حسین : کیسی باتیں کرتے ہو۔ بھلا میں تمھیں یوں جانے دوں گا۔

رام کشور : بدری کی ماں نے پہلے ہی کہا تھا کہ تم ضد کرو گے۔ بھئی تمھارے یہاں مہمان رہنے کو زندگی پڑی ہے۔ اِس وقت تو اجازت دو۔

تہور حسین : نہیں نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ (ایک ملازم پان وغیرہ لے کر آتا ہے۔ لگے ہوئے پانوں کے ساتھ کچھ کچے پان۔ چھالیہ۔ کتھا اور چونا علیحدہ رکھتے ہوئے۔ رام کشور اِسے دیکھ کر مسکراتا ہے۔ تہور حسین ہنس کر میں نے نجم سے کہہ دیا تھا کہ پنڈت بڑا کٹر ہندو ہے۔ مسلمان کے گھر کا لگا پان تک نہیں کھاتا۔

رام کشور : ارے خان! جب ساری زندگی یونہی گزار دی تو اب چتا پر بیٹھ کر اپنے اصول کیوں توڑوں۔ (مسکرا کر کچا پان۔ چھالیہ اور کتھا اٹھاتا ہے۔ جیب سے چونا

نکال کر سب ہتھیلی پر رکھ ملتا ہے اور کھاتا ہے) ہمارا زمانہ گزر گیا خان۔ اب تو نئے لوگ ان باتوں کو کہاں مانتے ہیں۔ ہمارے ہی صاحب زادے کو لو۔ انھیں مسلمان اور عیسائی کسی سے بھی پرہیز نہیں۔ (رازدارانہ لہجہ میں سنا ہے کسی عیسائی لڑکی چکر میں ہیں۔

تہور حسین : میں تو سمجھتا تھا ہمارے صاحبزادے کوئی گل کھلا رہے ہیں تم نے تو ایک نیا مسئلہ کھڑا کردیا۔

رام کشور : مجھے رام بابو نے لکھا تھا۔ اگر بدری کی ماں کو پتہ چل گیا تو صاحبزادے کے ہاتھ کا چھوا پانی تک نہیں پئیں گی۔

تہور حسین : (سنجیدہ ہوکر) دیکھو میں کھوج لگاؤں گا کیا قصہ ہے۔

رام کشور : بھئی جوانی ہماری تمھاری بھی تھی (ٹھنڈی سانس بھر کر) مگر کیا کہیں۔ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) ابھی راستے میں یہ احساس ضرور ہوا کہ ہوا اپنے وطن کی ہے۔ جیسے کسی دوشیزہ کے بدن سے نکل کر آرہی ہو۔ مگر ــــ

تہور حسین : (مسکرا کر) ابھی شاعری کا چسکا نہیں گیا۔

رام کشور : کیسے جاسکتا ہے (مسکرا کر) تم نے بھی تو پنڈت کو پنڈت کہنا نہیں چھوڑا۔ (سوچتے ہوئے) نئی نئی عمارتیں۔ چوڑی چوڑی سڑکیں یہ معلوم ہوا کہ دس سال میں اپنا دیس پردیس بن گیا ہے۔

تہور حسین : اور ان سب کی آڑ میں ایک زہریلا سانپ بھی پیدا ہوگیا ہے جس نے شرافت اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کو ڈس لیا ہے ضمیر مجرم ہو چکے ہیں۔

رام کشور : سماج کا کوئی پرزہ، کوئی چول اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہے جس نے سارے ڈھانچہ کو کمزور کردیا ہے۔

تہور حسین : (ٹھنڈی سانس بھر کر) مگر پنڈت ہمارا تمھارا سماج ایسا کمزور تو نہیں تھا کہ وہ یوں ایک جھٹکے میں گر جاتا۔

رام کشور : شاید کوئی نیاانسان پیدا ہورہا ہو۔ جس کی یہ تیاری ہے۔

تہور حسین : ہزاروں مندر گرا کر ایک مندر بنا لو مگر اس میں پرانے مندروں کے خوبصورت پتھروں کو استعمال کرنا ہی پڑے گا۔ نئے پتھروں سے بنائے ہوئے مندر کا بوجھ یہ زمین برداشت نہ کر سکے گی۔ (لکشمی دوسرے کمرہ سے آتی ہے۔ تہور حسین کھڑے ہوکر) آیئے بھابی (تشریف رکھیے (لکشمی گھونگھٹ کاڑھے رام کشور سے ہٹ کر بیٹھ جاتی ہے۔ تہور حسین سامنے کری پر بیٹھ کر۔ کہیے آپ نے انجم سے ملاقات کی۔

لکشمی : نجم بٹیا بے حد سمجھ دار اور نیک ہے۔ کیا رنگ روپ نکالا ہے۔ جی چاہتا ہے بس دیکھے جاؤ۔

تہور حسین : (ہنس کر) تو پھر دیکھتی رہی ہوتیں۔ آپ کی نظر تو نہیں لگ جاتی۔

لکشمی : دونوں لڑکیاں تھیں۔ میرے سامنے شرما رہی تھیں اس لیے اٹھ کر چلی آئی۔ لالہ! نجم بیٹا کے بارے میں کچھ سوچا؟ بھگوان کی کرپا سے شادی لائق ہوگئی ہے۔

تہور حسین : بھابی! اِس گھر میں کوئی بڑی بوڑھی تو ہے نہیں جو فکر کرے۔ اب آپ آگئی ہیں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ نجم اور رجو کی ساتھ ہی ساتھ ہوگی (کچھ دیر خاموش رہ کر) کہیے رجو کے لیے کوئی لڑکا ہے آپ کی نظر میں۔

لکشمی : لڑکے تو کئی ہیں۔ اب مہابیر پرشاد جی کا ہی لڑکا ہے۔

تہور حسین : (سوچتے ہوئے) کون مہابیر پرشاد جی؟

رام کشور : اکاؤنٹس آفیسر تھے۔ تم تو اچھی طرح جانتے ہوگے۔

تہور حسین : (لکشمی کی طرف دیکھ کر) ارے آپ ان مہابیر پرشاد جی کا کہہ رہی ہیں۔ ایسے نیک اور وضع دار بزرگ کہاں پیدا ہوتے ہیں۔

رام کشور : لڑکا انجینئر ہے اور چال چلن کا بھی نیک معلوم ہوتا ہے۔

تہور حسین : غیور کے پاس تو اکثر آتا رہتا ہے۔ میں نے تو کوئی برائی نہیں دیکھی اس میں اور سچ پوچھیے تو میں نے اکثر اس کے اور رجو کے بارے میں سوچا بھی ہے۔

رام کشور (وجو کے کان کے پاس منہ لے جا کر) وجو چاچا! آپ مہابیر پرشاد جی کو جانتے ہیں۔

وجو : کیوں نہیں (سوالیہ نظروں سے رام کشور کو دیکھ کر) کیا بات ہے پنڈت جی۔

رام کشور : ان کے لڑکے اور رجو کی بات ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

وجو : نیک لوگوں کے بچے نیک ہوتے ہیں پنڈت جی۔ بس بسم اللہ کرو یہ بوڑھی آنکھیں اس خوشی کو دیکھنے کے لیے کھلی ہوئی ہیں۔ جانے کب بند ہو جائیں۔

رام کشور : آپ کی دعا اور بھگوان کی کرپا ہوئی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

(بدری پرشاد ایک چھوٹے بچے کو لے کر داخل ہوتا ہے اور تہور حسین کو دیکھ کر)

بدری پرشاد : خان چاچا آداب عرض ہے۔

تہور حسین : جیتے رہو بیٹا۔ (رام کشور کی طرف دیکھ کر) بھئی تمھارا یہ لڑکا انتہائی نالائق ہے۔ میں نے اس کو حکم دے رکھا ہے کہ یہ دوکان سے واپسی پر یہاں چائے پی کر جایا کرے۔ مگر اس نے ایک نہیں سنی۔

بدری پرشاد : خان چاچا! دوکان پر اکثر دیر ہو جاتی ہے۔ سوچتا ہوں آپ کو پریشانی ہوگی۔

تہور حسین : کیسی پریشانی! غیور جو راتوں کے بارہ بارہ بجے آتا ہے تو اس گھر والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ میری شکایت بجا ہے۔

بدری پرشاد : آپ کی شکایت سر آنکھوں پر۔ مگر——

رام کشور : (بات کاٹ کر) خاموش رہ۔ بزرگوں سے بحث کرتے شرم نہیں آتی۔ خان میری جگہ پر ہے۔ اس نے جو حکم دیا تھا اس کی تعمیل کیوں نہیں ہوئی۔ (بدری پرشاد خاموش ہو جاتا ہے۔ رام کشور بچہ کا ہاتھ پکڑ کر) بیٹا! نانا جان کو آداب نہیں کیا (بچہ سہمی سہمی نظروں سے تہور حسین کو دیکھتا ہے) تہور حسین کھڑے ہو کر بچہ کو گود میں اٹھاتے ہیں اور محبت سے اس کا منہ چوم لیتے ہیں پھر بچہ کو گود میں لے کر اپنی جگہ بیٹھ جاتے ہیں)۔

تہور حسین : بیٹا تمھارا نام کیا ہے۔

بچہ : کنول۔

تہور حسین : بڑا پیارا نام ہے۔ (پھر محبت سے پیار کرتے ہیں) کیا پڑھتے ہو بیٹا۔

(بچہ تہور حسین کا منہ دیکھتا ہے)

رام کشور : ابھی چھ سال کا ہوا ہے۔ بس اِس سال اسکول بھیجنے کا ارادہ ہے۔

تہور حسین : دیکھو پنڈت! اس کی تعلیم کی ذمہ داری میری ہے۔ میں جس اسکول میں چاہوں گا۔ داخلہ کروں گا۔

رام کشور : تم تو خان ایسے کہہ رہے ہو جیسے میں انکار کرسکتا ہوں۔ کہو تو یہیں چھوڑ جاؤں۔

تہور حسین : (بچہ کو پیار کرکے) جی تو یہی چاہتا ہے مگر تعلیم کی ذمہ داری میری ہے تو تربیت کی تمھاری، اپنے ڈھنگ اور روایات کے مطابق۔

رام کشور : (ہنس کر) کیا میری اور تمھاری اور روایات جدا جدا ہیں اور ان میں فرق ہے۔

تہور حسین : میرا اپنا مذہب ہے۔ اپنے خیالات ہیں۔ اپنے عقائد ہیں۔ جن کو میں چھوڑنا نہیں چاہتا۔ (ہنس کر) جس طرح تم آج تک میرے گھر کا پکا ہوا کھانا نہیں کھاتے۔ میرے گھر کا چونا لینا تک تم گناہ سمجھتے ہو۔ یہ تمھارے عقائد ہیں اور ٹھیک ہیں (بدری کی طرف اشارہ کرکے) مگر یہ ہمارے بعد جو نسل آرہی ہے کچھ عجیب ہے۔ میں ان کا فلسفہ آج تک نہیں سمجھ سکا۔

بدری پرشاد : (مسکرا کر) خان چاچا! اب نئے خیالات ہیں۔ نیا زمانہ ہے یہ آپ کا مذہب اور پتا جی کی چھوت چھات سب بیکار ہے۔ ایک نیا اتہاس ہوگا ایک نیا—

تہور حسین : (بات کاٹ کر) ارے میرے بھائی یہ اتہاس کیا ہوتا ہے۔

رام کشور : (مسکرا کر) تواریخ خان، تواریخ

تہور حسین : (قہقہہ مار کر) باپ نے تاریخ کو تواریخ کردیا۔ بیٹا چلا تو اس کو کیا کہا تھا تم نے بدری؟

رام کشور : اتہاس۔

تہور حسین : اتہاس کر دیا۔ (مسکرا کر رام کشور کو دیکھ کر) ابھی میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ ہماری نئی نسل ایسا مندر بنانا چاہتی ہے جس میں پرانے تراشے ہوئے خوبصورت پتھروں کی کوئی جگہ نہیں (بدری کو دیکھ کر) بھائی میرے تاریخ سے تواریخ تک تو ٹھیک ہے مگر اِس کو اتہاس کر دینا ایک نیا مندر بنانا ہے جس کا بوجھ اِس زمین کو بہت مہنگا پڑے گا۔

بدری پرشاد : مگر خان چاچا اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اگر پرانے مندروں کو نہیں ڈھایا گیا تو ہم جہاں ہیں وہیں رہیں گے۔

رام کشور : یہ تو نوجوانوں کا خیال ہے جنھیں ہر پرانی چیز سے بیزاری ہے (کنول کی طرف اشارہ کر کے) یاد رکھو یہ ایک نئی نسل اور بھی ہے جو تمھارے اتہاس کی تاریخ لکھے گی تو تمھیں اِس رومن شہنشاہ کے مقابلہ میں کھڑا کرے گی۔ جس نے روم جلا کر بانسری بجائی تھی۔

(ماحول پر ایک دم ایک تناؤ سا پیدا ہوجاتا ہے۔ سب لوگ خاموش رہتے ہیں، کچھ دیر بعد تہور حسین)

تہور حسین : ہمارے صاحب زادے ہیں۔ الیکشن کا سودا سا گیا ہے (فیصلہ کن انداز میں) میں نے سختی سے منع کر دیا ہے۔

رام کشور : کیوں! اگر نوجوانوں میں اسپرٹ ہے تو تم اِسے کیسے دبا دینا چاہتے ہو؟

تہور حسین : یہ اسپرٹ ہے! مکاری، دھوکا۔ چالبازی۔ اگر تم اِسے اسپرٹ کہتے ہو تو ٹھیک ہے۔

رام کشور : مگر خان ہمارے خاندان کا کوئی لڑکا الیکشن میں چن لیا گیا تو اِس سے ہماری عزت بڑھ جائے گی۔

تہور حسین : خاک بڑھ جائے گی اور اِس سے پہلے جو بے عزتی ہوگی وہ کس دفتر میں لکھی جائے گی۔

رام کشور : تم معاملہ کے تاریک پہلو کو ہی دیکھتے ہو خان۔

تہور حسین : اور تم اِسے روشن پہلو کہتے ہو۔ معلوم ہے صاحب زادے الیکشن میں کیا گل

کھلائیں گے؟ مسلمانوں سے خدا اور رسول کے نام پر ووٹوں کی بھیک مانگیں
گے اور ہندوؤں سے وطن کے نام پر خدا رسول اور وطن سب کو بدنام کریں گے۔

رام کشور : (مسکرا کر) اگر غیور الیکشن میں کھڑا نہ ہوا تو کیا یہ باتیں ختم ہوجائیں گی؟
کوئی دوسرا کھڑا ہوگا اور وہ بھی باتیں کرے گا۔ جب تک ہندوستان میں ان پڑھ ووٹر اور خود غرض لیڈر ہیں یہ باتیں ہوتی رہیں گی۔

تہور حسین : تو تمھارا مطلب یہ ہے کہ صاحب زادے کو اِس دلدل میں کود کر خوب کیچڑ اچھالنا چاہیے۔

رام کشور : تم تو اگلے وقتوں کی باتیں کرتے ہو۔ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔

تہور حسین : لیکن پہلے یہ باتیں کہاں تھیں پنڈت۔ اب تو جو الیکشن آیا کہ ہندو مسلمان، مذہب دھرم، خدا، بھگوان، ہندو کلچر، مسلم کلچر، اردو-ہندی اور جانے کیا کیا الم غلم شروع ہوا اور نفرتیں ابھرنا شروع ہوئیں۔

رام کشور : تم تو یہ چاہتے ہو کہ الیکشن ہی نہ ہوں۔

تہور حسین : الیکشن ضرور ہوں گے مگر ان ناموں کو ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرنے والے سے پہلے گولی کی قیمت وصول کی جائے اور پھر اسی گولی سے اس کا سینہ چھید دیا جائے۔

رام کشور : (قہقہہ مار کر) گولی مارنے کی تاریخ میں گولی کی قیمت وصول کرنا ایک اضافہ ہے (سنجیدہ ہو کر) غیور کو الیکشن لڑنے دو۔

تہور حسین : تو آپ صاحب زادے کے وکیل ہیں (ٹھنڈی سانس بھر کر) ضرور الیکشن لڑائیے اور پھر پنڈت رام کشور جی دربدر ووٹ کی بھیک مانگتے پھریے۔

(رام کشور مسکرا کر خاموش ہوجاتے ہیں۔ لکشمی تہور حسین سے)

لکشمی : لالہ! اب ہمیں اجازت دو۔

تہور حسین : (جیسے اپنے خیالات سے چونک کر) ارے بھائی ایسی جلدی بھی کیا ہے۔

لکشمی : اب آنا جانا ہوتا رہے گا۔ باتیں کرنے کو بہت وقت ہے اور ہاں آج رات

کھانا ہمارے ساتھ کھانا۔ نجم اور غیور کو بھی ساتھ لانا۔

تہور حسین : مگر بھابی—

لکشمی : اگر مگر کچھ نہیں لالہ۔ (کھڑی ہوکر بلند آواز سے) رجو۔ اری راجیشوری

(اندر سے آواز۔ ''آئی ماتا جی''!) جلدی آ بیٹی۔

تہور حسین : آپ کا یوں جانا اچھا نہیں معلوم ہو رہا (پھر ایک دم جیسے کچھ یاد آجانے پر)

ارے آپ نے پان نہیں کھایا۔

(لکشمی بغیر لگا ہوا پان۔ کچھ چھالیا اور کھا اٹھا کر اپنی ساڑی کے پلو میں باندھ لیتی ہے۔ اُسی وقت دوسرے کمرہ سے راجیشوری آتی ہے۔ رام کشور کھڑے ہوکر)

رام کشور : تو پھر رات آ رہے ہو خان۔

تہور حسین : (مسکرا کر کھڑے ہوکر) بھلا بھابی حکم فرمائیں اور میں اِنکار کروں۔

رام کشور : وجو چاچا کو لانا نہ بھولنا۔

تہور حسین : وجو تو میری زندگی کے ساتھ ہے۔ تم نہ بھی کہتے تو ساتھ لاتا۔

(سب لوگ دروازہ کی طرف بڑھتے ہیں)

(پردہ)

(مطبوعہ: پگڈنڈی امرتسر، نومبر 1962)

شاخِ نازک

افرادِ تمثیل

(1) ریحانہ (ایک نوجوان خاتون) (2) کیپٹن مرزا (ریحانہ کا پڑوسی ایک پنشن یافتہ فوجی) (3) سلیمہ خانم (کیپٹن مرزا کی بیوی) (4) عنایت (ایک پروفیسر جو ریحانہ سے محبت کرتا ہے) (5) مسز خان (ایک بیوہ خاتون) (6) ملازم (کیپٹن مرزا کا ملازم)

منظر

(کیپٹن مرزا کا ڈرائنگ روم جو قرینہ سے سجا ہوا ہے اور موجودہ ضروریات کی ہر چیز اس میں موجود ہے۔ سجاوٹ میں غیر ملکی سامان کا زیادہ استعمال کیا گیا ہے جو کیپٹن مرزا نے دورانِ جنگ میں مختلف ممالک سے حاصل کی ہیں۔ اس سامان کو ڈرائنگ روم میں سجانے میں بڑی خوش ذوقی کا ثبوت دیا گیا ہے۔ شام کے چار بجے ہیں ریحانہ خاموش بیٹھی کچھ سوچ رہی ہے کہ سلیمہ خانم داخل ہوتی ہیں اور ریحانہ کو یوں خاموش بیٹھا دیکھ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ جاتی ہیں۔ پھر کچھ دیر بعد)

سلیمہ خانم : ارے ریحانہ! تم نے یہ کیا صورت بنا رکھی ہے پروفیسر عنایت آتے ہوں گے ۔

جاؤ لباس تبدیل کردو۔

ریحانہ : چچی جان—— (خاموش ہو جاتی ہے اور سامنے دیوار کو تاکنے لگتی ہے۔ کچھ دیر خاموش رہتی ہے۔ سلیمہ خانم سوالیہ نظروں سے ریحانہ کو تاکتی رہتی ہے۔ ریحانہ کچھ دیر خاموش رہ کر) جانے آج کیوں میرا دل دھڑک رہا ہے. جی چاہتا ہے کہ میں روپوش ہو جاؤں اور پھر کبھی عنایت صاحب کے سامنے نہ آؤں۔

سلیمہ خانم : کیا بچوں کی سی باتیں ہیں۔

ریحانہ : (ٹھنڈی سانس بھر کر) بچوں کی سی باتیں نہیں چچی جان—— ایک شدید احساس ہے۔ دل اس قدر رونا چاہتا ہے کہ دنیا آنسوؤں میں غرق ہو جائے۔

سلیمہ خانم : احمقانہ باتیں تمھاری زبان سے اچھی نہیں لگتیں۔ پروفیسر عنایت ایک بہت ہی نیک دل انسان ہیں۔

ریحانہ : مگر میرے دل میں جو کانٹا چبھ رہا ہے اسے کیسے نکال پھینکوں۔ کاش وہ نیک دل خاتون اپنی ڈائری نہ لکھتی اور اگر لکھی تھی تو میرے ہاتھ کبھی نہ لگتی۔

سلیمہ خانم : جس ماں کی تم نے شکل ہی نہیں دیکھی اس کے متعلق سوچنا ہی فضول ہے۔

ریحانہ : مگر چچی جان!

سلیمہ خانم : تمھاری ماں تو وہی نیک دل خاتون تھی جس نے تمھاری پرورش کی۔ پیدا ہونے کے بعد سب سے پہلے تم جس کی گود میں آئیں اور جس نے آندھی اور طوفان سے بچا کر تمھیں جوان کر دیا۔

ریحانہ : تو پھر انھوں نے اپنی وہ ڈائری کیوں ضائع نہ کر دی جو اپنے اندر طوفانوں کا ایک سمندر لیے ہوئے تھی۔

سلیمہ خانم : وہ ایک جہاندیدہ، تجربہ کار اور دور اندیش خاتون تھی۔ تمھاری خاندانی دولت کو حاصل کرنے کے لیے یہ ڈائری ایک بڑی ضمانت ہے۔

ریحانہ : مگر مجھے اس خاندانی دولت سے نفرت ہے جس نے میری نانی کے دل و دماغ پر ایک جھوٹے وقار اور ایک جھوٹی خاندانی عظمت کا ایسا ملمع کیا جس

نے میرے احساسات کو ایسی تاریکی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا جہاں صرف تاریکی ہی نہیں بلکہ روح کو مسل دینے والا ایک شدید کرب اور شدید احساس کمتری ہے۔

سلیمہ خانم : (محبت آمیز فہمائش کے لہجے میں) تم بھی کس فضول احساسِ کمتری میں مبتلا ہوگئی ہو۔

ریحانہ : پیاری چچی جان (ایک دم ہچکیوں سے رو پڑتی ہے اور سلیمہ خانم سے لپٹ جاتی ہے۔ سلیمہ خانم محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگتی ہے۔ ریحانہ برابر ہچکیوں سے روتی رہتی ہے۔ سلیم خانم برابر اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتی رہتی ہیں جیسے وہ اس طوفان کے گزر جانے کا انتظار کر رہی ہوں۔ کچھ دیر بعد ریحانہ ہچکیوں کے درمیان) میں کیا کروں چچی جان میرے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

سلیمہ خانم : تم بچی نہیں ریحانہ پڑھی لکھی اور سمجھ دار خاتون ہو جو چیز انسان کے بس سے باہر ہے اس پر کسی طرح کا افسوس کرنا فضول ہے۔ (سر پر محبت سے ہاتھ پھیر کر) جاؤ کپڑے بدلو۔ پروفیسر عنایت آتے ہوں گے۔

ریحانہ : نہیں میں کپڑے نہیں بدلوں گی۔

سلمہ خانم : خیر نہ بدلو (مسکرا کر ریحانہ کو سر سے پیر تک دیکھ کر) تم اس لباس میں بھی بہت بھلی معلوم ہوتی ہو (بات کا رُخ بدلتے ہوئے) اور آج یہ گلدان کیوں سونے پڑے ہیں۔

ریحانہ : (آنسو پونچھتے ہوئے) مجھے دراصل کچھ خیال نہیں رہا۔

سلیمہ خانم : یہ غلط ہے۔ تمھیں پھولوں کا کس قدر شوق ہے کیا باغیچہ میں پھولوں کی کمی ہے۔

ریحانہ : کمی تو نہیں ہے مگر۔

سلیمہ خانم : گڈی یا اندو سے کہہ دیا ہوتا تو ہلا دیتے۔

ریحانہ : وہ دونوں اپنے اپنے امتحانوں میں مصروف ہیں اس لیے

سلیمہ خانم : تو نوکر چاکر کس لیے ہیں (ریحانہ خاموش رہتی ہے کچھ دیر بعد سلیمہ خانم سوچتے ہوئے) ایک بات پوچھوں؟ (ریحانہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی ہے) کیا تم نے پروفیسر عنایت سے سب کچھ کہہ دیا ہے۔

ریحانہ : کئی مرتبہ کوشش کی مگر پھر ہمت نہیں ہوئی۔

سلیمہ خانم : میں سمجھتی ہوں کہ تمھیں ان سے سب کچھ کہہ دینا چاہیے۔

ریحانہ : میں بھی کچھ ایسا ہی سوچتی ہوں مگر جب بھی کوشش کی ایک خوف اور بزدلی نے مجھے آگھیرا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس قدر بزدل کیوں ہوگئی ہوں۔

سلیمہ خانم : تم زندگی کے ایک اہم موڑ پر کھڑی ہو اگر کوئی قدم بھی غلط اٹھ گیا تو بہت برا ہوگا۔

ریحانہ : مگر ــــــــــ

سلیمہ خانم : تم پروفیسر عنایت سے سب کچھ صاف صاف کہہ دو۔

ریحانہ : میں اُن کے سامنے جا کر جانے کیوں بزدل ہو جاتی ہوں۔ میں...

سلیمہ خانم : (بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے) اس لیے کہ تم ان سے غیر شعوری طور پہ بے پناہ محبت کرتی ہو۔

ریحانہ : ممکن ہے یہ بات ہو میں نے اکثر کوشش کی کہ اُن کے سامنے اپنے تمام غرور ونخوت کو جمع کرلوں مگر سامنے جاتے ہی ایسا محسوس کرتی ہوں کہ جیسے میری کوئی ہستی ہی نہیں۔ میں ایک وہم ہوں ایک خیال ہوں میری کوئی شخصیت نہیں۔

سلیمہ خانم : تمھاری شخصیت اُن سے زیادہ عظیم ہے۔ ان سے کہیں زیادہ بلند ہے ورنہ وہ مغرور انسان جو چالیس سال تک کنوار پن کی زندگی بسر کرتا رہا ہو یوں تمھارے دروازہ پر آن کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔

(کیپٹن مرزا داخل ہوتے ہیں اور ریحانہ کو دیکھ کر)

کیپٹن مرزا: بھئی ریحانہ کمال ہے یہ تو نے مسکینوں کا حلیہ کیوں بنا رکھا ہے۔

ریحانہ : چچا جان وہ——

کیپٹن مرزا: بحث کی گنجائش نہیں میں دیکھ رہا ہوں کہ تم غیر دلچسپ لڑکی بنتی جارہی ہو!

ریحانہ : مگر چچا جان——

کیپٹن مرزا: میں کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں بس فوراً اٹھو اور لباس تبدیل کر کے میرے سامنے آؤ۔

سلیمہ خانم : (مسکرا کر) آپ تو یوں حکم چلا رہے ہیں جیسے یہاں بھی فرنٹ پر ہوں۔

کیپٹن مرزا: فوجی آدمی مرنے کے بعد بھی فوجی رہتا ہے۔ میں تمھیں ایک سچا واقعہ سناتا ہوں۔

سلیمہ خانم : (مسکرا کر واقعہ ہے یا گپ)

کیپٹن مرزا: اجی واقعہ ہے گپ کیسی۔ پچھلی لڑائی میں میں جس فرنٹ پر تھا وہاں ایک دن گھمسان کا رن پڑا ہمارے ہزاروں جوان کھیت رہے۔ جب میں نے دشمن کا غلبہ ہوتے دیکھا تو مجھے ایک تدبیر سوجھی (ریحانہ اور سلیم خانم دلچپی سے کیپٹن مرزا کو دیکھتی ہیں) میں نے چلا کر کہا فال ان (سلیم خانم سے) جانتی ہو پھر کیا ہوا؟

سلیمہ خانم : (مسکرا کر) مردے اٹھ کر کھڑے ہوئے ہوں گے اور کیا ہوا ہوگا۔

کیپٹن مرزا: بالکل ٹھیک۔ یہ دیکھ کر دشمن پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ سب ہتھیار پھینک کر بھاگ کھڑے ہوئے (سلیمہ خانم قہقہہ مار کر ہنستی ہیں۔کیپٹن مرزا ریحانہ کی طرف دیکھ کر) گیٹ اَپ (ریحانہ مسکرا کر کھڑی ہوجاتی ہے) دیٹ اِز گڈ۔ جاؤ جلدی لباس تبدیل کر کے آؤ اور ہاں ذرا کچن میں چائے کے لیے کہتی جانا۔

(ریحانہ کمرہ سے چلی جاتی ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے—— کیپٹن مرزا ایک صوفے پر بیٹھ کر سگار سلگاتے ہیں۔ اور اطمینان سے کش لگانے لگتے ہیں۔ سلیمہ خانم کچھ دیر خاموش رہ کر افسوس کے لہجے میں)

سلیمہ خانم : بیچاری بچی بہت غمگین ہے۔
کیپٹن مرزا: (منہ سے دھواں نکالتے ہوئے) آپ بیچاری بچی کو فلسفہ پر لیکچر دینے پر تلی ہوئی تھیں۔ میں پاس کے کمرہ سے سب کچھ سن رہا تھا۔
سلیمہ خانم : وہ تو ایسے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کہ میں حیران رہ گئی۔ گھبرا گئی۔
کیپٹن مرزا: اس کے دل پر سخت چوٹ لگی ہے۔ جو بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی وہ ایک دم سامنے آئی خود ہم حیرت میں پڑ گئے۔
سلیمہ خانم : مسز نوری نے رازداری کی انتہا کردی، ہم تو یہی سمجھتے رہے تھے کہ ریحانہ انہی کی لڑکی ہے۔
کیپٹن مرزا: (سوچتے) تم نے یہ اچھا کیا کہ اس سے کہہ دیا کہ وہ سب حالات سے پروفیسر عنایت کو آگاہ کردے۔
سلیمہ خانم : سنا ہے پروفیسر عنایت عمر رسیدہ آدمی ہیں۔
کیپٹن مرزا: چالیس سے زیادہ نہیں۔
سلیمہ خانم : اور ابھی تک کنوارے ہیں۔
کیپٹن مرزا: سوسائٹی کی اچھی اچھی طرح دار لڑکیوں نے اُس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی مگر وہ بندۂ خدا کسی کے دامِ فریب میں نہیں پھنسا آج کل کوئی مسز خان اُس کے پیچھے پڑی ہیں۔
سلیمہ خانم : یہ مسز خان کون ہیں؟
کیپٹن مرزا: خدا جانے کون ہیں کہتے ہیں کہ بمبئی میں پروفیسر عنایت سے ملاقات ہوئی تھی اور اب ان کا پیچھا کرتی ہوئی یہاں تک آگئی ہیں۔
سلیمہ خانم : کہیں یہ کم بخت کوئی گل نہ کھلائے۔
کیپٹن مرزا: (سوچتے ہوئے) مجھے بھی یہی ڈر ہے مگر پھر سوچتا ہوں کہ اگر ایسی ویسی کوئی بات ہوتی تو پروفیسر عنایت ریحانہ سے یوں بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔

سلیمہ خانم : لیکن پروفیسر عنایت کا اس عمر تک شادی نہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔
کیپٹن مرزا: (مسکرا کر) شاید اُسے شادی کرنے کی فرصت نہیں ملی۔
سلیمہ خانم : (حیرت سے) کیا مطلب؟
کیپٹن مرزا: سنا ہے پروفیسر قسم کے لوگ اکثر کتابوں سے شادی کر لیتے ہیں۔
سلیمہ خانم : مگر مسز خان کا مسئلہ ضرور اہم ہے۔ کیا آپ کبھی اُن سے ملے ہیں۔
کیپٹن مرزا: نہیں۔ مگر لوگوں کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ کافی مالدار اور زندہ دل خاتون ہیں۔
سلیمہ خانم : کوئی جوان عورت ہے؟
کیپٹن مرزا: (مسکرا کر) میں فوج میں کیپٹن تھا جاسوس نہیں۔
سلیمہ خانم : پھر بھی کچھ سنا تو ہوگا۔
کیپٹن مرزا: لوگ پروفیسر ہی کی عمر کی بتلاتے ہیں۔ آخر تمھیں یہ مسز خان سے کیوں دلچسپی پیدا ہوگئی ہے (مسکرا کر) عورتوں میں تجسس کی عادت انتہائی ناپسندیدہ ہوتی ہے۔
سلیمہ خانم : سوال ریحانہ کی زندگی کا ہے۔ وہ اس دنیا میں تنہا ہے۔ کہیں دھوکا نہ کھا جائے۔

(ریحانہ داخل ہوتی ہے۔ اس نے لباس تبدیل کر لیا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک نوکر چائے لے کر آتا ہے۔ کیپٹن مرزا ریحانہ کو سر سے پیر تک دیکھ کر)

کیپٹن مرزا: ویٹ از گڈ، ناؤ یو آر اے سوئٹ چارمنگ بے۔ بی

(نوکر چائے کا سامان رکھ کر چلا جاتا ہے۔ کیپٹن مرزا پھر ریحانہ کو سر سے پیر تک دیکھ کر) ونڈرفل ــــــ پروفیسر عنایت نے تمھیں کتنے سال پڑھایا ہے۔

ریحانہ : (نظریں جھکا کر) صرف ایم اے میں پڑھایا ہے۔

(دروازہ کی گھنٹی بجتی ہے اور سب کی نظریں ایک ساتھ دروازہ کی جانب اٹھ جاتی ہیں۔ کچھ دیر بعد نوکر داخل ہوکر)

ملازم : پروفیسر عنایت تشریف لائے ہیں۔

(کیپٹن مرزا اٹھ کر دروازے کی طرف جاتے ہیں۔ سلیمہ خانم اپنی شال کو
برابر کرتی ہے۔ ریحانہ چائے کی کیتلی میز پر رکھ دیتی ہے اس کے چہرہ پر
پریشانی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ سلیمہ خانم ریحانہ کو دیکھتی ہیں اور پھر جیسے
اس کے احساسات کومحسوس کر کے آہستہ آہستہ اس کا کاندھا تھپ تھپاتی ہے۔
کچھ دیر بعد پروفیسر عنایت کیپٹن مرزا کے ساتھ کمرہ میں داخل ہوتا ہے۔ وہ ایک
پروقار شخصیت کا مالک ہے۔ اسے دیکھ کر ریحانہ کھڑی ہو جاتی ہے۔ سلیمہ خانم
خاموش بیٹھی رہتی ہیں۔ کیپٹن مرزا سلیمہ خانم کی طرف اشارہ کر کے)

کیپٹن مرزا: مسز مرزا (پروفیسر عنایت مسکرا کر ہاتھ اٹھا کر سلام کرتا ہے۔ سلیمہ خانم مسکرا کر گردن ہلا کر جواب دیتی ہیں۔ کیپٹن مرزا ایک صوفے کی طرف اشارہ کر کے) تشریف رکھیے (پروفیسر عنایت ایک صوفے پر بیٹھ جاتا ہے۔ کیپٹن مرزا پروفیسر عنایت کے پاس بیٹھتے ہوئے) ریحانہ بیٹی! پروفیسر صاحب کو چائے پیش کرو۔ بیٹھی کیوں ہو؟ (پروفیسر کی طرف دیکھ کر) مسز خان کہاں ہیں انھیں ساتھ کیوں نہ لائے۔ کم از کم اُن سے ملاقات ہی ہو جاتی۔

(پروفیسر عنایت کیپٹن مرزا کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے اسے اس وقت مسز خان کے متعلق گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں۔ پھر ریحانہ کی طرف دیکھتا ہے۔ جو خاموشی سے گردن جھکائے چائے بنانے میں مشغول ہے۔ سگریٹ جلا کر اس کا کش لیتا ہے۔ پھر کیپٹن مرزا سے مخاطب ہو کر)

عنایت : آج صبح ہی سے ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔

کیپٹن مرزا: اچھا ——— آپ سے ان کی پرانی ملاقات ہے؟

عنایت : جی نہیں ——— یونہی شناسائی سمجھیے۔ سالِ گزشتہ بمبئی میں ملاقات ہوگئی تھی اور وہ بھی بے حد معمولی۔ انھیں سیر و تفریح کا شوق ہے۔ اِدھر آنکلی ہیں۔

کیپٹن مرزا: ویٹ از گڈ۔ زندہ دل خاتون ہیں۔ کہاں کی رہنے والی ہیں۔

عنایت : کلکتہ کی (ریحانہ نظریں اٹھا کر پروفیسر کو دیکھتی ہے۔ مگر وہ اطمینان سے کیپٹن

مرزا سے مخاطب رہتا ہے) وہیں ان کی پہلی شادی ہوئی تھی۔

کیپٹن مرزا: اچھا ـــــ کیا اُن کے شوہر زندہ نہیں۔

عنایت : جی ہاں۔ ان کے پہلے شوہر مسٹر رضا فاروقی جنگ میں مارے گئے۔

ریحانہ : (چونک کر) جی۔

سلیمہ خانم : تو مسٹر خان ان کے دوسرے شوہر ہیں۔

عنایت : جی نہیں۔ بدقسمتی سے ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ اب وہ بیوہ ہیں۔

(ریحانہ چائے بناتے بناتے پیالیاں میز پر رکھ دیتی ہے۔ سلیمہ خانم اس کی طرف دیکھتی ہیں۔ ایک سیکنڈ سوچتی ہیں پھر ریحانہ سے)

سلیمہ خانم : بیٹی پروفیسر صاحب کو چائے دو ٹھنڈی ہو رہی ہے۔

(ریحانہ سلیمہ خانم کو دیکھتی ہے۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے چائے تینوں کو دیتی ہے)

کیپٹن مرزا: (مسکرا کر چائے کا گھونٹ لے کر) آج کل مسز خان سوسائٹی میں کافی دلچسپی کا سامان بنی ہوئی ہیں ـــــ کہ اب تو لوگ آپ کے اور ان کے تعلقات میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔

عنایت : (مسکرا کر) لوگوں کو تو دلچسپی لینے کا کوئی بہانہ ہونا چاہیے۔ اگر وہ اس طرح سوچتے ہیں تو مجھے اس پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔

سلیمہ خانم : (مسکرا کر) کسی کے ذاتی تعلقات میں یوں دلچسپی لینا ایک قسم کا اعتراض ہی ہوتا ہے۔

عنایت : (سگریٹ کا کش لے کر مسکرا کر) اگر کسی کو میرے ذاتی تعلقات پر اعتراض ہے۔ تو مجھے ان کے اعتراض میں کوئی دلچسپی نہیں۔

کیپٹن مرزا: (مسکرا کر) اگر مرد ایک خاص عمر تک شادی نہ کرے تو پھر لوگوں کو خواہ مخواہ اس کی ذات میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔

عنایت : (مسکرا کر) اور میں اس عمر کی شادی کو محض بچوں کا کھیل سمجھتا ہوں۔

کیپٹن مرزا: (قہقہہ مار کر ہنس کر) اور آپ کو بچوں کے کھیل میں کوئی دلچسپی نہیں۔ (چائے

کی پیالی میز پر رکھ کر کھڑے ہوتے ہوئے) اچھا اب مجھے اجازت دیجیے۔

عنایت : تشریف رکھیے کہاں چل دیے۔

کیپٹن مرزا: مجھے ایک سروس مین کلب میں ایک میٹنگ اٹینڈ کرنا ہے—— خدا حافظ۔

(مسکراتا ہوا کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ ریحانہ کھڑی ہوکر سامان جمع کرنے لگتی ہے۔سلیمہ خانم ریحانہ سے)

سلیمہ خانم : رہنے دو بیٹی۔ کسی نوکر کو آواز دے لو۔ وہ آکر سامان لے جائے گا۔

ریحانہ : حرج کیا ہے میں ہی لے جاؤں گی۔

سلیمہ خانم : (کھڑی ہوکر) تم بیٹھو میں رکھ آتی ہوں۔ بچے بھی اسکول سے آتے ہوں گے۔آتے ہی چائے کے لیے چلائیں گے۔

(ریحانہ کے ہاتھ سے کشتی لے کر چلی جاتی ہے۔ کچھ دیر مکمل خاموشی رہتی ہے۔عنایت کھوئی کھوئی نظروں سے ریحانہ کو دیکھتا رہتا ہے پھر کچھ دیر بعد)۔

عنایت : ریحانہ، (ریحانہ نظریں اٹھا کر عنایت کو دیکھتی ہے) لوگوں کو مسز خان میں جانے کیوں دلچسپی ہے (ریحانہ خاموش رہتی ہے عنایت مسکرا کر) تمھاری خاموشی سے پتہ چلتا ہے کہ تم بھی ان میں دلچسپی لے رہی ہو۔

ریحانہ : ابھی تک تو نہیں لی مگر اب دلچسپی لینا پڑ رہی ہے۔

عنایت : کیوں؟ کیا تمھیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟

ریحانہ : آپ پر اعتماد ہے۔مگر مسز خان پر نہیں۔ (کھڑکی کے پاس جاکر باہر دیکھتے ہوئے) میں ان سے ایک مرتبہ ملاقات کرنا چاہتی ہوں (عنایت چند منٹ خاموش بیٹھا سوچتا رہتا ہے۔ پھر اٹھ کر ریحانہ کے پاس جاتے ہوئے جو کھڑکی کے پاس جاکر کھڑی ہوگئی ہے)

عنایت : ریحانہ! اس کا مطلب تو میں یہی سمجھتا ہو ں کہ تمھیں مجھ پر اعتماد نہیں۔ ریحانہ! یقین کرو مجھے ان کی ذات میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

ریحانہ : مجھے یقین ہے کہ آپ جھوٹ نہیں بولتے ۔ دھوکہ نہیں دیتے۔ باوجود ہر قسم کی

بری افواہوں کے میں آپ کی ذات اور کردار پر بھروسہ کرتی رہی ہوں مگر (خاموش ہو جاتی ہے اور آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ آنسو پونچھ کر) اگر میں کہوں کہ میں ریحانہ نوری نہیں بلکہ کچھ اور ہوں تو آپ کی میرے متعلق کیا رائے ہوگی۔ مطلب یہ کہ اگر میں کہوں کہ میرا خاندانی نام نوری نہیں ہے تو آپ میرے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔

عنایت : کچھ نہیں۔ خاندانی نام کو میں ایک خودفریبی سمجھتا ہوں۔ ایک واہیات سی رسم سمجھتا ہوں۔ ایک جھوٹا وقار ایک سستی شہرت کا ذریعہ سمجھتا ہوں اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ (ریحانہ کے دونوں بازو پکڑ کر) تم ریحانہ ہو صرف ریحانہ۔ (مسکرا کر) نوری، رضوی، قریشی، فارقی، کچھ نہیں۔

ریحانہ : مگر سماج میں۔ یہ ایک ضروری برائی بن چکی ہے۔ جس سے انسان کے کردار، شرافت اور سماجی حیثیت کو متعین کیا جاتا ہے۔

عنایت : وہ کردار وہ شرافت اور وہ سماجی حیثیت جھوٹ ہے فریب ہے دھوکہ جو خود انسان کا حاصل کیا ہوا نہ ہو۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) ریحانہ! تم کوئی بھی ہو کچھ بھی ہو میں تمھیں پسند کرتا ہوں اور چاہتا ہوں۔

(ریحانہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے)

ریحانہ : میری پرورش جس عورت نے کی ہے وہ میری ماں نہیں تھی میری ملازمہ تھی۔ جس کو میں ہمیشہ ماں سمجھتی رہی۔ اُس نے مجھ کو ریحانہ نوری نام دیا۔ میں اپنی ماں کے نکاح ہونے سے پہلے ہی پیدا ہوگئی۔

عنایت : کیا تم اس کو اپنا قصور سمجھتی ہو ریحانہ۔

ریحانہ : (عنایت کی بات پر دھیان نہ دے کر) میں نہیں کہہ سکتی کہ یہ میری ماں کے کردار کی گراوٹ تھی یا جذبات کی فضول خرچی مگر یہ حقیقت تھی جس کا ثبوت میں ہوں۔

عنایت : یہ ایک غیر اہم واقعہ ہے۔ ایک فضول اور بیہودہ سا احساسِ کمتری ہے۔ تم اس کو بھول جاؤ ریحانہ۔

ریحانہ : جب تک مجھے اس واقعہ کا علم نہیں تھا۔ میں مطمئن تھی۔ آسودہ تھی مگر اب میں خود اپنی نظروں سے گرچکی ہوں۔ مجھے آپ کو چاہنے کا کوئی حق نہیں۔

عنایت : لیکن میں تم کو چاہتا ہوں۔ تم میرے اس حق کو مجھ سے کیوں چھین لینا چاہتی ہو— میں آج مطمئن تھا۔ خوش تھا زندگی میں ایک تازگی اور فرحت محسوس کررہا تھا۔ میں نے تمھاری نگاہوں میں محبت کی جھلک دیکھی۔ ہوس کی پیاس نہیں اور میں تمھیں چاہنے لگا تھا۔ تمھارے خواب دیکھنے لگا تھا۔ ریحانہ! میں آج یہ تمنا لے کر آیا تھا کہ تم بھی مجھے چاہوگی۔ جس طرح میں تم کو چاہتا ہوں۔ مجھے ناامید نہ کرو۔

ریحانہ : (سوچتے ہوئے) کیا مسز خان آپ کی ذات میں ویسی ہی دلچسپی لیتی ہیں جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے۔

عنایت : اوہ ہو ریحانہ ان کی دلچسپی لینے نہ لینے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یقین کرو کہ مجھے ان کی ذات میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

ریحانہ : میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ آپ غلط بیانی سے کام لیں گے۔

عنایت : (بات کاٹ کر) تو مارو گولی ان ذاتِ شریف کو آخر تمھیں ان کی ذات میں کیوں دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔

ریحانہ : میں اُن سے ایک بار ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔

عنایت : لیکن اس سے تمھیں کیا مل جائے گا۔ سوائے تلخی اور بدمزگی کے (باہر موٹر کا ہارن بجتا ہے۔ عنایت کھڑکی سے باہر دیکھ کر حیرت سے) یہ مسز خان یہاں کیسے پہنچ گئیں۔

ریحانہ : مسز خان (کھڑکی سے باہر دیکھ کر) تو یہ ہیں مسز خان۔ (عنایت سے) آپ دوسرے کمرے میں تشریف لے جائیے۔

عنایت : مگر ریحانہ——

ریحانہ : (بات کاٹ کر) خدا کے لیے پلیز— (عنایت کچھ سوچتا ہوا دوسرے کمرے

میں چلا جاتا ہے کہ دروازہ کو کھٹی اندر تشریف لے آیئے۔

(مسز خان کمرہ میں داخل ہوتی ہیں۔ عمر چالیس کے قریب ہے۔ مگر صحت مند ہیں۔ عمر کو میک اَپ سے چھپانے کی کوشش بے حد کامیاب ہے کافی غور سے دیکھنے کے بعد بھی وہ چالیس کی نہیں معلوم ہوتیں۔ اندر آکر کمرہ کو چاروں طرف سے دیکھ کر)

مسز خان : کیپٹن مرزا کی کوٹھی یہی ہے۔

ریحانہ : جی ہاں فرمایئے کیا کام ہے ان سے۔

مسز خان : آپ اُن کی صاحبزادی ہیں۔

ریحانہ : جی نہیں۔ میں اُن کی پڑوسی ہوں کیپٹن مرزا اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔

مسز خان : میں مسز خان ہوں۔

ریحانہ : مجھے ریحانہ کہتے ہیں۔ ریحانہ نوری۔

مسز خان آپ ہیں ریحانہ نوری۔ مجھے آپ ہی سے کام تھا۔

ریحانہ : فرمایئے میں حاضر ہوں۔

مسز خان : کیا کیپٹن مرزا سے آپ کا کوئی رشتہ ہے۔

ریحانہ : جی نہیں کوئی رشتہ نہیں۔ میں صرف ان کی پڑوسی ہوں۔ انھوں نے رحم کھا کر چند دن سے مجھے اپنے ساتھ رکھ کر چھوڑا ہے اولاد کی طرح محبت کرتے ہیں۔

مسز خان : کیا آپ مجھے کچھ دیر بیٹھنے کی اجازت دیں گی۔

ریحانہ : (ایک صوفے کی طرف اشارہ کرکے) تشریف رکھیے (مسز خان ایک صوفے پر بیٹھ جاتی ہیں) فرمایئے!

مسز خان : آپ پروفیسر عنایت کو جانتی ہیں۔

ریحانہ : خوب اچھی طرح۔

مسز خان : ابھی میں اُن کے گھر گئی تو معلوم ہوا وہ یہاں تشریف لائے ہوئے ہیں۔

ریحانہ : جی ہاں تشریف لائے تھے۔

مسز خان : مجھے اُن کی تلاش تھی (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) وہ آپ کی بے حد تعریف کرتے ہیں۔

ریحانہ : مہربانی ہے اُن کی جو وہ یوں کرم فرماتے ہیں۔

مسز خان : ایک روز کہہ رہے تھے کہ آپ کی والدہ کا انتقال ہوگیا ہے اور آپ اس دنیا میں بالکل تنہا ہیں۔

ریحانہ : (غور سے مسز خان کو دیکھ کر) جی نہیں میری والدہ کا انتقال نہیں ہوا ہے۔

مسز خان : (حیرت سے) تو پھر وہ خاتون۔

ریحانہ : وہ میری ماں نہیں تھیں بلکہ

مسز خان : انھوں نے آپ کو پالا تھا۔ گود لیا تھا۔

ریحانہ : گود لیا نہیں تھا بلکہ گود دی گئی تھی (مسز خان حیرت سے ریحانہ کو دیکھتی ہے ریحانہ مسز خان کو دیکھ کر) جی ہاں یہ صحیح ہے۔

مسز خان : میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔ میں تو یہی سمجھتی ہوں کہ دونوں کا مطلب ایک ہے۔

ریحانہ : دونوں کا مطلب ایک کیسے ہوسکتا ہے (آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس جاتی ہے۔ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی ہے۔ پھر مسز خان کی طرف مڑ کر) میں وہ بدقسمت ہوں جس نے اپنی ماں کی آغوش کی شفقت کبھی نہیں پائی۔ جس نے اپنی ماں کی شکل نہیں دیکھی اور نہ جس کو اس کی ماں نے۔

(ریحانہ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ مسز خان چند سکنڈ خاموش بیٹھی رہتی ہے۔ پھر اٹھ کر ریحانہ کے پاس جا کر)

مسز خان : مجھے افسوس ہے کہ میں نے ناپسندیدہ مضمون چھیڑ دیا۔ جس سے آپ کو دکھ پہنچا۔

ریحانہ : مجھے خوشی ہے کہ میں آپ سے یہ باتیں کر رہی ہوں۔

مسز خان : مگر مس نوری۔

ریحانہ : (بات کاٹ کر) میں مس نوری نہیں مس فاروقی ہوں۔ میرا خاندان کلکتہ کا ایک متمول خاندان تھا اس دولت مندی نے میرے خاندان پر شرافت کا ایک

ایسا لیبل لگا دیا تھا کہ اگر وہ ہٹ جاتا تو دولت مندی اور شرافت کا ایک گھناؤنا ڈھانچہ رہ جاتا جسے دیکھ کر لوگ اُس سے نفرت کرنے لگتے۔

مسز خان : تو آپ کلکتہ کی رہنے والی ہیں۔ دلی میں کب سے رہ رہی ہیں۔

ریحانہ : مجھے دلی میں پیدا کیا گیا تھا کہ کلکتہ کے لوگ میری پیدائش سے واقف نہ ہوں (پھر کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے) جانے میری ماں کی شرافت میں کون سی کمی تھی جو اُس نے مجھے ایک لاوارث اولاد بنا کر ایک غیر عورت کے سپرد کر دیا (پھر پلٹ کر مسز خان کو دیکھ کر) میں اپنے خاندانی نام تک سے محروم رہی۔

مسز خان : لیکن آپ کی والدہ نے ایسا کیوں کیا۔

ریحانہ : اس لیے کہ خاندانی شرافت کا جنازہ نکل جاتا۔ جب لوگ یہ جانتے کہ میری ماں نے کنوار پن میں ایک لڑکی کو جنم دیا تھا (مسز خان خاموش رہتی ہے۔ ریحانہ اس کے چہرہ کو غور سے دیکھتی ہے جس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری ہے مسز خان کچھ دیر خاموش رہ کر)

مسز خان : آپ کی کہانی دردناک ہے۔

ریحانہ : شکریہ آپ کی ہمدردی کا۔

مسز خان : (کچھ سوچتے ہوئے) میں آپ کے پاس ایک درخواست لے کر آئی ہوں مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس منہ سے عرض کروں۔ (ریحانہ سوالیہ نظروں سے مسز خان کو دیکھتی ہے۔ مگر خاموش رہتی ہے۔ مسز خان کچھ دیر خاموش رہ کر سوچتے ہوئے) سنا ہے پروفیسر عنایت آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔

ریحانہ : (روکھے پن سے) اگر آپ کو کوئی اعتراض ہو تو فرمائیے۔

مسز خان : (ریحانہ کے لب و لہجہ کی تلخی کو محسوس کر کے) اعتراض کیا ہوسکتا ہے مگر—

ریحانہ : (لقمہ دیتے ہوئے) آپ بھی اُن سے محبت کرتی ہیں۔

مسز خان : یونہی سمجھ لیجیے (کچھ سوچ کر) پروفیسر عنایت میری عمر کے ہیں اگر میں اُن سے محبت کرتی ہوں تو کون سا گناہ کرتی ہوں۔

ریحانہ : (طنزیہ مسکرا کر) اور میں اپنی کم عمری میں اُن سے محبت کر کے کوئی گناہ کر رہی ہوں۔

مسز خان : جی نہیں میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ گناہ کر رہی ہیں بلکہ میرا مطلب ہے کہ

ریحانہ : (بات کاٹ کر) مجھے پتہ چلا ہے کہ میری ماں کی عمر صرف 19 سال کی تھی۔ جب انھوں نے مسٹر فاروقی سے ناجائز تعلقات قائم کیے تھے اور یقین ہے کہ ان کی عمر زیادہ رہی ہوگی۔

مسز خان : مسٹر فاروقی—

ریحانہ : جی ہاں جس نیک دل خاتون نے میری پرورش کی ہے اس نے اپنی ڈائری میں یہی نام لکھا ہے (طنزیہ مسکرا کر) کاش وہ ان کی عمر بھی لکھ جاتیں۔

مسز خان : آپ اپنے ذاتی حالات کا میری محبت سے کیوں تعلق پیدا کر رہی ہیں۔

ریحانہ : اس لیے کہ خاندانی حالات کا اثر افراد کے کردار پر پڑتا ہے۔ میری ماں ایک بے پروا بدچلن آوارہ اور عیاش عورت تھی کیا ان خصوصیات کا اثر مجھ پر نہیں پڑا ہوگا۔

(مسز خان خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگتی ہے۔ پھر کچھ دیر بعد)

مسز خان : مس نوری۔

ریحانہ : (ایک دم پلٹ کر) میں نے کہہ دیا میں مس نوری نہیں۔ مس فاروقی ہوں۔

مسز خان : آپ مس نوری ہوں یا مس فاروقی، میرے لیے اس میں کوئی فرق نہیں۔

ریحانہ : جی ہاں آپ کے لیے کیوں فرق پڑے گا۔ آپ ایک دولت مند خاتون ہیں اور دولت مندی کسی بھی چیز میں فرق کرنا نہیں جانتی۔

مسز خان : (ذرا سہم کر) دیکھیے آپ تو بلاوجہ غصہ کر رہی ہیں۔ اگر آپ کا مقصد پروفیسر عنایت سے شادی کرنے کا صرف یہ ہے کہ آپ ایک اچھی اور سکھ کی زندگی بسر کریں تو میں اس کا انتظام کر سکتی ہوں۔

ریحانہ : بہت خوب شکریہ اس نوازش کا مگر مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔

مسز خان : میرے لیے دولت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ میں تو زندگی کو صرف خوش گوار بنانا چاہتی ہوں۔ بس اور صرف بس— اگر تم راستہ سے ہٹ جاؤ تو میں ایسا انتظام کر سکتی ہوں کہ تم تمام زندگی سکھ اور چین سے رہ سکو۔

ریحانہ : (طنزیہ) (بہت خوب۔ بہت خوب۔

مسز خان : تمھاری پیدائش کا کوئی علم نہیں۔ خاندان کا کوئی پتہ نہیں۔ جب عنایت کو اس کا علم ہوگا تو انھیں تم سے نفرت ہو جائے گی۔

ریحانہ : اچھا تجزیہ کر رہی ہیں آپ اپنے سماج کا۔

مسز خان : میرے سماج سے آپ کا کیا مطلب ہے۔

ریحانہ : وہی سماج جس میں کبھی ایک چیز نیکی کہلاتی ہے اور کبھی بدی۔ کبھی اچھائی کہلاتی ہے اور کبھی برائی۔

مسز خان : تم جیسی ناعاقبت اندیش لڑکیاں ناعاقبت اندیشی کو عاقبت اندیشی سمجھ لیتی ہیں ناتجربہ کاری کو تجربہ کاری سمجھ کر مغرور ہو جاتی ہیں۔ سماج میں ان کی حیثیت کیا ہے اسے بھول کر سماج سے کھلواڑ کرتی ہیں۔ مگر جب سماج کا پھندا اُنھیں جکڑ لیتا ہے تو وہ جس آشیانہ میں قید ہوتی ہیں۔ اُس کو اور گندہ کرنے پر تُل جاتی ہیں۔

ریحانہ : اچھی مقرر ہیں آپ۔ کبھی آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ آپ جیسی عورتیں اس سماج کو کیا دیتی ہیں؟ بے حیائی، بدچلنی اور آوارگی، ایک تجربہ کار چور ایک ناتجربہ کار سے خطرناک ہوتا ہے۔ ایک ضمیر فروش مجرم عدالت کے کٹہرہ میں بھی انصاف کو چیلنج کرتا ہے اور اپنے ضمیر کو مجرم نہیں سمجھتا۔ ایک سماج دشمن انسان اس قدر خود فراموش ہو جاتا ہے کہ اپنی بے حیائی اور بدچلنی اور آوارگی کو سارے سماج کا ضمیر سمجھنے لگتا ہے۔ سماج کی اعلیٰ اقدار کا نام دیتا ہے۔

مسز خان : تو گویا آپ اپنی ذات کا میری ذات سے مقابلہ کرنا چاہتی ہیں۔

ریحانہ : اور آپ کو یہ پسند نہیں (طنزیہ) کیوں ہوگا اس لیے کہ آپ نے کبھی اپنی

زندگی کے متعلق سوچا ہی نہیں کہ وہ کیا ہے۔ کیسی ہے۔ کیوں کرگزری اور کیوں کرگزر رہی ہے۔

مسز خان : میں کیا ہوں اور کون ہوں اچھی طرح جانتی ہوں مگر تم کون ہو۔ سماج میں تمھاری کیا حیثیت ہے تم بھول جاتی ہو مس نوری۔

ریحانہ : میں نے کہہ دیا کہ میں مس نوری نہیں ہوں۔ بس فاروقی ہوں اور اگر آپ صاف صاف ہی سننا چاہتی ہیں تو سنیے۔ میرے باپ کا نام رضا فاروقی تھا۔

مسز خان : رضا فاروقی!

ریحانہ : جی ہاں رضا فاروقی۔ جو ایک شریف اور متمول خاندان میں بحیثیت سکریٹری ملازم تھا۔ جس کی محبت اور جذبات کو خریدا گیا اور جس کو کسی نامعلوم جگہ پر جانے کے لیے مجبور کیا گیا اور شہرت دی گئی کہ وہ جنگ میں مارا گیا۔ پھر میری ماں مسز خان بن گئی اور اب وہ مسز عنایت بننے کی متمنی ہے۔

مسز خان : تو تم تو تم۔

ریحانہ : (اس کی بات پر دھیان نہ دے کر) پروفیسر صاحب! پروفیسر صاحب!!

(پروفیسر عنایت دوسرے کمرے سے آتا ہے ریحانہ تیزی سے مسز خان کے پاس کھڑی ہوکر) ماں اور بیٹی قابل فروخت ہیں خریدیئے کسے خریدتے ہیں۔

عنایت : لیکن ریحانہ مسز خان تمھاری ماں۔

ریحانہ : جی ہاں جنھوں نے پہلے مجھے لاوارث بنایا اور اب مجھ سے میرا پیار خریدنے آئی ہیں۔

مسز خان : مگر مجھ سے تو کہا گیا تھا کہ تم پیدا ہوتے ہی مرگئی تھیں۔

(دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگتی ہیں)

(پردہ)

(مطبوعہ: رسالہ پگڈنڈی امرتسر، ستمبر 1963)

سہاگ رات

افرادِ تمثیل

(1) قدیر (ایک ضدی نوجوان) (2) فہیم (قدیر کا دوست) (3) وحیدہ (قدیر کی بیوی جس سے اس نے آج ہی نکاح کیا ہے) (4) نعمان (وحیدہ کا بھائی، قدیر کا دوست) (5) انصار (قدیر کا باپ، مالدار، ضدی اور دُھن کا پکا) (6) سب انسپکٹر پولیس، سپاہی وغیرہ۔

منظر

(ایک پرانی بارہ دری جس میں مکڑی کے جالے چاروں طرف بھرے پڑے ہیں۔ دیواروں کا پلاسٹر جگہ جگہ سے غائب ہے۔ دیواریں شکستہ ہیں۔ ایک طرف سے چھت جھکی ہوئی ہے۔ دیواروں کی دراڑوں میں پیڑ پودے نکل آئے ہیں۔ غرض یہ کہ انتہائی وحشت ناک مقام ہے۔ چاروں طرف جنگل ہے۔ بارہ دری کے اندر ایک عجیب قسم کی بدبو پھیلی ہوئی ہے۔ رات کا وقت ہے۔ بارہ دری کے اندر ایک لالٹین جل رہی ہے جس کی روشنی بمشکل تمام بارہ دری میں پھیل رہی ہے۔ ایک ٹوٹی سی چارپائی بچھی ہے جس پر بستر قسم کی کوئی چیز نہیں ہے۔ قدیر اور نعمان دروازہ کے پاس کھڑے ہیں۔ یہ دروازہ کواڑوں سے

محروم ہے۔ جس وقت پردہ اٹھتا ہے تو نعمان بولتا ہوا سنائی دیتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں بہت دیر سے کسی مسئلہ پر بات چیت کر رہے ہیں)

نعمان : (مسکرا کر) مگر قدیر دنیا اس کو پاگل پن کہے گی۔

قدیر : (طنزیہ ہنس کر) اِس دنیا میں تھوڑا بہت پاگل ہونا بہت ضروری ہے۔

نعمان : پاگل ہونا ضروری ہے!

قدیر : ہاں۔ (بات ٹالنے کے انداز میں مسکرا کر) تم جیسے سمجھدار لوگوں میں کیا ایک پاگل کا گزر نہیں ہوسکتا۔

نعمان : یہ بات نہیں ہے قدیر — (کچھ دیر خاموش رہ کر) اس سنسان اور وحشت ناک کھنڈر میں رات گزارنا کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتا۔

قدیر : پاگل کی باتیں ہوش مند لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ تم جا کر ملکہ کو لے آؤ۔

نعمان : مگر قدیر — (کچھ دیر خاموش رہ کر) معلوم ہوتا ہے کہ تم پر حماقت کا پھر دورہ پڑ گیا ہے۔

قدیر : (ہنس کر) تو کہیں ڈاکٹر کو نہ لے آنا۔ کم بخت سہاگ رات میں کوئی نشہ آور دوا پلا دے گا (نعمان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر) جاؤ خدا حافظ (مسکرا کر) میں تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔

نعمان : مگر قدیر ذرا پھر سوچ لو کہ —

قدیر : (بات کاٹ کر) اماں سوچ لیا ہے تم تو بلا وجہ بقراط بنے جا رہے ہو (نعمان برا سا منہ بناتا ہے اور جانے کے لیے مڑتا ہے کہ قدیر کے والد انصار صاحب داخل ہوتے ہیں اور نعمان کو جاتا ہوا دیکھ کر)

انصار : نعمان! کہاں جا رہے ہو؟

نعمان : میں —

قدیر : (بات کاٹ کر) نعمان تم جاؤ۔ میں ابا جان کو سب کچھ بتلا اور سمجھا دوں گا۔ (نعمان جاتے ہوئے جھکتا ہے۔ قدیر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر)

جاؤ— جاؤ— تم جاؤ۔

(نعمان چلا جاتا ہے۔ انصار اس ٹوٹی پھوٹی بارہ دری کا ہر زاویہ سے جائزہ لے کر)

انصار : قدیر! یہ تم نے کیا بدنداقی مچا رکھی ہے۔

قدیر : ابا جان! میری ہر خوش مزاجی کو آپ ہمیشہ بدنداقی کہتے رہے ہیں۔ خدا گواہ ہے میرے دل کو سخت چوٹ پہنچتی ہے۔

انصار : کسی پاگل میں احساس کا اس قدر شدید جذبہ میں آج ہی سن رہا ہوں۔

قدیر : بہت زیادہ حساس لوگوں کو اکثر لوگ پاگل کہنے لگتے ہیں۔

انصار : (کسی قدر غصہ سے) تم ہمیشہ فلسفیانہ مکالمے بولنے کے عادی ہو جو مجھے پسند نہیں۔ میں تمھیں یہاں سے لے جانے کو آیا ہوں۔

قدیر : مگر آپ کے گھر میں تو میرے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

انصار : مجبوری میں انسان ناپسندیدہ لوگوں کو بھی قبول کرلیتا ہے۔

قدیر : آپ کو تو ہر وہ چیز ناپسند ہے جو مجھے پسند ہے اور پھر اب تو میں نے ملکہ سے نکاح کرلیا ہے۔

انصار : ملکہ! یہ کون محترمہ ہیں؟

قدیر : جسے آپ وحیدہ کے نام سے جانتے ہیں۔

انصار : اچھا! تو اب وہ ملکہ ہوگئی ہیں! یہ شرف آپ نے انھیں کب سے بخشا ہے۔

قدیر : جب سے اس نے اِس عظیم الشان بارہ دری کو قبول کرلیا ہے۔

انصار : (ٹھنڈی سانس بھر کر) قدیر! تم سے مجھے ہمیشہ دکھ پہنچا ہے۔

قدیر : اور مجھے آپ کی عالی شان کوٹھی میں کبھی سکھ نصیب نہیں ہوا (ٹھنڈی سانس بھر کر) آپ کی سخت گیری نے میری زندگی کو ایک قیدخانہ بنا دیا۔

انصار : بے لگام گھوڑے مجھے سخت ناپسند ہیں (غصہ سے) آخر وحیدہ میں کیا ہے ایک بدنصیب عورت ہے۔

قدیر : بدنصیب!

انصار : اور کیا۔ شادی کے تین مہینے کے اندر اندر اس کا پہلا شوہر مر گیا۔

قدیر : اس کی موت اور اس کے نصیب میں کیا رشتہ ہے یہ تو آپ جانیں— مگر

انصار : (بات کاٹ کر) سماج میں ایسی ہی عورتوں کو بدنصیب کہا جاتا ہے۔

قدیر : اگر سماج مجھے بُد بُد کہنے لگے تو اِس میں میرا کیا قصور ہے اور پھر آپ ایک مرتبہ فرما چکے ہیں کہ میرے لیے آپ کے گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

انصار : سماج میں تم نے میری ناک ویسے ہی کٹوا دی ہے جو رہی سہی ہے وہ تمھاری اس حرکت کی نذر ہو جائے گی۔

قدیر : مجھے افسوس ہے لیکن میری مجبوریاں ہیں۔ میں ملکہ کے چہرے پر بدنصیبی کا لیبل دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

انصار : چاہے سماج میں تمھارے باپ کی گردن ہمیشہ کے لیے جھک جائے۔

قدیر : یقین رکھیے کہ وہ نہیں جھکے گی۔ سماج آپ کا ہے ملکہ کا نہیں۔

انصار : میں تمھاری اچھی سے اچھی اور تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کرنے کو تیار تھا۔

قدیر : جو ہمیشہ اِس فکر میں رہتی کہ بلاؤز فیشن میں کس قدر اونچا ہو گیا ہے۔ باہیں کس قدر اوپر تک کھلی رہنا چاہئیں اور جسم کے کس کس حصہ کو ابھارنا فیشن ہے۔

انصار : تم ہمیشہ نامعقول بکواس کرنے کے عادی ہو۔

قدیر : اور آپ ہمیشہ معقول بات کو نامعقول سمجھتے رہتے ہیں۔

انصار : (غصہ سے) خیر تم میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو یا نہیں۔

قدیر : کوئی عزت دار آدمی کسی گھر سے نکالے جانے کے بعد وہاں نہیں جایا کرتا۔

انصار : تمھیں اپنی عزت کا اِس قدر لحاظ ہے اور میری عزت کو جو تم نے خطرہ میں ڈال دیا ہے؟

قدیر : عزت کا کیا ہے ابا جان۔ یہ تو ہمیشہ خطرہ میں رہتی ہے۔ کبھی معمولی حیثیت کی عورت سے شادی کرنے میں اور کبھی اس ویران کھنڈر میں سہاگ رات گزارنے میں۔

انصار : تو تم واپس چلنے کے لیے تیار نہیں۔

قدیر : آپ کو مجبور کرنے میں جانے کیا خوشی ہو رہی ہے۔

انصار : (مڑ کر دروازہ کی طرف جاتے ہوئے) تم کسی ہوٹل میں چلے جاؤ۔ بل ادا کر دیا جائے گا۔

(قدیر خاموش رہتا ہے۔ انصار صاحب چند سیکنڈ اس کے جواب کا انتظار کرتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد قدیر طنزیہ مسکرا کر)

قدیر : اور مرنے کے لیے کسی ہاسپٹل میں بھیج دیجیے گا۔

(فہیم ایک آڑ سے نکل کر آتے ہوئے مسکرا کر)

فہیم : اور اگر پاگل خانہ بھیج دیا جائے تو کیسا رہے؟

قدیر : جگہ وہ بھی بری نہ ہوگی (فہیم مسکراتا ہے) ابا جان کا اگر بس چلے تو وہ ضرور پاگل خانہ بھجوا دیں اور وہاں بھی چین سے نہ رہنے دیں۔ مگر تمھیں جاسوسی کرنے میں کیا مزہ آتا ہے۔

فہیم : تم اپنے ابا جان سے بلاوجہ ناراض ہو۔ میرے خیال میں وہ بے حد سمجھدار بزرگ ہیں۔

قدیر : اگر سمجھ دار نہ ہوتے تو بلیک مارکیٹ سے اس قدر دولت کیسے کما لیتے؟

فہیم : (طنزیہ) تمھاری سعادت مندی قابلِ ستائش ہے۔

قدیر : اور تمھارے نزدیک سعادت مندی کی تعریف یہ ہے کہ ہر ناجائز کو جائز مان لیا جائے۔

فہیم : اِس میں ہرج ہی کیا ہے کہ "باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی۔"

قدیر : یہ تمھارا فلسفہ ہے کہ احمق شاعر کی بکواس ہے۔

فہیم : (بارہ دری کا جائزہ لے کر) واللہ کیا رومانس ہے۔ اِس جگہ مکڑیوں نے کیا خوبصورت پردے لٹکا رکھے ہیں۔ جھینگروں نے اپنا ملہار چھیڑ رکھا ہے اور جلد ہی گیدڑ بھی آپ سے شرفِ ملاقات کے لیے حاضر ہو جائیں گے۔

قدیر : مگر وہ مجھ سے اِس جگہ شب باشی کی پگڑی طلب نہیں کریں گے۔

فہیم : یہ تو ہے مگر کرایہ ذرا مہنگا وصول کریں گے (طنزیہ ٹھنڈی سانس بھر کر) صاحب! زمانہ بھی کیا کیا عجیب عجیب کروٹیں لیتا ہے۔

قدیر : (فہیم کو غور سے دیکھ کر) کیا مطلب؟

فہیم : بیچارہ مجنوں تو ہجر و فراق کی گھڑیاں گزارنے کے لیے جنگل میں بھاگ گیا تھا مگر آج کل لوگ شبِ وصال گزارنے کے لیے جنگل کا رخ کرنے لگے ہیں (لہجہ بدل کر) قدیر! اِس حماقت کو چھوڑو اور میرے ساتھ چلو۔

: تمھارے ساتھ اِس مکان میں جس سے میں ایک مرتبہ نکالا جاچکا ہوں۔

۱۰ :نہیں۔ میرے گھر۔

قدیر : تا کہ وہاں سے بھی دھتکار کر نکالا جاؤں۔

فہیم : احمقوں کی سی باتیں نہ کرو۔ میرے والد کو تمھارے ساتھ ہمدردی ہے۔

قدیر : شکریہ ان کا۔ لیکن والد اور تمھارے والد میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔

فہیم : تم جانتے ہو کہ وہ ترقی پسند ہیں۔

قدیر : ترقی پسند! (طنزیہ) میرے والد بھی کم ترقی پسند نہیں ہیں۔ ہمیشہ زمانہ کا ساتھ دیتے ہیں۔

فہیم : زمانہ کا ساتھ دینا کوئی برائی تو نہیں ہے۔

قدیر : مگر زمانہ سازی؟ (ٹھنڈی سانس بھر کر) اور تم بھی زمانہ سازی کو ترقی پسندی سمجھتے ہو۔

فہیم : زمانہ سازی ایک بڑا وصف ہے۔ وہ لوگ بڑے بدقسمت ہیں جو اِس وصف سے محروم ہیں۔

قدیر : کچھ لوگ اِس بدقسمتی پر ناز کرتے ہیں۔

فہیم : تو دنیا انھیں احمق کہنے لگتی ہے۔ پاگل کا خطاب دیتی ہے۔

قدیر : تمھیں معلوم ہے کہ میں نے ایک معمولی مکان کرایہ پر حاصل کرنے کے لیے کون سے ایسے پاپڑ تھے جو نہیں بیلے مگر اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ محرومی اور

ناکامی۔ میں نے ایک بیوہ کی پیشانی سے بیوگی کا داغ دھونا چاہا تو مجھے کیا ملا؟ یہ ویران اور سنسان بارہ دری۔

فہیم : اور اس کو تم نے اپنی قسمت سمجھ لیا جس بیوہ کی بیوگی کا داغ تم نے دھونا چاہا کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ یہاں خوش رہے گی؟ اور اگر نعمان میں کچھ بھی سمجھداری ہے تو وہ اپنی بہن کی قسمت کو اِس بارہ دری کے حوالہ نہیں کرسکتا۔

قدیر : (فہیم کو غور سے دیکھ کر) کیا تم سمجھتے ہو کہ وحیدہ یہاں آنے کے لیے تیار نہیں ہوگی۔

فہیم : وحیدہ کے متعلق تو میں کہہ نہیں سکتا کیونکہ مجھے ان سے شرفِ ملاقات حاصل نہیں ہوا مگر کم از کم نعمان کو میں اِس قدر احمق نہیں سمجھتا۔

قدیر : احمق کی گردان تمھیں جانے کس مولوی نے رٹا دی ہے کہ بار بار تمھاری زبان پر آجاتی ہے۔ ہر وہ شخص جو تمھارے خیالات سے متفق نہیں احمق ہے۔

فہیم : جی ہاں— (بارہ دری کا جائزہ لے کر) یہ بارہ دری میرے خیالات ہیں۔ یہ ویرانی میرا تصور ہے۔ تھوڑی دیر بعد گیدڑوں کی چیخ و پکار میرا وہم ہوگا۔ درندوں کی آمد و رفت میرا واہمہ ہوگا (لہجہ میں التجا پیدا کرتے ہوئے) قدیر! وہ نہیں آئیں گے۔ خدا کے لیے میرے ساتھ چلو، میں تمھارا دشمن نہیں ہوں۔

قدیر : وہ ضرور آئے گی— اگر نہ آئی تو—

(قدیر کچھ کہتے کہتے رک جاتا ہے۔ فہیم سوالیہ نظروں سے قدیر کو دیکھتا ہے مگر قدیر کوئی جواب نہیں دیتا بلکہ بے چینی سے بارہ دری میں ٹہلنے لگتا ہے۔ فہیم جیسے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے۔

فہیم : اگر نہ آئی تو—؟ (قدیر کو دیکھتا ہے جو بے چینی سے ٹہل رہا ہے مگر اب بھی قدیر خاموش رہتا ہے۔ فہیم پھر قدیر سے مخاطب ہوکر) تم اُس سے ترکِ تعلق کرلو گے۔

قدیر : ترکِ تعلق! فہیم۔ خدا کے لیے ایسا نہ کہو (جیسے الجھن سے نجات پانے کے انداز میں) تم جاؤ فہیم۔ جاؤ مجھے یہیں چھوڑ دو۔

فہیم : (طنزیہ) میں تمھاری سہاگ رات کا مزہ کرکرا کرنا نہیں چاہتا۔ مگر تمھاری حماقت کاآخری انجام ضرور دیکھنا چاہتا ہوں۔

قدیر : (غصہ سے چیخ کر) فہیم!

فہیم : قدیر! تم زندگی پر ایک طنز کررہے ہو۔ بہت زبردست طنز— تم جوا کھیل رہے ہو۔ اپنے مستقبل سے جوا— یہ جوا—

قدیر : (بات کاٹ کر چیختے ہوئے) فہیم اب (پلٹ کر فہیم کا گریبان پکڑ کر) فہیم— تم— تم— (اس کا گریبان چھوڑ کر اپنا سر پکڑ لیتا ہے) مجھے پریشان نہ کرو۔ وہ آئیں گے اور ضرور آئیں گے۔ (موٹر کا ہارن) وہ آگئے۔ (دروازہ کی طرف لپک کر چوروں کی طرح جھانکتے ہوئے) وہ آگئے۔

فہیم : (طنزیہ) تو پھر ہمیں ملکہ کے استقبال کے لیے تیار ہوجانا چاہیے۔

(نعمان گھبرایا ہوا داخل ہوکر)

نعمان : قدیر! غضب ہوگیا۔

قدیر : (اِس کی بات پر دھیان نہ دے کر) ملکہ کہاں ہے۔

نعمان : میں اس کو ساتھ لا رہا تھا مگر—

قدیر : مگر کیا—؟ (طنزیہ) ایک بے گھر انسان کو اپنی بہن نہیں سونپی گئی— ٹھیک تو اس ویران وسنسان بارہ دری سے کیوں ڈر نہیں لگے گا۔

نعمان : مگر میری بات تو سنو—

قدیر : کیا خاک سنوں۔ آخر وحیدہ کو بھی اِسی عیش وعشرت اور آرام دہ مکان کی ضرورت تھی جس کی ہر عورت خواہش مند ہوتی ہے۔

نعمان : مگر قدیر—

قدیر : (اِس کی بات پر دھیان نہ دے کر اپنی ہی دھن میں) اس غّیں وحیدہ کا بھی کیا قصور ہے۔ یہ دنیا کی پرانی ریت ہے جس کو ہر عورت نبھاتی آرہی ہے کہ ایک آرام دہ مکان ہو۔ نوکر چاکر ہوں— اور میرے پاس کچھ بھی نہیں

ہے۔ تم بھی آخر وہیں جا کر کھڑے ہو گئے جہاں عام لوگ کھڑے ہوتے ہیں۔

فہیم : اور تم جیسے خاص انسان پیدا نہیں ہوتے اور اگر ہوتے ہیں تو ان کو ناکامی کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔

قدیر : تم بھی جی بھر کر طنز کرلو۔ اس لیے کہ جیت تمھاری ہوئی ہے (نعمان کی طرف مڑ کر) میں نے وحیدہ سے ہمدردی کی تھی دشمنی نہیں۔ میں نے ہر ممکن کوشش کی تھی۔ مجھے ایک مکان مل جائے مگر نہیں ملا۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) دنیا کیا چاہتی ہے یہ اب میں سمجھ گیا ہوں۔

نعمان : (غصہ سے) کچھ میری بھی سنو گے یا بکواس ہی کیے جاؤ گے۔

قدیر : میں کچھ سننا نہیں چاہتا اور اب تمھارے پاس سنانے کو رہ بھی کیا گیا ہے۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) دنیا کو انسانیت کی اب ضرورت نہیں رہی۔

نعمان : (غصہ سے) اگر میری نہیں سنتے تو میں وحیدہ کو لیے آتا ہوں (جانے کے واسطے مڑتا ہے کہ وحیدہ بارہ دری میں داخل ہوتے ہوئے۔

وحیدہ : میں خود آ گئی ہوں۔ کسی کو لینے جانے کی ضرورت نہیں۔

قدیر : وحیدہ!— تم—!

فہیم : (حیرت سے) آپ آ گئیں!

(وحیدہ فہیم کی طرف دیکھتی ہے۔ قدیر فاتحانہ مسکراہٹ سے)

قدیر : میرے دوست ہیں۔ ان کا نام فہیم ہے۔ اِسم بامسمّٰی ہیں۔ اگر بقراط کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

(وحیدہ خالص مشرقی انداز سے کچھ شرما کر فہیم کو سلام کرتے ہوئے)

وحیدہ : کیا آپ کا خیال تھا کہ میں نہیں آؤں گی۔

قدیر : (ہنس کر) انھیں اِس بارہ دری پر اعتراض ہے۔

وحیدہ : کیوں—؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ—

(ایک گیدڑ کی آواز، فہیم ایک دم بات کاٹ کر)

فہیم : ذرا خاموش رہیے۔ بیچارا بڑی محنت سے سہرا لکھ کر لایا ہے (نعمان اور قدیر قہقہہ مار کر ہنستے ہیں۔ وحیدہ کچھ شرما کر مسکراتی ہے اسی وقت کئی گیدڑ ایک ساتھ چیختے ہیں) یہ لیجیے داد دینے والے بھی آ گئے۔ (فہیم کچھ دیر خاموش رہ کر) لیکن آپ نعمان کے ساتھ کیوں نہیں آئیں۔

وحیدہ : نعمان بھائی مجھے گھر سے لے کر روانہ ہوئے تھے پھر راستہ سے واپس لوٹ کر مجھے گھر چھوڑ آئے۔ مگر میں ان کے پیچھے روانہ ہوگئی۔

فہیم : تو اب خدا کے لیے اپنے شوہر نامدار کو سمجھایئے کہ وہ شہر تشریف لے چلیں (مسکرا کر) اُمید ہے کہ یہ ایک سعادت مند شوہر ثابت ہوں گے اور آپ کی حکم عدولی نہیں کریں گے۔

قدیر : (کسی قدر جھنجھلاہٹ سے) جانے تمھیں اِس بارہ دری سے کیوں چڑ ہے۔ اِس بارہ دری کی تاریخ معلوم ہے۔

فہیم : آپ دونوں اِس کی تاریخ پر ریسرچ کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیں۔ تاریخ پر ریسرچ سہاگ رات میں کچھ مناسب نہیں ہے۔

وحیدہ : مگر فہیم بھائی—

فہیم : (بات کاٹ کر) ابھی آپ نے گیدڑوں کا لکھا ہوا سہرا سنا۔ اب تھوڑی دیر میں درندوں کا مشاعرہ ہوگا۔ پھر سانپ اچھے شعروں پر ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہوئے سنائی دیں گے بلکہ اپنی محفل جما کر رقص کریں گے۔ غرض ایک ہنگامہ بپا ہوگا جو سہاگ رات میں کچھ مناسب نہیں ہے۔

قدیر : (مسکرا کر) مگر وہ بھوت تم سے بڑھ کر نہیں ہوں گے جو پیچھے پڑ جانے کے بعد پیچھا نہیں چھوڑتے۔

فہیم : (ٹھنڈی سانس بھر کر) خیر مجھے تو پیچھا چھوڑنا ہی پڑے گا۔ (طنز جس میں کچھ نااُمیدی اور غصہ کے ملے جلے اثرات ہیں) مگر تم وہ بھوت ہو جس پر کوئی منتر اثر نہیں کرتا۔

قدیر : فہیم! میں تمھارے خلوص اور محبت کا شکر گزار ہوں مگر میرے عزم و ارادہ، میری مایوسی و ناامیدی کو اپنی خلوص اور محبت کی ترازو میں رکھ کر نہ تولو (فہیم ناامیدی اور مایوسی سے قدیر کو دیکھتا ہے۔ موٹروں کی آواز آتی ہے۔ سب لوگ اس طرف کان لگاتے ہیں۔ شکاری لوگ ہوں گے— (کچھ سیکنڈ خاموش رہ کر) فہیم! میں اپنے والد صاحب کو صرف یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ وہ مجھے گھر سے نکال سکتے ہیں۔ مجھے کوئی مکان کرایہ پر نہ ملے۔ اِس میں اپنی من مانی کر سکتے ہیں مگر میرے عزم اور میرے ارادہ کو مجھ سے نہیں چھین سکتے۔

فہیم : یہ صرف تمھاری ضد ہے۔ وہ خود تمھیں لینے آگئے تھے۔ وہ تمھاری طرف جھک چکے تھے۔ مگر تم—

قدیر : (بات کاٹ کر) یہ بات نہیں ہے فہیم۔ میں اپنے والد صاحب کو اچھی طرح جانتا ہوں (موٹروں کی آواز بالکل قریب سنائی دیتی ہے چند سیکنڈ خاموش رہ کر) وہ میرے سر کو ہمیشہ کے لیے جھکا دینا چاہتے تھے کہ مجھے آسرا ملا تو انھیں کے گھر میں۔

فہیم : تم تو ان کی طرف سے بلا وجہ بدظن ہو۔ (موٹر بارہ دری کے پاس آکر رک جاتی ہے۔ سب لوگ دروازہ کی طرف دیکھتے ہیں) شاید وہ تمھیں لینے کے لیے پھر آگئے ہیں۔

آواز : اندر جو لوگ ہیں وہ بلا ہتھیار لیے باہر نکل آئیں۔ ہم نے بارہ دری کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ (سب حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ باہر سے پھر آواز) ہم تم کو دو منٹ کا وقت دیتے ہیں اِس کے بعد گولی چلا دی جائے گی۔

فہیم : آپ کون لوگ ہیں؟

آواز : پولیس۔

قدیر : پولیس! (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہیں آپ اندر آسکتے ہیں۔ (کچھ دیر بعد مسلح پولیس داخل ہوتی ہے قدیر انھیں دیکھ کر) کہیے۔

سب انسپکٹر : (طنزیہ) تو آج دھر لیے گئے۔

فہیم : (غصہ سے) کیا مطلب؟

سب انسپکٹر : مطلب تو آپ کو پولیس چوکی میں چل کر معلوم ہوگا۔

فہیم : (برہم ہوکر) لیکن ہمارا قصور۔

سب انسپکٹر : ہمیں پتہ چلا ہے کہ آپ لوگوں نے اِس بارہ دری کو عیاشی کا اڈّہ بنا رکھا ہے۔
(سب انسپکٹر وحیدہ کی طرف دیکھتا ہے)

قدیر : یہ میری بیوی ہے۔

سب انسپکٹر : یہ آپ عدالت میں ثابت کرنا (بارہ دری کو چاروں طرف سے دیکھ کر) عیش وعشرت کی جگہ اچھی پسند کی ہے۔

قدیر : آپ یہ بکواس—

سب انسپکٹر : (بات کاٹ کر) مجھے امید ہے کہ آپ ہمیں طاقت کے استعمال پر مجبور نہیں کریں گے۔
(سب ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ قدیر چند سیکنڈ سوچتا ہے۔ پھر وحیدہ کا ہاتھ پکڑ کر سب انسپکٹر سے)

قدیر : چلیے— (طنزیہ) سہاگ رات سرکاری مہمان کی حیثیت سے گزاری جائے گی۔
(قدیر آگے بڑھتا ہے۔ نعمان فہیم کو دیکھ کر)

نعمان : میں نے انصاری صاحب کو پولیس چوکی میں جاتے دیکھا تھا۔ اِسی لیے وحیدہ کو ساتھ نہیں لایا تھا۔
(ایک سپاہی لالٹین اٹھا کر بارہ دری سے نکل جاتا ہے۔ بارہ دری میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ گیدڑوں کی آوازیں پھر آتی ہیں۔ اندھیرے میں فہیم کی آواز سنائی دیتی ہے۔

فہیم : اب بیچارے مرثیے پڑھ رہے ہیں۔

(مطبوعہ: پگڈنڈی امرتسر، مارچ 1963)

قبرستان

کردار

(1) شمشاد (ایک نوجوان) (2) زہرہ (ایک نوجوان عورت) (3) گورکن (گورکن)
(4) اخلاق (شمشاد کا دوست)

منظر

(قبرستان میں چاروں طرف قبریں ہی قبریں ہیں۔ اونچے اونچے درختوں سے ہمیشہ سایہ اور اندھیرا رہتا ہے شام کا وقت ہے۔ زہرہ اور گورکن ایک قبر کے پاس کھڑے ہیں۔ زہرہ سیاہ برقعہ پہنے ہے۔ کچھ دیر دونوں خاموش رہتے ہیں پھر زہرہ گورکن کو دیکھ کر آہستہ سے)

زہرہ : بابا! میں نے کہا تھا کہ اس قبر کا پتھر بدل دینا مگر—

گورکن : (بات کاٹ کر) مگر بی بی جی بات یہ ہے کہ—

زہرہ : دیکھو بابا۔ تمھیں ان سب باتوں سے کیا غرض۔ جب میں نے کہہ دیا کہ میں تم کو اس کا اچھا معاوضہ دوں گی تو پھر تمھیں کیا اعتراض ہے۔

گورکن : وہ سب ٹھیک ہے مگر میں نے آج تک ایسا الٹا کام نہیں کیا۔ بھلا اس سے کیا فائدہ ہوگا؟

زہرہ : میرا نفع اور نقصان میں خود بہتر سمجھتی ہوں (دس روپے کا نوٹ گورکن کو دیتے ہوئے) یہ لو اور جیسا میں کہتی ہوں ویسا کرو۔

گورکن : (روپے لے کر جیب میں رکھتے ہوئے) اچھا بی بی جی کل تک میں (طنزیہ) اس عورت کی قبر کو مرد کی قبر بنادوں گا۔
(گورکن جانے کے لیے مڑتا ہے)

زہرہ : اور بابا (گورکن پلٹ کر دیکھتا ہے اور کھڑا ہوجاتا ہے) ابھی شمشاد تو ادھر نہیں آئے۔

گورکن : کون شمشاد؟

زہرہ : وہی جو ہر روز مجھ سے یہاں آکر ملتے ہیں۔

گورکن : نہیں مجھے تو دکھائی نہیں پڑے (سوچتے ہوئے) مگر تم ان سے قبرستان میں کیوں آکر ملتی ہو۔ بھلا یہ بھی کوئی ملنے کی جگہ ہے۔

زہرہ : (مسکرا کر) کیوں؟ یہاں ملنے میں کیا حرج ہے؟

گورکن : حرج۔! یہاں رکھا کیا ہے، ویرانی، اُداسی، سناٹا اور تنہائی۔

زہرہ : اور مجھے بھی تنہائی پسند ہے۔

گورکن : (تعجب سے) تنہائی!

زہرہ : ہاں۔تنہائی۔ میں مجلس آرائی اور ہنگاموں سے اُکتا چکی ہوں۔

گورکن : لیکن۔۔۔ (خاموش ہوجاتا ہے، زہرہ سوالیہ نظروں سے گورکن کو دیکھتی ہے۔ گورکن کچھ دیر خاموش رہ کر بات بدلنے کے انداز میں) یہاں تو محبتیں دفن ہوتی ہیں بی بی جی۔ یہاں محبت کا کیا کام۔

زہرہ : یہاں نفرتیں بھی دفن ہوجاتی ہیں (ٹھنڈی سانس بھر کر حسرت سے) شاید میری نفرت بھی یہاں دفن ہوکر محبت میں بدل جائے۔

ورکن : تعجب سے) تم کو اور نفرت (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) کیا تم کو ان سے نفرت ہے؟

ہرہ : کس سے؟ شمشاد سے؟ نہیں! میں تو ان سے محبت کرنا سیکھ رہی ہوں۔

گورکن : تو کیا تم ان سے محبت نہیں کرتیں؟

زہرہ : میں کسی مرد سے محبت نہیں کرتی۔

گورکن : کسی بھی مرد سے۔ اور شمشاد میاں سے بھی نہیں۔

زہرہ : شاید میں اُن سے بھی محبت کرنے لگوں گی۔

گورکن : اور اسی لیے آپ گھنٹوں ان کا یہاں انتظار کرتی ہیں۔

زہرہ : (ایک دم جاتے ہوئے) شاید وہ آگئے ہیں (قدم تیز کرتے ہوئے) انھیں پتہ نہ چلے کہ میں ان کا یہاں انتظار کر رہی تھی۔ (تیزی سے درختوں کی آڑ میں چلی جاتی ہے۔ گورکن حیرت زدہ کھڑا رہ جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد شمشاد درختوں کی آڑ سے آتا ہے اور گورکن کے قریب آکر)

شمشاد : کیوں بابا۔ ابھی تک وہ نہیں آئی۔

گورکن : حضور کون؟

شمشاد : زہرہ۔ جو ہر روز مجھ سے یہاں ملنے آتی ہے۔

گورکن : نہیں۔ میں نے تو ابھی تک نہیں دیکھا۔

شمشاد : لیکن ابھی تم یہاں کس سے باتیں کر رہے تھے؟

گورکن : (سوچ کر) وہ میری لڑکی تھی حضور — کبھی کبھی میرے ساتھ چلی آتی ہے۔

شمشاد : (کچھ دیر خاموش رہ کر) اس تنہائی اور ویرانی میں بابا تم اپنی زندگی کیسے گزارتے ہو۔ تمھارا دل نہیں گھبراتا۔

گورکن : دل کیوں گھبرائے گا۔ حضور بچپن سے یہاں رہنے کا عادی ہوں (کچھ دیر خاموش رہ کر) عجیب پیشہ ہے۔ دن رات لاشیں ہیں اور قبریں۔

شمشاد : اور اب اس پیشہ میں بھی کیا رکھا ہے۔ حضور پیٹ بھر روٹی نہیں ملتی۔

گورکن : وہ سب ٹھیک ہے مگر میں نے آج تک ایسا الٹا کام نہیں کیا۔ بھلا اس سے کیا فائدہ ہوگا؟

زہرہ : میرا نفع اور نقصان میں خود بہتر سمجھتی ہوں (دس روپے کا نوٹ گورکن کو دیتے ہوئے) یہ لو اور جیسا میں کہتی ہوں ویسا کرو۔

گورکن : (روپے لے کر جیب میں رکھتے ہوئے) اچھا بی بی جی کل تک میں (طنزیہ) اس عورت کی قبر کو مرد کی قبر بنادوں گا۔

(گورکن جانے کے لیے مڑتا ہے)

زہرہ : اور بابا (گورکن پلٹ کر دیکھتا ہے اور کھڑا ہوجاتا ہے) ابھی شمشاد تو ادھر نہیں آئے۔

گورکن : کون شمشاد؟

زہرہ : وہی جو ہر روز مجھ سے یہاں آکر ملتے ہیں۔

گورکن : نہیں مجھے تو دکھائی نہیں پڑے (سوچتے ہوئے) مگر تم ان سے قبرستان میں کیوں آکر ملتی ہو۔ بھلا یہ بھی کوئی ملنے کی جگہ ہے۔

زہرہ : (مسکرا کر) کیوں؟ یہاں ملنے میں کیا حرج ہے؟

گورکن : حرج۔! یہاں رکھا کیا ہے، ویرانی، اُداسی، سناٹا اور تنہائی۔

زہرہ : اور مجھے بھی تنہائی پسند ہے۔

گورکن : (تعجب سے) تنہائی!

زہرہ : ہاں۔تنہائی۔ میں مجلس آرائی اور ہنگاموں سے اُکتا چکی ہوں۔

گورکن : لیکن— (خاموش ہوجاتا ہے، زہرہ سوالیہ نظروں سے گورکن کو دیکھتی ہے۔ گورکن کچھ دیر خاموش رہ کر بات بدلنے کے انداز میں) یہاں تو محبتیں دفن ہوتی ہیں بی بی جی۔ یہاں محبت کا کیا کام۔

زہرہ : یہاں نفرتیں بھی دفن ہوجاتی ہیں (ٹھنڈی سانس بھر کر حسرت سے) شاید میری نفرت بھی یہاں دفن ہوکر محبت میں بدل جائے۔

گورکن : تعجب سے) تم کو اور نفرت (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) کیا تم کو ان سے نفرت ہے؟

زہرہ : کس سے؟ شمشاد سے؟ نہیں! میں تو ان سے محبت کرنا سیکھ رہی ہوں۔

گورکن : تو کیا تم ان سے محبت نہیں کرتیں؟

زہرہ : میں کسی مرد سے محبت نہیں کرتی۔

گورکن : کسی بھی مرد سے۔ اور شمشاد میاں سے بھی نہیں۔

زہرہ : شاید میں اُن سے کبھی محبت کرنے لگوں گی۔

گورکن : اور اسی لیے آپ گھنٹوں ان کا یہاں انتظار کرتی ہیں۔

زہرہ : (ایک دم جاتے ہوئے) شاید وہ آگئے ہیں (قدم تیز کرتے ہوئے) انھیں پتہ نہ چلے کہ میں ان کا یہاں انتظار کررہی تھی۔ (تیزی سے درختوں کی آڑ میں چلی جاتی ہے۔ گورکن حیرت زدہ کھڑا رہ جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد شمشاد درختوں کی آڑ سے آتا ہے اور گورکن کے قریب آکر)

شمشاد : کیوں بابا۔ ابھی تک وہ نہیں آئی۔

گورکن : حضور کون؟

شمشاد : زہرہ۔ جو ہر روز مجھ سے یہاں ملنے آتی ہے۔

گورکن : نہیں۔ میں نے تو ابھی تک نہیں دیکھا۔

شمشاد : لیکن ابھی تم یہاں کس سے باتیں کررہے تھے؟

گورکن : (سوچ کر) وہ میری لڑکی تھی حضور— کبھی کبھی میرے ساتھ چلی آتی ہے۔

شمشاد : (کچھ دیر خاموش رہ کر) اس تنہائی اور ویرانی میں بابا تم اپنی زندگی کیسے گزارتے ہو۔ تمھارا دل نہیں گھبراتا۔

گورکن : دل کیوں گھبرائے گا۔ حضور بچپن سے یہاں رہنے کا عادی ہوں (کچھ دیر خاموش رہ کر) عجیب پیشہ ہے۔ دن رات لاشیں ہیں اور قبریں۔

شمشاد : اور اب اس پیشہ میں بھی کیا رکھا ہے۔ حضور پیٹ بھر روٹی نہیں ملتی۔

(شمشاد خاموش رہتا ہے۔ گورکن چند سیکنڈ خاموش رہ کر) زمانہ بدل گیا۔ محبتیں بدل گئیں (ٹھنڈی سانس بھر کر) میری ہی ان آنکھوں نے وہ دن بھی دیکھے ہیں جب لوگ بڑی عقیدت سے قبرستان آتے تھے مگر اب تو جوگاڑ کر جاتا ہے بھولے سے ادھر آنے کا نام نہیں لیتا۔

شمشاد : ہاں بابا۔ انسان کو پیٹ کی فکر نے سب غموں سے آزاد کر دیا ہے۔

گورکن : پیٹ کی بات تو الگ ہے حضور۔ لوگوں نے قبرستانوں کو برائیوں کا اڈہ بنا لیا ہے۔ کون سی برائی ہے جو یہاں نہیں ہوتی۔ جوا یہاں کھیلا جاتا ہے۔ چوری کا مال یہاں چھپایا جاتا ہے اور کیا کہوں۔ حضور کہ کیا کیا ہوتا ہے۔ بس دیکھتا ہوں اور خدا سے جلد اٹھا لینے کی دعا کرتا ہوں۔

شمشاد : بابا اس میں انسان کا اتنا قصور نہیں جتنا کہ —

گورکن : (بات کاٹ کر) حضور ناراض نہ ہونا۔ آپ ہی قبرستان میں محبت کا کھیل کھیل رہے ہیں۔

شمشاد : بابا —

گورکن : اب کیا کہوں سرکار۔ میں تو کئی دن سے عرض کرنے کی فکر میں تھا مگر —

شمشاد : میں خود نہیں سمجھ سکا کہ وہ مجھ سے قبرستان ہی میں کیوں ملتی ہے کسی اور جگہ کیوں نہیں ملتی۔

گورکن : اچھا ہی ہے اگر کہیں اور ملے تو آپ کو اس سے محبت نہیں نفرت ہو جائے۔

شمشاد : کیا کہہ رہے ہو بابا۔

گورکن : (بات بناتے ہوئے) کوئی خاص بات نہیں۔ میں نے زندگی میں ایسے ہزاروں کھیل دیکھے ہیں۔ اسی قبرستان میں میں نے نفرت سے قبریں کھود کر پھینکتے دیکھا ہے اور محبت سے آنسو بہاتے۔ یہاں محبتیں دفن ہوتی دیکھی ہیں اور نفرتیں ابھرتی۔ بہتر تو یہ ہے کہ آپ اس سے ملنا جلنا ترک کر دیں۔

شمشاد : لیکن وہ مجھ سے کہیں اور ملنے کو تیار نہیں۔

رکن : میرے بڑھاپے کا خیال کیجیے لیکن کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی تو میرا کیا حشر ہوگا۔

شاد : لیکن تمھارا اس سے کیا تعلق ہے بابا۔

ورکن : میرا اس سے کوئی تعلق نہیں مگر اس قبرستان سے تو ہے۔ پولس یہاں چھاپے مارتی رہتی ہے اور میں مصیبت میں پڑتا ہوں۔ عدالت۔ پولس، چوکی، وقت اور روپے کی بربادی۔ حضور خدا کے لیے رحم کیجیے اور اس قبرستان کا پیچھا چھوڑ یے۔

شمشاد : تم فکر نہ کرو بابا۔ ایسی کوئی بات نہ ہوگی جس سے تمھیں تکلیف ہو۔

گورکن : لیکن حضور خدا کے لیے۔

شمشاد : نہیں نہیں بابا (جیب سے کچھ روپے نکال کر دیتے ہوئے) یہ لو— میں جلد ہی اس قبرستان میں آنا چھوڑ دوں گا۔

گورکن : مگر حضور جلد ہی کہیں ایسا نہ ہو کہ۔

شمشاد : نہیں نہیں تم فکر نہ کرو— (گورکن جانے کے لیے مڑتا ہے) اور دیکھو بابا (گورکن پلٹ کر دیکھتا ہے) کسی کو خبر نہ ہو کہ ہم دونوں یہاں آکر ملتے ہیں۔

گورکن : بہت اچھا مگر—

(خاموش ہوکر شمشاد کو دیکھنے لگتا ہے)

شمشاد : وہ مجھ سے یہاں چھپ کر ملتی ہے اور نہیں چاہتی کہ کسی کو اس کا علم ہو (گورکن سوالیہ نگاہوں سے دیکھتا ہے) اپنے شوہر کی موت کے بعد وہ بہت اُداس ہوگئی ہے۔

گورکن : اس کا شوہر۔

شمشاد : ہاں اس کا شوہر (قبر کی طرف اشارہ کرکے) یہ جو ؟ قبر ہے۔

گورکن : اس کے شوہر کی قبر (پھر ایک دم جیسے سی بات کی یاد آجانے پر) اوہ ٹھیک تو

ہے۔شوہر پرست بی بی معلوم ہوتی ہے (درختوں کی آڑ سے زہرہ آتی ہوئی نظر آتی ہے۔گورکن اسے دیکھ کر) وہ آرہی ہیں (جاتے ہوئے) میں چلا سرکار۔

(گورکن چلا جاتا ہے۔ زہرہ برقعہ کا نقاب چہرہ پر ڈالے آہستہ آہستہ آتی ہے اور کچھ پھول قبر پر رکھ کر خاموش کھڑی ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد شمشاد اس خاموشی کو توڑتے ہوئے)

شمشاد : بہت دیر کی آج تو آپ نے۔

زہرہ : اوہ جی ہاں۔ دیر ہوگئی۔ بچہ اسکول سے دیر میں آیا۔

شمشاد : بچہ!

زہرہ : جی ہاں۔ (نقاب الٹ کر شمشاد کو دیکھتے ہوئے) میں نے شاید آپ سے کہا نہیں کہ میرا ایک چھ سات سال کا بچہ بھی ہے۔

شمشاد : اوہ (سوچتے ہوئے) پہلے آپ نے اس کا ذکر نہیں کیا۔

زہرہ : اور اگر ذکر بھی کرتی تو کیا ہوتا۔ یتیم بچہ میں کہاں کی دلکشی ہوتی ہے۔

شمشاد : ایسا نہ کہیے۔ معصوم بچہ کا تصور ہی دلکشی کا سبب ہوتا ہے۔

زہرہ : مجھے تو دن رات اس کا خیال رہتا ہے (غمگین لہجہ میں) سوچتی ہوں یتیم ہے۔ دنیا میں ٹھوکریں کھانا اس کی قسمت میں ہے۔

شمشاد : کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ قدرت نیک خیال انسانوں میں فرق کرنا نہیں جانتی جس بچے کو آپ یتیم سمجھ کر اس کے مستقبل کی طرف سے نا اُمید ہیں۔ جانے قدرت نے اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے؟

زہرہ : (تلخی اور طنز سے مسکرا کر) وہ تو میں دیکھ رہی ہوں۔ اس کی اعلیٰ تعلیم کو میں ایک خواب پریشان سے زیادہ نہیں سمجھتی۔ (شمشاد حیرت سے اس کا چہرہ دیکھتا ہے) کیا مالی پریشانیاں میرے پیش نظر نہیں ہیں۔ اوہ معاف کیجیے گا۔ میں بھی کہاں کا رونا لے بیٹھی۔

شمشاد : لیکن مالی پریشانیاں تو کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو حل نہ ہو سکے۔

، : (غور سے شمشاد کا چہرہ دیکھ کر) کیوں نہیں (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) آپ کا مطلب ہے میں کسی سے مدد لوں اور آپ کا اشارہ شاید خود آپ کی طرف ہے (ٹھنڈی سانس بھر کر) یتیم بچہ کی پرورش خیرات پر ہی ہوتی ہے۔

شاد : آپ نے شاید میرا مطلب غلط سمجھا۔ کیا ہمدردی، خلوص اور محبت کو آپ خیرات سمجھتی ہیں۔ زہرہ! (گھبرا کر زہرہ کا چہرہ دیکھتا ہے جو نظریں جھکائے کھڑی ہے! معاف کیجیے گا میں بلاوجہ بے تکلف ہوگیا (زہرہ کے چہرہ پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے جس سے شمشاد کی ہمت بڑھ جاتی ہے) تم نے شاید مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔

ہرہ : اور اگر میں کوشش بھی کروں تو کیا فرق پڑ جائے گا؟

شمشاد : کیوں فرق نہیں پڑے گا (کچھ دیر خاموش رہ کر) کیا ساری زندگی یونہی تنہا گزار دوگی؟

زہرہ : ایک بیوہ کی زندگی میں مایوسی اور تنہائی کے علاوہ ہوتا بھی کیا ہے۔

شمشاد : لیکن بیوگی کوئی جرم نہیں ہے کہ سزا اس قدر سخت ہو۔

زہرہ : اور یہ کوئی قدرت کا انعام بھی نہیں ہے۔ میں اِسے کسی بڑے گناہ ہی کا کفارہ سمجھتی ہوں۔

شمشاد : زہرہ! تم بھی سماج کے ان تعصبات کا شکار ہو جو المیہ کہانیوں کو جنم دیتے ہیں۔

زہرہ : لیکن جن کہانیوں کا پلاٹ ہی المیہ ہو اس کا کیا علاج ہوسکتا ہے۔

شمشاد : ہر المیہ پلاٹ میں ایسے وقفے آتے ہیں۔ جہاں روشنی ہوتی ہے۔ ان سے فائدہ اٹھانا دوراندیشی ہے (زہرہ خاموش رہتی ہے۔ شمشاد کچھ دیر خاموش رہ کر) میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میں زندگی کی تڑپ ہے۔ مگر تم کو ایسے تعصبات گھیرے ہوئے ہیں جنھوں نے تمھارے کردار کو بدلنا شروع کردیا ہے اور جس سے تمھاری زندگی کی کہانی المیہ ہوتی جارہی ہے۔

زہرہ : میں نے عرض کیا تھا کہ مجھے زندگی میں تاریکی کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

شمشاد : اور اسی کو میں تمھاری بھول کہتا ہوں۔ تم نے زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے شادی کی مگر شاید تمھیں اس کا تلخ تجربہ ہوا کہ تم—

زہرہ : (بات کاٹ کر) جی نہیں۔ مجھے ایک محبت کرنے والا شوہر ملا۔ آج زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ مجھے وہ محبت نصیب نہیں جس کی میں زندگی بھر خواہش کرتی رہی ہوں۔

شمشاد : کیا تم سمجھتی ہو کہ تمھیں وہ زندگی کبھی نصیب نہ ہوگی۔

زہرہ : میرا یہ خیال اب میرا عقیدہ بن گیا ہے۔

شمشاد : زہرہ! جانے کیوں میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوگئی ہے کہ میں تمھارے اس عقیدہ کو ختم کردوں اور تمھیں یہ بتا دوں کہ

زہرہ : (بات کاٹ کر) مسٹر شمشاد۔

شمشاد : زہرہ! تقریباً دو مہینے سے ہم تم یہاں مل رہے ہیں۔ اسی روز جب پہلی بار میں نے تم کو اس قبر پر پھول چڑھاتے دیکھا تھا تو میرے دل میں یہ خواہش جاگ اٹھی تھی کہ کاش تم—

زہرہ : (بات کاٹ کر) مسٹر شمشاد! (جانے کے لیے مڑتے ہوئے) اب مجھے اجازت دیجیے۔

شمشاد : زہرہ ٹھہرو (زہرہ ٹھہر جاتی ہے) میں آج تم سے بہت کچھ کہہ دینا چاہتا ہوں۔ شاید یہ موقع پھر نہ آئے (شمشاد کچھ دیر خاموش رہ کر) زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ (پھر چند سیکنڈ خاموش رہ کر) میں کوئی شاعر نہیں ہوں مگر میں نے تمھیں ایک مکمل حسن اور ایک مکمل عورت پایا ہے۔ زہرہ۔

زہرہ : (ایسے لہجہ میں جس میں بناوٹیں رہتی ہے) خدا را کچھ اور آگے نہ کہیے۔ یہ میرے شوہر کی قبر ہے۔ آپ کے کسی قسم کے الفاظ بھی اس کی شان میں گستاخی ہوں گے اور جس سے اس کی روح کو اذیت پہنچے گی۔

شمشاد : مجھے اس قبر میں سونے والے سے عقیدت ہوگئی ہے اس لیے کہ وہ خوش

قسمت تھا۔ اسے تم جیسی محبت کرنے والی بیوی ملی۔

زہرہ : (طنزیہ انداز میں) کیا آپ اس کی زندگی میں بھی یہی الفاظ کہہ سکتے تھے۔

شمشاد : اگر وہ زندہ ہوتا تو میں اس کی خوش نصیبی پر اس کو مبارک باد دیتا۔

زہرہ : اگر آپ کا مجھ سے خلوص بڑھانے کا مقصد یہی تھا تو ہم ملنا جلنا ترک کر دیں۔

شمشاد : زہرہ خدا کے لیے ایسا نہ کہو۔

زہرہ : مسٹر شمشاد! آپ نے مجھ کو صرف ظاہری طور پر دیکھا ہے، میں کون ہوں کیا ہوں۔ اس کا آپ کو علم نہیں۔

شمشاد : تم جو کچھ بھی ہو میں تم سے محبت کرتا ہوں۔

زہرہ : اگر آپ نے میری روح کی گہرائیوں میں اُتر کر یہ محسوس کیا ہوتا کہ میرے شوہر کی قبر پر مجھ سے محبت کہہ کر آپ مجھے کس قدر دکھ پہنچا رہے ہیں تو آپ یہ الفاظ کبھی نہ کہتے۔ فرض کیجیے میں آپ سے کہوں کہ میں ایک آوارہ اور بدچلن عورت ہوں تو آپ کی محبت قایم رہے گی۔

شمشاد : جو عورت اپنے شوہر کی قبر پر ہر روز ایک عقیدت سے پھول چڑھائے، جس کو اپنے شوہر سے اس قدر والہانہ محبت ہو اور جس کو اپنے بچے کے مستقبل کی کی اس قدر فکر ہو وہ آوارہ اور بدچلن نہیں ہوسکتی۔

زہرہ : (طنزیہ ہنس کر) آپ نے فلموں کی کہانیوں میں نہیں دیکھا کہ ایک عورت ہر نئے فلم میں کیسے عجیب عجیب روپ دھارن کرتی ہے کہ نقل پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔

شمشاد : لیکن وہ دنیا حقیقت کی دنیا تو نہیں ہوتی؟

زہرہ : مگر حقیقت کی جھلک تو ہوتی ہے۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔

شمشاد : زہرہ! تم میری روح کی انتہائی گہرائیوں میں سما چکی ہو۔

زہرہ : اگر یہ بات ہے تو مجھے کچھ دن غور کرنے کی اجازت دیجیے۔

(جواب کا انتظار کیے بغیر زہرہ چلی جاتی ہے۔ شمشاد کچھ دیر خاموش کھڑا رہتا ہے پھر قبر کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے چہرے سے امید و بیم کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ کچھ دیر وہ اس حالت میں بیٹھا رہتا ہے کہ اخلاق آتا ہے اور مسکرا کر)

اخلاق : میں سلام عرض کر رہا ہوں۔

شمشاد : ہے۔ کون۔ (اخلاق کو دیکھ کر) ارے اخلاق تم یہاں!

اخلاق : جی ہاں میں۔ (مسکرا کر) کوئی اعتراض ہے آپ کو۔

شمشاد : ہرگز نہیں۔ مگر تعجب ضرور ہے۔

اخلاق : تعجب! (مسکرا کر) میں نے آپ کے تصور جاناں کو درہم برہم کر دیا۔ (شمشاد کے چہرے پر خفیف سی ندامت اور شرمندگی ظاہر ہوتی ہے) شرمانے کی ضرورت نہیں۔ ویسے ہی چلا آیا تھا۔ سوچا کہ چل کر اس غارت گر سماج کو تو دیکھوں جس کو قبرستان کی تنہائی پسند ہے (طنزیہ) اور جس کو قبرستان کی ویرانی میں محبت کرنے میں مزہ آتا ہے۔ ابھی تشریف نہیں لائیں۔

شمشاد : (مسکرا کر) تشریف لائی بھی تھیں اور لے بھی گئیں (مسکرا کر) آپ کو جاسوسی کرنے میں دیر ہوگئی۔

اخلاق : میری بدقسمتی ہے کہ دیر ہوگئی۔ (ایک دم چونک کر) وہی تو نہیں جو ابھی سیاہ برقعہ پہنے گئی ہے۔

شمشاد : جی ہاں— وہی۔

اخلاق : اماں سچ کہو۔ (راستہ کی طرف اشارہ کرکے) جو اس راستے سے گئی ہے (شمشاد مسکراتا ہے) سچ کہہ رہے ہو تمھیں دھوکہ تو نہیں ہوا۔

شمشاد : کیسا دھوکا!

اخلاق : مجھے تعجب ہے۔ تم اسے اچھی طرح پہچانتے بھی ہو۔

شمشاد : اچھی طرح کا کیا مطلب؟ میں اس سے دو مہینے سے اس جگہ مل رہا ہوں۔

ملاق : اور اس کے شوہر کی قبر کون سی ہے۔

نشاد : (پاس والی قبر کی طرف اشارہ کر کے) یہ ہے۔

خلاق : (غور سے قبر کو دیکھتا ہے پھر طنزیہ ہنس کر) تم اس قبر کو پہچانتے ہو کس کی ہے۔

شمشاد : کیوں! اس کے شوہر کی۔

اخلاق : (قہقہہ مار کر) اگر عورتیں عورتوں کی شوہر ہوتی ہیں تو یہ ممکن ہے کہ اس کے شوہر کی قبر ہو۔

شمشاد : (تعجب سے) کیا مطلب؟

اخلاق : مطلب یہ کہ یہ مرد کی نہیں عورت کی قبر ہے۔ (شمشاد حیرت سے پلٹ کر قبر کو دیکھتا ہے (اس کا پتھر تم نے کبھی نہیں دیکھا اور جانتے ہو یہ کس کی قبر ہے؟ (طنزیہ مسکرا کر) جناب والا! یہ مشہور طوائف مشتری کی قبر ہے اور جناب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ابھی ابھی جو آپ سے مل کر تشریف لے گئیں ہیں۔ وہ مشہور طوائف زہرہ جان ہیں۔

شمشاد : (حیرت سے) کیا بک رہے ہو؟

اخلاق : بک نہیں رہا ہوں۔ حقیقت بیان کر رہا ہوں۔

شمشاد : لاحول ولا قوۃ۔ عجیب مذاق ہے۔

اخلاق : جی۔

شمشاد : (سوچتے ہوئے) مگر مجھے پھر بھی اس سے محبت ہے۔

اخلاق : بہت خوب۔ یہ دم خم ہیں۔

(پردہ)

(مطبوعہ: نئے چراغ، فروری 1962)

بنتِ عم

کردار

(1) افسر بیگ (ایک معقول اور زندہ دل بزرگ) (2) حمیدہ (افسر بیگ کی بیوی) (3) شبو (افسر بیگ کی لڑکی) (4) لطفی (شبو کا چچازاد بھائی)

منظر

(شبو کا کمرہ۔ ہر چیز بڑے قرینے سے سجی ہوئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کمرے کو خاص طور پر سجایا گیا ہے۔ ہر چیز صاف ستھری اور سلیقے سے رکھی ہوئی ہے۔ جب پردہ اٹھتا ہے تو شبو آئینے کے سامنے بال برابر کرتی نظر آتی ہے۔ اسی وقت لطفی کمرے میں آتا ہے اور شبو کو مسکرا کر دیکھ کر)

لطفی : زلفیں سنوارنے سے بنے گی نہ کوئی بات
اٹھیے کسی غریب کی قسمت سنواریے

شبو : (مڑ کر لطفی کو دیکھ کر) تو یہ ہے۔ آپ بھی کس قدر واہیات شعر یاد رکھتے ہیں۔

لطفی : واہیات! کمال ہے۔ یہ واہیات شعر ہے؟ (شبو کے پاس آتے ہوئے) اور

آپ کے پسندیدہ اشعار کون سے ہیں؟

شبو : میرے؟۔ (چند سیکنڈ رک کر مسکراتے ہوئے)

نہر پر چل رہی ہے پن چکی
دھن کی پوری ہے کام کی پکی

لطفی : (قہقہہ مار کر ہنستا ہے) بہت خوب بہت خوب۔ پھر تو آپ کو وہ شعر بھی پسند ہوگا۔ (شبو سوالیہ نظروں سے دیکھتی ہے۔ لطفی مسکراتے ہوئے) ایک لڑکی بگھارتی ہے دال۔

شبو : (مسکرا کر) بے حد پسند ہے۔ لیکن یہ آپ اس وقت آ کہاں سے رہے ہیں۔

لطفی : بس کالج سے چلا آ رہا ہوں۔

شبو : کالج! اب تو سات بجنے والے ہیں۔

لطفی : جی ہاں۔ کیا بتلاؤں ہمارے اُردو کے پروفیسر کی رگِ خوشنویسی پھڑک اٹھی تھی۔

شبو : (مسکرا کر) رگِ خوشنویسی! یہ جسم کے کس حصے میں پائی جاتی ہے۔

لطفی : (بے حد سنجیدہ شکل بنا کر) خالص دماغ میں۔ فرمانے لگے تم سب کے ہینڈرائیٹنگز انتہائی گندے، واہیات بلکہ جناتی ہیں۔ سب سے دو دو صفحے اس وقت تک نقل کراتے رہے۔ جب تک ان کو یقین نہیں ہوگیا کہ ہم سب اعلیٰ درجے کے خوش نویس بن چکے ہیں۔

شبو : (قہقہہ مار کر) پھر تو کافی ہوشیار اور سمجھدار معلوم ہوتے ہیں۔

لطفی : جی ہاں۔ میں تو خدا سے دعائیں مانگتا رہا کہ کہیں میری صحت کی طرف ان کا دھیان نہ چلا جائے اور اس کو واہیات کہہ کر ڈنڈ پیلنے اور مگدر ہلانے کا حکم صادر نہ فرمادیں۔ (چند سیکنڈ رک کر) یہ آپ اس وقت کہاں جانے کی تیاری کر رہی ہیں۔

شبو : کہیں کی بھی نہیں۔ آج ہماری خالہ جان آ رہی ہیں۔

لطفی : کون سی خالہ جان؟

شبو : وہی جن کے یہاں ہم گئے سال چھٹیوں میں مہمان گئے تھے۔

لطفی : ارے وہی جن کے صاحب زادے کچھ کریک سے ہیں۔

شبو : (مسکرا کر) یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ کریک سے ہیں۔

لطفی : آپ ہی اکثر کہا کرتی ہیں کہ وہ کچھ ایسی ہی اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔

شبو : میں نے کریک تو کبھی نہیں کہا۔ ہاں کچھ کھوئے کھوئے سے ضرور رہتے ہیں۔ (مسکرا کر) یا ایسا ایکٹنگ کرتے رہتے ہیں۔

لطفی : تو پھر آپ نے خبطی کہا ہوگا۔

شبو : نہ میں نے خبطی کہا۔ آپ تو اپنی طرف سے ہر کچھ فرض کر لیتے ہیں۔

لطفی : خیر خبطی بھی نہ کہا ہوگا۔ کیا وہ بھی تشریف لا رہے ہیں؟

شبو : جی ہاں۔ آنے کا تو لکھا ہے۔ اب دیکھیے۔

لطفی : یہ انھی کے خیر مقدم کی تیاریاں ہو رہی ہیں؟ کیا آپ ان سے میری ملاقات کرائیں گی؟

شبو : کیوں نہیں (مسکرا کر) آپ ان سے مل کر بے حد خوش ہوں گے۔

لطفی : (مسکرا کر) اور وہ مجھ سے مل کر؟

شبو : (ہنس کر) یہ وہ جانیں۔ آپ کی بات اس لیے کہہ دی کہ آپ کو سب سے مل کر بے حد خوشی ہوتی ہے (مسکراتے ہوئے) اس روز آپ نجمی صاحب کے صاحبزادے سے کہہ رہے تھے کہ آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی حالانکہ وہ صاحبزادے انتہائی بور واقع ہوئے تھے۔

لطفی : (ہنس کر) بور لوگوں سے مل کر مجھے واقعی خوشی ہوتی ہے۔ آخر ان سے مل کر بھی تو کوئی خوش ہونے والا ہو ہاں تو آپ کی خالہ جان کب تشریف لا رہی ہیں؟

شبو : بس آتی ہی ہوں گی۔ پاپا اسٹیشن گئے ہیں۔

لطفی : (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) اب میں ذرا جا کر انسان بن جاؤں۔ آپ کے ان کھوئے کھوئے سے رہنے والے بھائی صاحب سے ملاقات کرنا پڑے گی۔ (حمیدہ کمرے میں آ کر)

حمیدہ : ارے شبو۔ ان لوگوں کے لیے کمرہ تیار کر دیا؟

شبو : جی ہاں۔ وہ تو میں نے صبح ہی تیار کر دیا تھا۔

حمید : (لطفی کی طرف دیکھ کر) لطفی میاں! تم نے اپنے کمرے کی کیا دُرگت بنا رکھی تھی۔ شبو کو دن بھر لگ گیا صفائی کرنے میں۔ (لطفی مسکراتا ہے) اب تم کہاں جا رہے ہو؟

لطفی : چچی جان۔ میں ذرا انسان بننے جا رہا ہوں۔

حمیدہ : (مسکرا کر) اس وقت تم کہاں کے حیوان ہو؟

لطفی : دیکھیے نا۔ حلیے سے تو بھلا آدمی نظر نہیں آتا اور پھر آپ کی آپا جان آ رہی ہیں ان سے ملنے کے لیے کم از کم حلیہ تو معقول ہونا چاہیے (ہنستے ہوئے) ورنہ کہیں گی آپ نے بھی کہاں کہاں کے نمونے پال رکھے ہیں۔

(کمرے سے چلا جاتا ہے۔ حمیدہ کچھ دیر کے لیے خاموش رہ کر)

حمیدہ : شبو! یہ لطفی کل رات تیرے کمرے میں کیوں آیا تھا؟

شبو : (حیرت سے) میرے کمرے میں نہیں تو۔

حمیدہ : تیرے پاپا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ رات کوئی بارہ کا عمل ہوگا۔

شبو : مگر کل تو خود میرے سر میں درد تھا۔ دس بجے ہی سو گئی تھی۔ مجھے پتہ نہیں کیوں آئے تھے۔

حمیدہ : تیرے کمرے میں ایک بام کی شیشی بھی رکھی ہوئی تھی۔ تو نے بازار سے منگوائی تھی؟

شبو : جی نہیں میں نے بھی رکھی ہوئی دیکھی تھی۔ میں تو سمجھی تھی آپ یا پاپا رکھ گئے ہیں۔

حمیدہ : شاید وہی رکھنے گیا ہوگا اور تجھے سوتی دیکھ کر واپس آگیا ہوگا۔ (شبو کوئی جواب نہیں دیتی۔ حمیدہ کچھ دیر خاموش رہ کر) ارے ہاں تو اپنے پاپا کے ساتھ اسٹیشن نہیں گئی۔

شبو : جی ہاں مجھے کچھ دیر ہوگئی تھی۔

حمیدہ : اچھا اچھا جلدی تیار ہولے وہ لوگ آتے ہی ہوں گے اور ذرا خیال رکھنا آپا جان ذرا جھکی مزاج کی ہیں۔ ان کی باتوں کا برا نہ ماننا۔

شبو : (مسکرا کر) میں نے کب ان کی باتوں کا برا مانا ہے۔

حمیدہ : عمر کے ساتھ ساتھ آدمی بلاوجہ چڑچڑا ہو جاتا ہے اور پھر وہ تو اگلے وقتوں کی ہیں۔ یہ آج کل کی اچھل کود انھیں پسند نہیں۔

شبو : میں ان کے مزاج کو خوب سمجھتی ہوں انھیں شکایت کا موقع نہ دوں گی۔

(افسر بیگ کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ حمیدہ انھیں دیکھ کر)

حمیدہ : آپ تو تنہا آگئے! کیا آپا جان نہیں آئیں؟

افسر بیگ : (ایک کرسی پر بیٹھ کر) ارے صاحب کوئی ٹھکانہ ہے۔ گاڑی پورے سات گھنٹے لیٹ ہے۔

حمیدہ : سات گھنٹے!

افسر بیگ : جی ہاں۔ گویا اب دو بجے کے قریب آئے گی۔ اور اس کا بھی کیا ٹھکانہ۔ ریل گاڑی کیا ہوئی چھکڑا ہوگیا جب جی چاہا چلایا جب جی چاہا بیلوں کو گھاس چرانے لگے۔

حمیدہ : غضب خدا کا۔ گویا اب سارا پکایا ہوا کھانا سڑتا رہے گا۔ کم بخت ریل بابو ہر اسٹیشن پر تو اُتر کر چائے پیتے ہیں۔ بس اسی میں گاڑی لیٹ ہو جاتی ہے۔

افسر بیگ : بس بوس آپ اپنی قابلیت رہنے دیجیے۔

حمیدہ : تو تم مجھے بولنے ہی نہیں دیتے۔ آخر اس مرتبہ تم علی گنج گئے تھے تو ایسے نہیں ہوتا تھا۔ پہلے بس کا کنڈکٹر چائے پینے جاتا تھا۔ پھر ڈرائیور اور سب کے بعد

میں کلیئر۔ اس میں آدھ آدھ گھنٹہ لگ جاتا تھا۔ کم بخت کبھی ایک ساتھ نہیں جاتے تھے۔

افسر بیگ : گویا وہ ریل تھی؟ تمھیں ریل گاڑی اور بس میں بھی تمیز نہیں۔

حمیدہ : جب ریل گاڑیاں بھی بس کی طرح لیٹ ہونے لگیں۔ تو دونوں میں کون تمیز کرے گا۔

(شبو مسکراتی ہے۔ افسر بیگ ہنس کر)

افسر بیگ : بھئی تمھاری منطق سے کوئی نہیں جیت سکتا۔ اب جاکر کچھ انتظام کرو کہ کھانا گرم رہے اور خراب نہ ہو۔

حمیدہ : اب دو بجے میز سجائی جائے گی۔ راستہ میں کچھ کھاپی کر آئیں گی دو بجے رات تک تمھارے کھانے کے لیے بھوکی نہیں رہیں گی۔

افسر بیگ : (مسکرا کر) بھئی ہماری تو سالی ہیں تم انتظار کرو یا نہ کرو۔ ہم تو ضرور انتظار کریں گے۔

حمیدہ : آپ کو تو بات بات میں مذاق سوجھتا ہے، لڑکی کا بھی خیال نہیں کہ سامنے کھڑی ہے۔ (مڑ کر تیز تیز قدموں سے کمرے سے چلی جاتی ہیں۔ افسر بیگ کچھ دیر خاموش رہ کر)

افسر بیگ : تمھاری ماں اپنی بہن کے آنے سے بہت خوش ہیں۔

شبو : جی ہاں۔ دو تین راتوں سے تو وہ خوشی کے مارے سوئی بھی نہیں ہیں۔

افسر بیگ : ارے بھئی خوش ہونا ہی چاہیے۔ ایک ہی تو بہن ہیں اور وہ بھی کئی سالوں کے بعد آرہی ہیں۔ لطفی کہاں ہے؟

شبو : اپنے کمرے میں ہوں گے۔ ابھی ابھی کالج سے آئے ہیں۔

افسر بیگ : اتنی دیر سے؟

شبو : جی ہاں۔ (شبو کچھ دیر خاموش رہ کر) پاپا! ابھی امی کہہ رہی تھیں کہ آپ نے رات بارہ بجے انھیں میرے کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

افسر بیگ : ہاں بیٹی! میں بیٹھا ایک کتاب دیکھ رہا تھا۔ مجھے خود حیرت ہے کہ وہ اس قدر رات گئے تمھارے کمرے میں کیوں گیا تھا۔ کیا تم نے اس سے بام کی شیشی مانگی تھی؟

شبو : نہیں پاپا۔ میں نے تو سب کے سامنے ہی سر میں درد کی بات کہی تھی اور پھر جاکر اپنے کمرے میں سوگئی تھی۔ کچھ دن پہلے بھی مجھے شک ہوا تھا کہ وہ میرے کمرے میں رات آگئے تھے۔

افسر بیگ : پھر؟

شبو : میں خود نیند میں تھی۔ شاید وہ میری میز سے میرا رومال اٹھا کر لے گئے تھے۔ (افسر بیگ خاموش رہتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں) اسی طرح ایک مرتبہ مجھے ایک کتاب کی ضرورت تھی۔ باتوں باتوں میں میں نے تذکرہ کیا تھا اور صبح وہ کتاب مجھے اپنی میز پر رکھی ہوئی ملی تھی۔

افسر بیگ : مگر وہ یہ سب کچھ چوری چھپے کیوں کرتا ہے (اسی وقت لطفی کمرے میں آتا ہے۔ افسر بیگ اسے دیکھ کر) آؤ لطفی میاں۔ آج کالج سے بہت دیر میں آئے۔

لطفی : جی ہاں دیر ہوگئی (شبو کی طرف دیکھ کر) کیوں شبو اب میں بھلا انسان معلوم ہوتا ہوں (مسکرا کر) اب تو میں تمھارے ان کھوئے کھوئے سے رہنے والے بھائی صاحب سے مل سکتا ہوں (شبو خاموش رہتی ہے) ابھی تمھارے وہ بھائی صاحب نہیں آئے؟

افسر بیگ : گاڑی سات گھنٹے لیٹ ہے۔

لطفی : سات گھنٹے! کمال ہے۔ (پھر شبو کی طرف دیکھ کر) ارے ہاں شبو۔ تمھیں چچی جان بلا رہیں۔ باورچی خانے میں ہیں (مسکرا کر) جلدی جاؤ ورنہ اچھن کی پٹائی ہو جائے گی۔ اس نے کچھ گڑبڑ کردی ہے۔

(شبو کمرے سے چلی جاتی ہے۔ افسر بیگ لطفی کو دیکھ کر)

افسر بیگ : ارے بھئی بیٹھو نا۔ کھڑے کیوں ہو۔

لطفی : (بیٹھتے ہوئے) گویا وہ لوگ اب رات کے دو بجے تک آ جائیں گے؟

افسر بیگ : اس کا بھی کیا ٹھکانہ۔ گاڑی اور لیٹ ہوگئی تو رات کے چار پانچ بھی بج سکتے ہیں (افسر بیگ کچھ دیر خاموش رہ کر) لطفی میاں تمھارے امتحان کی تیاری کیسی ہو رہی ہے۔

لطفی : چچا جان تیاری تو اچھی کر لی ہے۔ اُمید ہے کہ اچھا ڈویژن بھی مل جائے گا۔ آگے خدا کی مرضی اور آپ لوگوں کی دعائیں۔

افسر بیگ : سعادت مندوں کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ ہاں ہماری جو سالی صاحبہ آ رہی ہیں۔ ان کے صاحب زادے سے ملنا وہ شاعر ہیں۔

لطفی : مجھے ان سے مل کر خوشی ہوگی۔

(حمیدہ کمرے میں آ کر)

حمیدہ : اس اچھن پر ذرا کام چھوڑا کہ بگڑا۔

افسر بیگ : (مسکرا کر) اب کون سی مصیبت نازل ہوگئی آپ پر؟

حمیدہ : آپ تو بس مسکرا دیتے ہیں اور میں اس اچھن کی حرکتوں پر جل بھن کر رہ جاتی ہوں۔ سارا کیا دھرا خاک میں ملا دیا۔

افسر بیگ : (اسی طرح مسکراتے ہوئے) آخر ہم بھی تو سنیں کہ اچھن نے کس کا خون کر دیا۔

حمیدہ : میرا خون کر دیتا تھا تو اچھا تھا مگر آپا جان یہ آ کر تو نہ دیکھتیں کہ سبزی تیل میں پکی ہے۔

افسر بیگ : (ہنس کر) بس اتنی سی بات ہے۔ گھی میں اور سبزی پکوالو۔

حمیدہ : آپ تو بڑی آسانی سے زبان ہلا دیتے ہیں اور سچ تو ہے زبان ہلانے میں کہاں کے ٹکے خرچ ہوتے ہیں (کچھ دیر خاموش رہ کر افسر بیگ کے کپڑوں کی طرف اشارہ کر کے) اب جا کر یہ تام جھام اتار لو اور کچھ دیر لیٹ لو۔ ایک بجے تمھیں جگا دوں گی۔

لطفی : چچا جان! آپ آرام کیجیے میں اسٹیشن چلا جاؤں گا۔

افسر بیگ : نہیں لطفی میاں (حمیدہ کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے) ہماری بیوی کی بہن یعنی ہماری سالی کا معاملہ ہے اسٹیشن تو ہم خود ہی جائیں گے۔ (پھر حمیدہ کی طرف دیکھ کر) آج اس خوشی میں کھانے کا پروگرام گول رہے گا۔

حمیدہ : غضب خدا کا۔ ابھی خود ہی کہا تھا کہ ان لوگوں کے آنے پر کھانا کھاؤں گا۔ میں اچھن سے کہہ کر آئی کہ گرم گرم چپاتیاں اسی وقت ڈالے تو کھانے کا پروگرام بننے لگا۔

افسر بیگ : خیر میں تو اپنی سالی کے ساتھ ہی کھانا کھاؤں گا مگر ان بچوں نے کون سا قصور کیا ہے کہ انھیں بھوکے رہنے کی سزا دی جارہی ہے۔

حمیدہ : اب بچے ایسے ندیدے نہیں ہیں۔ ایک دن گھنٹے دو گھنٹے صبر کرلیں گے۔

افسر بیگ : اچھا صاحب آج آپ ہی کی مرضی چلنے دیجیے ہماری سالی جو آرہی ہیں۔ (افسر بیگ مسکراتے ہوئے اٹھ کر کمرے سے چلے جاتے ہیں)

لطفی : چچی جان۔ کوئی کام میرے لائق ہو تو فرمایئے۔ میں حاضر ہوں۔

حمیدہ : اپنے چچا کے ساتھ اسٹیشن چلے جانا رات کا وقت ہوگا۔

لطفی : ضرور چلا جاؤں گا۔

حمیدہ : ان کی عمر جیسے جیسے زیادہ ہوتی جارہی ہے نہ جانے کیسے ہوتے جارہے ہیں (لطفی کے پاس بیٹھ کر رازدارانہ انداز میں مسکراتے ہوئے) تم سے ایک بات کہوں؟

لطفی : ضرور فرمایئے۔

حمیدہ : آپا جان کا لڑکا ہے نا۔ دلگیر۔

لطفی : وہی جن کے متعلق شبو کہتی ہے کچھ کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔

حمیدہ : ارے ہاں وہی۔ شاعر ہے بس خیالات میں کھویا رہتا ہے۔

لطفی : اگر وہ مجھ سے عمر میں بڑے ہوئے تو ضرور ان کو کھوئے کھوئے سے بھائی جان کہہ دوں گا۔"

حمیدہ : (مسکرا کر) تم تو بات میں سے بات نکالتے ہو۔ آپا جان کا خیال شبو کے لیے ہے۔

لطفی : اچھا— (چند سیکنڈ رک کر اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر) مگر نہیں چچی جان۔ میں ایسی خبر سننا نہیں چاہتا۔

حمیدہ : (گھبرا کر) کیا مطلب!

لطفی : آپ ایسی خبر بلا مٹھائی کھلائے سنا رہی ہیں۔ پہلے مٹھائی کھلوایئے پھر میں اپنے کان کھولوں گا۔

حمیدہ : (قہقہہ مار کر) بھئی غضب خدا کا۔ مجھے تو ڈرا دیا۔ ارے میاں مٹھائی بھی مل جائے گی (مسکرا کر) اب تو کان کھول لو۔

لطفی : وعدہ رہا؟

حمیدہ : ہاں بھئی رہا۔

لطفی : (کانوں پر سے ہاتھ ہٹا کر) دیکھیے مکر نہ جایئے گا۔ ورنہ میں ان کھوئے کھوئے سے بھائی کو قطعی اپنی ناپسندگی کی سند دے دوں گا۔

حمیدہ : تم دیکھنا تو وہ ہر لحاظ سے اپنی شبو کے لیے موزوں ہے۔

لطفی : آپ نے شبّو کی رائے بھی لے لی ہے؟

حمیدہ : اپنے خاندان میں لڑکیوں کی رائے کون لیتا ہے۔

لطفی : وہ تو ٹھیک ہے مگر پھر بھی چچی جان اب تو زمانہ بہت بدل گیا ہے۔

حمیدہ : زمانہ کتنا ہی بدل جائے۔ پھر بھی لڑکی اپنے منہ سے تھوڑا ہی کہتی ہے۔

(لطفی خاموش ہو کر سوچنے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد شبو کمرے میں آ کر)

شبو : تو یہ ہے ای۔ دن بھر تو سارے گھر بھر کو ہدایتیں جاری کی جا رہی تھیں کہ اچھے صاف ستھرے کپڑے پہنو۔ یہاں صفائی کرو وہاں صفائی کرو۔ یہ کمرہ

گندہ ہے وہ چیز ٹھیک نہیں ہے اور خود آپ نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔

حمیدہ : (مسکرا کر) ارے اب میرا کیا۔ کون مجھے نمائش کرنی ہے۔

لطفی : (کھڑے ہو کر) چچی جان۔ میں اپنے کمرے میں ہوں۔ جس وقت ضرور ہو آواز دے لیجیے گا۔

حمیدہ : دیکھو میاں سو نہ جائیو تمھیں اسٹیشن تک جانا ہے۔

لطفی : بہت اچھا۔ میں جاگتا رہوں گا۔

(کمرے سے چلا جاتا ہے۔ شبو لطفی کے جانے کے بعد)

شبو : ان سے کیا رازادارانہ باتیں ہو رہی تھیں؟

حمیدہ : بڑا ہی مزیدار لڑکا ہے (ہنستی ہے) کہہ رہا تھا کہ میں دلگیر کو ''کھوئے کھوئے سے بھائی جان۔'' کہا کروں گا— ارے ہاں تیرے پاپا نے دلگیر کی جو کتاب لاکر دی تھی تو نے دیکھ لی۔

شبو : ہاں دیکھ لی۔ مگر امی مجھے ان کی شاعری بالکل پسند نہیں آئی۔

حمیدہ : (کسی قدر گھبرا کر) یہ بات تو اس کے سامنے نہ کہہ دینا برا مان جائے گا۔

شبو : لیکن اگر انھوں نے بات چیت کی تو میں اپنی رائے ضرور دوں گی۔ عجیب پھیکے پھیکے اور بے جان اشعار ہوتے ہیں۔ لطفی بھائی کی کہانیاں کہیں جاندار ہوتی ہیں۔

حمیدہ : تم لوگ تو جانے کیسی باتیں کرتے ہو۔ ارے جان دار اور بے جان کیا ہوتا ہے۔ شاعری شاعری ہے۔ خیر اس کا خیال رکھنا۔

شبو : خیال کیوں نہ رکھوں گی۔ گئے سال انھوں نے بھی تو ہماری بڑی آؤ بھگت کی تھی اب بدلہ تو چکانا ہی پڑے گا۔

حمیدہ : صرف بدلہ چکانے کی بات نہیں ہے (مسکرا کر) کچھ اور بھی ہے (شبو غور سے حمیدہ کو دیکھتی ہے اور خاموش رہتی ہے۔ حمیدہ کچھ دیر خاموش رہ کر) تم دونوں کچھ کھا پی تو لو کب تک بھوکے رہو گے؟

شبو : ابھی تو ایسی کوئی بھوک نہیں ہے۔

حمیدہ : لطفی کالج سے آیا ہے ضرور بھوکا ہوگا۔ تمھارے پاپا تو غضب کرتے ہیں۔ بھلا تم لوگ کہیں دو بجے تک بھوکے رہو گے۔

شبو : ایک دن کا کیا ہے امی۔

حمیدہ : کچھ تھوڑا بہت تو پیٹ میں ہونا ہی چاہیے۔ جا لطفی کو بلا لا۔ ایک کپ چائے ہی پی لے۔

شبو : مگر امی۔

حمیدہ : ...... چلی بھی جا اور دیکھ اپنے پاپا کو بھی بلا لانا اور اچھن سے چائے کے لیے کہہ دینا۔

(شبو کچھ سوچتی ہوئی کمرے سے چلی جاتی ہے۔ حمیدہ کمرے کا بڑی تنقیدی نظر سے جائزہ لیتی ہے۔ میز پر رکھی ہوئی کتابوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتی ہے اور دلگیر کی کتاب نکال کر میز پر نمایاں طور پر رکھ دیتی ہے کہ افسر بیگ داخل ہوتا ہے۔)

افسر بیگ : اب کیا حکم ہے؟

حمیدہ : میں نے سوچا ایک کپ چائے پی لی جائے نہیں تو رات دو بجے تک پیٹ میں چوہے دوڑنے لگیں گے۔

افسر بیگ : (مسکرا کر) شکریہ! بہن کے آنے کی خوشی میں تو آج ہماری بھی اہمیت بڑھ گئی ہے۔

حمیدہ : بھئی غضب خدا کا۔ میں جیسے پہلے تو خیال رکھتی ہی نہ تھی۔

افسر بیگ : رکھتی تو تھیں مگر ـــــ

حمیدہ : (بات کاٹ کر) میں نے شبو کو اشارے اشارے میں ان کے آنے کا مقصد بتا دیا ہے۔

افسر بیگ : اچھا۔ پھر کیا بولی۔

حمیدہ : بھئی غضب خدا کا۔ آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ کہیں ہمارے خاندان کی لڑکیاں کچھ کہتی ہیں اور لطفی تو مارے خوشی کے اچھل پڑا۔

افسر بیگ : سچ! (سوچتے ہوئے) میں تو سوچتا تھا کہ کہیں — (کچھ دیر خاموش رہ کر) اس کے چہرے پر تو کسی ناگواری کا احساس نہیں تھا۔

حمیدہ : اب مردوں کے چہرے تو میں تاکتی نہیں۔ کہنے لگا چچی جان یہ خبر میں بلا منہ میٹھا کیے نہیں سنوں گا۔

(شبو کمرے میں آ کر)

شبو : امی کمال ہو گیا۔ (افسر بیگ اور حمیدہ دونوں اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہیں) وہ تو بستر پر پڑے سو رہے ہیں۔ کپڑے تک نہیں بدلے۔

حمیدہ : ابھی پانچ منٹ بھی تو نہیں ہوئے کہ وہ یہاں سے گیا ہے۔

شبو : جی ہاں۔ میں نے تو آواز بھی دی مگر وہ تو گھوڑے بیچ کر سوئے ہیں۔

افسر بیگ : کالج میں تھک گیا ہوگا لیٹا اور نیند لگ گئی۔

شبو : مگر پاپا وہ کتنے ہی تھک جائیں۔ 10-9 سے پہلے کبھی نہیں سوتے۔ یہ تو ان کی بہت غیرمعمولی حرکت ہے۔ (پریشانی کے انداز میں) کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

حمیدہ : بھئی غضب خدا کا۔ میں نے کہا بھی تھا کہ سونا نہیں ذرا اپنے چچا کے ساتھ اسٹیشن چلے جانا۔ رات کا وقت ہوگا مگر صاحب زادے ابھی سے جا کر سو گئے (افسر بیگ کی طرف دیکھ کر) آیئے چلیے چائے وہیں باورچی خانے میں پی لیں گے۔ دیکھو تو میاں اچھن کوئی اور گل نہ کھلا دیں — (شبو کی طرف دیکھ کر) اے شبو۔

شبو : نہیں امی۔ میں اس وقت چائے نہیں پیوں گی۔

حمیدہ : کیوں نہیں پیے گی؟ بی بی تمھارے بھی طرح طرح کے نخرے ہیں۔ (شبو خاموش رہتی ہے حمیدہ افسر بیگ کی طرف دیکھ کر) آیئے۔ اب چائے کے

لیے ان کی خوشامد نہیں کروں گی۔ (افسر بیگ مسکرا کر کھڑے ہو جاتے ہیں
اور حمیدہ کے پیچھے پیچھے کمرے سے چلے جاتے ہیں۔ شبو خاموش کمرے میں
کھڑی رہتی ہے۔ کچھ دیر بعد لطفی کمرے میں آکر)

لطفی : شبو!

شبو : (مڑ کر حیرت سے لطفی کو دیکھ کر) آپ! آپ تو سو گئے تھے۔

لطفی : نہیں شبو۔ میں جاگ رہا تھا۔

شبو : پھر آپ بولے کیوں نہیں؟

لطفی : میں سوچ رہا تھا۔

شبو : کیا سوچ رہے تھے؟

(لطفی میز پر رکھی ہوئی دلگیر کی کتاب اٹھا کر دیکھتا ہے۔ پھر میز پر رکھ کر اپنی
جیب سے ایک لیڈیز رومال نکال کر کتاب کے پاس رکھتا ہے اور پینٹ کی
دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر سیٹی سے ایک ماتمی دھن بجاتا ہوا کمرے سے
چلا جاتا ہے) شبو آنسو پونچھنے لگتی ہے۔

(پردہ)

(مطبوعہ: جان نثار امرتسر، جولائی 1969)

وہ کون تھا؟

کردار

(1) مونس (2) غزالہ (دو مسافر) (3) جمال (4) منو (دو مقامی آدمی) (5) لچھمن سنگھ

منظر

(پہاڑوں اور جنگلوں سے گھرا ہوا ایک کوارٹر جس کے سامنے ایک پہاڑی ندی بہتی ہے۔ کوارٹر کے سامنے ایک برآمدہ ہے۔ اس میں دو تین کرسیاں اور ایک چارپائی پڑی ہے۔ برآمدہ کے سامنے باہر ایک جیپ کھڑی ہے۔ برآمدہ میں مونس اور غزالہ کھڑے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابھی ابھی جیپ س اُتر کر برآمدے میں آئے ہیں۔ مونس چند منٹ خاموش کھڑا رہتا ہے پھر دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔)

مونس : ارے بھئی کوئی اندر ہے۔ (پھر دروازہ کھٹ کھٹا کر) کوئی اندر ہے۔ (غزالہ کی طرف دیکھ کر) (یہاں تو موت کا سا سناٹا ہے (پھر بلند آواز سے) ارے بھئی کوئی اندر ہے۔

غزالہ : ممکن ہے یہ جگہ غیرآباد ہو۔

مونس : (ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے) جگہ کیسے غیرآباد ہوسکتی ہے۔ یہ کرسیاں، یہ چارپائی، کیا یوں ہی پڑی ہوئی ہیں۔

غزالہ : اس قدر گھنے اور دہشت ناک جنگل میں کون رہتا ہوگا۔ (اندر کچھ گڑبڑ ہوتی ہے) دیکھیے اندر کوئی ہے۔

مونس : (کھڑا ہوکر دروازے کے پاس جاکر) ارے بھئی اندر کوئی ہے (دروازہ کھول کر اندر جھانکتا ہے۔ یہاں ضرور کوئی رہتا ہے)

غزالہ : مگر وہ بولتا کیوں نہیں؟

مونس : میں اندر جاکر دیکھتا ہوں۔

غزالہ : اندر نہ جایئے۔ خدا جانے کون لوگ ہیں کیسے لوگ ہیں۔

مونس : (دروازہ بند کرکے) مگر یہ کس قدر غیرمہذب حرکت ہے (اندر پھر کھڑبڑ کی آواز) کون ہے اندر؟ اگر جواب نہ دیا تو میں اندر آجاؤں گا (اندر بلیوں کے لڑنے کی آوازیں) عجیب جگہ ہے۔

غزالہ : مجھے تو ڈر معلوم ہورہا ہے۔ یہاں سے واپس چلیے۔

مونس : (پھر کرسی پر بیٹھ کر) اس قدر تیز بارش میں اب واپس چلنا غیرممکن ہے۔ بارش کا زور برابر بڑھتا جارہا ہے (سامنے بہتی ہوئی ندی کو دیکھنے لگتا ہے۔ پھر کچھ دیر بعد غزالہ کو دیکھ کر) کبھی کبھی تو جی چاہتا ہے کہ کسی ایسی ہی جگہ پر رہا جائے۔ کس قدر سکون ہے یہاں۔

غزالہ : مگر آپ کو سکون پسند ہی کہاں ہے— آپ تو—

مونس : (بات کاٹ کر) زندگی کچھ عجیب سی بن گئی ہے۔ اب اگر زندگی میں جدوجہد نہ ہو۔ خطرات نہ ہوں تو زندگی کچھ پھیکی پھیکی سی معلوم ہوتی ہے۔

غزالہ : آپ کے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ آپ اپنی زندگی سکون سے گزار سکتے ہیں۔

مونس : میرے لیے ہونے یا نہ ہونے کا سوال نہیں ہے۔ فطرت میں ایک بے چینی ہے۔ جو مجھے خطرات میں پڑنے کے لیے اکساتی رہتی ہے۔

(غزالہ ایک دم چیخ مارتی ہے۔ مونس گھبرا کر) کیا ہے؟

غزالہ : (بہت سہمے اور ڈرے ہوئے لہجہ میں) وہ— وہ— (دروازہ کی طرف اشارہ کر کے) وہاں— وہاں—

مونس : (پلٹ کر دروازہ کو دیکھ کر) وہاں کیا ہے؟

غزالہ : بہت خوفناک اور ڈراؤنا— وہ ابھی دروازہ میں سے جھانک رہا تھا۔

مونس : (غزالہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر) کیا تھا—؟ کون تھا——؟

غزالہ : بھوت۔

مونس : (مسکرا کر) بھوت—!

غزالہ : ہاں— بڑی بڑی سرخ آنکھیں۔ بڑی بڑی مونچھیں۔ بکھرے ہوئے بال۔ وحشت ناک چہرہ۔

مونس : تمھارا خیال ہے (کھڑے ہوکر) لاؤ میں اندر جا کر دیکھتا ہوں۔

غزالہ : (مونس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھلاتے ہوئے) نہیں اندر نہ جایئے وہ بہت ہی خوفناک ہے (بلیوں کے لڑنے کی آوازیں غزالہ دوڑ کر مونس سے لپٹ جاتی ہے۔ بلیوں کے لڑنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں) واپس چلیے مجھے تو بہت ڈر معلوم ہو رہا ہے۔

مونس : تم بلاوجہ ڈر گئی ہو (مسکرا کر) بھوت پریت دن کو نہیں نکلا کرتے۔

غزالہ : میں نے اکثر سنا ہے کہ بھوت پریت ایسی ہی سنسان جگہوں پر رہتے ہیں۔

مونس : (مسکرا کر) اور وہاں رہ کر کتابیں بھی پڑھتے ہیں (چارپائی کی طرف اشارہ کر کے) وہ دیکھو چارپائی پر ایک کتاب پڑی ہے۔

(غزالہ چارپائی پر پڑی ہوئی کتاب کو دیکھتی اور زور سے پڑھتی ہے)

غزالہ : ''بھوتوں کی لاش'' (اپنے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ پھر آہستہ سے) یہاں کتابیں بھی بھوتوں اور لاشوں سے متعلق ہیں۔ خدا کے لیے یہاں سے واپس چلیے۔ میں ایک منٹ بھی اس بھوتستان میں نہیں ٹھہر سکتی۔

مونس : (کسی قدر سخت لہجہ میں) یہ غیر ممکن ہے میں تمھارے فرضی خوف کی بنا پر اپنے ہزاروں کا نقصان نہیں کرسکتا کہہ دیا بھوت پریت کچھ نہیں ہوتے۔

غزالہ : تو پھر آخر یہ راز کیا ہے؟

مونس : یہی تو سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ (ندی کی طرف سے ایک شخص برساتی پہنے اور سر پر ٹوپی پہنے آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ چلنے میں کسی حد تک لنگڑا رہا ہے۔ اس کا چہرہ اور بدن نظر نہیں آرہا۔ مونس اور غزالہ اُسے خاموشی سے دیکھتے رہتے ہیں۔ وہ شخص برآمدہ میں آکر اپنی ٹوپی اُتارتا ہے اور دونوں کو غور سے دیکھتا ہے) ہم مسافر ہیں (وہ شخص خاموشی سے اپنی برساتی اتارتا ہے) میرا نام مونس ہے۔ مونس احمد اور— (وہ شخص غزالہ کی طرف دیکھتا ہے)۔ یہ غزالہ ہیں۔ میری— یوں سمجھ لیجیے کزن۔ (وہ شخص اب بھی خاموش رہتا ہے اور برساتی ایک طرف رکھتا ہے) ندی میں طغیانی کی وجہ سے ہمیں رک جانا پڑا ہے (وہ شخص خاموشی سے چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے۔ مونس اُس کی خاموشی سے اکتا کر) شاید آپ کو ہمارا یہاں قیام کرنا ناگوار گزرا۔ معاف کیجیے گا۔ مجبوری تھی۔ (وہ شخص کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھتا ہے) یہ دروازہ میں نے کھولا ہے۔ اندر شاید— مگر وہ بھوت نہیں ہوسکتا۔ میں نے گھر کا کونا کونا چھان مارا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

شخص : اور آپ اندر سے زندہ واپس آگئے۔

مونس : (گھبرا کر) جی! کیا مطلب؟

شخص : تین چار دن سے اُس نے گھر پر قبضہ کر رکھا ہے۔

مونس : مکان پر قبضہ! بھوت نے؟

شخص : جی ہاں یونہی سمجھ لیجیے۔ آپ دیکھتے نہیں کہ اس طوفانی موسم میں مجھے راتیں باہر چارپائی پر گزارنا پڑ رہی ہیں۔

مونس : مگر آپ—!

شخص : میں اوورسیر ہوں۔ میرا نام جمال ہے (ندی کے پل کی طرف اشارہ کرکے) مجھے اس پل کی دیکھ بھال کے لیے یہاں رہنا پڑتا ہے۔

غزالہ : (خوف زدہ لہجہ میں) اس خوف ناک اور بیابان جنگل میں! بالکل اکیلے تنہا؟

جمال : جی نہیں (سامنے جھونپڑیوں کی طرف اشارہ کرکے) ان جھونپڑیوں میں مزدوروں کا ایک پورا گینگ رہتا ہے۔

مونس : مگر اس وقت تو—

جمال : میں نے صبح انھیں ندی کے اس پار کام پر لگایا تھا مگر ندی میں پانی اس قدر تیزی سے بڑھا کہ پورا گینگ اُس پار رہ گیا۔ گاؤں ندی کے اُس پار آباد ہیں۔ (مکان کے اندر چلنے پھرنے اور پھر بلیوں کے لڑنے کی آوازیں۔ پھر کچن میں برتنوں کے الٹ پلٹ کرنے کی آوازیں پھر بلیوں کے لڑنے کی آوازیں سب خاموشی سے کان لگا کر سنتے رہتے ہیں)۔

مونس : مگر یہ بھوت—!

جمال : جی ہاں عجیب ماجرا ہے میں تین سال سے یہاں ہوں کبھی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ ابھی تین چار دن پہلے بہت تیز بارش ہوئی۔ میں پل دیکھ کر واپس آیا تو دیکھا ایک شخص میرے بستر پر سورہا ہے۔ میں نے جانا کوئی مسافر ہوگا۔ اس کو جگایا تو اس نے اپنی وحشت ناک سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورا اور اپنے پاؤں سے مجھے دھکا دیا۔ میں گر پڑا ابھی اٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ وہ دروازہ تک گیا اور غائب ہوگیا۔ اسی دن سے لنگڑا رہا ہوں۔

غزالہ : (حیرت سے) غائب ہوگیا!

جمال : جی ہاں— میں نے گھر میں اور گھر کے باہر تلاش کیا مگر کوئی پتہ نہیں چلا۔ جب واپس آیا تو یہ چارپائی اور بستر باہر پڑا تھا۔ تب ہی سے میں اپنے گھر میں داخل نہیں ہوسکتا۔

غزالہ۔ : پھر تو آپ کو بڑی تکلیف ہوگی۔

جمال : جی ہاں— گینگ کا کوئی آدمی اندر داخل نہیں ہوسکتا۔

غزالہ : مگر آپ کا کھانا وغیرہ۔

جمال : وہ مجھے وقت پر مل جاتا ہے۔ گینگ کی عورتیں اندر چلی جاتی ہیں۔ انھیں آج تک کوئی نقصان نہیں پہنچا ایک دن ایک مرد اندر چلا گیا تو اس کو اٹھا کر باہر پھینک دیا۔

مونس : (مسکرا کر) کافی شاعرانہ مزاج ہے اس بھوت کا۔

غزالہ : آپ یہ مکان خالی کیوں نہیں کردیتے۔

جمال : پھر آخر میں رہوں کہاں؟ (ایسی آوازیں جیسے کتا رو رہا ہو۔ کچن میں برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ۔ بلیوں کے لڑنے کی آوازیں۔ سب خاموشی سے انھیں سنتے رہتے ہیں۔ جمال کچھ دیر خاموش رہ کر) زندگی عذاب بنا دی ہے اس بھوت نے۔ (اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے۔ مونس اور غزالہ اُسے غور سے دیکھتے ہیں۔ سامنے بہتی ہوئی ندی کو دیکھتا رہتا ہے۔ پھر کتے کے رونے کی آواز۔ جمال پلٹ کر غزالہ کو دیکھ کر) آپ کو تکلیف تو ہوگی۔ ذرا اندر جا کر چائے لے آیئے۔

غزالہ : (گھبرا کر) جی—

جمال : آج کل میرے کھانے اور چائے کا انتظام وہی کرتا ہے۔

مونس : (غور سے جمال کو دیکھ کر) یہ بھوت اچھا خاصا باورچی معلوم ہوتا ہے۔

جمال : یونہی سمجھ لیجیے (غزالہ کو دیکھ کر) چلی جایئے۔ پلیز— آج کوئی عورت اندر جانے کے لیے نہیں ہے۔

غزالہ : معاف کیجیے گا۔ مجھے بھوتوں سے ملاقات کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔

جمال : یہ میری ذمہ داری ہے کہ وہ آپ کو نظر تک نہیں آئے گا۔ وہ صرف مردوں کی حد تک خطرناک ہے۔

غزالہ : کچھ بھی ہو۔ میں اندر ہرگز نہیں جاسکتی۔

جمال : آپ میری بات کا یقین کیجیے۔ میں آپ کو کسی خطرہ میں نہیں ڈال رہا ہوں۔

غزالہ : میں اس خوفناک شکل کو دیکھ چکی ہوں اور کسی قیمت پر اندر جانے کو تیار نہیں۔

جمال : آپ کی مرضی (پھر ندی کو دیکھنے لگا ہے۔ کچھ دیر بعد) پل خطرہ کی زد میں آچکا ہے۔

غزالہ : اِس جنگل میں آپ کا جی نہیں گھبراتا؟

جمال : مجھے نوکری کرنا ہے— یہ جنگل ہر لحاظ سے خطرناک ہے۔ ان جنگلوں کی خاص پیداوار ڈاکو ہیں۔

مونس : ڈاکو—!

جمال : جی ہاں—! آپ نے اخبارو ں میں ان کے متعلق نہیں پڑھا۔ ڈاکہ۔ قتل۔ اغوا۔ اس جگہ کے خاص پیشے ہیں۔

غزالہ : (گھبرا کر) اغوا—!

مونس : ڈاکہ—!

جمال : جی ہاں! جس طرح اور درندے اس جنگل میں جنم لیتے ہیں۔ اسی طرح ڈاکو بھی پیدا ہوتے ہیں۔

مونس : (کچھ دیر خاموش رہ کر) ہم کس وقت تک اس ندری کو پار کرسکیں گے۔

جمال : شاید دو تین دن لگ جائیں۔

غزالہ : دو تین دن—؟

جمال : جی ہاں— اس ندی میں باڑھ آتی تیزی سے ہے مگر اُترتی آہستہ آہستہ ہے۔

مونس : (سگریٹ جلا کر اس کا کش لے کر) تو پھر ہم کو واپس جانا پڑے گا۔

جمال : اب یہ غیر ممکن ہے۔ آپ یہاں سے آٹھ میل دور جس ندی کو پار کرکے آئے ہیں۔ اب اس میں باڑھ آچکی ہوگی۔

مونس : مگر ہم اس ڈاکو زدہ علاقہ میں نہیں ٹھہر سکتے۔

جمال : آپ کی مرضی۔ مگر اُس ندی کے کنارے آپ کو شاید چار دن قیام کرنا پڑے۔ اس ندی کے اترنے کے پورے چوبیس گھنٹے بعد وہ اترتی ہے

(برساتی پہنتے ہوئے) میں ابھی آجاؤں گا۔ (ٹوپی پہن کر مونس کی طرف دیکھ کر) اب آپ اندر جانے کی تکلیف نہ فرمائیے گا۔

غزالہ : (گھبرا کر) لیکن آپ کہاں جارہے ہیں۔

جمال : ندی کے پل تک۔ ریڈنگ لے آؤں۔ پانی خطرے کے نشان سے تو آگے نہیں بڑھ گیا۔ (لنگڑاتا ہوا چلا جاتا ہے غزالہ اور مونس خاموشی سے اُسے جاتا ہوا دیکھتے رہتے ہیں۔ اس کے جانے کے بعد پھر بلیوں کے لڑنے کی آوازیں آتی ہیں۔ غزالہ اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر)

غزالہ : کیا مصیبت ہے۔آخر اس بھوت کو بلیوں سے اس قدر دلچسپی کیوں ہے (مونس کی طرف دیکھ کر) خدا کے لیے یہاں سے واپس چلیے۔

مونس : (غزالہ کی بات پر دھیان نہ دے کر) مجھے تو اس اوورسیر پر بھی شک ہے (انتہائی وحشت ناک قہقہوں کی آوازیں مونس خاموش ہو جاتا ہے۔ پھر کچھ دیر بعد) کہیں یہ بھی ڈاکوؤں کے گینگ کا آدمی نہ ہو۔

غزالہ : میرا بھی یہی خیال ہے۔مگر سوال یہ ہے کہ اس نے اس مکان پر قبضہ کیسے کر رکھا ہے۔

مونس : خالی پڑا ہوگا رہنے لگا (کچھ سوچ کر) ممکن ہے وہ ڈاکوؤں کا جاسوس ہو۔

غزالہ : یہ بھی ممکن ہے (خاموش ہو جاتی ہے مگر کچھ بے چین سی نظر آتی ہے۔ مونس خاموشی سے سگریٹ پیتا رہتا ہے) کمبخت باتھ روم بھی تو گھر کے اندر ہے (مونس خاموش رہتا ہے۔ غزالہ تھوڑی دیر بعد) یہاں ٹھہرنا خطرناک ہے (کانا پھوسی کے انداز میں) اپنے ساتھ کافی افیم ہے (مونس ایسی نظروں سے دیکھتا ہے جیسے وہ اس موضوع پر بات کرنے سے منع کر رہا ہو (غزالہ مسکرا کر) آپ نے یہ کیسے کہہ دیا کہ میں آپ کی کزن ہوں؟

مونس : تو کیا میں یہ کہتا کہ میں تم کو بھگا کر لے جارہا ہوں یا تم اسمگلر ہو (طنزیہ مسکرا کر) پھر تو کافی عزت ہو جاتی ہم لوگوں کی (مسکرا کر) جب تک جھوٹ نہ

بولو زندگی میں مزا نہیں آتا (غزالہ کے چہرہ کو غور سے دیکھ کر) تم کچھ بے چین سی ہو (مسکرا کر) ادھر آڑ میں ہو کر اوپن ایریا باتھ روم بنالو۔

غزالہ : میں یہاں سے کہیں نہیں جاسکتی۔ چاہے مجھے — چاہے میرا — (مسکرا کر خاموش ہوجاتی ہے۔ جمال پھر آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ غزالہ نظروں سے اس کی طرف اشارہ کر کے) وہ لنگڑا پھر آرہا ہے۔ مگر وہ اس قدر تیز کیوں چل رہا ہے (مونس اس جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے جس میں ریوالور رکھا ہے۔ جمال برآمدہ میں آکر اپنی ٹوپی اُتارتا ہے۔ اُس کے چہرہ سے پریشانی ظاہر ہورہی ہے) خیریت تو ہے؟

جمال : جی نہیں (سگریٹ جلا کر بے چینی سے برآمدہ میں ٹہلتے ہوئے) مگر اب میں کیا کرسکتا ہوں۔

مونس : (مونس جیب میں سے ہاتھ نکال کر) بات کیا ہے؟

جمال : پانی کا لیول خطرہ کے نشان تک پہنچنے ہی والا ہے۔ پاس کے گاؤں خطرہ کی زد میں آچکے ہیں۔ ان کو خطرہ کی اطلاع ہونا ضروری ہے۔ آدھ گھنٹہ کے اندر اندر گاؤں میں پانی بھر جائے گا (پھر بے چینی سے ٹہلنے لگتا ہے) کم بخت پورا گینگ ندی کے اُس پار پھنس گیا ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر سوچتے ہوئے جیسے خود سے کہہ رہا ہو) مجھے خود ہی جانا پڑے گا۔

غزالہ : آپ خود جائیں گے! کہاں جائیں گے؟

جمال : گاؤں والوں کو خبردار کرنے۔

غزالہ : اس طوفانی بارش میں!

جمال : جی ہاں — اگر ان کو وقت پر اطلاع نہ ہوئی تو سارے گاؤں تباہ ہوجائیں گے۔ ان میں معصوم بچے بھی ہیں اور بوڑھے اپاہج لوگ بھی۔

غزالہ : مگر ہم یہاں — ڈاکو اور بھوت — (عاجزانہ لہجہ میں) خدا کے لیے آپ نہ جایئے۔

جمال : گاؤں کے لوگوں کو بچانا ضروری ہے۔ (اسی وقت ایک شخص سر پر مٹکی رکھے آتا دکھائی دیتا ہے۔ سب اُسے دیکھتے ہیں قریب آنے پر) ارے منو کہاں سے آرہا ہے؟

منو : گاؤں سے—

جمال : (حیرت سے) تو نے ندی کیسے پار کی؟

منو : جان پر کھیل کر ڈونگی کھیتا رہا یہ دودھ جولانا تھا۔

جمال : گاؤں میں پانی تو نہیں بھرا؟

منو : ابھی تو نہیں۔ مگر ندی دونوں کناروں سے جارہی ہے۔

جمال : اب تھوڑی دیر میں بھر جائے گا۔ پانی خطرہ کے نشان تک پہنچ گیا ہے۔ گاؤں والوں کو خبر ہونا ضروری ہے۔

منو : مگر اب ندی کو پار نہیں کیا جاسکتا۔ بڑ کے درخت کے پاس ہی بہاؤ کم تھا۔ میں نے وہیں سے ندی پار کی ہے۔ مگر پار کیے ہوئے بھی دو گھنٹے ہو چکے ہیں۔

جمال : مگر وہ درخت تو یہاں سے چھ میل دور ہے۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے گاؤں بہہ چکے ہوں گے۔ (کچھ دیر سوچ کر) چلو کوشش کریں۔

منو : (مٹکی کی طرف اشارہ کرکے) میں دودھ لایا تھا۔

جمال : ہاتھ بڑھا کر اندر رکھ دے (منو ہاتھ بڑھا کر مٹکی دروازہ کے اندر رکھ دیتا ہے۔ پھر پلٹ کو مونس اور غزالہ کو دیکھتا ہے) یہ مسافر ہیں۔ (کچھ بولنا چاہتا ہے۔ جمال اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتا ہے) ہم دونوں دو گھنٹے میں پہنچ سکتے ہیں۔

منو : مشکل ہے۔ راستے کیچڑ سے اٹے ہوئے ہیں (کچھ سوچ کر) اگر ہم 23ویں میل تک پہنچ سکیں تو وہاں رسی کا پل ہے وہاں سے ندی پار کرسکتے ہیں۔ پھر پہاڑی راستہ ہے تیزی سے پہنچ جائیں گے۔ مگر 23 واں میل بھی تو یہاں سے بارہ تیرہ میل دور ہے (جیپ کی طرف دیکھتا ہے پھر مونس سے)

کیا آپ کچھ مدد کر سکتے ہیں۔

مونس : میں—! میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟

منو : آپ اپنی گاڑی میں ہمیں 23 ویں میل تک پہنچا دیں پھر ہم کسی نہ کسی طرح گاؤں کو بچا لیں گے۔

مونس: (مشکوک نظروں سے منو کو دیکھ کر) مگر میں خود مسافر ہوں۔

منو : یہ تو ہمدردی کا کام ہے۔ بہت سے لوگوں کی جانیں خطرہ میں ہیں۔

مونس : مگر——

جمال : (جمال بات کاٹ کر) منو! ندی کے کنارے بڑ کے درخت کے پاس چیخ و پکار کریں۔ تو شاید گاؤں والے سن لیں۔

منو : مشکل ہے بابو جی۔

جمال : چل تو، کوشش کر دیکھیں۔

منو : بابو جی! تم تو جانتے ہی ہو اس علاقے کے لوگ کسی کی چیخ و پکار پر گھروں سے نہیں نکلتے۔

مونس : (بہت مشکوک نظروں سے دونوں کو دیکھ کر) گاؤں کنارے سے کس قدر دور آباد ہیں۔

جمال : بالکل کنارے پر— کیا زندگی ہے یہاں کی بھی۔ (مونس ایک دم کھڑا ہو جاتا ہے۔ غزالہ پلٹ کر دیکھتی ہے اور چیخ مار دیتی ہے۔ ایک خوفناک شکل سامنے کھڑی ہے اس کے کاندھے پر بندوق لٹک رہی ہے۔ مونس جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ وہ شخص مونس کو دھکا دیتا ہے اور مونس کرسی پر گر پڑتا ہے۔ بندوق کاندھے سے اتار کر اس کے سینہ کی طرف کر کے)

شخص : لچھمن سنگھ کا نشانہ کبھی خالی نہیں جاتا۔ (مونس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیتا ہے۔ پھر جمال کی طرف پلٹ کر) آج بھوت تمھارا مکان خالی کر کے جا رہا ہے— اپنی رعایا کو بچانے کے لیے۔ وہ ان کو ڈوب کر

مرنے نہیں دے گا۔ (بندوق کاندھے پر لٹکاتا ہے اور برآمدہ سے نیچے اُتر کر) اندر چائے اور کھانا تیار رکھا ہے جاکر کھاپی لو۔ ٹھاکر لچھمن سنگھ کے علاقے میں آئے مہمان بھوکے نہیں رہ سکتے۔

(ندی کی طرف چلا جاتا ہے۔ سب خاموشی سے اُسے جاتا ہوا دیکھتے رہتے ہیں۔ ندی کے پاس پہنچ کر اس میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔ غزالہ آنکھیں بند کرکے)

غزالہ : اب وہ ڈوب جائے گا۔

منو : وہ ٹھاکر لچھمن سنگھ ہے۔ دن بھر میں پچاس کوس کی منتری مارنا اور ایسی سات ندیاں پار کرلینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ دس فٹ اونچی دیوار وہ چھلانگ لگا کر پار کرلیتا ہے۔ جو کہا ہے وہ کرکے دکھائے گا۔ (سب ندی میں اُسے تیرنے کی جدوجہد کرتے ہوئے دیکھتے رہتے ہیں)۔

(پردہ)

(مطبوعہ: رسالہ پگڈنڈی امرتسر)

پردے اٹھتے ہیں

کردار

(1) غازی (ایک پیشہ ور شکاری) (2) فرقان (ایک نوجوان) (3) سعادت (ایک شہری)
(4) عبدل (غازی کا نوکر)

منظر

(ایک ایسا کمرہ جس کی سجاوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی شکاری کا کمرہ ہے۔ فرقان ایک آرام کرسی پر بیٹھا ایک کتاب اِس طرح دیکھ رہا ہے جیسے صرف وقت گزاری کررہا ہو۔ پاس ہی ایک گول میز پر سگریٹ کا پیکٹ، ماچس اور ایش ٹرے رکھی ہے۔ پورا ایش ٹرے سگریٹوں کے ٹکڑوں سے بھرا ہوا ہے اور اس میں سے دھواں نکل رہا ہے، جیسے فرقان نے ابھی ابھی سگریٹ اِس میں ڈالی ہو۔ وہیں زمین پر اخبار بے ترتیب پڑا ہے۔ فرقان کچھ دیر یونہی کتاب کی ورق گردانی کرتا رہتا ہے اور پھر کتاب میز پر رکھ کر آنکھیں بند کرلیتا ہے اُس کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت تھکا ہوا ہے۔ کچھ دیر بعد غازی کمرے میں آتا ہے۔ غازی کی شخصیت بہت پروقار ہے۔ عمر پینتالیس سال کے

قریب ہے۔ کنپٹیوں کے پاس بال سفید ہوگئے ہیں۔ فرقان آنکھیں کھول کر اُسے دیکھتا ہے۔ غازی کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انتہائی سنجیدہ ہے اور کسی اہم مسئلے پر غور کررہا ہے۔ فرقان خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہتا ہے۔ غازی میز پر سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر ایک سگریٹ نکال کر جلاتا ہے پھر الماری کے پاس جا کر ایک نقشہ نکالتا ہے اور اُسے میز پر پھیلا کر غور سے دیکھنے لگتا ہے۔ فرقان اس کا چہرہ دیکھ کر)

فرقان : کیا بات ہے، غازی چچا۔ آپ بہت پریشان نظر آرہے ہیں؟

غازی : (برابر نقشے کو غور سے دیکھتے ہوئے) ہاں فرقان وہ زخمی ہوکر بھاگ نکلا ہے۔

فرقان : (حیرت سے) زخمی ہوکر بھاگ نکلا۔

غازی : (نقشے پر انگلی رکھ کر) اِس جگہ اُس پر گولی چلائی گئی تھی۔ خلافِ توقع وہ اِس گھاس کے میدان میں داخل ہوکر غائب ہوگیا۔

فرقان : پھر تو وہیں کہیں بیٹھا اپنے زخم چاٹ رہا ہوگا۔

غازی : مگر اس نے یہ سارا میدان پار کرلیا ہے (پھر ایک جگہ نقشے پر انگلی رکھ کر) یہاں سے ایک مرتبہ اس کی آواز سنائی دی تھی۔

فرقان : یہاں تو کوہے کے درخت ہیں اور پھر نالا ہے، وہ ضرور نالے میں اُتر گیا ہوگا۔

غازی : ہاں وہ ضرور نالے میں اُتر گیا ہے، لیکن اگر وہ نالے میں بائیں جانب مڑ گیا ہے تو پھر بہت خطرناک ہے (فرقان خاموش رہتا ہے، غازی پھر نقشے پر انگلی رکھ کر) نالے میں اُس جگہ پانی ہے اور دیہات کے مویشی یہیں پانی پینے آتے ہیں۔ کہیں وہ مویشی اور انسان پر حملے نہ شروع کردے۔

فرقان : ممکن ہے، اس نے نالا بھی پار کرلیا ہو۔

غازی : یہاں کنارے بالکل عمودی ہیں۔ اس نے زخمی حالت میں شاید ہی نالا پار کیا ہو (سوچتے ہوئے) ہمیں ہر حالت میں اُسے ختم کرنا ہوگا۔

فرقان: مگر...

غازی : (بات کاٹ کر) لیکن اور مگر کا سوال نہیں ہے، ہماری پر اسٹیج کا سوال ہے۔ میں بیس سال سے یہاں کام کر رہا ہوں اور آج تک کوئی شیر زخمی حالت میں نہیں چھوڑا۔ جاگو۔ تیار ہولو۔ ہم ابھی اُس کی تلاش میں چلیں گے۔

فرقان : کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ...

غازی : کچھ نہیں ہوسکتا۔ (پھر غور سے فرقان کا چہرہ دیکھ کر) بات کیا ہے، یہ تم آج اگر مگر کیوں کر رہے ہو؟

فرقان : جی نہیں، کوئی بات نہیں ہے بلکہ بات یہ ہے کہ (چند سیکنڈ خاموش رہتا ہے، پھر ایک دم جیسے کچھ یاد آجانے پر) ابھی ابھی یہ تار آیا ہے۔ (تار میز پر سے اٹھا کر غازی کو دیتا ہے، غازی تار لیتے ہوئے)

غازی : کیسا تار ہے۔

فرقان : محکمۂ جنگلات کی طرف سے ہے۔ ایک غیرملکی شکار پارٹی آرہی ہے، جو ہماری خدمات حاصل کرنا چاہتی ہے۔

غازی : (تار پر نظریں ڈالتے ہوئے) کب آرہی ہے؟

فرقان : آج ہی یہاں پہنچنے والی ہے۔ شاید گورنمنٹ کی مہمانِ خصوصی ہے، اس لیے سوچ رہا تھا کہ

غازی : لیکن زخمی شیر کا ختم کیا جانا بہت ضروری ہے۔ اگر اس نے ایک آدھ واردات کردی تو میری ساری عزت خاک میں مل جائے گی (نقشہ لپیٹ کر الماری میں رکھتے ہوئے) جب تک میں نہاتا ہوں، تم بھی تیار ہولو۔

فرقان : مگر...

غازی : (پلٹ کر فرقان کو دیکھتے ہوئے) پھر وہی مگر، آخر بات کیا ہے، صاف صاف کیوں نہیں کہتے؟

فرقان : جی۔ کوئی بات نہیں ہے۔ میں ابھی تیار ہوتا ہوں۔

غازی : (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) میں نہا کر ابھی آتا ہوں۔ تم عبدل سے

چائے کے لیے کہہ دو اور تیار ہو جاؤ (پھر پلٹ کر) ریسٹ ہاؤس کسی شخص کو پہنچا دو اور وہاں جو شکار پارٹی ٹھہری ہوئی ہے، اس سے کہلوا دو کہ کل تک تمام پروگرام منسوخ رہیں گے۔

فرقان : بہت اچھا۔ (غازی دروازے کی طرف بڑھتا ہے) کیا ہم اس کی تلاش کل نہیں کر سکتے؟

غازی : (پلٹ کر پھر فرقان کو دیکھ کر) اگر کل تک اُس نے ایک دو مویشیوں کو زخمی کر دیا، یا کسی انسان پر حملہ کر دیا تو پھر کیا ہوگا؟ (دروازے کی طرف مڑ جاتا ہے مگر پھر کچھ سوچ کر، جیسے کچھ یاد آ جانے پر) آخر بات کیا ہے، تم صاف صاف کیوں نہیں کہتے۔

فرقان : (نظریں جھکا کر آہستہ سے) آج مس سعادت جا رہی ہے۔

غازی : مس سعادت جا رہی ہے! کہاں جا رہی ہے؟

فرقان : شہر۔

غازی : شہر! اب شہر کیوں جا رہی ہے؟

فرقان : مسٹر سعادت اسے واپس شہر بھیج رہے ہیں۔

غازی : اس بڈھے کھونسٹ کا دماغ خراب ہو گیا ہے (چند سیکنڈ فرقان کو غور سے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر مسکرا کر) تم چاہتے ہو کہ وہ شہر نہ جائے؟

فرقان : میرے چاہنے، یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے، بہرحال مسٹر سعادت اُس کے باپ ہیں۔

غازی : (طنزیہ ہنس کر) باپ! وہ خود کو بہت عقلمند سمجھتا ہے۔ بیوقوف — مگر تم ایسی فضول باتوں میں پڑ کر اپنے پیشے سے انصاف نہیں کر رہے ہو۔

فرقان : آج تک کسی بزرگ نے یہ نہیں کہا کہ اس کا چھوٹا اپنے پیشے سے انصاف کر رہا ہے (غازی پھر فرقان کو غور سے دیکھتا ہے، فرقان نظریں جھکا لیتا ہے۔ غازی کے چہرے پر محبت بھری مسکراہٹ آتی ہے۔ آہستہ آہستہ فرقان

کے پاس آکر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر)

غازی : فرقان! میں نے یہ نہیں کہا کہ نوجوان کو محبت نہیں کرنا چاہیے۔ (ہنستا ہے) نوجوان محبت کرتے ہوئے ہی اچھے معلوم ہوتے ہیں (پھر کاندھا تھپتھپا کر مسکراتے ہوئے) آج میں تنہا ہی اُس زخمی شیر کی تلاش میں چلا جاؤں گا مگر وہ بڈھا کھونسٹ کس قدر خبیث ہے ابھی تم نے سمجھا نہیں ہے (پھر محبت سے اُس کا کاندھا تھپتھپاتا ہے اور آہستہ آہستہ کمرے سے چلا جاتا ہے۔ فرقان چند سیکنڈ خاموش رہتا ہے پھر بلند آواز سے)

فرقان : عبدل دادا۔ عبدل دادا۔ (کچھ دیر بعد عبدل کمرے میں آتا ہے۔ فرقان اسے دیکھ کر) غازی چچا کے لیے چائے تیار کردو۔

عبدال : صاحب واپس آگئے؟

فرقان : ہاں، اور ابھی زخمی شیر کی تلاش میں جارہے ہیں۔

عبدل : زخمی شیر کی تلاش میں! آپ اُن کے ساتھ نہیں جائیں گے؟

فرقان : ہاں۔ میں نہیں جارہا ہوں۔

عبدل : (حیرت سے) کیوں! آج تک تو ایسا نہیں ہوا۔

فرقان : مجھے ایک ضروری کام ہے۔

عبدل : ایسا بھی کیا ضروری ہے فرقان میاں۔ انھیں جنگل میں تنہا نہیں جانا چاہیے (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) اگر آپ نہیں جارہے ہیں تو میں چلا جاؤں گا۔

فرقان : عبدل دادا تم!

عبدل : میں بوڑھا ضرور ہوگیا ہوں مگر اب بھی سونگھ کر بتا سکتا ہوں کہ جنگل میں کیسی ہوائیں چل رہی ہیں۔ آپ نہیں جانتے کہ سعادت میاں ان کے کس قدر دشمن ہیں۔

فرقان : دشمن! اور غازی چچا کے —— وہ تو ان کے ——

عبدل : (بات کاٹ کر) شاید کوئی راز ایسا ہے، جس کا علم صاحب کو ہے اور سعادت

میاں دل ہی دل میں ان کے دشمن ہیں۔ آپ کو کیا پتہ کہ... جب آپ چھوٹے تھے... مگر خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ آج میں ہی ان کے ساتھ چلا جاؤں گا۔

فرقان : اگر ایسی کوئی بات ہے تو— اچھا تم چائے تو تیار کردو۔ (عبدل مڑ کر دروازے کی طرف جاتا ہے) اور پھمن کو ریسٹ ہاؤس بھیجا دو۔

عبدل : ریسٹ ہاؤس! کیوں؟

فرقان : وہاں جو پارٹی ٹھہری ہوئی ہے، اس سے کہلوادو کہ آج کے سارے پروگرام ملتوی رہیں گے۔ (عبدل کمرے سے چلا جاتا ہے۔ فرقان کچھ دیر خاموش کھڑا رہتا ہے۔ پھر کچھ سوچ کر رائفل اٹھا کر اسے ایک دو مرتبہ چیک کرتا ہے اور کرسی سے ٹکا کر رکھ دیتا ہے۔ دوسری رائفل اٹھا کر اُسے چیک کرتا ہے۔ کھونٹی سے اپنا شکاری کوٹ اُتار کر پہنتا ہے۔ الماری سے کارتوس نکال کر جیب میں ڈالتا ہے۔ اُسی وقت غازی پھر کمرے میں آتا ہے۔ وہ نہانے کے لیے تیار ہے۔ فرقان کو یوں تیار ہوتا دیکھ کر مسکراتے ہوئے)

غازی : یہ سب کیا ہورہا ہے؟

فرقان : (پلٹ کر غازی کو دیکھ کر) میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔

غازی : (مسکراتے ہوئے) ارادہ بدل دیا ہے! کیوں؟ مس سعادت کو سی آف نہیں کرو گے؟

فرقان : جی نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ شاید یہاں آئے— مگر اب وہ شاید نہیں آئے گی—

غازی : تم نوجوان بڑے جذباتی ہوتے ہو (ہنس کر) تمھیں مس سعادت کو ایک بہادر کی طرح سی آف کرنا چاہیے۔ (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) پھمن سے کہہ دینا کہ وہ میرے ساتھ جانے کو تیار رہے۔

(جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے سے چلا جاتا ہے۔ فرقان کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے کہ سعادت کمرے میں آتا ہے۔ فرقان اسے دیکھ کر، حیرت سے)

فرقان : ارے آپ! (سعادت خاموشی سے اُسے گھورتا رہتا ہے) آخر بات کیا ہے۔

سعادت : اُس نے شہر جانے سے انکار کردیا ہے۔

فرقان : شہر جانے سے انکار کردیا ہے! یعنی کہ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

سعادت : تم خوب مطلب سمجھتے ہو مگر یاد رکھو تم اِس طرح اُسے بغاوت پر آمادہ کرکے اپنا مطلب حل نہیں کرسکتے۔

فرقان : کیا مطلب؟ میں نے کسی کو بغاوت پر، آمادہ نہیں کیا ہے۔

سعادت : تم سمجھتے ہو کہ اِس طرح تم اپنا الو سیدھا کرلو گے (غصے اور نفرت سے) یاد رکھو، مجھے تم سے نفرت ہے۔

فرقان : مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں کسی سے محبت نہ کروں۔ (بندوق اٹھا کر غصے سے ایک دو مرتبہ پھر اُسے چیک کرتا ہے۔ سعادت خاموشی سے اسے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر نفرت اور حقارت سے)

سعادت : تم سمجھتے ہو کہ اپنی بندوق کی اِس کھٹ پٹ سے مجھے ڈرالو گے۔ میں ایک مرتبہ پھر کہتا ہوں کہ مجھے تم سے نفرت ہے، سخت نفرت۔

فرقان : میں اتنا بزدل نہیں ہوں کہ انسان پر اپنی گولی ضائع کروں۔

سعادت : تم اپنی اوقات پرغور کرو کہ تم کیا ہو۔

فرقان : میری اوقات کچھ بھی ہو مگر ان سے ضرور بہتر ہے، جو محبت نہیں، نفرت کرنا جانتے ہیں۔

سعادت : تم گندی نالی میں سڑنے والے کیڑے تھے۔ اگر غازی تم کو سہارا نہ دیتا تو تم چور ہوتے، ڈاکو ہوتے۔ مجرم ہوتے اور تمھاری جگہ کسی جیل خانے کی کوٹھری ہوتی۔

فرقان : مسٹر سعادت مجھے مجبور نہ کیجیے کہ میں اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھوں۔

(غصے سے بندوق اٹھاتا ہے۔ سعادت پر ایک نفرت آمیز نظر ڈالتا ہے اور تیز تیز قدموں سے کمرے سے چلا جاتا ہے۔ سعادت کچھ دیر حیرت زدہ خاموش کھڑا رہتا ہے۔ چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی انجانے خوف سے گھبرا گیا ہو۔ چند منٹ پریشان سا کمرے میں ٹہلتا رہتا ہے۔ پھر ایک دم دوسری بندوق اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھتا ہے کہ غازی نہا کر کمرے میں آتا ہے۔ غازی چند سیکنڈ میں ماحول کا جائزہ لے کر)

غازی : یہ بندوق کہاں لے جارہے ہو۔

سعادت : (غصے اور نفرت سے) اگر وہ میرے گھر پہنچا تو میں اُسی کی بندوق سے اس کا خون کر دوں گا۔

غازی : کس کا؟

سعادت : فرقان کا۔ اُس کمینے نے میری زندگی کی ساری خوشیاں لوٹ لی ہیں۔ مجھے ذہنی بیمار ایک تھکا ہوا، انسان اور ایک ہارا ہوا جواری بنا دیا ہے۔

غازی : (پرسکون لہجے میں) بندوق رکھ دو۔ وہ تمھارے گھر نہیں جائے گا۔

سعادت : وہ ضرور میرے گھر جائے گا۔ اُس نے میری لڑکی کو محبت کا لالچ دے کر اِس قدر نافرمان بنا دیا ہے کہ وہ مجھ سے بغاوت پر اُتر آئی ہے۔

(دروازے کی طرف بڑھتا ہے، غازی غصے سے)

غازی : میں کہتا ہوں دروازے کے باہر نہ جانا، ورنہ...

سعادت : (پلٹ کر غازی کو دیکھ کر) ورنہ کیا۔

غازی : ورنہ اِس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔

سعادت : مجھے اِس کی پروانہیں۔ میں نے ایسی گیدڑ بھپکیاں بہت سنی ہیں۔

غازی : (غصے سے) میں کہتا ہوں بندوق رکھ دوتم ناعاقبت اندیش بڈھے کھونٹ۔

سعادت : (غصے سے چیخ کر) غازی! کہیں ایسا نہ ہو کہ اِس بندوق کا رخ تمھاری طرف ہو جائے۔

غازی : (سعادت کی طرف بڑھتے ہوئے) سعادت! مجھے طاقت کے استعمال پر مجبور نہ کرو۔ میں آخری بار کہتا ہوں کہ بندوق رکھ دو۔

(سعادت چند سیکنڈ غازی کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے اور پھر ایک مایوس انسان کی طرح بندوق میز پر پھینک دیتا ہے اور ایک کرسی پر بالکل شکست خوردہ انسان کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ غازی خاموشی سے اُسے دیکھتا رہتا ہے۔ کچھ دیر بعد سعادت نظریں اٹھا کر بہت مایوسانہ لہجے میں)

سعادت : غازی! میں نے ہمیشہ تمھیں اپنا دوست سمجھا ہے۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ایک روز تم اِس طرح میری عزت نیلام پر چڑھا دو گے۔

غازی : اور میں تمھیں اُس وقت اپنا دوست سمجھتا تھا جب تم نے مجھے زخمی شیر کے سامنے ڈھکیل دیا تھا۔ اگر فرقان کے باپ نے میرے سامنے آ کر اپنی جان نہ دے دی ہوتی تو آج میں اِس لیے زندہ نہ ہوتا کہ تم مجھے اپنا دوست کہو۔

سعادت : لیکن بخدا میرا ضمیر پاک ہے۔

غازی : مجھے تمھارے ضمیر سے مطلب نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ تم نے اپنی خودغرضی کی خاطر مجھے زخمی شیر کے سامنے جان بوجھ کر ڈھکیلا تھا اور تمھیں فرقان سے اِس لیے نفرت ہے کہ اُس کے باپ نے اپنی جان دے کر میری جان کیوں بچالی اور میں ابھی تک کیوں زندہ ہوں۔ تم ہمیشہ غصے میں فیصلہ کرنے کے عادی ہو اور اپنا ذہنی توازن کھو دیتے ہو۔

سعادت : اگر تمھاری لڑکی اس طرح تم سے بغاوت کرتی اور تم پرسکون رہتے تو مجھے تم پر تعجب ہوتا۔

غازی : اگر میری پڑھی لکھی اور سمجھدار لڑکی اپنے مستقبل کے لیے مجھ سے بغاوت کرتی تو مجھے خوشی ہوتی۔

سعادت : تم ایک باپ کے جذبات کو کیا سمجھو گے۔ تم نے کبھی شادی نہیں کی، تمھارے

کبھی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

غازی : (طنزیہ مسکرا کر) یقیناً میں تمھاری طرح کبھی باپ نہیں بنا۔ لیکن میں نے بھی ایک نوجوان کو باپ بن کر پالا ہے (عبدل چائے لے کر کمرے میں آتا ہے۔ غازی اُسے دیکھ کر) چھمن کہاں ہے؟

عبدل : ریسٹ ہاؤس گیا ہے۔

غازی : تم جا کر دیکھو، فرقان کہاں گیا ہے؟

عبدل : بہت اچھا۔

(عبدل چائے میز پر رکھ کر کمرے سے چلا جاتا ہے۔ سعادت چند سیکنڈ خاموش رہ کر)

سعادت : تم نے ایک لڑکے کو پالا ضرور ہے، مگر کسی لڑکی کو نہیں۔ اگر تم ایک لڑکی کے باپ ہوتے تو کیا تم اِس کو پسند کرتے کہ اس کا ہاتھ کسی ایسے کے ہاتھ میں دے دیا جائے جس کا کوئی ماضی نہیں ہے۔

غازی : وہ ایک بہادر باپ کا بیٹا ہے۔ میں نے اسے اعلیٰ تعلیم دلوائی ہے۔ وہ خود بھی بہادر ہے پھر اور کیا چاہیے۔ رہا ماضی کا سوال تو ماضی کتنے لوگوں کے اچھے ہوئے ہیں، یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ کبھی تم نے اپنے ماضی پر بھی غور کیا ہے؟

سعادت : میرا ماضی!

غازی : ہاں۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) تم اُس لڑکی کے متعلق بھی تو سوچو جس کا خود کوئی ماضی نہیں ہے۔

سعادت : وہ ایک شریف ماں باپ کی لڑکی ہے۔

غازی : (طنزیہ مسکرا کر) ہاں اِس قدر شریف ماں کی جو اُسے یتیم خانے میں پھینک آئی تھی اور جہاں سے تم اسے اٹھا لائے ہو۔ (طنزیہ) تم اس کی ماں کے قاتل کو تو جانتے ہو گے۔

سعادت : میں نہیں جانتا۔

غازی : (نفرت اور طنزیہ لہجے میں) عدالت میں تم نے اپنی بے گناہی ثابت کردی، مگر حقیقت کیا ہے، یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ کیا تمھارے اس کی ماں سے ناجائز تعلقات نہیں تھے۔ کیا تم نے اس کو اس لیے قتل نہیں کیا تھا کہ تمھارے علاوہ بھی اس کے کسی اور سے تعلقات تھے؟

سعادت : مگر غازی...

غازی : (بات کاٹ کر) کہو تمھارے ہاتھ انسانی خون سے رنگے ہوئے نہیں ہیں۔ میرے پاس آج بھی ثبوت موجود ہے اور میری زبان کی ذرا سی جنبش آج بھی تمھارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈلوا سکتی ہے۔

سعادت : (غصے میں کھڑے ہوکر) میں ہتھکڑیاں پہننا پسند کروں گا مگر اپنی لڑکی کا ہاتھ فرقان کے ہاتھ میں نہیں دے سکتا۔

غازی : (طنز اور نفرت سے) تمھاری لڑکی!

سعادت : ہاں میری لڑکی۔ فرقان کے ہاتھ میں اُس کا ہاتھ دینے سے تو میں یہ بہتر سمجھوں گا کہ اس کا ہاتھ تمھارے ہاتھ میں دے دوں۔

غازی : (چیخ کر) سعادت!

سعادت : ہاں تمھارے ہاتھ میں۔ مجھے فرقان سے نفرت ہے۔ اُس نے میری نصیحتوں کا مذاق اڑایا ہے۔ اُس نے میری بزرگی کی تضحیک کی ہے۔ اس نے میری لڑکی کو بغاوت پر آمادہ کیا ہے۔ بولو تم اُس سے شادی کرنے کو تیار ہو؟

غازی : شاید تمھارا نفرت کا جذبہ اِس قدر شدید ہوگیا ہے کہ تم اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے ہو۔

سعادت : نہیں۔ میں قطعی اپنے ہوش و حواس میں ہوں۔ میں تمھارے اندر ایک اچھا شوہر بننے کی صلاحیت پاتا ہوں۔ تمھارے اندر شرافت کی نیکیاں ہیں۔ تمھارے اندر مردانہ وجاہت ہے۔ تمھاری شخصیت پروقار ہے۔

غازی : میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ تم پاگل ہوگئے ہو (طنزیہ مسکرا کر)

ممکن ہے میرا ماضی بھی گھناؤنا رہا ہو۔

سعادت : ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں تمھیں بیس سال سے جانتا ہوں۔

غازی : (اُسی طرح طنزیہ انداز میں) اور میری عمر پینتالیس سال کی ہے۔

(عبدل گھبرایا ہوا کمرے میں آتا ہے، اُس کی سانس پھولی ہوئی ہے۔ پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان)

عبدل : صاحب۔ صاحب۔ (غازی عبدل کو دیکھتا ہے) صاحب۔ فرقان میاں—

غازی : فرقان میاں— فرقان کو کیا ہوا؟

عبدل : جی وہ— جی وہ— صاحب وہ—

غازی : (عبدل کے دونوں بازو پکڑ کر ہلاتے ہوئے) اپنے ہوش میں آؤ۔ فرقان کو کیا ہوا۔

عبدل : کچھ نہیں صاحب— مگر وہ—

غازی : (اس کے بازو چھوڑ کر) پھر تم اِس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟

عبدل : وہ بہت تیزی سے جیپ لے کر جنگل کی طرف گئے ہیں۔ بہت غصے میں تھے۔

غازی : تم بھی اس کے ساتھ کیوں نہیں گئے؟

عبدل : میں نے جیپ میں چڑھنے کی کوشش کی مگر انھوں نے دھکا دے کر مجھے گرا دیا اور چلے گئے۔ صاحب وہ ضرور زخمی شیر کی تلاش میں گئے ہیں۔

غازی : زخمی شیر کی تلاش میں!

عبدل : جی ہاں۔ جیپ کا رخ جنگل ہی کی طرف تھا۔ وہ اِس وقت اپنے ہوش میں نہیں تھے۔ گاڑی غیر معمولی رفتار سے چلا رہے تھے۔ صاحب انھیں کہیں کچھ ہو نہ جائے۔

(غازی تیزی سے بندوق اٹھا کر اپنے کاندھے پر رکھتا ہے۔ پھر سعادت کو غصے سے دیکھتا ہے پھر ایک دم اس کا گریبان پکڑ کر)

غازی : اگر اُس کو کچھ ہوگیا تو میں تیرا خون پی لوں گا (دھکا دے کر اسے کرسی پر گرا کر)

یاد رکھنا میری گولی عدالت کا انصاف نہیں ہے، ہمیشہ اپنے نشانے پر لگتی ہے۔

سعادت : مگر غازی...

غازی : (بات کاٹ کر) جوش انتقام میں تو اِس قدر نیچے گر گیا ہے کہ انسانیت کے تمام آداب بھول گیا ہے۔ تو اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ کس کی لڑکی ہے۔

سعادت : وہ میری لڑکی ہے۔

غازی : تیری (طنزیہ قہقہہ مار کر ہنستا ہے) اُس کی شادی تو مجھ سے کرنا چاہتا ہے۔ تجھے میرا ماضی معلوم ہے (نفرت سے) میں نے مردم شماری میں کبھی اپنے باپ کا نام نہیں لکھوایا۔ ہمیشہ اپنی ماں کا نام لکھوایا ہے۔

سعادت : (چیخ کر) غازی!

غازی : وہ اُس کی لڑکی ہے جس سے تو نے انتقام لینے کے لیے زخمی شیر کے سامنے ڈھکیل دیا تھا۔ تو تو اسے پرورش کر کے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہا ہے۔

سعادت : یہ جھوٹ ہے، وہ تیری نہیں، میری لڑکی ہے۔

غازی : جس طرح میں یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ تو اس کی ماں کا قاتل ہے اُسی طرح میں یہ بھی ثابت کر سکتا ہوں کہ وہ تیری نہیں میری لڑکی ہے، میں جس سے چاہوں گا اُس کی شادی کر دوں گا (تیزی سے کمرے سے چلا جاتا ہے۔ سعادت خاموش کھڑا رہ جاتا ہے)

(مطبوعہ: ماہنامہ 'شاعر' ممبئی)

ننھی صالحہ

کردار

(1) ظفر (بڑا بھائی) (2) زاہدہ (ظفر کی بیوی) (3) اشرف (ظفر کا لڑکا، عمر 9-8 سال)
(4) مظفر (چھوٹا بھائی) (5) ریحانہ (مظفر کی بیوی) (6) صالحہ (مظفر کی لڑکی عمر 6-5 سال)

منظر

(ایک چھوٹا سا کمرہ جس میں دو دروازے، ایک دروازہ دوسرے کمرہ میں کھلتا ہے جو بیرونی مکان ہے۔ دوسرا دروازہ اندرون مکان کھلتا ہے۔ کمرہ میں قیمتی قالین کا فرش ہے۔ بہترین میزیں کرسیاں۔ دروازوں پر ریشمی پردے۔ الماریوں میں خوشنما جلدوں کی کتابیں۔ دیواروں پر اچھی اور قیمتی تصاویر وغیرہ وغیرہ۔ اشرف ایک کرسی پر بیٹھا پڑھ رہا ہے)

اشرف : (چیخ چیخ کر) سی اے ٹی کیٹ معنی بلی۔ سی اے ٹی کیٹ معنی بلی سی اے۔

مظفر کی آواز: میاں اشرف ذرا آہستہ آہستہ۔ ہمارا ہرج ہوتا ہے۔

اشرف : ہم کیا کریں؟ سی اے ٹی

مظفر کی آواز: آہستہ آہستہ بھئی۔

اشرف کی آواز: (اور چیخ کر) سی اے ٹی کیٹ معنی بلی۔

مظفر کی آواز: اے او بلی کے بچے خاموش ہوتا ہے یا نہیں؟

اشرف: نہیں ہوتے جی! (زور سے) آرا ایئ ریٹ معنی چوہا۔

مظفر : (کمرہ میں داخل ہوکر) ریٹ کے بچے، کتنی دیر سے چلا رہا ہوں کہ آہستہ آہستہ۔ مگر آپ کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

اشرف : ہاں ہاں نہیں رینگتی۔ رعب کس پر جماتے ہو۔

مظفر : (غصہ سے) دیکھ لے اشرف تو بہت چخ چخ کرنے لگا ہے تیرا سب لاڈ پیار نکال دوں گا۔

اشرف : بڑے آئے لاڈ پیار نکالنے والے۔ اگر یہاں تکلیف ہوتی ہے تو دوسرے مکان میں کیوں نہیں چلے جاتے۔

ریحانہ : (داخل ہوکر) آپ اس کے منہ کیوں لگتے ہیں؟ ذرا دیکھو تو طعنے دے رہا ہے۔ ہاں بابا چلے جائیں گے بس۔

اشرف : (دیکھو جی۔ چچی ہم تم سے نہیں بول رہے ہیں۔

ریحانہ : بھابی نے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ بس انوکھا انہی کا تو بچہ ہے۔ نا معلوم کیا الٹا سیدھا سکھایا کرتی ہیں۔

اشرف : تمھاری بلا سے۔ تم اس کلمجڑی صالحہ کو کچھ نہ سکھایا کرو۔

ریحانہ : شیر کر رکھا ہے۔ بجائے اس کے کہ ڈانٹ ڈپٹ کریں اور شہ دیتی رہتی ہیں۔

مظفر : قصور نہ بھابی کا ہے نہ اشرف کا۔ قصور ہم ہی لوگوں کا ہے نہ ان کے ٹکڑوں پر پڑے رہتے نہ یہ باتیں سنی پڑتیں۔

ریحانہ : خدا نہ کرے۔ ہم کیوں ہوں ان کے ٹکڑوں پر۔ اللہ بخشے ابا میاں کی جائداد کے تنہا وارث یہی نہیں ہیں تمھارا حق بھی ہے۔

مظفر : (ٹھنڈی سانس لے کر) خدا غریق رحمت کرے ابا میاں کو۔ بیچاروں کے پاس جائداد ہی کیا تھی اور جو کچھ تھی بھی وہ بھائی جان میری تعلیم پر خرچ کر چکے ہیں۔

ریحانہ : میں تو بھائی کے طعنے برداشت کرتے کرتے عاجز آ گئی ہوں۔ اگر میرا بس

چلے تو ایک منٹ بھی نہ ٹھہروں اس مکان میں۔

مظفر : ریحانہ! اب ہمیں یہ مکان خالی کرہی دینا پڑے گا اور بہتر ہے کہ ہم ہنسی خوشی خالی کردیں۔

ریحانہ : بھابی اپنے گریبان میں نظر کیوں نہیں ڈالتیں۔ ان کے بھائی جو یہاں کی روٹیوں کے سہارے جی رہے ہیں اور بھائی جان کو بھی اس پر کچھ اعتراض نہیں۔

مظفر : (مسکراکر) بھائی سے بھتیجا پیارا اور سب سے بڑھ کر سالا۔ بہرحال ریحانہ اب ہمیں یہ مکان خالی کرنا ہے اور بہت جلدی۔

ریحانہ : (سوچتے ہوئے) لیکن جائیں گے کہاں؟

مظفر : دنیا بہت وسیع ہے ریحانہ! کہیں نہ کہیں تو جگہ مل ہی جائے گا اور اگر نہ بھی ملے تو قدرت خود انسان کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ درختوں کے گھنے سائے۔ چاند کی ٹھنڈی روشنی، پرندوں کی آوازیں اس کی تسکین کا سبب بن جاتی ہیں۔

ریحانہ : خیر یہ شاعری تو آپ اپنے ڈراموں اور افسانوں کے لیے رکھ چھوڑیئے۔

مظفر : کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔ اب اس جگہ گزارہ غیرممکن ہے۔

ریحانہ : جی ہاں! بس ناک میں دم آگیا ہے۔

مظفر : میں بچپن میں جس قدر خوددار تھا اسی قدر (مسکراکر خاموش ہوتا ہے اور آہستہ سے کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ ریحانہ جانے کے واسطے دروازہ کی جانب مڑتی ہے)

اشرف : پی آئی ٹی سی ایچ پچ معنی کتیا۔

ریحانہ : کیوں رے! مجھے کتیا کہہ رہا ہے۔

اشرف : جاؤ جاؤ اپنا کام کرو۔ پی آئی ٹی سی ایچ ناچ (ریحانہ کمرہ سے نکل جاتی ہے) سی اے ٹی کیٹ معنی بلی۔ آر اے ٹی ریٹ معنے چوہا (زاہدہ داخل ہوتی ہے)

زاہدہ : (پیار سے) کیوں منے سبق یاد کرلیا؟ چل چائے پی لے۔

اشرف : (رونی شکل بنا کر) ہم چائے نہیں پئیں گے۔

زاہدہ : کیوں منے کیا بات ہے؟ طبیعت تو خراب نہیں؟

اشرف : (رونی شکل بنا کر) دیکھیے امی! چچا اب پھر ہم پر خفا ہو رہے تھے۔ ہم سے کہہ رہے تھے بلی کے بچے چوہے کے بچے۔

زاہدہ : اچھا— اب ان کا دماغ اس قدر خراب ہوگیا ہے؟

اشرف : اور چچی کہنے لگیں کہ اس مکان میں ہمارا بھی حق ہے۔

زاہدہ : اچھا اس کی یہ مجال (غصہ سے) ہماری بلی ہم ہی سے میاؤں۔ ہمارا کھائیں ہم ہی پر شیر ہوں۔ آنے تو دو آج ان کو۔

اشرف : اور چچا صالحہ پر کبھی ناراض نہیں ہوتے۔

زاہدہ : ہاں اس پر کیوں ناراض ہوں گے۔ مفت کا تو میرا ہی بچہ ہے۔

اشرف : اور امی! (زاہدہ سے جھوم کر) ابا جان بھی صالحہ پر خفا نہیں ہوتے— اب صالحہ اس گھر میں رہے گی تو میں نہیں رہوں گا۔

زاہدہ : (غصہ سے چیخ کر) نکلیں تیرے دشمن! تو کیوں نکلے گا۔ اپنے باپ کا ہی تو کھاتا ہے۔ مفت کا تو نہیں۔

اشرف : اور چچی تو کہہ رہی تھیں کہ اس مکان میں ان کا بھی حق ہے۔

زاہدہ : (بگڑ کر) بڑی آئی حق جتلانے والی۔ (چیخ کر) اس کے میکے والوں نے دے دیا ہے خرید کر نا— مفت کا کھاتی ہے اور غراتی ہے (ریحانہ داخل ہوتی ہے) کیوں ری یہ تو حق کب سے جتلانے لگی ہے؟

ریحانہ : دیکھیے بھابی آپ بھی بچے کی باتوں میں آجاتی ہیں اور باپ دادا اور میکے والے نکالنے لگی ہیں (سنجیدگی سے) یہ تو ٹھیک نہیں۔

زاہدہ : ایسا ہی برا معلوم ہوتا ہے تو پھر چلی کیوں نہیں جاتیں۔ میاں مت کماؤ اور بیوی کلکٹر زادی۔

ریحانہ : دیکھو بھابی مجھے جو چاہو کہو۔ ان کا نام نہ لو۔

زاہدہ : کیوں نہ لوں؟ کیا پھانسی پر چڑھا دوگی۔ بچہ کا لکھنا پڑھنا دوبھر کر رکھا ہے۔

ریحانہ : (سنجیدگی سے) مگر بھابی اشرف سے کسی نے کچھ کہا بھی ہو۔ وہ تو خود انتہائی

گستاخ ہے۔

زاہدہ : (غصہ سے) تمھاری بلا سے۔ ادب سکھاؤ اپنی صالحہ کو تمھیں دوسروں کی کیا پڑی ہے۔

اشرف : چچا ہم سے (روکر) چوہے کا بچہ جو کہہ رہے تھے؟

ریحانہ : کسی نے کہا بھی ہو۔ اشرف خود ہی مجھ سے کتیا کہہ رہا تھا۔

اشرف : امی! میں تو سبق یاد کرر ہا تھا۔

زاہدہ : کہا بھی تو اچھا کہا (مظفر داخل ہوتا ہے)

مظفر : بھابی! کچھ آہستہ ہی ناراض ہوا کرو۔ باہر جو لوگ بیٹھے ہیں وہ کیا کہتے ہوں گے۔

زاہدہ : نام رکھیں ہزار مرتبہ۔ بدنامی ہوگی تو تمھارے بھائی کی — میں اپنے بچہ پر ظلم
برداشت نہیں کرسکتی۔

مظفر : آخر بھابی ظلم کس نے کیا؟ وہ تو خود چھوٹا منہ بڑی بات کہتا ہے۔

زاہدہ : (چیخ کر) تو تم سے کیوں ڈرے؟ (طنزیہ) ہاں تمھارا ہی تو کھاتا ہے۔

مظفر : میں کب کہتا ہوں کہ میرا کھاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی اپنا کھائے تو اسے
بدتہذیب ہوجانا چاہیے۔

زاہدہ : تہذیب سکھاؤ اپنی اس کلچڑی کو — قاضی جی دُبلے کیوں شہر کا اندیشہ۔

مظفر : (سنجیدگی سے) دیکھیے بھابی ان باتوں سے بچوں کو شہ ہوتی ہے۔

زاہدہ : اگر ناگوار گزرتا ہے تو دوسری جگہ چلے جاؤ — کھانا اور غرانا کہاں سے سیکھا ہے؟

مظفر : بھابی، ہم لوگ اب آپ کے واسطے عذاب بن گئے ہیں انشاءاللہ جلد چلے جائیں گے۔

زاہدہ : (حقارت سے) ننگے نواب قلعہ پر گھر — کئی مرتبہ تو یہی کہہ چکے ہو —
مگر — روٹیاں جو لگ گئی ہیں۔

مظفر : (کسی قدر برہم ہوکر) دیکھیے بھابی میں ابھی تک آپ کا احترام کرر ہا تھا۔

زاہدہ : نہیں تو ذبح کردو گے۔ تمھارے گھر کی چھوکری ٹھہری نا۔

مظفر : خیر غلام تو ہم ہی لوگ ہیں۔ مگر غلاموں میں بھی کچھ خودداری ہوسکتی ہے۔

زاہدہ : (حقارت سے) بڑی خودداری ہے۔ اگر خوددار ہوتے تو یوں ٹکڑے نہ توڑتے۔

مظفر : (غصہ سے) لیکن ہم اس قدر کم ظرف نہیں ہیں کہ ایسی معمولی باتیں زبان پہ لائیں— اپنے گریبان میں نظر ڈالو۔

زاہدہ : ہائے میرے خدا— (رونے لگتی ہے) اب یہ زمانہ رہ گیا ہے (ریحانہ اور مظفر کمرہ سے نکل جاتے ہیں) ان لوگوں کو انھوں نے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ میرا بس چلے تو زندہ چبا جاؤں (ظفر داخل ہوتا ہے)

ظفر : آج تو بہت ہی غصہ میں ہو (مسکرا کر) کس کو چبا رہی ہو (اشرف سے مخاطب ہوکر) کیوں بے تونے پھر پریشان کیا ہوگا (زاہدہ رونے لگتی ہے)

اشرف : (ڈر کر) جی نہیں ابا میاں! چچا مجھے بلا وجہ ڈانٹ رہے تھے۔ امی! بولیں تو وہ ان سے لڑنے لگے۔

ظفر : تمھاری ماں کی زبان کہاں کی چھوٹی ہے۔ چلتی ہے تو بس قینچی بن جاتی ہے۔

زاہدہ : میرے خدا! میں کس سے انصاف کراؤں۔ یہ بھی آئے تو انہی کی طرف داری کرتے ہوئے (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہاں کیوں نہ ہو۔ خون کا رشتہ جو ہے— اور میں ٹھہری غیر (زور زور سے رونے لگتی ہے)

ظفر : اشرف کی ماں! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کتنی مرتبہ ہر روز تمھارے مقدموں کے فیصلے کیا کروں۔ ناک میں دم آگیا ہے۔

زاہدہ : ہاں قصور وار میں ہی ہوں۔

ظفر : قصور وار تم ہو یا ظفر! بہرحال پریشان ہوگیا ہوں— اب کیا جھگڑا ہوگیا؟

زاہدہ : جھگڑا کیا ہوگا؟ وہی طعنے کہ میرے بھائی تمھارے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں۔

ظفر : کیا واقعی وہ پل رہے ہیں؟

زاہدہ : نوج وہ کیوں پلیں۔ پلیں ان کے دشمن۔

ظفر : تو پھر برا کیوں مانتے ہو؟

اشرف : اور چچا ہم کو بلی چوہے کا بچہ کہہ رہے تھے۔

ظفر : (غصہ سے) چپ رہ الو کے پٹھے۔ یہ سب تیرے ہی کرتوت ہیں۔

زاہدہ : (اشرف سے) خاموش رہو بیٹا۔ اب یہ زمانہ ایک تو کھائیں اوپر سے دندنائیں۔

ظفر : انہی باتوں نے اشرف کا دماغ خراب کررکھا ہے۔

زاہدہ : اگر ہم اس قدر برے معلوم ہونے لگے ہیں تو میں اسے لے کر میکے چلی جاؤں۔

(ظفر کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے)

ظفر : ناک میں دم ہے۔ لوگ گھر آتے ہیں تو ان کو آرام ملتا ہے۔ میں گھر میں آتا ہوں تو کوفت ۔۔ مگر اس مظفر نے بھی پریشان کررکھا ہے ۔۔ اس سے بھی عاجز آگیا ہوں ۔۔ مظفر ۔ اماں مظفر۔

مظفر کی آواز: جی ۔۔ بھائی جان۔

ظفر : یہاں آؤ ۔۔ (مظفر داخل ہوتا ہے) بھئی تم نے پریشان کرلیا ہے۔ اب ہمارا تمہارا نباہ غیر ممکن سا معلوم ہونے لگا ہے۔

مظفر : جی ہاں ۔۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ کسی دوسری جگہ چلا جاؤں۔

ظفر : برداشت کی اب حد ہوگئی ہے۔ وہ تو میں بہت برداشت کا ہوں ۔۔ ورنہ ۔۔

مظفر : جی ہاں آپ جس قدر زیادہ برداشت کرتے رہے اور میری خودداری زخمی ہوتی رہی۔ بہتر ہے کہ دل زخمی رہے ناسور نہ پڑے۔

ظفر : مناسب یہی ہے (ریحانہ داخل ہوتی ہے)

مظفر : میں کل ہی تک کوئی دوسرا مکان تلاش کرلوں گا۔

ظفر : ہاں بہت جلد۔

ریحانہ : بھائی جان!

ظفر : بیٹی! (دونوں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں صالحہ دوڑتی ہوئی کمرہ میں داخل ہوتی ہے)

صالحہ : (ظفر سے مخاطب ہوکر) حضور ابا آج آپ دفتر نہیں جائیں گے۔ آپ نے بازار چلنے کا وعدہ کیا تھا۔

زاہدہ : جاؤ اپنے باپ کے ساتھ وہ دوسرے مکان میں جارہے ہیں۔

صالحہ : دوسرے مکان میں کیوں جارہے ہیں؟ (ظفر سے مخاطب ہوکر) نہیں حضور ابا ہم تو آپ کے ساتھ رہیں گے۔ وہ تو ہم پر ناراض ہی ہوتے رہتے ہیں۔

زاہدہ : بڑی آئی رہنے والی۔ تمھارے باپ نے خریدا ہے نا۔ (ظفر غصہ سے زاہدہ کی طرف دیکھتا ہے)

صالحہ : حضور ابا ہم کہاں جائیں گے؟ (ظفر خاموش رہتا ہے۔ مظفر سے) کیوں میاں؟

مظفر : صالحہ! اب ہمیں خدا کا سہارا لینا ہے۔ دوسرے سہارے غیر مستقل ہیں۔

صالحہ : (معصومانہ انداز میں ضد کرتے ہوئے) نہیں میں تو نہیں جاؤں گی— اشرف بھائی نہ ہوں گے تو ہم کس کے ساتھ کھیلیں گے (اشرف زبان چڑاتا ہے) حضور ابا نہ ہوں گے تو کسے حضور ابا کہیں گے۔ ہمیں اچھی اچھی چیزیں دلانے بازار کون جائے گا— کیوں میاں آپ کے ساتھ چلا کریں گے (مظفر منہ چھپا کر آنسو پونچھتا ہے) آپ کو بھی مکان چھوڑنا برا معلوم ہو رہا ہے (التجا آمیز لہجہ میں) نہ جایئے —(ظفر سے جھوم کر) کیوں حضور ابا آپ روک لیں گے نا۔

ظفر : (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) بیٹی یہ بہت مردود ہے (مسکرا کر) اسے جانے دو تم میرے پاس رہنا۔

صالحہ : نہیں حضور ابا!

ظفر : اس کے دماغ پر ذرا گرمی چڑھ گئی ہے۔

صالحہ : آئس بیگ لاؤں (ظفر ہنس دیتا ہے۔ مظفر کے پاس جا کر) میاں نہ جائے۔ آپ نہ ہوں گے تو برا معلوم ہوگا۔

ظفر : مظفر اب تم نہیں جا سکتے۔

مظفر : بہت اچھا (کچھ سوچتا ہوا کمرہ سے نکل جاتا ہے صالحہ خوشی سے تالیاں بجاتی ہے)

اشرف : (غصہ سے کمرہ سے نکلتے ہوئے) کلمچڑی! کالی کلوٹی

ظفر : (مسکرا کر) تو بھی بیٹی چڑی کا غلام کہہ دے۔

صالحہ : حضور ابا— امی نے تو کہا ہے اشرف بھائی کہا کرو۔ (ظفر صالحہ کو پیار کرتا ہے)

(پردہ)

(مطبوعہ: حور، لاہور، نومبر 1945)

کراس کا تحفہ

افرادِ تمثیل

(1) تلنی (2) جسونت (3) انجمن (مریض) (4) روزی (ایک بوڑھی نرس) (5) ایک ٹھیلے والا

منظر

(ایک سینی ٹوریم کے سامنے لان۔ جس کے کنارے کنارے خوبصورت پھولوں کی کیاریاں ہیں۔ لان میں چند کرسیاں رکھی ہیں اور ان کے بیچ میں ایک گول میز۔ صبح کے آٹھ بجے ہیں۔ ہلکی ہلکی سردی ہے۔ تلنی ایک شال اوڑھے کرسی پر بیٹھی ہے۔ پاس ہی ایک دوکاندار اپنے ٹھیلے میں کچھ سامان لیے کھڑا ہے۔ تلنی ایک مفلر کو غور سے دیکھ رہی ہے۔ کچھ دیر بعد تلنی مفلر ٹھیلے والے کو واپس کرتے ہوئے ایک سوئیٹر کی طرف اشارہ کرکے)

تلنی : ذرا وہ سوئٹر دکھلایئے۔

دوکاندار : (سوئٹر اٹھا کر تلنی کو دیتے ہوئے) یہ لیجیے۔ خالص اون کا ہے۔

تلنی : (غور سے سوئٹر کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے) اور قیمت کیا ہے۔

دوکاندار : دوکانداری کی بات پینسٹھ روپے اور ایمانداری کی ساٹھ روپے۔

ٹلنی : بہت مہنگا ہے۔

دوکاندار : آپ دیکھیے تو کیا چیز ہے۔ خالص اون۔ روزی کی قسم لیجیے میں تو صرف پیٹ بھرنے تک کا دھندا کرتا ہوں۔ (انجمن سیڑھیوں سے اتر کر قریب آکر)

انجمن : کہو ٹلنی کیا خریدا جارہا ہے۔

ٹلنی : ایک سوئٹر دیکھ رہی تھی (سوئٹر انجمن کو دیتے ہوئے) دیکھو کیسا ہے؟

انجمن : (سوئٹر لے کر الٹ پلٹ کر دیکھ کر) یہ تو مردانہ ہے۔

ٹلنی : (مسکرا کر) ہاں مجھے مردانہ ہی چاہیے (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) جسونت کو کل یہاں سے چھٹی مل جائے گی۔ آخر اس کو کوئی تحفہ تو دینا ہی ہوگا۔

انجمن : اوہ ہاں— میں نے تو ایک شیونگ سیٹ خرید لیا ہے۔

ٹلنی : اچھا— کہو سوئٹر کیسا ہے۔

انجمن : بہت خوب ہے (مسکرا کر) تمھاری پسند ہے اور وہ بھی جسونت کے لیے۔

ٹلنی : (دوکاندار کی طرف دیکھ کر) کیوں پچپن روپے نہیں لو گے۔

دوکاندار : میں نے عرض کیا نا کہ آپ لوگوں سے دھندا نہیں کرتا۔

انجمن : یہ کیا مانگ رہے ہیں؟

ٹلنی : ساٹھ روپے

انجمن : پچپن بھی زیادہ ہیں مگر خیر اب تم نے کہہ دیا ہے تو پچپن ہی دے دو۔

دوکاندار : مگر روزی کی قسم—

انجمن : (بات کاٹ کر) سینی ٹوریم کی دوکان پر اس سے کم میں مل جائے گا۔ بس پچپن کافی ہیں دے دو (ٹلنی پرس سے روپے نکال کر دیتی ہے۔ دوکاندار روپیہ لے کر ٹھیلہ لے کر چلا جاتا ہے۔ انجمن واپس آکر کرسی پر بیٹھ کر مسکراتے ہوئے) بعض لوگ بھی کس قدر خوش قسمت ہوتے ہیں اور کچھ نہیں تو کم از کم کسی کو حسین خواب ہی دے جاتے ہیں۔

(ٹلنی چند سیکنڈ انجمن کو غور سے دیکھتی ہے پھر آہستہ سے)

نلنی : انجمن! یہ سینی ٹوریم ہے۔ کون یہاں سے واپس جاتا ہے۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا اور جو یہاں سے واپس جاتا ہے وہ خوش قسمت ہی ہوتا ہے۔

انجمن : (ہنس کر) میں تو ضرور یہاں سے واپس جاؤں گی۔

نلنی : بھگوان تمھاری زبان مبارک کرے— اس وقت جو جارہا ہے اس کی خوشی میں ہمیں خوش ہونا چاہیے۔

انجمن : خدا کی قسم نلنی جس دن تم یہاں سے جاؤ گی۔ اس دن میں-- اس دن میں— (خاموش ہوکر گہری سوچ میں ڈوب جاتی ہے اور آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں)

نلنی : (انجمن کو دیکھ کر) ارے انجمن یہ کیا۔ تمھارا تو یہاں سے جانے کا عزم پختہ ہے۔ پھر یہ آنسو کیوں۔

انجمن : (آنسو پونچھ کر) کچھ نہیں نلنی۔ (مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) جس وقت کوئی یہاں سے جاتا ہے تو میں خوشی کے آنسو ضبط نہیں کرسکتی اور اپنے اندر ایک نیا عزم محسوس کرتی ہوں۔ جسونت کے جانے پر آخر خوش ہونا ہی چاہیے۔

نلنی : کل تم نے اس کی ماں کو دیکھا تھا۔

انجمن : کس کی ماں کو؟

نلنی : جسونت کی ماں کو۔ جب ہم نے کہا تھا کہ دو چار دن میں جسونت کو یہاں سے چھٹی مل جائے گی۔

انجمن : ہاں— خوشی سے اس کا چہرہ دمکنے لگا تھا۔

نلنی : میں نے تو محسوس کیا تھ کہ بڑھیا کے چہرے پر کچھ جھریاں کم ہوگئی ہیں (روزی سسٹر سیڑھیوں سے اتر کر آتی ہے۔ نلنی اسے دیکھ کر) ہلو روزی سسٹر۔

روزی : (ان دونوں کے پاس آکر) ہلو نلنی۔ ہلو انجمن (کرسی پر بیٹھ کر) کیا ہورہا ہے۔

انجمن : نلنی نے جسونت کے لیے یہ سوئٹر خریدا ہے۔

روزی : (سوئٹر دیکھ کر) مارولس، ونڈرفل، جسونت کو ایک دم سوٹ کرے گا (پھر ایک دم جیسے کچھ یاد آجانے پر) ارے نلنی کامن ہال میں وہ سب تمھارا انتظار کررہے ہیں۔

ظلنی : میرا! کیوں؟

روزی : ڈرامے کا ریہرسل کر رہے ہیں۔

ظلنی : ڈرامے میں میرا تو پارٹ نہیں ہے۔

روزی : وہ تمھارے گانے کا ریہرسل لینا چاہتے ہیں۔

ظلنی : میں کئی مرتبہ تو ریہرسل دے چکی ہوں۔

روزی : اس وقت بالکل فائنل ہے۔ آج رات ہی تو ڈراما ہونا ہے۔

ظلنی : خیر وہ بھی کرلوں گی۔

(ظلنی اٹھ کر آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتی ہوئی عمارت میں غائب ہوجاتی ہے)

انجمن : (روزی کو دیکھ کر) ظلنی جسونت کو چاہنے لگی ہے۔

روزی : ہوسکتا ہے۔ یہاں کی ہمدردی بھی محبت ہی ہوتی ہے۔

انجمن : ہم نے کتنے ہی لوگوں کو یہاں سے رخصت کیا ہے مگر کبھی ظلنی نے گیت نہیں گایا۔ جسونت کے جانے پر وہ بہت خوش ہے۔

روزی : جسونت ایک دم سوئٹ ہے، ایک دم ینگ، مارولس، جولی اس کے جانے سے سونا سونا سا محسوس ہونے لگے گا۔

انجمن : سونا۔ سونا (ٹھنڈی سانس بھر کر) یہ سنی ٹوریم ہے روزی سسٹر یہ کبھی سنسان نہ ہوگا۔ زیادہ لوگ یہاں آتے رہیں گے اور بہت کم لوگ واپس جائیں گے۔ یہ آواگون تو لگا ہی رہے گا۔

روزی : اوہ تو مائی ڈیئر انجمن۔ اگر ہم یہ سینی ٹوریم بنا سکتے ہیں تو ہم اس بیماری کی جڑ بھی کھود کر پھینک سکتے ہیں جس کے لیے یہ بنایا گیا ہے۔

(برآمدے میں سے ایک عورت کی آواز)

آواز : روزی سسٹر۔ روزی سسٹر (روزی پلٹ کر برآمدے کی طرف دیکھتی ہے) ڈاکٹر ممتاز تم کو جلدی سے وارڈ نمبر 4 میں بلا رہے ہیں۔

روزی : (کھڑی ہوکر) اچھا۔

انجمن : (کس قدر خوف زدہ لہجے میں) کیا بات ہے روزی سسٹر۔

روزی : کوئی خاص بات نہیں۔ ذرا اقبال کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

انجمن : مگر کل تک تو

روزی : (سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے) معمولی بخار ہوگیا ہے اور کوئی خاص بات نہیں۔
(روزی چلی جاتی ہے۔ انجمن خاموش بیٹھی رہتی ہے مگر چہرے سے ایک خوف کا احساس ہوتا ہے۔ جسونت سیڑھیوں سے اترتا ہوا آتا ہے اور انجمن کو دیکھ کر)

جسونت : ہلو انجمن آرا بیگم

انجمن : ہلو مسٹر جسونت

جسونت : (ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے) دھوپ کھائی جارہی ہے۔
(جیب سے سگریٹ نکال کر منہ میں لیتا ہے)

انجمن : کل آپ چلے جائیں گے۔

جسونت : اور میں سیدھا مندر جاکر تم لوگوں کے لیے پرارتھنا کروں گا کہ تم لوگ بھی میرے پاس جلد آجاؤ۔ تم لوگوں کی یاد بہت ستائے گی۔ میں اس سینی ٹوریم سے باہر اداس اداس محسوس کروں گا۔

انجمن : اداس اداس! (جسونت سگریٹ جلاتا ہے۔ انجمن اس کے منہ سے سگریٹ نکال کر لان پر پھینکتے ہوئے مسکرا کر) سگریٹ پینا منع ہے۔

جسونت : (ہنس کر) ڈاکٹر نے مجھے ایک دو سگریٹ پینے کی اجازت دے دی ہے۔
(جسونت سامنے میز پر رکھے ہوئے سوئٹر کو اٹھا کر دیکھتا ہے۔ انجمن مسکرا کر)

انجمن : یہ آپ کے لیے ہے۔

جسونت : میرے لیے!

انجمن : جی ہاں۔ ظلی نے آپ کے لیے خریدا ہے۔

جسونت : ظلی بہت فضول خرچ ہے۔ بھلا اس کی کیا ضرورت ہے۔

انجمن : جب وہاں سے آئے تو آپ کفایت شعاری سکھا دیجیے گا مگر خدا را ایسا نہ

کیجیے گا کہ وہ کنجوس ہوجائے۔

جسونت : (انجمن کا چہرہ دیکھ کر) جی— کیا مطلب؟

انجمن : (مسکرا کر) یہی کہ جب میں آپ کے یہاں آیا کروں تو خاطر مدارات پوری ہو کہیں کفایت شعاری کنجوسی تک نہ پہنچ جائے۔

جسونت : انجمن آرا بیگم! آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں۔ آپ کی باتیں سن کر کہیں میں—

انجمن : (بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے) اچھا تو اب آپ بھی ہنسنے لگے ہیں۔ اچھا سچ بتلائیے کیا اس نے کسی اور کے فیرویل پر کبھی گانا گایا ہے (جسونت خاموش رہتا ہے) کیا آپ کے دل میں ٹلنی کے لیے جگہ نہیں ہے؟

جسونت : خالی دل میں جگہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ بھلا ٹلنی—

(ٹلنی سیڑھیوں پر آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ جسونت اسے دیکھ کر خاموش ہوجاتا ہے۔ ٹلنی قریب آکر)

ٹلنی : ارے انجمن ڈاکٹر صاحب چیک اَپ کے لیے تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔

انجمن : میرا—

ٹلنی : ہاں — (مسکرا کر) کہہ رہے تھے کہ ایک مہینے کے اندر اندر آپ لوگوں کو انجمن کا بھی فیرویل جلسہ کرنا ہوگا۔

انجمن : میرا— (پھیکی مسکراہٹ سے) ڈاکٹر صاحب بہت ہی مہربان ہیں (کھڑی ہوکر) ایک مہینہ کس نے دیکھا ہے۔

ٹلنی : پھر وہی۔ جانے تمھیں ناامیدی کی باتیں کرنے میں کیا مزا آتا ہے۔

انجمن : اور مسٹر اقبال کے لیے تو صرف آٹھ ہی دن بتلائے تھے مگر—

ٹلنی : مگر مسٹر اقبال کو کیا ہوا۔

انجمن : (سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے) آج پھر انھیں بخار ہوگیا ہے۔ ابھی روزی سسٹر نے بتلایا۔

(سیڑھیوں پر چڑھتی ہوئی عمارت میں غائب ہوجاتی ہے۔ ٹلنی عجیب انداز سے

انجمن کو عمارت میں غائب ہوتے دیکھتی رہتی ہے۔ جسونت نلنی کو دیکھ کر)

جسونت : اس طرح آپ کیا دیکھ رہی ہیں۔

نلنی : کچھ نہیں۔۔۔ بعض وقت کچھ عجیب سا احساس ہوتا ہے (جسونت غور سے نلنی کو دیکھتا ہے) ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس عظیم عمارت کے سامنے ہماری کوئی ہستی نہ ہو۔ انسان اس میں اس طرح کھو جاتا ہے جیسے اسے اس نے نگل لیا ہو۔

جسونت : (بات ٹالنے کے انداز میں) یہ انجمن آرا بیگم بھی کس قدر دلچسپ ہیں۔ دوسروں کو خوش رکھنے میں خوشی محسوس کرتی ہیں۔

نلنی : اور اس کا بھائی خالد تو اور بھی خوش مزاج ہے اور ہمدرد۔ ابھی گئے اتوار کو بابو رام یہاں سے رخصت ہوا تو وہ کس قدر خوش تھا۔

جسونت : بالکل یہ معلوم ہوتا تھا جیسے بابو رام اس کا سگا بھائی ہو۔ اپنی گاڑی میں اسے گھر پہنچانے گیا اور گاڑی کو بھی دلہن کی طرح سجائی۔ کافی روپیہ صرف اس لیے خرچ کر دیا کہ ایک غریب آدمی بھی خوش ہو سکے۔

نلنی : اس کے لیے پھل تو روز ہی لاتا تھا اکثر تحفے بھی لا کر دیتا تھا۔ شاید بابو رام کے کوئی نہ تھا۔

جسونت : صرف ایک بوڑھی ماں ہے اور وہ بھی محنت مزدوری کرتی ہے۔

نلنی : (کچھ دیر خاموش رہ کر) کل تو آپ کی ماتا جی بھی بہت خوش تھیں۔

جسونت : ان کی دعاؤں کی برکت ہے کہ میں کل یہاں سے رخصت ہو جاؤں گا۔ (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) میرے یہاں سے جانے کے بعد آپ مجھے یاد بھی رکھیں گی یا نہیں۔

نلنی : کیوں نہیں (مسکرا کر) آپ ہی بھول جائیں تو دوسری بات ہے۔

جسونت : کیسی باتیں کرتی ہیں آپ؟ میں آپ کو کیسے بھول سکتا ہوں (مسکرا کر) میں نے یہاں رہ کر کچھ خواب بھی تو دیکھے ہیں۔

نلنی : یہاں آ کر انسان خواب ہی دیکھتا ہے۔ زندگی کا خواب، موت کا خواب اور

انھیں میں سے کس کی تعبیر سچی ہے کوئی نہیں کہہ سکتا۔

جسونت : مگر ہمیں پرامید رہنا چاہیے۔

طلنی : ان چھ مہینوں میں سیکڑوں بار ہی ہمارے چہرے اداس ہوئے، سیکڑوں ہی بار روزی سسٹر نے اپنے سینے پر کراس کا نشان بنایا۔ سیکڑوں ہی مرتبہ—

جسونت : (بات کاٹ کر) اور سیکڑوں ہی مرتبہ ہم نے ان سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر تالیاں بجائیں۔ جانے والوں کو رخصت کیا۔ ان پر پھول پھینکے۔

طلنی : ہاں ہم نے یہ بھی کیا۔ ہم خوش بھی ہوئے مگر وہ خوشی کتنی عارضی رہی۔ شاید خوشی عارضی ہوتی ہے۔

جسونت : اور غم بھی عارضی ہوتے ہیں (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) میں ہر روز آپ لوگوں سے ملنے آیا کروں گا۔

طلنی : ابھی آپ کو زیادہ محنت نہیں کرنا چاہیے۔ ہو سکے تو کسی پہاڑی پر چلے جائیے۔

جسونت : (مسکرا کر) ماتا جی تو پہلے مجھے بنارس لے جائیں گی۔ انھوں نے کوئی منّت مانی ہے۔

طلنی : ان کی منت ضرور پوری کیجیے (کچھ دیر خاموش رہ کر) آپ کی ماتا جی کی باتوں میں کتنا سکون ملتا ہے (آنکھوں میں آنسو بھر کر) کاش میری ماتا جی بھی زندہ ہوتیں۔

جسونت : ارے آپ تو رونے لگیں۔ آنسو پونچھ ڈالیے۔ میری ماتا جی تو آپ کو بالکل اپنی بیٹی کی طرح چاہنے لگی ہیں۔

طلنی : (آنسو پونچھ کر) اب ان سے کیا ملاقات ہوگی۔

جسونت : کیوں نہیں۔ میں ہر روز ان کو اپنے ساتھ لایا کروں گا۔

طلنی : لیکن آپ تو بنارس چلے جائیں گے۔

جسونت : ابھی کچھ دن تو جانے میں لگیں گے ہی اور اس وقت تک تو آپ کو بھی چھٹی مل جائے گی۔ آپ ہمارے ساتھ ہی بنارس چلیے گا۔ (طلنی خاموش رہتی ہے

اور سامنے درخت پر پرندوں کو اڑتے ہوئے دیکھنے لگتی ہے۔ جسونت کچھ دیر
خاموش رہ کر) آپ کیا سوچنے لگیں۔

: جی کچھ نہیں۔ میں چھ مہینوں سے ان پرندوں کو روز ہی دیکھتی ہوں کیسے آزاد
اور بےفکر ہوا میں اڑتے رہتے ہیں۔

(جسونت خاموش رہتا ہے کہ انجمن سیڑھیوں پر سے اتر کر آتی ہے اور ایک
کرسی پر بیٹھ جاتی ہے جسونت انجمن کو دیکھ کر)

سونت : چیک اَپ کرالیا آپ نے۔

بمن : جی ہاں۔ (طنزیہ مسکرا کر) ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ اب میں تندرست ہوتی
جارہی ہوں۔

بسونت : (مسکرا کر) آپ کو اس میں شک کیوں ہے۔

انجمن : (پھیکی مسکراہٹ سے) اس لیے کہ ڈاکٹر ہر مریض سے ہر روز صبح صبح ایسا ہی
کہتے ہیں (طنزیہ ہنس کر) اور پھر ان کی کتنی پیشین گوئیاں سچ ہوتی ہیں۔

جسونت : پھر اس میں—

انجمن : (بات کاٹ کر) شاید انھیں جھوٹ بولنے کی ٹریننگ بھی دی جاتی ہے کہ ہر
مریض کو پرامید رکھو۔

جسونت : (ہنس کر) آپ تو خواہ مخواہ ڈاکٹروں پر تنقید کرنے لگیں (موضوع بدلنے کے
انداز میں) آج مسٹر خالد ابھی تک نہیں آئے۔

انجمن : آتے ہی ہوں گے (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) میری وجہ سے اُن کا سارا
کاروبار برباد ہو رہا ہے۔

جسونت : میں نے ان جیسا پرخلوص آدمی آج تک نہیں دیکھا۔ دل کیا ہے ایک اتھاہ
سمندر ہے جس کی گہرائیوں میں محبت کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔

(سیڑھیوں پر سے روزی سسٹر آتی ہوئی دکھائی دیتی اس کا چہرہ اترا ہوا ہے اور
آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑا رہی ہے۔ آہستہ آہستہ آکر ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ تینوں

اسے خوف زدہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ روزی سسٹر آہستہ آہستہ بڑبڑاتی ہے)

روزی : اے گاڈ بلیس ہم۔ (سینے پر کراس کا نشان بناتی ہے) اے گاڈ بلیس ہم۔

انجمن : روزی سسٹر۔ ایک اور کراس۔ روزی سسٹر ایک اور —

روزی : اس نے ڈاکٹروں کو ہرا دیا۔ ڈاکٹر اس کو— ڈاکٹر اس کو— (روزی اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتی ہے) وہ کس قدر پرسکون رہا— کس قدر پرسکون۔

انجمن : کون روزی سسٹر۔ یہ ایک اور کراس کا تحفہ تم نے کس کو دیا ہے۔

روزی : اقبال— وہ— وہ—

(آواز روندھ جاتی ہے اور روزی خاموش ہو جاتی ہے۔ نلنی ایک دم)

نلنی : اقبال— تو وہ— تو وہ— (ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ چند سیکنڈ بعد) اس کا تو دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ وہ کس قدر تنہا تھا بالکل اکیلا۔

جسونت : نلنی— نلنی— تم

نلنی : اس سے کبھی کوئی ملنے تک نہیں آیا (ہچکیوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے) کس قدر گمبھیر اور پرسکون رہتا تھا۔

روزی : نلنی— بیٹی نلنی— تم—

نلنی : اس نے کبھی کسی کو دکھ نہیں دیا۔ اس نے کبھی کسی سے کوئی خواہش نہیں کی۔ سوائے میرے۔

انجمن : سوائے تمھارے۔

نلنی : ہاں انجمن سوائے میرے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ جسونت کے فیرویل پر میں ایک گیت گاؤں اور میں نے مان لیا مگر— مگر یہ خواہش اپنے ہی دل میں لے کر چلا گیا۔ اب میں گیت نہیں گاؤں گی۔ کبھی نہیں گاؤں گی۔

(ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ ماحول ایک دم اداس ہو جاتا ہے)

(پردہ)

(غیر مطبوعہ)

جوتا

کردار

(1) سنجیدہ (2) فوزیہ (3) تبسم (4) گلشن (5) اسما (6) انور (7) نظر (8) شیخو (9) وکیل (10) پروفیسر (11) چچا (12) چور و پولیس

پہلا سین

منظر

(ایک کمرہ۔ شیخو کمرے میں جھاڑو لگا رہا ہے۔ گلشن کپڑے سے فرنیچر صاف کر رہی ہے۔ پھر ایک کونے کی طرف اشارہ کر کے شیخو سے)

گلشن : ارے دیکھو تو یہ جھاڑو لگائی ہے۔ دکھائی نہیں دیتا کیا۔

شیخو : مجھے تو تیرے علاوہ اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اس وقت بھی تیرے ہی خواب دیکھ رہا تھا۔

گلشن : خواب

شیخو : ہاں۔ مجھے بچپن سے خواب دیکھنے کا شوق ہے۔

گلشن : اچھا...

شیخو : سچ مچ گلشن۔ میں اپنے ان خوابوں ہی کے سہارے زندہ ہوں۔

گلشن : آنکھیں بند کر کے سوتا ہوگا۔

شیخو : ہاں۔ دونوں آنکھیں بند کر کے۔

گلشن : آنکھیں کھول کر سویا کر پھر خواب نہیں دیکھیں گے۔

شیخو : پھر تو بھی خواب میں نہیں آئے گی۔

گلشن : ہاں۔ میں بھی نہیں آؤں گی۔

شیخو : پھر کوئی دوسری لڑکی آنے لگے گی۔

گلشن : آنے دے۔

شیخو : مگر میں تو صرف تجھے خواب میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ خدا کے لیے خواب میں آنے کا وعدہ کر لے۔

گلشن : اچھا تو خوشامد کر رہا ہے تو مہینے میں ایک بار آجایا کروں گی۔

شیخو : مہینے میں صرف ایک بار۔

گلشن : وہ بھی زیادہ ہے اور ہاں وعدہ کرو کہ خواب میں چھیڑ چھاڑ نہیں کرے گا۔

شیخو : کان پکڑ کے وعدہ کرتا ہوں۔

گلشن : تو وعدہ کر رہا ہے تو مہینے میں دوبار آجایا کروں گی۔

شیخو : نہیں نہیں ایسا نہ کر۔ ہر روز آنے کا وعدہ کر لے، جب تو خواب میں آتی ہے تو دل کا کنول کھل اٹھتا ہے (روٹھنے کے انداز میں) مگر تو خواب میں بھی شرارت سے باز نہیں آتی۔

گلشن : خواب میں شرارت! کیسی شرارت؟

شیخو : کل خواب میں دھندلی دھندلی نظر آرہی تھی۔ ذرا صاف نظر آیا کر۔

گلشن : اچھا تو کہتا ہے تو صاف نظر آجایا کروں گی۔ (شیخو دوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتا ہے گلشن پیچھے ہٹ کر) دور سے بات۔ دور سے بات۔

(اسی وقت سنجیدہ بیگم کمرے میں آ کر)

سنجیدہ : ارے کم بختو۔ پھر لیلیٰ مجنوں شروع کردیا۔ تمھیں اتنی بھی غیرت نہیں کہ ابھی گھر سے میت اٹھی ہے لوگ قبرستان تک سے واپس نہیں آئے ہیں۔

— (دونوں پھر اپنے اپنے کام میں لگ جاتے ہیں کہ تبسم ہنستی ہوئی کمرے میں آتی ہے۔ سنجیدہ اِسے غصہ سے دیکھ کر) تبسم! یہ دانت کیوں نکل رہے ہیں۔ کچھ تو شرم کرو تمھارے دادا کی میت ابھی اٹھی ہے۔

تبسم : تو کون سی نئی بات ہوگئی۔ سب کے داداؤں کی میت اُٹھتی ہے۔ اُسّی برس جی لیے بہت ہوگیا۔ کیا قیامت کے بورے سمیٹنے کا ارادہ تھا۔

سنجیدہ : پھر بھی دنیا ہی کے دکھانے کو صورت غمزدہ بنا لو۔ اور پھر یہ دانت نکالنے کا کون سا موقع ہے۔

تبسم : اب ہنسی کی بات ہوگی تو ہنسی آئے گی ہی (شیخو کی طرف دیکھ کر) کیوں جناب شیخو صاحب یہ کیا حرکت تھی۔

شیخو : کون سی حرکت۔

تبسم : تو مولوی صاحب کے پاس سے کیا لایا تھا۔

شیخو : کون سے مولی صاحب۔

تبسم : وہی مولوی قل قل فل فل۔ امی یہ مولوی صاحب سے الائچیاں دم کرا کے لایا تھا کہ جو اِنھیں کھائے اُس پر عاشق ہوجائے۔ بول کسے کھلانے کا ارادہ ہے۔ مجھے یا امی کو۔

سنجیدہ : ارے تو وہ الائچیاں پڑھی ہوئی تھیں؟ ہائے میں مری۔

تبسم : کیا ہوا امی۔

سنجیدہ : ارے کم بخت پہلے کیوں نہیں کہا۔ ان میں سے ایک الائچی میں نے بھی منہ میں ڈال لی تھی۔

تبسم : بس تو بھگتو۔

شینو : (سنجیدہ سے) آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔
سنجیدہ : کیوں نہیں ہوگا۔ وہ مولوی ایک نمبر کا جادوگر ہے۔
شینو : میں کہہ رہا ہوں آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔
سنجیدہ : اگر کچھ ہوگیا تو تیری جان لے لوں گی۔
شینو : لے لینا۔ وہ تو سات دن ایک ایک کر کے کھانے کی تھیں۔
گلشن : اچھا تو کل اتنی محبت سے مجھے وہ الائچی اسی لیے کھلائی جا رہی تھی۔ (روٹھنے کے انداز میں) اب میں تیرے خواب میں نہیں آؤں گی۔
نو : میں تو لٹ گیا۔ ایک الائچی کم ہوگئی۔
گلشن : جب ہی تو میں سوچتی تھی کہ میرا دل اس کی طرف کیوں کھنچ رہا ہے۔بیگم صاحبہ آپ کا دل تو نہیں کھنچ رہا۔
سنجیدہ : مجھے سنبھالو۔ مجھے چکر آ رہا ہے۔

(سنجیدہ چکراتی ہے۔تبسم انھیں سنبھال لیتی ہے اسی وقت انور اور نظر داخل ہوتے ہیں)

انور : یہ کیا ہو رہا ہے۔
تبسم : امی کو چکر آ رہا ہے۔
نظر : کیا دادا جان کے مرنے کا غم ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ وہ بھی کوئی غم کرنے کی چیز تھے (کچھ دیر رُک کر) ابھی تک وہ کم بخت سالیسٹر نہیں آیا جبکہ اس سے کہا گیا تھا کہ اِسے نو بجے وصیت پڑھنا ہے (گھڑی دیکھ کر) نو بج کر پندرہ منٹ ہوگئے۔
تبسم : ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ آجائے گا۔
نظر : تمھارے نزدیک تو وقت کی کوئی قیمت نہیں۔ میرا وقت بہت قیمتی ہے جانے کیسے وقت نکال کر تو میں بڑے میاں کی میت میں گیا تھا۔ مرتے وقت اور کچھ نہ بنا تو وصیت کر گئے۔ جیسے اگر وہ وصیت نہ کرتے تو ہم جائداد انھیں

ثواب پہنچانے کے لیے خیرات کردیتے۔

تبسم : (ہنس کر) ذرا صبر سے کام لیجیے۔ کیا معلوم انھوں نے ساری جائداد کسی یتیم خانے کسی اپاہج آشرم یا کسی اور ایسے ہی ادارے کے نام لکھ دی ہو۔

نظر : اگر انھوں نے یہ حرکت کی ہوگی تو میں ان کی قبر تک اکھاڑ کر پھینک دوں گا۔

تبسم : امی آپ جا کر الٹی کر لیجیے۔ الائچی باہر اور چکر غائب۔ گلشن امی کو ان کے کمرے میں لے جا۔

(گلشن سنجیدہ کو کمرے کے باہر لے جاتی ہے کہ کال بیل بجتی ہے نظر شیخو کی طرف دیکھ کر)

نظر : شیخو دیکھنا کون ہے اگر وہ منحوس وکیل ہو تو اندر بلا لانا اور اگر کوئی پرسے کو آیا ہو تو کہہ دینا کہ بڑے میاں مر گئے دفن بھی ہو گئے اب پرسے کی ضرورت نہیں۔

انور : نظر کیا بیہودگی ہے، آخر لوگ تعزیت کے لیے آئیں گے۔

نظر : اور ہمارا قیمتی وقت ضائع کر کے ہمیں بور کریں گے۔ جا بے شیخو دیکھ کون ہے

(شیخو باہر چلا جاتا ہے کچھ دیر بعد وکیل کے ساتھ کمرے میں آتا ہے وکیل کے ہاتھ میں بریف کیس ہے۔ سب کو بے حد خلوص سے سلام کرتا ہے)

نظر : (گھڑی دیکھ کر) جناب آپ پورے سترہ منٹ تیرہ سیکنڈ دیر سے پہنچے آپ کو ہماری بے چینی کا احساس ہونا چاہیے تھا۔

وکیل : مجھے دیر سے آنے کا افسوس ہے۔ ویسے میں دیر آید درست آید کا قائل ہوں۔

نظر : آپ کس کس بات کے قائل ہیں ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے ہمیں صرف بڑے میاں کی وصیت سے دلچسپی ہے۔

وکیل : خیر خیر وہ بھی پڑھی جائے گی۔ کیا خاندان کے سب لوگ موجود ہیں (اِدھر اُدھر دیکھ کر) بیگم صاحبہ کہاں ہیں۔

نظر : آپ وصیت پڑھ کر سنا دیجیے۔ ہم انھیں بتلا دیں گے۔

وکیل : جی نہیں یہ اصول کے خلاف ہے۔

نظر : جی ہاں سترہ منٹ تیرہ سیکنڈ لیٹ ہوجانا اصول کے مطابق ہے (شیخو سے) جا
بے امی کو بلا لا۔ (شیخو جاتا ہے)

وکیل : جناب آپ کو طعنہ دینے کا حق نہیں۔ آپ کو کیا معلوم میں کن کن دشواریوں
کے بعد یہاں پہنچا ہوں۔ کافی عرصہ تک میں سڑک پر سواری کے انتظار میں
کھڑا رہا۔

نظر : اور آپ کو سواری نہیں ملی اور آپ تخ تخ کرتے چلے آرہے ہیں۔

وکیل : جی نہیں ملی۔ ایک اسکوٹر رکشا ملی۔ جب ڈرائیور نے میٹر ڈاؤن کر کے چلایا
تو مجھے شک ہوا کہ میٹر صحیح ورک نہیں کر رہا ہے میں اسے ناپ تول کے دفتر
لے گیا۔

نظر : بند کیجیے یہ بکواس ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔

وکیل : آپ کو دلچسپی لینا ہوگی آپ مجھ پر لیٹ ہونے کا الزام لگائیں اور میں چپ
رہوں ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ میٹر چیک کروایا۔

نظر : اور پھر آپ اسپتال گئے ہوں گے۔

وکیل : اسپتال کیوں۔

نظر : تاکہ آپ ڈرائیور کا میڈیکل چیک اَپ کرالیں کہ وہ صحت مند ہے اور آٹو
رکشا چلا سکتا ہے۔

وکیل : جی نہیں وہ کافی صحت مند تھا اور ایکسیڈنٹ کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا تھا۔
جی تو میں عرض کر رہا تھا کہ میٹر چیک کرایا۔ کلرک کو کچھ رشوت بھی دینا پڑی۔

نظر : خدا کے لیے مختصر کیجیے۔

وکیل : میں مختصر عرض نہیں کر رہا تو کیا داستان امیر حمزہ سنا رہا ہوں۔ ہاں جناب تو
عرض کر رہا تھا کہ رشوت دے کر میٹر چیک کرایا۔ وہ قریب قریب درست تھا۔

نظر : چلیے قصہ ختم ہوگیا۔

وکیل : کہاں ختم ہوگیا۔ وہ کم بخت ناپ تول کے دفتر تک کرایہ مانگنے لگا۔ بحث

مباحثہ کے بعد مار پیٹ تک کی نوبت آ گئی۔

تبسم : (ہنس کر) اور اس نے آپ کی پٹائی کر دی۔

وکیل : ضرور پٹائی کر دیتا وہ تو کچھ بھلے لوگوں نے بیچ بچاؤ کر دیا اور مجھ سے کرایہ ادا کرا دیا۔

(سنجیدہ اور شینو آتے ہیں)

نظر : بس اب اپنی داستان بند کیجیے۔

وکیل : (بے حد ادب سے سنجیدہ کو سلام کر کے) آپ کی صحت۔

تبسم : (ہنس کر بات کاٹ کر) کافی اچھی ہے بلکہ موسم بھی اچھا ہے اور اچھے موسم کی پیشن گوئی بھی کی گئی ہے۔

نظر : بس اب آپ اپنا کام شروع کیجیے۔

وکیل : حضرت اتنے اتاولے ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ انتہائی بدتہذیبی کی بات ہے کہ ایک خاتون کی صحت اور موسم کی رسی گفتگو کرنے سے پہلے قانونی اور غیر شاعرانہ کام شروع کیا جائے۔ انسان کو کم از کم تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیے۔

نظر : جناب ہم ایسی ہزاروں نصیحتیں داداجان اور والد صاحب سے سن چکے ہیں۔

وکیل : واہ آپ کے والد کیا شاندار مرد تھے اور آپ لوگ۔ لاحول ولا قوۃ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ان کی اولاد ہی نہ ہوں۔

سنجیدہ : بیہودگی نہیں— اپنا کام کیجیے۔

وکیل : جی ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ وہ بے حد مہذب لوگ تھے یہاں تک کہ اپنے جوتوں پر روز پالش کرتے تھے۔ خدا انھیں جنت نصیب کرے۔

نظر : انھیں جنت ملے گی یا دوزخ ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔

وکیل : آپ کے دادا مرحوم میرے عزیز ترین دوستوں میں سے تھے۔ میں ان کے نام کے ساتھ دوزخ کا ذکر برداشت نہیں کر سکتا۔

شیخو : اور میں بھی براشت نہیں کرسکتا۔

نظر : تو آپ دونوں اللہ میاں کے یہاں جاکر ان کے لیے جنت کی بھیک مانگیے۔

وکیل : جب اللہ میاں کے یہاں جاؤں گا تو ان کے لیے جنت کی وکالت ضرور کروں گا— اچھا خاندان کے سب لوگ آگئے۔

نظر : جی ہاں آگئے۔

(وکیل کرسی پر بیٹھ کر بریف کیس کھولتا ہے پھر ایک دم اسے بند کرکے)

وکیل : آپ کے یہاں ایک جوان لڑکی اور بھی تھی وہ کہاں ہے۔

سنجیدہ : وہ نوکرانی ہے اس کی موجودگی ضروری نہیں۔

وکیل : بالکل ہے۔ ممکن ہے جائداد کا کچھ حصہ یا پوری جائداد اُسی کے نام لکھ دی ہو۔

نظر : یہ نہیں ہوسکتا۔

وکیل : ہوسکتا ہے، اخباروں میں آپ روز پڑھتے ہوں گے کہ لوگ اپنی جائداد کتے بلیوں کے نام لکھ جاتے ہیں۔

تبسم : مگر دادا حضور اس قدر احمق نہیں ہوسکتے۔

وکیل : ہوسکتے ہیں۔ دنیا میں احمقوں کی کمی نہیں ہے۔ بہرحال اس کا یہاں ہونا ضروری ہے۔

نظر : (اُکتا کر) جا بے شیخو گلشن کو بلا لا۔

شیخو : میرا بھی یہاں رہنا ضروری ہے۔

نظر : آپ کا۔

شیخو : جی ہاں۔ میں نے ان کی بہت خدمت کی ہے۔ میں ان کے لیے وضو کا پانی رکھتا تھا اور مصلّیٰ بچھاتا تھا۔

نظر : ابے یہ ثواب کا کام تھا۔ تجھے ثواب مل گیا ہوگا۔

شیخو : ثواب کا حساب کتاب تو اللہ میاں کے یہاں جانے پر ہوگا۔ دنیا میں بھی تو کچھ ملنا چاہیے مجھے کچھ نہ کچھ ضرور دیا ہوگا۔

نظر : اچھا اچھا ابھی تو جا کر گلشن کو بلا لا۔

شیخو : میں یہیں سے آواز دے لیتا ہوں (وکیل کی طرف اشارہ کرکے) ان کا کیا بھروسہ کب وصیت پڑھ دیں (اونچی آواز سے) گلشن۔ ارے بی بی گلشن (کچھ دیر بعد گلشن آتی ہے)

نظر : (ایک کرسی کی طرف اشارہ کر) بیٹھو۔ (گلشن گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھتی ہے) میں تم سے کہہ رہا ہوں۔ میں نوکر اور مالک میں فرق نہیں کرتا (گلشن سکڑ کر خالی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

وکیل : ہاں اب ٹھیک ہے۔

(وکیل پھر اپنا بریف کیس کھولتا ہے۔ شیخو ادھر اُدھر دیکھتا ہے کوئی کرسی خالی نہیں۔

شیخو : ذرا ٹھہریے۔ (تیزی سے دوسرے کمرے میں جاتا ہے اور ایک شاندار کرسی لاکر اس پر بیٹھ کر) اب ٹھیک ہے۔ ہاں شروع کیجیے۔

سنجیدہ : ارے کم بخت یہ کرسی کیوں اٹھا لایا۔

شیخو : اس سے اچھی اور کرسی نہیں تھی۔

سنجیدہ : یہ میرے سسر کی کرسی ہے وہ اس پر بیٹھ کر اخبار پڑھا کرتے تھے۔

شیخو : اور میں اس پر بیٹھ کر وصیت سنوں گا۔

وکیل : ٹھیک ہے ٹھیک ہے اب وقت ضائع نہ کیجیے۔ میرا وقت بہت قیمتی ہے (بریف کیس میں سے ایک لفافہ نکال کر) یہ ہے وصیت عرصہ تک یہ بینک لاکر میں رکھی رہی۔

سنجیدہ : بینک لاکر میں۔

وکیل : جی ہاں۔ انھوں نے کئی بینکوں میں لاکر لے رکھے تھے۔

نظر : دیکھا کس قدر چالاک تھے۔ ہمیں اس کی ہوا تک نہ دی۔

وکیل : خدا کے لیے انھیں چالاک نہ کہیے۔ بے حد معصوم بزرگ تھے ہر روز اپنے ناخن کاٹتے تھے۔ بھلا وہ کیسے چالاک ہو سکتے تھے۔ جب بھی ان کا خیال آتا

ہے جی چاہتا ہے کہ ان کی یاد میں دو چار آنسو ضرور بہاؤں کیا آپ مجھے دو چار آنسو بہانے کی اجازت دیں گے۔ صرف چند منٹوں میں بہا لوں گا۔

نظر : جی نہیں یہ موقع آنسو بہانے کا نہیں ہے۔

وکیل : ٹھیک ہے میں گھر جا کر بہا لوں گا۔ جی تو میں عرض کر رہا تھا کہ یہ وصیت بینک لاکر میں رکھی تھی۔ چند دن قبل انھوں نے وہاں سے نکال کر میری سیف میں رکھوا دی گویا انھیں اپنی موت کا پہلے ہی علم ہو گیا تھا خدا را مجھے ان کی یاد میں دو چار آنسو بہانے کی اجازت دے دیجیے۔

نظر : پہلے آپ وصیت پڑھ کر سُنا دیجیے۔ پھر تمام زندگی آنسو بہاتے رہیے گا۔

وکیل : آپ میری خواہش کا خون کر رہے ہیں (آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر) اے خدا تو گواہ رہنا کہ میں ان کی یاد میں آنسو بہا کر دوستی کا حق ادا کرنا چاہتا تھا لیکن ان لوگوں نے اجازت نہیں دی۔

نظر : آپ وصیت پڑھتے ہیں یا یونہی خدا کے سامنے گڑگڑاتے رہیں گے۔

وکیل: پڑھتا ہوں جناب۔ پڑھتا ہوں (لفافہ سنجیدہ کے ہاتھ میں دے کر) آپ لوگ دیکھ لیجیے یہ سیل بند ہے (نظر لفافہ سنجیدہ کے ہاتھ سے لے کر دیکھتا ہے اور پھر وکیل کو دیتا ہے) اس پر آپ کے دادا حضور کی مہر ہے تو میں عرض۔

نظر : اگر آپ نے کچھ عرض کیا تو ہمارے ہارٹ فیل ہو جائیں گے۔

وکیل : میں اسی امکان کے بارے میں عرض کر رہا تھا۔ ذرا اپنے پر قابو رکھیے گا۔ زیادہ خوشی اور غم سے اکثر ہارٹ فیل ہو جاتے ہیں۔

(کوئی چیز بریف کیس میں تلاش کرتا ہے)

نظر : اب کیا ہوا۔

وکیل : پیپر کٹر تلاش کر رہا ہوں۔ جانے کہاں گیا۔ میری بیوی انتہائی لاپرواہ ہوتی جا رہی ہے۔ شاید رکھنا بھول گئی آپ کے پاس پیپر کٹر ہے۔

نظر : ویسے ہی پھاڑ لیجیے۔

بیل : جی نہیں انتہائی بدسلیقہ لوگ لفافے پھاڑا کرتے ہیں۔ مہذب لوگوں کا یہ شیوہ نہیں ہے لفافے پھاڑنے کا رواج صرف جاہل لوگوں میں ہے۔

نظر : آپ ہم کو جاہل لوگ سمجھتے ہیں۔

وکیل : میں اصولی بات عرض کررہا ہوں (ایک پیاز کاٹنے کی چھری نکال کر) دیکھیے مل گیا۔

تبسم : (ہنس کر) یہ پیپر کٹر ہے۔

وکیل : جی نہیں پھاوڑا ہے۔ میں نے اپنی بیوی کے بارے میں غلط رائے قائم کرلی تھی۔ حالانکہ وہ انتہائی سمجھ دار اور موقع شناس عورت ہے یہاں تک کہ اس نے میرے لیے ایک بچہ بھی پیدا کیا ہے۔

انور : (اخبار منہ کے سامنے سے ہٹا کر) آپ سے اجازت لے لی تھی۔

وکیل : (انور کی طرف دیکھ کر) جی ہاں (انور پھر اخبار پڑھنے لگتا ہے) بہت خوبصورت اور پیارا بچہ ہے۔ آپ لوگ اس سے مل کر خوش ہوں گے۔

نظر : ہم تو آپ سے ہی مل کر نہال ہوئے جارہے ہیں۔

وکیل : شکریہ تو اب میں لفافہ کھولتا ہوں (پیپر کٹر سونگھ کر) آج پھر میری بیوی نے اس سے پیاز کاٹی ہے۔ خیر اس سلسلے میں اس کی خبر لوں گا۔ (بڑا لفافہ کاٹتا ہے۔ اس میں سے تین لفافے نکلتے ہیں)

نظر : تین لفافے کیا سب کے لیے الگ الگ وصیت کی ہے۔

وکیل : ذرا دیکھیے میری عینک تو ٹیڑھی نہیں ہوئی۔

تبسم : عینک ٹیڑھی۔

وکیل : جی ہاں۔ جب میں بہت زیادہ اکسائیٹڈ ہوتا ہوں تو میری عینک ٹیڑھی ہوجاتی ہے۔

تبسم : (ہنس کر) لیکن آپ کی ناک پر عینک ہے کہاں جو ٹیڑھی ہوگی۔

وکیل : نہیں ہے (ناک ٹٹول کر) سچ مچ نہیں ہے (جیب میں سے عینک نکالتے

ہوئے) جب

نظر : اچھا تو عینک لگا کر آپ

وکیل : میں کم بولنے کی وجہ سے اکثر مقدمے ہار جاتا ہوں۔ (تینوں لفافوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ کر ایک لفافہ الگ کرکے) اس پر لکھا ہے۔ ہے کہ پہلے یہ لفافہ کھولا جائے ــــ اگر اجازت ہو تو کھولوں۔

نظر : جواب نہیں تھا دادا حضور۔ آخر یہ ناٹک کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کھولیے صاحب کھولیے۔

وکیل : انھوں نے یکایک غم یا خوشی کو نظر انداز نہیں کیا آپ لوگ ان کے لیے میرے ذاتی خلوص کے اظہار کا بھی موقع نہیں دے رہے کہ میں ان کی یاد میں دو چار آنسو بہا لوں خیر میں گھر جاکر بہا لوں گا۔ (لفافہ کھول کر اس میں سے کاغذ نکال کر پڑھتا ہے) میرے نالائق بیٹے کے میرے عزیز بچو۔ (سب کی طرف دیکھ کر) اپنے بیٹے کو نالائق اور آپ کو عزیز بچو کہا ہے۔ مبارک ہو۔ کیا خیال ہے آپ کا۔

نظر : ہمارا کچھ خیال نہیں۔ آپ آگے پڑھیے۔

وکیل : کوئی خیال نہیں! آپ کی مرضی۔ (آگے پڑھتا ہے) میں وصیت لکھنے سے پہلے تم لوگوں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں۔ (سب کی طرف دیکھ کر) خدا بخشے بے حد سمجھ دار تھے۔ سمجھے اب انھوں نے ایسا کیا۔

نظر : جی ہاں سمجھ گئے۔ کیا آپ کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ آپ ہر جملہ پر اپنے کمینٹس بھی دیں۔ آپ آگے پڑھیے۔

وکیل : جی ہاں پڑھتا ہوں (پڑھتا ہے) انور۔ تم اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے ہو اس لیے سب سے پہلے میں تم سے مخاطب ہوں۔ (انور کی طرف دیکھ کر) جناب اخبار پھر پڑھ لیجیے گا۔ میرے عزیز دوست آپ سے مخاطب ہیں۔

انور : (اخبار منہ پر سے ہٹا کر) آپ پڑھیے میں سن رہا ہوں۔

(اخبار پھر منہ کے سامنے کر لیتا ہے)

(پڑھتا ہے) تم بہت کم گو ہو مگر تمھاری خاموشی طوفانی ہوتی ہے (سب کی طرف دیکھ کر) خاموشی اور طوفانی! شاید وہ لکھنا چاہتے تھے کہ تمھاری خاموشی طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے آپ لوگوں کا کیا خیال ہے (سب خاموش رہتے ہیں) شاید آپ لوگوں کا کچھ خیال نہیں۔ (پڑھتا ہے) تم نے اسمگلنگ اور چور بازاری سے بہت روپیہ کمایا ہے۔

انور : (غصہ سے کھڑا ہو کر) غلط ہے۔ یہ والد صاحب کا کاروبار تھا۔ میں تو صرف ان کا بزنس پارٹنر تھا۔

نظر : اور آپ اب اس سارے کاروبار پر قبضہ کر چکے ہیں (وکیل کی طرف دیکھ کر) آپ آگے پڑھیے اس کا حساب کتاب بعد میں ہوگا۔

انور : وہ دادا حضور کی جائداد نہیں ہے جس کا بٹوارہ ہو۔ سب میں نے جان ہتھیلی پر رکھ کر کمایا ہے۔

وکیل : ذرا پرسکون رہیے ذرا پرسکون رہیے۔ پہلے وصیت سن لیجیے پھر جھگڑا کیجیے گا۔ (پڑھتا ہے) تم پیسے کو دانتوں سے پکڑنا جانتے ہو اور کنجوس مکھی چوس کی کہاوت تم پر صادق آتی ہے (تبسم ہنستی ہے) یہ ہنسنے کا موقع نہیں ہے۔

تبسم : تو کیا رونے کا موقع ہے۔ مجھے ہنسی آئے گی تو میں ضرور ہنسوں گی۔ آپ میرے ہنسنے پر پابندی نہیں لگا سکتے۔

نظر : ہنسنے دیجیے۔ آپ آگے پڑھیے۔

وکیل : (پڑھتا ہے) تمھاری سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ تم لنگوٹ کے کمزور ہو۔

تبسم : خیر یہ کوئی ایسی بات نہیں جسے وصیت میں لکھا جائے یہ بات ہمیں پہلے ہی سے معلوم تھی۔

وکیل : آپ لوگ بیچ بیچ میں بول کر میرا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ میں بے حد مصروف آدمی ہوں (پڑھتا ہے) انور میری وصیت ہے کہ اپنے کیریکٹر پر

دھیان دو۔

نظر : (ہنس کر) لیجیے انور بھائی آپ کو آپ کا حصہ مل گیا۔ مبارک ہو۔

وکیل : مبارک باد پھر دیتے رہیے گا۔ پہلے وصیت سن لیجیے (پڑھتا ہے) (نظر اب میں تم سے مخاطب ہوں (نظر مسکراتا ہے۔ وکیل پڑھتا ہے) تم انتہائی بدتمیز، بے ہودہ اور خود غرض ہو۔ تم بزرگوں کا احترام نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ تم نے کبھی اپنے باپ کو باپ نہیں سمجھا بلکہ اسے گھٹیا سمجھتے رہے۔

نظر : وہ تھے ہی گھٹیا انھیں تو باپ کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔

وکیل : جناب شرم بعد میں کیجیے گا۔ (پڑھتا ہے) تم اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے گدھے کو بھی باپ بنا لیتے ہو۔ اور اپنے آپ کو بڑا شاعر سمجھتے ہو۔

نظر : کیا میں بڑا شاعر نہیں ہوں۔

وکیل : (برا سا منہ بنا کر نظر کو دیکھتا ہے اور آگے پڑھتا ہے) تمھارا املا اور انشا دونوں غلط ہوتے ہیں۔

نظر : یہ بڑے میاں میری ترقی سے جلتے تھے۔

انور : (اخبار منہ پر سے ہٹا کر ہنس کر) تو اپنا انشا اور املا درست کرلو۔

وکیل : آپ لوگ وصیت نہیں سننا چاہتے (پڑھتا ہے) تمھیں میری وصیت ہے کہ بزرگوں کے منہ آنا چھوڑ دو۔

نظر : اِس بڈھے کھونسٹ نے بلا وجہ میرے خلاف زہر اُگلا ہے۔

وکیل : میں مصروف آدمی ہوں۔ خاموشی سے سنیے۔ (پڑھتا ہے) تبسم۔ اب میں تم سے مخاطب ہوں۔ تم اتنی حسین نہیں جتنا خود کو سمجھتی ہو۔

تبسم : ہر لڑکی خود کو حسین سمجھتی ہے۔

وکیل : تم نوجوانوں سے گھل مل کر انھیں فلرٹ کرتی ہو۔

تبسم : یہ ہر لڑکی کا پیدائشی حق ہے۔

وکیل : ذرا خاموش رہ کر سنیے۔ تم ایل ایس ڈی کا استعمال کرتی ہو۔

تبسم : (غصہ سے کھڑی ہوکر) غلط ہے جھوٹ ہے۔ میں نے تجربہ کے طور پر ایک مرتبہ استعمال کی تھی۔ مجھے یہ نشہ بالکل پسند نہیں آیا۔

نظر : مگر تم نے ایل ایس ڈی کا استعمال کیا۔

تبسم : تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ میں نے ایک مرتبہ بھنگ کا بھی تجربہ کیا تھا (برا سا منہ بنا کر) واہیات نشہ ہے۔ ہاں گانجے کی پھکی لگانے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ بلکہ میں آپ سب کو بھی رائے دوں گی۔ کہ آپ بھی شراب چھوڑ کر گانجے کی پھکیاں لگایا کیجیے۔

وکیل : آپ مشورہ پھر دیتی رہیے گا۔ میرا وقت قیمتی ہے اور میں مصروف آدمی ہوں (پڑھتا ہے) تمھارے لیے وصیت ہے کہ کسی نماز روزے کے پابند نوجوان سے شادی کر کے اپنا گھر بسا لو۔

تبسم : لعنت ہے دادا حضور آپ پر۔ میرے لیے کسی اور کو ریکمنڈ نہیں کر سکتے تھے لاحول ولا قوۃ۔

وکیل : آپ لوگ خاموشی سے نہیں سن سکتے (پڑھتا ہے)(اب میں اپنے نالائق بیٹے کی آوارہ بیوی سے مخاطب ہوں۔ تم نے اپنی اولاد کی تربیت پر کبھی توجہ نہیں کی اور اپنے شوہر کی کبھی وفادار نہیں رہیں۔

سنجیدہ : اس میں خود آپ کے صاحب زادے میری حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

وکیل : ذرا سنجیدہ رہیے۔ ذرا سنجیدہ رہیے۔

سنجیدہ : کیوں سنجیدہ رہوں۔ یہ بوڑھا کھونسٹ میری اولاد کے سامنے میری پول کھول رہا ہے اس کی قبر میں کیڑے پڑیں گے۔

نظر : وہ تو ہمیں معلوم ہے آپ خاموش رہیے۔ ہاں آگے پڑھیے۔

وکیل : نوجوان مردوں کو دیکھ کر تمھارے منہ میں اب بھی پانی بھر آتا ہے۔

سنجیدہ : ارے او جہنمی کھونسٹ لعنت ہو تم پر۔

وکیل : (پڑھتا ہے) اب میں گلشن سے مخاطب ہوں۔ (گلشن سر پر دوپٹہ برابر کر کے

بہت ادب سے بیٹھ جاتی ہے) تم ایک دلی لڑکی ہو۔ اپنا دامن اس گھر کے ماحول سے بچائے رکھنا۔ میری دعا ہے کہ تمھاری زندگی کامیاب زندگی ہو اور آخر میں میں اپنے عزیز ترین نوکر شیخو سے مخاطب ہوں۔ (شیخو اس طرح ہاتھ باندھ کر ادب سے کھڑا ہوجاتا ہے جیسے کسی بادشاہ کے دربار میں کھڑا ہو) تم نے میرے بڑھاپے میں میرے عزیزوں سے زیادہ خدمت کی ہے۔ میری دعا ہے کہ تمھارا ایک شاندار مستقبل ہو۔

نظر : تو یہ ہے اس بڈھے کھونسٹ کی وصیت لعنت ہو اس پر۔

وکیل : جی نہیں کچھ اور بھی ہے (پڑھتا ہے) تین دن تک اس پر غور کریں پھر لفافہ نمبر 2 کھولا جائے اور اس پر عمل کیا جائے (لفافے بریف کیس میں رکھ کر) تین دن بعد ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ۔

(دروازے کی طرف جاتا ہے۔ شیخو تیزی سے اس کے سامنے آکر ایک گھٹنا ٹیک کر اور دونوں ہاتھ جوڑ کر)

شیخو : آپ گھر جاکر اپنے عزیز ترین دوست اور میرے پیارے مالک کی یاد میں دو چار آنسو ضرور بہانا بلکہ اپنی بیگم صاحبہ کو بھی اس کار خیر میں شریک کرلینا۔

(پردہ)

دوسرا سین

منظر : وہی کمرہ۔ تیسرے دن۔ گلشن ایک کپڑے سے فرنیچر صاف کررہی ہے کہ شیخو کمرے میں آکر۔

شیخو : لا کپڑا مجھے دے میں صاف کیے دیتا ہوں۔

گلشن : رہنے دے میں خود کرلوں گی۔

شیخو : تو کام کرتی ہوئی اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ بس خواب میں آتی ہوئی اچھی معلوم ہوتی ہے (گلشن کے ہاتھ سے کپڑا لینے کوشش کرتے ہوئے لا مجھے دے۔)

شن : (اسے دھکا دے کر) چل نکل یہاں سے مجھے کام کرنے دے۔

نو : آہا ہاہاہا۔ کل تک تو خواب میں آنے کے وعدے تھے آج دھکے دے کر نکالا جارہا ہے۔

لشن : کل اور بات تھی آج اور بات ہے۔

یخو : آج کیا بات ہوگئی۔

گلشن : بس ہوگئی ایک بات مگر اب تو مجھے ایک نظر نہیں بھاتا۔

شیخو : جب ہی تو تین دن سے خواب میں نہیں آئی۔

گلشن : اور نہ اب کبھی آؤں گی تو مجھ پر جادو ٹونے کرتا ہے اور سن لے میں نے تیری وہ الائچیاں بھی کوڑے میں پھینک دی ہیں۔

شیخو : کوڑے میں پھینک دیں ارے تجھے نہ کھانا تھیں تو نہ کھاتی میں کسی اور کو کھلا دیتا۔ کسی نہ کسی کو تو مجھ سے محبت کرنا پڑے گی۔

(تبسم کمرے میں آتے ہوئے)

تبسم : ارے شیخو ذرا سن تو۔

شیخو : (رونی آواز میں) تبسم بی بی۔ اس نے میری الائچیاں کوڑے میں پھینک دیں۔

گلشن : یہ مجھ پر جادو ٹونے کرتا ہے۔

تبسم : ہاں آج کل تو تجھ پر نظر بھائی اپنے عشق کا جادو جگا رہے ہیں۔ اور تو پھول کر کپا ہوئی جارہی ہے۔ گلشن بی بی نظر بھائی گدھے کو باپ اور گدھی کو ماں بنانے کا فن جانتے ہیں۔ (شیخو سے) تھوڑی دیر اور صبر کرلے۔ ابھی دادا حضور کی وصیت پڑھی جائے گی۔ اگر گلشن بی بی کو کچھ نہ ملا تو نظر بھائی کا عشق گدھے کے سینگ کی طرح غائب ہوجائے گا۔

نظر : (کمرے میں آتے ہوئے) کون غائب ہوجائے گا۔ (تبسم کو دیکھ کر) اور تم کہاں جارہی ہو۔

تبسم : ذرا بیوٹی کارنر تک جارہی ہوں۔

نظر : بیوٹی کارنر تک! کیوں۔ تمھارا کمرہ تو ویسے ہی میکس، فیکٹر کا شو روم بنا ہوا ہے اب اور کیا ضرورت پڑ گئی۔

تبسم : عورتوں کو اور بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اور آپ میرے کمرے کی جاسوسی کیوں کرتے رہتے ہیں۔

(جانے کے لیے مڑتی ہے۔ نظر اسے جاتا ہوا دیکھ کر)

نظر : ابھی وہ منحوس سالیسیٹر آتا ہوگا۔ تمھاری غیر موجودگی میں وہ ہرگز وصیت نہیں پڑھے گا۔

تبسم : میں ابھی دس منٹ میں آجاؤں گی اور ہاں آپ سے ملنے دو لڑکیاں آئی تھیں۔ آپ کی شان میں قصیدے پڑھ رہی تھیں (ہنس کر ان کا قصہ میں ابھی آکر سناؤں گی (ہنستی ہوئی کمرے سے چلی جاتی ہے۔ نظر شیخو کو دیکھ کر)

نظر : کیوں بے تو یہاں کیا کر رہا ہے۔

شیخو : عشق کر رہا ہوں۔

نظر : عشق کر رہا ہے! ابے تجھے معلوم ہے عشق کیسے کیا جاتا ہے۔

(نظر کے سامنے رومیو اسٹائل میں ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر ایک ہاتھ سینہ پہ رکھ کر اور دوسرا پھیلا کر)

شیخو : اس طرح اب آپ ذرا شرما کر مسکراؤ۔

نظر : اس طرح کیا جاتا۔ اور وہ بھی مجھ سے۔ ابے تیرے باپ نے بھی کبھی عشق کیا تھا۔

شیخو : جی ہاں۔ ان کے عشق کی سزا میں دنیا میں آکر بھگت رہا ہوں۔

نظر : پھر تو خاندانی عاشق ہے (کچھ پیسے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ کر) دوڑ کر ایک پیکٹ سگریٹ تو لے آ۔

شیخو : مگر وہ وصیت۔

نظر : تیرے سامنے ہی پڑھی جائے گی۔ ابھی وہ منحوس آیا ہی کہاں ہے (شیخو برا سا منہ بنا کر چلا جاتا ہے۔ نظر گلشن کی طرف دیکھ کر) گلشن تو گاتی تو بہت اچھا ہے۔

گلشن : (شرما کر) آپ کو کیسے معلوم ہوا۔

نظر : کل میں نے چھپ کر سن لیا تھا۔ تو نے گانا کہاں سے سیکھا ہے۔

گلشن : بس سیکھ لیا۔

نظر : تیری آواز دل میں اُتر جاتی ہے سچ مچ ایسی آواز تو آج تک نہیں سنی۔

(تبسم ہنستی ہوئی کمرے میں آتے ہوئے)

تبسم : بس بنگالہ کی مینا کی طرح ہے۔ کیوں بچاری کو سبز باغ دکھا رہے ہو۔

نظر : میں سبز باغ دکھا رہا ہوں۔ تم تو بازار گئی تھیں۔

تبسم : جا رہی تھی مگر گئی نہیں۔ سوچا ناٹک کا یہ سین تو دیکھ ہی لیا جائے۔

نظر : چھپ کر کسی کی ٹوہ لینا انتہائی کمینہ پن ہے۔

تبسم : اور دو عورتوں سے ایک ساتھ عشق لڑانا بڑی شرافت ہے۔

نظر : کیا مطلب۔

تبسم : وہ جو دو عورتیں آئی تھیں نا وہ کچھ ایسی ہی کہانی سنا رہی تھیں۔

نظر : ارے اسما اور فوزیہ ہوں گی۔ میری فین ہیں۔ میری کہانیوں پر جان دیتی ہیں۔

تبسم : اور آپ نے دونوں سے ایک ساتھ عشق شروع کر دیا ہے۔

نظر : ارے نہیں وہ دونوں مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہیں۔

تبسم : اچھا اِنھیں دیکھ کر آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے۔ مگر آپ کی عقل پر رونے کو جی چاہتا ہے۔

نظر : تعجب ہے کہ وہ دونوں پھر آئیں۔ (تبسم سوالیہ نظروں سے نظر کو دیکھتی ہے) میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ جس کی عمر زیادہ ہوگی اسی سے شادی کروں گا۔ بھلا عورت اپنی عمر زیادہ کیوں بتلانے لگی۔

(تبسم قہقہہ مار کر ہنستی ہے کہ اسی وقت انور بہت غصہ میں کمرے میں آکر)

انور : نظر۔ یہ کیا حرکت تھی۔

نظر : کون سی حرکت۔ میں تو بہت سی حرکتیں کرتا رہتا ہوں۔

انور : پولیس کو تم نے کیا اطلاع دی تھی۔

نظر : یہی کہ آپ کے وہ گودام کہاں کہاں ہیں جن میں اسمگلنگ کا سامان بھرا ہوا ہے آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اگر میں کھا نہیں سکتا تو پھینک ضرور دیتا ہوں اور نہ دیجیے میرا حصہ۔

(شیخو دوڑتا ہوا کمرے میں آتا ہے)

شیخو : وہ آرہا ہے۔

تبسم : کون آرہا ہے۔

شیخو : وہی۔ وہی۔ دادا حضور کی وصیت۔

نظر : ابے تو اس قدر چیخ پکار کیوں مچا رکھی ہے اور میرے سگریٹ کا پیکٹ کہاں ہے۔

شیخو : وہ تو میں نہیں لایا (کان میں لگی ہوئی بیڑی نکال کر اسے دے کر) ابھی تو اس سے دل بہلاؤ۔

نظر : کیا بدتمیزی ہے۔

تبسم : (ہنس کر) مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے۔

(شیخو تیزی سے دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے اور کرسی لاکر اس پر اکڑ کر بیٹھ جاتا ہے کہ وکیل آتا ہے۔ نظر اسے دیکھ کر)

نظر : آیئے آیئے۔ ہم آپ ہی کا انتظار کر رہے تھے۔

وکیل : (گھڑی دیکھ کر) میں وقت پر آیا ہوں پھر کیوں انتظار کر رہے تھے۔ جناب میں وقت کا بے حد پابند ہوں۔ اس دن سترہ منٹ لیٹ ہوگیا تھا تو غصہ میں سترہ منٹ اپنی بیوی سے بات نہیں کی تھی۔ (تبسم پر نظر پڑتی ہے) ارے تبسم بی بی آپ کا مزاج تو اچھا ہے۔

نظر : (جلدی سے) جی ہاں بالکل اچھا ہے۔ ان تین دنوں میں امی کو بھی زکام نہیں ہوا۔ گلشن کو صرف ایک چھینک آئی تھی۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر بارش کی پیشن گوئی کی گئی ہے اس وقت حبس ہے۔

وکیل : شکریہ شکریہ۔ آپ نے بڑی زحمت سے بچا لیا۔ ہاں تو میں عرض کر رہا تھا۔

نظر : آپ نے پھر عرض کرنا شروع کر دیا۔ جا بے شینخو امی کو بلا لا (شینخو کوئی دھیان نہیں دیتا) ابے میں تجھ سے کہہ رہا ہوں (اب بھی کوئی دھیان نہیں دیتا۔ نظر اس کے پاس جا کر) کیا انتقال فرما گئے میں آپ سے عرض کر رہا ہوں۔

شینخو : تو زبان سے عرض کرو۔ ہاتھ پاؤں سے کیوں عرض کر رہے ہو۔

نظر : امی کو بلا کے لا۔

شینخو : بنگالے کی مینا سے کہو۔ وہ کس لیے ہے۔

نظر : (گلشن سے) جا تو بلا لا۔ میں اسے دیکھ لوں گا۔ امی نے اس کا دماغ بہت خراب کر دیا ہے۔

شینخو : تو دیکھ لو۔ پورے کا پورا ہوں۔ آدھا یا پون نہیں۔

(گلشن دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے، شینخو بیڑی جلا کر اس کا کش لے کر)

شینخو : سالی جو چیز بدیس کو جاتی ہے مہنگی ہو جاتی ہے۔ اب گانجے کے بھاؤ بڑھ گئے ہیں سالی بیڑی میں مزا ہی نہیں آتا۔

(سب خاموش رہتے ہیں)

وکیل : ابھی تک بیگم صاحبہ تشریف نہیں لائیں۔ میں بے حد مصروف آدمی ہوں۔ ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ۔

نظر : (بات کاٹ کر) جی نہیں۔ آپ کچھ عرض نہیں کر رہے تھے۔

وکیل : اگر نہیں کر رہا تھا تو اب کر رہا ہوں۔ اس دن یہاں سے جانے کے بعد میں نے آپ کے دادا مرحوم یعنی میرے عزیز ترین دوست کی یاد میں چار آنسو بہائے۔

نظر : خدا کے لیے اب دو دو چار چار۔ آنسو بہانا بند کر دیجیے آخر کب تک آپ

آنسو بہاتے رہیں گے۔

وکیل : ذرا سنیے تو عجیب اتفاق ہوا۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ بھی چار آنسو بہائے مگر وہ مصروف تھی۔ اس کا پروگرام پینڈنگ میں ہے۔ آپ مطمئن رہیے وہ بھی دو چار آنسو ضرور بہائے گی۔

(نظر تیزی سے دروازے کے پاس جاکر بلند آواز سے)

نظر : اے خدا کے لیے جلدی آجایئے۔ ورنہ یہ حضرات دو دو چار آنسو بہا کر سارا گھر ہی بہادیں گے (اسی وقت سنجیدہ اور اس کے پیچھے گلشن آتی ہے) خدا کا شکر ہے کہ آپ آگئیں۔

(وکیل پہلے تو جھک کر سنجیدہ کو سلام کرتا ہے پھر اس کا چہرہ غور سے دیکھ کر)

وکیل : بخدا آپ تو تین دن میں ہی بیمار نظر آنے لگیں۔ اس قدر غم کرنا بھی مناسب نہیں ہے آپ کے چہرے پر کس قدر جھریاں اُبھر آئیں ہیں۔

تبسم : وہ اپنی اصل شکل میں ہیں۔ آٹھ دن سے بیوٹی پارلر نہیں گئیں۔ آپ اپنا کام شروع کردیجیے۔

نظر : دیکھیے جناب آپ اب نہ تو آنسو بہائیں گے اور نہ کچھ عرض کریں گے بس جلدی سے وصیت پڑھ کر سنادیں گے۔

وکیل : میں خود مصروف آدمی ہوں وقت برباد کرنا پسند نہیں کرتا۔ ہاں تو میں عرض کررہا تھا۔

نظر : اب آپ کچھ عرض نہیں کریں گے۔

وکیل : ضرور عرض کروں گا۔ آپ پابندی نہیں لگا سکتے۔ عرض ہے کہ

تبسم : لعنت ہے۔

وکیل : آپ کس پر لعنت بھیج رہی ہیں۔

تبسم : اس شخص پر جس نے سب سے پہلے عرض کیا تھا۔

وکیل : وہ بہت مہذب آدمی تھا اور آپ اس پر لعنت بھیج رہی ہیں۔

نظر : آپ وصیت پڑھتے ہیں یا نہیں۔

وکیل : پڑھتا ہوں تو عرض ہے کہ آپ نے پہلے حصہ پر غور کرلیا ہوگا (بریف کیس سے لفافہ نکال کر) ملاحظہ فرمائیے یہ سیل بند ہے (سب لفافہ دیکھتے ہیں) عرض ہے کہ میں اسے کھولتا ہوں۔ گڈ لک ٹو یو آئی (اپنی جیب سے پیاز کاٹنے کی چھری نکال کر) آج پیپر کٹر میں نے جیب ہی میں رکھ لیا تھا (لفافہ کاٹ کر ایک کاغذ نکالتا ہے پھر تیزی سے جیبوں کو ٹٹولتا ہے اور کچھ پریشان نظر آتا ہے)

نظر : عرض ہے کہ اب کیا پریشانی ہے۔

وکیل : میری عینک۔

تبسم : (ہنس کر) وہ آپ کی ناک پر ہے اور ٹیڑھی بھی نہیں ہوئی ہے۔

وکیل : شکریہ۔ شکریہ (پڑھتا ہے) میرے نالائق بیٹے کے اہل خاندان (سب کی طرف دیکھ کر) بار بار نالائق بیٹا لکھا ہے۔ کیا واقعی آپ کے والد بے حد نالائق تھے۔

نظر : جی ہاں بے حد نالائق تھے، مگر آپ سے کم۔

وکیل : جی ہاں۔ جی ہاں (ایک دم چونک کر) آپ نے کچھ میرے متعلق فرمایا تھا۔

نظر : میں نے عرض کیا تھا۔ آپ آگے پڑھیے۔

وکیل : آپ بیچ میں بول کر میرا جوش وخروش ختم کردیتے ہیں (پڑھتا ہے) تم لوگوں نے اپنے بارے میں میری رائے پر غور کرلیا ہوگا۔ (سب کی طرف دیکھ کر) آپ نے غور کرلیا۔ ضرور کرلیا ہوگا۔ (پڑھتا ہے) جیسا کہ تم کو معلوم ہے دورانِ جنگ میں فرانس میں تھا — معلوم ہے نا آپ کو؟

نظر : جی ہاں معلوم ہے۔ آپ آگے پڑھیے۔

وکیل : (پڑھتا ہے) میں ایک عالی شان مکان میں ٹھہرا ہوا تھا۔ (سب کی طرف دیکھ کر) شاید جنگ بند ہوگی ورنہ مکان میں ٹھہرنا کیا معنی۔ انھیں میدانِ

جنگ میں ہونا چاہیے تھا (پڑھتا ہے) یہ ایک قدیم خاندان کا مکان تھا جو جنگ کی افراتفری میں کہیں بھاگ گیا تھا (سب کی طرف دیکھ کر) کوئی جنگ جو خاندان نہ ہوگا ورنہ یوں بھاگ جانا کیا معنی (پڑھتا ہے) ایک کمرے میں کچھ قدیم سامان رکھا تھا جس میں ایک جوڑا جوتے بھی تھے۔

شیخو : کیا وہ نائلون کے تھے۔

وکیل : کیا مطلب۔

شیخو : نائلون کے ہوتے تو کیا کباڑی خرید لیتا۔ کل ہی میں نے اپنی چپلیں بیچی ہیں۔

وکیل : اچھا۔ میرے یہاں بھی کچھ پڑی ہوئی ہیں۔

نظر : آپ بھی بیچ دینا۔ ابھی تو آگے پڑھیے۔

وکیل : ضرور ضرور۔ تو عرض ہے (پڑھتا ہے) وہیں ایک رجسٹر رکھا تھا جس میں اس سامان کے بارے میں معلومات تھیں۔ جوتے کے آگے لکھا تھا۔ نپولین۔

نظر : یعنی نپولین بوناپارٹ۔

وکیل : اس میں صرف نپولین لکھا ہے (پڑھتا ہے) گویا یہ جوتے نپولین کے تھے اس کے آگے لکھا تھا۔ روس اور واٹرلو۔ یعنی روس سے بھاگتے وقت اور واٹرلو میں ہارتے وقت وہ یہی جوتے پہنے تھا۔

نظر : اچھا۔ لیکن وہ جوتے ہیں کہاں۔

وکیل : ذرا صبر کیجیے ان کے بارے میں بھی لکھا ہوگا۔ آپ کے دادا مرحوم اور میرے عزیز دوست۔

تبسم : (ہنس کر) جن کے غم میں آپ چار آنسو بہا چکے ہیں۔

شیخو : اور جن کے غم میں آپ کی بیگم صاحبہ پڈنگ کھا رہی ہیں۔

وکیل : پڈنگ کھا رہی ہیں۔

نظر : ابے پڈنگ نہیں پینڈنگ۔

شیخو : تو پینڈنگ کھا رہی ہوں گی۔

نظر : اچھا اب آگے پڑھیے۔

شیخو : جلدی کیجیے گولی اٹک رہی ہے۔

وکیل : جی ہاں۔ ضرور اٹک رہی ہوگی (پڑھتا ہے) یہ جوتے میں اس کو دیتا ہوں جو انھیں قبول کرلے۔

تبسم : (ہنس کر) جوتے قبول کرلے۔ واہ دادا حضور کمال کردیا آپ نے۔

وکیل : جی ہاں۔ (پڑھتا ہے) لیکن پھر اس کا جائداد میں حصہ نہ ہوگا۔

نظر : لاحول ولاقوۃ۔ جوتے ہیں یا قارون کا خزانہ۔ لیکن وہ جوتے ہیں کہاں۔

وکیل : (پڑھتا ہے) جوتے اسٹیٹ بینک آف انڈیا کے لاکر میں ہیں۔ اب میں اپنے عزیز سالیسٹر سے مخاطب ہوں (سب کی طرف دیکھ کر) یعنی مجھ سے کس قدر محبت سے عزیز سالیسٹر لکھا ہے۔ ایک ایک لفظ سے محبت ٹپک رہی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ۔

شیخو : چار آنسو بہاؤں۔

نظر : آگے پڑھیے۔

وکیل : ان محبت آمیز لفظوں کو دل سن کر بھر آیا۔ خدا تم کو جنت نصیب کرے۔ تم ہر روز اپنی مونچھوں پر تاؤ دیا کرتے تھے (عینک اتار کر شیشے صاف کرتے ہوئے) تم خلوص و محبت کے دیوتا تھے۔ تمھاری پوجا کرنے کو جی چاہتا ہے دل بھر آیا اب مجھ سے نہیں پڑھا جائے گا۔

نظر : پیارے وکیل صاحب تھوڑا اور پڑھ دیجیے۔

وکیل : (مردہ سی آواز میں) پڑھتا ہوں (پڑھتا ہے) اب میں اپنے عزیز سالیسٹر سے مخاطب ہوں جس نے زندگی میں کوئی مقدمہ نہیں جیتا (سب کی طرف دیکھ کر) بس یہیں جھوٹ بول گئے۔ میں نے ایک مقدمہ نہیں جیتا (سب کی طرف دیکھ کر)

تبسم : (ہنس کر) سچ مچ آپ نے ایک مقدمہ نہیں جیتا تھا۔

وکیل : کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔

نظر : اچھا اچھا اب آگے پڑھیے۔

وکیل : (پڑھتا ہے) تم انور اور نظر کو ساتھ لے کر بینک جاؤ گے اور وہاں سے وہ جوتا حاصل کرو گے (سب کی طرف دیکھ کر) دیکھا آپ نے مجھ پر کتنا بھروسہ کرتے تھے (پڑھتا ہے) تین دن کا موقع دو گے کہ یہ تینوں آپس میں طے کرلیں گے کہ جوتا کسے پسند ہے۔ تیسرے دن تیسرا لفافہ کھولا جائے اور اس پر عمل کیا جائے (بریف کیس میں لفافہ رکھ کر) پہلے ہم وہ جوتا حاصل کریں گے (بریف کیس اٹھا کر) اچھا میں چلتا ہوں۔

نظر : لیکن وہ جوتا۔

وکیل : میں ٹھیک ایک بج کر اُنیس منٹ پر بینک میں ملوں گا۔ آپ دونوں ٹھیک وقت پر تشریف لے آیئے گا۔ میں مصروف آدمی ہوں اور جلدی میں ہوں۔ آج میری بیوی ذرا فرصت میں ہے۔ اس لیے۔

تبسم : (لقمہ دیتے ہوئے) انھوں نے چار آنسو بہانے کا پروگرام بنایا ہوگا۔

وکیل : جی ہاں وہ بھی ایک کام ہے۔

(کمرے سے چلا جاتا ہے شیخو کرسی لے کر اور اس کے پیچھے پیچھے گلشن جاتی ہے)

نظر : یہ اس بڈھے کھونسٹ نے وصیت کی ہے یا ہمارے صبر کا امتحان لیا ہے۔ دادا حضور جواب نہیں تھا آپ کے حرامی پن کا۔

سنجیدہ : نظر کیا بدتمیزی ہے۔

نظر : حرامی پن نہیں تو اور کیا ہے۔ وصیت نہ ہوئی معشوق کی آمد ہوگئی کہ سنگھار ہی ختم نہیں ہوتا۔

تبسم : (ہنس کر) اوہ ہو آج تو بڑی شاندار زبان بولی جارہی ہے۔ آیئے امی چلیے اور نظر بھائی آپ بھی صبر کیجیے تین دن بعد معشوق بے نقاب ہوجائے گا۔

(تبسم ہنستی ہوئی سنجیدہ کو ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ نظر

بھی جانے کے لیے اٹھتا ہے کہ انور اسے جاتا دیکھ کر)

: نظر ٹھہرو مجھے تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔

: (آگے بڑھتے ہوئے) مجھے ایک ضروری کام ہے۔

: (نظر کا گریبان پکڑ کر اس کا منہ اپنی طرف کرتے ہوئے) نظر!

: اچھا تو آپ مجھ سے ہاتھا پائی کریں گے۔

: جس گھر میں کتے پلے ہوئے ہوتے ہیں مالک پر بھونکنے کا کام نہیں کرتے جانتے ہو میرا کتنا نقصان ہوا ہے۔

ظر : سنا ہے ساٹھ ستر ہزار کا۔

نور : اس سے بہت زیادہ کا۔

نظر : خیر اس سے زیادہ کا ہوگا۔ ایک اسمگلر کے لیے یہ رقم کچھ زیادہ نہیں، میں تو بیس پچیس ہزار ہی میں مطمئن ہو جاتا۔

انور : اور اِس کے لیے میں تم کو بخشوں گا نہیں (اس کا گریبان چھوڑ کر دروازے کی طرف جاتے ہوئے) شہر کا کون سا چوراہا پسند ہے مجھے بتلا دینا۔

(تیزی سے دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد)

نظر : اور نظر بھی ماں کا دودھ نہیں ہے۔ جسے آپ آسانی سے ہضم کرلیں۔ (دوسرے دروازے کی طرف بڑھتا ہے کہ ایک ہپی ٹائپ لڑکی کمرے میں آکر)

اسما : ہلو ڈیئر۔

نظر : ہلو اسما۔ (غور سے اس کا چہرہ دیکھ کر) حسین چہرہ ستا ہوا ہے کھلے ہوئے بال ہیں۔ پریشاں شگفتگی اس ادا کے صدقے ادھر تو آؤ اداس کیوں ہو۔

اسما : (قریب آتے ہوئے) یہ رات کیسی بے چینی سے گزری کہہ نہیں سکتی۔

نظر : یہ اڑی اڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو تیری صبح کہہ رہی ہے تیری رات کا فسانہ۔ کہو کس کی یاد ستاتی رہی۔

اسما : تمھاری ایک کہانی پڑھ لی تھی خاک سمجھ میں نہیں آئی۔ جانے کیا لکھتے ہو اب

اسی پر رونا آتا رہا اور ہاں وصیت میں تمھیں کیا ملا۔

نظر : ایک جوتا۔

اسما : جوتا لاحول ولا قوۃ۔ تمھارے دادا تو چمار سے بھی گئے گزرے نکلے۔ وہ جوتا نہیں کچھ رقم چھوڑ کر مرتے تو تمھیں کچھ نہیں ملا۔ میں نے سوچا تھا کہ

نظر : کیا سوچا تھا۔

اسما : اگر تمھیں کچھ مل جاتا تو اپنی عمر زیادہ بتلا دیتی۔ مگر اب تو سوچنا پڑے گا۔

(دروازے پر دستک)

نظر : کون ہے۔

آواز : فوزیہ۔

نظر : (گھبرا کر) ارے مرگئے (اسما سے) فوزیہ ہے ذرا تم چھپ جاؤ۔

اسما : کیوں چھپ جاؤں۔ کیا میں اس پر کٹی سے ڈرتی ہوں۔ بلاؤ میں اسے سمجھ لوں گی۔

نظر : مگر جھگڑا۔

اسما : (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) ہاں جھگڑا ابھی کروں گی۔

نظر : ارے ارے کیا کر رہی ہو۔

اسما : اسے بلا رہی ہوں۔ آ جاؤ۔

نظر : اے اللہ مجھے دو بلیوں سے بچا۔

(فوزیہ کمرے میں آئی ایک اچٹتی سی نظر سے اسما پر ڈال کر نظر سے)

فوزیہ : ہلو نظر ڈیر۔ پڑھ لی گئی وصیت تمھیں کیا ملا۔ آج میں نے اسکول کا ریکارڈ نکلوا کر دیکھا تھا۔

نظر : اسکول کا ریکارڈ۔ کیوں۔

فوزیہ : عمر کے بارے میں۔ میری ہی عمر زیادہ ہے۔

اسما : دودھ کے دانت گر گئے یا ابھی کچھ باقی ہیں۔

یہ : تم اپنی عمران کی دادی کے برابر بتلا رہی ہوگی۔

ا : اور تم یہ خبر لائی ہوگی کہ طوفان نوح تمھارے ہی تندور سے شروع ہوا تھا۔

ر : مگر ابھی تو وصیت پڑھی ہی نہیں گئی۔

ما: وہ بھی پڑھ لی جائے گی۔ مگر میں اس سے بھی فیصلہ کروں گی۔

زیہ: تو کیا فیصلہ کرے گی۔ کر کیسے سکتی ہے۔ کل تک تو فراک پہنے گھوما کرتی تھی۔

سا : میں نے تیری ماں کو فراک پہنے گھومتے دیکھا۔

نوزیہ : اور میں نے تیری دادی کو گودوں میں کھلایا ہے۔

نظر : مگر بھئی میری بھی تو سنو۔

(اسما اور فوزیہ اس کا ایک ایک ہاتھ پکڑ کر اپنی اپنی جانب کھینچتی ہیں اور میں بڑی ہوں۔ میں بڑی ہوں کی رٹ شروع کر دیتی ہیں۔

(پردہ)

تیسرا سین

منظر : وہی کمرہ۔ ایک شخص جس کے سر اور داڑھی کے بال بے ترتیب ہیں۔ ڈھیلا ڈھالا کوٹ اور پتلون پہنے بیٹھا ہے۔ جن کا رنگ بھی میچ نہیں کر رہا ہے ٹائی کی ناٹ بھی انتہائی واہیات طریقہ سے بندھی ہے۔ اس کے سامنے ایک جوتا رکھا ہے۔ پہلے تو وہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے پھر جیب میں سے محدب شیشہ نکال کر جوتے کا تلا دیکھتا ہے اور بڑے احتیاط سے کوئی چیز گنتا ہے کہ تبسم کمرے میں آ کر۔

تبسم : ہلو پروفیسر۔

پروفیسر : (اپنے کام میں مشغول رہتے ہوئے) ہلو۔ (پھر ایک دم چونک کر تبسم کو دیکھ کر) ارے ہو بے بی۔ (کھڑے ہو کر) آج تو تم شبنم سے دھلے گلاب کی طرح تر و تازہ ہو۔ ادھر آؤ۔ میں تمھاری پیشانی کو بوسہ دوں گا۔ جس پر صبح کا

نور جگمگا رہا ہے۔

تبسم : (ہنس کر) لیکن پروفیسر ابھی تو میں نے منہ بھی نہیں دھویا ہے۔

پروفیسر : اچھا تو جاؤ۔ منہ دھوکر آؤ۔

تبسم : کیسے پہنچے کسی نتیجہ پر۔

پروفیسر : پہنچ رہا ہوں۔تھوڑی سی الجھن پیدا ہوگئی ہے۔

تبسم : تھوڑی سی الجھن؟ کیا الجھن؟

پروفیسر : ہاں بے بی۔ نپولین کے جوتے کے تلے میں ایک سو بیالیس ٹانکے ہوا کرتے تھے نہ ایک کم نہ ایک زیادہ۔

تبسم : (ہنس کر) اچھا۔

پروفیسر : (بگڑ کر) ہنسنے کی بات نہیں ہے بے بی۔ سنجیدہ مسئلہ ہے۔ میں نے زندگی کے دس قیمتی سال جوتوں کے ٹانکے گننے میں گزارے ہیں۔

تبسم : جی ہاں جی ہاں بے حد سنجیدہ مسئلہ ہے۔ واقعی آپ نے بڑا کام کیا ہے۔تو پھر اس جوتے میں۔

پروفیسر : تھوڑی سی الجھن ہے۔

تبسم : کیا الجھن ہے۔

پروفیسر : اس میں ساڑھے ایک سو اکتالیس ٹانکے ہیں۔ آدھا ٹانکا کہاں گیا بس اسی نے پریشان کر رکھا ہے۔

تبسم : ڈھونڈیے ڈھونڈیے مل جائے گا۔ ہوسکتا ہے آدھا ٹانکا گھِس گیا ہو۔

پروفیسر : نہیں مائی ڈیر بے بی۔ نہیں۔ فرض نہیں کیا جاسکتا جو کچھ ہے اس پر غور کیا جائے گا۔

تبسم : جی ہاں غور کیجیے آدھا ٹانکا بھی وہیں کہیں ہوگا۔ (پروفیسر کی ٹائی کی طرف دیکھ کر) ٹائی تو بڑی زوردار باندھ رکھی ہے۔

پروفیسر : یہ ٹائی۔ ہائے ہائے بے بی۔تم نے میری جوانی یاد دلا دی۔ اس ٹائی کو باندھ

کر میں اپنی بیوی لانے گیا تھا یہ میری بیوی سے بھی زیادہ پرانی ہے (تبسم ہنستی ہوئی دوسرے دروازے کی طرف بڑھتی ہے کہ اسی دروازے سے انور داخل ہوتا ہے اور تبسم کو جاتا ہوا دیکھ کر)

انور : تبسم۔ کہیں جارہی ہو۔

تبسم : کچھ دوستوں سے ملنا ہے ابھی آجاؤں گی۔

انور : (ایک شیشی تبسم کو دکھا کر) یہ کیا ہے۔

تبسم : (شیشی پر نظر ڈال کر) کیا ہے۔

انور : حمل روکنے کی گولیاں۔

تبسم : (اپنا پرس کھول کر اس میں کوئی چیز تلاش کرکے) میری نہیں ای کی ہوں گی ان سے پوچھیے گا۔

(کمرے سے چلی جاتی ہے۔ انور پروفیسر کے پاس آتا ہے جو انچی ٹیپ سے جوتا ناپ رہا ہے۔ انور کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد)

انور : کہیے پروفیسر کس نتیجہ پر پہنچے۔

پروفیسر : پہنچ رہا ہوں۔ پہنچ رہا ہوں۔ کچھ الجھنیں۔

انور : الجھنیں۔

پروفیسر : جی ہاں الجھنیں۔

انور : کیسی الجھنیں۔

پروفیسر : (ایک دم کھڑے ہوکر غصہ سے) آپ لوگ مجھے کام بھی کرنے دیں گے یا نہیں اپنے بچگانہ سوالات سے میرے دماغ کا ملیدہ بنا دیا۔ مجھے آدھے ٹانکے نے پریشان کررکھا ہے۔

انور : جی آدھے ٹانکے نے۔

پروفیسر : جی ہاں اور یہ دیکھیے تین ٹانکے سوا دو ملی میٹر کے ہیں جبکہ اس کے جوتے کا ہر ٹانکا صرف دو ملی میٹر کا ہوتا ہے۔ جوتے کی لمبائی پونے دو ملی میٹر اور

چوڑائی سوا ملی میٹر کم ہے۔ آخر یہ اصلی ہے یا نہیں۔

انور : اگر یہ جوتا نپولین کا ثابت ہو جائے تو۔

پروفیسر : انقلاب آجائے گا۔ تاریخ بدل جائے گی۔ پروفیسر آسمان کی بلندیوں پہ اڑے گا۔ اس کا نام سورج کی طرح چمکے گا۔

انور : اور اس کی قیمت

پروفیسر : ہزاروں بلکہ لاکھوں ڈالر۔ دنیا کی حکومتیں دوڑ پڑیں گی۔ کہ اس جوتے سے اپنے یہاں کے عجائب گھر سجالیں۔

انور : آپ کب تک کسی نتیجہ پر پہنچ جائیں گے۔

پروفیسر : وقت لگے گا۔ وقت لگے گا۔ ... کوئی بچوں کا کھیل تو ہے نہیں کہ جب چاہا شروع کر دیا جب چاہا ختم کر دیا۔

انور : لیکن اس کا فیصلہ تین دن میں ہو جانا چاہیے۔

پروفیسر : (تین دن میں (جوتے اٹھا کر انور کے ہاتھ پر رکھ کر) سنبھالیے اپنے جوتے یہ فیصلہ کرنے میں تیس سال بھی لگ سکتے ہیں۔ آپ پروفیسر کو موچی سمجھتے ہیں کہ ایک ہی جوتا سب کے پیروں میں فٹ کر دے۔

انور : لیکن پروفیسر۔

پروفیسر : جی نہیں۔ جی نہیں۔ بس اپنے جوتے اپنے پاس رکھیے۔ پروفیسر ہتھیلی پہ سرسوں نہیں جماتا ابھی اس کے ٹانکوں پر غور کیا جارہا ہے۔ پھر اس کی لمبائی چوڑائی پر غور ہوگا۔ پھر اس کے چمڑے کا مکمل اگزامینیشن کرایا جائے گا جس سے یہ معلوم ہوگا کہ وہ کس دور کا ہے۔ وہ کس کارخانے میں بنایا گیا ہے۔ اس کے بنانے والے کون کاریگر تھے پھر اس پر جو گرد ہے وہ جمع کی جائے گی۔

انور : گرد جمع کی جائے گی۔

پروفیسر : جی ہاں۔ پھر واٹر لو کی گرد لائی جائے گی۔ پھر دونوں کا مقابلہ کیا جائے گا کہ

ایک ہی ہیں یا نہیں۔ پھر جوتے کا تھوڑا سا پالش کھرچا جائے گا اس کی کیمکل اگزامنیشن ہوگا کہ یہ وہی پالش ہے جو نپولین کے جوتوں پر ہوا کرتا تھا۔ ابھی تو بہت سے مراحل سے گزرنا ہے آپ تو سمجھ رہے ہیں کہ آئس کریم ہے کہ منہ میں رکھا اور غٹ سے اندر۔

انور : (بے حد سنجیدگی سے) پروفیسر دروازہ ادھر ہے۔

پروفیسر : جی کیا مطلب۔

انور : دروازے کا مطلب بتاؤں یا ادھر کا۔

پروفیسر : (گھبراکر) دونوں کا۔

انور : (پروفیسر کی ٹائی پکڑ کر دروازے کے باہر کرتے ہوئے) اب آپ مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔

پروفیسر : (پھر اندر آکر) لیکن جوتے۔

انور : (چیخ کر) بھاگ جایئے۔

(پروفیسر دوڑ کر باہر جاتا ہے۔ چند سیکنڈ بعد پھر اندر آکر)

پروفیسر : آپ میرے ساتھ ظلم کررہے ہیں۔

انور : (غصہ سے پلٹ کر) آپ اندر آگئے۔ (پریشان ہوکر) اب یہ جوتا میں آپ کے سر پر بجاؤں یا اپنے سر پر۔

پروفیسر : دونوں کے۔

(انور غصہ سے ایک جوتا پھینک کر مارتا ہے جو اس کے نہیں لگتا۔ پروفیسر جوتا اٹھا کر اپنے کپڑوں سے پونچھ کر انور کو دیتے ہوئے)

پروفیسر : خدارا ان کی یوں توہین نہ کیجیے یہ جوتے نہیں بلکہ۔

انور : (غصہ سے) آپ کا سر ہیں۔

پروفیسر : میرے سر کی ان کے سامنے کوئی قیمت نہیں۔ یہ تاریخ ہیں ایک سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کی ایک انسان کے...

انور : (غصہ سے بات کاٹ کر) پروفیسر اگر اب آپ کچھ بولے تو ان کے ٹانکے میں آپ کے سر پر گن دوں گا۔

پروفیسر : گن لیجیے گن لیجیے (سر جھکا کر) یہ سر حاضر ہے مگر مجھے ان جوتوں پر ریسرچ کر لینے دیجیے۔

انور : جی نہیں کوئی ریسرچ نہیں (چیخ کر) گیٹ آؤٹ۔

(پروفیسر دروازے کی طرف جاتا ہے پھر مڑ کر)

پروفیسر : آپ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ خیر پھر جب آپ کو میری ضرورت ہو بلا لیجیے گا (انور خاموش رہتا ہے) تو پھر میں جاؤں۔ انور اب بھی خاموش رہتا ہے بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے۔

(گردن جھکا کر تھکے تھکے قدموں سے دروازے کی طرف جاتا ہے کہ اسی وقت تیزی سے تبسم کمرے میں آتی ہے اور پروفیسر سے ٹکرا جاتی ہے)

تبسم : سوری پروفیسر۔

پروفیسر : (روتی آواز میں) کوئی سوری نہیں ہے بی کوئی سوری نہیں (انور سے) تو میں جاؤں۔

انور : اب اگر آپ فوراً باہر نہ ہوئے تو یاد رکھیے کہ۔

پروفیسر : (دروازے کے پاس جا کر مڑ کر) ہاں یاد رکھوں گا کہ آپ انتہائی گنوار بیہودہ ناشائستہ، بدتمیز، بدتہذیب اور جاہل ہیں۔ اور— اور— خیر جانے دیجیے ورنہ میں آپ کو الو کا پٹھا بھی کہہ دیتا۔

(انور پھینک کر مارنے کے لیے ہاتھ میں جوتا تولتا ہے کہ پروفیسر کمرے سے نکل جاتا ہے)

تبسم : کیا بات ہے انور بھائی۔

انور : صبح سے اس وقت تک وہ جوتوں کے ٹانکے گن رہا تھا۔ تیس سال تک ان جوتوں کو گھورتے رہنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔

(انور جوتے لے جا کر کونے کی میز پر رکھتا ہے)

: (ہنس کر) ریسرچ کا کام ہے کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ (اپنے کمرے کی طرف جانے کے لیے مڑنا چاہتی ہے کہ اسی وقت نظر کمرے میں آتا ہے اس کے سر پر پٹی بندھی ہے تبسم اسے دیکھ کر) ارے یہ توڑ پھوڑ کہاں سے کرالائے۔

: کچھ پالتو کتوں نے نوچ لیا ہے۔

: (مڑ کر نظر کو دیکھ کر) اور انھوں نے تمھیں زندہ چھوڑ دیا۔

(تبسم جانے کے لیے مڑتی ہے)

: تبسم!

: بھئی یہ کتے بلیوں کی نوچا ناچی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں آپ جانیں آپ لوگوں کا کام۔ (تبسم دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے)

: آپ کو یہ سب کچھ یہ بہت مہنگا پڑے گا۔

: اور میں سستا سودا کرنے کا قائل نہیں بلکہ میں ان کتوں سے بازپرس کروں گا کہ انھوں نے تمھیں زندہ کیوں چھوڑ دیا۔

: پالتو کتے گھر کے کمپاؤنڈ میں ہی زیادہ بھونکتے ہیں۔ سڑکوں پر بھونکنے کے لیے بڑے دل گردہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

: خیر پھر سہی۔

: پھر کی بات چھوڑیے۔ میں نے پولیس میں نامزد رپورٹ کردی ہے۔

: نامزد۔

: جی ہاں کہ یہ کارخیر آپ نے خود انجام دیا ہے۔ پولیس خیریت دریافت کرنے آتی ہی ہوگی۔

: (ہنس کر) اچھا۔ سمجھ رہے ہو بڑا تیر مارا ہے۔ صاحبزادے پولیس ہم لوگوں کی جیب میں پڑی رہتی ہے۔

(دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ نظر تنہا کمرے میں رہ جاتا ہے۔ سگریٹ جلا کر ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ کہ کچھ دیر بعد فوزیہ کمرے میں آتی ہے۔ اور کمرے کو چوروں کی طرح چاروں طرف دیکھ کر)

فوزیہ : کوئی ہے تو نہیں۔

نظر : نہیں لیکن بات کیا ہے۔

فوزیہ : (نظر کے سر کی طرف دیکھ کر) ارے یہ کیا ہوا۔ خیر بعد میں بتلا دینا۔ رازدارانہ لہجے میں) میں اپنے چچا کو لے آئی ہوں۔

نظر : چچا۔ کون سا چچا۔

فوزیہ : وہی جو نوادرات کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔

نظر : مگر ـــــ

فوزیہ : اب اگر مگر کچھ نہیں۔ وہ سب ٹھیک کرلیں گے۔ انھیں اندر بلا لوں۔

نظر : (ادھر ادھر دیکھ کر) اچھا بلا لو۔

(فوزیہ آہستہ آہستہ چوروں کی طرح دروازے کے پاس جاتی ہے اور کسی کو اندر آنے کا اشارہ کرتی ہے۔ ایک شخص اندر آتا ہے نظر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتا ہے اور کونے کی میز پر سے جوتا اٹھا کر لاکر اس کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ وہ شخص جوتے کو الٹ پلٹ کر دیکھ کر)

چچا : اسے نپولین کا بنانا پڑے گا۔

نظر : بنانا پڑے گا۔ کیا مطلب۔

چچا : یہ بزنس ٹیکنکس ہیں۔ اس جوتے سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے مگر پھر بھی اس شرط کے ساتھ میں اسے خرید لوں گا کہ آپ اس کے ساتھ وصیت کا وہ حصہ بھی دیں گے جس میں اسے نپولین کا کہا گیا ہے۔

نظر : مگر وہ وصیت۔

چچا : دیکھیے جناب۔ اصل قیمت تو اسی تحریر کی ہے۔ جوتا تو کوئی بھی نپولین کا بنایا

جا سکتا ہے۔

نظر : کوئی سا بھی جوتا؟

چچا : جی ہاں۔ میرا بزنس ہی نوادرات بنانا ہے۔ جانے کتنے مخطوطے بنا کر بیچ چکا ہوں جن پر جہانگیر اور شاہجہاں کی مہریں تک لگا دی تھیں۔ پرانی مورتیوں کے ساتھ جانے کتنی نئی مورتیاں پرانی کر کے چوری چھپے باہر بھیج چکا ہوں۔ خیر یہ تو بزنس کی باتیں ہیں۔

نظر : مگر وہ وصیت تو سالیسٹر کے پاس ہے (سوچتے ہوئے) فرض کیجیے اگر وہ حصہ مل جائے تو اس کی قیمت کیا ہوگی۔

چچا : میں وصیت کے اس حصہ کی قیمت دو ہزار تک دے سکتا ہوں۔

نظر : بس دو ہزار۔

چچا : اگر آپ جوتا بھی دے دیں گے تو کچھ پیسے اور دے دوں گا۔ اگرچہ جوتے کی میرے لیے کوئی اہمیت نہیں ہے۔

نظر : مگر دو ہزار تو بہت کم ہیں۔

چچا : خیر تین ہزار سہی۔ اس سے ایک پیسہ زیادہ نہیں۔ (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) آپ اچھی طرح سوچ لیجیے۔

(کمرے سے چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد نظر، فوزیہ سے)

نظر : یہ پھوے کی اولاد تمھارا چچا ہے بڑا اخرانٹ معلوم ہوتا ہے۔

فوزیہ : ایک نمبر کا چار سو بیس ہے۔ خیر ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔ تم کسی طرح وہ وصیت مار دو — تین ہزار اپنے اور اپنے باپ کے۔

نظر : مگر تین ہزار تو بہت کم ہیں۔

فوزیہ : مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے۔ جائداد میں جو کچھ تمھیں ملنا ہے وہ تو ملے گا ہی (ہنس کر) اسے تو اوپر کی آمدنی سمجھو۔

نظر : لیکن پھر بھی تین ہزار تو۔

فوزیہ : میں اس کونسٹ کو پٹاؤں گی۔ شاید کچھ اور دے مرے مگر ڈیئر اس میں میرا کمیشن کیا ہوگا۔

نظر : (ہنس کر) دیکھو فوزیہ ڈیئر۔ دوستوں کا حساب کتاب تو دل میں ہوتا ہے۔

فوزیہ : وہ تو محبت کا حساب کتاب ہوتا ہے۔ روپے پیسے کا حساب نقد۔

نظر : اچھا — خیر پانچ پرسینٹ۔

فوزیہ : پانچ پرسینٹ۔ کیا مجھے مسکین سمجھ کر زکوٰۃ دے رہے ہو۔ بڑھاؤ، بڑھاؤ کچھ اور بڑھاؤ — شاباش ہمت کرو۔

نظر : دیکھو فوزیہ ڈیئر۔ ان تین ہزار پر تو میں پانچ پرسینٹ سے ایک پیسہ زیادہ نہیں دے سکتا۔

فوزیہ : یہودی کی اولاد معلوم ہوتے ہو۔

نظر : تین ہزار سے جتنا زیادہ لے لوگی اس پر سات پرسینٹ۔

فوزیہ : سات پرسینٹ — دس پرسینٹ سے کم نہیں۔

نظر : اچھا بابا آٹھ پرسینٹ سہی۔

فوزیہ : نہیں — دس۔

نظر : خیر ساڑھے آٹھ۔

فوزیہ : دس۔

نظر : اچھا نہ ساڑھے آٹھ میرے نہ دس تمھارے نو سہی۔

فوزیہ : دس — دس ایک دس دو — دس تین کہہ کر چلی جاؤں گی۔ دس ایک۔ دس دو — بولوں دس تین۔

نظر : اچھا بابا دس۔ چلو تمھاری بات ہی سہی۔

فوزیہ : اب آئے راستے پر۔ تو پھر سودا پکا — مگر وصیت۔

نظر : اسے میں کسی نہ کسی طرح حاصل کرلوں گا۔

فوزیہ : تو میں اسے جا کر پٹاؤں۔

نظر : او کے۔

(فوزیہ ٹاٹا کرتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ نظر سیٹی سے کوئی دھن بجاتا ہے پھر جوتے اٹھا کر کونے کی میز پر لے جا کر رکھتا ہے کہ اسما کمرے میں جھانکتی ہے اور کسی کو باہر ٹھہرنے کا اشارہ کرکے خود اندر آکر)

اسما : ہیلو نظر (نظر جوتے میز پر رکھ کر مڑتا ہے) یہ پرکٹی کیوں آئی تھی۔

نظر : کسی کے آنے جانے پر کوئی پابندی تو نہیں ہے۔ تم کیسے چلی آرہی ہو۔

اسما : کافی ہاؤس سے آرہی ہوں۔ وہاں تمھارا انتظار ہو رہا ہے۔ تمھارے بغیر محفل سونی سونی سی ہے۔ محفل کو گرمانے کے لیے تمھیں لینے آئی ہوں۔

نظر : بھئی اس وقت تو مجھے ایک ضروری کام ہے۔

اسما : دیکھو ڈیئر یہ میری پرسٹیج کا سوال ہے۔ تمھارے انکار سے میں اداس ہو جاؤں گی۔ کیا مجھے اداس دیکھنا پسند کرو گے۔

نظر : مگر اسما ڈیئر۔

اسما : (بات کاٹ کر) اور وہ ہے نا۔ کیا نام ہے اس کا۔ ارے وہی جسے تم چڑا گلخیرو کہتے ہو۔ وہ تمھاری نئی کہانی کو بری طرح کریٹیسائز کر رہا تھا۔

نظر : اچھا۔

اسما : اور کیا۔ میں نے کہا پیٹھ پیچھے کیا اڑا رہے سامنے بات کرو تو کہنے لگا کیا میں اس جاہل سے ڈرتا ہوں۔ تمھیں جاہل کہا اور جانے کیا کیا اونٹ پٹانگ بکتا رہا۔

نظر : اچھا چلو۔ آج اس کی زبان ہی بند کر دوں گا۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔

اسما : ہاں نظر ڈیئر۔ اس کا تو کچھ علاج ہونا چاہیے۔ آؤ چلو۔ بس دو چار گھونسوں ہی میں تمھیں سب سے بڑا افسانہ نگار نہ ماننے لگے تو میرا نام۔

(اسما اور نظر جانے کے لیے مڑتے ہیں کہ شیخو چائے کی ٹرے لیے ہوئے

داخل ہوتا ہے۔ نظر اور اسما کمرے سے چلے جاتے ہیں۔ شیخو کچھ دیر رک کر کچھ سوچتا ہے کہ ایک شخص چوروں کی طرح داخل ہوتا ہے۔ شیخو اسے دیکھ کر آڑ میں چھپ جاتا ہے۔ چور آہستہ آہستہ بڑھ کر کمرے میں چاروں طرف نظر ڈالتا ہے کہ اس کو کونے کی میز پر جوتے رکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آہستہ آہستہ بڑھ کر ان جوتوں کو اٹھا کر اپنے کاندھے پر لٹکے ہوئے جھولوں میں رکھتا ہے اور آہستہ آہستہ واپس جاتا ہے کہ شیخو سامنے آ کر)

شیخو : ارے بہت دن میں تشریف لائے۔ آیئے۔ (چور ادھر اُدھر سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے مگر شیخو اس کا راستہ روک کر) آیئے (ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے) تشریف رکھیے (چائے کی کشتی میز پر رکھ کر۔ چور کو کرسی پر بٹھا کر) میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔

چور : (گھبرا کر) جی

شیخو : آپ خوش آمدید کا مطلب نہیں سمجھتے۔ یعنی میں آپ کا سواگت کرتا ہوں۔

چور : جی۔ میرا۔

شیخو : جی ہاں۔ جی ہاں آپ کا (ٹرے کی طرف اشارہ کر کے) ملاحظہ فرمایئے۔

چور : جی۔

شیخو : آپ ملاحظہ فرمانے کا مطلب بھی نہیں سمجھتے۔ یعنی کھاؤ پیو عیش کرو۔

چور : یعنی کہ میں

شیخو : جی آپ یعنی کہ آپ۔

چور : مگر میں تو۔

شیخو : آپ کوئی بھی ہوں (چائے کی پیالی چور کے ہاتھ میں دے کر) لیجیے۔ جس میں چائے ہے۔ اسپیشل آرڈر پر آتی ہے۔ انور میاں اس کی اسمگلنگ کرتے ہیں۔ لیجیے لیجیے۔ تکلف کی ضرورت نہیں۔ ہماری مالکن کا حکم ہے کہ چور، ڈاکو، لچا، لفنگا، اٹھائی گیرہ، جو بھی گھر میں آئے اس کی خاطر مدارات ضرور

ہونا چاہیے۔ (چور بے حد گھبرائے ہوئے انداز میں چائے پیتا ہے۔ شیخو اس کے جھولے میں سے ایک جوتا نکال لیتا ہے۔ چور چائے کی پیالی میز پر رکھتا ہے) اور پیش کروں۔

چور : جی نہیں شکریہ۔ (کھڑا ہوکر) اچھا۔ اب میں چلتا ہوں۔

شیخو : ابھی سے۔ کچھ دیر تو اور ٹھہریے۔ بخدا آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی (چور دروازے کی طرف بڑھتا ہے) تو آپ جا ہی رہے ہیں۔ خدا کی قسم میں بڑی دیر تک اُداس رہوں گا۔ (چور سے ہاتھ ملا کر) پھر کب تشریف لایئے گا۔ پھر آیئے گا نا۔

چور : جی ہاں ضرور آؤں گا۔

(چور دروازے کی طرف بڑھتا ہے کہ شیخو کی نظر دوسرے جوتے پر پڑتی ہے۔ ایک پلیٹ اٹھا کر دوڑ کر چور کا راستہ روک کر)

شیخو : آپ نے بسکٹوں سے تو شوق فرمایا ہی نہیں۔

چور : جی بس شکریہ۔

شیخو : اجی واہ۔ شکریہ کیسے۔ لیجیے لیجیے (چور ایک بسکٹ اٹھا کر منہ میں رکھتا ہے شیخو دوسرا جوتا اس کے جھولے سے نکال لیتا ہے۔ دو چار بسکٹ اس کے ہاتھ پر رکھ کر) بچوں کے لیے اور ان کی ماں کے لیے بھی لے جایئے۔ سب خوش ہو جائیں گے (چور بسکٹ لے کر کمرے سے چلا جاتا ہے۔ شیخو اطمینان کی سانس لے کر) جان بچی لاکھوں پائے۔ اگر میں سالے کی خاطر نہ کرتا تو یہ سالا چاقو سے میری خاطر کر دیتا۔ شوں۔ اور آنتیں باہر— (آنکھیں پھاڑ کر) آنتیں باہر۔

(اس طرح کرسی پر گر پڑتا ہے جیسے سچ مچ آنتیں باہر آ گئی ہوں)

(پردہ)

چوتھا سین

منظر : وہی کمرہ۔ شینو کمرے میں جھاڑو دے رہا ہے اور اپنے آپ بڑبڑا رہا ہے۔

شینو : اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے۔ جیسے دنیا میں لڑکیاں ہیں ہی نہیں (تبسم کمرے میں آتی ہے) اگر طلاق دے دی تو روتی پھرے گی۔

تبسم : (ہنس کر) اجی جناب شینو صاحب کسے طلاق دی جا رہی ہے۔

شینو : (اپنے کام میں مشغول رہتے ہوئے) گلشن کو۔

تبسم : گلشن کو! تیری اس سے شادی ہی کب ہوئی ہے جو طلاق دے رہا ہے۔

شینو : خواب میں کرلی تھی۔

تبسم : (ہنس کر) خواب ہی میں طلاق دے دینا۔ کیوں بیچاری کنواری کو بیوہ کر رہا ہے۔

شینو : میں اسے بیوہ کر کے رہوں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے مرنا ہی پڑے۔ آپ جانتی ہیں کل کیا ہوا؟

تبسم : کیا ہوا۔

شینو : خواب میں اس نے مجھے زبان چڑائی اور انگوٹھا دکھلایا۔ (تبسم کو زبان چڑاتا اور انگوٹھا دکھلاتا ہے) یوں۔ آپ اس معاملہ میں بالکل نہ بولیے۔ میں اسے ضرور طلاق دے کر رہوں گا۔ (ہاتھ پھیلا کر بتلاتے ہوئے) اتنی بڑی زبان ہے۔ میں نے خواب میں دیکھ لی۔ لاحول ولا قوۃ۔

(اُسی وقت گلشن کمرے میں آتی ہے۔ تبسم اسے دیکھ کر ہنستے ہوئے)

تبسم : کیوں ری گلشن۔ کل تو نے اسے زبان کیوں چڑائی تھی۔

گلشن : میں اور اسے زبان چڑاؤں گی۔ میں تو اس کے منہ پر تھوکوں گی بھی نہیں۔

شینو : تو میرے منہ پر تھوکے گی بھی نہیں۔ دیکھتا ہوں کیسے نہیں تھوکے گی۔ (غصہ سے) اب آنا خواب میں۔ پھر بتاؤں گا مزا۔

گلشن : تو کیا مزا بتائے گا۔ بہت دیکھے ہیں مزا بتانے والے۔

شیخو : وہ دھول جماؤں گا کہ اولاد تک گنجی پیدا ہوگی۔

گلشن : اچھا اب تو میری اولاد تک پہنچ رہا ہے۔ دیکھ رے شیخو سمجھائے دیتی ہوں۔ اپنی کھال میں رہ نہیں تو یاد رکھنا۔

شیخو : کیا یاد رکھنا۔ ایک دو مرتبہ خواب میں کیا آجاتی ہے کہ احسان جتلانے لگی۔ چل ہٹ۔ اگر تو نہیں آئے گی تو میں کسی دوسری لڑکی کو بلا لیا کروں گا۔ لڑکیوں کی کمی نہیں۔

تبسم : (ہنس کر) اچھا اب یہ جھگڑا ختم کرو اور جلدی سے کمرے کی صفائی کرڈالو۔

شیخو : میں کرلوں گا۔ اس سے کہیے کہ یہ چلی جائے۔ میں اس کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔

گلشن : کیوں چلی جاؤں۔ میں بھی کمرے کی صفائی کروں گی۔ اور تو میری صورت نہیں دیکھے گا۔تو تو کیا ہے۔ تیرے باپ کو بھی دیکھنا پڑے گی۔

شیخو : دیکھ ری گلشن تو میرے مرے ہوئے باپ کا نام نہ لے ورنہ۔

گلشن : اوہ تو میرے بچوں کا نام لے جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے۔

تبسم : (ہنس کر) اچھا اب یہ جھگڑا ختم کرو اور دیکھ شیخو تو ذرا راشد میاں کے یہاں چلا جا۔

شیخو : میں ان کے یہاں نہیں جاؤں گا۔

تبسم : آپ ان کے یہاں کیوں تشریف نہیں لے جائیں گے۔

شیخو : میں ان سے ناراض ہوں۔

تبسم : جناب ان سے کیوں ناراض ہیں۔

شیخو : گاجے کی ایک پچکی مانگی تو کہنے لگے مہنگی آتی ہے بس میں ناراض ہوگیا۔

گلشن : میں چلی جاتی ہوں تبسم بی بی۔ مرنے دو اسے۔ کیا کہنا ہے ان سے۔

شیخو : تو چلی جائے گی۔ میں تجھ سے پہلے چلا جاؤں گا۔

(دروازے کے باہر چلا جاتا ہے لیکن چند سیکنڈ بعد اندر آکر)

شیخو : ان سے کیا کہنا ہے۔

تبسم : جناب شیخو صاحب آپ سنیں تو میں عرض کروں۔

شیخو : عرض کیجیے عرض کیجیے۔ جلدی عرض کیجیے۔ خیر میں کہہ دوں گا کہ آپ کو بلایا ہے (تیزی سے کمرے سے چلا جاتا ہے)

تبسم : اے اللہ جب تو عقل بانٹ رہا تھا تو اس کی آنکھ کیوں لگ گئی تھی۔

گلشن : خواب دیکھنے کے لیے۔

(سنجیدہ کمرے میں آکر)

سنجیدہ : اری گلشن تو یہاں کیا کر رہی ہے۔

گلشن : کمرے کی صفائی۔

سنجیدہ : یہ تیرا کام ہے۔ شیخو کہاں ہے۔

تبسم : میں نے اسے ایک کام سے بھیجا ہے۔

سنجیدہ : (گلشن سے) تو جا کر ناشتہ تیار کر۔ نہیں تو ابھی چیخ و پکار شروع ہو جائے گی۔ (گلشن کمرے سے چلی جاتی ہے۔ سنجیدہ تبسم سے) اور تم کہاں جانے کو تیار ہو۔

تبسم : کچھ دوستوں سے ملنا ہے۔

سنجیدہ : پہلے بیٹھ کر اس جوتے کا تو تصفیہ کرلو۔

تبسم : مجھے اس جوتے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے انور بھائی یا نظر بھائی جو چاہیں اسے لے لیں۔

سنجیدہ : مگر وہ دونوں اسے لینے کو تیار نہیں۔

تبسم : تو میں کیوں لے لوں۔ اور اگر وہ مجھے ہی دینا چاہتے ہیں تو میری شرط مان لیں کہ یہ بنگلہ اور دادا حضور کی گاڑی میرے نام کردیں۔

سنجیدہ : لیکن ابھی سالیسیٹر آئے گا۔ تمھارا گھر پر رہنا ضروری ہے۔

تبسم : میں آدھے گھنٹے میں آجاؤں گی (دروازے کی طرف جاتی ہے پھر رُک کر) اگر راشد آجائے تو اُسے روک لینا۔

سنجیدہ : کون راشد۔ وہی تو نہیں جو پرسوں تمھارے ساتھ آیا تھا۔ بہت خوبصورت اور صحت مند نوجوان تھا۔

تبسم : (سنجیدہ کے قریب آ کر) میرے ساتھ آیا تھا (طنزیہ) مگر خوبصورت اور صحت مند ہونے کے لیے اس کی عمر آپ کے لیے بہت کم ہے۔

(نفرت آمیز نظر سنجیدہ پر ڈالتی ہے اور کمرے سے چلی جاتی ہے۔ سنجیدہ کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہے پھر دروازے کے پاس جا کر)

سنجیدہ : نظر — ارے نظر۔

(پھر کمرے کے بیچ میں آ کر سامان برابر رکھنے لگتی ہے کہ نظر کمرے میں آتا ہے)

نظر : ابھی آنکھ ٹھیک سے کھلی نہیں کہ چیخ و پکار شروع ہوگئی۔

سنجیدہ : آخر کب تک سوتے رہو گے۔ دس بج رہے ہیں۔

نظر : میں کسی اور کی نیند تو نہیں چرا رہا تھا۔ اپنی نیند لے رہا تھا۔ فرمایئے۔

سنجیدہ : اس منحوس جوتے کے بارے میں کیا طے کیا ہے۔

نظر : مجھے اس کی ضرورت نہیں انور بھائی یا تبسم جانیں۔

سنجیدہ : مگر —

نظر : (بات کاٹ کر) میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ مجھے وہ منحوس جوتا نہیں چاہیے۔

سنجیدہ : اگر تم لوگوں نے فیصلہ نہیں کیا تو وصیت کبھی نہ کھولی جائے گی۔

نظر : کھولی جائے یا نہ کھولی جائے۔ میری بلا سے۔

(دونوں خاموش ہو جاتے ہیں۔ سنجیدہ کچھ دیر نظر کا چہرہ دیکھتی رہتی ہے پھر آہستہ آہستہ کمرے سے چلی جاتی ہے۔ نظر سگریٹ جلا کر اس کے دو چار کش لیتا ہے کہ فوزیہ کمرے میں آتی ہے۔ کچھ پریشان نظر آ رہی ہے۔ نظر مسکرا کر اسے دیکھ کر)

نظر: یہ بھولا سا چہرہ کچھ اترا ہوا ہے   پریشان گیسو ہیں جوڑا کھلا ہے
یہ ڈر ہے ستائیں گے جھونکے ہوا کے   کریں گے پریشان آنچل اُڑا کے

فوزیہ : مذاق نہیں ڈیر۔ میں بہت پریشان ہوں۔ تم نے جوتے کے بارے میں جو تحریر تھی حاصل کرلی۔

نظر : وہ تو میں نے حاصل کرلی ہے۔ کم بخت کو ذرا لمبا لالچ دیا تب پٹا۔

فوزیہ : میں نے چچا کو پٹالیا ہے۔ وہ پانچ ہزار دینے کو تیار ہوگیا ہے۔ مگر وہ تحریر ہے کہاں۔

نظر : (جیب کی طرف اشارہ کرکے) یہ ہے (طنزیہ) مگر تم نے پانچ ہزار کرالیے یہ ایک کارنامہ ہے۔

فوزیہ : (اس کے لہجے کے طنز کو محسوس کرکے) تم سمجھ رہے ہو کہ میں تمھیں دھوکہ دے رہی ہوں۔ چار سو بیس کررہی ہوں۔

نظر : ارے نہیں نہیں نہیں۔ نہ آج تک تم نے کسی کو دھوکا دیا ہے نہ چار سو بیس کی ہے۔ (ایک دم موڈ بدل کر) دیکھو ڈیئر فوزیہ چار سو بیس مجھ سے نہیں چلے گی۔ اس پھوے کی اولاد اپنے چچا سے کہہ دینا کہ میں اب اس سے بزنس کرنا نہیں چاہتا۔

فوزیہ : پھر میرا کمیشن۔

نظر : (دروازے کی طرف اشارہ کرکے) تمھارا کمیشن اس کمرے کے باہر ہے۔

فوزیہ : مگر ڈیئر۔

نظر : (فوزیہ کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر کرتے ہوئے) تشریف لے جایئے۔ (مڑ کر دو چار قدم آگے بڑھتا ہے کہ فوزیہ پھر کمرے میں آکر)

فوزیہ : تمھیں میرا کمیشن دینا ہوگا۔ آئیڈیا میرا تھا۔

نظر : اپنے آئیڈیا کے ساتھ کمرے سے باہر جاؤ۔

فوزیہ : جاتی ہوں مگر پھر آجاؤں گی۔

نظر : آجانا۔ ابھی تو چلتی پھرتی نظر آؤ۔

(انور کمرے میں آتا ہے اور دروازے کے پاس رک جاتا ہے)

فوزیہ : اور اکیلی نہیں آؤں گی۔ یاد رکھنا اپنا کمیشن لے کر جاؤں گی۔

(کمرے سے چلی جاتی ہے)

نظر : اکیلی نہیں آئے گی پورے شہر کو ساتھ لائے گی۔

(انور آگے بڑھتا ہے اس کی نظر کونے کی میز پر پڑتی ہے جس پر جوتا نہیں ہے)

انور : یہ کس کمیشن کی بات کر رہی تھی۔

نظر : میرا بزنس ہے آپ کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

انور : جوتا کہیں ہے۔

نظر : کون سا جوتا (کونے کی میز کی طرف دیکھ کر) ارے۔ کہاں گیا۔

انور : میں معلوم کروں یا تم خود ہی بتلا دو گے۔

نظر : اچھا تو آپ مجھ پر جوتا چوری کا الزام لگا رہے ہیں۔

انور : میں صرف اسے اگلوانا چاہتا ہوں جسے تم ہضم کرنا چاہتے ہو۔ فوزیہ سے کتنا کمیشن طے ہوا تھا۔

نظر : لیکن بخدا مجھے اس کا بالکل علم نہیں۔

انور : ہو جائے گا۔ گھبراؤ نہیں۔

نظر : جوتا خود آپ نے اڑا دیا اور الزام مجھ پر لگا رہے ہیں۔

(نظر دروازے کی طرف جاتا ہے)

انور : کہاں جا رہے ہو۔

نظر : پولیس کو اطلاع دینے کہ آپ نے تاریخی جوتا مار لیا ہے۔

انور : وہ بھی اطلاع دے دینا۔ پہلے جوتا یہاں آجانا چاہیے۔

(اسی وقت تبسم کمرے میں آتی اور انور کا آخری جملہ سن لیتی ہے)

تبسم : تو جوتا غائب ہو گیا۔

نظر : ہاں ان حضرت نے اسے غائب کر دیا ہے۔

تبسم : چلو۔ یہ بھی اچھا ہوا۔ ایک جھنجھٹ سے تو نجات ملی۔

انور : جی نہیں ایک جھنجھٹ اور پیدا ہو گیا۔ (نظر کی طرف دیکھ کر) نظر۔ سالسٹیر

کے آنے سے پہلے جوتا یہاں آجانا چاہیے۔

نظر : میں پیدا کروں یا آپ۔

انور : تم۔کل میں نے فوزیہ کے چچا کو یہاں سے جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور مجھے معلوم ہے اس کا بزنس کیا ہے۔

(اسی وقت پروفیسر ''یوریکا۔ یوریکا۔ یوریکا۔'' چلاتا اور دوڑتا ہوا کمرے میں آتا ہے۔اس کی سانس پھولی ہوئی ہے۔تبسم اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر)

تبسم : دیکھیے یہ ننگے تو نہیں ہیں۔

پروفیسر : نہیں بے بی۔اس وقت میں کپڑے پہنے ہوئے ہوں۔ میں نے کپڑے پہنے پہنے ہی حقیقت معلوم کر لی ہے۔

نظر : کیا حقیقت معلوم کر لی ہے۔

پروفیسر : وہ جوتا نپولین کا ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔

نظر : اہاہاہا۔کیا ریسرچ کی ہے آپ نے۔ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔

پروفیسر : جی ہاں۔ واٹرلو میں جب نپولین گرفتار ہوا وہ ننگے پیر تھا۔

نظر : اس ریسرچ پر تو آپ کو نوبل پرائز ملنا چاہیے۔

پروفیسر : بالکل بالکل۔ بات یوں ہوئی تھی کہ نپولین میدانِ جنگ سے بھاگنا چاہتا تھا اور تیز بھاگنے کے لیے اس نے جوتے اتارے ہی تھے کہ گرفتار ہو گیا۔

تبسم : اچھا۔

پروفیسر : ہاں بے بی۔ اب صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ یہ وہی جوتے ہیں جو اس نے اتارے تھے۔

انور : (اُس کی ٹائی پکڑ کر دروازے کی طرف دھکا دے کر) اب آپ جا کر یہ ریسرچ کیجیے کہ آپ کی کھوپڑی میں گدھے کا بھیجا ہے یا الو کا۔

(اسی وقت وکیل کمرے میں داخل ہوتا ہے اس کے پیچھے پیچھے شبنو بھی آتا ہے جس کے ہاتھ میں وکیل کا بریف کیس ہے کہ وکیل اور پروفیسر ٹکرا جاتے ہیں)

: مہذب لوگوں کی طرح باہر جائیے۔ سانڈ کی طرح منڈیری ماردی۔

: (وکیل کو سر سے پیر تک دیکھ کر) آپ کیا چیز ہیں۔ میرے مبارک سر کو منڈیری کہہ رہے ہیں۔ شاید مہذب لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

: جی کیا فرمایا آپ نے۔ آپ مجھے چیز کہہ رہے ہیں (اپنی آستین چڑھاتا ہے۔ انور آگے بڑھ کر پروفیسر کو کمرے کے باہر کردیتا ہے) بہت مناسب کام کیا آپ نے۔ ورنہ عرض ہے کہ یہ ہسپتال میں ہوتا اور میں جیل میں۔ غصہ میں میں پاگل کتا بن جاتا ہوں۔ عرض ہے کہ آپ ایسے غیرمہذب لوگوں کو اپنے گھر میں کیسے برداشت کرلیتے ہیں۔

: ہم تو آپ کو بھی برداشت کررہے ہیں۔

: شکریہ شکریہ۔ آپ کی سعادت مندی ہے۔ گھر کے سب لوگ موجود ہیں۔ میں مصروف آدمی ہوں۔ ذرا سب کو جلدی سے بلا لیجیے۔

(شیخو اپنی کرسی لے کر آتا ہے۔ انور اسے دیکھ کر)

: شیخو۔ امی اور گلشن کو بُلا لا۔

(شیخو کمرے سے چلا جاتا ہے کہ پروفیسر پھر کمرے میں آکر)

: کیا آپ لوگ مجھے اجازت دیں گے کہ کچھ دیر میں اس مقدس جوتے کو دیکھتا رہوں۔ میری زندگی کی آخری تمنا ہے کہ میں اس مبارک جوتے کو دیکھتے دیکھتے مرجاؤں۔

: (تخت کی طرف اشارہ کرکے) اچھا اچھا بیٹھ جاؤ اور دیکھتے دیکھتے مرجاؤ۔ (پروفیسر تخت پر بیٹھ جاتا ہے کہ سنجیدہ اور گلشن کمرے میں آتی ہیں۔ وکیل انھیں دیکھ کر) میں بیگم صاحبہ کی خدمت میں سلام عرض کرنے کی عزت حاصل کررہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا اور اس منحوس موسم نے آپ کی صحت پر کوئی برا اثر نہ ڈالا ہوگا۔ (سب خاموش رہتے ہیں) عرض ہے کہ آپ نے فیصلہ کرلیا ہوگا کہ جوتا کس خوش قسمت کی قسمت میں لکھا ہے۔

نظر : ابھی یہ فیصلہ ہونا باقی ہے۔

وکیل : عرض ہے کہ لاحول ولا قوۃ۔ یعنی آپ لوگ اس قدر ست اور کاہل ہیں کہ تین دن میں بھی فیصلہ نہ کر سکے۔

تبسم : اس کا فیصلہ ہوسکتا ہے۔

وکیل : کس طرح ہوسکتا ہے۔

تبسم : یہ دونوں حضرات میری ایک شرط قبول کرلیں۔

وکیل : آپ کی شرط کیا ہے۔

تبسم : یہ بنگلہ اور دادا حضور کی گاڑی میرے نام لکھ دیں۔ جوتا میں قبول کرلوں گی۔

وکیل : بے حد مناسب تجویز ہے اور بہت نرم شرطیں۔

نظر : یہ فیصلہ آپ کو نہیں ہمیں کرنا ہے۔

وکیل : تو کیجیے کیجیے۔ جلدی کیجیے۔ میں بہت مصروف آدمی ہوں۔

نظر : لیکن وہ جوتا غائب ہے پہلے اس کا ملنا ضروری ہے۔

پروفیسر : جوتا کھوگیا (کھڑا ہوکر چکراتا ہے جیسے اسے غش آرہا ہو۔ اسی وقت اسما کمرے میں آتی ہے اور پروفیسر کو پکڑتی ہے)

اسما : یہ مررہے ہیں۔

وکیل : مرجانے دو۔ جوتا مل جائے تو اسے سنگھا دینا پھر زندہ ہوجائے گا۔ (نظر کی طرف دیکھ کر) جوتا کہاں غائب ہوگیا۔

نظر : انور بھائی کو معلوم ہوگا۔

انور : مجھے معلوم ہوگا یا نہیں۔

نظر : آپ کو

(اسی وقت شیخو ایک کشتی جس پر کپڑا پڑا ہوا ہے لے کر داخل ہوتا ہے۔ وکیل اسے دیکھ کر)

وکیل : شکریہ شکریہ۔ عرض ہے کہ آج بیوی سے کچھ کہا سنی ہوگئی تھی اور میں غصہ میں

بلا ناشتہ کیسے آ گیا۔

تبسم : (ہنس کر) یا انھوں نے ناشتہ نہیں دیا۔

وکیل : اس وقت تو انھوں نے ہی نہیں دیا تھا مگر جب گھر جاؤں گا تو خوشامد کریں گی۔
(شیخو کشتی میز پر رکھ کر اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ جاتا ہے)

وکیل : پہلے ناشتہ کرلیا جائے پھر جوتا تلاش کرلیا جائے گا۔ (کشتی پر سے کپڑا ہٹاتا ہے۔ جوتا کشتی میں رکھا ہوا ہے (وکیل چونک کر) جوتا، ناشتہ کے بجائے جوتا۔ یہ آپ لوگوں کی مہمان نوازی ہے۔ عرض ہے کہ لاحول ولا قوۃ۔

انور : شیخو۔ یہ جوتا تو نے اپنے پاس کیوں رکھا تھا۔

شیخو : میں نے نہیں رکھا تھا۔

انور : پھر تیرے پاس کہاں سے آ گیا۔

شیخو : بس آ گیا۔ نظر میاں کی ایک سہیلی ہیں۔

سنجیدہ : ارے کم بخت کہیں مردوں کی بھی سہیلیاں ہوتی ہیں۔

شیخو : مگر ان کی ہیں۔ وہ اپنے ساتھ ایک شریف آدمی کو لگا لائی تھیں۔ نظر میاں اور ان کی سہیلی باہر اور وہ اندر۔ اور جوتے اس کے جھولے میں۔ میں نے اس کی خاطر کی چائے پلائی وہی چائے جس کی انور میاں اسمگلنگ کرتے ہیں۔ اور بسکٹ بھی کھلائے اور جوتا مار لیا۔ بیچارہ بہت ناامید ہو کر گیا۔ اس کی ناامیدی پر میں بھی بہت دیر تک اُداس رہا۔

وکیل : ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ جوتا مل گیا۔ اب میں وصیت کا تیسرا اور آخری حصہ پڑھتا ہوں (بریف کیس سے بڑا لفافہ نکالتا ہے۔ اس سے دو لفافے نکلتے ہیں) ہیں۔ تیسرا لفافہ۔

نظر : تیسرا لفافہ کہاں ہے۔

وکیل : شاید کھو گیا ہے۔

انور : کھو گیا! آپ سالیسیٹر ہیں یا کباڑی۔

وکیل : کباڑی— کیا فرما رہے ہیں آپ۔

انور : بلکہ کباڑی سے بھی بدتر۔ ان اہم تحریرات کی حفاظت کرنا آپ کا فرض تھا۔

وکیل : جی ہاں۔ جی ہاں۔ مگر۔

تبسم : خیر چھوڑیے جوتا میں قبول کر رہی ہوں اور مجھے اس تحریر کی ضرورت نہیں مگر انور بھائی اور نظر بھائی کو ایک تحریر ضرور دینا ہوگی۔

نظر : کیسی تحریر۔

: کہ خوشی سے یہ بنگلہ اور گاڑی آپ مجھے دے رہے ہیں۔

ل : معقول بات ہے۔ معقول بات ہے (انور اور نظر سے) آپ حضرات تیار ہیں۔ دونوں خاموش رہتے ہیں) گویا آپ دونوں تیار ہیں۔ میں معاہدہ ڈرافٹ کیے دیتا ہوں۔ (ایک کاغذ نکال کر اس پر معاہدہ لکھتا ہے اور انور کو دیتا ہے۔ انور نظر اور سنجیدہ اس پر دستخط کرتے ہیں (وکیل تبسم سے) آپ بھی دستخط کیجیے (تبسم بھی دستخط کرتی ہے۔ وکیل کاغذ کو موڑ کر رکھنا چاہتا ہے کہ شیخو تیزی سے اٹھ کر اس کے پاس آ کر اپنا انگوٹھا بڑھاتا ہے) جی ہاں آپ کا انگوٹھا بھی ضروری ہے (اس کے انگوٹھے پر اپنے قلم سے سیاہی لگا کر اس کا اور پھر گلشن کا انگوٹھا لگاتا ہے۔ بریف کیس میں پھر کوئی چیز تلاش کرتا ہے) پیپر کٹر کہاں گیا۔ عرض ہے کہ لاحول ولا قوۃ۔ میں نے آج اسے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا تھا۔ (پیاز کاٹنے کی وہی چھری نکالتا ہے (اسے سونگھ کر) آج میری بیوی نے پیاز نہیں کاٹی۔ میں نے اسے سخت ڈانٹ پلائی تھی (سب کو لفافہ دکھلا کر) اب میں آپ کی قسمتوں کا فیصلہ سناتا ہوں۔

(لفافہ کاٹ کر کاغذ نکالتا ہے)

شیخو : آپ کی ناک پر عینک بھی ہے اور وہ ٹیڑھی بھی نہیں ہوئی ہے۔

وکیل : شکریہ (ناک پر عینک ٹٹول کر) شکریہ۔ (پڑھتا ہے) میرے نالائق بیٹے کی واہیات اولاد۔ (سب کی طرف دیکھ کر) اب آپ لوگوں کو بھی واہیات کہہ دیا۔

: کہنے دیجیے۔ وہ خود واہیات تھے۔

: (پڑھتا ہے) واہیات اولاد۔ تم کو معلوم ہے کہ اس بنگلہ کے علاوہ شہر میں میرے چار بنگلے اور ہیں۔ پچاس ہزار کے بانڈ ہیں جن پر میری آوارہ بہو نے قبضہ کرلیا ہے (سنجیدہ) آپ کو آوارہ کہا۔لاحول ولا قوۃ۔

: بڈھا خود آوارہ اور بدمعاش تھا۔ سیدھا دوزخ میں جائے گا۔

: جانے دیجیے جانے دیجیے ابھی تو وصیت سن لیجیے۔ ہماری بلا سے کہیں جائے۔

: پچیس پچیس ہزار کے دو بانڈ جوتے کے تلے میں پوشیدہ ہیں۔ (تبسم تیزی سے دوڑ کر جوتے اٹھا لیتی ہے) باقی چاروں بنگلے میرے نالائق بیٹے نے رہن رکھ دیے ہیں۔ روپیہ ادا کر کے وہ تمھیں حاصل کرنا ہیں۔

: بس۔ لاحول ولا قوۃ۔

: ذرا سکون سے سنیے۔ بانڈس میری آوارہ بہو تمھیں کبھی نہ دے گی مگر میں اسے حکم دیتا ہوں کہ وہ اس میں سے پانچ پانچ ہزار روپے گلشن اور شیخو کو دے۔

: لعنت ہے۔ دس دن سے یہ واہیات ناٹک کھیلا جارہا تھا۔

(جانے کے لیے مڑتا ہے کہ چچا کمرے میں آتا ہے اور نظر کو جاتے ہوئے دیکھ کر)

: اجی جناب نظر صاحب۔ لائیے وہ جوتا کہاں ہے۔

: وہ جوتا تو۔

: نپولین کا جوتا۔ آپ اس کے مجھ سے دس ہزار روپے وصول کر چکے ہیں۔

: مگر وہ جوتا مجھے۔

: آپ کو نہیں ملا۔ میں یہ سب کچھ نہیں جانتا۔

: میں آپ کی رقم

: مجھے اب رقم بھی نہیں چاہیے جوتا چاہیے۔ اگر آپ نے جوتا نہیں دیا تو مجھے پولیس کی مدد لینا پڑے گی۔ آپ کی تحریر میرے پاس ہے۔

نظر : دیکھیے۔ خیر آیئے ہم دوسرے کمرے میں بیٹھ کر بات کریں گے۔ آیئے—
دوسرے کمرے میں آیئے۔
(اسی وقت فوزیہ داخل ہوتی ہے اور نظر سے)

فوزیہ : جو کچھ بات کرنا ہے اسی کمرے میں بیٹھ کر کیجیے۔

نظر : تم کیوں آئی ہو۔

فوزیہ : اپنا کمیشن لینے۔ کہہ کر گئی تھی کہ اکیلی نہیں آؤں گی اس لیے پھر پولس کو بھی
ساتھ لائی ہوں۔

وکیل : پولیس۔

فوزیہ : جی ہاں۔ آپ کے کالے کارناموں کی رپورٹ بھی پولیس میں درج کر آئی
ہوں۔

وکیل : (گھبرا کر) میرے۔

فوزیہ : جی ہاں۔ (دروازے کے پاس جا کر) آجایئے۔
(چور پولیس کی وردی میں داخل ہوتا ہے۔ شیخو اسے دیکھ کر گھبرا کر)

شیخو : آپ— پولیس—

چور : خاموش— یہ میرا سائڈ بزنس ہے۔

فوزیہ : (وکیل کی طرف اشارہ کر کے) یہی وہ ذات شریف ہیں جنھوں نے وصیت
کا حصہ مسٹر نظر کو بیچا ہے۔

وکیل : جھوٹ ہے۔ میں نے کچھ نہیں بیچا۔ میں ایک شریف اور ذمہ دار انسان ہوں۔

فوزیہ : جی ہاں بہت ذمہ دار ہیں کیا مسٹر نظر تمھاری بیوی کے لیے بنارسی ساڑی تحفہ
میں نہیں لے گئے تھے۔

وکیل : عرض ہے کہ ایک نمبر کا جھوٹ وہ ساڑی بنارسی نہیں کانجی ورم کی تھی۔

فوزیہ : ہاں ہاں ساڑھی تو تھی۔

وکیل : مگر عرض ہے میں شریف آدمی ہوں۔

فوزیہ : بہت شریف ہو۔ وہ تحریر اس وقت بھی مسٹر نظر کی جیب میں موجود ہے۔

(نظر یہ سنتے ہی بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر انور، شیخو، پروفیسر اور چور دوڑ کر اُسے پکڑتے ہیں۔ سب لوگوں کو اس طرف متوجہ دیکھ کر وکیل بھاگنے کی کوشش کرتا ہے کہ سنجیدہ، گلشن، تبسم، اسما اور فوزیہ اسے پکڑ لیتی ہیں۔

وکیل : عرض ہے کہ میں—

(پردہ)

یہ ڈراما 3 تا 5 مئی 1984 کو رویندر بھون بھوپال میں اسٹیج کیا گیا۔ میں یہ ڈراما ان فنکاروں کی نذر کرتا ہوں جنھوں نے اسے کاغذ سے اسٹیج پر منتقل کیا۔

ڈائرکشن : راجیو ورما

روشنی : بینو گنگولی

لباس اور میک اَپ : منجو شا گنگولی اور کماری افروز

فنکار

سنجیدہ : نیرا ورما

انور : ابرار حسن

نظر : کمیش کندن تھامس

فوزیہ : میناکشی ڈالے

تبسم : آبھا کندرا

شیخو : راہل رستوگی

گلشن : چترا بھادڑی

اسما : ایوا

وکیل : اعظم محمد خاں

پروفیسر : اُمیش سکسینہ

چچا : سریش

چور اور پولس والا : سنجے سیلٹ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

کلیاتِ اکبر الہٰ آبادی (جلد دوم)

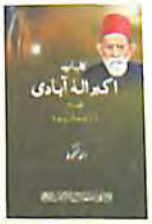

مرتب : احمد محفوظ

صفحات: 824

قیمت : -/257 روپے

تحقیق وتعارف

مصنف : حنیف نقوی

صفحات: 288

قیمت : -/99 روپے

کلیاتِ مُلّا رموزی (جلد اوّل۔ حصہ اوّل)

مرتب : خالد محمود

صفحات: 453

قیمت : -/151 روپے

کلیاتِ مُلّا رموزی (جلد اوّل۔ حصہ دوم)

مرتب : خالد محمود

صفحات: 444

قیمت : -/140 روپے

کلیاتِ ماجدی

مرتب : عطاء الرحمن قاسمی

صفحات: 666

قیمت : -/196 روپے

معاصر تنقیدی رویے

مصنف : ابوالکلام قاسمی

صفحات: 246

قیمت : -/84 روپے

₹ 1343/- (Set)

ISNB: 978-93-5160-072-5
9 789351 600725

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025